مجموعہ ماہنامہ البرہان

۲۰۱۱ء-۲۰۱۰

مدیر

ڈاکٹر محمد امین

ترتیب ، تہذیب، وفہرست

محمد علی جنید

ریسر چ اسکا لر ،شعبہ سیاسیات ،جامعہ کراچی۔

Karachi University Research Forum

جامعہ کراچی مرکز برائے تحقیق و دانش متدانہ مباحث

ایک آزاد غیر حکومتی ادارہ

موجودہ مجموعہ جناب ڈاکٹر ،محمد امین صاحب کے زیر ادارت طبع ہونے والے ماھنامے البرھان سے ترتیب دیا گیا ھے جس میں ،دینی مدارس اور مودودہ تعلیمی نظام کے احیا نو ،نئے مذھبی نصاب پر مضامین ،کے ساتھ ساتھ،جدید فلسفہ،مابعد از طبیعات،جدید علم کلام،افکار مغرب کا علمی محاکمہ کیا گیا ہے مذید براں ،تزکیہ نفس اور کتب پر تبصرے جمع کئے گئے ہیں، جو اپنی نذرت علمی اور افادیت کے سبب محقق اور عام قاری دونوں ہی کی علمی تشنگی بجھانے میں کارأمد ثابت ہونگے۔

جامعہ کراچی مرکز برائے تحقیق و دانش مندانہ مباحث

اپریل۔ ۲۰۱۰۶

www.kurf.page.tl

	ہماری سرگرمیاں: تعلیم و تربیت تحریک اصلاح تعلیم (ٹرسٹ)	=	۴۲
	مدیر کے نام محترم ڈاکٹر صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ،	=	۴۳

خسارے کی سرمایہ کاری

ہم نے ایک مہربان سے، جو تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ کے کاموں میں ہم سے مالی تعاون فرماتے ہیں، مشورہ کیا کہ ہم پرچہ نکالنے کی سوچ رہے ہیں۔ انہوں نے کہا 'اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں۔ پرچے بہت ہیں پڑھتا کوئی ہے نہیں'۔ ہم نے سوچا چونکہ وہ ٹرسٹ کی مالی معاونت فرماتے ہیں اس لئے انہیں حق ہے کہ سوچیں کہ ٹرسٹ کا پیسہ صرف مفید اور مؤثر کاموں میں صرف ہو۔ چنانچہ ہم نے اگلی ملاقات میں عرض کیا کہ ہم اس پرچے پر ٹرسٹ کا پیسہ نہیں لگائیں گے بلکہ یونیورسٹی سے ہمیں جو تنخواہ ملتی ہے اس میں سے کچھ کھینچ تان کر پرچہ نکالیں گے۔ کہنے لگے میری رائے پھر بھی وہی ہے۔

ہم چونکہ ان کے اخلاص اور ان کی اصابت رائے کے قائل ہیں لہٰذا سمجھ گئے کہ عقل کی بات وہی ہے جو وہ کہہ رہے ہیں ـــــ لیکن ہم اپنے جنوں کا کیا کریں جو کسی پل چین سے بیٹھنے نہیں دیتا چنانچہ جب دیوانگی فرزانگی پر غالب آ گئی تو ہم نے البرہان جاری کر دیا۔

سو جناب! منافع کی سرمایہ کاری تو سب کرتے ہیں ـــــ اور وہی کرنی چاہئے لیکن جب مقصد کی لگن انتہا کو پہنچ جائے اور دیوانگی فرزانگی پر غالب آ جائے تو کچھ لوگ خسارے کی سرمایہ کاری بھی کر لیتے ہیں۔

یہ عشق بھی عجیب چیز ہے۔ عرصہ ہوا ایک عربی قطعہ پڑھا تھا کہ کسی نے دیکھا کہ مجنوں دیواروں کو بوسے دیئے جا رہا ہے۔ اس نے پوچھا میاں قیس! یہ کیا کر رہے ہو؟ 'دیوانے' نے ایک لحظہ کو آنکھیں اٹھائیں اور معصومیت سے کہا 'تمہیں نہیں پتہ یہ لیلیٰ کے گاؤں کی دیواریں ہیں'۔

امین

ملی مجلس شرعی کے زیر اہتمام تمام مکاتب فکر کے علماء کرام کی طرف سے
فرقہ وارانہ دہشت گردی کی مذمت

ملی مجلس شرعی کے اجلاس مورخہ ۹ نومبر ۲۰۱۰ء میں تمام مکاتب فکر کے علماء کرام نے فرقہ وارانہ دہشت گردی کی مذمت کرتے ہوئے درج ذیل قرارداد منظور کی ہے:

''ہم ملک کے طول وعرض میں ہونے والی دہشت گردی کی تمام وارداتوں کی پرزور مذمت کرتے ہیں بالخصوص مساجد اور اولیاء اللہ کے مزارات کو دہشت گردی کا نشانہ بنانے کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے وہ بے حد قابل مذمت ہے۔ ان مقدس اور روحانی مقامات پر دہشت گردی کرنے والوں کا دین و مذہب سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

ہم اس بات پر بھی متفق ہیں کہ ہمیں اس صورتحال کا متحد ہو کر مقابلہ کرنا چاہیے ورنہ باہمی انتشار و افتراق سے ہماری ہوا اکھڑ جائے گی اور تمام مکاتب فکر کی جگ ہنسائی ہوگی جب کہ اسلام دشمن طاقتوں کو اس سے تقویت ملے گی۔

ہمارا ماضی سب کے سامنے ہے کہ عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ، ناموس رسالتؐ کے تحفظ اور نفاذِ اسلام کے لئے تمام مکاتب فکر کے اکابر علماء کرام نے ہر مرحلہ پر متحد ہو کر ملت کی قیادت کی ہے۔ آج بھی اس کی ضرورت ملک کے اسلامی نظریاتی تشخص کے تحفظ اور قومی خودمختاری کی بحالی کے لئے شدت کے ساتھ محسوس کی جارہی ہے اور اسی ضرورت و اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ہم مشترکات پر متحد رہنے کے عزم کا اظہار کرتے ہیں۔

ہم مشترکہ طور پر عوام سے بھی اپیل کرتے ہیں کہ وہ مسلکی اختلافات اور فرقہ واریت کو ہوا نہ دیں اور آپس میں محبت ومودت اور یگانگت کو فروغ دیں''۔

اس قرار داد پر مجلس میں موجود جن علماء کرام نے دستخط ثبت فرمائے ان میں مولانا زاہد الراشدی صاحب (جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ)، مولانا ملک عبدالرؤف صاحب (متحدہ

علماء کونسل)، مولانا خلیل الرحمٰن قادری صاحب (جامعہ اسلامیہ لاہور)، مولانا حافظ عبدالرحمٰن مدنی صاحب (جامعہ رحمانیہ گارڈن ٹاؤن)، مولانا قاری جمیل الرحمٰن اختر صاحب (جامع مسجد امن باغبانپورہ)، مولانا حافظ عبدالغفار روپڑی صاحب (جامعہ اہل حدیث نشتر روڈ)، حافظ عاکف سعید صاحب (امیر تنظیم اسلامی)، ڈاکٹر فرید احمد پراچہ صاحب (جماعت اسلامی)، پروفیسر نذیر احمد بھٹی صاحب (جامعہ صدیقیہ بہاولپور)، مولانا ابو رجال (جامعہ اہلحدیث) اور ڈاکٹر محمد امین صاحب (تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ) شامل ہیں۔

جبکہ مجلس کے دیگر رہنماؤں خصوصاً مولانا مفتی محمد خان قادری صاحب (جامعہ اسلامیہ لاہور)، علامہ احمد علی قصوری صاحب (مرکز اہلسنت)، مولانا حافظ فضل الرحیم صاحب (جامعہ اشرفیہ)، مولانا قاری احمد میاں تھانوی صاحب (جامعہ دارالعلوم اقبال ٹاؤن) اور مولانا عبدالمالک صاحب (جامعہ مرکز علوم اسلامیہ منصورہ) نے بھی اس قرارداد کی حمایت کی ہے۔

....

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبیؐ، دین بھی، ایمان بھی ایک

حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں!
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں!

خالد جامعی

جہاد اور مسلک پرستی

غلبۂ اسلامی کے لئے ضروری ہے کہ اس کے نفاذ اور توسیع کی چومکھی جنگ صالحین کے ذریعہ سے لڑی جائے جو تزکیۂ نفس کے مراحل سے گزر چکے ہوں اور اپنی ذات کو مٹا چکے ہوں۔ وہ لوگ جو مومن کا مقام حاصل کرنے کے بجائے ایک فرقہ پسند گروہ بن کر گروہی عصبیت کے حامل ہوں اور مشرکین، کفار، اہل کتاب اور اسلامی گروہوں کے مابین فرق کرنے سے معذور ہوں وہ جہاد کے اہل نہیں۔ جہاد میں اگر کافر چمکتی تلوار دیکھ کر اسلام قبول کر لے تو اس کا اسلام قابل یقین ہوجاتا ہے اور رسالت مآب ﷺ اپنے ایک صحابی سے فرماتے ہیں کہ جب اس کافر نے کلمہ پڑھ لیا تو تم نے اسے کیوں قتل کیا؟ وہ جواب دیتے ہیں کہ تلوار دیکھ کر کلمہ پڑھ رہا تھا۔ گمان یہ تھا کہ دھوکہ دے رہا ہے تو فرمایا کیا تم نے اس کا سینہ کھول کر دیکھ لیا تھا؟ حضرت علیؓ مرحب پہلوان کو گراتے ہیں لیکن اس کے تھوکنے پر اٹھ کر الگ ہوجاتے ہیں کہ پہلے میں اللہ کے لئے لڑ رہا تھا اب گمان ہوا کہ کہیں اپنے نفس کے لئے یہ کوشش نہ ہو۔ میدان جہاد میں ایک صحابی نے جن کا وقت شہادت قریب تھا پیاس کی شدت سے پانی طلب کیا۔ پانی پیش کیا گیا اتنے میں دور سے آواز آئی کہ پانی تو پانی چھوڑ دیا اور اشارہ کیا کہ انہیں پہلے پانی پلا دو۔ وہ دوسرے صحابی کے پاس پہنچے تو تیسرے کی آواز آئی۔ انہوں نے اشارہ کیا کہ انہیں پانی پلاؤ۔ ادھر گئے تو وہ شہید ہو چکے تھے۔ لوٹے تو پہلے اور دوسرے صحابی بھی شہید ہو چکے تھے۔ جو لوگ قربانی و ایثار کے اس درجے پر فائز ہوں کہ موت کی سختی اور پیاس کی طلب بھی انہیں اپنے بھائی کی محبت سے غافل نہیں کرتی وہی مجاہد کے مرتبے پر فائز کیے جانے کے لائق ہیں۔ سورہ حشر کی آیت **وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ** [۹:۵۹] انہی نفوس کی شان میں اتری ہے۔ یہ وہ مجاہد ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے اپنے قلم سے ایمان ثبت کر دیا ہے۔ **اُولٰٓئِكَ كَتَبَ**

فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْاِیْمَانَ وَاَیَّدَھُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ [۲۲:۵۸] جہاد کے لئے اس ایمان، یقین اور کردار کی ضرورت ہے اگر کوئی اس سے محروم ہے تو اپنے آپ پر اور اس امت پر رحم فرمائے اور میدان جہاد کی بجائے اپنے گھروں میں آرام کرے۔ جو لوگ تزکیہ نفس کے اس مقام پر ہوں وہی جہاد کے اہل ہیں اور جو لوگ انتقام اور ردعمل کی سطح سے اوپر ہی نہیں اٹھے وہ لشکر جہاد میں شامل ہونے کے اہل ہی نہیں ہیں۔

جہاد ایک نورانی و روحانی عمل ہے۔ یہ زمین پر قبضہ کرنے، سروں کے مینار کھڑے کرنے اور تسخیر فی الارض کے لئے نہیں یہ تسخیر قلوب انسانی کے لئے آیا ہے۔ اسی لئے دعوت اور جہاد کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ جہاد سے دعوت میں توسیع اسی وقت ممکن ہے جب مجاہد کمال ضبط کے مقام پر کھڑا ہو اور میدانِ جنگ میں بھی غیض وغضب سے مغلوب نہ ہو۔ کسی کو قتل کرنا اور فناء کے گھاٹ اتارنا اس کے اختیار میں ہو لیکن اللہ کی خاطر وہ اس اختیار کو ترک کر دے۔ ضبط نفس کا یہ مقام اگر آ جائے تب یہ جہاد اور چمکتی ہوئی تلواریں میدان دعوت بھی بن جاتی ہیں۔ اسی لئے دین کا مقصد قتال فی سبیل اللہ کے ذریعے دعوت کا فروغ اور توسیع ہے۔ اسی لئے دین صلح کو جنگ پر ترجیح دیتا ہے لیکن اگر اہل دین پر جنگ مسلط کی جائے تو وہ بھرپور مقابلے کا حکم دیتا ہے کہ کفر کی قوت اور شان وشوکت کو توڑ دیا جائے اور زمین کو فتنہ وفساد سے پاک کر دیا جائے۔

....

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ (الفتح ۴۸:۲۹)

محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھی ہیں وہ کافروں کے مقابلے میں سخت ہیں اور آپس میں مہربان ہیں۔

سید منصور آغا

حضرت عائشہؓ کے حق میں امام خامنائی کا فتویٰ

اسلامی جمہوریۂ ایران کے دینی سربراہ سید علی خامنائی نے ۳ اکتوبر ۲۰۱۰ء کو ایک فتویٰ جاری کیا ہے جس میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور اصحاب رسول (رضوان اللہ علیھم اجمعین) کی شان میں گستاخی کو حرام قرار دیا ہے۔ اس فتوے کا عالم اسلام کے ممتاز شیعہ وسنی علماء اور دانشوروں نے پُر جوش خیر مقدم کیا ہے۔ الاحساء کے علماء اور دانشوروں نے اپنے خط مورخہ ۱۵ اگست ۲۰۱۰ء میں ان سے استفسار کیا تھا کہ ''ایک ایسے دور میں جبکہ امت اسلامی ایک منظّم بحران سے گزر رہی ہے، مسلمانان عالم کے درمیان تفرقہ اور انتشار پھیل رہا ہے اور وحدت امت کی ترجیحات کو نقصان پہنچایا جا رہا ہے جس کی وجہ سے حساس معاملات کو حل کرنے کے لئے جاری اسلامی جدوجہد اور اس کے ثمرات سے توجہ ہٹ رہی ہے۔ ایسے نازک دور میں کچھ لوگ انتہا پسندانہ رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں اور ارادی طور پر سنی ملت کی علامتوں اور مقدسات کی مسلسل توہین ہو رہی ہے۔ اسی سلسلے کے تحت بعض سیٹلائٹ چینلز اور انٹرنیٹ ویب سائٹس پر علم و دانش سے منسوب بعض افراد کی جانب سے زوجۂ رسول حضرت عائشہؓ کے بارے میں ایسے نازیباالفاظ کہے جا رہے ہیں جن سے ان کی صریح اہانت ہوتی ہے اور جوازواج نبی ﷺ اور امہات المومنین کے شرف کے خلاف ہیں''۔ اس بارے میں جناب کی کیا رائے ہے؟

اس استفسار کا پس منظر یہ ہے کہ کویت کے ایک سابق فوجی افسر شیخ یاسر الحبیب نے، جو خود کو شیعہ مبلغ و عالم باور کراتا ہے اور برطانیہ میں خود جلاوطنی کی زندگی گزار رہا ہے، ماہ رمضان سے متعلق ایک مقدس اجتماع میں حضرت عائشہؓ کے خلاف انتہائی نازیبا کلمات کہے اور فحش الزامات عائد کئے جن کی بعض ٹی وی چینلز اور ویب سائٹس نے خوب تشہیر کی۔ اس کے نتیجے میں کویت میں سیاسی کشیدگی پیدا ہوگئی جہاں تقریباً ۴۰ فیصد شیعہ آبادی ہے۔ چنانچہ کابینہ نے الحبیب کی شہریت ختم کردی لیکن اس اقدام سے اضطراب ختم نہیں ہوا۔

امام سید علی خامنائی نے اپنے مختصر مگر دوٹوک جواب میں فرمایا: ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ، ہمارے سنی بھائیوں کی علامتوں اور مقدسات کی توہین وتحقیر، بالخصوص رسول اللہ ﷺ کے ازواج پر تہمت باندھنا، جوان کے شرف میں خلل پڑنے کا باعث ہو حرام ہے۔ بلکہ یہ امر تمام ابنیاء کی ازواج اور خاص طور سے ان کے سردار وسرور رسول اللہ اعظم ﷺ کے درجات کے لئے محال ہے''۔ شیعہ نیٹ پر ایک وضاحت میں کہا گیا ہے کہ جو تہمتیں حضرت عائشہ زوجہ رسولؐ پر لگائی گئی ہیں، شیعہ اعتقادات کے مطابق دیگر انبیاء کی ازواج حتیٰ کہ حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کے ازواج پر بھی نہیں لگائی جاسکتیں اور انبیاء علیہ السلام کے حریم ان تہمتوں سے مکمل طور پر پاک ہیں۔اہل بیت نیوز ایجنسی کے مطابق حوزۂ علمیہ قم کے علماء واساتذہ نے رہبر انقلاب کے اس فتوے کی پرزور تائید کی ہے اور ایک مشترکہ بیان میں کہا ہے کہ 'شیعہ اعتقادات زوجۂ پیغمبر اکرمؐ کو فحشاء سے نسبت کو غلط اور خلاف حقیقت سمجھتے ہیں اور شیعہ علماء نے سورۂ نور میں 'افک' کے قصے کے حوالے سے پیغمبر اکرمؐ کی زوجات کو فحشاء کے بہتان سے مکمل طور پر بری قرار دیا ہے'۔

لبنان کی شیعہ تنظیم 'جماعت علمائے مسلمین' کے ترجمان شیخ عمرو نے کہا ہے کہ جو اختلافات ابھارے جارہے ہیں ان کا شیعہ اعتقادات اور دینی اصولوں سے کوئی تعلق نہیں۔(وہ سیاسی اختلافات تھے)انہوں نے کہا کہ انقلاب اسلامی رہبر کا فتویٰ ایک فقہی اور سیاسی فتویٰ ہے اور اس اعتبار سے تمام اہل تشیع،خواہ وہ امام خامنائی کے مقلد نہ ہوں،اس پر عمل کے پابند ہوجاتے ہیں'۔

لبنان کے سنی علماء بورڈ کے سربراہ شیک ماہر مزبر نے کہا ہے کہ آیت اللہ العظمٰی کا فتویٰ امت اسلامی کے قائد اور پیشوا کی حیثیت سے آپ کی حکمت،علم ودانش اور اعلیٰ درجہ کے ایمان کی علامت ہے کیونکہ اسلامی امہ کا اصل امام وہ ہے جو امت کے درمیان اتحاد اور یکجہتی قائم کرے۔

جامعہ الازہر کے چانسلر ڈاکٹر احمد الطیب نے ایک تحریری بیان جاری کر کے اس فتوے کو مبارک قرار دیا اور کہا ہے ،'جو چیز اس فتوے کی اہمیت میں اضافہ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ مسلمانان عالم کے بزرگ علماء میں سے ایک عالم دین ، عالم تشیع کے بزرگ مراجع میں سے

ایک ممتاز ترین مرجع اور اسلامی جمہوریہ ایران کے اعلیٰ ترین رہبر نے صادر کیا ہے۔ انہوں نے کہا، 'علم کے مقام سے اور شرعی ذمے داری جو میرے دوش پر ہے، کی بناء پر کہتا ہوں کہ مسلمانوں کے درمیان اتحاد کی کوشش واجب ہے اور جو شخص مسلمانوں میں اختلاف اور تفرقہ ڈالے وہ گنہگار اور عذاب الٰہی کا مستحق ہے، عوام اس سے کنارہ کریں'۔ سب سے اہم یہ کہ کویت حکومت نے اس فتوے کا خیر مقدم کیا ہے۔ وزیر اعظم شیخ ناصر محمد الاحمد الجابر الصباح کی صدارت میں منعقدہ کابینہ کی میٹنگ میں امام خامنائی کے اس اقدام کو بنظر استحسان دیکھا گیا اور اس پر اظہار تشکر و اطمینان کیا گیا۔ یروشلم کی رپورٹ مظہر ہے کہ بیت المقدس کے امام شیخ مہر حمود نے اس فتوے کو مسلم اتحاد کے لئے نیک فال قرار دیا ہے۔ قاہرہ یونیورسٹی میں مشرقی علوم کے پروفیسر مدحت حماد نے اس کو 'فکر میں سنجیدہ تبدیلی' سے تعبیر کیا ہے اور توقع ظاہر کی ہے کہ امام خامنائی کی شخصیت کیوں کہ بہت ہی بلند اور محترم ہے، اس لئے اس کا اثر دور تک محسوس کیا جائے گا'۔

ہندوستان میں بھی اس فتوے کا خیر مقدم کیا گیا ہے۔ جماعت اسلامی ہند کے امیر اور معروف عالم دین مولانا سید جمال الدین عمری نے کہا ہے: ''یہ فتویٰ نہایت قابل ستائش ہے۔ اس کا خیر مقدم ہونا چاہئے۔ اس سے امید ہے کہ سنی شیعہ اختلافات کم ہوں گے اور ملی اتحاد کی راہیں کھلیں گی۔ اس فتوے کو عام کرنے کی ضرورت ہے''۔ جمعیۃ علماء ہند کے سیکریٹری مولانا عبدالحمید نعمانی نے، جو دارالعلوم دیوبند میں تدریسی فرائض بھی انجام دیتے ہیں، اس کو بڑی اچھی علامت قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ''اس میں مسلمانوں کے دونوں بڑے مکاتب فکر کے لئے رہنمائی اور روشنی ہے۔ انہوں نے کہا اس پر توجہ دی جانی چاہئے اور اس پر عمل ہونا چاہئے۔ توقع ہے کہ یہ بات بہت مؤثر ثابت ہوگی'۔ معروف صحافی محمد احمد کاظمی نے کہا ہے کہ یہ فتویٰ کسی مخصوص خطے کے لئے نہیں ہے اور توقع ظاہر کی کہ برصغیر میں بھی اس کا خاطر خواہ خیر مقدم ہوگا''۔ (بشکریہ 'دعوت' دہلی)

ہم 'ملی مجلس شرعی' کے سیکریٹری کی حیثیت سے اس فتوے کا خیر مقدم کرتے ہیں اور ہمیں توقع ہے کہ پاکستان کے شیعہ اور سنی علماء اس فتوے کا خیر مقدم کریں گے اور اگر اس پر کما حقہ عمل ہوتا ہے تو یہ فتویٰ دونوں مکاتب فکر کے درمیان فاصلوں کو پاٹنے میں اہم کردار ادا کرے گا۔

ڈاکٹر محمد امین

ڈاکٹر محمود احمد غازی ـــــ کچھ یادیں، کچھ باتیں

ڈاکٹر محمود احمد غازی بھی راہیٔ ملک عدم ہوئے۔ اور اتنے اچانک کہ ابھی تک یقین نہیں آتا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ غالباً 1993ء کی بات ہے جب ہم مرحوم ڈاکٹر غلام مرتضٰی ملک صاحب کے ساتھ ایک نیم سرکاری تعلیمی فاؤنڈیشن میں ڈائریکٹر نصابیات کے طور پر کام کرتے تھے۔ ہم نے اڑھائی تین سال کی محنت سے پہلی سے بارہویں تک کے نصاب کو از سرِ نو اسلامی تناظر میں مدون کیا۔ اب اس نصاب کے مطابق نصابی کتب مدون کرنے کا مرحلہ درپیش تھا لیکن ٹرسٹیوں اور ملک صاحب میں اختلافات کے پیش نظر کام ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ ہم نے چند ماہ انتظار کیا لیکن جب دیکھا کہ اونٹ کسی کروٹ نہیں بیٹھتا تو بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے 'ادارہ تحقیقات اسلامی' کے سربراہ اور اپنے مہربان ڈاکٹر ظفر اسحٰق انصاری صاحب سے اس کا ذکر کیا کہ کسی دوسری مصروفیت کا متلاشی ہوں۔ چند دن بعد ان کا فون آ گیا کہ ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب سے آ کر ملو۔ وہ ان دنوں ڈائریکٹر جنرل دعوۃ اکیڈیمی تھے، میں جا کر ان سے ملا۔ سانولا رنگ، لمبا قد اور لباس میں قدیم و جدید کا امتزاج یعنی سوٹ کے ساتھ نکٹائی لیکن سر پہ جناح کیپ اور چھوٹی داڑھی۔ خندہ پیشانی سے پیش آئے اور پوچھنے لگے کہ آپ کی زیادہ تر دلچسپی اسلامیات کے کن شعبوں سے ہے؟ میں نے کہا 'مزاجاً دعوت سے لیکن تعلیمی اسناد کے لحاظ سے اسلامی قانون سے'۔ کہنے لگے خیر، ان شاء اللہ دونوں اپنے بس میں ہیں (وہ ان دنوں شریعہ اکیڈیمی کے انچارج بھی تھے)۔ چنانچہ انہوں نے میری تعیناتی شریعہ اکیڈیمی میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر کرادی۔ وہاں سول اور ایڈیشنل ڈسٹرکٹ ججوں کی اسلامی قانون میں تربیت کے علاوہ شریعہ میں تالیف و تدوین کا شعبہ بھی میرے سپرد تھا۔ وہ ان شعبوں میں میری تجاویز اور رپورٹوں پر عموماً من و عن صاد کر دیتے۔ ایسے ہی ایک موقع پر میں نے نوٹ لکھا کہ مجھے ان کاموں کا کوئی تجربہ نہیں اور یہاں کوئی ایسے

ساتھی بھی نہیں جن سے مشاورت کی جا سکے اور یہ بڑے بڑے علمی منصوبے ہیں اور آپ بلا بحث و ادنی تغیر ان پر صاد کر دیتے ہیں۔ جواب میں 'من تواضع لله رفعه' کا مختصر جواب لکھ کر یہ باب بند کر دیا۔ مطلب یہ کہ وہ اپنے ساتھیوں پر اعتماد کرتے تھے، ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور ان کی علمی ترقی پر خوش ہوتے تھے۔

ان دنوں میری فیملی لاہور میں تھی لہٰذا میرے پاس کافی وقت بچ جاتا اور میں نے نوائے وقت میں ہفتہ وار کالم 'فکر و نظر' لکھنا شروع کر دیا۔ ایک دفعہ میں مساجد میں اسلامی تعلیم کے موضوع پر کالم لکھنا چاہتا تھا تو میں نے بعض معلومات کے لئے ایک جاننے والے صاحب کو وفاقی وزارت تعلیم میں فون کیا تو انہوں نے بتایا کہ جنرل ضیاء الحق صاحب نے ایک سروے کرایا تھا جس سے پتہ چلا کہ ہماری مساجد میں سے صرف 25 فیصد ایسی ہیں جہاں باقاعدہ سند یافتہ امام ہیں جو عوام کو قرآن و حدیث کا درس دے سکتے ہیں۔ یہ اعداد و شمار چونکا دینے والے تھے۔ اتفاق سے اسی شام کسی وجہ سے مجھے ڈاکٹر غازی صاحب کے گھر جانا پڑا۔ میں نے انہیں بتایا کہ مجھے اپنے کالم کے سلسلے میں یہ اعداد و شمار ملے ہیں۔ کہنے لگے اس بات کو ہرگز اپنے کالم میں نہ لکھنا کیونکہ اس سے علماء کی ہوا خیزی ہوگی اور علماء چونکہ ہمارے معاشرے میں دین کے نمائندے ہیں لہٰذا اس سے دین کی بھی ہوا خیزی ہوگی۔

اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے ایک سالہ قیام کے دوران ہی مجھے یہ آئیڈیا سوجھا کہ اسلامی مشاورتی کونسل چونکہ غیر فعال ہے لہٰذا کیوں نہ پرائیویٹ سطح پر مختلف مسالک کے علماء کرام اور اسلامی سکالرز پر مشتمل ایک علمی مجلس ایسی بنائی جائے جو معاشرے کو درپیش مسائل میں اسلامی حوالے سے غور کر کے اپنی سفارشات عوام اور حکومت کے سامنے لائے تاکہ اگر وہ چاہیں تو اس سے استفادہ کر لیں۔ میں یونیورسٹی میں نیا اور ناتجربہ کار تھا اور غازی صاحب کا جونیئر تھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے اس معاملے میں میری بھرپور حوصلہ افزائی کی اور اس منصوبے کو آگے بڑھانے میں میرے ساتھ مل کر کام کیا۔ مجوزہ ادارے کی تشکیل کے لئے بلائے گئے ہر اجلاس میں پرجوش طریقے سے شریک ہوتے بلکہ بہاول پور یونیورسٹی سے آئے

ہوئے اپنے برادر نسبتی ڈاکٹر یوسف فاروقی صاحب کو بھی اپنے ساتھ لاتے۔ (اس معاملے میں معروف اہل حدیث عالم مولانا عبدالغفار حسن مرحوم نے بھی ہمارا بھرپور ساتھ دیا) لیکن بُرا ہو 'معاصرت' کا کہ یونیورسٹی کی ایک سینئر اسلامی شخصیت نے اس کام میں اس طرح مداخلت کی کہ اسے کامیاب نہ ہونے دیا۔ اللہ ان کو بھی معاف فرمائے اور ہمیں بھی۔ (ہماری اس دیرینہ خواہش کی مظہر 'مجلس فکر ونظر' تھی جو ہم نے جامعہ پنجاب کے دوران قیام تشکیل دی اور اب 'ملی مجلس شرعی' ہے جو سارے دینی مکاتب فکر کے علماء کرام کا متحدہ پلیٹ فارم ہے)۔

غازی صاحب مرحوم کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ دینی فکر وعمل میں معتدل مزاج تھے۔ نہ تجمد کے قائل تھے اور نہ تجدد کے۔ یوں ہمارے معاشرے میں جو اصحاب وطبقات تجمد کی طرف میلان رکھتے ہیں وہ ان کے ناقد تھے اور جو اصحاب تجدد کی طرف میلان رکھتے ہیں وہ بھی انہیں ناپسند کرتے تھے لیکن ہمارے نزدیک ان کا معتدل رویہ قابل تعریف تھا بلکہ وہ جدید و قدیم کے امتزاج کا بہترین نمونہ تھے۔ کراچی یونیورسٹی میں ہمارے دوست خالد جامعی صاحب جو جدیدیت کے خلاف تیغ برّاں ہیں وہ غازی صاحب کا شمار بھی تجدد زدہ لوگوں میں کرتے ہیں۔ جب انہوں نے اس کا اظہار اپنے جریدے 'ساحل' میں کیا اور غازی صاحب کے خلاف لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ہم نے دوستانہ اختلاف کرتے ہوئے انہیں مشورہ دیا کہ وہ ایسا نہ کریں کیونکہ ہماری رائے میں غازی صاحب اس عتاب کے مستحق نہ تھے چنانچہ انہوں نے وقتی طور پر ہماری درخواست قبول فرمالی (گو جامعی صاحب اپنے نظریات میں بہت پختہ ہیں اور اپنی رائے پر اب بھی قائم ہیں)۔

ہمارے نزدیک فکری رویوں کے بڑے بڑے دائرے ہیں اور ہر دائرے کا ایک سنٹر ہوتا ہے اور جو لوگ اس سنٹر سے تھوڑا دائیں یا بائیں ہوتے ہیں ان کا شمار بھی اسی دائرے میں ہونا چاہئے خواہ وہ اس دائرے کی مین اسٹریم سے تھوڑے دور اور مختلف ہی کیوں نہ ہوں مثلاً متجددین کے دائرے میں برصغیر کی دینی روایت کے لحاظ سے سرسید، چکڑالوی، امرتسری، غلام احمد پرویز، جاوید احمد غامدی صاحب۔۔۔ وغیرہ ہیں لیکن اقبال، مولانا مودودیؒ اور ڈاکٹر غازی

صاحب کو اس دائرے میں شامل کرنا، ہمارے نزدیک، زیادتی ہے۔ ہماری غازی صاحب سے اس موضوع پر کئی دفعہ بات ہوئی لیکن انہوں نے کبھی اس طبقہ متجددین کے حق میں کلمۂ خیر نہیں کہا لیکن مغرب کے حوالے سے جو ان کی اپروچ تھی، ضروری نہیں ہے اس سے خالد جامعی صاحب جیسے اصحاب بھی مطمئن ہوں لیکن اس کے باوجود انہیں مغرب زدہ نہیں کہا جاسکتا۔ اسی طرح بلاشبہ وہ حلقہ دیوبند کے قریب تھے (بلکہ مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کے خاندان میں سے تھے) لیکن ہمارے علم اور مشاہدے کی حد تک وہ اس میں بھی معتدل مزاج تھے اور ہرگز متشدد نہ تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ بریلوی بھائیوں کو ان کا یہ اعتدال نہ بھاتا ہو اور وہ انہیں حکومت میں ایک دیوبندی وزیر سمجھ کر ان کی مخالفت کرتے ہوں۔

وزارت سے یاد آیا کہ بعض لوگ ان پر اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے جنرل پرویز مشرف کی حکومت میں وزیر مذہبی امور کی ذمہ داری کیوں قبول کی؟ جس زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا ہم لاہور میں تھے۔ ایک دفعہ کسی مظلوم کی مدد کے سلسلے میں ان کے ہاں حاضر ہوا تو انہوں نے بھرپور معاونت کی لیکن ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ حکومت میں خاصے غیر مطمئن تھے اور اپنے آپ کو misfit محسوس کرتے تھے اور اسے چھوڑنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن اب انہیں کمبل نہیں چھوڑتا تھا۔ ناچار انہوں نے پبلک بیان دے دیا کہ وہ فلاں مہینے وزارت چھوڑ دیں گے اور پھر چھوڑ بھی دی۔ یار لوگ کہیں گے کہ قبول ہی کیوں کی تھی؟ ہم سمجھتے ہیں کہ غازی صاحب اپنی اہلیت کے بل پر بڑے سے بڑے منصب کے اہل تھے لیکن ہمارے معاشرے کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ ہر اس شخص کو جو داڑھی رکھتا، ٹوپی پہنتا اور عربی اسلامیات میں مہارت رکھتا ہو، اسے مولوی سمجھتا اور بطور مولوی ٹریٹ کرتا ہے (خواہ وہ روایتی 'مولویت' سے دور ہی کیوں نہ ہو) اس طرح باصلاحیت لوگوں کو ان کی صلاحیتوں کے اظہار و استعمال کے موزوں مواقع میسر نہیں آتے اور ان میں ردعمل کی ایک نفسیات پیدا ہو جاتی ہے اور پھر جب انہیں کوئی موقع ملے تو وہ اسے قبول کر لیتے ہیں خواہ اس کی 'موزونیت' کچھ مشکوک ہی کیوں نہ ہو۔ ویسے بھی معتدل مزاج ہونے کی وجہ سے غازی صاحب اپنی افتاد

طبع میں اینٹی اسٹیبلشمنٹ آدمی نہ تھے۔ پھر ملت کا درد رکھنے اور معاشرے کے دینی مستقبل کے حوالے سے سوچنے والے شخص کی حیثیت سے ان کے ذہن میں کئی منصوبے تھے، ان کا خیال ہوگا کہ وہ اقتدار میں آکر ان منصوبوں میں سے بعض پر عمل کرسکیں گے لیکن غالباً حکومت میں جانے کے بعد جلد ہی انہیں اندازہ ہوگیا کہ ہمارا سیاسی نظام اور بیوروکریسی کا نظام نمک کی وہ کان ہے جس میں جانے والا خود نمک ہوجاتا ہے اور اس کا اپنا میٹھا پانی بھی کھاری ہونے لگتا ہے چہ جائیکہ وہ وہاں کے پانی کو میٹھا کرنے کے کسی منصوبے پر عمل کرے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ وزارت میں زیادہ دیر نہ ٹک سکے اور باہر آگئے۔ غازی صاحب کے وزارت قبول کرنے کے حوالے سے ہم نے جو کچھ ابھی کہا وہ ہمارا ذاتی تجزیہ ہے جس سے اختلاف کا حق ہر صاحب فکر ونظر کو ہے۔

پھر ہم نے اخبارات میں پڑھا کہ وہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے صدر ہوگئے ہیں۔ یہ ان کی محبت اور بڑا پن تھا کہ انہوں نے خود فون کرکے مجھے کہا کہ میرے پاس اسلام آباد آجاؤ یہاں کام کے بڑے مواقع ہیں اور ترقی کے بھی۔ ایک یونیورسٹی کے زیرک سربراہ کی حیثیت سے انہیں خوب اندازہ تھا کہ یونیورسٹی بڑی بڑی بلڈنگوں کا نام نہیں ہوتی بلکہ جتنے بڑے اہل علم اس سے وابستہ ہوں یہ اتنی ہی بڑی ہوتی ہے اور جب اس میں کام کرنے والے بونے ہوں تو یونیورسٹی کی عظیم الشان بلڈنگیں اسے عظمت نہیں بخش سکتیں۔ چنانچہ جب وہ یونیورسٹی کے صدر نہ رہے اور ان کا واسطہ بونوں سے پڑا تو وہ خاموشی سے یونیورسٹی چھوڑ گئے اور جامعہ قطر چلے گئے کیونکہ وہ لڑنے والے آدمی تھے ہی نہیں۔

ہاں! تو ہم عرض کر رہے تھے کہ غازی صاحب نے ہمیں اسلام آباد یونیورسٹی آنے کی دعوت دی لیکن ہم وہ راجپوت ہیں جن کا راج نہیں رہا لیکن بھوت باقی رہ گیا ہے چنانچہ ہم نے تحریک اصلاح تعلیم اور نئے رول ماڈل تعلیمی اداروں کے قیام کے محاذ سے نہ ہٹنے کی ضد میں ان سے معذرت کرلی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم کوئی قلعہ فتح نہیں کرسکے لیکن ہمارے نزدیک وفاداری بشرط استواری ہی اصل ایماں ہے۔ چنانچہ ہم اپنی ہٹ پہ قائم ہیں کہ غازی نہ بن

سکے، شہید تو ہوں گے، اور شہید بھی نہ ہوئے تو شہادت کی تمنا تو ہے، ہم معرکۂ کارزار میں تو ہیں، ہاتھ پاؤں تو چلا رہے ہیں ـــــ اور ممکن ہے ہمارے رب کو ہماری یہی ادا پسند آجائے۔

جب ہم نے پنجاب یونیورسٹی جوائن کی تو سرکاری ضرورت کے تحت ایک سال ہم نے جو غازی صاحب کے ساتھ اسلامی یونیورسٹی میں کام کیا تھا اس کا تجربے کا سرٹیفکیٹ بھجوانے کی ان سے درخواست کی۔ انہوں نے سرکاری خط بھجوانے کے ساتھ جو ذاتی خط مجھے لکھا وہ پڑھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ میں مرجاؤں تو یہ خط میری قبر میں رکھ دینا کہ یہ ایک مسلمان کی دوسرے کے بارے میں بے ریا شہادت ہے، شائد اللہ اسے قبول فرمالے۔ **اللهم اغفرله وادخله مدخلاً كريما وارزقه جنة الفردوس۔**

ڈاکٹر محمد امین

ایک رول ماڈل اسلامی یونیورسٹی کا خاکہ

تحریک اصلاح تعلیم شروع دن سے اس مؤقف کی حامی رہی ہے کہ موجودہ نظام تعلیم کی اصلاح کا کام اس وقت تک مؤثر نہیں ہوسکتا جب تک علی گڑھ اور دیوبند کی جگہ ایک تیسرا رول ماڈل تعلیمی ادارہ (سکول و مدرسہ تا یونیورسٹی) قائم کر کے نہ دکھا دیا جائے جو سابقہ رول ماڈلز کی خامیوں سے پاک ہو، ان کی خوبیوں کا جامع ہو اور اسلامی ہونے کے ساتھ عصری ضرورتوں کو بھی پورا کرتا ہو۔

اس ضمن میں ہم نے پچھلے چند سالوں میں اپنی صلاحیت کے مطابق غور و فکر کر کے ''ایک نئے رول ماڈل تعلیمی نظام کا خاکہ'' ، ''ایک رول ماڈل اسلامی سکول کا خاکہ'' ، ''رول ماڈل دینی تعلیم کا خاکہ'' اور ''ایک رول ماڈل اسلامی یونیورسٹی کا خاکہ'' کے عناوین کے تحت اپنے خیالات کو منضبط کیا ہے اور یہ مضامین ہماری کتاب ''ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل'' میں موجود ہیں جو محدود تعداد میں تعلیمی حلقوں تک پہنچی ہے۔ البرہان کے اجراء کے بعد ہم نے محسوس کیا کہ اپنے قارئین تک اپنے افکار پہنچائیں چنانچہ پچھلے شمارے میں ''ایک رول ماڈل اسلامی سکول کا خاکہ'' اور ''رول ماڈل دینی تعلیم'' پر مضامین شائع ہو چکے ہیں اور اس دفعہ ''ایک رول ماڈل اسلامی یونیورسٹی کا خاکہ'' آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ یونیورسٹی کی پوری اسکیم کا محض ابتدائیہ ہے جس میں اس مجوزہ یونیورسٹی کی نوعیت اور اس کے اہم خصائص کا تذکرہ آ گیا ہے۔ ہم اہل علم کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس خاکے پر تنقید کر کے اسے بہتر بنانے میں ہماری مدد کریں۔

نوعیت

یہ ایک نان کمرشل اور فلاحی اسلامی یونیورسٹی ہوگی۔ تعلیم کے اسلامی تصور کی رو سے تعلیم کے تین شعبے ہوتے ہیں:

۱۔ تدریس

۲۔ تحقیق؛ اور

۳۔ تربیت

تدریس و تعلیم میں صرف دینی تعلیم ہی شامل نہیں بلکہ وہ سارے معاصر علوم اور مہارتیں بھی شامل ہیں جن کی مسلم معاشرے کو ضرورت ہو لہٰذا اس مجوزہ یونیورسٹی میں اگرچہ دینی تعلیم

بنیادی اہمیت کی حامل ہوگی تاہم اس میں عمرانی علوم پر بھی ترکیز ہوگی اور بعض سائنس علوم بھی پڑھائے جائیں گے، اس فرق کے ساتھ کہ دینی تعلیم جدید تناظر میں اس طرح دی جائے گی کہ وہ عصری ضرورتوں کو پورا کر سکے اور عصری علوم اسلامی تناظر میں پڑھائے جائیں گے۔ نیز یہاں اعلیٰ درجے کی تحقیق کا انتظام ہوگا اور طلبہ کی تعمیر سیرت و کردار پر بھرپور توجہ دی جائے گی جو تعلیم کی اصل غایت ہے۔ اس کے نان کمرشل اور فلاحی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس یونیورسٹی کے محرکین کے پیش نظر دولت کمانا نہیں بلکہ رضائے الٰہی کی خاطر دین، معاشرے اور ملت کی خدمت کرنا ہے لہٰذا طلبہ سے فیسیں اتنی ہی وصول کی جائیں گی جن سے یونیورسٹی کے اخراجات پورے ہو سکیں۔

ضرورت

۱۔ پاکستان میں پچھلے چند برسوں میں کئی ایک پرائیویٹ یونیورسٹیاں قائم ہوئی ہیں لیکن عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ یہ یونیورسٹیاں صرف وہ مضامین پڑھاتی ہیں جن میں آمدنی زیادہ سے زیادہ ہو مثلاً کمپیوٹر سائنس اور بزنس مینجمنٹ وغیرہ لیکن دوسرے بہت سے شعبوں کی تعلیم جو ہمارے معاشرے کے لئے مفید اور ضروری ہے مثلاً دینی تعلیم، عمرانی علوم کی تعلیم اور خود سائنسی مضامین کی تعلیم، یہ اس کی طرف توجہ نہیں دیتیں۔ اس لئے ایک ایسی یونیورسٹی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو اس کمرشل ازم سے ہٹ کر صرف فلاحی بنیادوں پر معاشرے کی تعمیر و ترقی کے لئے نہ صرف دینی علوم کی تعلیم دے بلکہ عمرانی اور سائنسی علوم کی تدریس کا بھی انتظام کرے۔

۲۔ پاکستان میں دینی تعلیم اس وقت زیادہ تر پرائیویٹ سیکٹر میں دینی مدارس کی صورت میں دی جارہی ہے لیکن بدقسمتی سے دینی مدارس کے بارے میں دنیا میں یہ عمومی تاثر قائم ہوگیا ہے کہ یہ مدارس جہاد اور قدامت پرستی اور دہشت گردی کے گڑھ ہیں۔

دنیا کے یہ تاثر قائم کرنے کے تین بڑے سبب ہیں:

- دینی مدارس کا اپنے ہاں جدید علوم نہ پڑھانا

۔ مستقبل میں بھی جدید علوم پڑھانے سے انکار کرنا

۔ دینی مدارس کے فارغ التحصیل بعض افغانی طلبہ کا جہاد افغانستان میں شریک ہونا، وہاں حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوجانا اور وہ حکومت اس طرح چلانا کہ وہ جدید دنیا کے لئے قابل قبول نہ ہو۔

ان وجوہ سے نہ صرف دینی مدارس کے بارے میں دنیا میں خراب تاثر ابھرا بلکہ خود اسلام کے بارے میں یہ تاثر عام ہوا کہ یہ تنگ نظری اور دہشت گردی کا دین ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام تو اعتدال، رواداری اور روشن خیالی کا دین ہے اور وہ علم، امن، اخوت اور جدت کا علم بردار ہے۔ لہٰذا دینی مدارس اور دینی تعلیم کے حوالے سے قائم ہوجانے والے اس تاثر کو ختم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پاکستان میں پرائیویٹ سیکٹر میں دینی تعلیم کے ایسے ادارے قائم کیے جائیں جن میں دینی تعلیم کے ساتھ جدید عصری علوم کی تعلیم بھی دی جائے اور دینی تعلیم بھی اس طرح دی جائے کہ وہ جدید اذہان کے لئے قابل استفادہ ہو۔

۳۔ پاکستان میں اس وقت دینی علوم کی صرف ایک یونیورسٹی ہے جو اسلام آباد میں ہے لیکن یہ یونیورسٹی بین الاقوامی نوعیت کی ہے اور اس کے طلبہ و اساتذہ کی ایک کثیر تعداد دیگر مسلم ممالک سے آتی ہے لہٰذا ایک خالص پاکستانی اسلامی یونیورسٹی کی ضرورت اپنی جگہ ہے۔

۴۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ پاکستان کی ۸۷ فیصد آبادی مسلمان ہے۔ یہ مسلمان، روایتی طور پر پُر جوش مسلمان ہیں اور نہ صرف خود اسلامی تعلیمات پر عمل کرنا چاہتے ہیں بلکہ یہ خواہش بھی رکھتے ہیں کہ ان کی اولاد بھی اچھی مسلمان ہو اور اسلامی اصولوں سے وابستہ ہو اور ساتھ ہی دنیا میں بھی ترقی کرے۔ بدقسمتی سے دینی مدارس اس کے لئے موزوں ماحول فراہم نہیں کرتے اس لئے اکثر کھاتے پیتے اور پڑھے لکھے لوگ اپنے بچوں کو دینی مدارس میں نہیں بھجواتے اس کے باوجود کہ وہ اپنی اولاد کو دینی تعلیم دلوانا چاہتے ہیں۔ اس طرح پاکستانی معاشرے میں ایک تعلیمی اور تہذیبی خلاء موجود ہے جسے پُر کیا جانا ضروری ہے۔

۵۔ ہمارے ملک میں ایک بھی دینی ادارہ ایسا نہیں ہے جو ایسے علماء و سکالرز پیدا کر رہا ہو جو غیر مسلم دنیا بالخصوص مغرب کو اس کی زبان میں اور اس کے ماحول کے تناظر میں اسلام پیش کر سکیں اور اسلام کی حقانیت ان پر واضح کر سکیں۔ اس کے برعکس جو روایتی علماء وہاں جاتے ہیں وہ وہاں جا کر اپنے اپنے مسلک کا پرچار کرتے ہیں اور پاکستانی اسٹائل کے دینی مدارس وہاں قائم کرنا دین کی بہترین خدمت سمجھتے ہیں۔ اس لئے اس امر کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ پاکستان میں دینی تعلیم کا کم از کم ایک مرکز تو ایسا ہونا چاہئے جہاں سے فارغ التحصیل ہونے والے علماء و سکالرز یہ صلاحیت رکھتے ہوں کہ وہ اہل مغرب کو دین اسلام ان کی زبان میں اور ان کے ماحول کے تناظر میں سمجھا سکیں تا کہ اسلام کی اعلیٰ وارفع تعلیمات ان کے ذہن نشین ہو سکیں اور ان کے اذہان وقلوب کو مسخر کر سکیں۔

۶۔ پاکستان کو معتدل ذہن رکھنے والے ایسے روشن خیال علماء و سکالرز کی ضرورت ہے جو ایک طرف مسالک سے بالاتر رہتے ہوئے دینی علوم میں رسوخ رکھتے ہوں تو دوسری طرف جدید علوم اور تقاضوں سے بھی بہت اچھی طرح باخبر ہوں تا کہ معتدل اور روشن خیال مذہبی رجحانات رکھنے والا معاشرہ وجود میں آ سکے۔ معاشرے کی یہ ضرورت اس وقت کہیں سے پوری نہیں ہو رہی اس لئے ایک ایسے علمی اور تعلیمی مرکز کی ضرورت کا احساس ابھرتا ہے جو اس خلا کو پُر کر سکے۔

۷۔ اسلام اور نظریۂ پاکستان ہی مملکت خداداد پاکستان کے وجود میں آنے کا سبب ہے اور یہی اس کے بقاء واستحکام کا ضامن ہے اس لئے پاکستان کی بقاء سلامتی، استحکام اور خوشحالی کے لئے ضروری ہے کہ اس کی نظریاتی بنیادوں کو مستحکم کیا جائے تا کہ اس کی جغرافیائی بنیادیں بھی مستحکم ہوں اور ہماری آئندہ نسلیں اسلامی اور ملی تفاخر کے ساتھ قوموں کی برادری میں آگے بڑھ سکیں۔

۸۔ پچھلے پچاس سال میں پاکستان میں قائم ہونے والی حکومتوں نے سارے شعبہ ہائے زندگی خصوصاً تعلیم کو اسلامی تناظر میں ڈھالنے میں جس تساہل سے کام لیا ہے اور بین الاقوامی طور پر تعلیم کی سیکولرائزیشن اور گلوبلائزیشن کی اس وقت جو فضاء ہے اس میں حکومت پاکستان

سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ کوئی اسلامی یونیورسٹی قائم کرے گی۔ دوسری طرف برصغیر کے مسلمان پرائیویٹ سیکٹر میں اعلیٰ تعلیمی ادارے قائم کرنے کی شاندار روایت رکھتے ہیں اور انہوں نے نہ صرف ماضی میں دیوبند، علی گڑھ، ندوہ، جامعہ ملیہ، انجمن حمایت اسلام اور کئی دیگر تعلیمی ادارے قائم کیے بلکہ پاکستان بننے کے بعد بھی لاہور (جامعہ اشرفیہ، جامعہ نعیمیہ وغیرہ)، کراچی (دارالعلوم ملیر و بنوری ٹاؤن)، ملتان بھیرہ، اکوڑہ خٹک وغیرہ میں بڑے دینی مدارس قائم کیے بلکہ آج بھی ملک بھر میں ہزاروں دینی مدارس کام کررہے ہیں جن پر کروڑوں روپے ماہانہ خرچ اٹھ رہا ہے۔ لہٰذا یہ توقع بے جا نہیں کہ پرائیویٹ سیکٹر کو متحرک کر کے ایک جدید اسلامی یونیورسٹی بنائی اور چلائی جاسکتی ہے۔

۹۔ پاکستان میں موجودہ تعلیمی ثنویت کا ایک بڑا سبب اور مظہر دیوبند اور علی گڑھ کا رول ماڈل تعلیمی اداروں کی شکل اختیار کر جانا ہے لہٰذا اب جو کوئی بھی مدرسہ کھولنا چاہتا ہے وہ بنیادی طور پر دیوبند کی طرز کا درس نظامی پر مبنی مدرسہ کھولتا ہے اور اگر کوئی جدید سکول، کالج اور یونیورسٹی کھولنا چاہتا ہے تو وہ علی گڑھ کے قائم کردہ منہاج کو اختیار کرنے پر مجبور ہے کیونکہ دیوبند اور علی گڑھ کے علاوہ کوئی تیسرا تعلیمی رول ماڈل ہمارے سامنے موجود ہی نہیں (ندوہ اور جامعہ ملیہ نے تیسرا رول ماڈل بننے کی کوشش کی لیکن بوجوہ ناکام ہوگئے)۔ لہٰذا اب تعلیم کی بہتری کی یہی صورت ممکن ہے کہ ایک تیسرا رول ماڈل تعلیمی ادارہ قائم کیا جائے جو دیوبند اور علی گڑھ کی خوبیوں کا جامع ہو، ان کی کمزوریوں سے پاک ہو اور قدیم و جدید کا حسین امتزاج ہو تاکہ مسلمانوں کی دینی و دنیاوی تعلیمی ضروریات دونوں ایک ہی جگہ سے پوری ہوسکیں۔

۱۰۔ یہ یونیورسٹی ایسا ماحول پیدا کرے گی کہ مغرب کی ملحدانہ فکر و تہذیب سے مرعوب و متاثر ہوئے بغیر اسلامی تناظر میں علوم اور تعلیم و تربیت کی تشکیل نو ہوسکے اور ایسے افراد تیار ہوں سکیں جنہیں اپنے ماضی پر فخر ہو اور وہ اسلام کے غلبے اور مسلم نشأۃ ثانیہ میں قائدانہ کردار ادا کرسکیں اور مسلم معاشرے کی جدید مسائل کے حل میں علمی و فکری رہنمائی کرسکیں۔

ان حالات میں اس امر کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ پاکستان میں پرائیویٹ سیکٹر میں ایک نان کمرشل اسلامی فلاحی یونیورسٹی قائم کی جائے جو مذکورہ بالا خلا کو پُر کرے اور ایسے افراد تیار کرے جو پاکستانی معاشرے کو اعتدال اور ترقی کے راستے پر اس طرح ڈال سکیں کہ وہ اپنے دین سے بھی وابستہ ہوں اور اپنے اعلیٰ علمی اور تہذیبی ورثے پر فخر بھی ان کا سرمایۂ حیات ہو۔

اہداف و مقاصد

سطور بالا سے واضح ہوگیا کہ اس وقت پاکستان میں پرائیویٹ سیکٹر اور خصوصاً لاہور میں ایک نان کمرشل جدید اسلامی اور فلاحی یونیورسٹی قائم کرنے کی شدید ضرورت ہے جس کے اہداف و مقاصد یہ ہوں:

۱۔ ایسے علماء و سکالرز کی تیاری جو پاکستانی معاشرے اور خصوصاً اس کی نسل نو کو اسلام کی ایک متوازن تعبیر کے ساتھ وابستہ رکھ سکیں اور جو غیر مسلم افراد اور قوموں کے سامنے اسلام کی ایک مؤثر، جاندار اور دل آویز تصویر پیش کر سکیں۔

۲۔ ایسے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد اور ماہرین تیار کرنا جو ہر شعبۂ زندگی میں پاکستان کی ترقی و خوشحالی میں اہم کردار ادا کر سکیں۔

۳۔ جو تحقیق اور سیرت و کردار کی اعلیٰ روایات قائم کر کے مسلم معاشرے کو درپیش چیلنجز سے نمٹنے اور مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

۴۔ دینی مدارس کے موجودہ نظام تعلیم کی اصلاح کے لئے اقدامات کرنا۔

۵۔ جدید تعلیمی اداروں کے کردار کی، ملک و ملت کی اسلامی ضرورتوں کے تناظر میں، تشکیل نو میں مدد دینا۔

ترجیحات اور طریق کار

مجوزہ یونیورسٹی مذکورہ اہداف و مقاصد کے حصول کے لئے جو طریق کار اختیار کرے گی

اس کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

۱۔ وہ دینی تعلیم اس طرح دے گی کہ جدید علوم سے آگاہی نصابِ تعلیم کا ایک حصہ ہوگی۔

۲۔ یونیورسٹی میں عمرانی اور سائنسی علوم ضروری دینی تعلیم کے ساتھ اور اسلامی تناظر میں اس طرح پڑھائے جائیں گے کہ طلبہ ان شعبوں میں اسلامی نقطۂ نظر اور مسلم پیش رفت دونوں سے بخوبی واقف ہوں۔

۳۔ مندرجہ بالا مقاصد کے حصول کے لئے Double Major کا طریقہ اپنایا جائے گا، مطلب یہ کہ ہر طالب علم کا ایک بنیادی تخصص (Main Major) ہوگا اور ایک ثانوی تخصص (Sub Major)۔

دینی تعلیم کے متخصصین کے لئے جدید علوم کا تعارفی مطالعہ ثانوی تخصص ہوگا جس میں پاس ہونا ان کے لئے ضروری ہوگا۔ اسی طرح عمرانی اور سائنسی علوم کے طلبہ کے لئے دینی علوم کی تدریس ثانوی تخصص ہوگا جس میں پاس ہونا اس کے لئے لازمی ہوگا۔

۴۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ تزکیہ و تربیت پر بھرپور توجہ دی جائے گی اور طلبہ کی سیرت و کردار کے لئے خصوصی کوششیں کی جائیں گی تا کہ طلبہ کے پاس محض علم ہی نہ ہو بلکہ وہ اعلیٰ سیرت و کردار کے مالک بھی ہوں۔

۵۔ ہمارے ملک میں عموماً یہ طریقہ مروج ہے کہ گریجوایشن تک عمومی مضامین پڑھائے جاتے ہیں اور پھر اگلے دو سال میں کسی ایک خاص مضمون میں تخصص کروایا جاتا ہے۔ اس طریقے سے طلبہ کی پیشہ ورانہ مہارت خام رہ جاتی ہے۔ بہتر طریقہ وہی ہے جو صدر اسلام میں مروج تھا اور ہمارے ہاں میڈیکل اور انجنیئر نگ میں اپنایا جاتا ہے کہ کسی علم یا فن میں مہارت کے لئے کم از کم پانچ چھ سال تک یکسوئی سے محنت کی جائے۔ چنانچہ مجوزہ یونیورسٹی میں ہر تخصص چھ سال کا ہوگا یعنی طالب علم جس مضمون میں ایم اے کرنا چاہے گا وہ اسے میٹرک کے بعد سے مسلسل چھ سال تک پڑھایا جائے گا۔

۶۔ مجوزہ یونیورسٹی کو ایک اعلیٰ علمی اور فکری مرکز بنانے کے لئے تحقیق پر خصوصی توجہ دی جائے گی۔ ایک وسیع لائبریری قائم کی جائے گی اور دوسری تحقیقی سہولتیں مہیا کی جائیں گی اور ایم فل اور پی ایچ ڈی پروگرام شروع کیے جائیں گے۔

۷۔ اگرچہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی اہمیت مسلمہ ہے اور مجوزہ یونیورسٹی میں بھی ان سے صرف نظر نہیں کیا جائے گا لیکن اس حقیقت کے پیش نظر کہ دینی اور عمرانی علوم ہی دراصل وہ علوم ہیں جو انسان سازی کرتے ہیں اور معاشرے کو وہ بنیادی انسانی لوازمہ مہیا کرتے ہیں جو ہر قسم کی ترقی کی بنیاد فراہم کرتا ہے، اس لئے اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ مجوزہ یونیورسٹی کی ترجیحات میں عمرانی علوم کی تدریس سر فہرست ہوگی خصوصاً تربیت اساتذہ، ابلاغ عامہ، معاشیات اور قانون وغیرہ کی تدریس و تحقیق تاکہ معاشرے کی تعمیر و ترقی کے لئے موزوں افراد کار کی کھیپ میسر آسکے۔ یاد رہے کہ پرائیویٹ سیکٹر میں بننے والی نئی یونیورسٹیوں میں عام طور پر عمرانی علوم سے صرف نظر کیا جاتا ہے کیونکہ ان شعبوں کی تدریس سے زیادہ آمدنی حاصل نہیں ہو پاتی۔ مجوزہ اسلامی یونیورسٹی کے پیش نظر چونکہ نفع اندوزی نہیں اس لئے یونیورسٹی ان شعبوں کو خصوصی اہمیت دے گی۔

۸۔ مجوزہ یونیورسٹی ایک نان کمرشل اور فلاحی ادارہ ہوگی جس میں طلبہ سے محض اتنی فیسیں وصول کی جائیں گی جن سے ادارے کے اخراجات پورے ہوسکیں۔ گویا اس ادارے کو نہ نفع نہ نقصان (No-profit No-loss) کی بنیاد پر چلایا جائے گا۔

۹۔ مجوزہ یونیورسٹی ہر قسم کے دینی و سیاسی مسلک اور تحزب سے بالا تر رہتے ہوئے خالصتاً تعلیم، تربیت اور تحقیق کے شعبوں میں خدمات انجام دے گی۔

۱۰۔ مجوزہ یونیورسٹی میں حصول کمال یعنی کوالٹی اور ایکسی لینس کو بنیادی اہمیت دی جائے گی تاکہ قوم کے لئے بہترین افراد تیار کئے جاسکیں جو ہر شعبۂ زندگی میں نمایاں خدمات انجام دے سکیں۔

۱۱۔ مجوزہ یونیورسٹی اگرچہ اعلیٰ تعلیم کا ادارہ ہوگی تاہم یہ یقینی بنانے کے لئے کہ اسے پہلے مرحلے پر ہی موزوں طلبہ میسر آسکیں وہ ایک ماڈل اسکول بھی قائم کرے گی اور یہ کوشش بھی کرے گی کہ اس طرح کے بہت سے ماڈل اسکول قائم ہوجائیں تاکہ اسے بہترین طلبہ ابتداء ہی سے میسر آنے لگیں۔

۱۲۔ مجوزہ یونیورسٹی دینی مدارس کی اصلاح کے لئے ایک بھرپور پروگرام وضع کرے گی۔ وہ مدارس کے اساتذہ کو تربیت دے گی، ان کے فارغ التحصیل طلبہ کی ان مضامین میں تعلیم و تربیت کا اہتمام کرے گی جو وہ مدارس میں نہیں پڑھ سکے۔ مجوزہ جامعہ دینی مدارس کو اصلاح نصاب میں مدد دے گی اور جو مدارس اس کے نصاب کو قبول کرلیں گے، ان کے امتحان لے کر ان کو منظور شدہ یونیورسٹی ڈگری دے گی۔ اسی طرح وہ مدارس کے طلبہ کو اسلامی علوم کے علاوہ مختلف سماجی علوم میں مناسب تیاری کے بعد ایم فل اور پی ایچ ڈی کی تعلیم دے گی۔ مقصود یہ ہے کہ مدارس کے طلبہ مرکزی معاشرتی دھارے(mainstream society) کے قریب آجائیں۔ اس سے معاشرے میں ہم آہنگی پیدا ہوگی اور موجودہ تعلیمی ثنویت نے جس فکری وانتشار اور دیگر مسائل کو جنم دیا ہے، ان کی شدت بتدریج کم ہوتی چلی جائے۔

۱۳۔ مجوزہ جامعہ کے تعلیمی منہج کی تکمیل تین مراحل میں ہوگی: پہلے مرحلے میں اسلامی علوم اور بعض عمرانی علوم کی تدریس، دوسرے مرحلے میں اسلامی اور عمرانی علوم کی توسیع اور سکول سسٹم کا قیام اور تیسرے مرحلے میں سائنس وٹیکنالوجی کی تعلیم۔

۱۴۔ اسی طرح پہلے مرحلے میں طلبہ کی تربیت کا اہتمام کیا جائے گا اور دوسرے مرحلے میں مجوزہ پروگراموں میں طالبات کی شمولیت کو یقینی بنایا جائے گا۔

۱۵۔ مجوزہ جامعہ اپنے Double Major کے تصور کے ساتھ اور اپنی دیگر خصوصیات کی بناء پر پاکستان بھر بلکہ ملت اسلامیہ کی ایک منفرد یونیورسٹی ہوگی جس کے اپنے منفرد نصابات ہوں گے اور انہی کے مطابق اساتذہ کی فراہمی وتربیت کا انتظام کیا جائے گا۔ یہ یونیورسٹی

نظام تعلیم سے ثنویت کے خاتمے کے سلسلے میں ایک نئے رجحان کی نمائندہ ہوگی۔

۱۶۔ مجوزہ یونیورسٹی نہ صرف نسل نو کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرے گی بلکہ یہ ان لوگوں کی بھی خدمت کرے گی جو رسمی تعلیم سے فارغ ہو چکے ہوں۔ جامعہ ایسے لوگوں کے لئے مقامی مراکز اور فاصلاتی نظام تعلیم کے ذریعے ان کے علم میں اضافے اور ان کی تربیت کی سعی کرے گی۔

۱۷۔ مجوزہ جامعہ اسلامی اور عمرانی علوم کے ساتھ سائنسی علوم اور جدید ٹیکنالوجی میں نہ صرف اعلیٰ تعلیم کا انتظام کرے گی بلکہ اس کی یہ سعی بھی ہوگی کہ اس کا ہر گریجوایٹ خواہ وہ اسلامی علوم کی تعلیم حاصل کر رہا ہو یا عصری علوم کی، جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی سے استفادہ کر سکے تاکہ وہ جدید ماحول میں عصری تقاضوں کو پورا کر سکے، عصری چیلنجز سے عہدہ برآمد ہونے کے قابل ہو اور معاشرے کی رہنمائی کر سکے۔

۱۸۔ یہ یونیورسٹی چونکہ فقہی مسالک سے بالاتر ہوکر کام کرے گی اس لئے معاشرے میں یک جہتی اور دینی اخوت میں اضافے کا سبب بنے گی اور فرقہ واریت و مسلک پرستی کے رجحانات کی حوصلہ شکنی کا سبب بنے گی۔

۱۹۔ یہ یونیورسٹی اتحاد امت کا مظہر اور اس کی نقیب ہوگی۔

۲۰۔ یہ جامعہ ان شعبوں میں تخلیقی تحقیق کا اہتمام کرے گی جن پر مسلم معاشرے میں بہت کم توجہ دی گئی ہے لیکن وہ انتہائی ضروری ہیں مثلاً ''مرکز تحقیق برائے مسلم نشاۃ ثانیہ''، ''مرکز مطالعۂ مغرب''، ''عمرانی علوم کی اسلامی تشکیل نو کا تحقیقی ادارہ''۔۔۔وغیرہ۔

ڈاکٹر محمد امین

میڈیا۔ رہنما اصول اور ضابطۂ اخلاق

قرآن وسنت کی روشنی میں

ابلاغ کا فن ہمیشہ سے انسانی معاشرے میں اہمیت کا حامل اور اس کا مؤثر استعمال قوت کا سبب اور مظہر رہا ہے چنانچہ قرآن حکیم (جو ہمارے پاس علم کا مستند ترین ماخذ ہے) ہمیں قدیم ترین پیغمبر حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر آخری نبی حضرت محمد ﷺ کی ابلاغی حکمت تفصیل سے بتاتا ہے (انبیاء کرام کی ابلاغی حکمت عملی ایک مستقل موضوع ہے جس پر ہم ان شاء اللہ جلد قلم اٹھائیں گے) اور قرآن وسنت سے ہمیں ابلاغ کی حکمت عملی اور طریق کار کے حوالے سے وسیع رہنمائی ملتی ہے۔

صحابہ کرامؓ سے لے کر آج تک مجتہدین، فقہاء، حکام، قضاۃ اور مسلم مفکرین کا یہ مستقل طریق کار اور اسلوب رہا ہے کہ جب بھی ان کے پاس کوئی مسئلہ آتا تو وہ سب سے پہلے یہ دیکھتے کہ اس کے بارے میں قرآن حکیم کا حکم کیا ہے اور نبی کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ اور آپؐ کی تعلیمات سے اس میں کیا رہنمائی ملتی ہے، اس کے بعد ہی وہ مذکورہ معاملے میں کوئی رائے قائم کرتے۔ چنانچہ آج جب ہمارے سامنے یہ سوال آئے کہ ہمارے ہاں میڈیا کے رہنما اصول اور ضابطۂ اخلاق کیا ہونا چاہئے تو منطقی طور پر ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ اس بارے میں ہمیں قرآن وسنت سے کیا رہنمائی ملتی ہے۔ مغرب میں سائنسی اور تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ فن ابلاغ نے جو محیر العقول ترقی کی ہے (دو تین سو سال پہلے اخبارات شائع ہونا شروع ہوئے، پھر ریڈیو، ٹیپ ریکارڈر، پھر الیکٹرانک میڈیا میں ٹی وی اور آج کل انٹرنیٹ اور موبائل وغیرہ) اس نے ابلاغ کو آج ایک مستقل سائنس اور فن بنا دیا ہے جو اپنی موجودہ ہیئت اور تفصیل میں اگرچہ نیا ہے لیکن جہاں تک ابلاغ، اس کی حکمت عملی اور اس کے ذرائع (مثلاً زبان، آنکھ، اور کان کے استعمال) کا تعلق ہے، ان میں سے کچھ بھی نیا نہیں اور اللہ تعالیٰ کے

بھیجے ہوئے پیغمبر ان سے بھرپور کام لیتے رہے ہیں چنانچہ آج ہم اگر اپنے ہاں میڈیا کی پالیسی اور رہنما اصول وضع کرنا چاہیں یا میڈیا کے لئے ضابطۂ اخلاق بنانا چاہیں تو یقیناً ہمیں اس کے لئے قرآن وسنت سے واضح رہنمائی مل سکتی ہے اور قرآن وسنت کی نصوص سے بہت سے احکام مستنبط کئے جا سکتے ہیں۔

سہولت بیان کی خاطر ان ضوابط کو ہم ایجابی (Dos) یعنی وہ کام جو ذرائع ابلاغ کو کرنے چاہئیں اور سلبی (Donts) یعنی وہ کام جو اسے نہیں کرنے چاہئیں) میں تقسیم کر سکتے ہیں اور اگر ہم ان دونوں کا احاطہ کرلیں تو قرآن وسنت کی روشنی میں میڈیا پالیسی کے رہنما اصول اور ضابطۂ اخلاق دونوں واضح صورت میں ہمارے سامنے آجائیں گے۔ اور تفصیل کے لئے ہم ابتداء کرتے ہیں ایجابی پہلو سے یعنی وہ کام جو مسلم ذرائع کو کرنے چاہئیں:

۱۔ اشاعت دین/ دعوت وتبلیغ

اللہ تعالیٰ نے حضرت محمدﷺ پر نبوت ختم کردی (الاحزاب ۳۳:۴۰) اور آئندہ کے لئے آپؐ کے پیروکاروں پر فرض کردیا کہ وہ دین اسلام دوسروں تک پہنچائیں (آل عمران ۳:۱۱۰) اور نبی کریمﷺ نے بھی اسی مفہوم میں فرمایا کہ مجھ سے لے کر یہ پیغام آگے پہنچاؤ خواہ ایک آیت ہی کیوں نہ ہو۔(صحیح بخاری، کتاب الانبیاء) اسی لئے مسلمان ایک مشنری امت ہیں اور دین کی اشاعت وتبلیغ اور غیر مسلموں بلکہ مسلمانوں تک (برائے تذکیر و تزکیہ) اس کی دعوت پہنچانا مسلمانوں کا اور ان کے ابلاغی اداروں کا ایک بنیادی فریضہ اور ہدف ہونا چاہئے۔ اور جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ اسلام محض کوئی مذہب نہیں جو صرف اخلاقی، روحانی اور اخروی معاملات سے بحث کرتا ہو بلکہ یہ ایک دین، طرز زندگی اور نظام حیات ہے اور اس کا ہماری دنیاوی زندگی اور زندگی کے بارے میں ہمارے طرز عمل سے گہرا تعلق ہے لہٰذا اشاعت دین کا مطلب محض دینیاتی موضوعات پر وعظ ونصیحت نہیں بلکہ معیشت، معاشرت، تعلیم، قانون ۔۔۔غرض ہر شعبۂ زندگی کے بارے میں اسلامی تعلیمات کی حکمتیں واضح کرنا، ان کے اصول لوگوں کو بتانا اور انسانی وعقلی کاوشوں کے مقابلے میں قرآن وسنت کی ہدایت کے

اعلیٰ، برتر اور قابل عمل ہونے کا اثبات کرنا بھی شامل ہے۔

۲۔ غیر اسلامی افکار و اقدار کا رد

جو کلمہ پڑھ کر ہم مسلمان ہوتے ہیں یعنی **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** اس میں نفی پہلے ہے اور اثبات بعد میں اور یہی دعوت کی فطری ترتیب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کا توحید (یعنی ایک الہ پر) ایمان لانا اس وقت تک نامکمل اور بے معنی ہے جب تک وہ ایک اللہ کے سوا دیگر معبودوں کا انکار نہ کرے۔ یہ بات اتنی اہم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا کہ اس کے بغیر تمہارا ایمان لانا بے معنی ہے اور تمہارا کوئی اچھا عمل بھی قابل قبول نہیں ہے جب تک کہ تم شرک سے باز نہ آجاؤ (الانعام ۶:۸۸) یعنی ایک خدا کو ماننے کے ساتھ ساتھ دوسرے جھوٹے خداؤں کی خدائی کا انکار نہ کرو۔ ہماری رائے میں یہ بات بہت اہم ہے اسی لئے ہم نے اس کا الگ سے بیان ضروری سمجھا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی حسین عنوان سے (خواہ اسے 'رواداری' کا نام دیا جائے یا 'ڈائیلاگ' کا یا 'تقابلی مطالعے' کا یا کچھ اور) کوئی مسلمان یا ان کا ابلاغی ادارہ یہ نہیں کرسکتا کہ وہ ایسے افکار مسلمانوں کے سامنے پیش کرے اور ان پر عمل کی انہیں بالواسطہ یا بلاواسطہ ترغیب دے جو غیر اسلامی ہوں اور قرآن وسنت کی تعلیمات اور روح کے خلاف ہوں خواہ ان کا نام بظاہر کفر وشرک جیسا نہ ہو بلکہ سیکولرزم، لبرلزم، کیپٹل ازم، کمیونزم۔۔۔ وغیرہ ہو۔ اس کی مثال نبی کریم ﷺ کا وہ اسوہ ہے کہ جس کی رو سے آپ ﷺ حضرت عمرؓ پر ان کے تورات پڑھنے پر ناراض ہوئے تھے حالانکہ اپنی دانست میں وہ اسے ایک سابقہ آسمانی صحیفہ سمجھ کر ہی پڑھ رہے تھے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

یہاں کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ ہماری اپروچ آج کے اس بین الاقوامی اصول کے خلاف ہے کہ ہر کسی کو اپنے خیالات کے اظہار کی آزادی ہونی چاہئے۔ لامحدود شخصی آزادی اور لامحدود آزادیٔ اظہار مغرب کی ملحد تہذیب کے گمراہ کن اصول اور نعرے ہیں (اور خاص طور پر اہل مغرب ہر اس موقع پر اس کی آڑ لیتے ہیں جب انہیں اسلام کی مخالفت کرنا ہو اور مسلمانوں کے

مقدسات[قرآن اور پیغمبر اسلام ﷺ] کی توہین کرنا ہو ورنہ آزادی کا فطری مفہوم اور منطقی دائرہ کار یہ ہے کہ یہ ہمیشہ بعض شرط و قیود سے محدود ہوتی ہے جیسا کہ مشہور ضرب المثل ہے کہ 'جہاں سے میری ناک شروع ہوتی ہے وہاں سے آپ کی آزادی ختم ہوجاتی ہے' اور اہل مغرب کا بھی یہ محض نعرہ ہی ہے ورنہ وہاں بھی آزادی بعض حدود سے مقید ہے۔ یقین نہ آئے تو مغرب میں جا کر جمہوریت کے خلاف مضمون لکھ کر اپنا حشر دیکھ لیجئے یا امریکہ میں جا کر امریکی آئین کے خلاف تقریریں کرنا شروع کردیجئے تو ہم دیکھیں گے کہ کون آپ کو اس کی اجازت دیتا ہے۔ اہل مغرب کی آزاد خیالی کا تو یہ حال ہے کہ وہ مسلمانوں کو ان کی مرضی کا لباس پہننے کی آزادی نہیں دے رہے(مسلمان عورت اپنی رائے کی آزادی کے تحت اپنا سر اور چہرہ نہیں ڈھانپ سکتی) اور مسلمانوں کو ان کی مرضی کی بلڈنگ بنانے کی اجازت نہیں دے رہے(وہ مسجد کا مینار نہیں بنا سکتے) تو پھر یہ آزادی کیسی آزادی ہے؟

پھر یہ کہ ہم مسلمان ہیں اور اسلام میں بے قید اور لامحدود آزادی کا کوئی تصور ہی نہیں۔ اسلام کے تو لفظی اور اصطلاحی معنی ہی یہ ہیں کہ آدمی اپنی آزاد مرضی سے اللہ کی غیر مشروط عبادت و اطاعت پر راضی ہوجائے اور اس کے بعد ہر معاملے میں اللہ کی مرضی اور رائے پر چلے اور اپنی مرضی اور رائے چھوڑ دے۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ نے مومن کی آزادی کی مثال اس گھوڑے سے دی جو ایک لمبی رسی سے بندھا ہو۔(مسند احمد بن حنبل ۸:۳) یعنی وہ حرکت تو کرسکتا ہے لیکن صرف اسی حد تک جہاں تک رسی اس کو جانے کی اجازت دے۔ لہٰذا ایک مسلمان آزاد ہے لیکن صرف اس حد تک جہاں وہ اللہ کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ کرے۔ بالفاظ دیگر وہ آزاد ہے لیکن جہاں سے اللہ کی حدود شروع ہوتی ہیں وہیں سے اس کی آزادی ختم ہوجاتی ہے۔ لہٰذا ایک مسلمان صحافی اپنے ابلاغ میں کبھی مادر پدر آزاد نہیں ہوتا کہ وہ جو چاہے لکھے یا جو چاہے دکھائے اور سنائے بلکہ اسے اپنے لکھنے، دکھانے اور سنانے میں ان حدود و قیود کی پابندی کرنا ہوگی جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے مقرر کی ہیں۔ اسی ضمن میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ زبان کا غلط استعمال آدمی کو جہنم کا مستحق بنا دیتا ہے۔(صحیح بخاری و

صحیح مسلم) لہٰذا مغرب کا لامحدود شخصی آزادی اور لامحدود آزدئ اظہار کا تصور گمراہ کن ہے اور مسلمانوں کے لئے نا قابل عمل ۔

۳۔ میڈیا کا تعلیمی کردار

میڈیا غیر رسمی تعلیم کا بہت بڑا ادارہ ہے بلکہ آج وہ اتنا مؤثر ہو چکا ہے کہ رسمی یا ریگولر تعلیم کو بھی پیچھے چھوڑ چکا ہے اور اس کے اثرات پر بسا اوقات غالب آجاتا ہے۔ تعلیم نام ہے علم کے ابلاغ اور معلومات بہم پہنچانے کا اور یہ وہ کام ہے جو آج میڈیا بخوبی سرانجام دے رہا ہے لیکن اسلام میں تعلیم کا مطلب محض ابلاغ نہیں بلکہ ابلاغ حق ہے یعنی تعلیم کا مطلب ہے 'صحیح' علم لوگوں تک پہنچانا، وہ علم جو 'حق' ہو یا 'حق' پر مبنی اور اس کے مطابق ہو یا کم از کم اس کے خلاف نہ ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں کئی دفعہ سابقہ انبیاء اور خصوصاً آخری نبی حضرت محمد ﷺ کے بارے میں فرمایا کہ ان کا فریضہ یہ ہے کہ وہ 'کتاب وحکمت' کی تعلیم دیں (البقرہ ۲:۱۲۹)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ضروری ہے کہ مسلم میڈیا لوگوں تک قرآن پہنچائے اور انہیں قرآن کی تعلیم دے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ جو بھی تعلیم دے اور معلومات بہم پہنچائے وہ قرآن حکیم کے مطابق ہونی چاہئیں اور اس کے خلاف نہیں ہونی چاہئیں۔ اس اصول کا مطلب یہ ہے کہ مسلم میڈیا کو نہ صرف فہم قرآن اور فہم اسلام کی طرز کے دینی پروگرام با قاعدگی سے پیش کرنے چاہئیں بلکہ وہ کوئی بھی ایسا پروگرام پیش نہیں کرسکتا جو قرآن حکیم اور اسلامی تعلیمات کے خلاف ہو۔

۴۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا مطلب ہے لوگوں کو نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا۔۔۔ یہ وہ بنیادی کام ہے جو معاشرے کی اصلاح کرنے اور اسے بگاڑ سے بچانے کا ذریعہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں صاف فرمایا ہے کہ تم سے پہلی قومیں اس لئے تباہ ہوئیں کہ وہ یہ کام چھوڑ بیٹھی تھیں (المائدہ ۵:۷۹) اور نبی کریم ﷺ نے بھی اپنی امت کو اس کی بہت تاکید کی ہے۔ (سنن ترمذی) آپ ﷺ نے اس کے تین درجے بیان فرمائے ہیں

(صحیح مسلم) ایک یہ کہ جہاں مسلمان کے پاس طاقت ہو(اور اس کے طاقت کے استعمال کا دائرہ کار ہو) وہاں اسے قوت سے برائی کو روک دینا چاہئے اور نیکی کا حکم دینا چاہئے (جیسے مثلاً حکومت ہے کہ اس کے پاس قوت و اختیار ہے تو اسے ریاست میں بُرائی کو قوت سے روکنا چاہئے یا جیسے مثلاً والد ہے کہ اسے حق حاصل ہے کہ اولاد کو بگڑنے نہ دے اور بُرے کام نہ کرنے دے)۔البتہ جہاں آدمی کے پاس یہ اختیار نہ ہو وہاں اسے زبان سے معروف کی تلقین اور بُرائی سے بچنے کی تنبیہ کرنی چاہئے اور اس کا سب سے نچلا درجہ یہ ہے کہ مسلمان کم از کم دل میں تو بُرائی کو بُرا سمجھے خواہ زبان سے اس کا اظہار نہ کر سکے۔

جہاں تک اس اصول کے میڈیا پر اطلاق کا تعلق ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ ایک صحافی کی پروفیشنل زندگی اس کی مظہر ہونی چاہئے کہ وہ اپنی تحریروں، تقریروں اوراپنے پروگراموں کے ذریعے لوگوں کو نیکی کی تلقین کرے اور بُرائی سے بچنے کا کہے بلکہ اس کے پروگراموں میں بُرائی کا کوئی پہلو ہونا ہی نہیں چاہئے۔

۵۔ تزکیہ و تربیت

جس چیز کو قرآن حکیم نے تزکیہ کہا ہے اسے ہم اپنی زبان میں تربیت کہتے ہیں۔'تعلیم و تربیت' کی اصطلاح اسی لئے بنی ہے اور تعلیم اور تربیت کو اسی لئے یکجا استعمال کیا جاتا ہے کہ تعلیم بنیادی ترین ذریعہ ہے تربیت کا اور تربیت ہی تعلیم کی غایت اور اس کا ہدف ہوتی ہے۔ سادہ الفاظ میں تزکیہ و تربیت کا مفہوم ہے انسانی شخصیت کا تعلیم کے مطابق ڈھل جانا مثلاً 'نماز پڑھنی چاہئے' یہ علم ہے لیکن نماز پڑھ کر دکھانا، اس کا اہتمام کرنا اور نماز عملاً پڑھوانا یہ تربیت ہے۔انگریزی میں اس کا قریب ترین مفہوم ٹریننگ(training) کے لفظ سے ادا ہوتا ہے۔

قرآن حکیم سے پتہ چلتا ہے کہ اصل چیز تزکیہ و تربیت ہے یعنی انسان کا اپنے نفس کو بُرے رجحانات و میلانات سے پاک کر لینا، اس کا اپنے نفس کی ایسی تربیت کرنا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلنا اس کے لئے آسان ہوجائے اور اس کی عادت بن جائے۔ اس مختصر وضاحت سے ظاہر ہے کہ تزکیہ و تربیت، تعلیم سے ایک زائد چیز ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام میں تعلیم دینے

والا محض معلم نہیں بلکہ مربی بھی ہوتا ہے۔

مسلم معاشرے میں اس اصول کا نہ صرف رسمی اور باقاعدہ تعلیم پر اطلاق ہوتا ہے بلکہ معاشرہ اور اس کے افراد رسمی تعلیم کے علاوہ بھی تزکیہ وتربیت کے مکلّف ہیں کیونکہ اگر نفس انسانی دین کے مطالبات پر عملاً سر جھکانے کو تیار نہ ہو تو ایمان کا اقرار بے معنی اور محض دعویٰ بن کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں نے جب اپنے اندر اسلام پر عمل کرنے کے لحاظ سے خامیاں دیکھیں تو انہوں نے اپنے تزکیے کے لئے اور اپنی ان خامیوں کو دور کرنے کے لئے 'تصوف' کے نام سے ایک ادارہ بنایا تاکہ وہ اپنی صحیح تربیت کرسکیں۔آبادیوں کے شوروشغب سے دور اس طرح کی تربیت گاہ (خانقاہ) کے سربراہ کو لوگ مرشد(یعنی صحیح راہ کی طرف رہنمائی کرنے والا) یا مربی (تربیت کرنے والا) یا مزکی (تزکیہ کرنے والا) کہتے تھے۔اس اصول کا اگر ہم میڈیا پر اطلاق کریں تو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ میڈیا کا ہدف محض تعلیم یا معلومات بہم پہنچا دینا نہیں ہونا چاہئے بلکہ اسے لوگوں کی تربیت کرنا چاہئے۔ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا میڈیا اس وقت بھی لوگوں کی 'تربیت' کر رہا ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ وہ غیر اسلامی تربیت کر رہا ہے جبکہ اسے ان کی اسلامی تربیت کرنی چاہئے۔ میڈیا لوگوں کی اسلامی تربیت کیسے کرے؟ یہ ایک مستقل اور تفصیل طلب موضوع ہے۔تاہم ہمارے اس مضمون سے بھی اس کے خدوخال، ان شاءاللہ، واضح ہو جائیں گے۔

۶۔ ذاتی کردار

جب صحافی کا کردار ایک معلم اور مربی ومزکی کا ہے تو جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ معلم اور مربی کی بات میں اس وقت تک وزن اور اثر پیدا نہیں ہوتا جب تک وہ خود اس پر عمل نہ کرے لہٰذا ضروری ہے کہ ہر صحافی کی نیت او رقبلہ درست ہو اور اس کی عملی زندگی رذائل و معصیت سے پاک ہو کیونکہ اس کی بات میں اثر اسی وقت پیدا ہوگا جب بات اس کے دل سے نکلے اور صرف حلق کے اوپر اوپر سے خارج نہ ہو۔ اسی لئے قرآن حکیم نے اصول وضع کر دیا کہ وہ بات نہ کہو جس پر تمہارا عمل نہ ہو(الصّف ۶۱:۳) اور رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ

جودوسروں کو نیکی کی تلقین کرے اور خود عمل نہ کرے تو وہ جہنم کا ایندھن بنے گا۔(صحیح بخاری و صحیح مسلم) لہٰذا ضروری ہے کہ صحافی کا ذاتی کردار اجلا ہو اور وہ رذائل اخلاق سے پرہیز کرے۔

۷۔ مثبت تفریح

تفریح، کھیل اور مشغلے انسانی فطرت کی ضرورت اور اس کا حصہ ہیں لہٰذا ان کا اہتمام ضروری ہے لیکن اس حوالے سے چند اصول پیش نظر رہنے چاہئیں:

اوّل: کھیل اور تفریح ایک با مقصد زندگی کا جزو ہیں لیکن ان کی حیثیت آٹے میں نمک جیسی ہونی چاہئے مطلب یہ کہ کھیل اور تفریح برائے زندگی نہ کہ زندگی برائے کھیل اور تفریح۔ اس اصولی بات کو ذہن میں رکھ کر افراط وتفریط سے بچنا چاہئے۔

دوم: کھیل اور تفریح مثبت، تعمیری، پاکیزہ اور مفید ہونی چاہئے تاکہ ان سے جسم مضبوط ہو، روح کو پاکیزگی اور جلا ملے اور اچھی عادتیں پروان چڑھیں۔

سوم: کھیل، مشغلے اور تفریح ایسی نہیں ہونی چاہئے جو نفس حیوانی کو ابھارے، جس سے اخلاق خراب ہوں اور بُری عادتیں پروان چڑھیں جیسے مثلاً کھیلوں اور تفریح کو مقصد زندگی بنالینا اور ان کو بہت زیادہ وقت اور توجہ دینا۔ عورتوں اور مردوں کی مخلوط کھیلیں یا عورتوں کا مردوں کے لئے ناچنا گانا اور یوں عریانی و فحاشی کو فروغ دینا جس کا آخری اور لازمی نتیجہ عورتوں اور مردوں میں غیر قانونی جنسی تعلق ہے جو صالح معاشرے کے قتل کے مترادف ہے اور بہت سے مفاسد کو جنم دیتا ہے۔

۸۔ مقامی عرف و عادات

ہر انسانی معاشرے میں مقامی طور پر ایسے عرف و عادات رواج پاجاتے ہیں جو زندگی کو آسان، ہموار اور پُر لطف بناتے ہیں۔ اگر ان میں کوئی چیز خلاف احکام الٰہی اور خلاف مقاصد شریعت نہ ہو تو ان کو اپنانے میں کوئی حرج نہیں۔ خود قرآن اس اسلوب کی تائید کرتا ہے(البقرہ ۲:۱۷۸) اور نبی کریم ﷺ کے اسوہ مبارکہ سے بھی ہمیں اسی کی رہنمائی ملتی ہے

(مسند احمد ۱:۲۷۹) لیکن اس میں دو باتوں کا خیال رکھنا چاہئے:
ایک: یہ کہ مقامی اعراف و عادات تعمیری اور صالح ہوں اور شریعت کے احکام اور مقاصد کے خلاف نہ ہوں۔ نیز وہ خلاف فطرت سلیمہ اور شائستگی و پاکیزگی کے منافی نہ ہوں۔
دوسرے: مقامی عرف و عادات کو چھوڑ کر غیر مسلموں اور غیر قوموں کے ایسے اعراف و عادات کی نقالی نہ کی جائے جو مقامی اعراف و اقدار اور ان کی حکمتوں کے خلاف ہوں جیسے مثلاً ڈراموں اور فلموں میں مقامی لباس اور کلچر کی بجائے مغربی یا بھارتی کلچر دکھانا۔

۹۔ اچھی صحبت

ذرائع ابلاغ کے ساتھ وقت گزارنا ایک طرح سے ان کی صحبت اختیار کرنا ہی ہے اور اللہ و اس کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہے کہ اچھی صحبت اختیار کرو اور بُری صحبت سے بچو۔ قرآن مجید میں حکم ہے کہ سچے لوگوں کی معیت میں رہو (التوبہ ۹:۱۱۹) اور نبی کریم ﷺ نے خبردار کیا کہ دوستی کرنے سے پہلے دیکھو کہ کس کے ساتھ دوستی کر رہے ہو کیونکہ آدمی اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے (سنن ترمذی، کتاب الزھد) اور ان کے اثرات قبول کرتا ہے چنانچہ آپ ﷺ نے اچھی صحبت کی مثال عطر فروش کی دی جس کے ہاں کی خوشبو سے دل و دماغ معطر ہوتے ہیں اور بُری صحبت کی مثال لوہار کی دی جس کی دوستی میں دھوئیں سے پالا پڑنے اور کپڑے جھلنے کا خطرہ ہوتا ہے (صحیح بخاری، کتاب الذبائح) ذرائع ابلاغ کے ساتھ وقت گزارنا بھی ایک طرح کی صحبت ہے کہ آدمی جس طرح کے پروگرام دیکھے گا ویسے ہی اثرات اس کی شخصیت پر پڑیں گے۔ اچھے پروگراموں کے اچھے اثرات اور بُرے پروگراموں کے بُرے اثرات۔ لہٰذا میڈیا کا فرض ہے کہ وہ صالح جلیس بنے اور اس کی صحبت انسانوں کے اخلاق پر مفید اور تعمیری اثرات چھوڑے لہٰذا میڈیا کو صرف ایسے پروگرام پیش کرنے چاہئیں جو اچھی صحبت کے زمرے میں آئیں۔

۱۰۔ تعصّبات کی حوصلہ شکنی

اسلام مسلمانوں میں اخوت اور بھائی چارے کو فروغ دینا چاہتا ہے اور مسلم معاشرے میں

یک جہتی اور محبت کو پروان چڑھانا چاہتا ہے چنانچہ قرآن حکیم نے فرمایا کہ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں (الحجرات ۴۹:۱۰) اور رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی مثال جسد واحد کی سی ہے کہ ایک عضو کو تکلیف ہو تو سارے جسم کو تکلیف ہوتی ہے (صحیح بخاری، کتاب الادب) اس لئے ذرائع ابلاغ کو ایسے پروگرام پیش کرنے چاہئیں جو مسلمانوں میں اخوت و محبت کو فروغ دیں اور ان سب تعصّبات کی حوصلہ شکنی کرنی چاہئے جن سے مسلمانوں میں بُعد اور دوری پیدا ہو اور انتشار و افتراق کو ہوا ملے خصوصاً فرقہ واریت اور مسلک پرستی، صوبائیت اور علاقائیت، زبان اور رنگ، برادری اور قبیلے کے تعصّبات کی حوصلہ شکنی ضروری ہے۔

۱۱۔ خبر کی صحت کا خیال رکھنا

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ خبر اور اطلاع کا ذریعہ صحیح اور درست ہونا چاہئے اور اگر اس بارے میں ذرا بھی شک ہو تو اچھی طرح سے جانچ پڑتال کر لینی چاہئے تا کہ غلط خبر کی بنیاد پر کسی کو نقصان نہ پہنچ جائے (الحجرات ۴۹:۶) اور خبر دینے والے کو بعد میں ندامت کا سامنا نہ کرنا پڑے یا اعتذار نہ کرنا پڑے جیسا کہ آئے دن ہم اخبارات میں لوگوں کی تردیدیں اور اعتذارات پڑھتے رہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام تفتیشی یا تحقیقی پورٹنگ (investigating reporting) کا داعی ہے اور یہ درست رویہ نہیں ہے کہ صحافی جو بھی بات سنے وہ نشر کر دے یا لکھ دے جب تک کہ اس کا ثقہ ہونا اس کے نزدیک یقینی نہ ہو۔

۱۲۔ ہمیشہ اچھی، سچی اور تعمیری بات کہنا

سورہ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں (اور مسلمان صحافیوں) کے لئے یہ اصول بیان کیا ہے کہ وہ اللہ سے ڈرتے رہیں اور ہمیشہ صاف، سیدھی، سچی اور کھری بات کہیں (الاحزاب ۳۳:۷۰) عربی میں سدید کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اور سدّ کہتے ہیں روکنے کو (عربی میں پانی روکنے اور جمع کرنے کے لئے بنائے جانے والے ڈیم کو سدّ کہتے ہیں) اور سدید اس کاک یا ڈاٹ کو بھی کہتے ہیں جس سے بوتل کا منہ بند کر دیا جاتا ہے تا کہ کوئی چیز اس کے اندر نہ جا سکے یا جو چیز اندر ہے وہ گر کر یا بہہ کر ضائع نہ ہو جائے۔ گویا جب اللہ تعالیٰ

فرماتے ہیں کہ قول سدید کہو تو اس کا مطلب ہوتا ہے مکمل طور پر سچی اور کھری بات کہنا جس میں کوئی آلائش نہ ہو، فریب اور دھوکہ نہ ہو جس میں کوئی چکر نہ ہو بلکہ وہ مکمل طور پر صحیح، سچی اور تعمیری ہو۔

سطور بالا میں ہم نے ابلاغ کے ان ایجابی اور مثبت پہلوؤں اور اہم رہنما اصولوں کا ذکر کیا ہے جنہیں میڈیا سے متعلق افراد کو اپنی ابلاغی حکمت عملی میں اپنانا چاہئے اور اب ہم ابلاغ کے سلبی پہلوؤں اور ان اصول و اقدار کا ذکر کریں گے جنہیں اہل صحافت کو اپنی ابلاغی حکمت عملی میں نہیں اپنانا چاہئے بلکہ انہیں رد اور ترک کر دینا چاہئے جسے ہم ضابطۂ اخلاق بھی کہہ سکتے ہیں۔

ابلاغ کے سلبی پہلو (Donts یعنی نہ کرنے کے کام) یا ضابطۂ اخلاق

۱۔ فحاشی وعریانی اور رقص وسرود

سارے مسلمان جانتے ہیں کہ اسلام عورت کو پردے کا حکم دیتا ہے، (الاحزاب ۵۹:۳۳) حیاء کی تلقین کرتا ہے (النور ۳۱:۲۴) مردوں کو بھی غض بصر (نظریں نیچی رکھنے) اور غیر محرم عورتوں کو دیکھنے سے منع کرتا ہے۔ (النور ۳۰:۲۴) یہ بھی ہر مسلمان جانتا ہے کہ اسلام تصویر بنانے کی مذمت کرتا ہے (صحیح بخاری، بدء الخلق) اور ایکٹنگ (سوانگ بھرنا، دوسروں کے کردار ادا کرنا) کو بُرا سمجھتا ہے عورتوں اور مردوں کی مخلوط مجالس کو ناپسند کرتا ہے اور (سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ) گانے بجانے، رقص و سرود، شراب نوشی (المائدہ ۹۰:۵) اور زنا (بنی اسرائیل ۳۲:۱۷) کی مذمت کرتا ہے۔ یہ سب باتیں مسلمانوں کے ہاں متفق علیہ ہیں۔ قرآن وسنت میں واضح طور پر بیان کی گئی ہیں، ہمارے فقہاء اور محدثین ان میں متفق ہیں اور ان کے درمیان ان امور میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ماضی میں بعض مسلمان بادشاہوں اور خلفاء کے درباروں اور طبقۂ امراء میں ان ممنوعات میں سے بعض چیزیں مروج رہی ہیں لیکن علماء وصلحاء ہمیشہ اس کی مذمت ہی کرتے رہے ہیں اور عام مسلمان بھی ان امور کو دینی تعلیمات سے انحراف ہی سمجھتے اور انہیں ناپسندیدگی کی نظر ہی سے دیکھتے رہے ہیں۔

پھر ایک چیز ہے ذاتی زندگی میں کوئی فحش کام کرنا، فحش بات کہنا یا عریانی اختیار کرنا اور ناچنا گانا اور ایک چیز ہے معاشرے میں عریانی و فحاشی اور رقص و سرود پھیلانا۔ اگرچہ پہلی حرکت بھی معصیت، گناہ اور اللہ کی نافرمانی ہے اور اللہ کی ناراضگی کا سبب ہے لیکن یہ چیز کہ آدمی معاشرے میں فحاشی و عریانی اور رقص و سرود پھیلائے یہ پہلے کے مقابلے میں بہت ہی بڑا گناہ ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی خود ہی بُرائی نہیں کر رہا بلکہ دوسروں کو بُرائی پر اکسانے میں مشغول ہے۔ یہ اتنا شنیع فعل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا کہ جو لوگ مسلمانوں میں فحاشی و عریانی پھیلاتے ہیں انہیں میں دنیا اور آخرت دونوں میں درد ناک عذاب دوں گا۔ (النور ۲۴:۱۹)

آج دنیا میں مغربی تہذیب غالب ہے (اس کے غلبے کی وجہ زندگی کے بعض مثبت اصولوں پر ان کا عمل کرنا ہے) اور اس کی معاشرت اور ثقافت میں مذکورہ بالا سارے عیب پائے جاتے ہیں جو ہم مسلمانوں کے نزدیک غلط اور مردود ہیں کیونکہ یہ خلاف اسلام ہیں اور مسلم معاشرت و ثقافت کے اصولوں کی نفی کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اسلامی تعلیمات پر عمل کریں تاکہ ان کے اندر بھی وہ خوبیاں اور صلاحیتیں پیدا ہو جائیں جو دنیا میں ترقی اور آخرت میں کامیابی کے لئے ضروری ہیں اور وہ مغرب کی اس معاشرت اور ثقافت کی پیروی نہ کریں جو خلاف اسلام و شریعت ہے لیکن بدقسمتی سے بعض مسلمان (خصوصاً میڈیا مالکان) اس کے باوجود مغربی معاشرت و ثقافت کی پیروی اور نقالی پر مصر ہیں۔ شائد شیطان انہیں اس پر اکساتا ہے یا مغربی اقوام کی مالی ترغیب اور ان کی ایجنٹ مقامی حکومتوں کی حمایت اور دولت کی حرص انہیں اس پر اکساتی ہے یا وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ترقی یافتہ مغرب کی پیروی کر کے وہ بھی ترقی یافتہ ہو جائیں گے۔ بہرحال مسلم میڈیا مالکان کا یہ رویہ کہ وہ اپنی ابلاغی پالیسی میں مغربی تہذیب اور اس کی ہم نوا ہندو تہذیب کی پیروی کرتے ہیں، خلاف اسلام، سخت قابل مذمت اور قطعاً ناقابل قبول ہے۔ بعض علماء بکراہت مسلمانوں کو ریڈیو سننے، ٹی وی دیکھنے اور انٹرنیٹ استعمال کرنے کی اجازت دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی مسلمانوں کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ

اس دوران ان چیزوں سے احتراز کریں جو صریحاً خلاف اسلام ہیں۔

فحاشی وعریانی پھیلانا پاکستانی آئین و قانون کی رو سے بھی ناجائز اور غیر قانونی ہے لہٰذا حکومت پاکستان اور اس کے متعلقہ اداروں کی دینی اور اخلاقی کے علاوہ قانونی ذمہ داری ہے کہ وہ میڈیا مالکان سے ان قوانین کی پابندی کروائیں اور دینی عناصر اور سول سوسائٹی کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ حکومت کو مجبور کریں کہ وہ عریانی وفحاشی کے خلاف ان قوانین پر عمل درآمد کرائے۔ دینی عناصر اور سول سوسائٹی اگر متحد اور منظّم ہوجائے تو میڈیا مالکان کو بھی مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ عریانی اور فحاشی ختم کریں اور مسلمان معاشرے میں بگاڑ وفساد پیدا نہ کریں۔

خلاصہ یہ کہ عریانی اور فحاشی جو ہر پاکستانی ٹی وی چینل پھیلا رہا ہے (الا ماشاء اللہ) صریحاً خلاف اسلام ہے اور میڈیا مالکان کو خدا کا خوف کرنا چاہیئے کہ وہ اپنی عاقبت خراب نہ کریں اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں فحاشی پھیلانے والوں کو واضح الفاظ میں عذاب الیم کی جو دھمکی دی ہے وہ اس کے مصداق نہ بنیں اور مسلمانوں کے دین و ایمان خراب نہ کریں اور ان کی معاشرت برباد نہ کریں۔

۲۔ لھو ولعب

لھو ولعب کا مطلب ایسی تفریحی سرگرمیوں میں مصروف ہوجانا ہے جو مفید اور تعمیری نہ ہوں بلکہ جن سے وقت ضائع ہوتا ہو اور خیر کے کام اور مفید اور تعمیری سرگرمیاں نظر انداز ہوتی ہوں، ان کے لئے وقت نہ بچتا ہو اور یوں ان پر منفی اثر پڑتا ہو۔ لھو ولعب کی قرآن حکیم بھی مذمت کرتا ہے (الانعام ۶:۳۲) اور نبی کریم ﷺ سے بھی اس کی مذمت ثابت ہے (سنن ترمذی) بدقسمتی سے ہمارا میڈیا مغربی اور ہندو تہذیب کی پیروی اور نقالی میں بکثرت ایسے پروگرام پیش کرتا ہے جو لھو ولعب کی نوعیت کے ہوتے ہیں اور جن سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

یہ ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ انسان کی زندگی میں وقت بہت قیمتی ہوتا ہے بلکہ اب تو دنیاوی کاموں کے تجربے سے بھی انسان نے یہی سیکھا ہے کہ وقت بہت قیمتی ہے چنانچہ جس چیز کو ہم تنخواہ کہتے ہیں وہ درحقیقت ہمارے وقت کی قیمت ہی ہوتی ہے جس آدمی کی زندگی جتنی

با مقصد ہو وہ اتنا ہی مصروف ہوتا ہے اور اس کا وقت اتنا ہی قیمتی ہوتا ہے لہٰذا کوئی سمجھدار انسانی وقت کے ضیاع کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ ایک سچا مسلمان با مقصد زندگی گزارتا ہے اور لھو ولعب میں وقت ضائع کرنا اسے ہرگز اچھا نہیں لگتا۔ لہٰذا ایک مسلمان صحافی کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنی ذاتی زندگی میں بھی لھو ولعب میں مشغول نہ ہو اور اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں بھی کوئی ایسی تحریر نہ لکھے، کوئی ایسی بات نہ کہے اور کوئی ایسا پروگرام پیش نہ کرے جو لھو ولعب کی نوعیت کا ہو۔

۳۔ شریعت کی بالا دستی کی نفی

اسلامی عقیدے کی رو سے اور اسلام کے سیاسی اور قانونی نظام میں حاکمیت اللہ تعالیٰ کو حاصل ہوتی ہے اور مسلمان اللہ کا ایک حقیر بندہ ہوتا ہے جس کا کام اپنے خالق ومالک کے آگے جھکنا اور اس کی اطاعت کرنا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو حکم اور قانون اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے (قرآن حکیم کی شکل میں یا اس کے مبعوث کردہ نبی کی سنت کی صورت میں) وہ ایک مسلمان کے نزدیک یقینی طور پر صحیح، قابل عمل اور قابل نفاذ ہوتا ہے اور اس پر انگلی اٹھانے، اعتراض کرنے، اس کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے اور اس کے نفاذ میں روڑے اٹکانے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس لئے مسلم میڈیا سے متعلق ہر فرد کا رویہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ شریعت (اللہ کے قانون) کی بالا دستی کو نہ صرف تسلیم کرے بلکہ اس کی حمایت کرے اور اسے معاشرے میں پروان چڑھائے اور ہرگز ایسا کوئی پروگرام پیش نہ کرے اور اس کی زبان اور قلم سے کوئی ایسا لفظ نہ نکلے جس سے شریعت کی بالا دستی کا اصول مجروح ہوتا ہو یا اس کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہوں کیونکہ ایک مسلمان جو اللہ کے سامنے ایک عبد کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے آگے دن میں پانچ وقت جھکتا اور اس کے آگے سر تسلیم خم کرتا اور ماتھا ٹیکتا ہے اسے کہاں یہ زیب دیتا ہے کہ وہ شریعت الٰہی کے احکام پر اعتراضات کرے یا ان کا استخفاف کرے۔

۴۔ آئین کی خلاف ورزی

اگرچہ اسلام میں تقدس قرآن وسنت کو حاصل ہے نہ کہ انسانوں کے بنائے ہوئے کسی

قانون یا آئین کو تاہم انسان کا بنایا ہوا آئین اور قانون اگر قرآن وسنت کے مطابق ہو، قرآن وسنت کی بالادستی کوتسلیم کرتا ہواور قوم کے نمائندوں کا اس پر اتفاق ہوتو اجتماعی مصالح کی خاطر اس کی اطاعت کرنی چاہئے اور اس کی خلاف ورزی جائز نہیں۔لہٰذا میڈیا کے کردار کے حوالے سے پاکستان کے آئین اور قوانین میں جو کچھ درج ہے اس کی خلاف ورزی نہیں ہونی چاہئے بلکہ اس کی اطاعت اور پیروی ضروری ہے۔ پاکستان کا آئین نقاضا کرتا ہے کہ شریعت کے احکام پر عمل کیا جائے اور اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی نہ کی جائے۔فحاشی و عریانی نہ پھیلائی جائے،پاکستان کے استحکام وتحفظ کا خیال رکھاجائے اورکسی کی پگڑی نہ اچھالی جائے ۔۔۔۔تو میڈیا کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ آئین پاکستان کی پابندی کرے اوراس کی خلاف ورزی نہ کرے۔

۵۔ دارالاسلام کے مصالح کی خلاف ورزی

پاکستان ہمارا وطن ہے اور دارالاسلام ہے۔اگرچہ پاکستان کے آئین وقانون میں درج بعض باتیں اسلامی لحاظ سے غیر معیاری اور ناقص ہیں لیکن بحیثیت مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کا آئین اسلامی ہے، بایں معنی کہ وہ قرآن وسنت کی بالادستی کوتسلیم کرتا ہے اور اسلام کے مطابق زندگی گزارنے کی تلقین کرتا ہے۔اس میں نفاذ حدود کا ذکر موجود ہے، زکوٰۃ وعشر اور احترام رمضان کے قوانین موجود ہیں، علماء کرام سے مشاورت کا اہتمام موجود ہے۔۔۔۔اسی طرح پاکستانی معاشرہ بھی اسلامی تعلیمات پر عمل کی کوشش کرتا ہے گواس میں بھی کمزوریاں اور خامیاں موجود ہیں۔خلاصہ یہ کہ پاکستان قانوناً اور شرعاً دارالاسلام ہے، ایک اسلامی ملک ہے اور اس کی حفاظت اور اس کے مصالح کی حفاظت ہر مسلمان پاکستانی پر واجب ہےلہٰذا میڈیا کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلام،نظریۂ پاکستان اور پاکستان کے استحکام وتحفظ کو یقینی بنائے اور اس کے مصالح کی حفاظت کرے اور کوئی ایسا پروگرام پیش نہ کرے اور کوئی مسلمان صحافی ایسی تحریر نہ لکھے اور تقریر نہ کرے جس سے پاکستان کے مفادات کو زک پہنچتی ہو۔

۴۔ غیر اسلامی افکار، تصورات اور اقدار کو گلیمرائز نہ کیا جائے

میڈیا ایک ایسی دو دھاری تلوار ہے جو اگر چاہے تو بعض افکار، تصورات اور اقدار کو آسمان پر چڑھا دے اور چاہے تو انہیں پاتال میں گرا دے۔ لہٰذا میڈیا کو چاہئے کہ وہ اسلامی تصورات اور اقدار کو گلیمرائز کر کے پیش کرے اور انہیں خوبصورت اور جاذب نظر بنا کر قارئین کے سامنے لائے تاکہ لوگوں کو ان پر عمل کی ترغیب ملے۔ اور اس کے برعکس غیر اسلامی افکار و تصورات کو گلیمرائز کر کے پیش نہ کرے بلکہ ایسی صورت میں پیش کرے کہ لوگوں کا دل ان کو رد کرنے کو چاہے اور وہ بُرائی سے نفرت کرنے لگیں۔

۷۔ افواہیں نہ پھیلائی جائیں

قرآن حکیم افواہ پھیلانے کی مذمت کرتا ہے اور مطالبہ کرتا ہے کہ معاملہ پہلے ذمہ داروں کے علم میں لایا جائے اور وہ تحقیق کریں کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ پھر ہی بات آگے پھیلائی جائے۔ (الحجرات ۴۹:۶) اسی طرح نبی کریمﷺ نے فرمایا کہ آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے اتنی بات ہی کافی ہے کہ وہ جو سنے بلا تحقیق آگے پھیلا دے۔ (صحیح مسلم) یہ اسلامی احکام تقاضا کرتے ہیں کہ کوئی بات کہنے، لکھنے اور پھیلانے سے پہلے اس کی تحقیق و تصدیق کی جائے کہ وہ صحیح بھی ہے یا نہیں۔ لہٰذا میڈیا کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر خبر کی پہلے تصدیق کرے اور بے بنیاد خبروں کی تشہیر، بے پر کی اڑانے اور اپنی رائے اور خواہش کو خبر بنا کر پیش کرنے سے احتراز کرے۔

۸۔ اسلام اور مسلم دشمن طاقتوں کے مفاد کی رعایت نہ کی جائے

مسلمان کی دوستی اور دشمنی کا معیار اللہ اور رسولﷺ نے قائم کر دیا ہے چنانچہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ سے دوستی نہ کرو کیونکہ وہ تمہارے دشمن اور بدخواہ ہیں اور کبھی تمہارا غلبہ نہیں چاہتے (التوبہ ۹:۲۳) اور مسلمانوں کے بارے میں فرمایا کہ تمہارے درمیان اخوت اور بھائی چارہ ہونا چاہئے (الحجرات ۴۹:۱۰) تجربے نے بھی یہی بتایا ہے کہ یہود (اسرائیل)، نصاریٰ (یورپ و امریکہ) اور مشرکین (بھارت و روس وغیرہ) اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ ان کو جب بھی موقع ملا انہوں نے اسلام اور مسلم

دشمنی کی۔مسلمان علاقوں پر قبضہ کر کے ان کے جان و مال کو لوٹا اور انہیں غلام بنایا۔فلسطین، کشمیر اور چیچنیا کے مسلمان ابھی بھی ان کے شکنجے میں تڑپ رہے ہیں اور حال ہی میں عراق اور افغانستان کی تباہی، پاکستان پر امریکہ کے حملے اور ایران پر شدید دباؤ سب کے سامنے ہے۔ لہٰذا ان ممالک کے ساتھ دوستی کرنا،ان کے مفادات کا خیال رکھنا اور ان کی بے جا حمایت کرنا اسلام، مسلمانوں اور پاکستان سے غداری کے مترادف ہے۔ان ممالک کے ساتھ تعلقات محتاط اور رسمی ہونے چاہئیں اور ان کے شر سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

۹۔ معاشرے میں انتشار وتشتت کو ہوا دینا

اسلام میں مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق اور باہم تعاون کی تلقین کرتا ہے اور ہر اس پروگرام سے روکتا ہے جس سے معاشرے میں تفرقہ پیدا ہو۔آپﷺ نے مدینہ کے مسلمانوں میں مہاجر وانصار (یعنی مقامی اور غیر مقامی) کی بنیاد پر تفریق کی کوشش کو جاہلیت قرار دے کر اس کی مذمت فرمائی لہٰذا ہر قسم کے مسلکی اختلافات اور زبان ،رنگ،نسل،علاقے۔۔۔وغیرہ کے تعصّبات کو ہوا دینا جرم ہے اور مسلمان میڈیا کا ان سے احتراز لازمی ہے۔

تلخیص بحث

قرآن وسنت کے حوالے سے ذرائع ابلاغ (جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا کہ ابلاغ میں تقریر، تحریر اور سمعی و بصری ذرائع سب شامل ہیں مثلاً علماء کرام کے وعظ خصوصاً جمعہ کی تقریریں، اخبارات، جرائد، کتب، ریڈیو، ٹی وی [بشمول ایڈور ٹائزنگ ایجنسیاں]، انٹرنیٹ، موبائل ۔۔۔وغیرہ) کے کرنے اور نہ کرنے والے کاموں کے تفصیلی ذکر کی روشنی میں ایک ہم عصر مسلم ریاست کی میڈیا پالیسی کے رہنما اصول اور میڈیا کے لئے ضابطہ اخلاق بآسانی وضع کئے جا سکتے ہیں جو یہ ہیں:

پاکستانی میڈیا کے لئے رہنما اصول

مسلم ذرائع ابلاغ کو جن اصولوں کو پیش نظر رکھنا چاہئے وہ یہ ہیں:

۱۔ دین اسلام جو ہمارا نظریۂ حیات ہے اس کی تعلیمات لوگوں تک پہنچانا

۲۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر
۳۔ غیر اسلامی افکار و اقدار کا رد
۴۔ لوگوں کی اخلاقی اصلاح اور تربیت
۵۔ فرقہ واریت اور لسانی و علاقائی تعصّبات کی حوصلہ شکنی
۶۔ اسلام، پاکستان اور مسلم دشمن قوتوں کے ایجنڈے کا رد اور بیخ کنی
۷۔ مثبت اور تعمیری تفریح مہیا کرنا
۸۔ مقامی عادات اور صالح اعراف کا لحاظ رکھنا
۹۔ خبر کی صحت جانچنے کا اہتمام کرنا
۱۰۔ ہمیشہ اچھی، سچی اور تعمیری بات کرنا

ضابطۂ اخلاق

اس سے مراد ہے وہ امور جن سے میڈیا کو احتراز کرنا چاہئے۔ ان کی ایک مختصر فہرست درج ذیل ہے:

۱۔ ذرائع ابلاغ کو کوئی ایسی تقریر، تحریر اور پروگرام پیش نہیں کرنا چاہئے جن سے اسلامی تعلیمات کی نفی ہوتی ہو ان کا استخفاف ہوتا ہو اور ان پر عمل نہ کرنے کی ترغیب ملتی ہو۔
۲۔ نظریۂ پاکستان کو زک پہنچتی ہو، (نظریۂ پاکستان سے مراد یہ ہے کہ پاکستان اس لئے بنایا گیا ہے کہ یہ اسلام کا قلعہ بنے اور اس میں اسلامی اصول و اقدار پر عمل ہو) اور پاکستان کے تحفظ، استحکام اور مفادات پر حرف آتا ہو۔
۳۔ فحاشی و عریانی پھیلتی ہو اور رقص و سرود کو فروغ ملتا ہو۔
۴۔ لھو ولعب کو فروغ ملتا ہو، وقت ضائع ہوتا ہو اور بے مقصدیت پھیلتی ہو۔
۵۔ اسلامی اقدار کی نفی ہوتی ہو۔
۶۔ غیر اسلامی اقدار و افکار جیسے سیکولرزم، لبرلزم، کمیونزم، ہندوازم وغیرہ کی اشاعت ہوتی ہو۔
۷۔ فرقہ واریت اور لسانی، علاقائی اور دیگر تعصّبات کو تقویت پہنچتی ہو۔

۸۔ اسلام، مسلم اور پاکستان مخالف قوتوں (امریکہ و یورپ، بھارت، اسرائیل اور روس) کی ہم نوائی اور ان کے ایجنڈے اور مفادات کی حمایت ہوتی ہو۔

نفاذ کا طریق کار

۱۔ حکومت پاکستان خصوصاً وزارت ہائے اطلاعات، ثقافت اور مذہبی امور کا فرض ہے کہ وہ اس طرح کے رہنما اصول اور ضابطۂ اخلاق سٹیک ہولڈرز کی مشاورت سے وضع کرے اور اس کے نفاذ کے لئے قانون سازی کرے تاکہ اس کی خلاف ورزی پر عدالتیں سزائیں دے سکیں۔ دینی عناصر، سول سوسائٹی اور سٹیک ہولڈرز کو حکومت پر دباؤ ڈالنا چاہئے کہ وہ یہ کام کرے۔

۲۔ جب تک حکومت یہ کام نہیں کرتی صحافیوں اور ان کی پیشہ ورانہ تنظیموں کو چاہئے کہ وہ باہم مشاورت سے اس طرح کے رہنما اصولوں اور ضابطۂ اخلاق کا تعین کرلیں اور ایک سپروائزری کمیٹی بنالیں (اس کمیٹی کو کوئی موزوں نام دیا جاسکتا ہے مثلاً ڈسپلن کمیٹی) اور جب فرد یا تنظیم کو کسی صحافتی ادارے یا میڈیا کے خلاف شکایت ہو کہ وہ اس ضابطۂ اخلاق کی خلاف ورزی کر رہا ہے تو وہ اس ڈسپلن کمیٹی سے رجوع کر سکے۔ اس کمیٹی میں ایسے ذمہ دار افراد ہوں جن کا پروفیشن میں نام اور عزت ہو۔ سول سوسائٹی کے نیک نام اور صاحب کردار افراد اور اعلیٰ عدالتوں کے نیک نام ریٹائرڈ ججوں کو بھی اس طرح کی کمیٹی میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

اس کمیٹی کے اختیارات کا تعین بھی کیا جانا چاہئے مثلاً یہ کہ وہ اپنے فیصلوں کو مشتہر کر سکے، کچھ جرمانہ عائد کر سکے یا محدود مدت کے لئے اشاعت معطل کر سکے۔۔۔ وغیرہ۔

۳۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کمیٹی کے فیصلے کے بعد کوئی اس معاملے کو ملکی عدالتوں میں لے جانا چاہے تو لے جائے جہاں عدالت کو اس کمیٹی کے فیصلے کی روشنی میں فیصلہ صادر کرنے میں آسانی ہوگی۔ **هذا من عندنا والعلم عند الله۔**

باب العقائد　　علامہ احمد جاوید

اکتساب فضائل (۳)

تقدیر

س: تقدیر کا موضوع بہت پیچیدہ اور دشوار ہے۔ اس میں بڑے بڑے لوگوں سے لغزش ہوئی ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے تقدیر پر گفتگو کرنے سے شدت کے ساتھ منع کیا ہے۔ اس سارے پس منظر میں آپ ایسا کون سا موقف اختیار کریں گے جو محفوظ بھی ہو اور آپ ﷺ کے ارشاد گرامی کے خلاف بھی نہ ہو؟

ج: اصل میں تقدیر کی حقیقت کے درپے ہو کر اسے ایک فلسفیانہ مسئلے کی طرح زیرِ غور لانا اور موضوعِ گفتگو بنانا نہ صرف یہ کہ خطرناک ہے بلکہ اس کا کوئی شافی نتیجہ بھی نہیں نکل سکتا۔ تقدیر اللہ تعالیٰ کے رازوں میں سے ایک راز ہے جسے بس وہی جانتا ہے اور کوئی نہیں جان سکتا۔ اسی لئے اس پر محض ایمان ضروری ہے، اس کا تفصیلی اور فلسفیانہ فہم درکار نہیں۔ یہ غیب ہے اور اس کا غیب ہونا کسی بھی کاوش سے زائل نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ تقدیر یا مشیت اللہ کی مرضی کا نام ہے۔ جب ہمیں یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ تقدیر کے خیر وشر پر ایمان لاؤ تو اس کا ایک مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی مرضی پر راضی رہو۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ کسی شے کو اللہ کی قدرت، خلاقی اور علم سے باہر نہ سمجھو۔ تقدیر پر ایمان کے یہ دو بڑے اجزاء ہیں۔ پہلی صورت میں بندگی کا کمال ہے اور دوسری میں اللہ کی ایمانی معرفت۔ ہمارا زیادہ زور سر دست تقدیر بمعنی مرضی الٰہی پر ہے۔ بالفاظ دیگر ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ احکام پر پورے عمل کے ساتھ نتائج کی نسبت اللہ کی طرف کرنا اور اس پر کوئی شکایت یا فخر کئے بغیر راضی رہنا تقدیر پر ایمان کا لازمہ ہے۔

س: آپ کی باتوں کا کہیں یہ نتیجہ تو نہیں نکلتا کہ آدمی کفر اور فسق وغیرہ پر بھی راضی ہو جائے کیونکہ اللہ کی مرضی یہی ہے؟

ج: ہرگز نہیں! جن چیزوں پر اللہ راضی نہیں ہے ان پر بندہ کیسے راضی ہوسکتا ہے؟ کافر و فاسق مجبور نہیں ہوتے وہ اس شر کے مستحق ہوتے ہیں جو یقیناً اللہ ہی کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔سب سے پہلے یہ اصول یاد رکھیں کہ شر ہمیشہ مستحق کو پہنچتا ہے لیکن خیر کے لئے استحقاق ضروری نہیں۔ یہ جملہ معترضہ تھا، ہماری مراد یہ ہے کہ تقدیر پر ایمان ایک سادہ اور فطری مطالبہ ہے جس کے ذریعے سے بندے کی بندگی اور اللہ کی الوہیت وضاحت سے سامنے آتی ہے۔اس ایمان کے دو بنیادی تقاضے ہیں:ایک یہ یقین کہ ہر شے خواہ اچھی ہو یا بری اللہ کے علم میں ہے، اللہ کی مخلوق ہے اور اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ یہ عقیدہ الوہیت کے بارے میں صحیح تصور فراہم کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ میری کوششیں، خواہشیں اور تمنائیں پوری نہیں ہورہیں تو یہ اللہ کی مرضی ہے، مجھے انہیں برقرار رکھتے ہوئے اللہ کی مرضی پر اس طرح راضی رہنا چاہئے کہ کوئی شکایت اور مایوسی غلبہ نہ پا سکے۔ اسی جزو کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بندے کے کمالات اور کامیابیاں بھی تقدیری امور ہیں۔ ان پر اترانے کی بجائے تقدیر پر صحیح ایمان رکھنے والا انہیں اللہ کا فضل اور انعام سمجھ کر ایک عاجز اور محتاج بندے کی طرح شکر گزار رہتا ہے۔

باقی رہے وہ امور جن کی طرف آپ نے اشارہ کیا تو ان کا تعلق تقدیر کی حقیقت سے ہے جس کی دریافت کے ہم مکلّف نہیں ہیں۔ان معاملات میں (مثلاً ابوجہل کافر کیوں تھا اور عیسیٰ علیہ السلام نبی کیوں بنے؟) ہمارا کام بس یہ ہے کہ محض واقعاتی رخ سے ان کی تائید کریں اور ان کی سمجھ میں نہ آ سکنے والی حکمتوں کو اللہ کے سپرد کر کے اعتراض اور تشکیک وغیرہ کی طرف مائل نہ ہوں۔ اللہ جو کرتا ہے وہی حق ہے اور وہی اچھا ہے، چاہے ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ یہ تقدیر کی حقیقت پر ایمان کا خلاصہ ہے اور اس پر ہر طرح کا غور وفکر ممنوع قرار دیا گیا ہے کیونکہ ایسے غور وفکر کی بنیاد لازماً کسی منفی محرک پر ہوگی۔

ہم نے یہ بات دہرا کر کہی ہے کہ تقدیر پر ایمان کے دو بڑے فوائد ہیں اللہ کی معرفت اور عبودیت کا کمال۔امید ہے یہ دونوں پہلو ضروری حد تک واضح ہوگئے ہوں گے۔

ہاں! یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہئے کہ اللہ کی مرضی ہر حال میں خیر سے نسبت رکھتی ہے شر

سے نہیں یعنی شر اللہ کی مخلوق ہے، اس کی قدرت میں ہے، اس کے علم میں ہے لیکن اس کا پسندیدہ نہیں ہے۔ یہ ناپسندیدہ چیز وہ سزا اور عذاب کے طور پر مستحقین پر مسلط کرتا ہے اپنے مطلق اختیار اور قوت کی بنیاد پر، جبر کی طرح اندھا دھند وارد نہیں کرتا۔ اس حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے مسئلہ تقدیر میں بہت سے لوگ گمراہ ہوئے۔

س: اب یہ بات صاف ہوگئی کہ تقدیر پر ایمان کا وہ مفہوم کیا ہے جو ہر صاحبِ ایمان کے لئے فرض ہے۔ آپ کی گفتگو کا نتیجہ ایک پہلو سے غالبًا یہ نکلتا ہے کہ ناکامیوں اور مصیبتوں وغیرہ کو اللہ کی طرف سے سمجھ کر ان پر صبر کرنا چاہئے اور اپنی زندگی کو کسی بھی درجے میں مجروح اور متاثر نہیں ہونے دینا چاہئے۔ یہ ایک عملی اور اخلاقی نکتہ ہے جس کی افادیت بالکل روشن ہے لیکن ایک چیز تا حال سمجھ میں نہیں آئی کہ تقدیر کو صرف اللہ کی مرضی کیسے قرار دیا جا سکتا ہے اس میں تو خیر وشر دونوں ہیں۔ تقدیر کیا یہ نہیں ہے کہ اللہ نے ہر شخص کا کفر و ایمان نیکی و بدی وغیرہ لکھ دی ہے اور اس کا خلاف ممکن نہیں؟

ج: آپ خود ہی دشواری میں پڑنا پسند کر رہے ہیں۔ بہر حال اس کا ایک جواب یہ ہے کہ تقدیر الٰہیہ کے دو حصے ہیں: علم اور قدرت۔ اللہ کے علم سے باہر کوئی چیز نہیں ہے اور اللہ کی قدرت ہر معاملے میں حاوی ہے۔ کفر و ایمان وغیرہ کا تعلق علم الٰہیہ سے ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس نے کافر کو کفر پر اور فاسق کو حق پر مامور اور مجبور کر رکھا ہے۔ یاد رکھیں اللہ علیم وقدیر اپنی تمام صفات کے ساتھ ہے۔ مثال کے طور پر اس کا علم اس کی رحمت کا غیر نہیں ہے اور اس کی قدرت اس کے عدل کے منافی نہیں ہے اور عدل کی صفات رکھنے والی ذات کی طرف سے کسی ذہن میں یہ وسوسہ آنا ہی نہیں چاہئے کہ اس کا کوئی فعل جبر عائد کرنے والا بھی ہوسکتا ہے۔ تقدیر مخلوق کی مجبوری کی دستاویز نہیں ہے بلکہ مخلوق کے بارے میں خالق کے علم اور قدرت کا مظہر ہے۔ اس بات کو جتنا سمجھیں گے اتنا پریشان خیالی اور وساوس سے بچیں گے۔

ایک اور پہلو سے دیکھیں تو تقدیر پر ایمان بندگی کی ایک بنیادی ضرورت پوری کرتا ہے اور وہ ہے تسلیم و رضا یا صبر و شکر۔ بندگی اپنی ماہیت میں مالک کے ساتھ ایک غیر مشروط تعلق پر مبنی

ہے یعنی بندہ اپنی کسی خواہش یا ضرورت کو شرط بنا کر اللہ کے ساتھ کوئی محدود تعلق نہیں رکھتا۔ اس کا فریضہ بس یہ ہے کہ پرستش اور اطاعت کے ساتھ اللہ کے ہر فعل پر پوری طرح راضی رہے۔ یہ حالت تقدیر پر ایمان رکھے بغیر ممکن نہیں۔ گویا ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ تقدیر پر ایمان لانا بندگی کا لازمہ ہے اس کے بغیر بندہ ہونے کا کوئی مطلب نہیں۔

س: اب بات پوری طرح سمجھ میں آ گئی البتہ آپ نے جس تسلیم و رضا کا ذکر کیا ہے اس کی اگر مختصر تعریف بھی کر دیں تو بات کو اچھی طرح سمجھنا ممکن ہو جائے گا۔

ج: تسلیم و رضا دراصل وہ حال ہے جو بندے کو یہ کہنے کے قابل بناتا ہے کہ یا اللہ! آپ کا ہر حکم اور آپ کی ہر مرضی سر آنکھوں پر۔ یعنی جو آپ فرمائیں، جو آپ چاہیں میں اس کے لئے حاضر ہوں، میں اس پر راضی ہوں۔ اس میں تسلیم کا تعلق حکم سے ہے اور رضا کا تعلق مشیت سے۔ بندے تک اللہ کی طرف سے یہی دو چیزیں پہنچتی ہیں ان کے آگے اپنی نفی کر دینا تسلیم و رضا ہے۔

ہاں! یہ خیال رہے کہ تسلیم و رضا کا یہ مطلب نہیں کہ بندہ سعی و کوشش میں ناکامی کے بعد ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے اور یہ کہے کہ میں اللہ کی مرضی پر راضی ہوں۔ ایک تو ہمیں یہ نہیں معلوم کہ اللہ کی حتمی مرضی کیا ہے اور دوسرے یہ کہ ترک عمل خود خلاف حکم ہے۔ حکم کی خلاف ورزی کر کے اللہ کی مرضی پر راضی ہونے کا دعویٰ محض ایک خود فریبی ہے۔ ہمارا کام تو بس یہ ہے کہ نتائج کی ناموافقت ہمیں عمل میں مسلسل اشتغال اور کوشش میں متواتر مصروفیت سے نہ روک سکے۔ یہ ہے حقیقی تسلیم و رضا۔

ڈاکٹر مشتاق گوہر

انسانی فکر و عمل میں قلب کا بنیادی کردار (۳)

دل کی ذہانت کا نظام

اس وقت تک کی بحث سے واضح ہے کہ سائنس دانوں کے نزدیک دل کی ذہانت کا دماغ سے الگ ایک اپنا نظام ہے جو کئی لحاظ سے دماغ کی ذہانت کے نظام سے منفرد ہے۔ انسانی دماغ کی حیثیت معلومات سٹور کرنے والے سنٹر(Data Strorage Center) جیسی ہے یہ سیدھے اور منطقی انداز میں کام کرتا ہے۔ انسانی دماغ کا اصل کام معلومات کو یاد کرنا، ان کا تجزیہ کرنا، ان کو متعلقہ خانوں میں سٹور کرنا اور موازنہ کرنا ہوتا ہے۔ یہ معلومات ہمیں ہماری حسیات(Senses) سے حاصل ہوتی ہے۔ ماضی کی معلومات، تجربات اور یادداشتوں کی بنیاد پر ہماری حسیات سے مہیا ہونے والی نئی معلومات کو دماغ سٹور کرتا ہے۔ مغربی محقق ڈاک چلڈر(Doc Childre) کے مطابق گو کہ دماغ کا معلومات کا تجزیہ کرنے کا یہ طریقہ ہماری بقاء کے لئے اہم ہے لیکن اس کے کچھ نقصانات بھی ہیں۔

چونکہ دماغ ہر نئی آنے والی معلومات کا سابقہ معلومات (جو پہلے سے دماغ میں موجود ہوتی ہیں) سے لاشعوری طور پر موازنہ اور مقابلہ کرتا ہے، اس لئے اگر کسی خاص طرز کی معلومات دماغ میں پہلے سے موجود ہوں تو دماغ انہیں قبول کرنے میں پس و پیش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے لئے اپنے سابقہ نظریات اور پرانی عادات سے چھٹکارا حاصل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

اب جب معاملہ اللہ کی ذات پر ایمان کا آتا ہے تو دماغ اس مسئلے میں کنفیوز ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بارے میں قرآن میں فرمایا ہے: **لیس کمثلہ شی** (الشعراء: ۱۱) اس کے مثل کوئی چیز نہیں ہے۔

اسی بارے میں مشہور جرمن فلسفی کانٹ(Immanuel Kant 1742ء تا1804ء) نے اپنی مشہور کتاب''*The Critique of Pure Reason*''میں کہا تھا: ''خدا کی ذات کے ادراک کے بارے میں عقل انسانی بالکل ناکافی اور بے بس ہے''۔ دماغ چونکہ ہر نئی

معلومات کا پرانی معلومات سے موازنہ کرتا ہے، اس لئے خدا کی ذات کے معاملے میں دماغ کو کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس سے وہ خدا کی ذات کا موازنہ کر سکے۔ اس لئے وہ خدا کی ذات کے بلاواسطہ(Direct) ادراک سے قاصر رہتا ہے۔ دماغ اللہ کی ذات کا ادراک صرف اس کی تخلیقات پر غور و فکر کرنے سے ہی کر سکتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے دماغ کی اِسی بے بسی کی طرف اشارہ کیا تھا جب آپؓ نے فرمایا تھا:

'اَلْعِجْزُ عَنْ دَرْکِ الذَّاتِ اِدْرَاکٌ'

اللہ کی ذات کا ادراک نہ کر سکنا ہی اس کا حقیقی ادراک ہے۔

اس کے برعکس انسانی دل انفارمیشن کی پیچیدگیوں میں کم ہی پڑتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ٹارچ میں سے نکلنے والی روشنی کی شعاع اندھیرے کو چیرتی ہوئی سیدھی اس چیز پر پڑتی ہے جسے ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔ محقق ڈاک چلڈر(Doc Childre)اور ہاورڈ مارٹن (Howard Martin)اپنی کتاب '*The Heart Math Solution*'(مطبوعہ نیو یارک 1999ء) میں لکھتے ہیں کہ انسانی دل کی ذہانت ایسی ہوتی ہے کہ وہ آنے والی معلومات کو منطق کی بجائے وجدانی(Intuitive) اور زیادہ بلاواسطہ(Direct) طریقے سے دیکھتی ہے۔

درحقیقت زندگی کی بہت سی ایسی حقیقتیں ہوتی ہیں جنہیں منطق سے اور عقل کے زور پر نہیں سمجھا جا سکتا مثلاً غیب پر ایمان، خدا کی ذات پر ایمان، خدا کی ذات کا خوف وغیرہ۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل کو ایسا بنایا ہے کہ وہ ایسی حقیقتوں کو سمجھ سکتا ہے۔ اسی طرح انسانی دل کی ذہانت اس قسم کی ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کا خیال کرتی ہے(Humanistic Type) اور دوسروں کا درد محسوس کرتی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اقبالؒ نے اشارہ کیا:

درِ دِل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

اس کے برعکس مشہور ماہر نفسیات میہالی (Mihaly) اپنی کتاب '*The Evolving Self*' میں لکھتا ہے کہ ''انسانی دماغ کا یہ وصف ہے کہ وہ اپنے فنا ہونے سے خائف رہتا ہے اور

صرف اپنی ذات کے متعلق سوچتا ہے۔ دماغ ہمیشہ بد سے بدتر کی توقع کرتا ہے اور اس کا میلان مایوسی کی طرف ہوتا ہے''۔

یعنی دماغ کی ذہانت خودغرض قسم کی ہوتی ہے۔ جسے صرف اپنی بقاء سے غرض ہوتی ہے۔ ایسے حالات میں دماغ کی ذہانت کو آخرت کی بجائے دنیا کی فکر رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام مالکؒ نے فرمایا تھا:

ليس العلم كثرة الروايات ولكن العلم نور قذفه الله بقلب المومن۔

یعنی علم معلومات کی کثرت کا نام نہیں ہے۔ بلکہ علم ایک نور ہے جسے اللہ مومن کے دل میں ڈال دیتا ہے۔

حقیقی علم معلومات کی کثرت کا نام نہیں بلکہ اللہ کی ذات کو پہچاننا، انسان کی تخلیق کے مقصد کو سمجھنا اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے اپنی کم مائیگی اور بے حیثیتی کو سمجھنے کا نام ہے۔ حقیقی علم کی کچھ ایسی ہی تعریف امام شافعیؒ نے بھی بیان کی تھی۔ جب آپؒ نے اپنے اشعار میں فرمایا تھا:

شكوت الى وكيع سوء حفظ

فارشدني الى ترك المعاصي

واخبرني بان العلم نور

ونور الله لا يعطى لعاصي

(دیوان شافعی)

میں نے اپنے استاد وکیع سے اپنے حافظے کی کمزوری کی شکایت کی تو انہوں نے مجھے نصیحت کی کہ میں گناہوں کو چھوڑ دوں۔ اور انہوں نے مجھے بتایا کہ علم ایک نور ہے اور اللہ تعالیٰ یہ نور کسی گنہگار کو عطا نہیں کرتا۔

ان اشعار میں امام شافعیؒ دل کے حافظے کی بات کر رہے ہیں۔ حدیث نبویﷺ میں آتا ہے کہ ہر گناہ کی وجہ سے آدمی کے دل پر ایک سیاہ دھبہ پڑ جاتا ہے۔ اگر آدمی گناہ سے توبہ کر لے تو وہ سیاہ دھبہ دل پر سے غائب ہوجاتا ہے وگرنہ مزید گناہ کرنے کی وجہ سے وہ سیاہ

دھبے بڑھتے رہتے ہیں حتیٰ کہ انسان کا دل مکمل طور پر سیاہ ہوجاتا ہے۔ یہاں امام شافعیؒ ذہن کے حافظے کی بات نہیں کر رہے کیونکہ وہ حافظہ تو بڑے بڑے سرکش اور گنہگار لوگوں کا بھی تیز ہوتا ہے لیکن اگر ان کا دل مردہ ہوتو وہ تیز ذہن ان کو جہنم کی آگ سے نہیں بچا سکتا۔اس کے برعکس جو شخص اللہ کے احکامات کی اطاعت کرے، اللہ تعالیٰ اس کے دل میں علم کا نور ڈال دیتا ہے۔اللہ تعالیٰ اس کے دل کا حافظہ تیز کردیتا ہے اور اسے دین کی صحیح سمجھ عطا فرما دیتا ہے جیسا کہ حدیث نبوی ﷺ میں آیا ہے:

'من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین'

اللہ تعالیٰ جس سے بہتری کا ارادہ فرماتا ہے، اس کو دین کی سمجھ عطا فرما دیتا ہے

....

''معلوم ہونا چاہیئے کہ انسانی جسم میں سب سے زیادہ اعلیٰ و افضل عضو دل ہے۔یہی اللہ کو جانتا ہے، اس کے لئے عمل کرتا ہے اور اس کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور اللہ کے قریب کرنے والا اور صاحب مکاشفہ بھی یہی ہے اور اعضاء اس کے تابعدار اور خادم ہیں۔وہ ان سے اس طرح کام لیتا ہے جیسے بادشاہ غلاموں سے۔یہ سچ ہے کہ جس نے اپنے دل کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا''۔ (علامہ ابن جوزی: منہاج القاصدین)

''گو کہ قلب جو روح کا کنٹرول سنٹر ہے وہ انسان کے جسمانی دل سے مختلف ہے لیکن دونوں کی کارکردگی کا آپس میں گہرا رابطہ ہوتا ہے۔ دل میں جو خصوصیت بھی پیدا ہوتی ہے اس کے اثرات تمام جسم کے اعضاء تک پھیل جاتے ہیں اور وہ اعضاء اسی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ اسی طرح انسانی جسم کے اعضاء اچھے یا بُرے جو عمل بھی کرتے ہیں ان کے اثرات دل پر مرتب ہوتے ہیں''۔ (امام غزالی: احیاء العلوم)

تفہیم مغرب

ڈاکٹر محمد امین

مغربی فکر کی اساسیات (۳)

تجربیت (Empiricism):

تجربیت سے مراد ہے وحی اور عقل سے حاصل ہونے والے علم کے مقابلے میں حسیات سے حاصل ہونے والے علم کو یقینی اور حتمی ماننا۔ یہ تقابل شروع ہی سے فکر انسانی میں موجود رہا ہے۔ وحی کی برتری کو ماننے والے اہل مذہب ہیں، عقل کو منبع علم سمجھنے والے اکثر غیر مذہبی فلسفی ہیں جب کہ سائنس دان (اور سائنسی منہج پر مبنی دیگر علوم کے ماہرین) حسی علم کو حتمی اور یقینی سمجھتے ہیں۔ یونان قدیم کے سوفسطائی حسیات کو علم انسانی کا ماخذ سمجھتے تھے جب کہ افلاطون اور اس کے ہم خیال یہ سمجھتے تھے کہ ذہن بذات خود (حسی تجربے اور مشاہدے کی صداقت کے بغیر) صداقت کے انکشاف پر قادر ہے۔ رومیوں اور قرون مظلمہ سے گزر کر جب یہ علمی روایت احیائے علوم کے دور میں داخل ہوئی تو کائنات کی حقیقت سے متعلق دو نظریے وجود میں آئے۔ ایک وہ جو افلاطون اور ارسطو کی روایت کی یادگار تھا اور جس کی رو سے امثال حقیقی ہیں اور دوسرا وہ جس کی رو سے کائنات کی حقیقی اشیاء خاص اشیاء ہیں جو ہمارے تجربے اور مشاہدے میں آتی ہیں۔ پہلی روایت سے (عیسائی) مذہب نے اپنی تصدیق کا کام لیا اور دوسری روایت نے جدید سائنس کی بنیادیں استوار کیں۔ سائنس میں گلیلیو اور فلسفے میں فرانسس بیکن ان رجحانات کے ترجمان سمجھے جاتے ہیں۔

بیکن کے نزدیک علم کا ماخذ حسیات ہیں اور علم صرف انسانی تجربے ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس نے فلسفے کو مذہب سے جدا کر کے علم کو بے مصرف اور بے ثمر رجحان قرار دیا۔ تھامس ہوبز نے بھی حسیات ہی کو علم کا ماخذ قرار دیا اور سائنس اور فلسفے کو مذہب (علم کلام) سے نجات دلانے کی دعوت دی۔ نیوٹن کی طرح جان لاک بھی تجربے اور مشاہدے سے علمی نتائج اخذ کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ازلی و ابدی صداقتوں کا کوئی وجود نہیں ہے اور حس ہی ہمارے علم کا ماخذ ہے۔ اس نے ضمیر کے وجود کا بھی انکار کیا اور کہا کہ اخلاقی قوانین جبلی نہیں ہوتے بلکہ حسیات کے ذریعے حاصل کیے ہوئے

علم کی روشنی میں ہم جو رائے (صحیح یا غلط) قائم کرتے ہیں وہی ضمیر ہے۔سیاست میں وہ عوام کی حاکمیت کے نظریے کا علمبردار تھا۔ ہیوم نے جو اٹھارویں صدی کے تشکک کا امام تھا، لاک کے فلسفہ تجربیت کو منطقی انجام تک پہنچا دیا۔اس نے کہا کہ انسانی تجربہ ہی انسانی علم کا ماخذ ہے اور صرف انہی اشیاء کا وجود ہے جن کا ادراک کیا جاسکے۔اس بناء پر اس نے نفس انسانی، روح اور خدا کا انکار کردیا کیونکہ یہ تصورات قابل ادراک نہیں ہیں۔انیسویں صدی میں کومتے، بنتھم اور ولیم جیمز نے ہیوم کے اثرات قبول کیے۔

کومتے کو ایجابیت (Positivism) کا بانی کہا جاتا ہے جو تجربیت ہی کی ایک صورت ہے۔ اس کے نزدیک کائنات اور کائنات میں انسان کے مقام کا تعین انسانی مشاہدے اور تجربے ہی کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے۔اس اساس پر وہ انسان کو مرکز کائنات سمجھتا ہے کیونکہ خدا پر ایمان لانا اور کسی وجود مطلق کو ماننا انسانی تجربے سے متجاوز ہے لہٰذا اس کے نزدیک ایک ہی وجود مطلق ہے اور وہ ہے انسانیت عالیہ لہٰذا صرف انسان کی فلاح و بہبود کی کوشش ہی نیکی ہے۔اسی طرح کومتے کے نزدیک انسانی ذہن تین مراحل سے گزرا ہے: مذہب، مابعد الطبیعیات اور مرحلۂ ایجابیت یا سائنس۔ اس کے نزدیک مذہب اور مابعد الطبیعیات قصۂ پارینہ بن چکے ہیں اور اب سائنس کی خدائی کا دور ہے۔

امریکہ کے نتائج پسند فلاسفہ ولیم جیمز اور ڈیوی اور دوسرے دور کے تجربیت پسندوں میں سے جان اسٹوارٹ مل اور بنتھم کومتے کے افکار سے بہت متاثر ہیں۔اسی طرح درخائیم، لیوی بروہل، تین اور رینان نے کومتے کے عمرانی نظریات کو بیسویں صدی میں نیا آہنگ دیا ہے۔

جان اسٹورٹ مل بھی جرمی بنتھم کی طرح افادیت (Utilitarianism) کا قائل ہے اور اس کی طرح زیادہ سے زیادہ انسانوں کو زیادہ سے زیادہ مسرت بہم پہنچانے کو اخلاقیات کا نصب العین قرار دیتا ہے۔وہ کہتا ہے کہ چونکہ صرف لذت کی خواہش کی جاتی ہے اس لئے لذت ہی مستحسن ہے جب کہ بنتھم تو یہاں تک کہتا ہے کہ لذت ہی خیر ہے اور اذیت ہی شر ہے اور افادیت ہی ہر شے کا معیار ہے۔

امریکی نتائجیت (Pragmatism) کا شارح ولیم جیمز ہے جو لاک، ہیوم، کانٹ، پیرس اور کومتے کے افکار کا جامع تھا۔ولیم جیمز کسی صداقت مطلق کا قائل نہیں تھا اور وجود مطلق کو ''مابعد الطبیعی

عفریت'' کا نام دیتا تھا۔ اس کے خیال میں صرف وہی اشیاء موضوع بحث بن سکتی ہیں جو انسانی تجربے سے لی گئی ہوں۔ انسانی تجربہ ہی حقیقت ہے اور صرف انسانی مشاہدہ اور تجربہ ہی علم کا اصل ماخذ ہے۔ اس کے نزدیک نتائجیت ایک طریق فکر ہے جس کا مقصود کسی نوع کی ازلی صداقتوں کا کھوج لگانا نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس بات سے انسانی تجربے یا طرز عمل میں کچھ فرق نہیں پڑتا کہ آیا وجود مطلق ہے یا نہیں۔ جیمز کی افادیت اور نتائج پسندی کا یہ عالم ہے کہ وہ مذہب کو بھی نتائج کی کسوٹی پر پرکھتا ہے اس کے نزدیک ایمان کا جوہر نہ جذبہ ہے نہ عقل بلکہ ایمان لانے کا ارادہ ہے جسے سائنسی طریقوں سے ثابت کیا جا سکتا۔ مذہب میں کسی صداقت مطلق کا کھوج نہیں لگایا جا سکتا البتہ یہ سوال پوچھا جاسکتا ہے کہ کیا خدا، حیات بعد الموت اور قدر و اختیار پر عقیدہ رکھنے سے ہمیں کوئی عملی (دنیاوی) فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہوتو ان عقائد کے اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

نتائجیت کا ایک مشہور شارح جان ڈیوی ہے جو جیمز ہی کی طرح فکر انسانی کو محض ایک آلہ سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک کسی نظریے کی عملی کامیابی کی طرف رہنمائی ہی اس کی صداقت کا واحد معیار ہے۔ انگلستان کے پروفیسر شلر نے نتائجیت کو انسان پسندی سے مربوط کرنے کی کوشش کی۔ اس کے نزدیک جو کچھ بھی انسان کے لئے صحیح ہے اسے کسی مافوق الفطرت ہستی کی بجائے انسانی مفاد ہی کی پرورش کرنی چاہئے۔ گویا خدا کو بھی صرف اس لئے مانو کہ اس سے دنیوی فائدہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اس سے بڑھ کر سیکولرزم اور لادینیت کا تصور کیا ہوسکتا ہے کہ عملی کامیابی، نتیجہ خیزی اور افادیت کو افکار کی صداقت کا واحد معیار قرار دیا جائے بلکہ یہ تو محض کاروباری ذہنیت کی عکاسی ہے۔

تجربیت اور اس کی بعض ذیلی شاخوں کے اس مختصر بیان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تجربیت نے نہ صرف مذہب اور وحی کی برتری کو رد کیا بلکہ ادراک حقائق کا انحصار محض انسانی مشاہدے اور حسی تجربے کو قرار دے کر اسے ایک متبادل مذہب اور نظریۂ حیات بنا کر پیش کیا۔ اس نقطۂ نظر نے انیسویں اور بیسویں صدی میں نہ صرف سائنس کو پروان چڑھایا بلکہ سائنسی نقطۂ نظر کو دوسرے علوم و فنون پر بھی غالب کر دیا اور انہیں لادینیت بلکہ دین دشمنی کے رنگ میں رنگ دیا۔

مدیر کے نام

البرہان کے اجراء پر مبارکباد کے پیغامات کا سلسلہ جاری ہے گوجرانوالہ سے مولانا زاہد الراشدی صاحب، اسلام آباد سے مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین جناب افتخار عارف صاحب، جوہر آباد سے معروف مصنف جناب عبدالرشید ارشد صاحب، لاہور کے کتاب جو جناب شبیر میواتی صاحب، اور تعلیمی ریفارمر جناب جہانگیر محمود صاحب، مولانا اسرائیل صاحب(مانسہرہ)، ڈاکٹر انعام اللہ صاحب(اٹک)، عبداللہ صاحب(خوشاب)، بلال اسلامک سنٹر (وہاڑی) کے اللہ داد نظامی صاحب، چنیوٹ سے جناب آفتاب عروج صاحب، اور فضل کریم بھٹی صاحب (راولپنڈی) وغیرھم نے فون اور خط کے ذریعے مبارکباد دی۔ مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب (مدیر اعلیٰ ماہنامہ القاسم ومہتم جامعہ ابی ہریرہ) نے ہمارے کہے بغیر القاسم کے بیک ٹائٹل پر البرہان کے اجراء کا اشتہار شائع فرمایا اور جناب مجیب الرحمٰن شامی صاحب نے البرہان کے مضامین میں خصوصی دلچسپی لی۔

☆کئی دنوں سے آپ بہت یاد آرہے تھے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ آپ کہاں ہیں اور کس غار میں امام غائب بن کر چھپ گئے ہیں۔معلوم نہیں کہ یہ میری کرامت ہے یا آپ کی ولایت کہ کل 'البرھان' آیا اور آپ کے متعلق علم ہوا کہ آپ کن معاملات میں الجھے ہوئے ہیں۔

البرہان دیکھ کر اور پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ یہ اگست ۲۰۱۰ء کا رسالہ ہے اور ماشاءاللہ آغاز نہایت عمدہ ہے۔اس کے تمام مندرجات علمی، تحقیقی اور اصلاحی نوعیت کے ہیں مجلّے کا بہت اچھا نام ہے اور ان شاءاللہ اس کا دائرہ اشاعت بہت وسیع ہوگا۔لوگ اس سے استفادہ کریں گے۔آپ استقلال اور دلجمعی سے کام کرتے رہیں۔ **ان اللہ لایضیع اجر المحسنین۔**

محمد اسحاق بھٹی
(محقق، ادیب اور مصنف کتب کثیرہ)

☆تعلیم کو اس کے صحیح خدوخال کے ساتھ مقصدیت میں ڈھالنے کی جدوجہد میں معروف احباب کے لئے البرہان ایک مشعل راہ ہے۔امید ہے کہ یہ آئندہ بھی اسی آب وتاب سے تعلیمی صحافت کے اُفق پر چمکتا رہے گا۔

ظفر اقبال بلوچ
(جنرل سیکرٹری شان اسلام تعلیمی پراجیکٹ، گلبرگ لاہور)

میری بُکّل دے وِچ چور

یعنی چورتو میرے دامن کے اندر چھپا بیٹھا ہے

یہ غالباً ۱۹۸۵ء کی بات ہے کہ پاکستان کی 'اسلامی تحریک' حسب معمول انتخابات میں شکست کھا گئی۔ اس پر ہمارے دوست مدیر تکبیر محمد صلاح الدین مرحوم اور تحریک کے ایک رہنما کے درمیان طویل بحث چھڑ گئی کہ اس شکست کے اسباب کیا تھے اور ان پر کیسے قابو پایا جا سکتا ہے۔ اس بحث کی تفصیلات سے قطع نظر ہوا یہ کہ اس بحث سے ہمارے اندر سویا تحقیق کا طالب علم جاگ اٹھا اور ہم نے اپنے تئیں اس بات پر مطالعہ اور غور وفکر شروع کر دیا کہ ان ناکامیوں کا بنیادی سبب کیا ہے۔ ہم بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ مذکورہ تحریک کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ اجتماعی سیاسی جدوجہد کے ذریعے پاکستان میں اسلامی انقلاب لایا جائے جب کہ ہم یہ سمجھے کہ حقیقی انقلاب تو فرد کے دل سے پھوٹتا ہے لہٰذا جب تک فرد نہ بدلے اور افراد کے بدلنے سے معاشرہ نہ بدلے (کہ معاشرہ افراد ہی کا مجموعہ ہوتا ہے) اسلام کے حق میں کوئی انقلاب کیسے آ سکتا ہے؟ گویا اسلامی انقلاب لانے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ فرد پر فوکس کیا جائے اور معاشرے کی اصلاح کی جائے۔ جب وہاں تبدیلی آئے گی تو سیاسی تبدیلی اس کے نتیجے میں ضرور آئے گی۔

جب ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ تبدیلی باہر سے نہیں اندر سے آتی ہے تو فطری اور منطقی طور پر اگلا سوال یہ تھا کہ کیا ہمارے اندر وہ تبدیلی واقع ہوئی ہے؟ اور ہم اس کا ادراک کر کے پریشان ہو گئے کہ وہ تبدیلی تو ہمارے اندر بھی پوری طرح واقع نہیں ہوئی۔ گویا جس چور کو ہم باہر تلاش کر رہے تھے وہ تو ہمارے دامن کے اندر چھپا بیٹھا تھا۔ تب سے ہم اپنی اصلاح کی کوشش میں لگ گئے اب اس کا نتیجہ یہ تو نہیں نکلا کہ اس کوشش کے نتیجے میں ہماری مکمل اصلاح ہو گئی ہو لیکن اتنا ضرور ہوا ہے کہ ہماری ذاتی اصلاح کی کوشش اور اس کے لیے فکرمندی کبھی ماند نہیں پڑی ــــ شائد اللہ تعالیٰ اس ٹوٹی پھوٹی کوشش ہی کو قبول فرمالیں اور بخش دیں کہ وہ غفور بھی ہیں اور رحیم بھی۔

تب سے یہ حال بھی ہے کہ کہ صحبت صالحین کی طلب وجستجو رہتی ہے ؎

احبّ الصالحین ولستُ منھم
لعلّ اللہ یرزقنی صلاحاً

امین

مدیر

توہینِ رسالت

مغرب اور مغرب کے غلام مسلم حکمرانوں کا رویہ

ہمارے عہد کے عالم اسلام کا بہت بڑا المیہ اور مسئلہ یہ ہے کہ عوام اور ان کے حکمرانوں میں بُعد ہے۔ عوام اسلام اور اسلامی تعلیمات و اقدار پر عمل چاہتے ہیں جبکہ ان کے حکمران اہل مغرب کے حاشیہ نشین بنے ہوئے ہیں اور اقتدار میں آنے اور رہنے کے لیے مسلم عوام پر انحصار کرنے کی بجائے امریکہ و یورپ کی کفش برداری اور غلامی کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ اس مسئلے پر قابو پانے میں امت ابھی تک ناکام ہے اور اس کے سکالر اور حکمت کار (Strategists) بھی اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کا کوئی قابل عمل حل ابھی تک نہیں ڈھونڈ سکے۔

پچھلے کچھ عرصے سے اہل یورپ نے مسلمانوں کو ذلیل و رسوا اور مشتعل کرنے کا یہ طریقہ ڈھونڈا ہے کہ وہ نبیٔ محترم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی توہین کرتے ہیں تا کہ مسلمان مشتعل ہوں اور انہیں دہشت گرد اور انتہا پسند کہا جا سکے۔ گوری چمڑی والوں کے دیکھا دیکھی مسلمان ملکوں میں کالے عیسائیوں نے بھی پر پُرزے نکالنے شروع کر دیے ہیں اور وہ نبی کریم ﷺ کی اہانت کو معمولی بات سمجھتے ہیں اور جب ان کے خلاف قانون حرکت میں آتا ہے تو ایسے شریر اور بدبخت لوگوں کو بچانے کے لیے سارا امریکہ اور یورپ حرکت میں آ جاتا ہے۔ اہل مغرب کا یہ طرز عمل افسوسناک ہے لیکن اس سے زیادہ افسوسناک ان مسلم حکمرانوں کا طرز عمل ہے جو مغرب کے دباؤ پر متعلقہ قانون کو ختم یا غیر مؤثر کرنا چاہتے ہیں اور مجرموں کو اہل مغرب کے حوالے کرنا چاہتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے نہ ان کی دینی غیرت کو ٹھیس پہنچتی ہے اور نہ ان کی حمیت جوش میں آتی ہے۔

اللہ ایسے بے غیرت، بزدل اور بے حمیت حکمرانوں سے ہمیں بچائے۔ پاکستانی عوام کو چاہیے کہ اس معاملے میں ہر قسم کے مسلکی اور سیاسی اختلافات سے بالاتر ہوتے ہوئے نبیٔ پاک ﷺ کی حرمت کے لیے سیسہ پلائی دیوار بن جائیں اور ڈٹ کر اندرونی و بیرونی دشمنوں کا مقابلہ کریں۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

دینی مدارس کے نظام تعلیم کو مزید مؤثر کیسے بنایا جائے؟

۱۸ دسمبر ۲۰۱۰ء کو تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ کے صدر ڈاکٹر محمد امین صاحب کا جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ علامہ اقبال ٹاؤن لاھور میں دینی مدارس کے اساتذہ کی تربیتی نشست سے خطاب (ادارہ)۔

حمد وثناء کے بعد،

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے معاشرے میں جتنا دین باقی ہے اس میں بڑا کردار ان علماء کرام کی قربانیوں کا ہے جنہوں نے بھوکے رہ کر اور آسائشیں تج کر دینی مدارس کو زندہ رکھا، مساجد کو آباد کیا اور معاشرتی رسم ورواج میں دینی تعلیمات کو باقی رکھا خصوصاً انگریزی دور میں جب مسلمانوں کا نظام تعلیم تباہ کر دیا گیا تھا اور مغربی فکر وتہذیب پر مبنی تعلیمی نظام ملک میں رائج کر دیا گیا تھا۔ تاہم اگر اہل مدارس خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لیں تو ہم یہ عرض کرنے کی جسارت کریں کہ ہمارا معاشرہ آج دین سے جتنا دور ہے اور تیزی سے ہو رہا ہے اس کی وجہ بھی علماء کرام اور دینی مدارس کے نظام تعلیم کا غیر مؤثر ہو جانا ہے۔

دینی مدارس کے نظام تعلیم میں کن تبدیلیوں کی ضرورت ہے کہ وہ مزید مؤثر ہو جائے اور اپنا کردار احسن طریقے سے ادا کر سکے، ہماری رائے میں اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ دینی مدارس مندرجہ ذیل تین اہم ایشوز پر صحیح مؤقف اختیار کریں:

۱۔ دینی مدارس کے تعلیمی مقاصد پر نظر ثانی

۲۔ مغربی فکر وتہذیب کے بارے میں صحیح ردعمل

۳۔ فرقہ واریت کا خاتمہ

ذیل میں ان مباحث کی کچھ تفصیل دی گئی ہے:

دینی تعلیم کے مقاصد واہداف

برصغیر میں انگریزوں کے غلبے سے پہلے ہندوستان کے مدارس میں وہی نظام تعلیم رائج تھا جو پچھلی

بارہ صدیوں سے مسلمان معاشروں میں مروج تھا یعنی مدارس دینی اور دنیاوی دونوں طرح کی تعلیم پرائیویٹ سیکٹر میں دیتے تھے اور ایسے افراد تیار کرتے تھے جو اپنی ذاتی زندگی میں بھی اسلام پرعمل کریں اور معاشرے اور ریاست کو بھی اسلامی تناظر میں چلاسکیں۔ چنانچہ مدارس میں قرآن، حدیث، فقہ اورعربی زبان کے ساتھ طب(میڈیسن)، ہندسہ(انجینئرنگ)،فلکیات(اسٹرانومی)، کیمیا(کیمسٹری) اور ریاضی جیسے سائنسی علوم بھی پڑھائے جاتے تھے اورمنطق، فلسفہ، السنہ(زبانیں) ادب، تاریخ، قانون جیسے عمرانی علوم بھی۔ خود اس نصاب پر ایک نظر ڈالیں جو ملا نظام الدین سہالویؒ نے برصغیر کے مدارس کے لیے ترتیب دیا تھاتو معلوم ہوگا کہ اس میں قرآن وسنت کا نصاب بہت ہلکا ہے یعنی تفسیر میں صرف بیضاوی اور حدیث میں صرف مشکوۃ تھی باقی سارے علوم وہ تھے جن کی مسلم معاشرے اور ریاست کوضرورت تھی۔

لیکن برصغیر میں جب انگریز نے مسلمانوں کا نظام تعلیم قوت سے ختم کردیا اوراپنا نظام تعلیم جاری کردیا تو علماء کرام ریاست کے وسائل سے محروم ہوگئے اور معاشرہ بھی لوٹ کھسوٹ اور زبوں حالی کا شکار ہوگیا۔ تب علماء کرام نے آگے بڑھ کر معاشرے کو جہالت اور بے دینی کے سیلاب سے بچایا او رروکھی سوکھی کھا کر اورمٹی کے حجروں میں بیٹھ کرقرآن وسنت کی تعلیم دی تاکہ مساجد آباد رہیں اور مسلمان نکاح، طلاق، اور شادی وغم کی رسمیں اسلامی تعلیمات کے مطابق ادا کرسکیں۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد جب ریاست وحکومت مسلمانوں کومنتقل ہوگئی تو اب علماء کرام کا فرض تھا کہ وہ اس عارضی تعلیمی بندوبست کوترک کردیتے جو وقتی طور پرانہوں نے انگریزی اقتدار کی وجہ سے اختیار کیا تھا اور اس مستقل نظام تعلیم کی طرف مراجعت کرلیتے جواسلاف کا منہج تھا اورصدیوں سے مسلم معاشرے میں جاری تھا یعنی وہ رجال کار تیار کرتے مسلم معاشرے اور ریاست کے لیے نہ کہ صرف مساجد و مدارس کے لیےلیکن بوجوہ علماء کرام یہ نہ کرسکے۔

علماء کرام کے اس مطلوبہ تبدیلی کوقبول نہ کرنے کے دوبہت بڑے نقصان ہوئے۔ ایک یہ کہ معاشرے اور ریاست کو چلانے والے افراد تیار نہ کرکے گویا انہوں نے معاشرے اور ریاست کو چلانے کا کام خود ان لوگوں کے سپرد کردیا جومغرب سے مرعوب تھے، غلامانہ ذہنیت رکھتے تھے اور

اقتدار کی خاطر اپنے سابقہ آقاؤں کے ایجنٹ بن کر مسلم معاشرے اور ریاست کو اسلام کی بجائے مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب کے مطابق چلانا چاہتے تھے۔ دوسرے یہ کہ اس سے دین و دنیا میں تفریق اور سیکولرزم کی وہ دراڑ جو قرن اوّل میں حضرت حسین بن علیؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی شہادت کے بعد اہل علم و اصلاح کی حکومت و ریاست سے بُعد کی وجہ سے مسلم معاشرے میں پیدا ہوئی تھی اب نا قابل عبور شگاف کی صورت اختیار کر گئی نتیجتاً مسلم معاشرے میں مسٹر اور ملا اور مذہبی و غیر مذہبی شخصیت کی تفریق اسلام کی بنیادی اقدار کی نفی کر رہی ہے۔

دینی مدارس چلانے والے علماء کرام سے اگر کبھی اس موضوع پر بات ہوتو وہ کہتے ہیں کہ یہ حکومت کا کام ہے کہ وہ ملک کے عمومی تعلیم کے ادارے چلائے ہم تو رو پیٹ کر اور کھینچ تان کر اپنے مدارس ہی چلالیں تو یہ بہت بڑا کام ہے۔ہمیں علماء کرام کے اس جواب سے ہرگز اتفاق نہیں کیونکہ جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا کہ مسلمانوں کا پورا نظام تعلیم صدر اسلام سے علماء کرام کے ہاتھوں میں اور پرائیویٹ سیکٹر میں رہا ہے اور معاشرہ اور حکومت دونوں اس کام میں ان کی غیر مشروط امداد کرتے رہے ہیں۔ آج بھی اگر وہ اسے چلانے کے لیے کھڑے ہو جائیں تو معاشرہ ضرور ان کا ساتھ دے گا خواہ حکومت نہ بھی دے۔ علماء کرام کے اسی رویے کا شاخسانہ ہے کہ عام افراد معاشرہ روایتی مدرسے اور درس نظامی کو تو دینی کام اور کار ثواب سمجھتے ہیں لیکن ہماری طرح کا اِکا دُکا آدمی اگر اس پورے کام کو کرنا چاہے جو ماضی میں مدارس انجام دیتے تھے تو عوام اسے 'دینی کام' ہی نہیں سمجھتے جو باعث ثواب ہو۔غرض یہ کہ علماء کرام اور دینی مدارس کو بغیر تاخیر کے یہ فیصلہ اب کر لینا چاہیے کہ وہ تعلیم صرف مسجد اور مدرسے کے لیے رجال کار تیار کرنے کے لیے نہیں دیں گے بلکہ اس کے ساتھ معاشرے اور ریاست کے کارکن بھی انہوں نے تیار کرنے ہیں؟ ہماری رائے میں جب تک وہ یہ صحیح فیصلہ نہیں کریں گے معاشرے میں دینی مدارس اور ان کے فضلاء کا کام ناقص اور غیر مؤثر رہے گا اور معاشرہ بداخلاقی اور مغربی فکر وتہذیب کی پیروی کے اندھے راستے پر بگٹٹ دوڑتا رہے گا۔ یہ ہماری رائے ہے جب کہ بعض سخت مزاج لوگ ایسے بھی ہیں جو دینی مدارس کے اس رویے کو صریحاً غیر اسلامی رویہ سمجھتے ہیں۔

مغربی فکر وتہذیب کے بارے میں ردعمل

دوسرا بہت اہم معاملہ جس کے بارے میں دینی مدارس کو اپنے فیصلے پر فوری نظر ثانی کی ضرورت ہے وہ مغرب کی ملحدانہ اور اسلام مخالف فکر وتہذیب کے بارے میں ان کا رویہ ہے۔ مغربی تہذیب کے بارے میں علماء کرام کے رویے کو جذبات پر مبنی نفرت اور صَرفِ نظر کا رویہ کہہ سکتے ہیں جو ملک اور ملت کے لیے انتہائی مضر ثابت ہورہا ہے۔ انگریز چونکہ غاصب اور ظالم تھا اور مسلمانوں خصوصاً علماء کرام کو کچل کر برصغیر میں حاکم بنا تھا اور اس نے مسلم اداروں خصوصاً ان کے نظام تعلیم کا بھی خاتمہ کیا تھا جو مدارس کی صورت میں علماء کرام کے ہاتھوں میں تھا، اس لیے علماء کرام کی انگریز سے نفرت بجا تھی اور ان کا 'ہم اس کافرانہ نظام سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے' کا رویہ بھی جواز رکھتا تھا لیکن اب لاتعلقی کا یہ رویہ امت کے لیے بہت نقصان کا باعث بن رہا ہے جس کے چند بڑے مظاہر یہ ہیں:

۱۔ نظام تعلیم کا کچھ جزوی حصہ تو علماء کرام کے ہاتھوں میں رہا جس پر انہوں نے خوب کام کیا لیکن باقی ساری تعلیم انگریز اور اس کی فکر سے مرعوب مسلمانوں کے ہاتھوں میں چلی گئی اور وہ غیر اسلامی خطوط پر ترقی کرتی رہی یہاں تک کہ آج سکول سے لے کر یونیورسٹی تک جو تعلیمی ادارے معاشرے اور ریاست کو چلانے والے رجال کار تیار کر رہے ہیں ان میں نہ دینی تعلیم ہے نہ تربیت۔ حکومت پاکستان کے اعداد وشمار کے مطابق صرف پرائمری سطح پر داخلہ لینے والے طلبہ کی تعداد ۵ کروڑ ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان کروڑوں مسلمان بچوں کی دینی تعلیم وتربیت نہ کرنے کی ذمہ داری سے علماء کرام کیسے بری الذمہ ہوسکتے ہیں؟ یاد رہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد سے دو نسلیں مغرب سے مرعوبیت اور اسلام سے بُعد پر مبنی یہ تعلیم حاصل کرچکی ہیں اور وہی آج ملک اور معاشرہ چلا رہی ہیں اور معاشرے میں سارا اخلاقی بگاڑ انہی کا لایا ہوا ہے کیونکہ ان کی تعلیم وتربیت میں اہل دین اور علماء کا کوئی کردار ہے ہی نہیں یا محض برائے نام ہے۔

۲۔ استعمار سے نفرت اور لاتعلقی کی جذباتی فضاء میں علماء کرام نے یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ مغرب کا فکر وفلسفہ ہے کیا؟ ان کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ یہ غیر اسلامی ہے لیکن اب جب کہ استعمار

یہاں سے بظاہر چلا گیا اور خود مدارس کے اندر سے دو نسلیں اس حالت میں گزر گئیں تو اب مدارس کے طلبہ میں مغرب سے جذباتی نفرت کی تندی بھی باقی نہیں رہی اور انہیں یہ بھی خبر نہیں کہ مغربی فکر و تہذیب ہے کیا؟ جب کہ معاشرے کی یہ حالت ہے کہ نہ صرف عام تعلیم کا سارا ڈھانچہ مغرب زدہ ہوگیا ہے بلکہ پورا معاشرہ مغرب کی ملحدانہ فکر و تہذیب کا نخچیر ہو چکا ہے اور پوری معاشرتی فضاء مغرب کی اندھی نقالی کی نذر ہوگئی ہے۔ ان حالات میں دینی مدارس کا مغربی فکر وتہذیب سے لاتعلقی کا رویہ سخت نقصان دہ ہے اور اس امر کی فوری ضرورت ہے کہ علماء کرام مغربی فکر وتہذیب کا مطالعہ کریں اور دینی مدارس میں طلبہ کو باقاعدہ ایک مضمون کی صورت میں پڑھائیں تا کہ وہ جان سکیں کہ مغرب کی فکر وتہذیب کیسے ملحدانہ اور اسلام دشمن ہے تا کہ یہ طلبہ جب فارغ التحصیل ہو کر معاشرے میں جائیں تو یہ ان کے جمعہ کے مواعظ اور درس و تدریس کا حصہ بنے۔

۳۔ علماء کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ امت مسلمہ ایک مشنری امت ہے اور علماء کرام کا بنیادی کام ہی دین کی دعوت لوگوں تک پہنچانا ہے خواہ مخاطب مسلمان ہوں یا غیر مسلم لیکن دعوت وتبلیغ اور تزکیہ واصلاح کا کام اس وقت تک مؤثر طور پر نہیں ہوسکتا جب تک آپ مخاطب کے ذہن اور اس کی فکری بناوٹ کو نہ سمجھتے ہوں۔ اب مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب دنیا کی غالب فکر وتہذیب ہے اور مسلم وغیر مسلم سب اس سے متاثر ومرعوب ہیں خواہ وہ پاکستان میں ہوں یا ہندوستان میں، ایشیا میں ہوں یا افریقہ میں اور یورپ میں ہوں یا امریکہ میں۔ لیکن دینی مدارس میں علماء کرام نے چونکہ مغربی فکر وتہذیب کا مطالعہ نہیں کیا ہوتا اس لیے نہ وہ مغربی تہذیب کو سمجھتے ہیں اور نہ اس کی فکری بنیادوں کو اور نہ اس سے متاثر اذہان کے اشکالات کو ۔ اس پس منظر میں علماء کرام نہ تو مسلمانوں کی اصلاح وتزکیے کے لیے مؤثر انداز میں کام کر سکتے ہیں، نہ وہ مغربی تہذیب سے مرعوب مسلمانوں کے ذہنی وفکری مسائل سمجھ سکتے ہیں اور نہ غیر مسلموں تک موزوں اسلوب وانداز میں دعوت دین پہنچا سکتے ہیں خصوصاً جب کہ ان کے ہاں انگریزی اور دیگر زبانیں پڑھنے کا رواج ہی نہیں۔

۴۔ مغربی فکر وتہذیب کا غیر اسلامی بلکہ اسلام دشمن ہونا واضح ہے لیکن جب تک علماء کرام اس فکر

وتہذیب کا مطالعہ نہ کریں گے اور اسے اچھی طرح نہیں سمجھیں گے وہ اس کا رد کیسے کریں گے؟ امام غزالیؒ نے جب یونانی فلسفہ کو رد کرنا چاہا تو پہلے انہوں نے یونانی فلسفے کا مطالعہ کیا اور اسے سمجھا اور مقاصد الفلاسفہ لکھی، پھر اس کا رد کیا اور تہافتہ الفلاسفہ لکھی۔ یہی کام کی صحیح ترتیب ہے کہ آج بھی علماء کرام پہلے مغربی فکر وفلسفے کو پڑھیں، اسے سمجھیں اور پھر اس کا رد کریں۔ اسے پڑھے اور سمجھے بغیر وہ اس کا رد کس طرح کر سکتے ہیں؟

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دینی مدارس میں مغربی فکروتہذیب کا مطالعہ ناگزیر ہے اور اسے نصاب کا حصہ بننا چاہیے ورنہ دینی مدارس کے فضلاء عصر حاضر کی فکر اور اس کے تحدیات کو سمجھنے اور ان کا حل پیش کرنے میں ناکام رہیں گے۔

فرقہ واریت کا رد

تیسرا بڑا مسئلہ جس کے بارے میں دینی مدارس کو ایک متوازن اور فیصلہ کن رویہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے وہ فرقہ واریت ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ علماء کے درمیان علمی وفکری اختلاف ہونا ایک فطری اور منطقی امر ہے اور یہ ہرگز قابل مذمت نہیں۔ اسی طرح بعض فقہی اور کلامی اختلافات مسالک اور مکاتب فکر کی صورت اختیار کر چکے ہیں جیسے ائمہ اربعہ کے مابین اختلافات یا اہل الرائے اور اہل الحدیث کا اختلاف یا اہل سنت اور اہل تشیع کا اختلاف۔ لیکن یہ مکاتب فکر اور مسالک صدیوں کا تاریخی سفر طے کرنے کے بعد معروف اور پختہ ہو چکے ہیں اور اب انہیں سبب نزاع وتعصب بنانے کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ ان کی بنیاد پر معاشرے کو تقسیم کرنے اور لڑانے کی کوئی گنجائش ہے۔ ہماری یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ دینی مسالک کو باہم لڑانے کا کام ہمارے یہاں پہلے انگریز اور اس کی خفیہ ایجنسیوں نے کیا اور اب ان کی مدد کے لیے ان کے غلام مسلمان حکمران اور ان کی خفیہ ایجنسیاں بھی اس گناہ بے لذت میں شریک ہوگئی ہیں۔ لہٰذا یہ علماء کرام کی فراست واخلاص کا امتحان ہے کہ وہ ان ایجنسیوں کے قابو نہ آئیں اور ان کے ہاتھوں میں نہ کھیلیں۔ اس کی سب سے نمایاں مثال مسلک کی بنیاد پر بننے والی دینی سیاسی جماعتیں ہیں۔ جس آدمی کے پاس ذرا سی بھی عقل ہو وہ سمجھ سکتا ہے کہ اگر دینی مسلک کی بنیاد پر سیاسی جماعت بنے گی تو ایک مسلک کے حامل دوسرے مسلک کی سیاسی

جماعت کو ووٹ نہیں دیں گے لہٰذا مسلک کی بنیاد پر بنی ہوئی سیاسی جماعت قیامت تک انتخابات میں کامیاب نہیں ہوسکتی اور اقتدار میں نہیں آسکتی اس کے باوجود ایجنسیوں نے بعض علماء کو انگیخت کر کے ہر دینی مسلک کی سیاسی جماعت بنوائی اور انہیں آپس میں خوب لڑایا جس کے نتیجے میں ان کے حصے میں ناکامی آئی، دین کی ہوا خیزی ہوئی اور سیکولر سیاسی جماعتوں کو حکمرانی کا موقع ملا۔لطف کی بات یہ ہے کہ آئین پاکستان کی رو سے زبان، نسل، رنگ، علاقے، مسلک کی بنیاد پر سیاسی جماعت بنانا ممنوع ہے لیکن ہماری اسٹیبلشمنٹ دینی جماعتوں کو باہم لڑانے کے لیے آئین پر عمل کی بات ہی نہیں کرتی۔

دوسرا خنّاس جوان ایجنسیوں نے ہمارے دینی مسالک کے نچلی سطح کے واعظین کے دماغوں میں بھر دیا ہے وہ یہ ہے کہ حق صرف ہمارے مسلک میں منحصر ہے اور باقی سب مسالک والے کافر یا کم از کم گمراہ ضرور ہیں۔ ذرا تصور کیجیے کہ ہمارے ملک میں تقریباً ۸۰ فیصد احناف ہیں لیکن انہیں دیوبندی اور بریلوی میں تقسیم کر کے انہیں متحارب دھڑے بنادیا گیا ہے اور کسی کو اس کا احساس تک نہیں۔ یہی حال دوسرے مسلکوں کا ہے۔

ہم پھر کہتے ہیں کہ علماء کرام کے درمیان اختلافات موجود ہیں اور یہ ہرگز قابل مذمت نہیں۔ جہاں بھی اہل علم اور سوچنے سمجھنے والے لوگ ہوں گے فکر ونظر میں اختلاف ہوگا لیکن ان اجتہادی اور فروعی اختلافات کو تعصب میں بدلنا اور اس بناء پر معاشرے کو تقسیم کرنا قابل مذمت ہے اور یہی فرقہ واریت ہے جو بُری ہے۔آیئے ایک نظر اس پر ڈالیں کہ مغربی اور پاکستانی حکمرانوں اور ان کی خفیہ ایجنسیوں نے کس طرح اپنے انتظامی اقدامات کے ذریعے اور چھوٹی سطح کے بعض واعظین اور علماء کو اپنا آلۂ کار بنا کر فرقہ واریت کے عفریت کو زندہ رکھا ہوا ہے بلکہ اسے پال پوس کر بڑھا رہے ہیں:

۱۔ حکومت نے مساجد اور مدارس کو مسلکوں میں بانٹنے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور وہ اس طرح کہ حکومت مسلک کی بنیاد پر رجسٹریشن قبول کرتی ہے۔اگر حکمران اس کی حوصلہ شکنی کرنا چاہتے تو کہہ سکتے تھے کہ مسجد کے نام میں اگر فرقہ واریت ہوئی تو رجسٹریشن نہیں ہوگی۔اگر ایسا ہوتا تو مسجدیں اللہ کا گھر ہی رہتیں فرقہ واریت کا گڑھ نہ بنتیں۔

۲۔ دینی تعلیم کا ایک ہی وفاق بن سکتا تھا اور آج بھی بن سکتا ہے اور وہ یوں کہ اس کے دوسیکشن بنا دیئے جائیں ایک اہل سنت کا اور دوسرا اہل تشیع کا۔ اہل سنت کے سیکشن میں بریلوی، دیوبندی، اہل حدیث اور جماعت اسلامی کا نصاب ایک ہو البتہ کتابیں مختلف رکھنے کی اجازت ہو — یاد رہے کہ اہل سنت کے ان چاروں وفاقوں کو آسانی سے ایک نصاب پر جمع کیا جا سکتا ہے بلکہ ان کا نصاب اس وقت بھی تقریباً یکساں ہی ہے لیکن حکومت نے جان بوجھ کر اور سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پانچ وفاق بنائے ہیں تا کہ ہر فرقے کا الگ وفاق ہو، الگ نصاب اور کتابیں ہوں تا کہ فرقہ واریت پھلتی پھولتی اور مستحکم ہوتی رہے۔

۳۔ مرکز اور صوبوں میں اوقاف کی وزارتیں اور محکمے موجود ہیں جن کے پاس سیکڑوں مسجدیں اور بیسیوں دینی مدارس ہیں جن میں ہزاروں خطیب، امام، مؤذن اور علماء کرام ملازمت کرتے ہیں لیکن یہ سارا کام بھی مسلک کی بنیاد پر ہوتا ہے اور کسی حکومت نے کبھی کوشش نہیں کی کہ ان اداروں کا نظم و نسق غیر فرقہ وارانہ بنیادوں پر چلایا جائے۔

۴۔ دینی مدارس کے اساتذہ کی تربیت کی جا سکتی ہے کہ وہ دوران تدریس دوسرے مسالک کے رد میں مبالغہ آرائی نہ کریں اور ان کے خلاف تعصب نہ پھیلائیں لیکن حکومت نے دینی مدارس کے اساتذہ کی تربیت کی کبھی کوشش نہیں کی۔

۵۔ حکمران اگر اخلاص سے دینی مدارس کے نظام اور نصاب کی اصلاح چاہتے تو یہ ہرگز مشکل نہ تھا اور نہ آج مشکل ہے لیکن اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کام کے لیے معتدل مزاج اور جہاندیدہ علماء کرام کی ایک کمیٹی بنا دی جائے اور حکومت کا ایک آدھ ایسا آدمی، جو علماء کے لیے قابل قبول ہو، ان کے درمیان رابطے کا کام کرے اور ضروری سہولتیں مہیا کرے۔ لیکن ہماری مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتیں کروڑوں بلکہ اربوں روپے تعلیم پر خرچ کرتی ہیں لیکن انہوں نے کبھی ایک دھیلا دینی مدارس کو نہیں دیا۔ الٹا مغربی حکومتوں کے دباؤ پر مدارس کو جکڑنے، پابند بنانے اور ان کے نصاب میں تبدیلیاں کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پھر دینی مدارس اگر ان حکومتی اقدامات کی مزاحمت نہ کریں

تو کیا کریں؟

خلاصہ یہ کہ مغربی حکومتیں اور ان کی ایجنسیاں اور ان کی اقتداء میں ان کے غلام اور ایجنٹ مسلم حکمران، دینی مدارس و مساجد اور علماء کرام میں فرقہ واریت پھیلانے اور مسلک پرستی کو مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں اور یہ محض ڈھونگ ہے کہ وہ اسے ختم کرنا چاہتے ہیں۔

باتیں تو اگرچہ اور بھی ہیں اور وہ اہم بھی ہیں مثلاً طلبہ کی تربیت کا مسئلہ، معیار تعلیم کو بہتر بنانے کا مسئلہ، نصاب پر نظر ثانی اور اساتذہ کی تربیت کا مسئلہ لیکن ہم طوالت سے بچنے کی خاطر صرف ان تین نکات پر اکتفا کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے اس کی تلخیص کے طور پر عرض کرتے ہیں کہ جب تک دینی مدارس:

اوّلاً: اپنے مقاصد تعلیم کو تبدیل نہیں کرتے اور صرف مساجد و مدارس کے لیے رجال کار مہیا کرنے کی پالیسی تبدیل کر کے معاشرے اور ریاست کے لیے کارکن مہیا کرنے کو بھی اپنے دائرہ کار میں شامل نہیں کرتے:

ثانیاً: جب تک وہ مغربی فکر و تہذیب اور اس کے علوم کے مطالعے کو شامل نصاب نہیں کرتے اور اسے اچھی طرح سمجھ کر دلائل کی بنیاد پر اسے رد کرنے کی صلاحیت کے حامل نہیں ہو جاتے:

ثالثاً: فرقہ واریت کے عفریت سے اپنی جان چھڑانے کا اہتمام نہیں کرتے:

اس وقت تک نہ تو وہ معاشرے کا حقیقی جزو بن کر اس سے مربوط ہو سکتے ہیں اور نہ وہ مؤثر طور پر اس پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور نہ وہ فرد اور معاشرے کی ایسی اصلاح کر سکتے ہیں کہ لوگوں کے لیے دینی تعلیمات پر عمل آسان ہو جائے اور وہ دنیا اور آخرت میں کامیاب ہو سکیں۔ لہٰذا یہ وقت کا تقاضا اور ضرورت ہے کہ علماء کرام ان معاملات پر غور فرمائیں اور ان کے حوالے سے ایک صحیح اور مضبوط مؤقف طے کریں اور اس پر عمل درآمد کریں تاکہ دینی مدارس معاشرے میں اپنا کردار مؤثر طریقے سے ادا کر سکیں۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

دینی مدارس کو گھیرنے کی حکومت کی نئی چال

عام لوگ بھی یہ بات جانتے ہیں اور علماء کرام و دینی مدارس چلانے والوں کا تو روز کا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ ہمارے حکمرانوں کو دینی مدارس اور ان کے نظام تعلیم کی بہتری اور افزونی کوئی دلچسپی نہیں۔ مرکزی اور صوبائی حکومتیں کروڑوں اور اربوں روپے مغرب زدہ جدید تعلیم پر ہر سال خرچ کرتی ہیں لیکن دینی مدارس پر وہ ایک روپیہ خرچ کرنے کو تیار نہیں اور جب بھی بیرونی قوتوں خصوصاً امریکہ و یورپ کا دباؤ پڑتا ہے وہ مدارس پر سختی اور پکڑ دھکڑ شروع کر دیتے ہیں۔

اس پس منظر میں حال ہی میں وزارت داخلہ کی زیر نگرانی مدرسہ ایجوکیشن بورڈ اور دینی تعلیم دینے والے وفاقوں کی تنظیم 'اتحاد تنظیمات مدارس' (جس میں ہر وفاق کا صدر اور ناظم اعلیٰ شامل ہوتے ہیں) کے درمیان جو اصولی معاہدہ ہوا ہے اس پر بعض دینی مدارس کے تحفظات بے جا محسوس نہیں ہوتے۔ اس معاہدے میں ابتدائی طور پر یہ طے پایا ہے کہ دینی مدارس میٹرک اور ایف اے کا حکومتی نصاب پڑھائیں گے اور دینی تعلیم کے وفاقوں کو بطور بورڈ ان کا امتحان لینے اور ڈگری جاری کرنے کا اختیار ہوگا۔ ان مجوزہ بورڈوں میں مذکورہ امتحان لینے کے انتظامات میں حکومت کے افراد بھی شامل ہوں گے اور ان بورڈوں کے اوپر نگرانی کے لیے ایک حکومتی ادارہ (غالباً موجودہ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ) موجود ہوگا۔ ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ کے دسمبر کے شمارے میں مولانا محمد حنیف جالندھری صاحب اور جامعہ امدادیہ فیصل آباد کے مولانا محمد زاہد صاحب کے مضامین شائع ہوئے ہیں جو اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہیں۔ موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات انہیں ضرور ملاحظہ فرمالیں۔

اس معاملے میں ہماری رائے یہ ہے کہ:

۱۔ یہ معاہدہ حکومت کی طرف سے مدارس کو گھیرنے کی ایک نئی چال ہے۔ مرکزی حکومت کی ژولیدہ فکری اور مدارس سے عدم دلچسپی کا تو یہ حال ہے کہ ابھی اس نے یہ بھی طے نہیں کیا کہ مرکزی حکومت

کی کون سی وزارت اور شعبہ مدارس کو ڈیل کرے گا۔ وزارت داخلہ اسے امن و امان اور سیکورٹی کا مسئلہ سمجھتی ہے کہ ان کے آقایان ولی نعمت مدارس کو دہشت گردی اور انتہاپسندی کے مراکز سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک وہ سیکورٹی رسک ہیں۔وزارت مذہبی امور، مذہبی تعلیم کو ایک مذہبی معاملہ سمجھ کر دینی مدارس سے ڈیل کرنا چاہتی ہے جبکہ تعلیم اور خصوصاً نصاب وغیرہ مرکزی وزارت تعلیم کا شعبہ ہے۔ بہرحال مذکورہ معاہدہ وزارت داخلہ کی نگرانی میں ہوا ہے جس میں مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے سربراہ فعال کردار ادا کررہے ہیں جو سابق سیکرٹری وزارت مذہبی امور ہونے کی وجہ سے دینی وفاقوں کے ذمہ داران سے قریبی تعلقات بھی رکھتے ہیں۔ یہ بات بہرحال ظاہر ہے کہ حکومت جو کچھ کررہی ہے وہ مغربی دباؤ کے تحت کررہی ہے جہاں سے اسے اس مد میں کافی پیسے بھی ملے ہوئے ہیں (جنہیں استعمال کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ تحرک ضروری ہے) اور اسے ایک انتظامی اور امن و امان کا مسئلہ سمجھ کر ڈیل کررہی ہے۔حکومت کا ایک نعرہ مدارس کی تعلیم کو مین اسٹریم یعنی تعلیم کے مرکزی دھارے کے ساتھ ملانا بھی ہے۔لہٰذا اگر مدارس حکومتی سکیم اور نصاب کے مطابق میٹرک، ایف اے کرانے پر تیار ہوجائیں تو واقعی یہ حکومت کی کامیابی ہے۔مدارس کا خدشہ اس ضمن میں یہ ہے کہ اگر وہ تعلیم کے مرکزی دھارے میں شریک ہوگئے تو جلد یا بدیر ان کی شناخت اور وجود گم ہوجائے گا اور حکمرانوں کے رویوں کے پیش نظر مدارس کے اس خدشے میں وزن بھی محسوس ہوتا ہے۔

۔ سوال یہ ہے کہ اس معاہدے میں دینی مدارس کے وفاقوں کے پیش نظر کیا ہے؟ اگر وہ اصلاح کے خواہش منداور دینی مدارس کے کردار کو مزید مؤثر بنانا چاہتے ہیں تو یہ خواہش فطری اور جینوئن ہے لیکن معروضی حالات کا تقاضا ہے کہ مدارس یہ کام خود کریں اور اس کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھیں اور اس میں حکومت کو شامل نہ کریں۔ اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ 'اتحاد تنظیمات مدارس' سارے وفاقوں کے دو دو موزوں ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی بنادے جو اس ضمن میں سفارشات تیار کرے اور ہر وفاق اپنے اپنے پلیٹ فارم پر بحث و مناقشہ کے بعد اسے منظور کرکے اپنا لے۔'اتحاد تنظیمات مدارس' کے ذمہ داران اگر مناسب سمجھیں تو ان سفارشات کو پبلک بھی کردیں تا کہ مدارس کے بہی خواہ اور ان کے

معاملات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات بھی اگر کوئی مشورہ دیں تو اسے بھی زیرغور لے آیا جائے کہ مشاورت میں بہرحال خیر ہی خیر ہے (اس ضمن میں راقم نے تو ابتداء بھی کر دی ہے اور 'دینی مدارس کے نظام تعلیم کو مؤثر کیسے بنایا جائے؟' کے موضوع پر ایک تحریر البرہان کے تازہ شمارے میں موجود ہے)۔

۔ زیر بحث معاہدے کے حوالے سے وفاق حکومت کے پاس کیوں گئے ہیں؟ اپنی ڈگریاں منوانے؟ سوال یہ ہے کہ وفاق اپنی ڈگریاں کیوں منوانا چاہتے ہیں؟ کیا وہ چاہتے ہیں کہ ان کے فضلاء کو معاشرے اور ریاست میں ملازمتیں ملیں؟ اگر اس کا جواب 'ہاں' میں ہے تو یہ تبدیلی خوش آئند ہے کہ مدارس ایسے افراد تیار کرنا چاہتے ہیں جو مدارس و مساجد کے علاوہ مسلم معاشرے اور ریاست کے لیے بھی مفید خدمات انجام دے سکیں۔لیکن یہ ایک بڑی تبدیلی ہے اور اس کے بہت سے تقاضے ہیں۔ مدارس کو پہلے بیٹھ کر شعوری طور پر اس تبدیلی اور اس کے تقاضوں پر غور کرنا چاہیے۔ بطور مدارس کے بہی خواہ کے ہماری طالب علمانہ رائے میں اس کا جو طریقہ مجوزہ معاہدے میں مذکور ہوا ہے کہ مدارس میٹرک اور ایف اے کے مضامین پڑھا دیں تو یہ دینی مدارس اور مسلم معاشرے کے لیے نقصان دہ ہے کیونکہ:

۔ اس سے تعلیم میں موجودہ ثنویت اور دوئی مزید مستحکم ہوگی جو ایک طرح کا سیکولرزم ہے کہ درس نظامی الگ اور جدید تعلیم الگ۔ وہ اکٹھے نہیں ہو سکتے البتہ دونوں کو علی حالہ (؟) قائم رکھتے ہوئے الگ الگ پڑھایا جا سکتا ہے۔

۔ ہم جیسے لوگوں کے چیخ چیخ کر گلے بیٹھ گئے ہیں کہ موجودہ جدید یا عمومی نظام تعلیم خصوصاً اس کا نصاب مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب پر مبنی ہے اور اس کا زہر اس کے ہر ہر جزیئے میں موجود ہے لہٰذا اسے تبدیل کرنا ضروری ہے۔ دینی مدارس کو ہرگز اسے جوں کا توں قبول نہیں کرنا چاہیے اور اگر انہوں نے کر لیا تو ان کے طلبہ ہرگز اس کے بد اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔ مدارس اگر اس مغرب زدہ نظام اور اس کے نصاب کو قبول کرتے ہیں تو ہمیں کہنے دیجیے کہ یہ سادہ لوحی نہیں حماقت ہوگی۔

(حکومت اگر وفاقوں کو بورڈ تسلیم کرتی ہے تو غالبًا وہ یہ بھی منوائے گی کہ اس میں سارے مضامین کے امتحان دینے کی گنجائش ہو صرف عربی اسلامیات کی نہیں)۔

۔ اوّل تو میٹرک، ایف اے (اور بی اے، ایم اے) کے حکومتی نصابات قرآن کا حرف نہیں کہ انہیں تبدیل نہ کیا جاسکے اس لیے مدارس کو اصرار کر کے انہیں تبدیل کروانا چاہیے یا اگر وہ نصاب نہیں بدلوا سکتے تو کم از کم اتنا تو ضرور ہی انہیں کرنا چاہیے کہ وہ اس نصاب کے مطابق اپنی کتابیں خود تیار کریں یا کرائیں۔ اس کی گنجائش قانون میں موجود ہے اور سیکولر لوگ اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ مدارس کیوں نہیں اس سے دینی مقاصد کے لیے فائدہ اٹھاتے؟

پیشکش: ہم دینی مدارس کو پیشکش کرتے ہیں کہ اگر وہ چاہیں تو ہمارا ادارہ یہ کام انہیں کر کے دے سکتا ہے۔

۔ اور اگر مدارس ایف اے، بی اے اسلامیات و عربی کے ساتھ کرانا چاہیں تو اس کے لیے حکومت کے ساتھ کسی معاہدے کی ضرورت ہی نہیں کہ یہ سہولت تو پہلے سے موجود ہے۔ لیکن یہ کام نصابی وحدت کے ساتھ کرنا چاہیے اور جدید تقاضوں اور ضرورتوں کو سامنے رکھ کر کرنا چاہیے نہ کہ دونوں نصابوں کو علیحدہ علیحدہ علی حالہ (؟) قائم رکھتے ہوئے۔ اس کا ایک ماڈل تو وہ ہوسکتا ہے جو ہم نے اپنے ادارے 'صفاء اسلامک سنٹر' کے لیے تیار کیا ہے۔ علماء کرام اگر چاہیں تو ہم انہیں ان کی مرضی اور ضرورت کے مطابق نئے نصابی ماڈل تیار کر کے ان کے غور وفکر کے لیے پیش کر سکتے ہیں۔ بنگلہ دیش، انڈونیشیا اور سعودی عرب میں اس کے کامیاب تجربات ہو چکے ہیں تو پاکستان میں کیوں یہ کام نہیں ہوسکتا؟

۔ دینی مدارس کے نصاب کی ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ ان کے طلبہ کو مغربی فکر و تہذیب اور اس کے علوم سے متعارف کرایا جائے جس میں ان پر اسلامی نقطۂ نظر سے نقد بھی شامل ہو۔ اس کام کی تدوین کے بعد وفاقوں کو اسے سارے مدارس میں رائج کرنا چاہیے (ہم نے اس کام کی ابتداء کر رکھی ہے اور اگر اللہ تعالیٰ نے اس کے اکمال کی توفیق عطا فرمائی تو ہم مدارس کی خدمت میں ضرور پیش کریں گے)۔

۔ دینی مدارس کی خواہش تو یہ تھی کہ ان کی ڈگریاں حکومت تسلیم کرے لیکن مذکورہ معاہدے میں 'اتحاد تنظیمات مدارس' نے اپنی ڈگریاں تسلیم کرانے کی بجائے حکومتی ڈگریاں منظور کر لی ہیں اور وہ بھی

حکومتی مداخلت اور بالادستی کے ساتھ۔ یہ گھاٹے کا سودا ہے اور معاہدہ چونکہ ابھی تک محض اصولی ہے جس کی تفصیلات پر ابھی کام ہوگا لہٰذا ہمیں توقع ہے کہ اتحاد تنظیمات مدارس کے ذمہ داران، ان شاء اللہ، دھوکہ نہیں کھائیں گے اور یہ معاہدہ ان شاء اللہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچے گا۔

ہمیں ان لوگوں کے خدشات بھی بے جا محسوس ہوتے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ اتحاد کے صدر اور ناظم اعلیٰ (جناب مفتی منیب الرحمٰن صاحب اور مولانا قاری محمد حنیف جالندھری صاحب) حکومت کے بارے میں نرم رویہ رکھتے ہیں لہٰذا حکومت کے مطالبات مانے جاسکتے ہیں اور ایسا معاہدہ ہوسکتا ہے جو مدارس کے لیے مفید نہ ہو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اتحاد کی قیادت، ان شاء اللہ، زیرک لوگوں کے ہاتھ میں ہے اور وہ حکومت کے کسی بھی جال اور چال میں نہیں آئیں گے، ان شاء اللہ۔

آخر میں ہم اپنی اس گزارش کو دہرائیں گے کہ دینی مدارس کے نظام تعلیم کو مزید مؤثر بنانے کی غرض سے اس میں اصلاحات کی ضرورت ہے۔ اور یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ ایسا ہر نظام تعلیم میں ہوتا ہے لہٰذا دینی مدارس اور وفاقوں کو چاہیے کہ وہ اس سلسلے میں ضروری اقدامات کریں۔ جو امور ان کی خصوصی توجہ کے مستحق ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ تعلیمی ثنویت کا خاتمہ اور نظام تعلیم کی وحدت
۲۔ مغربی فکر وتہذیب کا مطالعہ اور اس کا رد
۳۔ فرقہ واریت میں کمی
۴۔ نصاب پر نظر ثانی
۵۔ تربیت اساتذہ
۶۔ معیار تعلیم کو بہتر بنانا
۷۔ طلبہ کی تربیت۔۔۔ وغیرہ

غامدی مکتب فکر۔ علماء کرام کا ردعمل

جناب جاوید احمد غامدی صاحب اور ان کے شاگردوں کا حلقۂ فکر اگر چہ پہلے بھی موجود تھا لیکن پچھلی دہائی میں امریکہ کے پاکستان میں بڑھتے ہوئے مفادات اور ان کے ایجنٹ پاکستانی حکمرانوں نے انہیں الیکٹرانک میڈیا پر ابھرنے کا موقع دیا جس سے ان کا نقطہ نظر عام لوگوں تک پہنچا۔ وہ اپنے آپ کو حریت فکر کا پاسبان اور مجتہد سمجھتے ہیں جو عصری تقاضوں کے مطابق اسلام کی تشریح وتعبیر کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ علماء اور اسلامی دانشوروں میں غامدی صاحب کے مکتب فکر کے بارے میں تین طرح کی آراء پائی جاتی ہیں:

۱۔ اِکا دُکا افراد حسن نیت سے یا جدیدیت کے جراثیم رکھنے کی وجہ سے ان کے نقطۂ نظر سے ہمدردی رکھتے ہیں اور ان کے کام کو سراہتے ہیں۔ ان میں سے بعض ان سے بحث و مباحثہ کر کے اپنے تئیں انہیں ان کی فروگزاشتوں پر متنبہ کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں تا کہ وہ دین کے مرکزی دھارے (یعنی مین اسٹریم اسلام) کے قریب آ جائیں۔ وہ غامدی صاحب کی آراء و افکار کو دین کی ممکن و جائز تعبیرات میں سے ایک تعبیر سمجھتے ہیں۔

۲۔ علماء اور سکالرز کی ایک بہت بڑی اکثریت انہیں گمراہ سمجھتی ہے کیونکہ وہ اجماع اور اسلاف کی تعبیر دین کو رد کرتے ہیں، قرآن کی من مانی تشریح کرتے ہیں، سنت کا استخفاف کرتے ہیں اور سرسید اور پرویز کی طرح مغربی فکر وتہذیب کے تقاضوں کے مطابق اسلام کو ڈھالنے کی سعی نامسعود کرتے ہیں لیکن ان علماء کی اکثریت غامدی صاحب اور ان کے مکتب فکر کے رد میں زیادہ فعال نہیں ہے کیونکہ انہوں نے نہ تو تفصیل سے غامدی صاحب کے لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے، نہ وہ جدید علوم میں زیادہ دسترس رکھتے ہیں اور نہ وہ ان کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اگر کبھی ان کا ٹکراؤ اور مباحثہ غامدی صاحب سے ہو جائے تو وہ کمزور پڑتے دکھائی دیتے ہیں کیونکہ غامدی صاحب بات متانت اور دلیل سے کرتے ہیں اور دلائل کی بھی ان کے پاس کمی نہیں کیونکہ انہوں نے برسوں سے اس کی تیاری کر رکھی ہے اور ان کا مطالعہ وسیع ہے جبکہ مخالفین کی زیادہ تیاری نہیں ہوتی اور وہ خود کو حق پر سمجھنے اور مخاطب کو گمراہ سمجھنے کی بناء پر جلد غصے میں آ جاتے ہیں لہٰذا مباحثہ کے شرکاء پر ان کا مثبت اثر نہیں پڑتا۔

۳۔ علماء اور اسلامی سکالرز کا ایک اور گروہ غامدی صاحب اور ان کے تلامذہ کو غلام احمد قادیانی کی

طرح ملت کا غدار سمجھتا ہے۔ان کی رائے میں جس طرح قادیانی نے اپنی حب جاہ و مال اور بڑا بننے کی خاطر اپنی فراست اور ہوشیاری سے اس وقت کی ورلڈ پاور اور مغربی فکر وتہذیب کی نمائندہ طاقت (تاج برطانیہ) کی اس ضرورت کومحسوس کر لیا تھا کہ انہیں برصغیر میں جہاد کے رد اور مسلمانوں کو تاج برطانیہ کا وفادار بنانے اور رکھنے کے لیے ایک دینی شخصیت اور گروہ کی ضرورت ہے تو اس نے خود کو اس کام کے لیے پیش کر دیا اور سلطنت برطانیہ کی خفیہ و اعلانیہ حمایت وقوت سے اپنی نبوت کا کاروبار چلا لیا۔تفردات تو مولانا حمید الدین فراہی صاحب کے بھی تھے لیکن علماء نے ان کے تقویٰ و اخلاص کے پیش نظر ان سے صرف نظر کیا۔ اسی طرح مولانا امین احسن اصلاحی صاحب حجیت حدیث وغیرہ میں مستشرقین سے متاثر ضرور تھے لیکن علماء نے ان کی علمی صلابت اور اخلاص کے پیش نظر ان کے تفردات کو بھی برداشت کر لیاالبتہ جاوید احمد غامدی صاحب نے غلام احمد قادیانی کی طرح اپنی ہوشیاری وفراست سے جب یہ دیکھا کہ آج کی ورلڈ پاور اور مغربی تہذیب کے غلبے کے علمبردار امریکہ اور اس کے حواریوں کو پاکستان میں ایک ایسے دینی لیڈر کی ضرورت ہے جو اسلام کو مغربی تہذیب کا چولا پہنا سکے اور مغربی فکر وتہذیب کے تقاضوں اور امریکی خواہشات کے مطابق اسلام کا ایک نیا ایڈیشن تیار کر سکے تو ان کے اندر حب جاہ و مال اور بڑا بننے کی جوخواہش تھی اس نے انہیں یہ راہ سجھائی کہ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے چنانچہ انہوں نے آگے بڑھ کر یہ محاذ سنبھال لیا اور واشنگٹن کی اشیر باد اور اسلام آباد کی حمایت سے ان پر اور ان کے شاگردوں پر الیکٹرانک میڈیا کے دروازے کھل گئے، نشر و اشاعت اور ادارہ سازی کے وسائل بھی آ گئے۔ یونیورسٹیوں، بنکوں اور اسلامی نظریاتی کونسل جیسے سرکاری اداروں میں ان کے لیے جگہ نکالی گئی۔ انٹرنیٹ اور مغربی رسائل میں ذکر بھی آنے لگا۔ یوں غامدی صاحب اور ان کی فکر معروف ہوگئی۔ اس پس منظر میں علماء اور اسلامی سکالرز کا ایک گروہ سمجھتا ہے کہ غامدی صاحب محض گمراہ نہیں بلکہ وہ غلام احمد قادیانی کی طرح ملت کے غدار بھی ہیں اور مغرب اور امریکہ کے ایجنٹ کے طور پر اسلام کا ایک نیا ایڈیشن پیش کر رہے ہیں۔

یہ ایک تجزیہ تھا غامدی مکتب فکر کے بارے میں علماء کرام اور اسلامی سکالرز کے ردعمل کا—جہاں تک ہمارے ذاتی مؤقف کا تعلق ہے تو ہم ان شاء اللہ اگلے کسی شمارے میں اس پر اظہار خیال کریں گے۔

تعلیمی بگاڑ میں اضافے کے لیے

مرکزی حکومت کی مدہوشی

افراد اور معاشرے کے عروج وزوال اور بناؤ بگاڑ میں تعلیم اہم کردار ادا کرتی ہے۔ پاکستان جیسے ملک میں جہاں نظام حکومت فیڈرل ہے اور صوبوں کی اکائیاں مضبوط تاریخی، علاقائی، لسانی اور ثقافتی پس منظر رکھتی ہیں وہاں ان اکائیوں کو جوڑے رکھنے، باہم افہام وتفہیم بڑھانے اور طے شدہ مشترکہ قومی مقاصد کے لیے متحد رکھنے میں اہم کردار تعلیم ہی ادا کرسکتی ہے اور اسی وجہ سے تعلیم خصوصاً اس کا نصاب سازی کا ڈھانچہ مرکز کے پاس ہوتا ہے تاکہ وہ قومی یک جہتی کا سامان کرسکے۔ صوبوں کے حقوق اپنی جگہ اور وہ صوبوں کو ضرور ملنے چاہئیں لیکن جب سے ہمارے ہاں اسلام اور پاکستان دشمن بیرونی قوتوں کی درپردہ مدد سے صوبہ پرستی شروع ہوئی ہے اور 'قوم پرستی' کے نام پر مرکز گریز قوتوں نے راہ بنانی شروع کی ہے صرف یکساں نظام تعلیم ہی ایک ایسی شے ہے جسے مرکز فیڈریشن قوم کو متحد رکھنے میں استعمال کرسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۷۳ء کا دستور بنانے والوں نے نصاب سازی کا شعبہ مرکز کے پاس رکھا تھا اور اس کے باوجود کہ مرکزی حکومت نے اس سے شعوری طور پر زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا اور تعلیم کو اسلام، نظریۂ پاکستان اور قومی یک جہتی کے لیے کماحقہ استعمال نہیں کیا تاہم اس شعبے کے مرکز کے ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے کسی صوبے کو نصاب سازی اور نصابی کتب کی تیاری میں انتہا پسندی اور سیکولرزم کے فروغ کے لیے تعلیم کا ہتھیار نہیں مل سکا۔ اب جبکہ اٹھارویں ترمیم کے نتیجے میں مرکز کے اختیارات صوبوں کو منتقل کیے جارہے ہیں تعلیم اور نصاب سازی کا شعبہ بھی صوبوں کو منتقل کیے جانے کی خبریں اخبارات میں آرہی ہیں۔ یہ بات خوش آئند ہے کہ وفاقی وزارت تعلیم نے رضا ربانی کمیٹی کو خط لکھا ہے کہ نصاب سازی کا شعبہ مرکز کے پاس رہنے دیا جائے اور صوبوں کو منتقل نہ کیا جائے۔

ہم عرض کرتے ہیں کہ اس بات کو ہلکا نہ لیا جائے اور اس بات کی اہمیت کو سمجھا جائے کہ نصاب سازی کا شعبہ بہر قیمت مرکز کے پاس رہنا چاہیے اور تعلیم کے اسلامی اور قومی کردار کی حفاظت کی جائے ورنہ قومی شیرازہ بکھرنے میں دیر نہ لگے گی لہٰذا نصاب سازی کا شعبہ صوبوں کو منتقل کرنے کی غلطی ہرگز نہ کی جائے۔

تعلیمی بگاڑ میں اضافے کے لیے

پنجاب حکومت کی گرم جوشی

میاں شہباز شریف صاحب کی یہ خوبی بہرحال قابل تعریف ہے کہ وہ متحرک حکمران ہیں اور حکومت چلانے والے اہل کاروں کو بھی دوڑائے رکھتے ہیں اور غفلت کی نیند سونے نہیں دیتے اور اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ وہ تعلیم پر بہت پیسہ خرچ کر رہے ہیں لیکن نظریاتی سمت درست نہ ہونے کی وجہ سے اس بھاگ دوڑ کا نتیجہ سیکولرزم اور بیرونی ایجنڈے کے فروغ کے سوا کچھ نہیں نکلے گا اور یہی چیز قوم کے لیے مہلک ہے۔ کیا یہ قابل افسوس نہیں کہ وہ مسلم لیگ جس کے قائد نے پاکستان بنایا تھا اور یہ اعلان کیا تھا کہ پاکستان اسلام کا قلعہ ہوگا اور قیام پاکستان کے فوراً بعد انہوں نے کراچی میں تعلیمی کانفرنس بلوائی اور اس میں اعلان کیا کہ پاکستان میں تعلیم نظریاتی اور اسلامی ہوگی، اسی مسلم لیگ کا آج کا قائد پاکستان کے سب سے بڑے صوبے پنجاب میں تعلیم میں سیکولرزم کو اور مغربی ایجنڈے کو فروغ دے رہا ہے۔ بیرونی ایجنڈا یہ ہے کہ پاکستان میں تعلیم کے پبلک سیکٹر کو کمزور کیا جائے کیونکہ اس میں اسلامیت اور پاکستانیت کے کچھ جراثیم پائے جاتے ہیں اور وہ سستی ہونے کی وجہ سے غریب عوام کی پہنچ میں بھی ہے۔ پرائیویٹ سیکٹر نہ صرف تعلیم کو مہنگا کر رہا ہے اور یوں شرح تعلیم میں اضافے کو روک رہا ہے بلکہ اسے ویسٹرنائیز کر کے اسلامی اصولوں اور اقدار کو بھی تباہ و برباد کر رہا ہے۔ پنجاب کی حکومت یہ سب دیکھ رہی ہے اور ٹس سے مس نہی ہو رہی۔ الٹا اس نے پنجاب کے ۱۶ بڑے کالجوں کو پرائیویٹائزیشن کی راہ پر ڈال دیا ہے جس کا نتیجہ بہرحال جلد یا بدیر پبلک سیکٹر کی کمزوری، تعلیم کی مہنگائی اور تعلیم کو سیکولر اور مغرب زدہ بنانے کی صورت میں نکلے گا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جب طلبہ اور اساتذہ اس کے خلاف احتجاج کرتے ہیں تو انہیں پولیس کی مدد سے مارا پیٹا جاتا اور سزا دی جاتی ہے۔

ہم میاں نواز شریف صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے برادر اصغر کو سمجھائیں کہ تعلیم کو پرائیویٹائز کرنے، مہنگا کرنے، اس کا اسلامی کردار کمزور کرنے اور اسے سیکولر اور مغرب زدہ بنانے کا تمغہ اپنے سینے پر نہ سجائیں اور تعلیم کا قبلہ درست رکھیں اور کم از کم اس کا حلیہ مزید تو نہ بگاڑیں۔

ڈاکٹر محمد امین

يا معشر الشباب! ارجعوا الى سبيل ربكم

نوجوانوں کے نام ــــ ایک اہم پیغام

سرمایۂ ملت

نوجوان کسی بھی قوم کا عظیم سرمایہ ہوتے ہیں چنانچہ آج کا مسلم نوجوان بھی امت مسلمہ کے لیے عظیم سرمائے کی حیثیت رکھتا ہے۔ دنیا کی کوئی بھی تحریک اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک نوجوانوں کی قوت اس کے ساتھ نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جب اسلام کی دعوت ابتدائی مرحلے میں اور کمزور تھی تو اللہ کے پیغمبر حضرت محمد ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے خصوصی دعا کی کہ وہ اعلیٰ خاندانی پس منظر اور بہت سی ذاتی خوبیوں کے حامل دو نوجوانوں (عمر بن خطاب اور عمرو بن ہشام) میں سے کسی ایک کو اسلام لانے کی توفیق عطا فرمائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی دعا قبول فرمائی اور حضرت عمر بن خطابؓ کو اسلام لانے کی توفیق دی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند گھنٹے بعد جب نماز کا وقت آیا اور مسلمان دار ارقم میں (چھپ کر) نماز پڑھتے تھے تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ نہیں! آج سے ہم حرم کعبہ میں علی الاعلان جماعت سے نماز ادا کریں گے۔ چنانچہ مسلمان آپ ﷺ کی قیادت میں صف بنا کر حرم کعبہ میں آئے اور حضرت عمرؓ نے کفار مکہ کے سامنے اپنے اسلام لانے کا اقرار کیا اور للکار کر کہا کہ کسی میں ہمت ہے تو ہمیں حرم میں نماز پڑھنے سے روکے۔ یوں حضرت عمرؓ کے اسلام لانے سے کفر کی کمر ٹوٹ گئی، مسلمانوں کو بہت بڑا سہارا ملا اور ان کی ہمت و حوصلے نے نئی انگڑائی لی۔

گمراہی کا خطرہ

لیکن دوسرا پہلو بھی ذرا سامنے رہے اور وہ یہ کہ دوسرا نوجوان جس میں اتنی قوت و صلاحیت تھی کہ وہ نبی ﷺ کی دعا و خواہش کا مصداق اور ہدف بنا، اس نے حق کو رد کردیا اور اس کی صلاحیتیں کفر کے غلبے اور حق کی مزاحمت میں صرف ہوئیں چنانچہ اس کی گمراہی اور کجی کی وجہ سے مسلمانوں نے اسے 'ابوجہل' یعنی جہالت کے سردار کا لقب دیا اور وہ دنیا میں بھی خاسر و ناکام ہوا، ذلت کی موت مرا اور آخرت میں بھی اپنے کفر وظلم کی وجہ سے عتاب الٰہی کا شکار رہوگا۔

اس سے اے نوجوانانِ ملت! یہ سبق ملا کہ جوانی اگرچہ قوت کا منبع ہوتی ہے اور صلاحیتیں اس میں

عروج پر ہوتی ہیں لیکن یہ قوت صحیح راہ میں بھی استعمال ہوسکتی ہے اور غلط راہ میں بھی۔ اس لیے مسلم نوجوان کو چاہیے کہ وہ:

۔ ہمیشہ اس کا استحضار رکھے کہ یہ جوانی اور یہ صحت، قوت اور صلاحیت محض اللہ کی دین ہے اور اس کی شخصی محنت اور کوشش کا اس میں کوئی دخل نہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو اسے بیمار و معذور بھی کرسکتا تھا یا جوانی سے پہلے دوسرے عالم بھی روانہ کرسکتا تھا۔

۔ اس لیے اس کا فیصلہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ اس اللہ کا بندہ بنے گا جس نے اسے یہ جوانی اور قوت وصلاحیت عطا کی ہے اور وہ اپنی قوتوں کو اللہ کی راہ میں اور اس کی مرضی کے کاموں میں صرف کرے گا اور زندگی اس کے احکام کے مطابق گزارے گا۔

۔ وہ اپنی پوری شعوری قوت سے برائی کا راستہ ترک کرے گا، معصیت اور اللہ کی نافرمانی سے بچے گا اور اپنی جوانی اور قوت وصلاحیت کو اچھے اور تعمیری کاموں میں صرف کرے گا اور نیکی کی قوتوں کا ساتھ دے گا۔

۔ اور نیکی پر چلنے اور برائی سے بچنے کی توفیق بھی اللہ ہی سے طلب کرے گا کیونکہ اس کی مرضی کے بغیر اس کائنات میں درخت کا ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔

مقصدِ زندگی

ایک بات جو شروع ہی سے ہر مسلم نوجوان کے ذہن میں واضح ہوجانی چاہیے وہ یہ ہے کہ اسے اپنے مقصد زندگی کا ادراک ہونا چاہیے۔ اس بات کو اگر ہم فلسفیانہ سطح پر لینے کی بجائے سادہ اور عملی انداز میں لیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک مسلمان کی زندگی کی آخری غایت یہ ہوتی ہے کہ اس کا اللہ اس سے راضی ہوجائے اور اس کی خوشنودی اسے حاصل ہوجائے اور اللہ کی رضا کے حصول کا طریقہ ہے دنیا میں اللہ کی عبادت و اطاعت۔ قرآن نے اس کے لیے ایک ہی لفظ عبودیت استعمال کیا ہے جو ان دونوں باتوں کا جامع ہے۔

عبودیت کیا ہے؟ انسان کا یہ احساس کہ وہ اللہ کا عبد ہے۔ یہ احساس چونکہ بندگی کی جان ہے اور انسان کی ہدایت کا اسی پر انحصار ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال مہربانی سے اسے انسان کی فطرت میں رکھ دیا ہے۔ (آج کی زبان میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ انسان کی جین (gene) میں موجود ہے اور اس کے سٹرکچر میں (built in) ہے لہٰذا اللہ کو ماننا اور اس سے محبت کرنا انسان کی فطرت ہے اور ہمارا دنیا

کا تجربہ یہ ہے کہ ہم جس سے محبت کرتے ہیں وہ ہمیں بہت خوبصورت لگتا ہے۔ ہم اس کے گھر کے چکر لگاتے ہیں (طواف کعبہ) اور اس کے گھر کی دیواروں سے لپٹتے (ملتزم) اور انہیں چومتے ہیں (حجرِ اسود)۔ اسے کبھی بھولتے نہیں ہر وقت اٹھتے، بیٹھتے، لیٹے، کام کرتے اسے یاد رکھتے ہیں (ذکر)۔ اس کی کبریائی کا اقرار کرتے اور اس کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوجاتے ہیں، اس کے آگے جھکتے ہیں بلکہ اس کے سامنے ماتھا ٹیک دیتے ہیں (نماز)۔ اس کی مخلوق سے بھی محبت کرتے ہیں اور اس کا دیا ہوا مال ان پر خرچ کرتے ہیں تا کہ ان کی ضرورتیں پوری ہوجائیں (زکوٰۃ) اور اس کی محبت و اطاعت میں ہمیں کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں رہتا (روزہ)۔ اسلام میں عبادت کی یہی چار شکلیں ہیں نماز (بشمول ذکر)، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔

اور یہی نہیں دنیا میں ہمارا مشاہدہ اور تجربہ یہی ہے کہ ہمارا محبوب ہم سے جو کہے ہم وہ خوشی خوشی کرتے ہیں اور جس سے منع کرے اس سے رک جاتے ہیں بلکہ ہم تو اس کی محبت کی ایک نظر کے منتظر رہتے ہیں کہ وہ ہم سے کچھ کہے تو سہی۔ وہ مطالبہ نہ بھی کرے تو ہم یہ جاننے کی فکر میں رہتے ہیں کہ وہ کن باتوں سے خوش ہوتا ہے تا کہ ہم وہ کریں اور کون سی باتیں اسے اچھی نہیں لگتیں تا کہ ہم ان سے باز رہیں۔ بلکہ ہم وہی کھاتے ہیں جو اسے اچھا لگے، ہم وہی پہنتے ہیں جو اسے بھلا معلوم ہو اور یہی ہے دنیا میں اللہ کی اطاعت کی اساس اور طریقہ کہ ہم دنیا میں وہ سارے کام کریں جو اللہ کو پسند ہیں، جن کا وہ حکم دیتا ہے (اوامر) اور ان سارے کاموں سے ہم رک جائیں جو اسے ناپسند ہیں اور جن سے وہ روکتا ہے (نواہی)۔

پس خلاصہ یہ کہ ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد ہے اللہ کی رضا اور خوشنودی کا حصول اور اس کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ دنیا کی زندگی اللہ کی عبادت اور اطاعت کرتے ہوئے گزاری جائے۔

تعلیم و تربیت کی عمر

تعلیم کیا ہے؟ یہ جاننے کی خواہش و کوشش کہ ہمارا اللہ ہمارا محبوب ہم سے کیا چاہتا ہے؟ ہم جاننا چاہتے ہیں کہ وہ کن باتوں سے خوش ہوتا ہے (تا کہ ہم وہ کریں) اور کن باتوں سے وہ ناراض ہوتا ہے (تا کہ ہم وہ نہ کریں)؛ اور تربیت کیا ہے؟ ہم عملاً ایسے بن جائیں جیسے اللہ ہمیں دیکھنا چاہتا ہے۔ ہمارے اندر یہ صلاحیت پیدا ہوجائے اور ہمیں رغبت اور شوق سے ان کاموں کی عادت پڑ جائے جن سے وہ خوش ہوتا ہے اور ان کاموں سے ہم رک جائیں جو اسے پسند نہیں۔

نوجوانوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ان کی تعلیم وتربیت کی عمر ہے لہٰذا فی الوقت انہیں اپنی ساری قوتیں اور صلاحیتیں صرف اسی کام پر لگانی چاہئیں تاکہ مستقبل میں جو وہ بننا چاہتے ہیں بن سکیں اور جو کرنا چاہتے ہیں اس کی صلاحیت اور مہارت ان کے اندر پیدا ہوجائے۔ ہم نے سوچ کر عملاً دو لفظ استعمال کیے ہیں ایک تعلیم اور دوسرے تربیت۔ تعلیم سے مراد ہے علم حاصل کرنا اور تربیت سے مراد ہے اس علم کے مطابق اپنی شخصیت کو ڈھالنا۔ اس تعریف سے ظاہر ہے کہ یہ دونوں باہم مربوط ہیں لیکن ان کے تقاضے الگ الگ بھی ہیں جیسا کہ ہم آگے ذکر کریں گے۔

تعلیم اور اس کے مسائل

مسلم نوجوانوں کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ وہ نظام تعلیم جو ہمارے معاشرے اور ملک میں مروج اور میسر ہے وہ بڑی حد تک ناقص اور غیر تسلی بخش ہے۔ نظری لحاظ سے اس میں تین بڑے نقائص اور خامیاں ہیں:

۱۔ یہ اسلامی تعلیمات اور اس کے تقاضوں کے مطابق نہیں

۲۔ یہ مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب پر مبنی ہے

۳۔ اس میں اسلامی تربیت اور کردار سازی کا اہتمام نہیں

عملی لحاظ سے اس کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ ثنویت اور دوئی پر مبنی ہے یعنی اس میں دینی اور دینوی تعلیم کا نظام الگ الگ ہے۔ عمومی یا جدید تعلیم جو سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دی جاتی ہے اس میں مؤثر دینی تعلیم وتربیت موجود نہیں اور دینی تعلیم (جو مدارس میں دی جاتی ہے) وہ معاشرے کی عصری ضرورتوں اور تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں اور دینوی علوم کی تدریس اس میں شامل ہی نہیں۔ یوں یہ دونوں اپنی اپنی جگہ ناقص ہیں۔

آج کے نوجوانوں کی بہت بڑی اکثریت چونکہ جدید تعلیم کے اداروں میں پڑھتی ہے جہاں مؤثر دینی تعلیم وتربیت کا اہتمام موجود نہیں لہٰذا نوجوانوں کو ان کے حصول کی بہت فکر کرنی چاہیے اور قرآن وحدیث، عربی زبان اور دیگر اسلامی علوم جاننے کے لیے اپنے طور پر الگ سے جدوجہد کرنی چاہیے۔ الحمدللہ! ہمارے معاشرے میں ایسے افراد اور ادارے موجود ہیں جن سے انہیں اس ضمن میں مدد مل سکتی ہے لیکن اس کا باقاعدہ نظام چونکہ کہیں موجود نہیں اس لیے نوجوانوں کو خود ہی ذاتی دلچسپی لے کر یہ کام کرنا پڑے گا اور یہ کام انہیں ضرور ہی کرنا چاہیے۔ اس کا ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہوگا کہ جس دنیاوی

یا جدید علم کے شعبے میں آگے جا کر وہ تخصص حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ اس کا مطالعہ قرآن و سنت کی روشنی میں بھی کرسکیں گے۔

تربیت وتزکیہ

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا تربیت سے مراد ہے اپنی شخصیت کو حاصل کردہ علم کے مطابق عملاً ڈھال لینا۔ قرآن حکیم اس کے لیے تزکیہ کی اصطلاح استعمال کرتا ہے یعنی اپنے نفس کو غلط رویوں سے بچانا اور اسے صحیح رویوں کا عادی بنانا۔ اسے عام زبان میں تعمیر شخصیت، تعمیر سیرت یا کردار سازی بھی کہتے ہیں۔ یہاں یہ بنیادی حقیقت ذہن میں رہے کہ انسان کی تعمیر شخصیت میں جو چیز بنیادی کردار ادا کرتی ہے وہ اس کا عقیدہ یا ورلڈ ویو ہے یعنی اس کا تصور الہ، تصور انسان اور تصور کائنات۔ اگر اس کا ایمان اور عقیدہ یہ ہے کہ اُس سمیت اِس کائنات کا خالق و مالک اور اسے چلانے والا ایک اللہ ہے اور وہ اس کا حقیر عبد ہے تو اس دنیا میں زندگی گزارنے کے چھوٹے بڑے ہر معاملے میں اسے اللہ کی اس ہدایت پر عمل کرنا چاہیے جو اس نے قرآن اور سنت پیغمبرؐ کی صورت میں اسے عطا کی ہے۔ اگر وہ جانتا ہے کہ یہ دنیا عارضی ہے اور مستقل اور پائیدار زندگی آئندہ آنے والی ہے جس میں دنیا میں اس کے کیے گئے اعمال کا نتیجہ نکلے گا تو اسے دنیا کی زندگی اس طرح گزارنی چاہیے جس طرح اس کا خالق و مالک اللہ چاہتا ہے تاکہ وہ آخرت میں اس سے راضی ہوجائے اور اپنے انعامات (جنت) اور خوشنودی سے اسے نوازے۔ یہ چیز ہے جو انسان کے رویوں اور عادتوں پر اثر انداز ہوتی ہے بلکہ ان کی تشکیل کرتی ہے مثلاً اللہ نے کہا ہے سچ بولو تو اسے سچ بولنا ہے۔ اللہ نے کہا ہے کہ کسی پر ظلم نہ کرو تو اس نے ظلم نہیں کرنا۔ اللہ نے کہا میرے سامنے پانچ وقت جھکو تو اس نے جھکنا ہے۔ اللہ نے کہا غریبوں کی مدد کرو تو اس نے کرنی ہے۔ غرض عملی زندگی میں انسان کے رویے اور اس کی عادتیں ایسی ہی بنتی چلی جاتی ہیں جیسے کہ اس کے عقیدے، علم اور تعلیم کا تقاضا اور مطالبہ ہوتا ہے۔

مسلم ماہرین تربیت وتزکیہ نے پچھلے چودہ سال میں جو تحقیق اور تجربے اس ضمن میں کیے ہیں، ان کی بناء پر ان کا کہنا ہے کہ تربیت میں عملاً سب سے زیادہ کردار دو چیزیں ادا کرتی ہیں ایک استحضار عبدیت اور دوسرے اچھی صحبت۔ استحضار عبدیت سے مراد یہ ہے کہ یہ بات ہر وقت انسان کے ذہن میں تازہ رہے اور بھول نہ جائے کہ ہم اللہ کے عبد ہیں اور وہ ہمارا خالق و مالک اور ہادی ہے اور ہمیں یہی زیبا ہے کہ ہم اس کی عبادت و اطاعت کرتے رہیں۔ اس استحضار عبودیت کے لیے

وہ قرآنی اصطلاح 'ذکر' استعمال کرتے ہیں۔ ذکر کا لفظی مطلب ہے یاد کرنا، یاد رکھنا اور بھول نہ جانا۔ اصطلاحاً اس سے مراد ہے ذکر اللہ یعنی اللہ کے خالق و مالک اور معبود و مطاع ہونے کو اور اپنے عبد اور مطیع و فرماں بردار ہونے کو یاد رکھنا اور اسے بھول نہ جانا۔اس کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اٹھتے، بیٹھتے، چلتے، لیٹے اور کام کرتے غرض ہر وقت اور ہر حالت میں اللہ کو اور اس کی کبریائی اور عظمت کو اور اپنی محتاجی، کمزوری اور خامیوں کو یاد رکھے چنانچہ وہ کہے **سبحان الله**(اے اللہ تو پاک ہے ہر کمزوری اور نقص سے اور میں کمزور اور خطار کار ہوں)، **الله اکبر** (اے اللہ! تو سب سے بڑا اور عظیم ہے اور میں تیرے مقابلے میں حقیر اور کمتر ہوں)، **الحمدللہ** (اے اللہ تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے بندگی کا ادراک عطا فرمایا اور مجھے ہر قسم کی نعمتیں دیں)۔کبھی وہ اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہے(استغفار کرنا) اور کبھی اس پیغمبر کے لیے اللہ کی رحمت کا طلب گار ہوتا ہے جو اس کی ہدایت کا سبب بنا (درود شریف پڑھنا)۔

تربیت کا دوسرا بنیادی اصول اچھی صحبت ہے۔اچھی صحبت کا مطلب ہے اپنا وقت ان لوگوں کے ساتھ گزارنا جنہیں اپنی عبدیت کا استحضار ہو اور جو اللہ کی عبادت اور اطاعت کے راستے پر چلنے والے ہوں۔گھر کا ماحول اور والدین، بہن بھائی اور اہل خاندان کے ساتھ وقت گزارنا بھی ایک طرح کی صحبت ہے لہٰذا گھر کا ماحول اسلامی ہونا چاہیے یعنی ایسا جو استحضار عبدیت میں مدد دے اور جہاں لوگ اللہ کی محبت اور عبادت اور اطاعت کرنے والے ہوں۔صحبت کا دوسرا اظہار آپ کے دوستوں سے ہوتا ہے کہ آپ گلی محلے میں اور سکول کالج میں دوستی کن لوگوں سے کرتے ہیں۔اگر آپ اچھے اور نیک لوگوں سے دوستی کریں گے تو آپ پر اس کے اچھے اثرات پڑیں گے۔اسی لیے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ دوستوں کے انتخاب میں محتاط رہو اور صرف نیک لوگوں سے دوستی رکھو۔صحبت کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ اگر آپ عبودیت کے راستے پر چلنے میں مشکل محسوس کریں اور کوشش کے باوجود خود پر قابو نہ پاسکیں اور اللہ کی نافرمانی سے بچ نہ سکیں تو آپ کسی ایسے نیک اور صالح آدمی کی صحبت اختیار کریں، اس سے بار بار ملیں، اس کی مجلس میں بیٹھیں، ہو سکے تو کچھ ہفتے یا مہینے اس کے پاس جا کر رہیں تاکہ اس کی مدد اور صحبت سے آپ پر بھی نیکی کا رنگ چڑھ جائے، آپ اللہ کی معصیت سے بچ جائیں اور اللہ کی بندگی کی راہ پر چلنا آپ کے لیے آسان ہو جائے۔ایسے موزوں لوگ (جنہیں عرف عام میں مرشد، مربی یا پیر کہا جاتا ہے) اگرچہ بہت کم ہیں اور امت کے زوال اور ہر شعبے میں بگاڑ کی

وجہ سے اس شعبے میں بھی زوال آیا ہے اور اکثر صوفی، پیر اور سجادہ نشین محض دنیا دار بلکہ دین فروش ہیں لیکن اللہ کی دنیا نیک بندوں سے بہرحال بالکل ہی خالی نہیں ہوئی اور اصلاح کے سچے طلب گاروں کو کوئی نہ کوئی مخلص اور نیک بندہ ڈھونڈنے سے مل ہی جاتا ہے جو اللہ کے راستے پر چلنے میں ان کی مدد کرتا ہے۔

یہ تھیں تعلیم و تربیت سے متعلق وہ چند ضروری باتیں جن پر عمل کر کے آج کا مسلم نوجوان اللہ کی عبادت اور اطاعت کی زندگی گزار سکتا ہے۔

دینی و سیاسی جماعتوں سے تعلق میں اعتدال کی ضرورت

نوجوانوں کی قوتوں اور صلاحیتوں کے پیش نظر اور اس وجہ سے کہ انہوں نے ہی آگے جا کر معاشرے کا رکن بننا اور اہم کردار ادا کرنا ہوتا ہے تقریباً ساری ہی دینی و سیاسی جماعتیں یہ کوشش کرتی ہیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ نوجوانوں کو اپنی طرف کھینچ لیں اور انہیں اپنے حلقے اور دائرے میں لے آئیں تاکہ مستقبل میں وہ ان کے لیے سرمایہ ثابت ہو سکیں۔ اس کے لیے تقریباً ہر جماعت اور تنظیم نے طلبہ اور نوجوانوں کے ونگ بنا رکھے ہیں۔

ایک معقول حد کے اندر رہتے ہوئے اور متوازن انداز میں کسی دینی، دینی سیاسی یا سیاسی تنظیم یا جماعت کے ساتھ وابستگی کوئی عیب کی بات نہیں لیکن یہ عمر ایسی ہوتی ہے جس میں جذبات کو عقل و خرد پر غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ دوسری طرف جماعتوں کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ طلبہ اور نوجوانوں کا زیادہ سے زیادہ وقت اور صلاحیتیں لے سکیں اس لیے طلبہ اور نوجوانوں کے لیے ہمارا مشورہ یہ ہے کہ تنظیموں اور جماعتوں سے وابستگی میں وہ مندرجہ ذیل حدود و قیود کا خیال رکھیں:

۱۔ چونکہ یہ عمر تعلیم و تعلم کی ہوتی ہے اور اسی پر نوجوانوں کے مستقبل کا انحصار ہوتا ہے اس لیے کسی طالب علم/نوجوان کو اپنا اتنا وقت اور صلاحیتیں کسی تنظیم اور جماعت کو نہیں دینی چاہئیں جس سے اس کی تعلیم کا حرج ہو۔

۲۔ سیاسی جماعتوں کے لیے کام کرنے کے سلسلے میں محتاط رہیں کیونکہ ہماری اکثر سیاسی جماعتیں نظریاتی کم اور افراد و خاندانوں کے گرد زیادہ گھومتی ہیں اور انہی کے مفادات کا خیال رکھتی ہیں۔ وہ اکثر سیکولر ہیں اور ان میں دین اور دینی مفادات کا لحاظ بھی برائے نام ہوتا ہے۔

۳۔ ہماری دینی اور دینی سیاسی جماعتوں کا معاملہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک اسلام کی ایک

خاص تعبیر اور ایک خاص مسلک پر قائم ہے لیکن دعوی ہر ایک کا یہی ہے کہ وہ پورے اسلام کی نمائندہ ہے اور صرف اس کا مسلک اور نظریہ ہی صحیح اسلام ہے اور باقی لوگ غلط اور گمراہ ہیں۔ ظاہر ہے یہ درست رویہ نہیں ہے۔سیدھی بات یہ ہے کہ اگر آپ اسلام کی کسی ایک خاص تعبیر یا مسلک کو صحیح سمجھتے ہیں تو یہ کوئی بری بات نہیں۔ آپ ایسا سمجھتے رہیں لیکن آپ اپنی تعبیر دین اور مسلک کو پورا دین اور دین کی واحد صحیح تعبیر اور مسلک نہ سمجھیں بلکہ دوسرے مسالک اور نقطہ ہائے نظر میں بھی صحت کا امکان تسلیم کریں (جیسا کہ اجتہادی امور میں اہل علم کا طریقہ ہے) اور دوسرے مسالک کے ماننے والوں کو بھی اپنا اسلامی بھائی سمجھیں اور قوم کو مسلکوں اور فرقوں میں تقسیم نہ کریں بلکہ خود کو مسلم کہیں اور پورے معاشرے کو مسلم معاشرہ اور امت کو امت مسلمہ سمجھیں۔

طرز زندگی/ لائف اسٹائل

اب ہم ان مسلم نوجوانوں کے لیے کچھ رہنما خطوط کا ذکر کرتے ہیں جو اسلامی زندگی گزارنا چاہتے ہیں تا کہ وہ جان لیں کہ ان کی عملی زندگی کس قسم کی ہونی چاہیے۔

۱۔ ہر مسلم نوجوان کے دل میں یہ تڑپ ہونی چاہیے کہ وہ ایسی زندگی گزارے جو اس کے رب کو پسند ہو۔ اس کے دل میں گناہ سے نفرت ہو اور وہ معصیت اور نافرمانی سے دور رہے۔ اسے صرف دنیا بنانے اور اس میں آگے بڑھنے کی فکر نہ ہو بلکہ آخرت بنانے اور اس میں اعلیٰ درجات کے حصول کی بھی فکر ہو۔ نوجوانی میں اطاعت کی زندگی گزارنا بڑے نصیب کی بات ہے اور اللہ سے اس کی توفیق طلب کرتے رہنا چاہیے۔ بقول سعدی شیرازی ؎

در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری
وقت پیری گرگ ظالم مے شود پرہیزگار

یعنی جوانی میں توبہ کرنا شیوۂ پیغمبری ہے جبکہ بڑھاپے میں تو ظالم بھیڑیا بھی نیک بن جاتا ہے

۲۔ ہر نوجوان کو چاہیے کہ وہ ہرگز فارغ نہ بیٹھے بلکہ اپنے آپ کو مصروف رکھے اور نہ صرف مصروف رکھے بلکہ تعمیری کاموں میں مصروف رکھے کیوں کہ خالی دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے جب کہ مومن کو ہر لحظہ شیطان اور نفس کے شر سے پناہ مانگنی چاہیے۔اس کا بہترین حل یہ ہے کہ اپنے اوقات کو منضبط کیا جائے، چوبیس گھنٹوں کے لیے ٹائم ٹیبل بنالیا جائے اور حتی المقدور اس پر سختی سے کاربند ہوا جائے۔

اگرچہ تعمیری سرگرمیاں بہت سی ہیں جن میں سے کچھ کا ہر نوجوان کو اپنے ذوق اور مزاج کے

مطابق انتخاب کر لینا چاہیے لیکن ہم انہیں ایک ایسی سرگرمی کی طرف لانا چاہتے ہیں جو ہمیشہ ان کے کام آئے گی اور وہ ہے مطالعہ کی عادت۔ اس سے مراد عمومی مطالعہ ہے نہ کہ سکول و کالج کی روٹین کی پڑھائی۔ ہر نوجوان کو چاہیے کہ وہ مطالعہ کی عادت ڈالے اور اپنی سہولت سے دن رات کا کوئی حصہ اس کے لیے ضرور متعین کرے۔

کیریئر پلاننگ

اوپر ہم نے مقصد زندگی کا ذکر کیا تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی دنیا میں خواہ جس شعبہ زندگی میں بھی کام کرے، آخرت اسے نہیں بھولنی چاہیے اور اسے اپنی زندگی اللہ کے احکام کے مطابق گزارنی چاہیے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آدمی دنیا میں جو کچھ کرنا اور بننا چاہتا ہے اس کی پلاننگ نہ کرے اور اس کے لیے جدوجہد نہ کرے بلکہ ہر نوجوان کو دستیاب مالی وسائل اور اپنے ذوق، رجحان اور صلاحیتوں کو دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ وہ زندگی میں کون سی لائن اختیار کرے گا، استاد بنے گا یا انجینئر، ڈاکٹر بنے گا یا تاجر۔۔۔وغیرہ۔

ایک عمومی اصول یہ ہے کہ ہر فن مولا (jack of all trades) بننے کی بجائے کسی ایک شعبے میں تخصص (specialization) حاصل کرنا چاہیے اور اس میں کمال (excellence) حاصل کرنے کو ہدف بنانا چاہیے یعنی کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی۔ لہٰذا آگے بڑھنے، فرسٹ آنے اور کمال حاصل کرنے کی جستجو اور خواہش ہر مسلم نوجوان کے دل میں ہونی چاہیے اور اسے نالائق اور کمزور رہنے کو قبول نہیں کرنا چاہیے؛ بقول اقبال ؎

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

آدمی کو اپنی صلاحیتوں کو نمو دینے کی فکر کرنی چاہیے کہ باصلاحیت اور اولوالعزم آدمی جہاں جائے گا کامیاب ہوگا۔ اسی بناء پر رسول کریم ﷺ نے صحابہ سے فرمایا تھا کہ تم میں سے جو لوگ دور جاہلیت میں آگے تھے وہ اسلام میں بھی آگے ہیں اور اگر کوئی غیر مسلم حکمران اسلام قبول کر لیتا تو آپ عموماً اسے عہدے پر برقرار رکھتے تھے اور تبدیل نہ فرماتے تھے اور حضرت عمرؓ کی اعلیٰ صلاحیتوں کی وجہ سے ہی آپ ﷺ نے ان کے قبول اسلام کے لیے دعا کی تھی۔ تو خلاصہ یہ کہ اپنی صلاحیتوں کو نکھارنا اور کسی شعبے میں کمال حاصل کرنا ہر نوجوان کا ہدف ہونا چاہیے۔ اگر اسے ڈاکٹر بننا ہے تو صرف ڈاکٹر نہیں بننا بلکہ بہترین اور

اعلیٰ پائے کا ڈاکٹر بننا ہے۔ استاد بننا ہے تو صرف استاد نہیں بننا بلکہ بہترین اور اعلیٰ درجے کا استاد بننا ہے۔

کھیل اور تفریح

نوجوانوں سے یہ توقع رکھنا بے جا ہے کہ وہ بڑے بوڑھوں کی طرح سنجیدہ ہوجائیں۔ بلاشبہ شرارتیں، تفریح اور کھیل کود نوجوانوں کی زندگی کا حصہ ہوتے ہیں اور ان میں کوئی حرج اور عیب کی بات بھی نہیں لیکن اس ضمن میں کچھ باتوں کا لحاظ ضروری ہے:

۔شرارتیں اور مذاق ایسا نہیں ہونا چاہیے جس سے کسی کو دکھ اور تکلیف پہنچے اور اس کے حقوق ضائع ہوں۔

۔مشغلے اور تفریح تعمیری ہونی چاہیے یعنی تفریح بھی ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ تعمیری بھی ہو۔ مطلب یہ کہ اس کے کچھ فائدے بھی ہوں محض وقت گزاری نہ ہو بلکہ ہمیں کہنے دیجیے کہ وقت گزاری (time killing) کا تصور غیر اسلامی ہے کیونکہ یہ وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے جبکہ مومن کو تو آخرت میں ایک ایک لمحے کا حساب دینا ہے۔ بے مقصدیت اور بوریت کا احساس اسی وقت ہوتا ہے جب آدمی کے سامنے زندگی کا کوئی مقصد نہ ہو اور آدمی تعمیری طور پر مصروف نہ ہو۔

۔کھیلوں میں مشغولیت بھی بری اور غیر تعمیری نہیں جب تک کہ ایک حد کے اندر رہے۔ مطلب یہ کہ کھیل اور تفریح اور اچھا کھانا اور پہننا (اور اسلامی حدود کے اندر فیشن) زندگی کا ایک حصہ ہے لیکن اسے زندگی کا ایک حصہ ہی رہنا چاہیے نہ کہ پوری زندگی اور اس کا واحد مقصد؛ جیسا کہ فارسی کے ایک محاورے کا ترجمہ ہے کہ کھانا پینا اور کھیل کود برائے زندگی نہ کہ زندگی برائے کھیل کود وتفریح۔

صنف مخالف سے روابط

عورت اور مرد کے تعلقات کا صحیح خطوط پر استوار ہونا صالح معاشرت اور تہذیب کی جان ہوا کرتا ہے اور قوموں کے عروج وزوال میں اس کا اہم کردار ہوتا ہے۔ اسلام نے اس بارے میں اپنے متبعین کو تفصیلی رہنمائی دی ہے اور مسلم معاشرے میں لوگ صدیوں تک اسلام کے سنہری معاشرتی اصولوں پر عمل کر کے پر امن اور خوشگوار زندگی گزارتے آئے ہیں لیکن مغربی تہذیب نے خدا کی رہنمائی کو مسترد کر کے اور معاشرت کو انسانوں کی خواہشوں اور ہویٰ وہوس کے حوالے کر کے نہ صرف اپنا معاشرہ تباہ کیا ہے بلکہ اب وہ اپنی عریانی، فحاشی اور بے حیائی بلکہ کہنا چاہیے کہ اپنی بے سکونی، اضطراب اور بے چینی کو مسلم معاشرے کو برآمد کرنے پر بھی مصر ہے اور ہمارے ہاں کے مغربی تہذیب سے مرعوب اذہان وقلوب اس کو خوش آمدید بھی کہہ رہے ہیں اور اپنی زندگی میں دکھوں اور بے سکونی کو

راہ دے رہے ہیں۔

اسلام نے عورت اور مرد کا دائرہ کار الگ الگ رکھا ہے۔ اس نے عورت کو گھر ہستی ، بچوں کی تربیت اور مرد کو سکون وتعاون مہیا کرنے کی خاطر اسے گھر میں رہنے کی ہدایت کی اور مرد کو کمانے اور گھر سے باہر تگ و دو کی راہ دکھائی اور عورت کو ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کے روپ میں عزت واحترام کا مقام دیا اور اس کے حقوق (وفرائض) کا تعین کردیا۔ اس کے مقابلے میں مغربی تہذیب نے عورت اور مرد کی مساوات کا نعرہ لگا کر عورت کو شمع محفل بنادیا اور اسے گھر سے نکال کر بازار میں لے آئی۔ شرم وحیا، لباس وستر اور نکاح کا تصور غارت کردیا اور فرد کی لامحدود آزادی کے نعرے اور نتیجے میں انسان اور حیوان میں فرق مٹ گیا اور آزادانہ جنسی تعلق بلکہ جنسی بے راہ روی کو بھی قانونی تحفظ حاصل ہوگیا۔

اب مغرب جو مصیبتیں ہمیں برآمد کررہا ہے اس میں ایک تو ٹی وی اور موبائل فون کی بیماری ہے (مغرب صرف ٹیکنالوجی نہیں بیچتا بلکہ اس کے پروگرام اور اقدار بھی ساتھ بھجواتا ہے) اور دوسرے مخلوط تعلیم اور مخلوط معاشرت۔ اب اگر ایک یونیورسٹی میں نوجوان لڑکا اور لڑکی اکٹھے پڑھیں گے اور ان پر پابندیاں بھی نہیں ہوں گی تو اخلاق تو بگڑیں گے۔ اسلام تو عورتوں اور مردوں کو غض بصر کا حکم دیتا ہے یعنی وہ نظر بھر کر ایک دوسرے کو دیکھیں بھی نہیں جبکہ مغربی تہذیب میں تو عورتوں مردوں کا اختلاط اور وڈیو اور سینما اور میوزک اور ڈانس وغیرہ معمول کی سرگرمیاں ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مسلم سوسائٹی کو مغربی معاشرت اور اس کی معاشرتی اقدار کو، جو صراحتاً غیر اسلامی ہیں، خوب سوچ سمجھ کر رد کردینا چاہیے اور ہر مسلم لڑکے اور لڑکی کو موجودہ غیر اسلامی اور فساد زدہ ماحول میں اپنے اخلاق کی حفاظت کی سخت فکر کرنی چاہیے اور اخلاقی فساد میں مبتلا ہونے سے بچنے کی بھرپور جدوجہد کرنی چاہیے اور اس میں اللہ کی نصرت بھی طلب کرتے رہنا چاہیے۔

حرف آخر

ہماری رائے میں یہ وہ لائحہ عمل ہے جو ہر مسلم نوجوان طالب علم (لڑکے اور لڑکی) کو اختیار کرنا چاہیے تاہم سطور بالا میں ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اور جو مؤقف اختیار کیا ہے، اس کے بارے میں اگر کسی نوجوان کو شرح صدر نہ ہو یا اس کے ذہن میں اس حوالے سے سوالات پیدا ہوں تو ہمیں اس سے مکالمہ کر کے، اس کے سوالوں کا جواب دے کر اور اس کی تشفی کر کے خوشی ہوگی۔ نوجوان خط، فون، ای میل، ملاقات جس طرح بھی چاہیں ہم سے رابطہ کرسکتے ہیں، ہم انہیں خوش آمدید کہیں گے۔ (رابطے کے لیے ضروری معلومات البرہان کے پہلے صفحے پر موجود ہیں)

تفہیم مغرب

مولانا نور عالم

امریکہ اسلام دشمن کیوں ہے؟

دہشت گردی کے خلاف جنگ، درحقیقت اسلام کے خلاف جنگ ہے۔ اس میں کسی طرح کا شبہ خودفریبی وحماقت کے ساتھ ساتھ حالات و واقعات سے بالکلیہ بے خبری اور سچائیوں سے بالقصد آنکھیں موند لینے کے مترادف ہے۔ امریکہ اسلام کے خلاف یہ جنگ درحقیقت یہود کی طرف سے، یہودیوں کی خاطر، اپنے بے پایاں خرچ سے، اپنے فرزندوں کی قربانی، اپنی عالم گیر بدنامی اور مسلمانوں اورعربوں کی دوررس اور دیرپا بلکہ نہ ختم ہونے والی ناگزیر دشمنی مول لے کرلڑ رہا ہے۔لیکن وہ ایسا کیوں کررہا ہے؟ آئندہ سطور میں اس حیران کن سوال کا مختصر مگر تشفی بخش جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

جولوگ یہودیوں کی بازی گری، دنیا پر اپنے تسلط کے لیے فریب کاری اور انسانی لہو کو پانی سے زیادہ ارزاں بنا ڈالنے کی اُن کی 'فن کاری' نیز عصر حاضر میں امریکہ پر اُن کی واقعی اور ہمہ گیر حکمرانی کی حقیقت سے واقف ہیں، ان کی لیے مذکور الصدر سچائی چنداں تعجب کی بات نہیں، لیکن بے خبروں کے لیے عموماً اور فریب خوردہ وفریب دہندہ مسلم اور عرب حکمرانوں کے لیے خصوصاً یہ سچائی 'ہرزہ سرائی' سے زیادہ کچھ نہیں، جو بقول ان کے 'بنیاد پرست' و'انتہاپسند' اہل قلم اور مفکرین ہمیشہ کیا کرتے ہیں اور اپنے سادہ لوح قارئین ومعتقدین میں پھیلایا کرتے ہیں۔

امریکہ میں مصیبت کی جڑ'صہیونی مسیحیت' ہے جس نے 'صہیونی یہودیت' کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔صہیونی یہودیوں نے (جن کے ہاتھ امریکی معیشت و دولت وثروت اور ذرائع ابلاغ کی کلید ہے اور جو امریکہ پر اس درجہ تسلط رکھتے ہیں کہ سارے صدور اور حکمراں خواہی نہ خواہی اُن کی مرضی سے انحراف کرنے کی جرأت نہیں کرپاتے) امریکی مسیحیوں کی معتدبہ تعداد کو شیشے میں اتار کر انہیں صہیونیت گزیدہ بنادیا ہے۔انہیں اپنے اِن خرافی عقیدوں پر ایمان لانے پر مجبور کردیا ہے کہ وہ اور مسیحی دونوں حقیقی بھائی ہیں، دونوں اللہ کی چیدہ پسندیدہ قوم ہیں، دونوں کو اللہ نے زمین پر اپنی مشیت کو

برپا کرنے کے لیے منتخب کیا ہے۔ لہٰذا دونوں سارے افرادِ بشر سے اعلیٰ وارفع ہیں۔ دیگر فرزندانِ آدم ان کے نزدیک کسی شمار و قطار میں نہیں ہیں۔ اس لیے یہ دونوں مشیتِ الٰہی کو بروئے کار لانے کے لیے انہیں دھوکہ دینے، ان کا استحصال کرنے، ان کے ساتھ ہر طرح کی تذلیل، تحقیر، تمسخر اور قتل و غارت گری کا معاملہ کرنے کا ہمہ گیر جواز رکھتے ہیں۔ صہیونی مسیحی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان پر فرض ہے کہ وہ اللہ کی مدد کریں اور اسرائیل کا سیاسی و اجتماعی بازو بن کر اللہ کے پیغامات کو عملی جامہ پہنائیں اور جسمِ مسیح کے ذریعے صرف انجیلی منصوبے کو بروئے کار لانے پر اکتفا نہ کریں۔

صہیونی مسیحیت کی تحریک کے ایک بڑے مفکر پوپ والٹر ریگنز (Walter Reggans) کا کہنا ہے: 'توراتی صہیونیت ہی ہر مسیحی کی یقینی آرزو ہے کیونکہ یہ بنیادی طور پر اللہ اور اس کے مقاصد سے ہم رشتہ ہے، اسی لیے مسیحی نظریے کی رو سے، صہیونیت مذہبی الٰہیات کا حصہ ہے، اس کا محض سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ مسیحی نقطۂ نظر سے اسرائیل کی ریاست یہودی قوم کے لیے الٰہی عمل کا محض آغاز ہے۔ مسیحیوں پر صرف ریاستِ اسرائیل کی مدد ہی فرض نہیں بلکہ اس کی پالیسی کے ساتھ تعاون بھی ضروری ہے۔ یعنی اُن پر اصولی طور پر اللہ کی ریاست اسرائیل سے، اسے اللہ کی رحمت الٰہی کا اشارہ سمجھتے ہوئے، مکمل تعاون فرض ہے۔ نیز یہ ایمان رکھنا بھی ان پر فرض ہے کہ ریاستِ اسرائیل توراتی عندیے کی غماز ہے کہ اللہ اس عالم کے مسائل سے حد درجہ دلچسپی لے رہا ہے'۔

گریس ہیلسل (Grace Halsel) نے، جو وہائٹ ہاؤس میں سابق امریکی صدر لنڈن جانسن کی سیکرٹری رہ چکی ہیں، اپنی دو کتابوں 'نبوت و سیاست' (Prophecy and Politics) اور 'اللہ کا ہاتھ' (Forcing God's hand) میں 'صہیونی مسیحیت' پر بہت زیادہ لکھا ہے اور امریکہ میں اس کی 'سیادت وحکومت' اور بھرپور اقتدار و اختیار پر سیر حاصل و مدلل گفتگو کی ہے۔ ان کے مطابق ذرائع ابلاغ پر اسی کی حکومت ہے، اس کے پاس ۱۰۰ ٹیلی وژن اسٹیشن اور ۱۰۰۰ ریڈیو اسٹیشن ہیں۔ امریکہ کے چپے چپے پر اس کی حکمرانی ہے۔ اس تحریک کے ہم نوا گرجا گھروں کی تعداد سب سے زیادہ ہے، جن کے ۸۰ ہزار پادری میدانِ تبلیغ میں سرگرم کار ہیں۔ بیسویں صدی کے صرف آٹھویں عشرے میں صہیونی مسیحیت کے پروگرام کے تحت اسرائیل کے ہم نوا ۲۵۰ ادارے اور

انجمنیں معرض وجود میں آئیں۔ جن پادریوں اور قائدین مسیحیت کو وقار و اعتبار حاصل ہے، ان میں سے اکثریت صہیونی مسیحیت سے نہ صرف جڑے ہوئے، بلکہ اس کے سرگرم داعی اور سپاہی ہیں جیسے ہیل لیڈسی، جیری فال ویل، پاٹ روبرٹسن، چارلس ڈایر، مائک ایونز، گون والورڈ، ڈیو بینٹ وغیرہ ــ اس تحریک کی جڑیں برطانیہ میں بھی پیوست رہی ہیں۔ اس وقت وہاں کے ڈیویڈ پوسن، ڈیرک پرنس، لینس لمبرٹ، والٹر ریگنز وغیرہ اس تحریک کے مضبوط ستون ہیں۔

اسرائیل اور مسئلہ فلسطین سے متعلق سیاسی مؤقف کو مذہبی تصورات سے ہم رشتہ کرنے کے نظریے پر زور دینے والی جو کتابیں، مذکورۃ الصدر پادریوں اور مسیحی قائدین نے، صرف گذشتہ صدی کے آخری عشروں میں مختلف عنوانات کے تحت لکھی ہیں، وہ خاصی کثیر الاشاعت ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں: 'آٹھویں دہائی اور ہرمجدون کی الٹی گنتی؛ ہولوکاسٹ کی راہ؛ آخری معرکہ؛ عرب تیل اور ہرمجدون؛ غیر مقدس جنگ؛ تیل، اسلام اور ہرمجدون؛ اسرائیل یعنی امریکہ کے نجات کی کلید؛ ہرمجدون، تیل اور مشرق وسطی کا بحران؛ آخری المیہ، جنگِ خلیج کے بعد ہرمجدون کی ابتداء؛ امن ترقی اور آخری ہولوکاسٹ۔

امریکہ میں صہیونی مسیحیت کی تحریک کے ماننے والوں کی تعداد اس کے بعض علم برداروں کے مطابق دس کروڑ ہے، لیکن تحریک سے پرخاش رکھنے والے امریکی انجیلی کلیسا کے ہم نوا، ان کی تعداد ڈھائی تین کروڑ ہی بتاتے ہیں، تاہم یہ لوگ بھی یہ مانتے ہیں کہ یہ لوگ بہت تیزی سے پھیل رہے ہیں۔ اس تحریک کو برپا کرنے والی ۲۲۰ سے زیادہ تنظیمیں اس بات کی مدعی ہیں کہ ان کے تحت سرگرم عمل افراد کی تعداد کم از کم ۴ کروڑ ہے۔

صہیونی مسیحیت کے علم بردار، صرف امریکہ و برطانیہ کے بہت سارے مسیحی پادری ہی نہیں تھے اور ہیں، بلکہ اکثر امریکی صدور، سیاستدان اور حکمران اسی نظریہ و تحریک سے وابستہ رہے ہیں۔ صدر لنڈن بی جانسن جو بیسویں صدی کے نصفِ آخر کے اوائل میں امریکہ کے صدر تھے، اس تحریک کے سرگرم قائدین میں شمار ہوتے ہیں۔ صدر جمی کارٹر تو اس حوالے سے اتنے پر جوش داعی گزرے ہیں کہ انہوں نے خود یہ اقرار کیا تھا کہ ان کے صہیونیت حامی جذبات ہی مشرق وسطیٰ کی ان کی سیاست کے

رنگ وآہنگ اور سمت کا تعین کرتے تھے۔ انہوں نے مئی ۱۹۷۸ء میں اپنے ایک خطاب میں یہ تک کہا تھا کہ ''ریاستِ اسرائیل، ارض توریت کی طرف لوٹنے سے عبارت ہے، جہاں سے یہودیوں کو سیکڑوں برس قبل نکال دیا گیا تھا۔ اسرائیلی قوم کی اپنی زمین میں اقامتِ نو، تورات کی پیش گوئی کو برپا کرنا ہے'' (امریکی فیصلے میں مذہب کا عمل دخل از محمد سماک، ص ۴۱-۴۲)۔

مبصرین کا خیال ہے کہ صدر رونالڈ ریگن صہیونی مسیحیت کے عقیدے پر کار بند سب سے طاقت ور امریکی صدر رہے ہیں۔ انہیں یہ عقیدہ اپنی ماں نیل سے وراثت میں ملا تھا۔ ان کا عہد صدارت امریکہ میں اس عقیدے کے اثر ورسوخ کے حوالے سے سنہری دور باور کیا جاتا ہے۔ ان کے صدر منتخب ہونے سے امریکہ کی تاریخ میں اسرائیل کو امریکہ کی طرف سے سب سے زیادہ طاقت وحمایت اور مدد ملی تھی، نیز مختلف انتظامی ڈھانچوں کے بڑے بڑے ذمہ دار صہیونی مسیحی عقیدے کے حامل اور اسرائیل کو امریکی ریاست کا حصہ، بلکہ امریکہ کو ریاست اسرائیل کی مرضی ومفاد کے مطابق ڈھالنے اور چلانے کے قائل اور اس پر عامل تھے جن میں وزیر انصاف ایڈمیس وزیر دفاع کیسپر ونبرگر اور وزیر داخلہ جیمز واٹ انتہائی غالی عقیدے کے صہیونی مسیحی تھے۔ اسی عقیدے کے تناظر میں صدر ریگن نے ۱۹۸۶ء میں لیبیا پر اپنی افواج سے بمباری کروائی، کیوں کہ وہ لیبیا کو 'دشمن خدا' باور کرتے تھے۔ امریکہ اور اسرائیل نے اپنی مشترکہ جدوجہد سے ۱۹۸۲ء میں فلسطینی افواج کو لبنان سے کھدیڑ دیا تو ریگن نے اس کو امریکہ کے لیے باعث افتخار کارنامہ گردانا تھا۔

ریگن کے بعد دو صدورِ امریکہ یعنی جارج بش سینئر اور بل کلنٹن کے زمانے میں مبصرین کے مطابق صہیونی مسیحیت کی لے بہ وجوہ دھیمی پڑ گئی، جس کی وجہ سے اس کے علم بردار پادری اور قائدین مسیحیت پیچ وتاب کھاتے رہتے تھے، اس لیے جیسے ہی جونیئر بش کا دور آیا، تو صہیونی مسیحیت کا کردار دھاکہ خیز طور پر عود کر آیا اور اس عقیدے کے پنڈتوں نے یہ طے کرلیا کہ نہ صرف ماضی کا حساب بے باق کرنا ہے بلکہ اسرائیل کے مفادات کو بروئے کار لانے اور مسیحیت کو یہودیت کا وفادار خادم بلکہ بے دام غلام بنا ڈالنے کے عمل کو اپنے آخری انجام تک پہنچا کے دم لینا ہے۔

صہیونی مسیحیوں نے اسی دور میں محرف توریت کے ۳۳ ویں پارے کی اللہ کی طرف سے موسیٰ کو

کی گئی نام نہاد وصیت کو برپا کرنے اور اس کے لیے وسیع تر ذرائع استعمال کرنے کی ٹھان لی۔ اس وصیت میں کہا گیا ہے کہ 'اللہ نے بنی اسرائیل کو ارض کنعان یعنی فلسطین کا حقِ وراثت تفویض کر دیا ہے لہٰذا تمہیں اس زمین سے سارے سا کنانِ اجانب کو کھدیڑ دینا ہے۔ اگر تم اپنے سامنے یہ کام نہ کر سکے تو وہ تمہارے لیے آنکھوں کا تنکا ثابت ہوں گے اور تمہاری کمر میں کانٹے چبھوئیں گے اور تمہاری زمین میں تمہاری زندگی کو مکدر کیے رہیں گے'۔

ان مسیحیوں کا پختہ عقیدہ ہے کہ جب تک فلسطین کو مکمل طور پر یہودی نہیں بنا دیا جاتا اور وہاں سے ایک ایک عربی کو نکال باہر نہیں کیا جاتا تب تک مسیح کا نزول یا ان کی ولادتِ نو نہیں ہوسکتی۔ فلسطینیوں سے ارض فلسطین کی تطہیر جتنی جلدی ہوگی اتنی ہی جلد نزولِ مسیح کا مبارک دن وقوع پذیر ہوگا۔

امریکہ کے ایک مسیحی پادری پاٹ رابرٹسن، جسے مذکورہ عقیدے کی سب سے طاقت ورشخصیت باور کیا جاتا ہے، کے خیالات، اس کی زبان اور اس کا اندازِ کلام، عرب اور فلسطینی مسلمانوں کے خلاف اسی طرح جارحانہ ہے جیسے ہندوستان کے سنگھی خاندان کے شعلہ نو اور آتش فشاں حضرات کا ہوا کرتا ہے۔ اس پادری نے ۱۹۶۰ء میں تقریباً ۲۰ کروڑ ڈالر کی لاگت سے سی بی این (Christian Broadcasting Network) قائم کیا تھا جو دنیا میں سب سے اہم اور مؤثر مسیحی مذہبی ٹیلی وژن اسٹیشن ہے۔ اس نے ۱۹۸۹ء میں Christian Coalition نام کی تنظیم قائم کی جس سے اب تک تقریباً دو کروڑ امریکی وابستہ ہو چکے ہیں۔ اس تنظیم کا مقصد صرف یہ ہے کہ صہیونی مسیحی نظریے سے وابستہ امریکی صدارت کے امیدواروں کی مالی اور اخلاقی مدد کی جائے، چنانچہ ۲۰۰۰ء میں جونیئر بش کے لیے اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا جو ساری دنیا کو معلوم ہے۔ اسی تحریک کے زیر اثر اکتوبر ۱۹۹۵ء میں امریکی کانگرس کے ایوانِ بالا و زیریں دونوں نے بیت المقدس کو اسرائیل کا دارالحکومت قرار دیے جانے کی قرار داد پاس کی اور یہ بھی کہ امریکی سفارت خانے کو تل ابیب سے وہیں منتقل کر دیا جائے۔ کیتھولک، آرتھوڈکس اور انجیلی کلیسا سے وابستہ سارے ممبران اس قرارداد کے خلاف تھے۔ اس کے باوجود یہ قرارداد نہ صرف منظور کی گئی بلکہ اس قرارداد کی ستمبر ۲۰۰۲ء میں دوبارہ توثیق کی گئی جب جونیئر بش نے اس پر اپنے دستخط ثبت کیے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ

تحریک امریکہ میں کتنی طاقت وراور اثر و رسوخ کی مالک ہے۔صہیونی مسیحیت کے عقائد کو سیاسی طور پر برپا کرنے کے لیے مندرجہ ذیل امور پر عمل کیا جارہا ہے:

۱۔ یہودی اللہ کی منتخب قوم ہیں لہٰذا ریاستِ اسرائیل کی حمایت اور ہر طرح سے اس کی مدد مسیحیوں پر بھی فرض ہے۔

۲۔ یہ ایمان رکھنا مسیحیوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ اللہ نے قوم یہود کو ارضِ مقدس یعنی فلسطین عطا کردی ہے، لہٰذا وہاں بنائی جانے والی کالونیوں اور فتح کی ہوئی زمینوں پر یہودی قبضے کی حمایت واجب ہے۔

۳۔ بیت المقدس قوم یہود کو خدا کی طرف سے عطا کردہ ارض مقدس کا جزو لاینفک ہے، لہٰذا اسے اسرائیل کا پایۂ تخت تسلیم کرنا مسیحیوں پر بھی فرض ہے۔

۴۔ مسیحیوں پر واجب ہے کہ وہ یہ ایمان رکھیں کہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر، مسیح کی دوبارہ واپسی کے لیے ناگزیر شرط ہے، لہٰذا اس راہ کی ساری رکاوٹوں کو دور کرنا ان کے لیے بھی ضروری ہے، جن میں مسجد اقصیٰ کا انہدام بھی شامل ہے۔

۵۔ معرکۂ ہرمجدون کے یقینی ہونے پر ایمان لانا مسیحیوں پر فرض ہے۔ یہ معرکہ مسیح کی واپسی سے پہلے ضرور پیش آئے گا۔ اس لیے مشرق وسطیٰ میں مساعیِ امن کو سبوتاژ کرتے رہنا، پیہم انتشار برپا کیے رکھنا اور عرب و یہود دشمنی کو تازہ اور مؤثر بنائے رکھنا دینی عمل کا حصہ ہے۔ مساعیِ امن کے مؤثر ہوجانے سے ہرمجدون کے معرکے میں تاخیر ہوگی اور مسیح کی واپسی مؤخر ہوگی جب کہ اسرائیل وعرب رسّہ کشی سے ان کی واپسی بعجلت اور یقینی ہوگی!

جونیئر بش کے صدر بننے کے بعد اسرائیل اور صہیونی مسیحیت کی خوش قسمتی، دنیا کی بدقسمتی اور مسلمانوں کی آزمائش کے خدائی فیصلے کے تحت دو ایسے طاقت ور محرکات جمع ہوگئے، جن کی وجہ سے وہ سب کچھ بعجلت اور دھماکہ خیز انداز میں روبہ عمل آیا جسے مسلمان اب تک بھگت رہے ہیں۔

۱۔ ایک یہ کہ جونیئر بش، صہیونی مسیحی تحریک کی طاقت ور سیاسی شخصیت اور اسرائیل و یہود کے سب سے بڑے پشتی بان امریکہ کے صدر کی حیثیت سے نہ صرف نمودار ہوا بلکہ اس نے اپنی ساری

حرکات وسکنات سے مذکورہ تحریک کا وفادارغلام اور بے لوث خادم ہونے کا ثبوت دیا اور نہ صرف اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنے بھیانک جرائم پر بار بار فخر کا اظہار کیا بلکہ ان جرائم کو اپنی نجات، امریکہ کی عزت وسرخ روئی اور مغربی وامریکی متمدن ومہذب قوم کی سربلندی کا بار بار بے تکان اور ہر موقع وجگہ پر یقینی ذریعہ بتایا۔

بش کے اس عقیدہ وعمل کے سرگرم داعی اور پرجوش سپاہی ہونے کی وجہ سے اس تحریک کے سارے قائدین اور اہل کار اس کے گرد اس طرح اکٹھے ہوگئے جیسے مقناطیس کے گرد لوہا۔ جس کی وجہ سے بش کے جوش وجذبے میں مزید اُبال آیا۔ چنانچہ عیسائیوں کی عید کبیر کی عبادت والے دن ۲۰۰۳ء میں جہاں بش نے صہیونی مسیحیت کے ایک بڑے داعی پادری فرینکلن گراہم کو اس کے سامنے ان الفاظ میں سراہا کہ ہمارے دل میں انہی نے 'ایمان' کی جڑیں گہری کی ہیں، میں منشیات کے استعمال سے باز آ گیا ہوں اور مسیح کو میں نے گلے لگا لیا ہے، وہیں فرنکلین نے اسی تقریب میں صاف لفظوں میں یہ کہہ کر بش کو اسلام کے خلاف مزید اکسایا کہ 'اسلام ومسیحیت میں وہی فرق ہے جو تاریکی اور روشنی میں'۔

۲۔ دوسرا محرک، جسے پہلے محرک سے غذا ملی، اس شکل میں نمودار ہوا کہ صہیونی مسیحیت کی تحریک سے وابستہ ساری انجمنیں اور تنظیمیں پہلے سے زیادہ منظّم، طاقت ور، مؤثر اور نہ صرف ابلاغی اور مذہبی سطح پر زیادہ فعال بن گئیں بلکہ وہ ایسی سیاسی طاقت بن کر ابھریں کہ ان کی حمایت کے بغیر صدر اور دیگر سیاستدانوں کا داخلہ وخارجہ پالیسی میں کوئی قدم اٹھانا ممکن نہ رہا۔

یہود دوست واسرائیل کی حامی صہیونی مسیحیت کے قائدین اور منصوبہ ساز ارکان نے سوچا کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دشمنی کے جذبات کو دوآتشہ بنا کر وسیع تر صلیبی صہیونی مشترکہ مفادات کو بروئے کار لانے کا یہی سنہری موقع ہے لہٰذا اسے ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے چنانچہ بہت سوچ سمجھ کر ۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کو نیویارک اور واشنگٹن میں دھماکوں کا واقعہ برپا کیا گیا جو صہیونی مسیحیوں اور صہیونی یہودیوں کی مشترکہ کارستانی اور منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا، لیکن ہوشیاری ومکاری سے اسے مسلم عرب نوجوانوں کے سر منڈھ دیا گیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس دعوے کو صحیح طور پر اب تک ثابت

نہ کیا جا سکا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجائے اور نہ اس دعوے کے ان بہت سارے تضادات کو دور کیا جا سکا اور نہ ان پیچیدہ سوالات کا کوئی تشفی بخش جواب دیا جا سکا جو عربوں اور مسلمانوں پر ان دھماکوں کے الزام سے براہ راست اور منطقی طور پر پیدا ہوتے تھے لیکن نہ صرف امریکی اور اہل مغرب بلکہ مشرق و مغرب کے سارے 'انسانیت نواز' اور 'ہمدردانِ فرزندانِ آدم' اٹھ کھڑے ہوئے اور مسلمانوں کو سب وشتم کرنے، ان سے انتقام لینے اور نام نہاد القاعدہ والوں سے حساب بے باق کرنے کی ایسی رٹ شروع کی کہ اللہ کی پناہ! صہیونی مسیحیوں اور اسرائیلی لابی کو بالخصوص امریکہ اور بالعموم پوری دنیا میں اسرائیل کی نیکی، یہودیوں کی معصومیت، صہیونیوں کی بے گناہی و خدا ترسی کا ڈھنڈورا پیٹنے اور اس کے بالمقابل مسلمانوں کی شیطنت، شر پسندی، خون آشامی، انسانیت دشمنی، تہذیب نا آشنائی اور تمدن سے بیگانگی کو طرح طرح سے اتنی بار، اتنے دنوں تک، اتنی زبانوں میں، اتنے سارے ذرائع ابلاغ کے ذریعے اچھالا گیا اور ان پر دھاوا بولنے، ان کو تہ تیغ کرنے، ان کے ملکوں، ان کی تاریخ، تہذیب و ثقافت، ثروت و دولت اور غیر منظم رہی سہی عسکری و سیاسی و اقتصادی طاقت کو کچلنے اور مسیحی و یہودی خدا کی عظمت کے گن گانے کی اس طرح راہ ہموار کی گئی کہ مسلمانوں کے ہوش اڑ گئے اور دنیا کے سارے 'انصاف پسندوں' کی صلیبیت وصہیونیت نوازی دیکھ کر مسائل کو صحیح تناظر میں دیکھنے والے انگشت بدنداں رہ گئے۔

۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعات کے برپا کنندہ بالیقین صہیونی یہودی اور صہیونی مسیحی تھے۔ اس سلسلے میں اتنا کچھ دنیا کی ساری زبانوں میں لکھا، بولا اور نشر کیا گیا ہے کہ اب مزید کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں۔ خود امریکہ میں بڑے بڑے اہل قلم اور دانشوروں نے انتہائی مدلل انداز میں ان دھماکوں کو یہودیوں اور امریکہ کی اسرائیل نواز صہیونی مسیحی لابی کا کارنامہ قرار دیا ہے۔

۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کے دھماکوں کے بارے میں جو سیکڑوں ویب سائٹس انٹرنیٹ پر موجود ہیں، ان میں ۷۰ ممتاز سائنس دانوں اور اعلیٰ پروفیسروں کی ''اسکالرز فار نائن الیون ٹرتھ ویب سائٹ'' نمایاں ہے۔ ان سائنس دانوں اور پروفیسروں کو اپنی تحقیق وجستجو اور تجربے کی روشنی میں یقین ہے کہ ان دھماکوں کا مقصد وہائٹ ہاؤس کی طرف سے ''دہشت گردی'' کے خلاف جنگ، مشرق وسطیٰ پر مزید

کنٹرول، وہاں کی دولت کی لوٹ کھسوٹ، اسرائیل کی برتری کو تقویت دینا اور عربوں کے تیل پر قبضہ کرنا تھا۔ ایک امریکی تجزیہ نگار نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ اسامہ بن لادن نے ۱۱ستمبر کے حملوں کو اپنی کامیابی کا جس ویڈیو میں دعویٰ کیا تھا، وہ یقیناً جعلی تھا، کیونکہ اس میں اسامہ کی ناک ایک انچ چھوٹی تھی، بالیقین اس میں کسی اداکار کو استعمال کیا گیا تھا۔ ایف بی آئی کے ترجمان لیبل ایڈمنڈس کو امریکی انتظامیہ نے اس لیے مہر بہ لب کر دیا ہے کہ اس کے پاس ۱۱ستمبر کے متعلق بہت سی ایسی سچائیاں ہیں جن سے صہیونیوں (یہودیوں اور مسیحیوں دونوں) کی بڑی رسوائی ہوسکتی ہے۔ اس کا یہ کہنا ہے کہ اسامہ کے وہ ۴ ویڈیو ٹیپس ہی صحیح ہیں جن میں اس نے نائن الیون میں شرکت سے انکار کیا تھا۔ بعد کے وہ ٹیپس جن میں شرکت کی تصدیق ہے وہ جعلی ہیں۔ آواز اور شکل دونوں تراشیدہ ہیں۔

روزنامہ 'جسارت' کراچی نے پچھلے دنوں ''۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء خود ساختہ امریکی سازش'' کے عنوان سے بہت نتیجہ خیز اور تحقیقی کالم شائع کیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ امریکی یونیورسٹی کے ایک ممتاز پروفیسر اسٹیونس جونس کو امریکی انتظامیہ نے محض اس 'گناہ' میں جبری رخصت پر بھیج دیا ہے کہ اس نے طویل جستجو اور بھرپور کوشش کے بعد یہ ثابت کیا کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی عمارتیں صرف جہازوں کے ٹکرانے سے مکمل طور پر تباہ نہیں ہوسکتی تھیں بلکہ ایسا صرف اس صورت میں ممکن ہے جب انہیں اندرونی دھماکوں سے گرایا گیا ہو۔ اس نے ثابت کیا کہ ایسا ہی ہوا ہے لیکن آزادیٔ رائے کا ڈھنڈورا پیٹنے والی سپر پاور اپنے ہی ایک دانش ور کی تحقیق ہضم نہ کرسکی اور اسے جبری رخصت پر بھیج دیا گیا۔ حال ہی میں یہ جائزہ بھی شائع ہوا ہے کہ امریکہ کے ۳۰ فیصد لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نائن الیون کا واقعہ خود امریکی حکومت نے کرایا تھا جس کا مقصد وہی کچھ تھا جو امریکہ اس وقت عالم اسلام کے ساتھ کر رہا ہے اور مستقبل میں کرنے والا ہے۔ امریکی اور مغربی ذرائع ابلاغ کے زبردست پروپیگنڈے کے باوجود بھی اگر خود امریکہ کے ۳۰ فیصد لوگ خود امریکی انتظامیہ کے مذکورہ واقعے میں ملوث ہونے کی بات کہتے ہیں تو یہ غیر معمولی بات ہے کیوں کہ امریکیوں نے یہ خود دیکھا کہ امریکی سیکورٹی میں تاریخی ناکامی کے باوجود، اس واقعے کی داخلی ذمے داری کو سنجیدگی سے نہیں لیا گیا اور اس سلسلے میں کسی ایک اہم شخصیت کو بھی اس عہدے سے برطرف نہیں کیا گیا، حالانکہ اتنے بڑے واقعے کے بعد تو سیکڑوں اہل کار

برطرف کیے جا سکتے تھے۔ مذکورہ امریکی پروفیسر کی تحقیق اگر غلط تھی تو امریکی انتظامیہ اس کی جوابی تحقیق پیش کر کے اس کو غلط ثابت کر سکتی تھی لیکن ایسا نہ کیا گیا۔ اس نے ایک اور غلطی یہ کی کہ پروفیسر کا منہ بند کرنے کے لیے اس کو جبری رخصت کی سزا دی۔ یہ حرکت خود ایک طاقت ور شبہے کو جنم دیتی ہے اور اس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ امریکی حکومت نے نائن الیون کو ایک 'مقدس عقیدے' کی حیثیت دے دی ہے کہ جس طرح مغرب میں ہولوکاسٹ پر بات نہیں کی جا سکتی اسی طرح امریکہ میں نائن الیون پر سوالات قائم نہیں کیے جا سکتے۔ یہ صورت حال امریکی حکومت کے کمزور مؤقف کی آئینہ دار ہے اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔

ان محرکات کی کوکھ سے اسلام سے نفرت کے اس دیرینہ کلچر کو، جو صہیونی مسیحیت کی تعلیمات کی اساس ہے، مزید پھیلنے کا موقع ملا اور اسی کلچر کو امریکہ کے سیاسی فیصلوں اور عسکری سرگرمیوں کا محور مان لیا گیا۔ پادری 'ہال لینڈسی' نے صہیونی امریکیوں کو یہ کہہ کر للکارا کہ 'مسلمانوں کا نشانہ صرف ریاست اسرائیل کی بیخ کنی نہیں بلکہ وہ یہودی مسیحی کلچر کو نیست کرنے کے درپے ہیں، جو تہذیب مغرب کی اساس ہے۔ یہ کمیونسٹوں کی طرح ہیں اور ان کے فکر ونظر کی گہرائیوں میں ہم سبھوں کو بالکلیہ دفن کر دینے کی نا قابلِ بیان خواہش تڑپ رہی ہے'۔ پادری 'پاٹ روبرٹسن' نے اسلام کو 'دہشت گردی کا مذہب' کہا جس کا مقصد پوری دنیا کو زیر کرنا ہے۔ اس نے امریکی مسلمانوں کو 'دہشت گردی کا زیر زمین نظام' قرار دیا جس کا مقصد امریکہ کو نیست و نابود کرنا ہے۔ پادری 'جیری فائن' نے آگے بڑھ کر خود آنحضرت ﷺ کے خلاف زبان طعن دراز کی۔ پادری فرینکلین گراہم نے جونیئر بش کی صدارت کا حلف لینے کی تقریب میں اسلام کو 'شیطانی اور شر پسند مذہب' بتایا جب کہ پادری جیری فولویل نے اسے ''مصنوعی مذہب'' سے تعبیر کیا۔

الغرض یہ محرکات اس لیے تخلیق کیے گئے تھے کہ اسلام و مسلمانوں کے خلاف ان کے گھروں میں اور پوری دنیا میں ایسی ہمہ گیر اور دور رس جنگ دھما کہ خیز سطح پر اس طرح چھیڑ دی جائے کہ جس کی، ان کے عندیے کے مطابق، مسلمان تاب نہ لا سکیں کیوں کہ یہ کثیر المحاذ جنگ عسکری، فکری، ثقافتی، سیاسی اور اقتصادی سطحوں پر لڑی جا رہی ہے جسے انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کی بالکلیہ تباہی کا حتمی

ذریعہ باور کیا ہے۔

یہودی اور مسیحی صہیونیت نے جونیئر بش اور اس کے انتظامی ٹولے کو بدمست ہاتھی بنا دینے میں ایسی کامیابی حاصل کی جو عالم اسلام کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کے حوالے سے صہیونیت کے حصے میں پہلے کبھی نہ آئی تھی۔ صدر بش کی بدمستی کا یہ عالم تھا کہ وہ کسی لمحہ اپنی عقل سے بھی مشورے کا طالب نہ ہوا اور نہ اس کے دل میں خیر وشر کے امتیاز کا کبھی کوئی جذبہ بیدار ہوا۔ وہ حد درجہ منفی اور شر انگیز جذبات سے ایسا مغلوب ہوا کہ اسلام اور عالم اسلام کے خلاف ہمہ گیر 'صلیبی جنگ' لڑنے کا اعلان کر دیا اور معاصر انسانی معاشروں کے متعلق یہ فیصلہ سنا دیا کہ مغربی امریکی معاشرہ مہذب اور اس کے سوا یعنی اسلامی مشرقی معاشرہ غیر مہذب ہے اور جو اس کے (یعنی بش) ساتھ نہیں وہ بالیقین اس کے خلاف ہے، لہٰذا وہ اس کی طرف سے عبرت ناک سزا کا مستحق ہے چنانچہ وہ عالم اسلام کو عبرت ناک سزا دینے میں جت گیا۔

'نیو یارک ٹائمز' کے کالم نگار جاکسن لیرز نے اخبار کے ۱۱ مارچ ۲۰۰۳ء کے شمارے میں اپنے مضمون میں واضح طور پر لکھا کہ بش کا عقیدہ ہے کہ معاصر واقعات ایک انصاف پسند ونجات دہندہ مسیحی اور یہودی خدا کے ہاتھوں انجام پذیر ہو رہے ہیں۔ نیز بش یہ سمجھتا ہے کہ اس کی صدارت ایک 'مقدس منصوبے' کا حصہ ہے۔ اس نے ٹکساس صوبے کی گورنری کے زمانے میں اپنے ایک دوست سے کہا تھا کہ خدا نے اسے امریکہ کی صدارت کی امیدواری کا حکم دیا ہے اور ریاست ہائے متحدہ کو مشرق وسطیٰ میں آزادی کی صلیبی مہم چھیڑنے کو کہا ہے۔ بش کا خیال ہے کہ اس کی ساری حرکات وسکنات خدائی تعلیمات اور الٰہی ارادوں کی تنفیذ سے عبارت ہیں۔

۶ اکتوبر ۲۰۰۵ء (یکم رمضان ۱۴۲۶ھ) کو بی بی سی لندن نے ایک دستاویزی پروگرام میں بتایا تھا کہ جون ۲۰۰۳ء میں بش نے نام نہاد فلسطینی مقتدرہ کے وزیر اطلاعات نبیل اشعت سے وہائٹ ہاؤس میں کہا تھا کہ اس کی عسکری سرگرمیاں خدا کے پیغام کی ترجمانی کرتی ہیں۔ خدا نے اس سے کہا کہ عراقی اقتدار کو ختم کر دو اور افغانی انتظامیہ کو تبدیل کر دو چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ اب اسے محسوس ہو رہا ہے کہ اس وقت خدا کا حکم ہے کہ فلسطینیوں کے لیے ایک ریاست کا قیام عمل میں لاؤ، اسرائیل

کے لیے سیکورٹی فراہم کرو اور وہ یہ سب کچھ کر کے رہے گا۔

افغانستان کی اسلامی حکومت کی تباہی، اس کی ہمہ گیر بربادی جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے، عراق کے خلاف جنگ و قبضہ اور وہاں 'لڑاؤ اور حکومت کرو' کی پالیسی کا نفاذ، اس کے حصے بخرے کر دینے کے منصوبے پر عمل، یہودیوں کی وہاں دندناہٹ، فسلطینیوں پر آتش و آہن کی بے طرح بارش اور انہیں دوڑا دوڑا کے مارنے، بھوکوں تڑپانے، خاک و خون میں لوٹانے کی مشق، سعودی عرب، کویت، قطر، عمان، بحرین وغیرہ کی عسکری ناکہ بندی بلکہ جکڑ بندی اور سعودی عرب میں 'دہشت گردی' کا عفریتی و ساحرانہ کھیل، ان ملکوں میں دینی نصابوں کی تبدیلی، تاریخی و ثقافتی میراث کی بربادی، رفاہی کاموں پر طرح طرح کی پابندی، مذہبی سرچشموں کو خشک کر دینے کا عمل، اسلامی شعائر پر حملہ، نبی اسلام ﷺ کو سب وشتم کیے جانے کی تحریکِ مسلسل اور اسلامی و عربی ملکوں پر یکے بعد دیگرے نشانہ باندھنے کی 'رسم وراہ' اسی حرفِ کراہیت اور عقیدۂ بد کی تفسیریں ہیں جو روبہ عمل لائی جارہی ہیں۔

مسیحی بنیاد پرستی اور یہودی عالمی صہیونیت کے عشقِ بے پناہ کا رنگ، جتنا چوکھا ہوتا جائے گا، اسلام اور مسلمانوں پر مشقِ ستم میں اسی قدر شدت آتی جائے گی کیوں کہ یہ بنیاد پرستی انتہائی خطرناک ہے۔ اس کے شعور و لاشعور دونوں کی گہرائی میں یہ خیال جاگزیں ہے کہ اس کے ماننے والوں کا قول و فعل ماورائے تاریخ و ارادۂ انسانیت غیر مرئی قانون کی دین ہیں، اسی لیے بش نے اپنے خیالات سے متصادم حقائق سے یکسر چشم پوشی اور کور مغزی کا رویہ نہ صرف یہ کہ اختیار کیا بلکہ عالمی برادری اور امریکہ کے تاریخی حلیفوں کے ذریعے بہ اصرار راہِ صواب سمجھائے جانے کو امریکہ دشمنی اور اسرائیل دشمنی گردانتے ہوئے جنگ کے شعلوں کو اس طرح فروزاں کیا کہ امریکہ کے وقار کے سارے سرمایے بھسم ہو جانے کے باوجود وہ انہیں بجھا دیے جانے کا مشورہ دینے والوں کی بات ماننے کے لیے نہ صرف یہ کہ تیار نہیں ہوا، بلکہ انہیں نامعقول، بے وقوف اور انسانیت دشمن خیال کرتا رہا۔ بش کے لیے ماضی کی طرف لوٹنا ممکن نہیں اور آگے کی طرف گہری کھائی کے سوا کچھ بھی نہیں، لیکن عقیدہ و عمل کے جس جہنم کا ایندھن وہ بن رہا ہے، اس کی وجہ جہاں اس کی مذہبی و عملی گمراہی ہے وہیں گمراہی پر اس کے ثابت قدم رہنے کے ایسے اسباب بھی ہیں جن کا ازالہ ممکن نہیں۔ بش کے رفقائے کار، خواہ وہائٹ

ہاؤس کے اندر ہوں یا وزارتِ دفاع میں، ان میں سے اکثر ایسے امریکی یہودی ہیں جو دوہری نیشنلٹی رکھتے ہیں اور سابقہ اسرائیلی حکومتوں میں مشیر رہ چکے ہیں ، وہ جہاں امریکی ہیں وہیں یہودی بھی ہیں۔ یہ بدبخت رفقا، بش کی خوں خواری میں اضافہ اور عربوں اور مسلمانوں کے خون کی لذت وافادیت سے اس کو بار بار آگاہ کرتے رہتے ہیں کہ اس کو پینے سے دنیا وعقبیٰ کا ہر مرض زائل ہوجاتا ہے۔ بش کی خوں خواری کا اندازہ اس کے جون ۲۰۰۲ء میں امریکہ کے ایک عسکری اڈے میں اس اعلان سے ہوسکتا ہے جو امریکہ کی تاریخ میں کسی صدر نے نہیں کیا تھا: ''مستقبل میں امریکی افواج کے لیے ضروری ہے کہ خطرات کے حقیقت واقعہ بننے سے پہلے وہ مطلوبہ عسکری سرگرمی انجام دینے میں عجلت سے کام لیں، اس لیے کہ امریکی سکیورٹی سارے امریکیوں سے اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ حفاظتی واحترازی عمل کے لیے بالکل تیار ہیں۔ ۸ مارچ ۲۰۰۳ء کی شب اردو سروس بی بی سی لندن نے کہا کہ امریکی صدر بش نے کہا ہے کہ عراق امریکہ کے لیے براہ راست خطرہ ہے، اس لیے اقوام متحدہ کی منظوری کے بغیر وہ عراق پر حملہ کرے گا۔ افغانستان وعراق اور عالم اسلام وعرب کے خلاف امریکہ کی وسیع تر جنگ امریکہ اور اسرائیل کے لیے وسیع تر حفاظتی عمل کا حصہ تھا اور ہے جو بش امریکیوں سے انجام دلوا رہا ہے۔ 'حفاظتی و احترازی جنگ' کا اصول و کردار انتہائی سفاکانہ ہے جو صہیونی مسیحی صلیبی اور بنیاد پرست بش اور اس کے ٹولے نے تراشا اور اس کو برپا کرنا شروع کیا ہے۔ اس اصول کے تحت کسی بھی ملک پر کسی بھی وقت حملہ کیا جا سکتا ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے امریکہ اور انسانیت یعنی اسرائیل کو خطرہ تھا جو دور کر دیا گیا۔

مذکورۃ الصدر پس منظر میں یہ بات، جو سارے باخبر مبصرین نے کہی اور لکھی ہے، زیادہ واضح اور ثابت ہوجاتی ہے کہ ایران عراق جنگ ہو یا عراق کو کویت پر چڑھ دوڑنے کی بیوقوفی کرنے کی تحریک وترغیب، اس کے بعد کی عراق کے خلاف امریکی جنگ ہو یا عراق پر طویل ہمہ گیر اقتصادی پابندی، اقوام متحدہ کی آڑ میں عراقی اسلحہ کی تفتیش کا اکتا دینے والا عمل ہو یا ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کا ڈرامہ اور پھر اس کے بہانے افغانستان کے خلاف عسکری عمل ہو یا عراق کو تہس نہس کرنا اور عالم اسلام پر ہمہ گیر حملہ، یا اسلامی شعائر اور حضرت محمد ﷺ کی تحقیر و استہزا، یہ سارا کچھ اسلام کے خلاف ایک مربوط و مسلسل

جنگ کا عمل ہے، جو جاری ہے اور تا دیر جاری رہے گا، کیوں کہ اس کا مقصد صہیونی مسیحی صلیبی مقاصد کو بروئے کار لانا ہے۔ چوں کہ صہیونیت زدہ مسیحیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ مسیح کی ولادتِ نو کی تعجیل کے لیے اسرائیلی ریاست کی بہ ہر نوع حمایت ضروری ہے، اس لیے عقیدے کے سامنے عالمی برادری کی کسی بات کو ماننے کی چنداں ضرورت نہیں، اسی لیے بش نے بار بار یہ بات دہرائی کہ اقوام متحدہ عراق پر حملے کی منظوری دے یا نہ دے، امریکہ عراق پر بہر کیف حملہ کر کے رہے گا کیوں کہ اس نے اقوام متحدہ کی غیر مسلح ہونے سے متعلق قرار داد (۱۴۴۱) اور اس سے پہلے کی قرار دادوں کو یکسر نظر انداز کیا ہے۔ گویا عراق نے اگر اقوام متحدہ کو نظر انداز کیا ہے تو آپ کو یہ حق ہے کہ اس کو، اقوام متحدہ کو نظر انداز کرنے کی سزا، اقوام متحدہ کو نظر انداز کر کے ضرور دیں۔ عجیب سی منطق ہے، لیکن مسلمانانِ عالم جو بے بس ٹھہرے تو ظاہر ہے کہ انہیں امریکہ، اسرائیل اور فرزندان صلیب وصہیونیت سے ہر طرح کی ضرب سہنی ہے اور تذلیل وتحقیر بھی اور ساتھ ہی ''بھینس'' بھی کھونی ہے، کیوں کہ انہوں نے ''لاٹھی'' کھونے کے گناہ کا مسلسل ارتکاب کیا ہے، لہٰذا جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔

جانی نقصانات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو نائن الیون کا واقعہ ایک معمولی واقعہ تھا اس لیے کہ اس میں ڈھائی پونے تین ہزار امریکی ہلاک ہوئے۔ اتنے مسلمانوں کو تو امریکیوں نے صرف افغانستان پر حملہ کر کے چند روز میں ہلاک کر دیا، اس کے بعد عراق میں حملہ کر کے ہر ہفتے اتنے مسلمانوں کو بھسم کرتے رہے ہیں۔ امریکہ، اس کے دم چھلہ برطانیہ اور مغربی ملکوں نے عراق پر دس سال تک جو اقتصادی پابندیاں عاید کیں، ان سے دس لاکھ عراقی مسلمان صرف دوا اور غذائی قلت کی وجہ سے موت کا نوالہ بن گئے، جن میں پانچ لاکھ بچے شامل تھے۔ آپ نے مغربی اور امریکی ذرائع ابلاغ سے ان دس لاکھ معصوم انسانوں کے ضیاع کا کبھی تذکرہ بھی نہ سنا ہوگا، کیوں کہ مغربی و امریکی صلیبی و یہودی سونے کے بنے ہوئے ہیں اور مسلمان مٹی کے، لہٰذا اگر وہ چند سو بھی مر جائیں تو دنیا کے کونے کونے میں ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں اور اگر مسلمان لاکھوں کی تعداد میں بھی ان کے ہاتھوں مارے جائیں تو محض ان کی تعداد کے تذکرے کی بھی وہ ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

نائن الیون کے روز مرنے والے ڈھائی پونے تین ہزار مسیحیوں اور یہودیوں کی ہلاکت کو پورے

عالم کی نفسیات پر مسلط کر کے، اس کی آڑ میں صہیونی اور مسیحی دن رات، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف، سازش، جنگ ،نفرت کی نہ ختم ہونے والی لہر کی تخلیق، ہمارے مراکز و مدارس، نصاب ہائے تعلیم ، ہماری تاریخ ،تہذیب وثقافت، ہمارے مذہب وپیغمبر، ہمارے علماء وقائدین، ہمارے دعاۃ و رفاہی کاموں کے ذمے داران، کے خلاف ایسا معرکہ بپا کیے ہوئے ہیں کہ پوری دنیا میں اور خود ہمارے گھروں کے اندر ہمارے لیے جینا مشکل ہوگیا ہے۔اس صورتِ حال کی وجہ سے پوری اسلامی دنیا مبتلائے اضطراب ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے حکمران ،مغرب اور امریکہ کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں کیوں کہ ایمان کی کمزوری اور ضمیر کی موت کے حوالے سے وہ اپنا جواب آپ ہیں۔اس لیے وہ امتِ مسلمہ کے خلاف کی جانے والی کارروائیوں میں امریکی حمایت میں مؤثر کردار ادا کررہے ہیں۔ دنیا کی چند روزعزت و وجاہت کی چمک نے نہ صرف انہیں اندھا کیا ہوا ہے، بلکہ ان کی عقل بھی ماری گئی ہے۔مسئلے کا خطرناک پہلو یہ ہے کہ مسلمان ہنوز اس ہمہ گیر اور بھرپور یلغار کے آگے کسی طرح کا بند نہیں باندھ سکے ہیں۔اس حملے اور سازش کو اس کے ہمہ گیر تناظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے، اس کے بغیر اس کا فکر وعمل کی سطح پر مؤثر جواب دینا ممکن نہیں۔اس حملے میں نائن الیون کی سازش کی تحت جو تیزی لائی گئی ہے، اس وقت سے اب تک کے طویل دورانیے میں یہ بات ہر مسلمان پر منکشف ہوگئی ہے کہ امریکہ،مغرب اور یہود کے ذریعے ہماری رسوائی اور تباہی کی اصل وجہ ہمارے ملکوں کے مغرب کے وفادار خادم اور غلام حکمراں ہیں، جن کے ذریعے یہود وفرزندانِ تثلیث اپنے منصوبوں کو روبہ عمل لا رہے ہیں۔ انہیں ہر جگہ قبل از یلغار اور بعد از یلغار بہت سارے کرزئی اور مشرف مل جاتے ہیں۔اگر یہ آڑے نہ آتے تو امتِ مسلمہ میں یہود ونصاریٰ کے ہر زہر کا تریاق فراہم کرنے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔

بالیقین صہیونیوں کی کامیابی کا راز ان کی غیر معمولی ذہانت اور ان کی محض اقتصادی وابلاغی برتری نہیں ، بلکہ ان کے حکمران وعوام مسلمانوں کے خلاف اپنے منصوبوں کے نفاذ میں ہر وقت ، ہر جگہ، ہر محاذ اور ہر سطح پر یک جان و یک آواز اور مکمل طور پر متحدہ ہیں ، اسی لیے انہوں نے پوری دنیا میں

ہمارے لہو کو پانی سے زیادہ ارزاں بنادیا ہے۔ ان کے توڑ سے ہم اس لیے عاجز ہیں کہ ہمارے ہاں عرصۂ دراز سے حکمرانوں اور امت کے عام افراد کے درمیان فکری و عملی سطح پر زبردست خلیج پائی جاتی ہے۔ الغرض ہم خارجی دشمن سے اتنے ستم زدہ اور شکست خوردہ نہیں ہیں جتنے داخلی دشمن اور مارہائے آستین یعنی قائدین و حکام سے، جس دن ہمیں کسی طرح ان سے نجات مل گئی وہ پوری دنیا میں وہ ہماری برتری کا دن ہوگا (بشکریہ 'دعوت' دہلی)۔

استدراک

اس مضمون کو پڑھ کر ہمارے ایک دوست نے یہ تبصرہ کیا کہ یہود و نصاری جس طرح اتحاد کر کے مسلمانوں کو ذلیل و رسوا کر رہے ہیں اسی طرح مسلمانوں کو صہیونی عیسائی گٹھ جوڑ کے شر سے بچنے کے لیے ایسی حکمت عملی وضع کرنی چاہیے جس سے یہود و نصاری میں تفریق پیدا ہو۔ اسی طرح عالم اسلام کو امریکی شر سے بچنے کے لیے یہ کرنا چاہیے کہ جیسے تیسے بھی ہو وہ یورپ کی ہمدردیاں حاصل کر لے اور یورپ و امریکہ کے عالم اسلام کے خلاف اتحاد میں رخنے پڑیں بلکہ خود امریکی ریاستوں میں موجود اختلافات اگر بڑھ جائیں تو لوگوں کو اس عفریت سے پناہ ملنے میں آسانی ہو۔ امین

تزکیۂ نفس　　علامہ احمد جاوید

اکتساب فضائل (۴)

توکل

س: توکل کی تعریف کیا ہے؟

ج: توکل نام ہے اپنی بجائے اللہ پر بھروسہ کرنے کا یا یوں کہہ لیں کہ خود کو اور اپنے تمام معاملات کو اللہ کے سپرد کر دینا اور اس پر مطمئن رہنا توکل ہے۔

س: دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگ توکل سے یہ سمجھتے ہیں کہ آدمی کوشش و عمل ترک کر کے محض اللہ کی مدد اور فضل کی امید پر بیٹھا رہے کیا یہ رویہ درست ہے؟

ج: ہرگز نہیں۔اس رویے میں ایک طرح کا تکبر پوشیدہ ہے۔ایسے لوگ اللہ پر اپنا حق جتاتے ہیں جو اللہ تبارک و تعالیٰ کے پیدا کردہ تمام ممکنہ اسباب کو اختیار کرے اور پھر نتائج کو اللہ پر چھوڑ دے۔ جو نتیجہ بھی نکلے اس سے بددل نہ ہو اور اس رویے کو مرتے دم تک برقرار رکھے۔توکل کا یہ مفہوم تھوڑی ہے کہ آدمی اللہ پر بوجھ بن جائے یا اسے معاذ اللہ امتحان میں ڈالے رہے۔

س: کیا توکل میں یہ بات داخل نہیں ہے کہ بندہ اپنے نفع و نقصان وغیرہ کو اللہ کی طرف سے سمجھے اور یہ یقین رکھے کہ اللہ کی مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوسکتا؟

ج: بالکل، یہ چیز تو توکل کی روح ہے۔متوکل آدمی کوشش بھی دعا کی طرح کرتا ہے اور اس کی قبولیت کی کسی خاص شکل پر اصرار نہیں کرتا۔عمل جس احتیاج سے پیدا ہوتا ہے وہ احتیاج بندگی کا خلاصہ ہے۔خود کو عمل سے مستغنیٰ کر کے آدمی بندہ کہلانے کے لائق نہیں رہتا۔ بندگی کے جتنے بھی فضائل ہیں وہ سب عمل سے اور عمل کے بعد حاصل ہوتے ہیں خواہ یہ عمل دینی ہو یا دنیاوی۔توکل کو بھی اس پر قیاس کریں اور اچھی طرح جان لیں کہ توکل اسی بندگی کی ایک صفت ہے جس کا جوہر مجاہدہ اور محتاجی ہے۔ جوہر کو منہا کر کے کسی شے کے وصف کا کوئی اعتبار نہیں۔

س: متوکل بننے کے راستے میں کون سی رکاوٹیں آج کے مسلمان کو درپیش ہیں؟

ج: تمام ضروریات بندگی میں نقص و کمال کا ایک ہی اصول ہے اور وہ ہے اللہ سے تعلق۔ یہ تعلق مضبوط ہے تو بندگی مجموعی طور پر کامل ہے اور اگر یہی کمزور ہے تو بندگی کا ہر پہلو ناقص ہے تاہم ہر

فضیلت اپنا ایک ذاتی رنگ بھی رکھتی ہے لہٰذا اس کے مواقع اور محرکات کا رنگ سے بھی تعین کیا جا سکتا ہے۔اس اعتبار سے توکل سے محرومی یا اس میں کمزوری کے بنیادی اسباب یہ ہیں:

-حبّ دنیا
- تکبر
- ریا اور مخلوق پر بھروسہ
- طول امل

ان میں سے اس معاملے میں ہر ایک کے کردار کی ضروری تفصیل یہ ہے:

حب دنیا

توکل کے لیے حب دنیا زہر ہے۔نفس کی جو خرابیاں بندے کو توکل بلکہ تعلق باللہ کی تمام صورتوں سے محروم کر دیتی ہیں حب دنیا ان میں سے ایک ہے۔توکل کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ مجھے اللہ سے اپنے تعلق کی بہتری اور مضبوطی مطلوب ہے، اپنی مرضی اور خواہش پر چلنا مطلوب نہیں۔ دنیا کی محبت اس کے منافی ہے۔ یہ دنیا کو خدا سے بڑھ کر مطلوب بنا دیتی ہے اور اس شدت طلب میں جو چیزیں سب سے پہلے متاثر ہوتی ہیں توکل ان میں سے ایک ہے۔غور سے دیکھیں تو بندگی کے دیگر ضروری فضائل کی طرح توکل بھی بندے اور مالک کے تعلق کی فطری طور پر متوازن صورت کا نام ہے۔ دنیا اس توازن میں یقیناً ایک کردار رکھتی ہے لیکن اس کی حیثیت اصولی طور پر اس احتیاج کو تقویت دینے والے عنصر کی ہے جو عبودیت کی روح ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اس میں رہ کر بندے کو اپنے پروردگار اور حاجت روا پر اس بھروسے کا بھی ناگزیر طور پر ثبوت دینا پڑتا ہے جس کے بغیر بندگی محض ایک جبر کا نام تو ہو سکتی ہے مگر اس طاقت اور اختیار کی حاصل نہیں بن سکتی جو احتیاج ہی کی طرح اسے حقیقی اور بامعنی بنا سکے۔ بالفاظ دیگر بندگی جس حاجت مندی، اعتماد اور اختیار سے عبارت ہے، توکل اس کی پوری نمائندگی کرتا ہے۔ دوسری طرف دنیا ہماری ضرورت بھی ہے اور ہمیں طبعاً مرغوب بھی ہے۔ضرورت اور رغبت کی یکجائی ادنیٰ کو کسی اور تعلق کی شرائط ملحوظ رکھنے سے روک سکتی ہے یعنی دنیا کا ضروری اور مرغوب ہو جانا تعلق باللہ کی ایک ضروری شرط تسلیم و انقیاد کو اس طرح متاثر کرنے کی قوت رکھتا ہے کہ ہم اس تعلق کے اساسی تقاضے یعنی لامطلوب و لامقصود الا اللہ کو ابتدائی طور پر ہی پیش نظر رکھنے کے قابل نہیں رہتے۔ دنیا ایک پہلو سے اللہ کی نعمت تو ہے مگر اس کی محبت اسے اللہ کا بدل بنا

دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حب دنیا اور شرک یا کفر ہم معنی چیزیں ہیں اللہ سے دور لے جانے کی جتنی صلاحیت حبّ دنیا میں پائی جاتی ہے اتنی شرک اصطلاحی میں بھی نہیں۔ شرک پھر بھی عبودیت کے تصور کو بگاڑ کے ساتھ ہی سہی مگر محفوظ رکھتا ہے حب دنیا میں یہ بات بھی نہیں پائی جاتی۔

سادہ لفظوں میں یوں سمجھیں کہ نفس انسانی اپنی محبوب و مطلوب چیز کے معاملے میں کسی پر بھروسہ نہیں کرتا۔ اس تک رسائی یا نارسائی کے تمام احوال خود تک محدود رکھنا چاہتا ہے اور ان میں کسی کی نسبت یا مداخلت پسند نہیں کرتا۔ دنیا کی محبت اگر پیدا ہو جائے تو یہ صورت لازماً پیش آتی ہے کہ آدمی اس کے سلسلے میں کامیاب ہو یا ناکام، خودمختار اور خود مکتفی رہنا چاہتا ہے۔ اللہ کا حکم، مرضی اور قدرت اس تمنا کے راستے میں رکاوٹوں کی طرح محسوس ہوتی ہیں۔

ترکِ رذائل

حبّ دنیا

حبّ دنیا یہ ہے کہ دنیا اس قدر مطلوب ہو جائے کہ آدمی اس کے حصول کا ہر ذریعہ، خواہ صحیح ہو یا غلط، اختیار کر لے اور اس بارے میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی واضح ناراضی اور غضب کو بھی خاطر میں نہ لائے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ دنیا کی طلب اور محبت کا اللہ کی طلب اور محبت پر بداہتہً غالب آ جانا حبّ دنیا ہے۔

حبّ دنیا نہ صرف یہ کہ تمام گناہوں کی جڑ ہے بلکہ اپنے شکار کو کفر، شرک اور جہنم تک پہنچا سکتی ہے جیسا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے متعدد ارشادات سے ثابت ہوتا ہے۔ حبّ دنیا کا علاج ہے اس تجربی صداقت کا استحضار کہ دنیا اور دنیا کی راحتیں خود اس کے طالب کے ساتھ فنا ہو جانے والی ہیں اور اس ایمانی حقیقت کی یاد دہانی کہ آخرت اور اس کی راحتیں نہ صرف یہ کہ خود باقی رہنے والی ہیں بلکہ اپنے طالب کی مطلوبہ بقاء کا بھی سامان رکھتی ہیں۔ یہ حبّ دنیا کی گرفت کمزور کرنے کی واحد اصولی تدبیر ہے تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مرض اتنا گہرا اور پیچیدہ ہے کہ جب تک مریض خود اس سے نکلنے کی جان توڑ کوشش، جسے اصطلاح میں مجاہدہ کہتے ہیں، نہیں کرے گا، پورا افاقہ نہیں ہو سکتا۔ 'ترکِ رذائل' از علامہ احمد جاوید

تزکیۂ نفس　　علامہ ابن جوزی

موت ـــــ جسے ہم بھول گئے ہیں

معلوم ہونا چاہیے کہ دنیا میں منہمک اور اس کے دھوکے میں مبتلا آدمی کا دل لازماً موت کے ذکر سے غافل ہوتا ہے۔ وہ اس کا بالکل تذکرہ نہیں کرتا اور اگر کبھی کرتا ہے تو نفرت کے رنگ میں۔ وہ دنیا کی ناپائیداری پر افسوس اور موت کی مذمت میں مشغول رہتا ہے اور یوں ایسے آدمی کو موت کا تذکرہ اللہ سے اور دور کر دیتا ہے۔ البتہ توبہ کرنے والا موت کا تذکرہ اس لیے کرتا ہے کہ اس کے دل میں ڈر پیدا ہو اور وہ اپنی توبہ کو پورا کر سکے۔ اس سلسلے میں کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ وہ موت کو اس لیے ناپسند کرتا ہے کہ عقبٰی کے سفر میں زادِ راہ کی تیاری سے پہلے موت نہ آ جائے؛ چنانچہ اس کا موت کو ناپسند کرنا بُرا نہیں۔ یہ آدمی نبی ﷺ کے اس فرمان کے تحت نہیں آتا کہ جو 'اللہ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اللہ بھی اس کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے'' کیونکہ وہ اللہ کی ملاقات سے اپنی کوتاہیوں اور گناہ کی وجہ سے ڈرتا ہے۔ اس کی مثال اس شخص جیسی ہے جو دوست کی ملاقات کو اس خیال سے مؤخر کرے کہ اس کی پسند کے مطابق تیاری کرنے کے بعد ملاقات کے لیے جائے گا۔ ایسے آدمی کے لیے یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ ملاقات کو پسند نہیں کرتا اور اس کی علامت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اس کی تیاری میں لگا رہے۔ بہرحال موت کے تذکرے میں ثواب اور فضیلت ہے۔ دنیا میں غرق آدمی بھی کبھی اس سے فائدہ اٹھاتا ہے کہ وہ دنیا سے الگ ہو جاتا ہے کیونکہ موت کا تذکرہ دنیا کی نعمتوں کو مکدر کر دیتا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ نے کہا رسول ﷺ نے فرمایا: لذتوں کو توڑنے والی موت کا اکثر تذکرہ کیا کرو۔ حضرت انسؓ نے کہا کہ ایک آدمی کا تذکرہ نبی ﷺ کے سامنے ہوا۔ لوگوں نے اس کی بڑی تعریف کی، تو نبی ﷺ نے پوچھا! یہ آدمی موت کا تذکرہ کس طرح کرتا ہے،؟ انہوں نے کہا کہ ہم نے کبھی اسے موت کا تذکرہ کرتے نہیں سنا تو آپ نے فرمایا: 'تمہارا ساتھی اس درجہ کا نہیں ہے'۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ سے پوچھا گیا: 'کون آدمی زیادہ عقل مند ہے،؟ آپؐ نے فرمایا: 'جو موت کا تذکرہ زیادہ کرے اور موت کے بعد کی زندگی کے لیے اچھی تیاری میں لگا رہے وہی عقل مند ہے'۔ معلوم ہونا چاہیے کہ موت کا خطرہ بڑا عظیم ہے، لوگ اس سے محض قلتِ فکر و ذکر کی وجہ سے غافل ہیں اور اگر کوئی اس کا تذکرہ کرتا بھی ہے تو غافل دل سے کرتا ہے۔ اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی تمام خیالات سے کنارہ کش ہو کر موت کا تذکرہ کرے اور یوں سمجھے کہ

وہ سامنے سے آرہی ہے۔ اس کا حال ایسا ہو کہ گویا خطرناک جنگل طے کرنا چاہتا ہو یا سمندر کا سفر کر رہا ہو۔ ایسی صورت میں وہ سب سے زیادہ خطرات کے متعلق غور کرے گا۔ اس کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ اپنے ان ساتھیوں اور ہم عصروں کو یاد کرے جو اس سے پہلے گزر چکے ہیں اور ان کی موت اور ان کے زمین کے نیچے دفن ہونے کو یاد کیا کرے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے فرمایا: 'خوش قسمت وہ ہے جو دوسروں سے عبرت حاصل کرے'۔ حضرت ابوالدرداءؓ نے فرمایا: 'جب مُردوں کا تذکرہ ہو تو اپنے آپ کو بھی انہی میں سے شمار کرو'۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے کندھے سے پکڑا اور فرمایا: 'دنیا میں اس طرح رہو جیسے کوئی پردیسی یا راہ چلتا مسافر'۔ وہ کہا کرتے تھے، جب شام ہو جائے تو صبح کی امید نہ رکھ اور جب صبح ہو تو شام کا انتظار نہ کر اور اپنی صحت میں بیماری اور اپنی زندگی میں موت کا سامان کرو'۔ حضرت حسنؓ نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا: 'کیا تم سب جنت میں داخل ہونا چاہتے ہو؟ انہوں نے کہا ہاں تو فرمایا، طول امل (یعنی لمبی امیدیں پالنے) سے بچو، اپنی موت کو اپنے سامنے رکھو اور اللہ تعالیٰ سے پوری طرح حیا کرو'۔

معلوم ہونا چاہئے کہ طول امل کے دو بڑے سبب ہیں: دنیا سے محبت اور جہالت۔ جب انسان دنیا کی خواہشات، لذتوں اور تعلقات سے مانوس ہوتا ہے تو اس کی جدائی دل پر گراں گزرتی ہے۔ اس کا دل موت کی یاد سے رک جاتا ہے جیسا کہ ہر آدمی اپنی ناپسندیدہ چیز کو اپنے نفس سے دور رکھنا چاہتا ہے۔ انسان باطل خواہشات میں مشغول رہتا ہے۔ وہ اپنے نفس کو ہمیشہ اپنی مراد کے موافق دنیا میں باقی رہنے کی امید دلاتا ہے۔ وہ مال، اہل وعیال، مکان وسامان اور ضرورت کی چیزوں کے خیال میں اس طرح ڈوبا رہتا ہے کہ اپنی موت سے غافل ہو جاتا ہے۔ اگر کبھی اس کا خیال آ بھی جائے تو اسے آئندہ پر ٹالتا ہے اور اپنے نفس کو یقین دلاتا ہے کہ ابھی تو بہت زندگی پڑی ہے آگے چل کر توبہ کرلوں گا۔ پھر سوچتا ہے بوڑھے ہو کر تائب ہو جاؤں گا۔ اور جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو کہتا ہے مکان کی تعمیر سے فارغ ہو جاؤں، اس زمین کو آباد کرلوں، اس سفر سے واپس آجاؤں۔ بس اسی طرح ٹالتا رہتا ہے۔ ایک کام پورا کرنے کی حرص کرتا ہے تو اس کے ساتھ دس شغل اور چمٹ جاتے ہیں یہاں تک کہ موت اسے آکر دبوچ لیتی ہے اور اب یہ بات اس کی سمجھ میں آتی ہے کہ جن کاموں میں وہ الجھا رہا ان میں سے ایک بھی نفع پہنچانے والا نہ تھا۔

دوسرا سبب جہالت ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی اپنی جوانی پر اعتماد کرتا ہے، جوانی میں موت کا آنا بعید سمجھتا ہے اور یہ اس کی بھول ہے۔ اگر وہ اپنے شہر کے بوڑھوں کا شمار کرے انہیں کم پائے گا تو اسے معلوم ہوگا کہ موت کا کوئی وقت نہیں۔ وہ گرمی، سردی، بہار، خزاں، دن، رات غرض کسی وقت بھی آسکتی ہے اس کے لیے عمر کا کوئی حصہ مخصوص نہیں۔ جوان، ادھیڑ عمر، بوڑھے اور بچے سب پر آتی ہے۔ انسان کے لیے یہی بات اچھی ہے کہ وہ موت کی تیاری کرے (منہاج القاصدین)۔

ہماری سرگرمیاں

☆ ۱۸ دسمبر ۲۰۱۰ء کو جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور میں دینی مدارس کے اساتذہ کی تربیتی نشست سے صدر تحریک ڈاکٹر محمد امین نے 'دینی مدارس کے نظام تعلیم کو مزید مؤثر کیسے بنایا جائے'؟ کے موضوع پر خطاب کیا۔ اس تقریب سے مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب، مولانا زاہدالراشدی صاحب اور دیگر علماء کرام نے بھی خطاب فرمایا۔

☆ ملی مجلس شرعی کا اجلاس ۶ دسمبر ۲۰۱۰ء کو دفتر تنظیم اسلامی گڑھی شاہو لاہور میں ہوا۔ جس میں سارے مکاتب فکر کے ممتاز علماء کرام نے شرکت کی خصوصاً مولانا زاہدالراشدی، مولانا عبدالرؤف فاروقی، مولانا مفتی محمد خان قادری، علامہ احمد علی قصوری، حافظ عبدالرحمٰن مدنی، مولانا حافظ عبدالغفار روپڑی، حافظ صلاح الدین یوسف، قاری شیخ محمد یعقوب، مولانا عبدالمالک، مولانا خلیل الرحمٰن قادری، ڈاکٹر فرید احمد پراچہ، حافظ عاکف سعید، ڈاکٹر محمد امین وغیرھم۔ ان علماء کرام نے بعد میں پریس کلب میں پریس کانفرنس بھی کی اور توہین رسالت اور مساجد و مزارات پر خودکش حملوں کی مذمت کی جس میں علامہ ڈاکٹر محمد حسین اکبر بھی شامل ہوئے۔

☆ تحریک کے ایک وفد نے، جس میں صدر تحریک ڈاکٹر محمد امین، پروفیسر شاہد رشید، سراج محمود ناصر، عبدالستار ہمدانی اور عبدالرؤف شامل تھے، اسلام آباد میں معروف دانشور اور سیاستدان احسن اقبال، آغا مسعود شورش اور معروف صحافی اور دانشور عرفان صدیقی صاحب سے ملاقات کی۔ وفد نے ۱۹ دسمبر کو پائنیر اسلامک سکول اور جامعہ اسلامیہ للبنات واہ کینٹ کا دورہ کیا جہاں پروفیسر شاہد رشید اور ڈاکٹر محمد امین نے اساتذہ سے خطاب کیا۔ بعد میں وفد اٹک سے آگے سوجھنڈہ گاؤں گیا اور وہاں کلیۃ العلوم الاسلامیہ کا دورہ کیا اور ادارے کی بہتری اور نصاب وغیرہ سے متعلق مشاورت میں شرکت کی۔

☆ ادارہ مطبوعات طلبہ لاہور نے حال ہی میں صدر تحریک کی کتاب 'ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل' کی طبع نو کا اہتمام کیا ہے۔ تعارفی تقریب ۲۵ دسمبر ۲۰۱۰ء کو ہمدرد سنٹر لاہور میں ہو رہی ہے جس کی صدارت جسٹس (ر) خلیل الرحمٰن خان فرمائیں گے جبکہ مقررین میں پروفیسر ڈاکٹر مہر سعید اختر، اوریا مقبول جان، پروفیسر رشید احمد انگوی اور پروفیسر سلیم منصور خالد شامل ہوں گے (ان شاء اللہ)۔

مدیر کے نام

''البرہان کے مندرجات نہایت عمدہ ہیں مثلاً قرآن، سیرت، دینی تناظر، معاشرت، تزکیۂ نفس، تفہیم مغرب اور ہماری سرگرمیاں۔ امید ہے کہ آپ اس ضمن میں ان مستقل عنوانات کے علاوہ معیشت اور اسلامی نقطۂ نظر اور زندگی کے بارے میں مغرب کے نظریات اور اس کے مقابل قرآن و حدیث کی تعلیمات جدید تناظر میں بھی پیش فرمائیں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

آپ سے التماس ہے کہ یہ جو آج کل مغربی امداد کے تحت نیم خواندہ دانشور (Pseudo Intellectuals) پیدا ہوگئے ہیں اور پھر یو ایس ایڈ کے تحت علماء کرام بھی پی سی بھوربن میں نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ دینی اجتماعات کررہے ہیں، اس پر بھی کچھ خامہ فرسائی فرمائیں گے۔ پھر این جی او کے کردار کو بھی زیر بحث لایا جائے کہ اس سے ہمارے معاشرے میں کتنا سدھار اور بہتری وفلاح پھیلی ہے اور کس قدر شر نے جنم لیا ہے۔

مجھے قوی امید ہے کہ آپ لارڈ میکالے کے نظام تعلیم کو بھی تحقیقی وتنقیدی طریقہ سے کسی مقالہ میں پیش فرمانے کا بندوبست کریں گے اور پھر اسی طرح مشرف دور میں جو تعلیمی پالیسی Subtle Subversion کے نام سے ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی صورت معرضِ وجود میں لائی گئی تھی اس کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ بھی قوم کے سامنے پیش فرمائیں گے۔

اسی طرح البرہان میں Pew, RAND Corporation اور اسی طرح کے دیگر تھینک ٹینکس مثلاً The Club of Rome، Brookings Institute وغیرہ کی رپورٹوں اور تجزیات اور کتب کے اردو تراجم عوام الناس کی آگہی کے لیے تلخیص کی صورت میں پیش فرمایا کریں گے۔ مغربی پریس سے انتخاب کا مستقل عنوان بھی آپ کی فہرست مضامین میں ضرور شامل ہونا چاہیے۔

تنویر احمد بٹ، کراچی

البرہان: ہم تنویر احمد بٹ صاحب اور دیگر اہل علم سے درخواست کریں گے کہ وہ مذکورہ موضوعات پر قلم اٹھائیں۔ البرہان کا تعاون انہیں، ان شاء اللہ، حاصل ہوگا۔

امریکی غلامی سے نجات کی واحد راہ

ریمنڈ ڈیوس کی رہائی ــــ صدمہ، مایوسی، غصہ، نفرت، انتقام ــــ ہمیں سمجھ نہیں آتی اپنے جذبات کا اظہار کیسے کریں؟ ہماری پوری اشرافیہ ــــ سیاستدان، انتظامیہ، عدلیہ، میڈیا، فوج۔۔۔سب بِک چکی ــــ کیا ہم میر جعفر اور میر صادق کی اولاد ہیں؟ ہمیں یہ سوچ کر اپنے آپ سے گھِن آنے لگتی ہے کہ ہم وہ قوم ہیں جو امریکی غلامی اور استعمار کی ویوٹی پر قانع ہو چکی اور جو لوگ غلامی پہ قانع ہو جائیں کیا وہ مسلمان ہوتے ہیں؟ بلکہ کیا وہ انسان ہوتے ہیں؟ یا ایک ریوڑ جسے جدھر چاہے ہانک لیا جائے! کھرلی پہ بندھے جانور جنہیں زندہ رہنے اور کام کرنے کے لیے چارہ چاہیے۔۔۔اور بس۔۔۔نہ سوچنے سمجھنے اور اظہار کی صلاحیت، نہ کوئی نظریہ، نہ کوئی آئیڈیلز، نہ کوئی ترجیحات۔۔۔ **انا لله و انا اليه راجعون۔**

غیرت وعزت سے زندہ رہنے کی ہمیں تو ایک ہی صورت نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ پوری قوم اٹھ کھڑی ہو اور امریکی غلامی سے نجات کی خواہاں دینی اور سیاسی جماعتیں اور سول سوسائٹی کے سارے طبقات خصوصاً صحافی، طلباء، وکلاء، اساتذہ، ڈاکٹرز، انجینئرز۔۔۔امریکی غلامی سے نجات اور قومی خود مختاری کے تحفظ کے ایک نکاتی ایجنڈے پر جمع ہو جائیں اور ایسی پُر زور تحریک چلائیں جو امریکہ اور اس کی غلامی قبول کرنے والوں کو بہا کر لے جائے۔

(۲)

مندرجہ بالا مختصر جذباتی تحریر ریمنڈ ڈیوس کی رہائی سے پیدا ہونے والے تموج کے دنوں میں لکھی گئی لیکن البرہان چونکہ ہر مہینے کی آخری تاریخوں میں پریس جاتا ہے لہٰذا اس موضوع پر مزید سوچنے اور غور کرنے کا موقع مل گیا۔

ٹھنڈے دل سے سوچنے کے باوجود ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ یہ بات، اگرچہ تلخ ہے اور صدمے کی ہے، لیکن ہے سچی کہ ہماری اشرافیہ امریکہ کے آگے بک چکی یا اس بِکنے پر راضی ہو چکی بالخصوص ہماری سیاسی قیادت ــــ پیپلز پارٹی، مسلم لیگ (ن وق وغیرہ)۔ اے این پی، متحدہ، جے یو آئی۔۔۔سب ــــ باستثناء جماعت اسلامی اور عمران خان کی تحریک انصاف (اگرچہ خان صاحب کے بارے میں بھی بعض ناگفتنیاں سننے میں آرہی ہیں لیکن بہرحال ابھی تک وہ اپنے امریکہ مخالف

موقف پر بظاہر قائم ہیں)۔میڈیا مالکان اور بڑے اینکرز کے دام لگنے کے بارے میں خود میڈیا کے حلقوں سے تفصیلات مسلسل باہر آرہی ہیں اور ان کے چینلز اور اخبارات کا رویہ ان باتوں کی صداقت کا شاہد ہے۔فوج وہی کررہی ہے جو امریکہ چاہتا ہے۔عدلیہ اور بیوروکریسی کی تربیت ہی مغربیت اور سیکولرزم کے خطوط پر ہوئی ہے۔۔۔رہے نام اللہ کا۔

قوم اور سول سوسائٹی کا یہ حال ہے کہ قوم دو دفعہ سڑکوں پر آئی (ایوب خان اور بھٹو کے خلاف) لیکن دونوں دفعہ اسے کچھ نہیں ملا لہٰذا اب لوگ بے حس ہوگئے ہیں۔غریب لوگ دو وقت کی روٹی کے چکر میں ایسے پھنسے ہیں کہ انہیں کسی بات کی ہوش نہیں۔ بلاشبہ سوسائٹی کے سارے طبقات میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اس صورت حال کو سمجھتے ہیں اور امریکہ اور اس کے گماشتوں اور حمایتیوں اور ان کی کرپشن اور دینی قدروں کی پامالی پر آزردہ بھی ہیں لیکن وہ متفرق و منتشر ہیں اور کوئی قابل اعتماد سیاسی و دینی قیادت موجود نہیں جو انہیں مجتمع اور متحرک کرے۔اور یہ بھی ظاہر ہے کہ بچی کھچی صحیح الفکر قیادت (مثلاً جماعت اسلامی یا عمران خان) میں سے انفرادی طور پر کوئی اتنا طاقتور نہیں کہ اپنے بل بوتے پر امریکہ مخالف تحریک چلا سکے۔یوں کہا جاسکتا ہے کہ قوم میں امریکہ مخالف جذبات موجود ہیں لیکن ان کو نکاسی کا کوئی رستہ نہیں مل رہا۔

لہٰذا اب بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ بچی کھچی صحیح الفکر سیاسی و دینی قیادت اسلام اور مسلم دشمن امریکی استعمار کی غلامی سے نجات اور قومی خودمختاری کے تحفظ کے ایک نکاتی ایجنڈے پر فوراً مجتمع ہوکر تحریک چلانے کا اعلان کردے۔اس طرح سول سوسائٹی کے ہر طبقے کے صحیح الفکر لوگ اس تحریک میں جمع ہوجائیں گے اور کمزور و بے رائے لوگ بھی بتدریج اس میں شامل ہوتے جائیں گے اور بہت جلد یہ تحریک زور پکڑ کر نتیجہ خیز ہوجائے گی، ان شاء اللہ۔لیکن یاد رہے کہ اس دفعہ تحریک کے نتائج وثمرات عوام تک پہنچنے چاہئیں اور سچ مچ انقلاب آنا چاہیے اور اس کے لیے ساتھ ساتھ ہوم ورک ہونا چاہے اور تھنک ٹینک قائم ہونے چاہئیں۔

اور یہ سب کچھ فوراً کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ دشمن طاقتور ہے، منظّم ہے اور حملہ آور ہے۔اگر خدانخواستہ اس کا راستہ نہ روکا گیا تو جو آوازیں آج اٹھ رہی ہیں وہ بھی خاموش کردی جائیں گی اور پھر شاید ایسی تحریر بھی آپ کو پڑھنے کو نہ ملے ــــ اور یہ اس زلزلے اور طوفان سے بڑا المیہ ہوگا جن کا مزا قدرت ہمیں حال ہی میں چکھا چکی ہے تاکہ ہم سنبھل جائیں۔تو کیا ہم سنبھلیں گے؟ (محمد امین)

اہل مغرب کا اخلاقی دیوالیہ پن

ٹیری جونز

امریکہ کے ایک قصبے کے چھوٹے سے چرچ کا ایک پادری جسے قرآن دشمنی کا کریز ہے، شاید وہ شہرت کا بھوکا ہے یا نفسیاتی مریض ہے۔ اس نے اعلان کرکے اور دنیا کو دکھا کے قرآن جلایا۔ ہم مسلمانوں کے لیے تو یہ صدمے اور اشتعال کی بات ہے ہی، ہم پوچھتے ہیں امریکہ و یورپ کے نام نہاد 'مہذب' افراد سے کہ کیا یہ عدم رواداری اور عدم برداشت کا وہی رویہ نہیں جس کے نہ ہونے کا تم ہمیں الزام دیتے ہو کہ مسلمان غیر مہذب اور جاہل ہیں، انتہا پسند اور دہشت گرد ہیں لہٰذا ان میں رواداری اور برداشت کا مادہ نہیں۔ ہم کہتے ہیں آئینہ دیکھو کہ تم کیا ہو؟ اور تمہارے ٹیری جونز کیا ہیں؟

اور اب لیبیا

لیبیا کا قذافی واقعی آمر ہے اور اپنے خلاف اٹھنے والے لوگوں پر اس کا تشدد واقعی جرم ہے اور ہم اس کی مذمت کرتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ امریکہ و یورپ کو کیا تکلیف ہے کہ وہ لیبیا پر حملے کر رہے ہیں اور قذافی کا اقتدار ختم کرکے خود وہاں کے تیل پر قابض ہونا چاہتے ہیں اور وہاں اپنے ایجنٹوں کی حکومت بنانا چاہتے ہیں؟ یہ اقوام متحدہ کیوں امریکہ کی لونڈی بنی ہوئی ہے کہ امریکی خواہشات سر نیچا کرکے پوری کرتی جارہی ہے؟

افسوس! امت مسلمہ سوئی ہوئی ہے! او آئی سی گہری نیند میں ہے۔ ۵۷ مسلم ممالک کے حکمران امریکہ کے آگے سر اٹھا کے بات کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ یہ زنخے ایک ایک کرکے پٹتے جارہے ہیں۔ پہلے عراق پھر افغانستان اور اب لیبیا اور پاکستان لیکن نہ کسی کی حمیت جاگتی ہے نہ غیرت۔

تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو۔

توفیق بٹ

ہم سب مجرم ہیں

ریمنڈ ڈیوس کے حوالے سے جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا ہونا ہی تھا۔ پورے پروٹوکول کے ساتھ چند یوم کے لیے اسے جیل میں رکھنے کا ڈرامہ بھی امریکہ نے خود ہی کروایا ہوگا، پاکستان کے ''غیور عوام'' کو احساس دلانے کے لیے کہ ہم آپ کو کسی بھی قیمت پر خرید سکتے ہیں اور اگر دیت والی بات ''سرکاری مؤقف'' کی بجائے حقیقت ہے تو پھر مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے جب ایک ملک کے ''نیشنل ڈے'' کے حوالے سے منعقدہ ایک تقریب میں اس وقت کے امریکی سفیر تشریف لائے تو وہاں موجود ایک پاکستانی سیاستدان نے ان سے کہا'' آپ نے دیکھا باہر سڑکوں پر ہمارے کچھ لوگ آپ کے ملک کے خلاف احتجاج کررہے ہیں اور آپ کا قومی پرچم جلارہے ہیں۔'' ایک طنزیہ سی مسکراہٹ امریکی سفیر کے ہونٹوں پر پھیل گئی اوراس نے الٹا سوال کردیا'' جی ہاں میں نے دیکھا اور سوچا ابھی یہاں کھڑے ہوکر آپ کے لوگوں کو امریکی ویزوں کی پیشکش کروں اور ان سے کہوں اس کے بدلے میں آپ پاکستانی پرچم جلادیں تو آپ کے خیال میں کتنے لوگ میری اس پیشکش کا احترام نہیں کریں گے؟'' پاکستانی سیاستدان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا اور آج امریکہ نے ایک بار پھر ثابت کردیا کہ اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ ظاہر ہے ایسا ہی ہونا تھا اور اس کے ذمہ دار صرف حکومت، بکاؤ سیاستدان اور پاکستان کے ''نیک نام اورمؤقر ادارے'' ہی نہیں عوام بھی ہیں۔ جی ہاں! لہک لہک کر''اس پرچم کے سائے تلے ہم ایک ہیں ہم ایک ہیں'' اور''میں بھی پاکستان ہوں تو بھی پاکستان ہے'' جیسے ملی نغمے گانے والے عوام، پاکستان کے بکاؤ سیاستدانوں کو بار بار منتخب کرنے والے عوام۔ اپنے ملک کی عزت کو نیلام ہوتا ہوا دیکھ کر منہ پرے کرنے والے عوام، صرف اور صرف پاپی پیٹوں کے دوزخ بھرنے کے لیے زندہ رہنے کا جذبہ رکھنے والے عوام۔۔۔سو جناب عرض یہ ہے جیسی قوم ہوگی ویسے ہی اس کے حکمران بھی ہوں گے۔ ریمنڈ ڈیوس کی رہائی سقوط ڈھاکہ سے کم سانحہ نہیں مگر اٹھارہ کروڑ عوام میں سے کتنے ہیں جنہوں نے اس سانحے پر پُر زور انداز میں اپنا احتجاج ریکارڈ کروایا؟ کتنے ہیں جو سڑکوں پر آئے؟ چند لاکھ بھی نہیں ہوں گے اور اگر صورت حال جوں کی توں رہی

تو پاکستان اور پاکستانیوں کو مکمل طور پر امریکہ کے سپرد کرنے کے جذبے سے سرشار حکمران اپنے مشن میں کیوں کامیاب نہیں ہوں گے؟ چوروں اور چوکیداروں کا گٹھ جوڑ کیا رنگ لائے گا؟ پاکستان کی اٹھارہ کروڑ بھیڑ بکریوں کو کبھی اس کا احساس ہوگا یا نہیں؟ اور ہوگا تو کب ہوگا جب گلشن مکمل طور پر برباد ہوجائے گا؟۔۔۔اور میڈیا مجھے معاف کرے تو عرض کروں ریمنڈ ڈیوس کے حوالے سے اس نے بھی اپنی آنکھیں اس طرح کھلی نہیں رکھیں جیسے رکھنے کا حق تھا۔''بکاؤ سیاسی حکمران'' میڈیا کو اور قسم کے کاموں میں مصروف رکھنے کی سازش میں کامیاب ہوگئے۔میڈیا نے اپنی توجہ لوٹا سازی اور روایتی قسم کے سیاسی جھگڑوں پر مرکوز کرلی اور ملک دشمن قوتیں اپنے مشن میں کامیاب ہوگئیں۔سو اب تمام تر خوبیوں اور ذمہ داریوں کی ادائیگی کے باوجود میڈیا کے کردار پر بھی انگلی ضرور اٹھے گی اور میڈیا کو اس کا ازالہ کرنا پڑے گا ورنہ ریمنڈ ڈیوس کیس کے حوالے سے تاریخ میں میڈیا کو بھی کوئی زیادہ اچھے الفاظ سے یاد نہیں رکھا جائے گا۔ اس کیس نے پاکستان کے بکاؤ سیاسی حکمرانوں کے ساتھ کچھ مؤقر اداروں کی عزت اور آزادی کے بھرم بھی کھول کر رکھ دیے۔سو ہم تو کچھ کہنے کی ہمت نہیں رکھتے مگر عدالتی حکمرانوں کے کانوں میں حکمران جماعت کے ایک صوبائی وزیر کی آواز تو ضرور پڑی ہوگی کہ''ریمنڈ ڈیوس کو اس عدلیہ نے رہا کیا جس سے ہمیں بھی شکایات ہیں''۔اب اس حوالے سے عدلیہ کے کردار پر بھی انگلیاں اٹھیں گی۔ بہرحال مبارک ہو پاکستان کے''بہادر سپاہی حکمرانوں'' کو جنہوں نے ایک بار پھر اس تاثر کو مضبوط کردیا کہ ۲۰۰۸ء کے انتخابات کے نتیجے میں پاکستان میں حکومت نہیں امریکی غلاموں کی شفٹ تبدیل ہوئی تھی۔ریمنڈ ڈیوس کو لے جانے کے فوراً بعد امریکہ نے ڈرون حملوں کے ذریعے ۸۱ بے گناہ پاکستانیوں کو شہید کرکے پاکستان میں اپنے غلاموں کو جو سلامی پیش کی اس پر بھی وہ مبارک باد کے مستحق ہیں (بشکریہ نوائے وقت)۔

مقالۂ خصوصی　　　　　　　　　　　　　　ڈاکٹر محمد امین

پاکستانی معاشرے کا بحران اور اس کا حل

پاکستانی معاشرہ اس وقت جس سیاسی، معاشی، اخلاقی اور معاشرتی بحران کا شکار ہے اس کے اسباب ووجوہات پر غور ضروری ہے تا کہ اصلاح احوال کی کوئی صورت نکل سکے۔فرمایا ہادیٔ عالمﷺ نے کہ اللہ نے کوئی بیماری ایسی پیدا نہیں کی جس کا علاج نہ پیدا کیا ہو لہٰذا یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایت اور فراست کی روشنی میں جسد ملت کو لاحق سیاسی، معاشی، اخلاقی اور معاشرتی بیماریوں کے اسباب ومظاہر پر غور کریں تا کہ ان کا صحیح اور مؤثر علاج دریافت کیا جاسکے۔ اس موضوع پر اگر ہم منطقی انداز میں غور کریں تو گفتگو کی ترتیب یہ بنتی ہے:

۱۔ کیا پاکستانی معاشرہ سچ مچ بحران کا شکار ہے؟

۲۔ اگر ہے تو اس کے اسباب کیا ہیں؟

۳۔ اور اس بحران کا حل کیا ہے؟

جسد ملت کو لاحق بیماریوں کے علاج کے حوالے سے گفتگو کے آغاز ہی میں ہم اپنے غور کرنے کے اسلوب کا ذکر کرنا چاہیں گے کہ حقیقی، مؤثر اور دیرپا علاج کے لیے مرض کے حقیقی اسباب تک پہنچنا اور ان کا علاج کرنا ضروری ہوتا ہے نہ کہ محض فوری علامتوں اور تکالیف (symptoms) کا علاج کر دینا مثلاً اگر کسی آدمی کو سر درد ہو تو پیناڈال یا اسپرین اس کا کوئی علاج نہیں، یہ تو محض دفع الوقتی ہے اور اگر اصل سبب کو دور نہ کیا جائے تو چند گھنٹوں بعد درد دوبارہ شروع ہونے کا امکان غالب ہوتا ہے۔ اور جیسا کہ ہم میں سے اکثر جانتے ہیں کہ سر درد کے متعدد اسباب ہوسکتے ہیں مثلاً بخار، زکام، معدہ خراب ہونا، نیند پوری نہ ہونا، زیادہ رونا، قبض، دماغی مشقت، پریشانی، میگرین ۔۔۔وغیرہ تو جب تک اصل سبب دور نہ کیا جائے محض عارضی علامتیں ختم ہونے سے بیماری جڑ سے نہیں جاتی۔

اس اصول کا اطلاق اگر ہم پاکستانی معاشرے پر کریں تو بلاشبہ کرپشن، مہنگائی، بیروزگاری، نااہل حکمران، امریکہ کا سیاسی غلبہ، خودکش حملے، ٹارگٹ کلنگ، چوری، ڈاکے، کم شرح تعلیم، میڈیا کی عریانی وفحاشی۔۔۔غرض ایسے بہت سے مسائل، تکالیف اور بیماریاں ہیں جو پاکستانی معاشرے کو لاحق ہیں۔ اگر ہم سطحی انداز میں غور کریں تو مثلاً مہنگائی کا علاج یہ معلوم ہوتا ہے کہ چیزیں سستی کر دی جائیں لیکن

حکومت عملاً ایسا کر نہیں سکتی۔ پنجاب حکومت نے تھوڑے عرصے کے لیے روٹی سستی کی تھی لیکن اس پر قائم نہ رہ سکی کیونکہ مہنگائی کے اسباب گہرے ہیں اور ان کے پیچھے بظاہر نظر نہ آنے والے ایسے عوامل موجود ہیں جن کو دور نہیں کیا جا سکتا مثلاً بجلی مہنگی ہوگئی کیوں مہنگی ہوئی؟ اس لیے کہ آئی ایم ایف نے یہ مطالبہ کیا کہ اس پر سبسڈی (subsidy) ختم کر دی جائے؟ آئی ایم ایف نے یہ مطالبہ کیوں کیا؟ اس لیے کہ آپ اس سے قرض لینے گئے؟ آپ اس سے قرض لینے کیوں گئے؟ اس لیے کہ آپ کے پاس ملک چلانے کے لیے پیسے نہ تھے؟ پیسے کیوں نہیں تھے؟ وہ کرپٹ حکمران اور انتظامیہ کھا گئی؟ کیوں کھا گئی؟ حرص اور ہوس کی وجہ سے، حلال وحرام کی تمیز نہ کرنے کی وجہ سے، آخرت کا خوف نہ ہونے کی وجہ سے۔ یہ بھی سوچیے کہ آئی ایم ایف کے یہودی مالکان اور امریکہ نے آپ کو قرض کیوں دیا؟ تا کہ وہ آپ سے سود وصول کرے؟ آپ کو قرضوں میں جکڑے، آپ کی معاشی پالیسیاں کنٹرول کرے، آپ کے کرپٹ حکمرانوں کو اللوں تللوں کا موقع دے اور مسلمان عوام کو بھوکا مارے تا کہ مسلمان دبے رہیں، غربت میں پستے رہیں، مغربی آقاؤں کے آگے سر نہ اٹھا سکیں، ان کے غلام بنے رہیں اور مغربی فکر و تہذیب کے اصول و اقدار کو اپنانے سے انکار نہ کر سکیں۔۔۔مطلب یہ کہ فوری تکالیف اور ظاہری علامتوں سے جو مرض نظر آتا ہے وہ بالعموم اتنا سادہ نہیں ہوتا اور نہ اتنی سادگی سے اس کا علاج ممکن ہوتا ہے جب تک اس کی جڑ تک نہ پہنچا جائے اور اسے بنیاد سے ٹھیک نہ کیا جائے۔

ہمارے اس اسلوب فکر کے دو نتیجے نکل سکتے ہیں جو ہمارے قاری کو پہلے سے ذہن میں رکھنے چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ تحریر سادہ اور عام فہم ہونے کی بجائے کچھ دقیق ہو جائے اور دوسرے یہ محسوس ہو کہ بات موضوع سے ہٹ گئی ہے یا غیر متعلق ہوگئی ہے مثلاً اگر کسی آدمی کو سر درد ہو اور ڈاکٹر اس کے معدے کا علاج شروع کر دے تو ممکن ہے یہ بات مریض اور اس کے لواحقین کو غیر متعلق لگے اور اس کا فوری نتیجہ بھی برآمد نہ ہو لیکن اگر معائنے اور ٹیسٹوں کے بعد ڈاکٹر اس واضح نتیجے پر پہنچے کہ سر درد کی اصل وجہ معدے کی خرابی ہے تو مریض کے دیرپا علاج کے لیے ڈاکٹر کو معدے کا ہی علاج کرنا چاہیے۔ ایک اور بات یہ کہ موضوع اتنا اہم اور وسیع ہے کہ اس پر تفصیل سے لکھا جانا چاہیے لیکن ہمارے پیش نظر چونکہ البرہان کے لیے ایک مضمون لکھنا ہے نہ کہ پوری کتاب لکھنا اس لیے ہم اختصار کو ملحوظ خاطر رکھیں گے اور کوشش کریں گے کہ یہ اختصار فہم مطالب میں مخل نہ ہو۔

کیا پاکستانی معاشرہ بحران کا شکار ہے؟

ہماری رائے میں پاکستانی معاشرہ بحران کا شکار ہے۔ بحران ہم اس کو کہتے ہیں جب بگاڑ بڑھ جائے، مشکلات اور مسائل حل نہ ہوں، اصلاح کی ذمہ دار قوتیں غیر مؤثر اور ناکام ہو جائیں، معاشرہ اضطراب و ہیجان کا شکار ہو جائے اور معاشرے و ریاست کی ٹوٹ پھوٹ اور اچانک و غیر منظم تبدیلی کا امکان بڑھ جائے۔ بحران کی اس تعریف کے مطابق پاکستانی معاشرہ اس وقت سچ مچ بحران کا شکار ہے اور اس کی اصلاح کے لیے صحیح اور مؤثر اقدامات کی فوری ضرورت ہے اور خوش فہمی میں مبتلا ہو کر یا لاپروائی سے اس بحران کو اہمیت نہ دینا اور اس سے نمٹنے کی کوشش نہ کرنا نادانی ہوگی۔

بحران کے اسباب

اگرچہ اس بحران کے اسباب کئی ایک ہیں ــــ بلکہ ان کی ایک پوری فہرست گنوائی جا سکتی ہے ــ لیکن بنیادی، فکری اور اصولی اسباب، جن کی حیثیت ام الامراض کی سی ہے، دو ہیں:

۱۔ اپنے نظریۂ حیات سے عدم وابستگی اور اس کی تعلیمات اور تقاضوں پر عمل نہ کرنا

۲۔ مغربی فکر و تہذیب کی پیروی

یہ دونوں اصول اگرچہ قرآن و سنت سے مستنبط ہیں اور اس کے لیے تفصیلی حوالے دیے جا سکتے ہیں (تفصیل کے لیے دیکھیے ہماری دو کتابیں 'مسلم نشأۃ ثانیہ' اور 'اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش') لیکن یہ دونوں اصول معروضی، عالمی، منطقی اور عقلی بھی ہیں کیونکہ کوئی بھی قوم جو اپنے نظریۂ حیات سے وابستگی ترک کر دے اور ایسے افکار، اصول، اقدار پر عمل شروع کر دے جو اس کے نظریۂ حیات کی نقیض ہوں تو اس کی پستی اور زوال ناگزیر ہو جاتا ہے کیونکہ انسانوں میں وہ بنیادی خصائص جو دنیا میں ترقی اور سربلندی کے لیے ضروری ہیں (مثلاً محنت، تنظیم، پابندیٔ قانون، اطاعت امیر، ایثار وغیرہ)، پیدا ہی اس وقت ہوتے ہیں جب فرد کسی نظریۂ حیات سے مستحکم وابستگی اختیار کرے اور اگر کوئی فرد یا معاشرہ دو ایسی کشتیوں پر پیر رکھے ہوئے ہو جو ایک دوسرے کی مخالف سمت جا رہی ہوں تو اس کا ڈوب جانا ظاہر سی بات ہے۔ لہٰذا پاکستانی معاشرے کے بحران کا نقلی و عقلی سبب یہ ہے کہ یہاں معاشرہ عملاً نظریاتی طور پر یکسو نہیں رہا، اس کا دعویٰ اسلام ہی پر عمل کا ہے لیکن عملاً وہ مغرب کی ملحدانہ فکر و تہذیب سے مرعوب و متاثر ہو کر اس کی پیروی کر رہا ہے۔

سطور بالا میں ہمارے استدلال کا انحصار اس بات پر ہے کہ مغربی فکر و تہذیب اسلامی تعلیمات کی نقیض ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں مغربی فکر و تہذیب کے براہ راست مطالعے کی روایت کمزور ہے

ورنہ جن اصحاب نے بھی مغربی تہذیب کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ مغربی تہذیب جن فکری بنیادوں پر کھڑی ہے وہ اسلام کی عین ضد ہیں مثلاً ہیومنزم (Humanism) کا تصور یہ ہے کہ آدمی دنیا میں خود مختار بلکہ مختار مطلق ہے اور کسی ہستی کا عبد نہیں ہے۔ سیکولرزم یہ ہے کہ اگر کسی نے خدا و رسول کو ماننا ہے تو اپنی ذاتی زندگی میں مان لے لیکن خدا و رسول کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ہماری اجتماعی زندگی میں دخل دیں یعنی انسان خود یہ طے کرتا ہے کہ اللہ کا دائرہ کار کیا ہونا چاہیے اور کہاں اس کی بات مانی جائے اور کہاں نہ مانی جائے۔ کیپٹل ازم کا حاصل یہ ہے کہ دنیا کی زندگی اور خوشحالی ہی ہماری ساری جدوجہد اور سرگرمیوں کا مرکز ہونی چاہیے نہ کہ آخرت۔ اسی طرح ایمپیر یسزم (Empericism) کا مطلب یہ ہے کہ 'علم' اور 'حق' صرف وہ ہے جس کا مشاہدہ اور تجربہ کیا جا سکے گویا وحی کا انکار اور عدم اہمیت۔

خلاصہ یہ کہ مغربی فکر و تہذیب کا عقیدہ یا ورلڈ ویو یہ ہے کہ اللہ حاکم مطلق نہیں ہے اور انسان اس کا عبد نہیں ہے بلکہ انسان خود مختار اور مختار مطلق ہے کہ زندگی جیسے چاہے بسر کرے اور اصل اہمیت اس دنیا کی ہے لہٰذا دنیا کی زندگی میں مگن رہو، آخرت کو بھول جاؤ۔ قرآن و حدیث کچھ نہیں اصل چیز عقل اور سائنس ہے۔ گویا مغربی تہذیب کے ورلڈ ویو کا حاصل ہے خدا، رسول، آخرت اور قرآن کی نفی۔ اب بتائیے کہ یہ بے دینی ہے یا نہیں اور یہ نظریات اسلام کے نقیض ہیں یا نہیں؟

اس پر مستزاد اہل مغرب کی اسلام اور مسلم دشمنی ہے بلکہ وہاں قوت حاصل کرنے کا جذبۂ محرکہ ہی اسلام اور مسلم دشمنی تھی جب ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ پر فتح حاصل کر لی اور عیسائیت کا ہیڈ کوارٹر وہاں مغلوب ہو گیا تو عیسائی پادری وہاں سے نکل کر یورپ بھر میں پھیل گئے اور مسلمانوں کے خلاف نفرت اور انتقام کے جذبات ابھارنے لگے چنانچہ یورپ میں بیداری پیدا ہوئی، انہوں نے قوت حاصل کی، مسلم ممالک پر یلغار کی، انہیں روندا، کچلا، غلام بنایا اور ان کی صدیوں سے جمع کردہ دولت اور مادی وسائل کو لوٹا اور اپنے ہاں لے گئے۔ پھر مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے غلام رکھنے کی خاطر ان کا سیاسی، تعلیمی، معاشی، معاشرتی اور قانونی ڈھانچہ توڑ کر اسے اپنی فکر و تہذیب کے مطابق از سرنو استوار کیا اور مسلمانوں میں ایسے افراد اور طبقات پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے جو ان کی تہذیب کے رسیا تھے اور اسے ہی ترقی اور سر بلندی کا زینہ اور معراج سمجھتے تھے۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد جب یورپ کمزور ہوا اور مسلمانوں کی جدوجہد آزادی بھی جاری تھی تو انہیں مجبوراً مسلم ممالک کو

آزادی دینا پڑی۔ اب استعمار نے چولا بدل لیا۔ اس نے اپنے تیار کردہ مغرب پرست عناصر کو نو آزاد شدہ ممالک میں اقتدار دلوایا اور پُرامن ذرائع سے تعلیم، میڈیا، مالی امداد، فیملی پلاننگ اور جمہوریت وغیرہ کے نام پر مسلم ممالک میں نفوذ کر کے اپنے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی اور جب اس کے باوجود کچھ مسلم ممالک نے سر اٹھا کر جینے کی استعداد حاصل کر لی اور اسلام کی طرف رجوع کرنا شروع کر دیا تو امریکہ و یورپ نے اپنی مجموعی حربی و مادی قوت سے پہلے عراق کو تباہ و برباد کیا، پھر افغانستان کا تورا بورا بنایا اور اب پاکستان اور لیبیا پر حملے جاری ہیں۔

عملی سبب

مذکورہ بالا نظری اسباب کے ساتھ عملی پہلو سے دیکھا جائے تو پاکستانی معاشرے میں جس طرح بگاڑ اور فساد بڑھ رہا ہے وہ اس امر کا مظہر ہے کہ یہاں اصلاحی قوتیں کمزور اور غیر مؤثر ہو چکی ہیں اور ان کی حکمت عملی اور لائحہ عمل زیادہ کامیاب نہیں رہا اور بگاڑ و فساد پیدا کرنے والی ابلیسی قوتیں یہاں مقابلتاً طاقتور اور کامیاب ہیں۔ اصلاحی قوتوں کی ناکامی کے اسباب داخلی بھی ہیں اور خارجی بھی۔ داخلی اسباب میں اخلاص و فراست کی کمی، فرقہ واریت، انتشار و عدم اتحاد وغیرہ اور خارجی اسباب میں اسلام دشمن مغربی طاقتوں اور ان کے مقامی ایجنٹوں کی سازشیں شامل ہیں جو کسی قیمت پر اسلامی عناصر کو کامیاب نہیں ہونے دینا چاہتے۔

بحران کا حل

جب ہم نے بیماری کے اسباب و وجوہات کا پتہ چلا لیا تو اب اس کا علاج ممکن و سہل ہے اور علاج بھی پائیدار ہونا چاہیے تا کہ بیماری جڑ سے جائے لیکن بعض لوگ عارضی اور وقتی علاج کی طرف لپکتے ہیں جو درحقیقت علاج نہیں ہوتا محض عارضی طور پر مرض کی علامتیں کچھ کم ہوتی ہیں یا بدل جاتی ہیں مثلاً سیاسی حکومت کمزور ہو تو فوج اقتدار پر قبضہ کر لیتی ہے اور اسے 'فوجی انقلاب' کا نام دے دیا جاتا ہے حالانکہ اس سے محض چہرے بدلتے ہیں نظام نہیں بدلتا۔ اہل پاکستان کو اس طرح کے 'انقلابوں' کا اور ان کے نتائج کا خوب تجربہ ہے یہی وجہ ہے کہ اب وہ اس طرح کے کسی 'انقلاب' کے حق میں نہیں۔ ان دنوں عالم عرب میں فوجی آمروں کے خلاف عوام اٹھ کھڑے ہوئے ہیں لیکن حسبِ معمول وہاں امریکہ و مغرب کی مداخلت اور سازشیں عروج پر ہیں اور ان کی پوری کوشش ہے کہ کوئی حقیقی اور نظریاتی تبدیلی ان ممالک میں نہ آئے اور صرف چہرے بدل جائیں اور نئے آنے والے بھی

ان کی مرضی اور ڈھب کے آدمی ہوں۔

بہرحال بات ہورہی تھی جسد ملت کو لاحق بیماریوں کے پائیدار علاج کی۔ ہماری رائے میں پائیدار علاج ہے۔۔۔لا الہ الا اللہ۔۔۔مطلب یہ کہ ایک حقیقی خدا کا اثبات کیجیے اور سارے غیر حقیقی خداؤں کا انکار کر دیجیے۔ دوسرے لفظوں میں اسلام پر یکسو ہو جایئے اور اس کے تقاضوں کو پورا کیجیے اور غیر اسلام بالخصوص مغربی فکر وتہذیب کو ترک کر دیجیے۔

لیکن یہ تو ایک اصولی بات ہے، سوال یہ ہے کہ پاکستانی معاشرے کے بحران کے حل کے لیے عملاً کیا کیا جائے یا کیا کیا جا سکتا ہے؟☆ ہماری رائے میں مطلوبہ حکمت عملی دو نکات پر مبنی ہونی چاہیے:

ایک تو یہ کہ موجودہ اصلاحی قوتیں اپنی حکمت عملی پر نظر ثانی کریں اور اپنے کام کو مؤثر اور نتیجہ خیز بنانے کے لیے اقدامات کریں۔

دوسرے یہ کہ ایک نئی اصلاحی قوت کھڑی کی جائے جو موجودہ آزمائے ہوئے اصلاحی مناہج کی بجائے اصلاح وتعمیر کا ایک نیا منہج اپنائے اور کام کے نئے رستے نکالے تا کہ جن جہات میں کام نہیں ہورہا وہاں کام کیا جائے اور جس اسلوب سے نہیں ہورہا اس اسلوب سے کیا جائے۔ اس سے لامحالہ موجودہ اصلاحی قوتوں کو تقویت ملے گی اور شریعت پر عمل پیرا ہونے کی منزل قریب آئے گی۔

گویا اب ہمارے سامنے کام یہ ہے کہ پہلے موجودہ اصلاحی قوتوں کے کام کا تجزیہ کرتے ہوئے انہیں کچھ مشورے دیے جائیں تا کہ ان کا کام مؤثر اور نتیجہ خیز ہو سکے اور دوسرے اُس نئے منہج کی نشان دہی کی جائے جس پر عمل کر کے وہ اہم کام کیے جا سکتے ہیں جو موجودہ مناہج میں نہیں ہو پا رہے

موجودہ اصلاحی مناہج

اگرچہ اسلام میں دین و دنیا میں کوئی تفریق نہیں بلکہ شریعت نازل ہی لوگوں کے دینوی امور کی تنظیم کے لیے ہوئی ہے یا بالفاظ دیگر شریعت نام ہے ان تعلیمات، ضوابط اور قوانین کا جو انسان کی دینوی زندگی کو منظّم کرتے ہیں۔ تاہم تفہیم کی خاطر ہم دین کو چار بڑے شعبوں عقائد، عبادات، اخلاق

☆ جب ہم بات فرد اور معاشرے کے اسلامی مستقبل کے حوالے سے کر رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ حکومتی ڈھانچہ اور سول سوسائٹی کے وہ عناصر جو مختلف عوامل بالخصوص مغربی فکر وتہذیب کے زیر اثر فرد اور معاشرے کو اسلام سے دور لے جا رہے ہیں انہیں ہم یہاں زیر بحث ہی نہیں لائے کیونکہ اسلامی تناظر میں ان کا کوئی مثبت کردار نہیں (اسلامی عناصر اور عوام کے دباؤ پر کچھ اسلامی اقدامات کر لینا الگ بات ہے) بلکہ وہ تو الٹا بگاڑ و فساد کا سبب بن رہے ہیں، مسائل پیدا کر رہے ہیں اور انہیں بڑھا اور پیچیدہ بنا رہے ہیں۔

اور معاملات میں تقسیم کر سکتے ہیں اور اسی طرح دنیوی زندگی کو سیاست، معیشت، معاشرت، تعلیم، قانون وغیرہ میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور سارے دین کو مانتے ہوئے ایک شخص یا ایک جماعت دین و دنیا کے کسی ایک شعبے میں کام کر سکتی ہے جیسے سیاسی، تبلیغی، معاشی وغیرہ۔ ہم یہاں دو بڑے شعبوں کی عملی کاوشوں کا ذکر کریں گے: ایک سیاسی اور دوسرے تبلیغی۔

دینی سیاسی جماعتیں

دینی سیاسی جماعتیں اگر مندرجہ ذیل حقائق سامنے رکھیں تو انہیں اپنی جدوجہد کو مؤثر اور نتیجہ خیز بنانے اور اس غرض سے اپنے لائحہ ہائے عمل پر نظر ثانی کرنے میں آسانی رہے گی:

۱۔ ساری دنیا (امریکہ، یورپ، چین، روس، آسٹریلیا وغیرہ) ان کے خلاف متحد ہے اور نہیں چاہتی کہ پاکستان میں اسلامی عناصر اقتدار میں آئیں۔

۲۔ ان کا فرقہ واریت (یعنی فقہی و کلامی مسالک) کی بنیاد پر دینی جماعتیں بنانا (جب کہ یہ آئین پاکستان کی رو سے بھی غلط ہے اور عقل عام کے بھی خلاف ہے کیونکہ اس سے فرقہ واریت بڑھتی ہے اور امت تقسیم ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ ایک مسلک دوسرے مسلک کو ووٹ نہیں دے گا لہٰذا مسلک کی بنیاد پر بننے والی جماعت قیامت تک برسر اقتدار نہیں آسکتی) اور پھر ہر جماعت کا دھڑوں میں تقسیم ہونا کوئی اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ مغربی ممالک کی ایجنسیوں اور ان کی ایجنٹ مقامی حکومت اور اس کی ایجنسیوں کی باقاعدہ پلاننگ کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا اگر وہ اخلاص اور فراست رکھتی ہیں تو انہیں اس صورت حال کا ادراک کرنا چاہیے اور اسلامی اہداف کی خاطر متحد ہو جانا چاہیے۔

۳۔ انہیں اس پر غور کرنا چاہیے کہ مغربی جمہوریت کو بعض کاغذی نظری تبدیلیوں کے بعد مشرف بااسلام کرنے اور اس میں حصہ لے کر اس کی مزید اصلاح کرنے اور اس کے ذریعے معاشرے میں دین نافذ کرنے کا ان کا منصوبہ پچھلے ۶۳ سال کی جدوجہد کے باوجود کامیاب نہیں ہوا۔ الٹا اس کے نتیجے میں سیاست اور دیگر سارے شعبہ ہائے زندگی میں مغربیت اور سیکولرزم غالب آ گیا ہے۔

۴۔ اس وقت سب سے بڑا مسئلہ پاکستان کی قومی خود مختاری کا ہے کیونکہ ہم عملاً امریکہ کے غلام بن کر رہ گئے ہیں اور ہماری بدقسمتی اور دشمن کی کامیاب پلاننگ کہ ہماری سیاسی جماعتوں (بڑی سیاسی جماعتوں جیسے پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ ن اور چھوٹی سیاسی جماعتوں جیسے اے این پی اور متحدہ) کے علاوہ فوج، عدلیہ، میڈیا اور بیوروکریسی نے بھی اس امریکی بالادستی کو قبول کرلیا ہوا ہے۔ اس صورت

حال میں پاکستان میں جمہوریت اور نفاذ اسلام کا دعویٰ اور کوششیں بے معنی ہوکر رہ گئی ہیں۔ دینی جماعتوں میں جماعت اسلامی اور سیاسی جماعتوں میں عمران خان کی تحریک انصاف کے سوا کوئی امریکہ کے خلاف آواز اٹھانے تک تیار نہیں۔عمران خان کا سیکولر ہونا واضح ہے لہٰذا جماعت اسلامی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ امریکی غلامی سے نجات کے لیے قوم کو اکٹھا کرے اور تحریک چلائے۔اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ جماعت محض اپنی جماعتی اور تنظیمی قوت پر انحصار نہ کرے اور نہ لوگوں کے لیے جماعتی قیادت میں کام کرنے کی شرط رکھے بلکہ اسے آگے بڑھ کر ہر اس جماعت، ادارے، تنظیم، تحریک اور سول سوسائٹی کے ہر طبقے کو اس ایک نکتے پر جمع اور متحرک و منظم کرنا چاہیے اور انہیں تحریک کی قیادت میں شامل کرنا چاہیے۔

۵۔ دینی سیاسی جماعتوں کے قیام کی شرعی اساس امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور اصلاح ہے لہٰذا ان کا اہم ترین ہدف یہ ہونا چاہیے کہ عوام خود بھی احکام شریعت پر عمل کریں اور حکومت بھی شریعت کے احکام پر عمل کرائے اور اس کے لیے محض قانون سازی کافی نہیں بلکہ عوام کی تعلیم و تربیت کی بھی ضرورت ہے تاکہ وہ صدق دل سے ان قوانین پر عمل پر آمادہ ہو جائیں اور ایسے لوگوں کو ووٹ دے کر حکمران بنائیں جو نفاذ شریعت کے لیے پُر جوش ہوں۔

تبلیغی جماعتیں

ا۔ بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں دعوت وتبلیغ کا کام بھی مسلک پرستی پر مبنی ہے جیسے دیوبندی حضرات کی تبلیغی جماعت اور بریلوی بھائیوں کی دعوت اسلامی ۔۔۔وغیرہ۔ ہمارے علماء کرام مغربی اور پاکستانی خفیہ ایجنسیوں کی چالوں کو نہ سمجھتے ہوئے سیاسی اور تبلیغی جماعتیں، مدرسے، مسجدیں اور دینی تعلیم کے وفاق تو پہلے ہی مسلکی بنیادوں پر بنائے ہوئے تھے اور اب ہر دینی مسلک نے اپنا ٹی وی چینل کھول کر فرقہ واریت کو مزید ہوا دینے کا انتظام کر لیا ہے۔کاش یہ لوگ مسلک کو دین نہ بناتے۔ ان کے مسلک پر ظاہر ہے کسی کو اعتراض نہیں لیکن مسلک کو دعوت وتحزب کی بنیاد بنانا دین کی حقیقی سپرٹ کے خلاف ہے۔

۲۔ ان دینی جماعتوں کے سامنے سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ وہ اپنی تبلیغ و دعوت کو کلمے اور نماز روزے تک محدود نہ رکھیں بلکہ پورے دین کی دعوت دیں۔ بلاشبہ تعلق باللہ اور عبادات بہت اہم اور بنیادی اہمیت کی حامل ہیں لیکن ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ شریعت تو نام ہی دنیوی تنظیم وفلاح کا

ہے لہٰذا دین اور شریعت کا کوئی ایسا تصور کیسے صحیح ہوسکتا ہے جو ہماری دنیا کو نہ سنوارے اور اس پر اثر انداز نہ ہو۔ پس ان دینی وتبلیغی جماعتوں کو اصرار کے ساتھ پورے دین کی تبلیغ کرنی چاہیے تاکہ عامۃ الناس کی ہمہ گیر اصلاح ہو جو زندگی کے سارے شعبوں کو محیط ہو تاکہ ایک مسلمان کو دنیا اور آخرت دونوں میں فلاح وکامرانی نصیب ہو۔

اور اسی میں شامل سمجھنا چاہیے اس تعلیمی کام کو جو ہمارے معاشرے میں دینی مدارس سرانجام دے رہے ہیں۔ بدقسمتی سے یہ کام بھی ناقص ہے اور پورے دین کی نمائندگی نہیں کرتا بلکہ اس نے بھی دنیا کو دین کے دائرے سے باہر کی چیز سمجھ رکھا ہے حالانکہ قرآن وسنت اور فقہ کی کوئی ایسی تعبیر کیسے صحیح ہوسکتی ہے جو ہماری دنیا کو زیر بحث نہ لائے اور اس پر اثر انداز نہ ہو۔ اس کو انتظامی مسئلہ کہہ کر بھی جان نہیں چھڑائی جاسکتی کیونکہ مدارس کے باہر جو عصری تعلیم دی جارہی ہے وہ بھی اسلامی تعلیمات اور تقاضوں کے مطابق نہیں لیکن دینی مدارس اور علماء کرام اُس تعلیم کو اسلام کے مطابق بنانے کے لیے کوئی کوشش نہیں کررہے۔

پاکستان میں احکام شریعت پر عمل کے لیے نئے منہج کی ضرورت

جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں عرض کیا کہ پاکستان میں بعض دینی سیاسی جماعتیں نفاذ شریعت کے لیے سیاسی جدوجہد کررہی ہیں لیکن اس میں انہیں بوجوہ زیادہ کامیابی نہیں ہوسکی (اور ان وجوہ و اسباب کی طرف بھی ہم نے اشارہ کردیا ہے) اور دینی مدارس اور کچھ دعوتی وتبلیغی جماعتیں جو کام کر رہی ہیں وہ بھی آج کی اصطلاح میں 'مذہبی آدمی' تو پیدا کررہی ہیں (جو مثلاً داڑھی رکھتا، نماز پڑھتا اور شلوار قمیض پہنتا ہے) لیکن پورا دینی آدمی پیدا نہیں کررہیں جس کی دنیا بھی دین کے مطابق ہو۔ اس سیاسی ناکامی اور جزوی دعوتی کام سے ایک خلاء پیدا ہوا ہے جسے مغربی تہذیب نے پورا کیا ہے اور پاکستانی معاشرہ بڑی تیزی سے مغربی فکر وتہذیب کو اپنا رہا ہے جب کہ مذکورہ دینی عناصر اپنے منہج میں کوئی تبدیلی قبول کرتے نظر نہیں آتے۔ ان حالات میں ہم سوچتے ہیں کہ پاکستان میں ایک نئے منہج سے احکام شریعت پر عمل کرنے کی ضرورت ہے جو موجودہ دینی کاموں کے خلاء کو پُر کرسکے اور موجودہ اصلاحی کاموں کو کمک پہنچائے۔ ہم اسے سیاسی اور تبلیغی کی بجائے 'سماجی تبدیلی' کا منہج کہنا چاہیں گے۔ نئے منہج کی اساس دو نکات ہوں گے:

ا۔ 'متوازن' تعلیم وتربیت کے ذریعے 'متوازن فکر وعمل' کے حامل 'فرد' کی تیاری

۲۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں شریعت پر عمل کے خواہاں افراد کو منظّم و متحرک کر کے زندگی کے اہم شعبوں میں ادارے بنا کر احکام شریعت پر عمل درآمد اور معاشرے کے مسائل کا حل جن کی اجازت ریاست کا آئین دیتا ہے جیسے تعلیم، میڈیا، عدل وانصاف، امن وامان، اصلاح اخلاق وغیرہ۔

ان دو نکات کی تفصیل، جواز اور حکمت یہ ہے:

ا۔متوازن فرد کی تیاری کی اہمیت

دنیا میں آج تک جتنے بھی بڑے انقلاب آئے ہیں اور جتنی بھی تہذیبیں پروان چڑھی ہیں، اگر ان کا مطالعہ کیا جائے تو یہی بات سامنے آتی ہے کہ اجتماعی تبدیلی اور ترقی کی اساس فرد ہے۔ گویا اصل کام انسان سازی ہے۔ یہی بات قرآن حکیم میں بار بار اس اسلوب میں کہی گئی ہے کہ اللہ نے جتنے بھی پیغمبر بھیجے اس لیے بھیجے کہ وہ تعلیم کتاب وحکمت کے ذریعے افراد کے نفوس کا تزکیہ کریں تاکہ ایسے افراد تیار ہو جائیں جو برضا ورغبت اللہ و رسول کی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنے پر آمادہ ہوں۔ یہی افراد اسلامی معاشرے کی تشکیل کرتے ہیں۔ چنانچہ دیکھیے کہ نبی کریم ﷺ جو عظیم الشان انقلاب لائے وہ ان صحابہ کرام کے ہاتھوں ہی آیا جن کی آپ ﷺ نے تربیت کی تھی۔ آج بھی ہمارے معاشرے میں جو خرابیاں ہیں انہیں دور کرنے اور مسلم امت کی عظمت گم گشتہ بحال کرنے کا نسخہ یہی ہے کہ انسان سازی کا کام کیا جائے اور صحیح تعلیم وتربیت کے ذریعے ایسے افراد تیار کیے جائیں جو قرآن اور اسلام کا انسان مطلوب ہوں۔

انسان سازی یا انسانوں کی تعمیر سیرت و کردار میں بنیادی کردار تعلیمی ادارے ادا کرتے ہیں (اگرچہ اس میں گھر، والدین، دعوتی تحریکوں اور میڈیا کا کردار بھی اہم ہوتا ہے) لیکن پاکستان میں مغرب پرستانہ حکومتی پالیسیوں اور میڈیا نے تعلیم میں الٹا بگاڑ پیدا کیا ہے اور دینی سیاسی جماعتیں اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے اور تبلیغی تحریکیں اور دینی مدارس اپنے مخصوص منہج کی وجہ سے عام تعلیم کے ذریعے مسلم شخصیت کی متوازن تعمیر میں زیادہ فعال کردار ادا نہیں کر سکے اس لیے مجوزہ تحریک صحیح اور متوازن تعلیم وتربیت کے ذریعے فرد کی تعمیر سیرت و کردار پر بھرپور توجہ دے گی۔ اس غرض سے عصری و دینی تعلیم کے موجودہ مناہج میں دوررس تبدیلیاں لانا پڑیں گی جن کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

۲۔شریعت پر عمل اور مسائل کے حل کے لیے پرائیویٹ سیکٹر میں منظّم جدوجہد کی ضرورت

اس میں شک نہیں کہ شریعت کا نفاذ اور معاشرے کے مسائل حل کرنا حکومت کا کام ہے کہ اس

کے پاس اختیار و اقتدار ہوتا ہے اور افرادی و مادی وسائل ہوتے ہیں لیکن اکثر مسلمان ممالک میں حکومتیں چونکہ ایسے طبقات و افراد کے ہاتھوں میں ہیں جو مغرب تہذیب کے تربیت یافتہ ہیں، اس سے مرعوب و متاثر ہیں، اس کی پیروی ہی کو ترقی کا زینہ سمجھتے ہیں اور مغربی قوتوں کی مدد ہی سے اقتدار میں آتے ہیں اور اپنے اقتدار کو طول دینے اور مستحکم رکھنے کے لیے مغربی ممالک کی کاسی لیسی کرنے بلکہ ان کے ایجنٹ کا کردار ادا کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں اور ان کی پالیسیوں کو اپنے ملک میں نافذ کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں خواہ ان سے اپنے دین اور اپنے ملک کا نقصان ہی ہو اور عوام کو ان کی پالیسیوں سے دکھ اور تکلیف ہی پہنچ رہا ہو اور ان کی مشکلات و مسائل میں اضافہ ہی ہو رہا ہو اور قوم ترقی وعروج کی طرف بڑھنے کی بجائے زوال و ادبار کے گڑھوں میں ہی گر رہی ہو۔ اس طرح کے حکمران اپنے مغربی آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے ایسی پالیسیاں بنانے میں بھی دریغ نہیں کرتے جو غیر اسلامی ہوں، مسلم عوام کو دین سے دور لے جانے والی ہوں اور ملحدانہ مغربی اصول و اقدار کو معاشرے میں پروموٹ کرتی ہوں۔

بعض دینی سیاسی جماعتوں کا ایسے مغرب پرست سیاسی وعسکری حکمرانوں کی مخالفت کرنا، ان کی اصلاح کی کوشش کرنا اور دباؤ ڈال کر ان سے عوام کے مسائل حل کرانے کی کوشش کرنا بلاشبہ قابل تحسین ہے اور اس طرح کے حکمرانوں نے مغربی فکر پر مبنی جو سیاسی نظام ملک میں رائج کر رکھا ہے، اس میں حصہ لے کر برسر اقتدار آنے کی کوشش کرنا تاکہ وہ اسلامی تناظر میں عوام کے مسائل حل کر سکیں، احسن ہے لیکن مغربی طاقتیں اپنے ایجنٹ مسلم حکمرانوں سے مل کر ہمیشہ کوشش کرتی ہیں کہ ایسے دینی عناصر کو بہر قیمت ناکام بنا دیا جائے اور اسلام پسند عوام کی حقیقی رائے عامہ ریاستی سطح پر مؤثر نہ ہو سکے۔ ان حالات میں سیاسی دینی جماعتیں عوامی مشکلات و مسائل کے حل اور عوام کی دینی تعلیم و تربیت میں زیادہ کردار ادا نہیں کر سکتیں۔ جہاں تک غیر سیاسی دعوتی وتبلیغی تحریکوں کا تعلق ہے تو نفاذ شریعت کی عملی جدوجہد اور عوام کے مسائل کا حل ان کے اہداف میں شامل ہی نہیں ہے۔

اس وقت تک ہم نے جو عمومی گفتگو کی ہے اسے ہم پاکستان کے عملی تناظر میں دیکھیں تو صاف نظر آتا ہے کہ پاکستان میں بڑی سیاسی جماعتیں، فوج (جس کا کردار ملکی معاملات میں اہم ہے اور وہ بہت عرصہ برسر اقتدار بھی رہی ہے) بیوروکریسی اور میڈیا مغربی قوتوں کے دباؤ میں ہیں، سیکولر ہیں اور اسلامی تعلیمات و اقدار کے نفاذ کی حامی نہیں ہیں (مجبوری اور منافقت سے بطور ڈپلومیسی اسلام کا نام

لینا الگ بات ہے) اور نتیجتاً سمت غلط ہونے کی وجہ سے عوامی مشکلات و مسائل میں اضافے کا سبب بنی ہوئی ہیں۔ دینی سیاسی جماعتوں کو فرقوں میں بانٹ کر انہیں متحد اور کامیاب ہونے دینے کا اسٹیبلشمنٹ اور خفیہ ایجنسیوں [مقامی و مغربی دونوں] نے باقاعدہ انتظام کر رکھا ہے اور وہ سیاست میں اتنی گہری اور کھبی ہوئی ہیں کہ عوام کی دینی تعلیم و تربیت اور ان کے مسائل کے حل کے لیے وہ کوئی عملی اقدامات کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔تبلیغی تحریکوں کا وژن محدود ہے اور دین کے دینوی کردار اور ملحدانہ مغربی فکر و تہذیب کی اسلام اور مسلم دشمن پالیسیوں، پلاننگ اور سازشوں سے وہ لاتعلق نظر آتی ہیں۔

پس چہ باید کرد

ہماری رائے یہ ہے کہ دینی سیاسی جماعتوں اور تبلیغی تحریکوں سے باہر بھی علماء کرام، اسلامی سکالرز اور سول سوسائٹی کے مختلف طبقات میں دین پسند عناصر کا ایک خاصا بڑا حلقہ موجود ہے لیکن کوئی متبادل سمت اور لائحہ عمل نہ ہونے کی وجہ سے وہ بھی غیر منظّم، غیر فعال اور غیر مؤثر ہے۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ اس طبقہ کو منظّم و متحد کیا جائے اور وہ سیاست میں الجھے بغیر سماجی سطح پر اسلامی تعلیمات پر عمل اور عوام کی مشکلات کے حل کے لیے کام کرے۔

ہمارے نزدیک اس مجوزہ حلقے یا تحریک کے لیے زندگی کے مختلف شعبوں میں احکام شریعت پر عمل کے لیے منظّم کام کی وسیع گنجائش موجود ہے اور مغربی جمہوریت کے بنیادی اصول اگرچہ غیر اسلامی ہیں لیکن بطور سیاسی نظام اس میں یہ خوبی بہرحال موجود ہے کہ اس میں دم گھٹنے والا جبر اور آمریت نہیں ہوتی اور خصوصاً اگر کوئی مقتدر طبقات کا براہ راست سیاسی حریف بھی نہ ہو تو پھر اس کے لیے کام کی خاصی گنجائش نکل آتی ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ نئی مجوزہ تحریک اسی خلاء یا گنجائش سے فائدہ اٹھائے اور منظّم انداز میں کام کرے۔ اس کام میں اسے حکومت اور سیاسی و دینی جماعتوں سے الجھنے کی بھی ضرورت نہیں بلکہ جہاں تک ہو سکے ان کا تعاون حاصل کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس مجوزہ غیر سیاسی تحریک کا لائحہ عمل اور دائرہ کار کیا ہونا چاہیے، اس ضمن میں ہماری سوچ یہ ہے کہ مجوزہ تحریک تعلیم و تربیت، میڈیا، معیشت، انصاف، امن و امان، اصلاح اخلاق و خدمت خلق کے شعبوں میں گراں قدر خدمات سرانجام دے سکتی ہے۔ ان کاموں کی کچھ تفصیل یہ ہے۔ (جاری ہے)

تعلیم و تربیت　　ڈاکٹر محمد امین

ایک نئے رول ماڈل تعلیمی ادارے کی ضرورت

تحریک اصلاح تعلیم جن دو مقاصد کے لیے کام کر رہی ہے ان میں سے ایک موجودہ تعلیمی نظام کی اسلامی تناظر میں اصلاح اور دوسرے ایک نئے رول ماڈل تعلیمی ادارے (سکول تا یونیورسٹی) کا قیام ہے۔ پہلے مقصد کے لیے تحریک نے اصلاح نصاب، تربیت اساتذہ، تعلیمی اداروں کے ماحول کی بہتری اور طلبہ کی اسلامی تربیت کے حوالے سے لٹریچر بھی تیار کیا ہے اور مقدور بھر عملی جدوجہد بھی کر رہی ہے۔ تاہم افرادی اور مادی وسائل کی کمی کی وجہ سے یہ کام اتنے بڑے پیمانے پر نہیں ہو سکا کہ ملکی سطح پر اس کے اثرات سامنے آتے۔
دوسرے مقصد کے لیے بھی تحریک نے ہوم ورک کیا ہے، لٹریچر تیار کیا ہے اور تعلیمی ثنویت کے بُرے اثرات کم کرنے کے لیے لاہور میں ایک ادارہ (صفاء انسٹی ٹیوٹ) قائم کیا ہے جو دینی مدارس کے طلبہ و اساتذہ کے لیے معاصر علوم اور جدید تعلیمی اداروں کے فارغ التحصیل حضرات کے لیے دینی تعلیم کے مختلف پروگرام منعقد کرتا رہتا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ جو لوگ تحریک کی اس فکر سے متفق ہوں وہ نئے رول ماڈل تعلیمی اداروں کے قیام کے بارے میں سوچیں اور اس پر عمل کریں۔ ایک نئے رول ماڈل تعلیمی ادارے کے قیام کی ضرورت و اہمیت کیا ہے؟ اس کے خدوخال کیا ہوں؟ یہ پہلے ماڈلز سے کیسے مختلف ہوگا؟ ان سوالوں کے تفصیلی جوابات ہم نے موجودہ مضمون میں دینے کی کوشش کی ہے۔ اللہ کرے کچھ لوگ اس سوچ کے مطابق آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔　　امین

تعلیمی رول ماڈل سے ہماری مراد وہ نمائندہ تعلیمی ادارہ ہے جس کے اصول و مناہج کی پیروی دوسرے بہت سے تعلیمی ادارے کریں۔ جس طرح مسلمانوں کے تعلیمی ادارے غیر مسلم تعلیمی اداروں کے مقابلے میں بعض منفرد خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں، اسی طرح ایک مسلم ریاست یا معاشرے کے اندر بھی ایسے تعلیمی ادارے ہو سکتے ہیں جو مختلف وجوہ کی بناء پر ایک دوسرے سے مختلف ہوں اور متعدد اسباب کی بناء پر ایک تعلیمی رول ماڈل کی صورت اختیار کر گئے ہوں کہ اس کے بعد جتنے بھی تعلیمی ادارے وجود میں آئیں وہ انہی کے اصول و مناہج کی پیروی کریں۔

انگریزی عہد میں برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں نے جو تعلیمی ادارے قائم کیے، ان میں سے دو یعنی دیوبند اور علی گڑھ تعلیمی رول ماڈل کی حیثیت اختیار کر گئے اور آج جب کہ ان کے قیام کو ڈیڑھ صدی ہونے کو ہے اور تقسیم ہند کے بعد پاکستان کی صورت میں مسلمانوں کی آزاد علیحدہ مملکت کے

قیام جیسا عظیم تغیر برپا ہو چکا ہے، اس کے باوجود ان دونوں تعلیمی اداروں کی رول ماڈل ہونے کی حیثیت برقرار ہے، اس کے کچھ اسباب ہیں جو درج ذیل ہیں:

اولاً ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کو شکست دینے کے بعد انگریزوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے تمام تعلیمی، تہذیبی، معاشی، معاشرتی اور قانونی اداروں کو ختم کر دیا اور ان کی جگہ اپنی فکر و نظر کے مطابق نئے اداروں کے قیام کا ڈول ڈالا۔ مسلمانوں کو چونکہ وہ خصوصی طور پر دبانا اور کچلنا چاہتے تھے تاکہ ان کے دوبارہ اٹھ کھڑے ہونے اور ان کے مدمقابل آنے کا کوئی امکان نہ رہے، اس لیے انہوں نے تعلیمی میدان میں خاص طور پر مسلمانوں کو پسماندہ رکھنے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کی عمارتوں، جاگیروں اور تعلیمی اوقاف پر قبضہ کر لیا، ان تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل لوگوں کو سرکاری ملازمتیں دینے سے انکار کر دیا اور ملک کے نئے انتظامی ڈھانچے میں حصول ملازمت کے لیے انگریزی زبان اور جدید علوم جاننے کی شرط عائد کر دی۔

ثانیاً انگریزی استعمار کے ان اقدامات کے نتیجے میں مسلمانوں کا ردِعمل دو طرح کا تھا۔ دین کا درد رکھنے والے لوگوں نے سوچا کہ ریاست و شوکت تو گئی ہے، نئے تعلیمی نظام سے دین بھی چلا جائے گا لہٰذا کسی طرح دینی علوم کو زندہ رکھنے اور پڑھنے پڑھانے کا انتظام کیا جائے۔ دینی قیادت نے چونکہ انگریز کی مزاحمت سب سے زیادہ کی تھی اور جانی و مالی نقصان بھی اسی کا سب سے زیادہ ہوا تھا اس لیے فطری ردعمل کے طور پر ان کے اذہان و قلوب میں انگریز اور اس کے نظام تعلیم و تہذیب سے نفرت بھی اتنی ہی گہری تھی، چنانچہ انہوں نے ۱۸۶۷ء میں دیوبند میں ایک خالصتاً دینی مدرسے کے قیام کا انتظام کیا جس میں انہوں نے انگریزی تہذیب اور جدید علوم کا مکمل بائیکاٹ کیا۔

ملی درد رکھنے والے ایک دوسرے مسلم گروہ نے سوچا کہ اگر مسلمانوں نے انگریزی زبان نہ سیکھی اور جدید مغربی علوم سے استفادہ نہ کیا اور انگریز سے مزاحمت کی پالیسی جاری رکھی، تو وہ معاشی اور معاشرتی طور پر تباہ ہو جائیں گے۔ ان کے تجزیے کے مطابق برصغیر کے مسلمانوں کی معیشت کا زیادہ تر انحصار سرکاری ملازمتوں پر تھا کیونکہ تجارت پر تو ہندو بنیے کا غلبہ تھا۔ نیز ان کا یہ خیال بھی تھا کہ اگر مسلمانوں نے انگریزی زبان اور جدید علوم نہ سیکھے تو وہ مغربی تہذیب کی روز افزوں ترقی اور سائنس و ٹیکنالوجی میں اس کی پیش رفت کے مقابلے میں بالکل پسماندہ ہو کر رہ جائیں گے۔ اس نقطۂ نظر کے حامل گروہ نے، جس کے سرخیل سرسید احمد خان تھے، ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ کالج قائم کیا (جو ۱۹۲۰ء میں

یونیورسٹی کی صورت اختیار کر گیا)۔ سرسید خود دین کے اچھے عالم تھے اور اپنے کالج میں بھی اسلام کا اثر چاہتے تھے لیکن انہوں نے اپنی تعلیمی اسکیم پر کچھ اس طرح عمل درآمد کیا کہ کالج میں انگریز پرنسپل تعینات کیا، اساتذہ کی اکثریت بھی انگریز تھی اور طلبہ کی تربیت انہی کے ہاتھ میں تھی۔ نیز حاصل تعلیم انگریز سرکار کی نوکری سمجھنا اور دل و دماغ پر مغربی فکر وتہذیب کی برتری اور عظمت کا نقش بٹھایا جانا جیسے وہ امور تھے کہ جنہوں نے مذہب اور مذہبی تعلیم کی علی گڑھ میں دال نہ گلنے دی اور بالآخر لبرلزم، سیکولرزم اور مغرب پرستی اس کا مزاج بنا۔

ثالثاً یہ دونوں تعلیمی دھارے اس وقت مسلمانوں کی ضرورت تھے۔ علی گڑھ نے مسلمانوں کی دنیوی ضرورتوں کو پورا کرنا شروع کر دیا اور دیوبند نے مسلمانوں کی دینی ضرورتوں یعنی مسجدوں کو آباد کرنا، ان میں قرآن کی تعلیم اور معاشرتی و مذہبی رسوم و رواج کا بجالانا وغیرہ جیسے امور کو پورا کرنا شروع کر دیا۔ ان وجوہ کی بناء پر یہ دونوں تعلیمی ادارے مضبوط ہوگئے اور ان کی پیروی میں ہزاروں مدارس اور سینکڑوں سکول و کالج ملک بھر میں کھلتے چلے گئے۔ اس طرح یہ دو تعلیمی ادارے دو تعلیمی رول ماڈل بن گئے۔

رابعاً جن علاقوں میں پاکستان بنا وہ پہلے بھی مسلم اکثریت اور مسلم اثر و رسوخ کے علاقے تھے چنانچہ وہاں پہلے سے دیوبند کی طرز کے مدرسے موجود تھے اور انہیں قائم کرنے والے اور ان میں پڑھانے والے اساتذہ اکثر دیوبند ہی کے فیض یافتہ تھے۔ پھر جو نامور علماء کرام تقسیم ہند کے بعد پاکستان آئے انہوں نے یہاں آکر بڑے بڑے دینی مدرسے قائم کیے۔ ان علماء کی اکثریت چونکہ دیوبند کی تعلیم و تربیت یافتہ تھی اس لیے انہوں نے دیوبند والا نظام تعلیم ہی من وعن رائج کر دیا۔

جدید تعلیم کے میدان میں جو ادارے انگریزی حکومت نے مسلم اکثریتی علاقوں میں قائم کیے جیسے شمالی ہند میں پنجاب یونیورسٹی اور بنگال میں کلکتہ یونیورسٹی وغیرہ تو ظاہر ہے وہاں نظام تعلیم کلی طور پر انگریز کے ہاتھ میں تھا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ انہیں مسلمانوں کے دین و ایمان اور اصول و اقدار کے تحفظ کی فکر کیوں ہوتی؟ انہیں تو اپنا نظام حکومت چلانے کے لیے اچھے کارندے درکار تھے جو انہوں نے ان تعلیمی اداروں میں تیار کرنے شروع کیے۔ جدید تعلیم میں مسلمانوں نے جو مزید تجربے کیے وہ علی گڑھ ہی کی طرز کے تھے۔ ان میں اور انگریز کے قائم کردہ اداروں میں یہ فرق تھا کہ یہاں اسلامیات کا پیریڈ بھی ہوتا تھا اور تحریک پاکستان جیسی ملی تحریکوں سے وابستگی بھی ممنوع نہیں تھی۔ ورنہ

جہاں تک تعلیمی اہداف کا تعلق ہے تو ان کے سامنے بھی علی گڑھ کی طرح آکسفورڈ اور کیمبرج ہی ماڈل تھے اور مغرب کی تمدنی ترقی ہی ان کے لیے بھی منارۂ نور تھی۔

ان حالات میں دینی مدارس کی حد تک دیوبند اور جدید تعلیم میں علی گڑھ کا نظام ہی رول ماڈل بنا رہا اور جتنے بھی نئے مدارس اور سکول کالج کھلے وہ ان ہی دونوں ماڈلوں کی نقل تھے اور کسی نے یہ نہ سوچا کہ ایک آزاد اسلامی مملکت کے قیام کے بعد اب حالات کے تقاضے کچھ اور ہیں اور جنہوں نے کچھ سوچا بھی تو محض اشک شوئی اور درخ اندوزی (patch work) سے کام لینا کافی جانا یعنی نظام تعلیم میں چھوٹی موٹی اور سطحی تبدیلیاں کر دیں جس نے معاملات کو مزید بگاڑا اور فکری انتشار اور ذہنی خلفشار میں اضافہ کیا۔

یہ وہ چند بڑے اسباب تھے جنہوں نے دیوبند اور علی گڑھ کو ہمارا تعلیمی رول ماڈل بنادیا اور یہ سلسلہ قیام پاکستان کے بعد ابھی تک جاری ہے اور ظاہر ہے کہ اس وقت تک جاری ہے گا جب تک کہ قوم کو ان کے نقائص اور خامیوں کا بخوبی احساس نہیں ہوجاتا اور جب تک کوئی بہتر، موزوں اور متبادل تعلیمی ماڈل ان کے سامنے نہیں آجاتا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ ہم آپ کو بتائیں کہ ان دو تعلیمی ماڈلوں کی کوارنہ تقلید کی وجہ سے ہماری تہذیبی اور ملی زندگی میں کیا خرابیاں پیدا ہوچکی ہیں اور یہ کہ نیا تعلیمی ماڈل کن اصولوں پر قائم ہونا چاہیے، ہمیں آپ کو یہ بتانا ہے کہ ایک نئے تعلیمی ماڈل کے قیام پر اصرار کر کے ہم کوئی نرالی بات نہیں کر رہے بلکہ خود دیوبند اور علی گڑھ کے بانیوں اور ان کے بعد آنے والے دیگر ماہرین تعلیم اور اصحاب علم و فضل کو بھی ان اداروں کی خامیوں اور نقائص کا احساس رہا ہے۔ انہوں نے ان خرابیوں کو دور کرنے اور ان کے نقائص سے بچنے کی شعوری کوششیں کی ہیں اور اس غرض کے لیے نئے تعلیمی ادارے قائم کرنے کی بھی جدوجہد کی ہے۔

دیوبند کے قیام اور اس کی تعلیمی پالیسی وضع کرنے والوں میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سرفہرست ہیں۔ مولانا گنگوہی قدیم منطق و فلسفہ کے تفصیلی مطالعے کے سخت خلاف تھے اور کہا کرتے تھے کہ ان کے مقابلے میں تو انگریزی پڑھنا بہتر ہے کہ چلو اس سے دنیوی فائدہ تو ہوگا لیکن یہ منطق و فلسفہ پڑھنے کا کوئی دینی فائدہ ہے نہ دنیوی۔ اسی طرح انہیں یہ احساس بھی تھا کہ دیوبند سے فارغ ہونے والے علماء کو انگریزی اور جدید علوم سے بھی واقف ہونا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے دیوبند کے نصاب کو کچھ مختصر کیا اور اس کی مدت تدریس آٹھ سال سے کم کر کے چھ سال کر دی

تا کہ طلبہ اسی وقت میں جدید علوم سیکھ سکیں اور اس کے لیے انہیں اضافی مدت نہ صرف کرنی پڑے۔ لیکن وائے بدقسمتی کہ اس پروگرام پر عمل نہ ہوسکا اور چند سال کے بعد روایت پسندی کے غلبے نے دیوبند کے نصاب کو پہلی صورت میں بحال کر کے مدت تدریس دوبارہ آٹھ سال کردی اور شیخ الہند مولانا محمود حسن نے تو علی گڑھ والوں سے مل کر باقاعدہ معاہدہ کیا کہ دیوبند سے فارغ ہونے والے علی گڑھ جا کر جدید علوم حاصل کیا کریں گے اور اسی طرح علی گڑھ سے فارغ التحصیل دیوبند آیا کریں گے لیکن سوئے اتفاق کہ شیخ الہند کی بیماری، اچانک وفات اور سیاسی اضطرابات کی وجہ سے اس پروگرام پر بھی عمل درآمد کی نوبت نہ آسکی۔

پھر یہ بات بھی قابل ملاحظہ ہے کہ سرسید کی زندگی ہی میں اہل علم علی گڑھ کی اٹھان اور حاصلات تعلیم سے، خصوصاً دینی حوالے سے، بیزار ہوگئے تھے اور شبلی جیسے آدمی نے علی گڑھ سے علیحدگی اختیار کر کے اور دیگر اہل علم سے مل کر متبادل ادارہ ندوۃ العلماء کے نام سے قائم کیا جس میں پیش نظر یہ تھا کہ دیوبند والی روایت پسندی اور خامیاں اس میں نہ ہوں اور علی گڑھ کے کچھ مثبت اثرات بھی موجود ہوں۔ اس کا خیر مقدم خود سرسید نے بھی کیا۔ یہ ادارہ بنا اور آج تک کام کر رہا ہے اور ملی زندگی پر اس کے مثبت اثرات سے بھی انکار نہیں لیکن بہرحال یہ علی گڑھ اور دیوبند کو جمع کرنے والا تیسرا تعلیمی ماڈل نہ بن سکا اور دینی وعربی علوم ہی کا ایک منفرد ادارہ بن کر رہ گیا۔

پھر جب ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت زوروں پر تھی اور اس کے چلانے والوں میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی جیسے علی گڑھ کے فارغ التحصیل بھی تھے تو فطری طور پر انہوں نے کوشش کی کہ علی گڑھ کا وزن اس تحریک کے پلڑے میں پڑے لیکن انگریز اساتذہ کی نگرانی میں علی گڑھ کا ماحول مغرب پرستی اور ماڈرنزم کے رنگ میں رنگا ہوا تھا اور انگریزی حکومت میں ملازمت کا حصول ہی طلبہ کا منتہائے مقصود بن کر رہ گیا تھا۔ چنانچہ تحریک خلافت کے حق میں علی گڑھ کے اندر اور باہر تحریک چلی لیکن جب اہل دانش و سیاست علی گڑھ کو انگریزوں کے خلاف تحریک میں متحرک نہ کر سکے تو انہیں بڑی مایوسی ہوئی اور انہوں نے سوچا کہ ایسی قومی یونیورسٹی بنانے کا کیا فائدہ جو قومی اہداف اور ملی عزائم کی پشتیبانی نہ کر سکے۔ چنانچہ جنوری ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ کے یونیورسٹی ڈیکلیئر ہونے سے پہلے مولانا محمد علی، حکیم اجمل، ابوالکلام آزاد اور دوسرے قائدین نے جامعہ ملیہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور علی گڑھ ہی میں اس کا قیام عمل میں لایا گیا اور اس کا افتتاح دیوبند کے مہتمم شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے ہاتھوں

ہوا (گو بعد میں یہ دہلی منتقل ہوگئی اور آج تک وہیں ہے) اور علی گڑھ کے طلبہ اور اساتذہ کی ایک کھیپ اس نئی یونیورسٹی میں چلی گئی۔ لیکن یہ ایک الگ داستان ہے کہ جامعہ ملیہ بھی علی گڑھ کی خامیوں سے مبرا ہو کر اور دینی تعلیم کو شامل کر کے تیسرا تعلیمی ماڈل پیش نہ کر سکی اور آج بھی پبلک سیکٹر کی ایک عام ہندوستانی یونیورسٹی کی طرح کام کر رہی ہے۔

متبادل اداروں کے قیام کے علاوہ اصلاح نصاب کی کوششیں بھی ہوتی رہیں۔ چنانچہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے دیوبند کے نصاب میں اصلاح کی جو کوشش کی، اس کا ذکر ابھی ہوا، اس کے علاوہ علامہ شبلی نعمانیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ بلکہ خود حلقہ دیوبند کے اپنے لوگوں میں سے مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ، قاضی زین العابدین سجادؒ اور دوسرے بہت سے علماء کرام درسِ نظامی کے موجودہ نصاب پر تنقید کرتے اور اس میں اصلاح کی تجاویز دیتے رہے ہیں۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے تو شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے مشورے سے دہلی میں ۱۹۱۳ء میں ایک ادارے ''نظامت المعارف'' کی بنیاد رکھی تا کہ دیوبند اور علی گڑھ کے فکری امتزاج اور اصلاح کی کوشش کی جا سکے۔ لیکن سیاسی حالات کے دباؤ اور مولانا کی سیمابی طبیعت کی وجہ سے کوئی بڑا کام نہ ہوسکا۔ خود دارالعلوم دیوبند نے ۱۹۲۸ء میں اعلان کیا کہ فلسفہ کی جدید کتب داخل درس کی جائیں گی لیکن اس پر بھی عمل نہ ہوسکا۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے آخری زمانے میں پھر نصاب پر نظر ثانی کی تحریک شروع ہوئی اور دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے باضابطہ ایک کمیٹی اس مقصد کے لیے تشکیل دی جس نے نصاب میں کئی ترمیمات کی رائے دی اور قدیم علوم عقلیہ کو کم کر کے انگریزی اور علوم جدیدہ کو اس میں شامل کرنے کی سفارش کی، لیکن بعض وجوہ سے اس کمیٹی کی سفارشات پر بھی عمل نہ ہوسکا گو اس کی ضرورت برابر محسوس کی جاتی رہی۔

مذکورہ بالا چند واقعات سے یہ اندازہ بہرحال ہوجاتا ہے کہ برصغیر کے اہلِ دانش اور اہل تعلیم کو اس امر کا بخوبی احساس تھا کہ جن اصولوں پر دیوبند اور علی گڑھ کام کر رہے ہیں وہ یک طرفہ اور انتہا پسندی پر مبنی ہیں اور ان میں اصلاح کی ضرورت ہے لیکن اسے بدقسمتی کہیے یا حالات کی ستم ظریفی کہ جب برصغیر کی ملت اسلامیہ غلام تھی تو اپنے ملی وقومی آدرشوں کے حصول کے لیے متحرک اور منظّم تھی لیکن جب ۱۹۴۷ء میں مملکت خداداد وجود میں آگئی تو اس نے سمجھ لیا کہ ہمارا کام گویا ختم ہوگیا اور اب یہ نوزائیدہ اسلامی مملکت کا کام ہے کہ وہ تعلیم کی اصلاح اور پشتیبانی کا کام کرے۔ چنانچہ ملی سطح پر جو

حرکت اور دلچسپی تعلیم وتربیت کے میدان میں تھی وہ ختم ہو کر رہ گئی۔ دوسری طرف پاکستانی حکومتوں نے جو رویہ اختیار کیا وہ مایوس کن تھا۔ تعلیمی نظام کو اسلامی ضروریات اور عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالنے میں کسی پاکستانی حکومت نے کبھی خاطر خواہ دلچسپی نہیں لی، چنانچہ دیوبند اور علی گڑھ کی ثنویت آج بھی پہلے کی طرح زور وشور سے جاری ہے۔ دینی مدارس آج بھی دیوبند والی روایت پسندی پر عامل ہیں اور جدید تعلیم کے سکول و کالج اور یونیورسٹیاں آج بھی علی گڑھ والی مغرب پرستی اور دین سے عدم اعتناء والی پالیسی پر گامزن ہیں کیونکہ ان کے نزدیک آج بھی مغربی فکر وتہذیب ہی ترقی کا سرچشمہ اور اعلیٰ ترین تہذیب وتمدن کا مظہر ہے۔ ان حالات میں ان سے توقع کی بھی نہیں جا سکتی کہ وہ تعلیم کی اسلامی تشکیل نو کا کام کریں گے۔

بہرحال یہ تو ماضی کا ایک جائزہ تھا۔ ہمیں جو کہنا ہے وہ یہ ہے کہ جو کام ہم کل نہیں کر سکے وہ آج کرنے کا عزم کیوں نہ کریں؟ اور خیر کے تعمیری کاموں میں تاخیر کو ہماری قوت عمل کو مہمیز کرنے کا سبب بننا چاہیے نہ کہ مایوسی و دل گرفتگی کا، کہ ہاتھ چھوڑ کر بیٹھے رہیں، خصوصاً یہ دیکھتے ہوئے کہ تعلیم کی موجودہ صورت ہمارے لیے عظیم ملی نقصانات کا سبب بن رہی ہے۔ ان نقصانات کی کچھ تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ عمومی تعلیم یا جدید تعلیم جو قوم کا ہر بچہ حاصل کرتا ہے اس میں دینی تعلیم کا ضروری مواد شامل نہیں ہے یعنی وہ مواد اپنی کیفیت و کمیت یعنی مقدار اور کوالٹی میں ایسا نہیں ہے جو ہماری دینی ضروریات بطریق احسن پوری کرے۔ اس کے علاوہ جو چیز ناگزیر تھی وہ یہ کہ باقی سارے جدید علوم ومضامین کو اسلامی تناظر میں مرتب کر کے پڑھایا جاتا، اس لیے کہ ان علوم کا فکری منبع مغرب کی لادین فکر وتہذیب ہے لیکن اس کی طرف کسی حکومت نے آج تک توجہ ہی نہیں دی۔ پھر اس پر مستزاد یہ کہ طلبہ کی اسلامی نقطۂ نظر سے تربیت کا کوئی تصور جدید تعلیم میں موجود ہی نہیں۔ خلاصہ یہ کہ ہماری جدید تعلیم نہ تو ہمارے بچوں کو اچھا مسلمان بناتی ہے اور نہ انہیں ضروری دینی علم دیتی ہے۔

۲۔ دینی مدارس کا نظام وہی پرانا درس نظامی ہے جس میں زیادہ زور علوم آلیہ پر ہے۔ دینی علوم وہاں پڑھائے جاتے ہیں تو پرانے اسلوب اور لوازمہ کے ساتھ اور عصری علوم کا تو وہاں گزر ہی نہیں۔ اولاً تو دینی مدارس کو اس منہج پر لوٹ جانا چاہیے جو اسلاف کے زمانے میں یا خود ہندوستان میں انگریز کے آنے سے پہلے تھا یعنی وہ ریاست اور معاشرے کے لیے کارکن تیار کرتے تھے یا کم از کم پہلے مرحلے

میں دینی مدارس کے ہر طالب علم کو جدید علوم کا تعارفی مطالعہ ضرور کرانا چاہیے تا کہ اسے یہ تو پتہ چلے کہ جس دنیا میں وہ رہ رہا ہے وہ کیا سوچتی ہے اور کیونکر سوچتی ہے؟ پھر مرحلۂ تخصص میں کچھ لوگ ایسے بھی ہونے چاہئیں جو مختلف جدید علوم میں مہارت رکھتے ہوں تا کہ وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں دینی رہنمائی کی تفصیلات ماہرانہ انداز میں سامنے لاسکیں۔ اس وقت کیفیت یہ ہے کہ دینی مدارس سے فارغ ہونے والے طالب علم کو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ عصر حاضر کیا ہے اور اس کے تقاضے اور چیلنج کیا ہیں اور ان سے کیسے عہدہ برآ ہوا جاسکتا ہے؟ نتیجہ یہ ہے کہ وہ معاشرے پر، خصوصاً اس کے پڑھے لکھے طبقے پر جو معاشرے کی ریڑھ کی ہڈی ہے، اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ وہ جس ذہنی فضا میں رہ کر مسجد کے منبر پر بیٹھ کر گفتگو کرتا ہے، اس کے سامعین کی ذہنی فضا اس سے مختلف ہوتی ہے جس کے نتیجے میں ان کے درمیان بامعنی اور سنجیدہ ڈائیلاگ ہوتا ہی نہیں۔ ہمارے علماء اور عوام، خصوصاً پڑھے لکھے اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے درمیان جو ذہنی، فکری، معاشرتی اور معاشی بُعد ہے اور جو دن بدن بڑھ رہا ہے، اس نے دین کو ایک قابل عمل اور زندہ حقیقت نہیں رہنے دیا بلکہ وہ ایک یوٹوپیا بن کر رہ گیا ہے۔

۳۔ مندرجہ بالا ثنویت کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام میں دین اور دنیا کی تفریق اور ان کے الگ الگ ہونے کے مرض کو بہت تقویت حاصل ہوئی ہے، علماء اور عوام کے درمیان فاصلہ بڑھا ہے اور اسلام کے قابل عمل ہونے اور معاشرے کی عملی رہنمائی کرنے کے عمل کو بالواسطہ طور پر بہت زک پہنچی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دین پر عمل کرنے والے ہر آدمی کو مولوی اور عجوبہ سمجھا جاتا ہے جو ایک عام دنیا دار مسلمان سے الگ مخلوق ہوتی ہے اور عام معاشرے میں نا قابل قبول (misfit) ہوتی ہے۔ اس صورت حال سے زندگی کے مرکزی اور مجموعی دھارے (mainstream life) کے اسلام سے قریب آنے کی بجائے نیکی کے جزیرے وجود میں آنے شروع ہو گئے ہیں اور یہ جزیرے بھی دن بدن سکڑ رہے ہیں۔

۴۔ اس کا ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ ایک موحد، معتدل اور یکسو شخصیت (Anintegrated and balanced personality) وجود میں نہیں آسکی۔ دین و دنیا کی عدم آہنگی اور تفریق نے فکری انتشار اور ژولیدگی کو پروان چڑھایا ہے اور انتہا پسندی کو ترقی دی ہے۔ ایک عام آدمی جب مذہب کی گرفت میں آتا ہے تو وہ اپنی پہلے کی زندگی کو یکلخت ترک کر کے ایک دوسری انتہا پر پہنچ جاتا ہے یا ایک دیندار آدمی اپنی دینداری کے سارے مظاہر کے باوجود اندر سے ایک سخت دنیا دار آدمی بن جاتا ہے جس کے اندر دین کی حقیقی روح اور رمق باقی نہیں رہتی۔ اس

دورخے پن اور منافقت کے اژدھے نے ہمارے ملی وجود کو جکڑ کر بے دست و پا بنادیا ہے۔ جس کا انجام بالآخر موت ہے۔

۵۔ آج مغرب کی فکر اور تہذیب ایک غالب اور برتر تہذیب ہے۔ اس کا غلبہ سیاسی، معاشی اور عسکری ہی نہیں فکری بھی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اس کا شعوری طور پر ادراک نہ کرنا اور اس کے توڑ کی فکر نہ کرنا خودکشی کے مترادف ہے۔ آج ہمارے تعلیمی نصابات بلکہ تعلیم و تربیت کا سارا ڈھانچہ مغربی افکار کے سائے تلے پروان چڑھ رہا ہے۔ اس کے دفعیے کے لیے نہ صرف مضبوط دفاعی اقدامات کی ضرورت ہے بلکہ اس کے لیے مثبت ہجومی پیش رفت کی ضرورت بھی ہے لیکن اوپر ذکر کردہ تعلیمی ثنویت نے ہمارے نظام تعلیم کو مغربی تہذیب کے لیے لقمہ تر بنا کر رکھ دیا ہے۔

۶۔ تزکیہ و تربیت ہر نظام تعلیم کی جان ہوتے ہیں بلکہ تزکیہ تو دین کا مرکزی نقطہ اور جوہر ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر اسی لیے بھیجتا ہے کہ وہ لوگوں کے نفوس کا تزکیہ کریں تا کہ وہ ہدایت پا کر اللہ کے احکام کی اطاعت کرتے ہوئے زندگی گزاریں اور دنیا و آخرت دونوں میں سرخرو ٹھہریں اور قرآن حکیم میں ہے کہ اللہ نے اپنا آخری پیغمبر بھی لوگوں کے تزکیے ہی کے لیے مبعوث فرمایا تھا۔ مسلمان اہل علم و صلاح نے صدر اسلام میں جب لوگوں کے اندر ایمانی و اخلاقی کمزوریوں کو جڑ پکڑتے دیکھا تو تزکیہ و تربیت کے لیے اجتماعی کوششیں شروع کردیں جو بالآخر تصوف کے نام سے ایک وسیع ادارے اور تحریک کی شکل اختیار کر گئیں۔ اگرچہ اس میں جلد ہی بہت سی غیر اسلامی رسوم و رواج اور افکار دخیل ہو گئے لیکن اس کے باوجود صدیوں تک مسلم تاریخ میں اگر مدارس نے تعلیم مہیا کی تو خانقاہوں نے تزکیہ و تربیت کا سامان مہیا کیا۔ آج نیا زمانہ ہے نہ وہ قدیم مدارس رہے نہ خانقاہیں لیکن کیا ہمیں تزکیہ و تربیت کی ضرورت بھی نہیں رہی؟

آج کی جدید تعلیم میں اسلامی تزکیہ و تربیت کا تصور راہ ہی نہیں پا سکا۔ کیا اس کی موجودگی کی ضرورت اہل فکر و نظر محسوس نہیں کرتے؟ کیا اس وقت ہمارے ہاں جو فکری انارکی، اخلاقی انحطاط اور سیرت و کردار کا بحران پایا جاتا ہے اس کی یہی بڑی وجہ نہیں کہ جو بچے ہمارے سکولوں کالجوں میں آتے ہیں ہم انہیں پڑھنا لکھنا تو سکھا دیتے ہیں لیکن ان کی اخلاقی تربیت نہیں کرتے، انہیں اچھا انسان اور اچھا مسلمان بنانے کی تگ و دو نہیں کرتے؟ کیا ہمارے تربیت اساتذہ کے اداروں میں اساتذہ کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ طلبہ کو اچھا مسلمان کیسے بنایا جائے؟ کیا ہمارے علماء و صلحاء کو اس کی فکر

ہے کہ نئی نسل کے بگڑے اخلاق کیسے سنوریں گے، کہاں سنوریں گے اور انہیں کون سنوارے گا؟

تو مختصر الفاظ میں یہ وہ چیدہ چیدہ خامیاں ہیں جو ہمارے موجودہ تعلیمی رول ماڈلز کی پیروی میں ہمارے تعلیمی اداروں میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ ان سے ایک بات پوری طرح واضح ہو کر ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ ہمارے زوال اور نکبت کا بڑا سبب ہمارا یہ ناکارہ نظام تعلیم ہی ہے۔ یہی ساری خرابیوں کی جڑ ہے اور اس نظام تعلیم کی خرابیوں کا بڑا سبب اس کی ثنویت اور دوئی ہے یعنی علی گڑھ اور دیوبند کو تعلیمی رول ماڈل سمجھنا اور آنکھیں بند کر کے ان کی پیروی کیے چلے جانا۔ لہٰذا وقت کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ان دونوں تعلیمی ماڈلوں سے جان چھڑائی جائے اور ایک نیا تعلیمی ماڈل کھڑا کیا جائے جس میں ان دونوں کی خوبیاں تو ہوں لیکن ان کی خامیاں اور نقائص نہ ہوں۔ جو ہماری دینی ضروریات بھی پوری کرے اور عصر حاضر کے چیلنج سے نمٹنے اور ہمارے آج کے مسائل حل کرنے کا بھی اہل ہو۔ وہ ایسی متوازن اور یکسو شخصیت پروان چڑھائے جو اعلیٰ اخلاق و کردار کی حامل ہو، دینی تعلیمات سے واقف اور ان پر عامل ہو اور ساتھ ہی جدید سماجی اور سائنسی علوم سے بھی خوب واقف ہو اور جو بیک وقت دنیا اور آخرت میں کامیابی اور سربلندی کے لیے جدوجہد کر سکے۔

نئے تعلیمی ماڈل کے خدوخال کیسے ہونے چاہئیں؟ اگرچہ مذکورہ بالا بحث میں ان کی کافی حد تک نشاندہی ہو چکی ہے تاہم پھر بھی مزید وضاحت کی خاطر ہم اس کے بارے میں مختصراً کچھ عرض کیے دیتے ہیں:

نئے تعلیمی ماڈل کے خدوخال

۱۔ اس کی نظریاتی سمت متعین ہوگی کہ اس کا مقصد طلبہ کو اچھے، عملی اور کامیاب مسلمان بنانا ہے تاکہ وہ دنیا کی زندگی الٰہی تعلیمات کے مطابق گزار سکیں اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کر سکیں، جو ہر مسلمان کا مقصد حیات ہے اور جس کے نتیجے میں دنیا میں بھی خوشی، عزت اور سربلندی حاصل ہوتی ہے۔

۲۔ اس میں تعلیمی ثنویت نہ ہوگی اور نہ جدید و قدیم کا جھگڑا ہوگا۔ عام تعلیم اس طرح دی جائے گی کہ دنیوی علوم کے ساتھ دینی تعلیمات کا بھی اس میں معتدبہ حصہ ہوگا۔ اسی طرح جو طلبہ دینی علوم میں خصوصی مہارت (تخصص) حاصل کرنا چاہیں گے، وہ جدید دنیوی علوم کا تعارفی و تقابلی مطالعہ بھی لازماً کریں گے۔

۳۔ تزکیہ و تربیت اس تعلیمی ادارے کے نظام تعلیم کا لازمی حصہ ہوں گے۔ اس تربیت کے دو حصے ہوں گے ایک عمومی تربیت جس میں بنیادی انسانی صلاحیتوں کو جلا دی جائے گی جیسے صفائی، وقت کی

پابندی ، نظم و ضبط کی عادت، تقریری وتحریری صلاحیتوں میں اضافہ، کھیلوں میں حصہ لینا وغیرہ، دوسرے خصوصی تربیت جس میں طلبہ کو اللہ تعالیٰ کی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھایا جائے گا۔ ان دونوں طرح کی تربیت کے لیے ایک بھرپور تربیتی پروگرام بنایا جائے گا۔ تربیتی نظم ہوگا۔ ہفتہ وار، ماہانہ اور سالانہ منصوبہ بندی ہوگی۔ ہر طالب علم کی الگ فائل ہوگی۔ اس غرض کے لیے نصاب میں تبدیلی ہوگی۔ اساتذہ کی خصوصی تربیت کی جائے گی۔ تربیت کا باقاعدہ امتحان ہوگا، جس میں پاس ہونا لازمی ہوگا۔ تربیتی سرگرمیوں کا وزن اور اہمیت تعلیمی سرگرمیوں سے کسی طرح کم نہ ہوگی۔

۴۔ نیا نصاب بنایا جائے گا اور نئی کتابیں لکھی جائیں گی۔ نئے نصاب کے راہنما اصول یہ ہوں گے:

i) اس میں جدید دنیاوی اور دینی علوم موزوں امتزاج کے ساتھ موجود ہوں گے۔

ii) جدید علوم اسلامی تناظر میں مدون کیے جائیں گے۔

iii) مغربی علوم کا تنقیدی اور تقابلی مطالعہ کیا جائے گا۔

iv) ہر مسلمان طالب علم کو اتنا دینی علم ضرور دیا جائے گا جتنا ایک عام مسلمان کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

v) تربیت کا موضوع اور مواد بھی نصاب کا حصہ ہوگا۔

vi) اس میں بچوں کی عمر اور پاکستانی معاشرت کا لحاظ رکھا جائے گا۔

vii) اس میں اصرار انسان سازی اور سماجی علوم پر ہوگا تاہم سائنس اور ٹیکنالوجی کو بھی پس پشت نہیں ڈالا جائے گا۔

۵۔ اساتذہ کی تربیت کا خصوصی انتظام ہوگا تا کہ ان کو بتایا جاسکے کہ نہ صرف بچوں کو عمدہ تعلیم احسن انداز میں دینی ہے بلکہ یہ بھی کہ ان کی تربیت کر کے ان کو اچھا انسان اور اچھا مسلمان کیسے بنانا ہے؟

۶۔ تعلیم گاہ کا ماحول بچوں کی تربیت میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ اس تعلیم گاہ کا ماحول ایسا بنایا جائے گا جو تزکیہ وتربیت میں مددگار ہو۔ اس کے لیے ہم نصابی و غیر نصابی سرگرمیوں کا وسیع نیٹ ورک قائم کیا جاے گا جس سے نہ صرف طلبہ کی بنیادی انسانی صلاحیتوں کو جلا بخشی جائے گی بلکہ عملی اقدامات کے ذریعے انہیں اطاعت الٰہی کا خوگر بھی بنایا جائے گا (تعلیمی اداروں میں طلبہ کی اسلامی تربیت کیسے کی جائے؟ اس پر ہماری ایک پوری کتاب موجود ہے)۔

۷۔ طلبہ کو فکری حریت کا درس دیا جائے گا، سوال پوچھنے کی حوصلہ افزائی کی جائے گی اور ان کے جذبۂ تجسس کو ابھارا جائے گا۔ بڑی عمر کے طلباء کو تحقیق کا خوگر بنایا جائے گا اور تحقیق میں بھی تخلیقیت کو

اہمیت دی جائے گی۔

۸۔ بہترین کارکردگی (Excellence) ہر سطح پر اس تعلیمی ادارے کا ماٹو ہوگا۔ طلبہ اور اساتذہ کے اندر مسابقت کا ماحول پیدا کیا جائے گا۔ صرف ذہین، محنتی اور لائق طلبہ کو داخلہ دیا جائے گا۔ اسی طرح صرف ذہین، محنتی اور لائق اساتذہ کو تعلیم و تربیت کی ذمہ داری سونپی جائے گی جو اس کام کو مشن کے طور پر سرانجام دیں گے۔

۹۔ اس ادارے کا مطمح نظر نفع اندوزی اور پیسے کمانا نہیں ہوگا۔ وہ طلبہ ہی کو نہیں اساتذہ کو بھی اعلیٰ اخلاقی اور دینی نصب العین دینے کی جدوجہد کرے گا۔

۱۰۔ یہ ادارہ اصلاح تعلیم کے جن اصولوں پر قائم ہوگا انہیں معاشرے میں برپا کرنے کے لیے بھرپور جدوجہد کرے گا تاکہ وہ محض تعلیمی ادارہ نہ رہے بلکہ نظام تعلیم و تربیت کی اسلامی تشکیل نو کرتے ہوئے تجدید تعلیم و تربیت کی تحریک بن جائے اور اصلاح فرد اور اصلاح ملت میں اہم کردار ادا کر سکے۔

نئے رول ماڈل کا قیام

یہ وہ چند اصول ہیں جن پر نئے تعلیمی ماڈل کی بنیاد رکھی جانی چاہیے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ جو لوگ نظام تعلیم و تربیت کی اہمیت سے واقف ہیں کہ یہ اصلاحِ فرد اور اصلاحِ اجتماعی میں کتنا بڑا کردار ادا کر سکتی ہے، جو مروجہ تعلیمی نظام کی خرابیوں سے آگاہ ہیں اور ان سے بچنے کے لیے اس کی اسلامی تشکیل نو چاہتے ہیں، انہیں چاہیے کہ وہ اٹھ کھڑے ہوں اور اس نئے تعلیمی ماڈل کو قائم کرنے کی جدوجہد میں لگ جائیں۔ اس نئے ماڈل کے لیے ایک اقامتی یونیورسٹی بنی چاہیے اور ایک ماڈل سکول اور ایک ماڈل مدرسہ (یا اسلامک سنٹر) اس کا حصہ ہونا چاہیے۔ اگر کل ہم دیوبند اور علی گڑھ جیسے تعلیمی ماڈل قائم کر سکتے تھے تو آج ایک تیسرا تعلیمی ماڈل کیوں کھڑا نہیں کر سکتے؟ اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم یکسو ہو کر اس کام میں لگ جائیں اور اللہ سے نصرت طلب کرتے رہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم کامیاب نہ ہوں کہ اس کا وعدہ ہے کہ جو اس کی راہ کا جویا ہو وہ اسے سیدھی راہ ضرور دکھاتا ہے اور جو اس کی طرف بڑھے وہ اس کا ہاتھ ضرور پکڑتا ہے اور جس کی نصرت پر وہ کمربستہ ہو جائے دنیا کی کوئی طاقت اس کی کامیابی کا راستہ نہیں روک سکتی۔

تعلیم و تربیت *عطاء محمد جنجوعہ*

اسلامی تعلیم کا خاکہ

ہر حاکم قوم اپنے تمدن کی اشاعت اور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے لیے سب شعبوں سے بڑھ کر تعلیم پر توجہ دیتی ہے۔ سامراجی طاقتوں نے نو آبادیاتی دور میں مسلمانوں کو مستقل غلام بنانے کے لیے مخصوص تعلیمی پالیسی تشکیل دی جس سے مسلمان ان کے ذہنی غلام بن کر رہ گئے اور ان سے اسلامی روح چھین لی گئی اور تعلیم کا مقصد برائے اصلاح ختم ہو کر حصولِ معاش روزگار تک محدود ہو گیا ہے۔ لارڈ میکالے نے ۱۸۳۴ء میں اپنے نظامِ تعلیم کے بارے میں پیشین گوئی کی تھی کہ اس کے فضلاء ''رنگ اور نسل کے اعتبار سے دیسی ہوں گے لیکن خیالات اور تمدن میں انگریز ہوں گے''۔ اسلامی ممالک کو سامراجی قوتوں سے جغرافیائی آزادی حاصل کیے ہوئے طویل عرصہ گزر چکا ہے مگر ان کا نظامِ تعلیم آج بھی سیکولر ذہن کی عکاسی کرتا ہے۔ اسلامی اداروں اور حکومت کا فرض ہے کہ نظامِ تعلیم کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے ضروری اقدامات کرے تاکہ مسلمان علم و تحقیق میں کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر سکیں۔ آج کے مسلمان معاشرے میں تعلیم کیسی ہونی چاہیے اس بارے میں ہماری تجاویز درج ذیل ہیں:

۱۔ اسلام سے عدم دلچسپی، ترقیاتی منصوبوں کی ناکامی، سیاسی شعور کی کمی اور اہلِ مغرب کی اندھی تقلید کا سبب تعلیم کی کمی ہے۔ اسلامی ممالک میں خواندگی کا تناسب دوسروں کی نسبت کم ہے جب کہ قوم کی بقاء کا انحصار تعلیم و تربیت پر ہے۔ نئی نسل کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا والدین اور حکومت کا فریضہ ہے۔ تعلیم عام کرنے کے لیے بنیادی تعلیم لازمی کر دی جائے تاکہ نوخیز پودا پروان چڑھ کر ملّی، قومی اور عالمی مسائل سے آگاہ ہو سکے اور اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر قومی ترقی میں اہم کردار ادا کر سکے۔

۲۔ ناظرہ قرآن کی تعلیم لازمی ہو۔ ابتدائی تعلیم کے آخر میں عملی امتحان میں پاس ہونا ضروری قرار دیا جائے۔

۳۔ اسلامیات میں ارکانِ اسلام اور اخلاق و آداب شامل ہو۔ نماز، ادعیہ مسنونہ اور قرآن مجید کی چند

سورتیں اور ترجمہ شامل نصاب ہوں اور عربی گرامر کا ابتدائی تعارف ہو۔

۴۔ ناظرہ قرآن اور اسلامیات کی تدریس کے لیے ہر ابتدائی سکول میں فاضل عربی یا وفاق المدارس کے فارغ التحصیل عالم کی آسامی ہو اور حافظِ قرآن کو ترجیح دی جائے جس کی تنخواہ عام مدرس سے کم نہ ہو۔

۵۔ پرائمری سطح تک تعلیم مفت دی جائے۔ نصابی کتب ارزاں نرخوں پر دستیاب ہوں۔

۶۔ خواندگی کی شرح میں اضافہ کے لیے محلّہ کی مساجد میں تعلیم بالغاں کے مراکز قائم کیے جائیں جن میں ابتدائی تعلیم کا نصاب مکمل کرایا جائے۔

۷۔ نصابی یا تدریسی زبان قومی ہو (ملّی زبان عربی ہو)۔

۸۔ غیر ملکی، مشنری اور پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں قومی نصاب رائج کیا جائے۔

۹۔ غیر مسلموں کو مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لیے سکول قائم کرنے کی اجازت ہو جن میں مسلمان طلباء کا داخلہ ممنوع ہو۔

۱۰۔ ملک کے تمام تعلیمی اداروں کا نصاب یکساں ہو۔

۱۱۔ بی اے کے معیار تک عربی کی تدریس لازمی کر دی جائے۔ عربی کا نصاب سہل ہو جو قرآن وحدیث پر مشتمل ہو لیکن گرامر کی مشق شامل ہو۔

۱۲۔ انگریزی زبان بین الاقوامی زبان ہے۔ موجودہ دور میں اس کی افادیت سے انکار ممکن نہیں لہٰذا اس کی حوصلہ افزائی کی جائے لیکن یہ اختیاری ہو تاکہ دوسرے علوم میں اعلیٰ مہارت حاصل کرنے میں آڑے نہ آئے۔

۱۳۔ دفتری امور قومی زبان میں منتقل کیے جائیں۔ جن محکموں کے معاملات انگریزی زبان میں ناگزیر ہوں مثلاً امورِ خارجہ، سائنس وٹیکنالوجی وغیرہ ان محکموں میں بھرتی کے لیے محکمانہ اہلیت کے علاوہ انگریزی میں کامیابی لازمی قرار دی جائے۔

۱۴۔ عورتوں کے اسلامی گروپ میں تاریخ صحابیات، تہذیب نسواں، اصولِ صحت اور انسانی تعمیر میں عورتوں کا کردار جیسے مضامین کا اضافہ ہو۔

۱۵۔ مخلوط نظامِ تعلیم ختم کیا جائے اور خواتین کے لیے علیحدہ یونیورسٹیاں اور فنی ادارے قائم کیے

جائیں۔ان اداروں سے متعلق محکمانہ تربیت اور محکمانہ امور سرانجام دینے کے لیے عملہ خواتین پر مشتمل ہو۔

۱۶۔ آرٹس گروپ کے مضامین سیاسیات، معاشیات، عمرانیات اور نفسیات ہوں۔ فلسفہ میں اسلامی وغیراسلامی نظریات کا تقابلی جائزہ پیش کر کے ملحدانہ نظریات کی تردید کی جائے اور اسلام کے ہمہ گیر آفاقی اصولوں کو اجاگر کیا جائے مثلاً سود کے مضمرات اور زکوٰۃ کے ثمرات۔

۱۷۔ فنی وسائنسی علوم کو قومی زبان میں ڈھالا جائے۔ تجربات کے لیے وافر مقدار میں ضروری سامان مہیا کیا جائے۔اس شعبہ میں ذہین طلباء کو خصوصی الاؤنس دیا جائے۔

۱۸۔ ابتدائی سطح سے اعلیٰ سطح تک زیرِتعلیم طلباء پر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر پابندی ہو۔ نیز کسی قسم کے سیاسی مظاہروں میں شامل ہونے والے طلباء اور مظاہرہ کرنے والی تنظیموں کو سختی سے روکا جائے۔

۱۹۔ دورانِ تعلیم بچوں کی تعلیم وتزکیہ کا خصوصی انتظام کیا جائے۔انہیں صوم وصلوٰۃ کا پابند بنایا جائے۔درس گاہ سے فارغ ہوتے وقت طلبہ کے چال چلن کے سرٹیفکیٹ میں یہ تصدیق لازمی ہو کہ وہ پابند صلوٰۃ ہے۔

۲۰۔ غیر مسلم علاقوں میں مسلم طلباء کو فنی وسائنسی تحقیق کے سوا قطعاً نہ بھیجا جائے۔ وہاں ان کی رہائش کا خصوصی انتظام کیا جائے تا کہ اسلامی تشخص کو برقرار رکھ سکیں اور دوسروں کے لیے علم وعمل کا عمدہ نمونہ ہوں۔ دوسرے اسلامی ممالک سے آئے ہوئے مسلمان طلباء سے رابطہ قائم کریں،شرعی وعقلی علوم پر تبادلہ خیال کریں اور عالمِ اسلام کو درپیش مسائل کے حل کے لیے حتی المقدور کوشش کریں۔

۲۱۔ تعلیمی درس گاہوں میں اساتذہ کا معیارِ زندگی بہتر بنانے کی کوشش کی جائے تا کہ علم وعمل کے پیکر اور ذہین طلبہ شعبۂ تعلیم کی طرف رجوع کریں۔ حاضر سروس اساتذہ کو فنی تربیت کے علاوہ تعلیم وتزکیہ کا کورس کرایا جائے جس میں بحیثیت معلم ان کو اخلاقی ذمہ داریوں کا احساس دلایا جائے۔ نااہل اور بےعمل اساتذہ کو برطرف کر کے انہیں دوسرے محکموں کے سپرد کیا جائے۔

۲۲۔ مسلمانوں کے ابتدائی دور کی درس گاہوں میں بچوں کو تیراندازی، تیغ زنی اور گھڑسواری کی مشق کرائی جاتی تھی۔موجودہ دور میں طلباء کے لیے فوجی تربیت لازمی کردی جائے۔

۲۳۔ تعلیمی اداروں میں دارالمطالعہ کو مؤثر اور جاندار بنایا جائے۔ ہر جماعت کے ٹائم ٹیبل میں دارالمطالعہ

کے لیے ہفتہ وار چند پیریڈ مخصوص ہوں۔طلباء کے زیر مطالعہ کتب کو رجسٹر میں درج کیا جائے۔

۲۴۔ میٹرک سے بی اے تک تعلیمی اداروں میں سائنس و آرٹس گروپ کی طرز پر اسلامی گروپ قائم کیا جائے۔ اسلام مکمل اور جامع ضابطۂ حیات ہے۔ زندگی کے تمام شعبوں میں ہماری راہنمائی کرتا ہے۔ اسلامی گروپ کے مضامین تفسیر القرآن، معارف الحدیث، علم الفقہ ، تاریخ اسلام، اتحاد اسلامی، اسلامی دنیا، سیرت طیبہؐ، سیرتِ صحابہؓ، اللہ تعالیٰ کا نظامِ عدل، اسلامی معیشت، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، احکام السلطانیہ وغیرہ ہوں، طلباء ان میں سے انتخاب کریں۔

۲۵۔ سائنس گروپ میں 'یورپ پر اسلام کے احسانات' میڈیکل گروپ میں 'طبِ نبوی اور جدید سائنس' اور کامرس گروپ میں 'اسلام اور جدید معیشت و تجارت' کے موضوع پر کتب کو شامل نصاب کیا جائے۔

۲۶۔ علمی وفنی ڈگری کے حصول کے لیے سخت نگرانی کے تحت سال میں دو دفعہ امتحان لیے جائیں لیکن طلباء کے لیے ایک ڈگری کے بعد دوسری ڈگری (میٹرک کے بعد ایف اے) کا امتحان دینے کے لیے کسی قسم کے وقفہ (عموماً دو سال) کی شرط ختم کی جائے۔ اس کو اپنانے سے طلباء سیاسی و مذہبی سرگرمیوں میں وقت ضائع نہیں کریں گے بلکہ اپنی صلاحیتوں کو تعلیمی میدان میں ایک دوسرے سے سبقت حاصل کرنے میں صرف کریں گے۔ ہمارے اسلاف کی زندہ و تابندہ روایات موجود ہیں کہ انہوں نے اٹھارہ سال کی عمر میں مختلف قسم کے علوم وفنون حاصل کیے پھر تدریسی دور میں تصنیف و تالیف کے ذریعے علمی دنیا میں اپنا نام روشن کیا (بشکریہ الاعتصام ۱۴۱۷ھ)۔

تزکیۂ نفس علامہ احمد جاوید

حسنِ معاشرت

علامہ احمد جاوید صاحب کے ہاں ہر جمعہ کو بعد نماز مغرب عامۃ الناس کے لیے ایک تربیتی نشست ہوتی ہے جس میں آج کل وہ کسی موضوع پر ریاض الصالحین سے منتخب احادیث کا مطالعہ کرکے اس پر کچھ گفتگو کرتے ہیں۔ البرہان نے ان مجالس کی روداد افادۂ عام کے لیے طبع کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ اس طرح کی ایک نشست کی جزوی گفتگو حاضر خدمت ہے۔ امین

حضرت ہشام بن حکیم بن حزامؓ بیان کرتے ہیں کہ ان کا شام میں کچھ عجمی کاشت کاروں پر سے گزر ہوا جنہیں دھوپ میں کھڑا کیا گیا تھا اور ان کے سروں پر زیتون کا تیل بہایا گیا تھا۔ انہوں نے پوچھا: یہ کیا ماجرا ہے؟ انہیں بتایا گیا کہ انہیں خراج کی عدم ادائی کی وجہ سے سزا دی جا رہی ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ انہیں جزیے کی وجہ سے قید کیا گیا ہے۔ حضرت ہشامؓ نے فرمایا: میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو عذاب دے گا جو دنیا میں لوگوں کو عذاب دیتے ہیں۔'' پھر حضرت ہشامؓ وہاں کے گورنر کے پاس گئے اور اسے یہ حدیث سنائی تو گورنر نے ان لوگوں کو چھوڑ دیا۔ (صحیح مسلم ، کتاب البر والصلة والادب، باب الوعید الشدید لمن عذب الناس بغیر حق، حدیث:۲۶۱۳)

رسول کریم ﷺ نے جن بہت سی چیزوں کی تاکید فرمائی ہے ان میں سے دو بہت اہم ہیں۔ ایک کا تعلق اللہ سے ہے اور دوسری کا مخلوق سے۔ یعنی اللہ کے ساتھ بھی اچھے رہو (اُس کی شان اور اپنی حیثیت کے مطابق) اور مخلوق کے ساتھ بھی۔

اس حدیث میں آپ ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ دنیا میں جو آدمی کسی کو عذاب دے گا اللہ تعالیٰ قیامت والے دن اسے بھی عذاب میں مبتلا کرے گا، یہ اس معاشرت کی کنجی ہے جو رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان قائم کرنے کے لیے تشریف لائے تھے۔ اس کو ہم جتنا پھیلاتے چلے جائیں ہماری معاشرت کی خرابیاں دور ہوتی چلی جائیں گی۔ جو مخلوق کو تکلیف پہنچائے اس کا ناقص الایمان ہونا یقینی ہے۔ اور اس شخص کی آخرت کی بربادی میں کوئی شبہ نہیں جس نے اپنے رویے، اپنے عمل یا اپنے خیالات کے ذریعے مخلوق کو اذیت، تکلیف، پریشانی یا گمراہی میں ڈالا۔

جس بات کا آپ ﷺ اپنے خدام کی معاشرت میں اہتمام فرماتے تھے اور جس پر عام سے عام آدمی بھی کامیابی کے ساتھ پورا اتر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر آدمی کو کوشش کرنی چاہیے کہ دوسروں کو اس سے راحت ملے خواہ اس عمل سے خود اسے کچھ تکلیفوں ہی کا سامنا کرنا پڑے۔ یہ ان لوگوں کی علامت ہے جو کسی بھی معاشرے کا جوہر ہوتے ہیں۔ معاشرے میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک وہ جو معاشرے کے آئیڈیلز یعنی خیر کی اعلیٰ صورتوں کو عمل میں لاتے ہیں اور دوسرے وہ جو خیر کی موجودہ صورتوں کی خلاف ورزی نہیں کرتے یعنی چاہے وہ خیر کی عمارت تعمیر نہ کر سکیں لیکن خیر کی عمارت جب تعمیر ہو رہی ہو تو اس میں رکاوٹ بھی نہیں بنتے اور اگر اس میں کوئی حصہ ڈال سکیں تو جا کر اپنی جماعت اور اپنے نام کے نعرے نہیں لگاتے۔

آئیڈیل آدمی وہ ہے جس کی زندگی اس مزاج پر گزرے کہ میری سوسائٹی کو اور مجھ سے تعلق رکھنے والوں کو میری ذات سے آرام اور فائدہ پہنچے چاہے مجھے نقصان ہی ہو جائے۔ معاشرت کی جہت سے متبع سنت یہی آدمی ہے۔

لیکن اس آدمی کو بھی آپ ﷺ نے مسلم معاشرے کے لیے قابل قبول قرار دیا ہے جو زندگی اس اصول پر گزارے کہ اگر کسی کو مجھ سے فائدہ نہیں پہنچتا تو کوئی تکلیف بھی نہ پہنچے۔ یہ معاشرت کی بنیاد ہے۔ کیونکہ معاشرت کی بنیادیں آئیڈیلسٹک نہیں ہوتیں۔ معاشرے کو کچھ انجینئرز کی ضرورت ہوتی ہے جو خواص ہوتے ہیں اور کچھ کارکنوں کی ضرورت ہوتی ہے جو اس معاشرے کی اکثریت ہوتی ہے۔ ایک اچھے معاشرے کا کارکن بن کر رہنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس عہد پر خود کو قائم کریں اور اس کی خلاف ورزی اپنی ذات سے نہ ہونے دیں۔ یہ وہ بنیادی باتیں ہیں جو آپ ﷺ کی سنت معاشرت کو اجتماعی سطح پر پورا کرنے کے لیے درکار ہیں۔

معاشرت کا ایک اور اصول جو اچھے معاشرے کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے وہ ہے انصاف۔ کوئی اچھا معاشرہ اپنے جاری رہنے کا امکان پیدا نہیں کر سکتا جب تک اس میں انصاف نہ ہو۔ لہٰذا ہر معاملے میں حق کے ساتھ کھڑے ہونا چاہیے چاہے اس کی زد کسی پر بھی پڑے۔ یہ انصاف کا خلاصہ ہے کہ حق پر قائم رہو اور حق کے گواہ بنو چاہے اس کا فائدہ تمہارے دشمنوں کو ہو اور نقصان تمہارے دوستوں کو۔

انصاف سے بڑھ کر انسانوں کے درمیان ایسی چیز مشکل سے ملے گی جو انہیں اپنے نفس پر قابو

رکھنے میں اتنی مدد دے جتنی حِس انصاف سے ملتی ہے۔ ایک آدمی اگر منصف مزاج ہو تو وہ نوافل میں برسوں لگا دینے والے شخص کے مقابلے میں اپنے نفس پر زیادہ قدرت رکھتا ہے۔ انصاف کا ایک subjective فائدہ یہ ہے کہ انصاف کرنے کی عادت، رویہ، مزاج اور عزم انسان کو اپنے نفس پر قدرت دیتا ہے بلکہ اپنے نفس کے خلاف حق کے میلان کو غالب رکھتا ہے۔

انصاف وہ سیمنٹ ہے جو معاشرے کی اینٹوں کو جوڑ کر سٹرکچر بناتا ہے۔ انصاف کی حیثیت اس گارے کی سی ہے جو افراد کی شکل میں پھیلی ہوئی اینٹوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر ایک اچھے معاشرے کا ڈھانچہ تعمیر کرتا ہے۔ انصاف ہر حال میں حق کے ساتھ کھڑے رہنے کا نام ہے چاہے مسلمان کو نقصان ہو اور یہودی کو فائدہ۔

تیسری بات یہ کہ حق پر قائم رہنے کے لیے جن ناہموار راستوں پر چلنا پڑتا ہے اور جن ناگوار باتوں سے واسطہ پڑتا ہے ان میں اگر کسی معاشرے کے افراد ایک دوسرے کی مدد کریں تو سمجھیے وہ معاشرہ ابدیت کا فرمان لکھا لایا ہے۔ وہ معاشرہ ابدی بننے کی خدا کی ضمانت لے کر آیا ہے جس کے افراد ایک دوسرے کو حق پر ثابت قدم رہنے کے لیے فعال اور بے نفس کمک فراہم کرتے ہوں۔ یعنی تم اپنے بھائی کو کہہ سکو کہ اگر تمھیں بھوک کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے تو پرواہ نہ کرو میں نے بھی حق پر رہنے سے پانچ سال بھوک جھیلی ہے۔ تمھیں ابھی کاروبار میں سود سے بچنا ناگوار لگ رہا ہے تو اس کو جھیل جاؤ اور اس میں اگر کوئی نقصان ہوتا ہے تو ہم ان شاء اللہ تمہارا رزق کفاف کے لیے ساتھ دیں گے یعنی اتنی روزی کے لیے جو زندگی کے لیے ضروری ہو۔ اس کے ہم ضامن ہیں تم فکر نہ کرو اور اپنے ارادۂ خیر پر قائم رہو۔ فرد کو ارادۂ خیر اور عزم حق پر قائم رہنے کے لیے جس طرح کی زبانی، جانی اور مالی کمک کی ضرورت ہوتی ہے اگر کسی معاشرے کے غالب افراد ایک دوسرے کے ایسے مددگار ہوں کہ زبان سے واعظ بھی ہوں، مال سے منفق بھی ہوں اور جان سے مجاہد بھی ہوں تو یہ معاشرہ پھر ایک ایسی دیوار بن جاتا ہے جس کی پانچ دس اینٹیں اگر کچی بھی ہوں تو وہ اس دیوار کے انہدام کا سبب نہیں بنتیں اور یوں معاشرے کا مجموعی سیٹ اپ تبدیل نہیں ہوتا۔

خلاصہ یہ کہ آپ ﷺ کی سنت کا جوہر ہے حسن معاشرت یعنی افراد معاشرہ کی خیر خواہی اور انہیں نفع پہنچانے کی خواہش و کوشش اور انہیں مشقت میں ڈالنے اور ان کے ساتھ ناانصافی کرنے سے بچنا۔ اگر ہم سمجھیں تو یہی دین کی سپرٹ ہے بلکہ یہی پورا دین ہے۔

تزکیۂ نفس　　　علامہ احمد جاوید

نفاق (منافقت)

حکم ربّانی

۔ ''**یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لاَ تَفْعَلُوْنَ O کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰہِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لاَ تَفْعَلُوْنَ**'' (الصّف ۶۱: ۲، ۳)

مومنو! تم ایسی باتیں کیوں کہا کرتے ہو جو کیا نہیں کرتے ۔ خدا اس بات سے سخت بیزار ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔

۔''**اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَ لَنْ تَجِدَلَھُمْ نَصِیْرًا**'' (النساء۴:۱۴۵)

کچھ شک نہیں کہ منافق لوگ دوزخ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے۔

فرمانِ نبوی

۔ ''**آیة المنافق ثلاث اذا حدّث کذب، اذا أوتمن خان و اذا وعد اخلف**''(صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب علامات المنافق)

منافق کی تین نشانیاں ہیں، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو اسے پورا نہ کرے اور امانت میں خیانت کرے۔

۔ ''**قال رجل لحذیفةؓ: یا ابا عبدالله! ما النفاق؟ فقال: ان تتکلم بالاسلام ولا تعمل به**'' (مسند الامام الربیع)

ایک آدمی نے حضرت حذیفہؓ سے پوچھا کہ نفاق کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: یہ کہ تم زبان سے تو اسلامی تعلیمات کا اقرار کرو لیکن ان کے مطابق عمل نہ کرو۔

س: نفاق کسے کہتے ہیں؟

ج: نفاق کی اصولی تعریف یہ ہے کہ دل اور زبان متفق نہ ہوں۔ اس کی دو بڑی قسمیں اعتقادی نفاق اور عملی نفاق ہیں۔ اعتقادی نفاق ایک قسم کا کفر ہے اور عملی نفاق فسق ہے۔ اعتقادی نفاق کی تعریف یہ ہے کہ آدمی ایمان کا اظہار کرے مگر دل میں ایسا انکار رکھے جو ارادتاً ہو، یا دوسرے لفظوں میں اقرار ظاہر کرنا اور انکار چھپانا جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے:

''**اِذَا جَآءَکَ الْمُنَافِقُوْنَ قَالُوْا نَشْھَدُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰہِ م وَاللّٰہُ یَعْلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُهٗ وَاللّٰہُ**

يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَO اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ'' (المنافقون ۶۳:۱،۲)

''اے محمد ﷺ! جب منافق لوگ تمہارے پاس آتے ہیں تو (ازراہ نفاق) کہتے ہیں کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ بے شک خدا کے پیغمبر ہیں اور خدا جانتا ہے کہ درحقیقت تم اس کے پیغمبر ہولیکن خدا ظاہر کیے دیتا ہے کہ منافق (دل سے اعتقاد رکھنے کے لحاظ سے) جھوٹے ہیں۔ انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور ان کے ذریعے سے (لوگوں کو) راہِ خدا سے روک رہے ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ جو کام یہ کرتے ہیں بُرے ہیں۔

نفاق عملی یہ ہے کہ دین کے احکام کو ماننے کے باوجود ان پر دانستہ اور اختیاراً عمل نہ کیا جائے جیسا کہ قرآن حکیم نے سورہ الصّف میں ان لوگوں کی نکیر کی ہے جن کے قول وفعل میں تضاد ہو۔

واضح رہے کہ اعتقادی نفاق کفر کی بدترین قسم ہے اور عملی نفاق فسق کی جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ منافق کی نشانی یہ ہے کہ وہ جھوٹ بولتا ہے، امانت میں خیانت کرتا اور وعدے کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ نیز فرمایا:

''لااله الاالله كلمة الف الله بها قلوب المسلمين. فمن قال واتبعها بالعمل الصالح فهو مومن ومن قالها واتبعها بالفجور فهو منافق'' (مسند الامام الربیع)

یعنی لا الہ الا اللہ وہ کلمہ ہے جس سے اللہ نے مسلمانوں کے دلوں کو باندھ رکھا ہے پس جس نے یہ کلمہ پڑھا اور نیک عمل کیے تو وہ سچا مومن ہے اور جس نے کلمہ پڑھا اور بُرے اعمال کیے وہ منافق ہے۔

س: نفاق کا ضرر کیا ہے؟

ج: نفاق کا سب سے بڑا ضرر تو اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور اس کے نتیجے میں جہنم کی آگ کا عذاب ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ منافقین جہنم کے سب سے نچلے گڑھے میں ہوں گے۔

س: اعتقادی نفاق کا علاج کیا ہے؟

ج: اعتقادی نفاق کا علاج ہمیں درکار نہیں ہے کیونکہ ایک مسلمان کو مسلمان رہتے ہوئے یہ مرض لاحق نہیں ہوتا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اعتقادی نفاق کا حامل خود کو مریض نہیں سمجھتا اس لیے اس کو کوئی علاج بتانا بے سود اور بے معنی ہے۔ البتہ اس نفاق میں مبتلا کسی شخص کو خیرخواہی اور تبلیغ کی نیت سے بعض طریقوں سے سمجھانے اور حق کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ، آداب تبلیغ میں ہوگا۔

س: عملی نفاق کا علاج کیا ہے؟

ج: عملی نفاق کی دو حالتیں ہیں۔ پہلی حالت تو یہ ہے کہ آدمی اس نفاق میں مبتلا ہو مگر کسی وجہ سے اس کے ضرر کو محسوس نہ کرتا ہو۔ دوسری حالت یہ ہے کہ اس کا شکار تو ہو لیکن اس سے رہائی پانے کی خواہش بھی رکھتا ہو۔

پہلی حالت عموماً دو وجوہ سے پیش آتی ہے: ایک غلط عقائد اور دوسرے حبّ دنیا۔ اس کا علاج اصولاً صحیح عقائد سے شروع ہوگا۔ ایسے شخص کی وہ غلطی دریافت کرنی چاہیے جس کی وجہ سے وہ اپنے نفاق کے نقصانات کی طرف پوری طرح متوجہ نہیں ہو پا رہا۔ عام طور پر اس غلطی کے دو سبب ہوتے ہیں: ایک اللہ کی رحمت کا غلط تصور؛ اور دوسرے رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کا غلط تصور۔ سب سے پہلے یہ باور کرنا اور کرانا چاہیے کہ اللہ کی رحمت اگر آخرت میں بھی نافرمانوں پر ایسی عام ہو کہ بڑے سے بڑا نافرمان بھی بخشا جائے تو اس کا سیدھا سادا مطلب تو یہ ہوا کہ نعوذ باللہ، اللہ کے احکام محض مذاق تھے اور ظاہر ہے کہ یہ بات اللہ تبارک وتعالیٰ کی شان کے اس قدر خلاف ہے کہ خود یہ شخص بھی جو رحمت کا خود ساختہ تصور رکھتا ہو، اسے قبول نہیں کر سکتا۔ دوسرے سبب کا ازالہ بھی اسی نہج پر ہوگا کہ بلا قید اور عام شفاعت رسول کریم ﷺ کی عبدیت ہی نہیں بلکہ رسالت کے بھی منافی ہے کیونکہ اگر اس طرح کی شفاعت آپ ﷺ کو فرمانا تھی تو آپ ﷺ کا اپنی بندگی پر اصرار کوئی معنی نہیں رکھتا اور وہ پیغام بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا جو آپ ﷺ انسانوں کی اخروی نجات کے واحد ذریعے کے طور پر لے کر آئے۔ باقی رہی حبّ دنیا تو اس کی تعریف اور علاج نفاق کے بعد زیر بحث آئے گا۔

س: اس شخص کے لیے کیا علاج تجویز کیا جائے گا جو عملی نفاق میں مبتلا ہو، اس کے ضرر کو محسوس بھی کرتا ہو اور اس سے بچنا بھی چاہتا ہو؟

ج: اس معاملے میں علاج دراصل دو چیزوں کا ہوگا۔ ایک کسل اور دوسرے آخرت پر مطلوبہ یقین نہ ہونا۔ کسل کے علاج کا آغاز نماز باجماعت کی پابندی سے ہوگا اور رفتہ رفتہ دوسرے معاملات کا بھی احاطہ کرے گا۔ جماعت کی پابندی کسل کی دونوں قسموں یعنی ذہنی اور جسمانی کسل کا علاج ہے۔

آخرت پر مطلوبہ یقین پیدا کرنے کی بہترین تدبیر تو یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کی جائے جن کے قول وفعل سے اللہ کا خوف جھلکتا ہو، تاہم اگر اس طرح کی صحبت میسر نہ ہو تو آخرت سے متعلق آیات قرآنیہ، احادیثِ نبویہ یا کوئی مستند بیان بار بار پڑھنے کی عادت ڈالی جائے۔ شروع میں اگر دل نہ لگے تو بھی یہ مطالعہ جاری رکھنا چاہیے۔ اس میں کچھ رسوخ پیدا ہو جائے تو پھر موت کو یاد رکھنے کی مشق کرنی چاہیے۔ یہ آخرت کے یقین کو بھی کامل کرتی ہے اور عمل کے محرکات کو بھی تقویت پہنچاتی ہے۔

مسلم نشأۃ ثانیہ اور مغرب　　　ڈاکٹر نعمان ندوی

مسلم ترقی اور سربلندی کے لیے
سائنس و ٹیکنالوجی غیر اہم ہے (آخری قسط)

نفس پرستی اور نفس کشی کی متضاد روایات ایک ساتھ نہیں چل سکتیں۔ کیا خیرالقرون کے عہد کی کیفیات اس دور کی سادگی اور دنیا سے کم سے کم تمتع کی روایت کے بغیر روحانیت کا منبع کچھ اور بھی ہوسکتا ہے؟ کیا اس جدید تہذیب و تمدن اور طریقوں کو لفظ بہ لفظ ارتقائے زمانہ کے نام پر اختیار کرلیا جائے جس کے نتیجے میں لوگوں کا زندگی بسر کرنا بلکہ مغرب میں لوگوں کا مرنا بھی ناممکن ہوگیا ہے؟ برطانیہ جیسے ملک میں تدفین کی رسومات پر چار پانچ ہزار پونڈ خرچ ہوتے ہیں اس لیے اب تدفین کی رسم کے لیے بھی انشورنس متعارف کرائی گئی ہے۔ صنعتی انقلاب کے نتیجے میں کینسر جیسی کئی موذی اور مہلک بیماریوں کے جدید علاج نے موت کا حصول بھی مشکل بنادیا ہے، کیونکہ علاج سے مرنے کے لیے لاکھوں روپے کی ضرورت ہے۔ سات ہزار سال کی تاریخ میں سترہ تہذیبوں میں جہاں کبھی خودکشی کی روایت نہیں رہی، تاریخ میں پہلی مرتبہ خودکشی جدید طرز زندگی کے طور پر عام ہورہی ہے۔ غربت، معیار زندگی کی آرزو، خوابوں سے بھرپور الف لیلوی پُرتعیش زندگی، چکا چوند سے معمور زرق برق خوابناک طرز حیات جو صرف میڈیا پر دکھائی دیتا ہے جدید ایجادات اور ان کی اشتہار بازی سے مسابقت کی دوڑ میں ناکامی کے باعث بے شمار مہلک دماغی، جسمانی اور روحانی امراض پیدا ہورہے ہیں، ان مہلک امراض کے علاج اتنے مہنگے ہیں کہ زندگی بخوشی ہار دینا اور خودکشی کرلینا زیادہ آسان ہوگیا ہے۔ جو موت قسطوں میں لاکھوں روپے خرچ کرکے ملتی ہو جس کے باعث خاندان، جائیداد، عزتیں اور عورتیں سب بک جاتی ہوں مگر مریض پھر بھی صحت مند نہ ہوتا ہو تو سب کے لیے خودکشی کے راستے کھل جاتے ہیں۔ اسی لیے خودکشی عام ہورہی ہے خواہ وہ دنیا کے غریب علاقے ہوں یا امیر خطے۔ اس کا سبب شاعر عارف شفیق نے صرف دو مصرعوں میں بتادیا ہے:

غریب شہر تو فاقے سے مرگیا لیکن　　　امیر شہر نے ہیرے سے خودکشی کرلی

کسی کے پاس کھانے کو روٹی نہیں اور کسی کے پاس کھاکے مرنے کے لیے ہیرا ہے، یہ خدا بے زار معاشروں کا انجام ہے۔

خودکشی صرف غریب آدمی نہیں کررہا، بڑے بڑے امرا بھی کررہے ہیں۔ یہ ان یوروپی ممالک

میں بھی ہورہی ہے جہاں آمدنی اور عیاشی سب سے زیادہ ہے، جن کو ہمارے جدیدیت پسند مسلم مفکرین بڑی حسرتوں سے دیکھتے ہیں اور جیسے ہی کسی یورپی ملک سے سفر کرکے آتے ہیں فوراً مدح وثنا سے بھرپور سفر نامے لکھتے اور اسلام سے ٹریفک کا نظام ثابت کرنے لگتے ہیں۔ مغرب میں محبت، خاندان، رشتوں، روابط، مذہب، اقدار اور اخلاقیات کی موت کے باعث لوگوں کی زندگی بے معنی (meaningless) ہوچکی ہے۔ اس کو معنی دینے کا طریقہ گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ ہے، مگر زندگی پھر بھی بے معنی ہی رہتی ہے۔ نہ خاندان، نہ ماں، نہ بیوی نہ بچے آدمی کس کے لیے جیے، کس کے لیے مرے، کس کے لیے قربانی دے لہٰذا بہتر یہ ہے کہ آدمی اپنے ہی لیے مرجائے۔ ہائیڈیگر کے الفاظ میں یہ ''فاتحانہ موت'' آج مغرب کی پسندیدہ تہذیب ہے جسے تیزی سے مقبولیت حاصل ہورہی ہے۔ عہد حاضر کا سب سے بڑا فلسفی گلز ڈیلوز (Gills Delluze) اس عہد کے مسائل پر سوچتے سوچتے پاگل ہوگیا۔ وہ ان مسائل کا کوئی جواب نہ دے سکا تو اس نے ہسپتال کی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر خودکشی کرلی۔ اسے صدمہ ہے کہ انسان ابھی تک آزاد نہیں ہوسکا۔ مساوات کے فلسفے کے باوجود باپ بیٹی اور ماں بیٹے کے رشتوں میں ابھی تک احترام قائم ہے۔ یہ تعلقات ابھی تک مکمل ناپاک نہیں ہوئے۔ اسے شکایت یہ ہے کہ محرمات سے ازدواجی تعلقات (Incestuous relations) عام کیوں نہیں ہوئے۔ حالانکہ مغرب میں مساوات کے فلسفے کے باعث حقیقی خونی رشتوں میں جنسی جبر کی شکایات عام ہیں۔ تاریخ انسانی میں کبھی کسی فلسفی نے اس بے بسی کے ساتھ اپنی جان کا نذرانہ پیش نہیں کیا۔ جدید مغربی تہذیب، اس کی سائنس، ٹیکنالوجی اور اس کے بطن سے پھوٹنے والے مسائل گلز ڈیلوز کی خودکشی کا سبب ہیں۔ سوئٹزرلینڈ، ناروے، سویڈن، جرمنی اس وقت عصری تاریخ کے ترقی یافتہ، امیر، سہولتوں سے آراستہ اور جدید فتوحات سے مزیّن بہت محدود آبادی کے حامل معاشرے ہیں، لیکن سب سے زیادہ خودکشی کی شرح ان خطوں میں ہے تو آخر کیوں؟ مادی ترقی کی معراج پر پہنچنے کے بعد بھی کیا کسی چیز کی ضرورت باقی رہ گئی؟ انسان خودکشی کیوں کرتا ہے؟ کیا اسے خودکشی کرنی چاہیے؟ خودکشی کیوں کی جاتی ہے؟ فلاسفہ کے یہاں اس پر دلچسپ بحث ملتی ہے۔ کانٹ کے خیال میں انسانی ذہن بارہ حصوں میں منقسم ہے۔ ہیگل کے خیال میں ان کی تعداد ۱۰۵ ہے۔ کانٹ کے خیال میں کوئی عقل مند آدمی خودکشی نہیں کرسکتا۔ ہیگل کے خیال میں خودکشی انسان ہی کرتے ہیں جانور کبھی خودکشی نہیں کرتے۔ کیا عہد حاضر کا انسان جانور سے بھی گیا گزرا ہے یا خودکشی کوئی قابل فخر کام ہے۔ عہد حاضر میں زندگی اتنی اذیت ناک کیوں ہوگئی ہے؟

زندگی یقیناً اذیت ناک ہے اس لیے کہ عہد حاضر کے انسان کی آرزوئیں اور تمنائیں میڈیا اور اشتہارات کی صنعت نے بہت بڑھا دی ہیں۔ اس کے نتیجے میں انسان قلت (Scarcity) کے جدید مادی اور روحانی بحران کا شکار ہوگیا ہے جس کا آخری حل خودکشی ہے۔ جزیرۃ العرب کی سخت ترین زندگی میں شب و روز بسر کرنے والے مشرکین نے کبھی خودکشی نہیں کی مگر عہد حاضر کے عیش و عشرت اور سہولتوں میں آنکھ کھولنے والے وحشی اپنی جان پر کیوں کھیل رہے ہیں؟ وہ کیا بنیادی تغیر واقع ہوگیا ہے کہ اونٹ کی جلتی ہوئی پیٹھ پر بیٹھ کر تپتے ہوئے صحراؤں میں کوک پیپسی اور ٹیٹرا پیک کے دودھ کے بغیر سفر کرنے والا فرد کبھی زندگی سے بے زار نہیں ہوتا تھا۔ عہد حاضر کا عیاش فرد یہ تمام سہولتیں، مراعات اور تعیّشات مل جانے کے باوجود مرجانا چاہتا ہے تو کیوں؟ اگر عہد جدید کے مسلم مفکرین ان باریکیوں، نزاکتوں اور نکتوں سے واقف نہیں تو وہ خطبہ جمعہ سننا ترک کر دیں اور اپنے لیے ہیگل کے جدلیاتی افکار پر مبنی دجل سے نیا خطبہ جمعہ تیار کریں۔ [خودکشی کی تفصیلات کے لیے انٹر نیٹ پر بے شمار معلومات میسر ہیں۔]

حسین نصر اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہر تہذیب کو سائنسی ترقی اس قوم کے دورِ زوال میں ملی لیکن اس تاریخی تجزیے کو تسلیم کرنے کے بعد وہ مسلمانوں کی سائنسی ترقی کے دور عروج کو ہی اصلاً دور عروج سمجھتے ہیں۔ اسے زوال کی علامت کے طور پر قبول نہیں کرتے اور اس امر پر تعجب کرتے ہیں کہ اس عروج پر زوال کیوں آ گیا؟ اور اس زوال سے عروج کے سفر کا راستہ کیسے نکالا جائے؟ یعنی دنیا کی تاریخ میں تمام تہذیبوں اور اقوام میں مسلمان وہ واحد تہذیب، قوم یا امت ہے جس کو سائنسی ترقی دور زوال میں نہیں مسلمانوں کے دور عروج میں ملی۔ ایک جانب وہ عہد عباسی کو عہد ملوکیت بھی قرار دیتے ہیں، ملوکیت کو تمام گناہوں کی جڑ کہتے ہیں اور اس ملوکیت سے نکلنے والی سائنس کو عظیم اسلامی سرمایہ تسلیم کرتے ہیں اور اس سرمایے کے دوام کے لیے کوشاں رہنے کو مقصود قرآن اور مطلوب رسالت محمدیﷺ قرار دیتے ہیں۔ ملوکیت کو تمام گناہوں کی جڑ قرار دینا تاریخی طور پر خالص سیاسی، مادی اور دورِ جدید میں خالص مغربی نقطۂ نظر سے ہم آہنگ فکر ہے جو جمہوریت اور جدید مغربی تصور تاریخ سے برآمد ہوا ہے جس کی عمر تین سو سال سے زیادہ نہیں ہے۔ اسلامی تاریخ کو ملوکیت کی تاریخ سمجھنا ردِعمل کی نفسیات سے برآمد ہونے والا نتیجہ ہے جو جمہوریت کے کفر سے خاص تعلق رکھتا ہے اور حاکمیت جمہور کے ذریعے حاکمیت الہٰ کے تصور کو جڑ بنیاد سے ختم کر دیتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ نقطۂ نظر اپنی تاریخ کا انکار ہے جو ملت اپنی تاریخ رد کر دے وہ صحرا میں تنہا کھڑی ہوگی اور سراب کی

تلاش میں رہے گی۔ حسین نصر کے ان تضادات کی تشریح و توجیہہ کے لیے ہمیں کچھ اور لکھنے کی ضرورت نہیں۔ حسین نصر اور مکتبہ روایت سے وابستہ مفکرین اسلامی سائنس کی نہایت عالمانہ اور پر جوش وکالت کے باوجود یہ نہیں بتا سکے کہ مسلمان کا دورعروج تو عہد رسالت مآبﷺ اورعہد خلافت راشدہ ہے اور بلا شبہ خیر القرون ہے لیکن اس عظیم عہد اور اس کے بعد خلافت راشدہ کے زریں ادوار میں سائنس کی ترقی کے لیے کیا لائحہ عمل مرتب کیا گیا؟ اگر نہیں تو کیوں؟ خیر القرون سائنس کی عظیم ترقی سے کیوں خالی رہا؟ کیا علوم نقلیہ اور روحانیت اور شعور ایمانی کے مقابلے میں علوم عقلیہ کی ذرہ برابر بھی وقعت نہیں تھی۔ کبار صحابہ کرام میں کتنے سائنس داں تھے، سائنس کے بغیر ہی مسلمانوں نے تین براعظموں کو کیسے فتح کیا؟ امت مسلمہ کا اصل کردار وہ ہے جب وہ مادی طور پر نہایت ہلکی اور اخلاقی و روحانی طور سے سب پر فضیلت کی حامل تھی یا وہ دور جب اسے دنیا میں مادی طور پر برتری حاصل ہوگئی تھی اگر مادی دور بہتر تھا تو اسی دور میں تاتاریوں جیسی کم زور قوم نے انہیں کیسے شکست دے دی؟ اور اُندلس عظیم سائنسی ایجادات کے باوجود اپنا تحفظ کیوں نہ کرسکا کہ وہاں کوئی مسلمان باقی نہ بچا؟

یہ سوال اہم ہے کہ ہمسایہ اقوام کی مادی ترقی، تہذیب، سائنس اور فنِ تعمیرات سے ام القریٰ کے مسلمان کیوں مرعوب و متاثر نہ ہوئے؟ اور مدینۃ النبی میں ان فنون اور علوم عقلیہ کی در آمد میں کیا امر مانع رہا؟ اس سوال پر بھی غور کی ضرورت ہے کہ مسلمان ہمسایہ اقوام کے علوم عقلیہ اور محیر العقول فلسفہ و سائنس سے اگر مرعوب ہوجاتے تو کیا وہ روم و ایران کو فتح کرسکتے تھے؟ رومی اپنی تمام تر طاقت کے باوجود ایران کو فتح نہ کرسکے لیکن مسلمانوں نے نہ صرف سرزمین ایران کو فتح کرلیا بلکہ اس خطے کے لوگوں کے قلب بھی تسخیر کرلیے اور عظیم الشان رومی سلطنت کا بھی خاتمہ کردیا۔ مسلمانوں کے پاس روم و ایران کی سائنس و ٹیکنالوجی کے مقابلے میں صرف ایمان کی قوت تھی۔ ان قوتوں کا خاتمہ کرنے والے ان ختم ہونے والی سلطنتوں کی مادی ترقی، علوم عقلیہ کے مقابلے میں کس حیثیت اور کس مقام کے حامل تھے، یہ جاننے کے لیے تمام مروجہ تاریخوں کا مطالعہ کرلیا جائے۔

کفار مکہ جب ایک امی رسولﷺ کے معجزانہ کلام کے سامنے عاجز رہ گئے تو انھوں نے یہ اعتراض کیا تھا: ''یہ پرانے لوگوں کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں جنھیں یہ شخص نقل کراتا ہے اور وہ اسے صبح و شام سنائی جاتی ہیں''۔ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا [الفرقان: ۵]۔ صرف یہی نہیں بلکہ کفار کو یہ اعتراض بھی تھا کہ یہ کیسا پیغمبر ہے جس کے ساتھ فرشتوں کے لشکر نہیں، جو ہماری طرح بازاروں میں چلتا پھرتا، کھاتا پیتا اور ہم سے ہم کلام ہوتا ہے۔ اسے علم،

مال، دولت۔ شان وشوکت یعنی مادی طور پر کسی بھی شے میں ہم پر برتری حاصل نہیں۔ یہ مادہ پرست جس چیز کو علم سمجھتے اور جس منہاج علم میں کھڑے تھے وہاں دنیا اور امور دنیا سے متعلق علوم، یعنی علوم عقلیہ اور مال و دولت ہی راس العلم تھا۔ وہ پیغمبر کو عام انسانوں کی طرح عام لوگوں کے ہم رکاب دیکھتے تھے تو انھیں حیرت ہوتی تھی۔

ان کا یہ اعتراض بظاہر درست تھا کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے مقرب بندوں کو مافوق الفطرت تصور کرتے تھے۔ جنات کے ساتھ ان کے تعلق کی نوعیت ان کے اکرام کے واقعات جو تاریخ عرب اور کلام عرب میں ملتے ہیں اس نقطۂ نظر کی تشریح میں معاون ہوسکتے ہیں ''یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے کیوں نہ اس کے پاس کوئی فرشتہ بھیجا گیا جو اس کے ساتھ رہتا اور [نہ ماننے والوں] کو دھمکاتا؟ یا اور کچھ نہیں تو اس کے لیے کوئی خزانہ ہی اتار دیا جاتا یا اس کے پاس کوئی باغ ہی ہوتا جس سے یہ [اطمینان کی] روزی حاصل کرتا: وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْاَسْوَاقِ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ...... اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا وَ قَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا [الفرقان: ۸و۷]

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا [الفرقان: ۳۰]۔ ''اے میرے رب میری قوم کے لوگوں نے اس قرآن کو نشانہ تضحیک بنا لیا تھا۔'' یہ آیت صرف عہد رسالت کے کفار مشرکین کے لیے نہیں ہے اس عہد کے جدیدیت پسند مسلمانوں کے لیے بھی ہے جنھوں نے اس قرآن کی تضحیک کے نئے نئے طریقے ایجاد کیے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ قرآن کے معنی Hermeneutics سے متعین ہوں گے، کبھی کہتے ہیں کہ کلام عرب سے اخذ ہوں گے، کبھی کہتے ہیں کہ اس کے جو معنی عہد رسالت میں تھے اب وہ نہیں ہیں۔ ان میں جو بہت زیادہ جری ہیں ان کو شکوہ ہے کہ اس قرآن کو لے کر ہم کیا کریں، اس میں نہ نیچرل سائنس ہے، نہ سوشل سائنس، نہ منطق۔ اس کی آیات سے نہ ہم ایٹم بم بنا سکتے ہیں، نہ ہوائی جہاز۔ یہ قرآن عہد حاضر میں کسی کام کا نہیں ہے، نعوذ باللہ۔ دوسری جانب معذرت خواہ، سادہ لوح اور جاہل مفکرین اسی قرآن سے تمام مغربی، مادی، عقلی اور سائنسی علوم کو ثابت کر رہے ہیں مگر اس سوال کا جواب نہیں دیتے کہ عجیب بات ہے کہ قرآن تمھارے پاس تھا اور قرآن میں مستور و مخفی تمام علوم کافروں کو مل گئے جن میں سے کسی ایک سائنس داں نے کبھی بھول کر قرآن نہیں پڑھا اور نہ قرآن کے ذریعے کوئی سائنسی فارمولا دریافت کیا۔

مسلم نشأة ثانیہ اور مغرب ڈاکٹر محمد امین

مسلمانوں کی ترقی کا واحد راستہ

اس آنکھوں دیکھی اور خود بیتی کا انکار تو کوئی صاحب ہوش وخرد کر ہی نہیں سکتا کہ مسلمان اس وقت زوال کا شکار ہیں اور ذلت وپستی کے گڑھے میں گرے ہوئے ہیں۔ وہ اس پستی سے نکلنے کے لیے کچھ ہاتھ پاؤں مار بھی رہے ہیں لیکن انہیں ابھی تک اس میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اس تحریر میں ہم اختصار کے ساتھ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مسلمان کس طرح موجودہ ذلت وپستی سے نکل کر دوبارہ شاہراہ ترقی پر گامزن ہوسکتے ہیں اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو بحال کر سکتے ہیں!

اگر ہم قرآن وسنت کی روشنی میں قوموں کے عروج وزوال کا جائزہ لیں تو درج ذیل اصول ہمارے سامنے آتے ہیں:

انسان

اس کائنات اور انسان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ اُس نے انسان کو کائنات میں تصرف کی صلاحیت اور اختیار دیا ہے اور کائنات اسی کے لیے پیدا کی ہے۔ انسان کو اس نے زمین میں قیامت تک کے لیے سامان زیست مہیا کیا ہے تاکہ وہ یہاں بخوبی زندگی گزار سکے۔

ہدایت

انسان کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت سے نوازا ہے اور اسے بتایا ہے کہ زمین میں زندگی کیسے بسر کرے۔ اس نے اپنی ذات کے ادراک کا مادہ انسان میں رکھا ہے اور پیغمبروں کے ذریعے بھی اس کی رہنمائی کی ہے لیکن اس نے بنیادی طور پر انسان کو غیر جانبدار پیدا کیا ہے اور اس کے اندر اچھے اور بُرے دونوں طرح کے میلانات رکھ دیے ہیں اور اسے اختیار دیا ہے کہ وہ چاہے تو ہدایت کو مانے اور چاہے تو نہ مانے اور ماننے اور نہ ماننے دونوں کا انجام بھی بتادیا ہے۔

دنیا میں کامیابی ہدایت سے مشروط نہیں

دنیا کے تصرف اور اسباب زندگی مہیا کرنے کے کام کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت سے منسلک نہیں کیا یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ قانون نہیں بنایا کہ جو اس کی ہدایت مانے گا اسے وہ زرق دے گا اور جو نہیں

مانے گا اسے نہیں دے گا یا جو اسے مانے گا اسے زیادہ رزق دے گا اور جو اسے نہیں مانے گا اسے کم رزق دے گا بلکہ دنیا گزارنے کے اسباب اس نے سب انسانوں کے لیے یکساں رکھے ہیں خواہ کوئی اس کی ہدایت کو مانے اور مسلم و مطیع ہو یا اس ہدایت کو نہ مانے اور کافر و نافرمان ہو۔

ہدایت کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے جو ہدایت اور لائحہ عمل دیا ہے وہ کیا ہے؟ اس کا خلاصہ اس فرمان الٰہی میں ہے کہ اے انسان! میں نے تجھے پیدا کیا ہے اور اس کائنات کو بھی اور تمہیں اس کائنات میں تصرف کا اختیار دیا ہے تو تمہیں چاہیے کہ میری اطاعت کرو، میری مرضی پر چلو۔ تمہارا امتحان یہی ہے کہ تم دنیا کی زندگی میری مرضی کے مطابق گزارتے ہو یا نہیں؟ دنیا کی یہ زندگی عارضی اور چند سالہ ہے اس کے بعد ایک دائمی زندگی آنے والی ہے لہٰذا آخرت کی زندگی کو دنیا کی زندگی پر ترجیح دو اور زندگی گزارنے کا جو طریقہ اور سلیقہ میرے مبعوث کردہ پیغمبروں نے تمہیں بتایا ہے اس پر عمل کرو۔

اطاعت الٰہی کا اخروی نتیجہ

جو انسان اللہ کے احکام کی اطاعت کرتے ہوئے زندگی گزارے گا اسے آخرت میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوگی اور وہ دائمی نعمتوں سے نوازا جائے گا۔ اس کے برعکس جو شخص دنیوی زندگی اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گزارے گا وہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی ناراضی مول لے گا اور سخت سزا کا مستحق ٹھہرے گا۔

اطاعت الٰہی کا دنیوی نتیجہ

اگر انسان اپنی زندگی اللہ کی ہدایت کے مطابق گزاریں گے تو وہ آخرت ہی نہیں دنیا میں بھی کامیاب ہوں گے۔ وہ اسباب زندگی باافراط مہیا کرنے پر قادر ہو جائیں گے اور ان کے درمیان اخوت و محبت کا تعلق پروان چڑھے گا اور یہ زندگی دنیا میں ہی جنت نظیر بن جائے گی۔ تاہم یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ کسی ایک فرد سے نہیں بلکہ انسانی معاشرے سے ہے یعنی جس معاشرے کے افراد کی اکثریت اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اللہ کے احکام کے مطابق گزارتی ہو وہ دنیا میں بھی کامیاب رہتی ہے۔ تاہم افراد معاشرہ کی اکثریت، خصوصاً اس کے مقتدر عناصر، اگر اللہ کی معصیت پر مبنی زندگی گزاریں تو ظاہر ہے کہ اللہ کی اطاعت کی زندگی بسر کرنے والے شخص یا اشخاص کو ان کی

مزاحمت کی وجہ سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اور ایسا فرد بظاہر تو دنیا میں شاید کامیاب نہ ہو لیکن اس اطمینان قلب سے ضرور متمتع ہوگا کہ اس نے مقدور بھر اللہ کی اطاعت کی ہے اور آخرت میں کامیابی تو یقیناً اس کے قدم چومے گی۔

اسلام، کفر اور دنیوی کامیابی

درج بالا گفتگو سے واضح ہوگیا کہ اگر کوئی معاشرہ اسلام یعنی اللہ کی اطاعت کی راہ پر چلے تو اس کے افراد دنیا میں بھی کامیاب ہوں گے اور آخرت میں بھی اور اگر کوئی معاشرہ کفر یعنی اللہ کی عدم اطاعت کے راستے پر چلے تو وہ آخرت میں تو حتماً ناکام ہوگا تاہم وہ دنیا میں کامیاب ہوسکتا ہے اگر وہ اپنی انسانی صلاحیتوں کو منظم کرکے اسباب زندگی مہیا کرنے پر قادر ہوجائے اور اس میں دوسروں سے آگے نکل جائے۔

آج مغرب کیوں کامیاب ہے؟

آج اہلِ مغرب کامیاب ہیں اگرچہ وہ اللہ کی اطاعت کے راستے پر نہیں چل رہے اور دنیوی زندگی گزارنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کو انہوں نے رد کردیا ہے۔ ان کی کامیابی کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو منظم کرکے اسباب زندگی مہیا کرنے پر دوسروں سے بہتر قدرت حاصل کرلی ہے تاہم اس دنیوی کامیابی کے باوجود آخرت میں وہ حتماً ناکام ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کے سخت عذاب کے مستحق ٹھہریں گے۔ اور ان کی یہ دنیوی کامیابی بھی عارضی ہے کیونکہ انہوں نے الٰہی ہدایت کو رد کرکے اپنی مرضی کا جو طرز زندگی ایجاد کیا ہے وہ فساد فی الارض کا سبب بن رہا ہے اور یہ فساد دن بدن بڑھ رہا ہے لہٰذا کسی وقت بھی اللہ کی مشیت کا کوڑا حرکت میں آئے گا اور یہ تہذیب عاد وثمود کی طرح نابود ہوجائے گی۔

آج مسلمان کیوں دنیا میں ناکام ہیں؟

آج مسلمان اس لیے دنیا میں ناکام ہیں کہ ان کا معاشرہ اور ان کی اکثریت اللہ کی اطاعت کی زندگی نہیں گزار رہی۔ اگر وہ اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گزار رہے ہوتے تو ان کی انسانی صلاحیتیں بھی بہتر طور پر منظم ہوجاتیں، وہ اسباب زندگی مہیا کرنے پر بھی قادر ہوجاتے اور یوں دنیا میں بھی کامیاب ٹھہرتے۔

تاہم جو مسلمان اپنی ذات کی حد تک مقدور بھر اللہ کی اطاعت پر مبنی زندگی گزار رہا ہو وہ یقیناً آخرت میں کامیاب ہوگا اور دنیا میں اس اطمینان قلب سے بھی متمتع ہوگا کہ اس نے مقدور بھر اللہ کی اطاعت کی کوشش کی۔ البتہ دنیا کی زندگی میں اسے مشکلات وتکالیف اور اللہ کے نافرمان معاشرے کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا اور دنیا میں اس کا حشر وہی ہوگا جو اس کے معاشرے کا ہوگا۔

مسلمان وہ شخص ہے جو اسلام لایا ہو اور اسلام کا مطلب ہے اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دینا اور اس کی اطاعت کرنا۔ اب جو شخص کہتا ہے کہ وہ مسلمان ہے لیکن عملاً اطاعت نہیں کرتا بلکہ کفر کی ہی روش اختیار کرتا ہے تو وہ منافق ہے اور نفاق کے اس رویے کی بناء پر آخرت میں اس کی ناکامی تو ظاہر ہی ہے دنیا میں بھی اگر کسی معاشرے میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہو تو وہ دنیا میں بھی ناکام ہوجائیں گے کیونکہ احکام الٰہی کی عدم اطاعت کا رستہ اختیار کرنے کی وجہ سے وہ اس قوت سے محروم ہوجائیں گے کہ اپنی انسانی صلاحیتوں کو منظّم کرسکیں اور اسباب زندگی مہیا کرنے پر قادر ہوسکیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان آج دنیا میں ذلیل وخوار ہو رہے ہیں۔

آج مسلمان کس طرح دنیا میں کامیاب ہوسکتے ہیں؟

مسلمانوں کے پیش نظر محض دنیا کی نہیں بلکہ دنیا وآخرت دونوں کی کامیابی ہوتی ہے اور دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی کا طریقہ یہی ہے کہ دنیوی زندگی اللہ کے احکام کے مطابق گزاری جائے۔ اس سے نہ صرف آخرت میں کامیابی یقینی ہوجائے گی بلکہ انسانی صلاحیتوں کے بہتر استعمال کی وجہ سے مسلمان اسباب دنیا مہیا کرنے میں بھی دوسروں سے آگے نکل جائیں گے۔

کیا مسلمان مغرب کی پیروی کرکے دنیا میں ترقی کرسکتے ہیں؟

اہل مغرب نے چونکہ اللہ کی اطاعت کے راستے کو رد کردیا ہے اور ان کے پیش نظر صرف دنیا کی کامیابی ہے لہٰذا مسلمان اگر ان کی پیروی کریں گے تو ان کی طرح وہ بھی آخرت میں ناکام رہیں گے کیونکہ مغرب کے پیش نظر آخرت کی کامیابی ہے ہی نہیں۔

جہاں تک دنیوی کامیابی کا تعلق ہے، جس کا انحصار انسانی صلاحیتوں کی بہتر تنظیم اور اسباب زندگی مہیا کرسکنے کی قوت پر ہے تو مسلمانوں کو اس کے لیے بھی مغرب کی پیروی کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا راستہ اختیار کرنے سے یہ دونوں صلاحیتیں خود بخود انہیں حاصل

ہوجائیں گی جیسا کہ اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور میں انہیں حاصل ہوئی تھیں۔

منطقی بات یہ ہے کہ مسلمان مغرب کی پیروی کریں گے تو نہ صرف اپنی آخرت برباد کرلیں گے بلکہ ان کا دنیوی زوال بھی مزید گہرا ہوجائے گا کیونکہ ان کا سارا نظام فکر وعمل اللہ کی اطاعت پر مبنی ہے اور مغرب کا سارا نظام فکر وعمل اللہ کی عدم اطاعت پر مبنی ہے۔ لہٰذا مغرب کی پیروی سے ان کے اندر کشمکش شروع ہوجائے گی اور انہیں کبھی فکر وعمل کی وہ یکسوئی حاصل نہ ہوگی جو دنیوی ترقی کی بنیاد ہے۔ بلکہ اس کشمکش سے فکری اور نظری انارکی پیدا ہوگی جو ایک منتشر شخصیت کو جنم دے گی اور اس کے نتیجے میں مغرب کی پیروی کرنے والے مسلم معاشرے مزید کمزوری کا شکار ہوں گے اور زوال کی دلدل میں مزید گہرے دھنستے چلے جائیں گے۔ ترکی اور ایران کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ وہ عرصۂ دراز تک مغرب کی پیروی کے باوجود دنیوی طور پر دیگر مسلم ممالک سے زیادہ خوشحال نہیں ہوئے۔ اس کے مقابلے میں جاپان اور کوریا کو دیکھیے کہ انہوں نے مغرب کی پیروی کی اور دنیوی خوشحالی حاصل کرلی کیونکہ ان کے ہاں مغربی فکر ونظر سے کشمکش کی یہ صورت موجود نہ تھی۔ تیسری مثال ملائشیا کی ہے جس نے اپنے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے اور مغرب کی پیروی کیے بغیر ترقی کی کوشش کی تو اسے کامیابی ہوئی۔

خلاصۂ بحث

دنیا میں مسلمانوں کی ترقی اور کامیابی کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ وہ سچ مچ اللہ کی اطاعت کا راستہ اختیار کرلیں اور منافقت و دوعملی چھوڑ دیں۔ اس طرح ان کی انسانی صلاحیتوں کی بہتر نشوونما ہوگی اور وہ دوسروں سے بہتر انداز میں اسباب زندگی مہیا کرنے پر قادر ہوجائیں گے۔ اس سے نہ صرف انہیں دنیا میں سربلندی حاصل ہوگی بلکہ آخرت میں بھی کامیابی انہی کے حصے میں آئے گی۔ اس کے برعکس اگر انہوں نے دنیوی ترقی کے لیے مغرب کی پیروی کا راستہ اختیار کیا تو مغرب کے فکر ونظر سے اساسی اختلاف کی وجہ سے (کہ مغرب کا سارا فکری ڈھانچہ اللہ کی عدم اطاعت پر مبنی ہے) مسلمانوں کے اندر فکری اور نظریاتی کشمکش شروع ہوجائے گی جو ان کی شخصیت کو مضمحل کردے گی جس کے نتیجے میں نہ ان کی انسانی صلاحیتوں کی بہتر نشوونما ہو سکے گی اور نہ وہ اسباب زندگی احسن انداز میں حاصل کرنے پر قادر ہوسکیں گے اور یوں وہ دنیوی ترقی و کامیابی سے مزید دور ہوجائیں گے۔

مغرب کی پیروی سے مسلمانوں کی اخروی کامیابی کی منزل بھی کھوٹی ہوگی کیونکہ مغرب کے سارے نظام فکر و عمل میں آخرت اور اللہ کی اطاعت کا کوئی تصور موجود ہی نہیں۔

چونکہ اسلام اور مغرب کے نظام فکر و عمل میں بنیادی تضادات ہیں لہٰذا ان میں ہم آہنگی پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔اس لیے یہ تصور ممکن ہی نہیں کہ مسلمان بیک وقت اچھے مسلمان بھی رہیں اور مغرب کی پیروی کر کے دنیوی ترقی اور کامیابی بھی حاصل کر لیں۔ لہٰذا اگر مسلمان دنیا میں ترقی کرنا چاہتے ہیں اور کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ انہیں صحیح اور اچھا مسلمان بننا پڑے گا۔

ترقی کے دنیاوی اسباب و وسائل

سطور بالا میں ہم نے دو اصولی باتوں کا ذکر کیا ہے، ایک یہ کہ مسلمان صرف اسلامی اصولوں پر عمل کر کے ترقی کر سکتے ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ مغربی تہذیب کی پیروی کر کے ترقی نہیں کر سکتے۔ پہلے اصول کی وضاحت کرتے ہوئے ہم نے یہ بات بھی کہی تھی کہ اسلامی اصولوں پر عمل مسلمانوں کی ترقی کا ضامن اس لیے ہے کہ اس سے ان کے اندر ان اسباب و وسائل کے حصول کی وہ صلاحیت خود بخود پیدا ہو جائے گی جو دنیوی ترقی کا زینہ ہیں۔ ممکن ہے بعض قارئین کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ دنیاوی ترقی کے وہ اسباب و وسائل ہیں کیا؟ لہٰذا ہم ان کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ یہ وسائل تین قسم کے ہیں:

۱۔ نموئی (Developmental) وسائل ۲۔ انسانی (Human) وسائل
اور ۳۔ مادی (Material) وسائل

نموئی وسائل:

۱۔ تعلیم و تربیت ۲۔ تحقیق ۳۔ سیاسی استحکام ۴۔ قوت ابلاغ

انسانی وسائل:

۱۔ محنت ۲۔ اتحاد ۳۔ تنظیم و منصوبہ بندی ۴۔ پابندیٔ قانون ۵۔ ایثار و قربانی

مادی وسائل:

۱۔ سائنس و ٹیکنالوجی ۲۔ معاشی مضبوطی ۳۔ حربی قوت

ان وسائل و اسباب کے حوالے سے دو اہم باتیں ذہن میں رہنی چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ یہ اسباب معروضی اور عالمی نوعیت کے ہیں یعنی ان پر جو عمل کرے گا وہ دنیا میں کامیاب ہوجائے گا خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر۔ دوسرے یہ کہ انسانوں میں ان وسائل کے حصول کی صلاحیت کے پیدا ہونے کا انحصار اپنے نظریۂ حیات سے کمٹمنٹ پر ہے۔ کیونکہ اپنے نظریۂ حیات سے کمٹمنٹ ہی انسانوں کو وہ قوت محرکہ اور صلاحیت مہیا کرتی ہے جو انہیں دنیا میں ان اسباب ترقی کے حصول پر قادر بناتی ہے۔

اب ان دو اصولوں پر عمل کے حوالے سے مسلمانوں کا اور مغرب کا جائزہ لے لیجیے۔ مغرب اپنے نظریۂ حیات (سیکولرزم، ہیومنزم، میٹریلزم وغیرہ) سے شدت سے وابستہ ہے اور اس پر پوری طرح عمل کر رہا ہے اس لیے وہ ان اسباب کے حصول پر قادر ہو گیا ہے اور اس نے ترقی و عروج حاصل کرلیا ہے۔ اس کے برعکس مسلمانوں نے اپنے نظریۂ حیات (اسلام) پر عمل چھوڑ دیا ہے لہٰذا ان کے اندر وہ قوت محرکہ اور وہ صلاحیت کمزور ہوگئی ہے جس سے وہ ان اسباب ترقی کے حصول پر قادر ہوتے لہٰذا وہ زوال کا شکار ہوگئے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مسلمانوں کے لیے ترقی کا واحد راستہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنے نظریۂ حیات سے عملاً وابستہ ہوجائیں تاکہ ان کے اندر ان اسباب دنیا کے حصول کی قدرت پیدا ہوجائے۔

رہا یہ سوال کہ اسلامی اصولوں پر عمل سے ان اسباب کے حصول کی صلاحیت کیسے پیدا ہوتی ہے؟ یا ان وسائل ترقی کا استنباط قرآن وسنت سے کیسے ہوتا ہے؟ یا مذکورہ نقطۂ نظر سے ہر شعبہ زندگی میں اصلاح کے لیے کن اقدامات کی ضرورت ہے؟ تو یہ ایک تفصیلی بحث ہے جس کے لیے دیکھیے ہماری کتاب 'مسلم نشأۃ ثانیہ ـــ اساس اور لائحہ عمل' اور 'اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش'۔

تعارف کتاب پروفیسر ارشد جاوید

مسلمانوں کا ہزار سالہ عروج

سیاسی، سائنسی، طبی، علمی

وہ دور اب بھی آسکتا ہے

اس کتاب کے مؤلف پروفیسر ارشد جاوید صاحب اگرچہ ماہر نفسیات کے طور پر معروف ہیں لیکن وہ نہ صرف استاد ہیں بلکہ اسلامی درد رکھنے والے دانشور بھی ہیں جو امت مسلمہ کی نشاۃ ثانیہ کی آرزو رکھتے ہیں۔ یہ کتاب انہوں نے اسی جذبے سے مرتب کی ہے کہ اپنے ہم وطنوں کو بتاسکیں کہ ہم وہ امت ہیں جس کے اسلاف نے اسلام کے سنہری اصولوں پر عمل کرکے ایک ہزار سال تک دنیا میں اپنی برتری اور بالادستی کے جھنڈے گاڑے ہیں اور یہ تفوق محض سیاسی اور حربی نہ تھا بلکہ مسلم تہذیب نے زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں، خصوصاً سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبے میں۔

اس کتاب کے آغاز میں پروفیسر صاحب نے مسلمانوں کے سیاسی عروج، ان کی علم دوستی، سائنسی ترقی میں ان کے کردار اور ایجادات وانکشافات میں ان کے انہماک و کارکردگی کے ذکر کے بعد ہر شعبۂ علم میں ان کی پیش رفت کے ثبوت اور تفصیلات فراہم کی ہیں اور کیمسٹری، فزکس، میکانیات، معدنیات، نباتات، زراعت، حیوانات، ریاضیات، فلکیات، جغرافیہ، میڈیسن، تاریخ نویسی، فلسفہ، ادب، علم موسیقی، تعمیرات اور جہاز رانی کے بارے میں الگ الگ بحث کی ہے۔

اس کتاب کے ذریعے پروفیسر صاحب نے امت کو عموماً اور نوجوانوں کو خصوصاً یہ پیغام دیا ہے کہ مسلمانوں کی ترقی وعظمت کا وہ دور پھر لوٹ کر آسکتا ہے اگر وہ ازسرنو اپنے نظریۂ حیات سے سنجیدگی سے وابستہ ہوجائیں اور علم دوستی، مطالعہ وتحقیق اور محنت کو اپنا شعار بنالیں۔

یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر مسلمان نوجوان اس کا مطالعہ کرے اور یہ ہر لائبریری میں موجود ہو تاکہ نئی نسل نہ صرف اپنے ماضی پر فخر کرنا سیکھے بلکہ اسے اپنے مستقبل کے لیے زادراہ بھی بنا سکے۔۱۹۲ صفحات کی اس کتاب کی قیمت ۲۰۰ روپے ہے اور یہ علم وعرفان پبلیشرز، الحمد مارکیٹ، ۴۰۔اردو بازار لاہور سے مل سکتی ہے۔

البرہان کے قارئین کی خدمت میں

البرہان کے مضامین پر تبصرہ آپ کا حق اور ہماری ضرورت ہے۔ جب تک آپ کمزور مضامین پر تنقید نہ کریں، اچھے مضامین کو نہ سراہیں اور پرچے میں جو کچھ دیکھنا چاہتے ہیں اس سے ہمیں آگاہ نہ کریں تو ہم اسے بہتر نہیں بنا سکتے لہٰذا بلا تکلف قلم اٹھایئے اور اپنی رائے سے ہمیں آگاہ کیجیے۔

اب جبکہ البرہان کا مزاج اور دلچسپی کا دائرہ اہل علم وفضل کے سامنے آچکا ہے کہ اسے جدید اور دینی تعلیم، تربیت وتزکیہ، میڈیا، مغربی تہذیب کی تفہیم اور ردّ اورفرد ومعاشرہ کی اصلاح سے دلچسپی ہے تو ہم ان سے درخواست کریں گے کہ وہ البرہان کے لیے لکھیں۔ ظاہر ہے کہ ان امور میں البرہان کی ایک رائے ہے لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ رائے اس طرح حرف آخر نہیں ہے جس طرح قرآن وسنت حرف آخر ہیں بلکہ یہ ایک انسانی کاوش ہے جو غلط بھی ہوسکتی ہے اور جس سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری نہیں کہ آپ البرہان کی پالیسی کی حمایت ہی میں لکھیں بلکہ آپ اس سے اختلاف بھی کر سکتے ہیں اور اگر آپ کا اختلافی نقطۂ نظر شائستگی، متانت اور دلائل پر مبنی ہوا تو البرہان اسے شائع کرنے میں نہیں ہچکچائے گا بلکہ ہم تو آپ سے یہ بھی توقع رکھتے ہیں کہ آپ پرچے اور اس کے علمی و اصلاحی مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے لیے موزوں مضامین کی تلاش و انتخاب میں ادارتی عملے کی رہنمائی ومعاونت فرمائیں۔

اگر پرچہ آپ تک پہنچ رہا ہے اور آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی نہیں ہے تو ازراہ کرم ہمیں مطلع فرمائیں تاکہ یہ کسی موزوں تر فرد تک پہنچ سکے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ پرچہ آپ کو باقاعدگی سے ملتا رہے تو بھی ہمیں اپنی دلچسپی سے آگاہ فرمائیں ورنہ اس کی فراہمی کسی بھی وقت معطل ہوسکتی ہے۔ اور اگر آپ پرچہ اپنے کسی دوست یا عزیز کو بھجوانا چاہتے ہیں تو بھی ہمیں اس کے ایڈریس سے مطلع فرمائیں۔

نیز اگر آپ چاہتے ہیں کہ البرہان جاری رہے تو اس کی انتظامیہ کا مالیات میں ہاتھ بٹائیں۔ خود بھی خریدار بنیں اور اپنے احباب کو بھی توجہ دلائیں۔ جزاکم اللہ خیرا۔

سراج محمود ناصر
مدیر انتظامی امور

ڈاکٹر محمد امین

پاکستان میں تعلیمی، اخلاقی اور سماجی تحریک کی ضرورت جو غیر سیاسی ہو

ہم نے البرہان کے مارچ اور اپریل ۲۰۱۱ء کے شماروں میں مذکورہ بالا موضوع پر سیر حاصل بحث کی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۔ پاکستانی معاشرہ جس بحران کا شکار ہے وہ ہمہ جہتی ہے: دینی و اخلاقی، سیاسی و معاشی، تہذیبی اور معاشرتی۔۔۔

۔ حکمران سیاسی قوتیں شعوری و لاشعوری دونوں سطحوں پر اس بحران کو پیدا کرنے اور بڑھانے میں لگی ہوئی ہیں کیونکہ اپنے ذاتی و گروہی مفادات کے لیے اقتدار انہیں بہرحال چاہیے اور اس کے لیے وہ اسلام، مسلم اور پاکستان دشمن مغربی اقوام کے ایجنڈے پر عمل کرنے کے لیے تیار ہیں بلکہ اس پر عمل کر رہی ہیں ـــــ اور مستقبل میں بھی ان کے اس روش سے باز آنے کے امکانات نظر نہیں آتے کیونکہ وہ مذکورہ مغربی طاقتوں کے ایما اور مدد سے پاکستانی عوام کو جاہل رکھنے اور بیوقوف بنانے میں کامیاب ہیں۔

۔ دینی سیاسی قوتیں منتشر اور کمزور ہیں اور وہ اسلامی مفادات کے حصول اور مغرب و مغرب پرست قوتوں کے لادینی ایجنڈے کے رد کے لیے متحد و منظّم ہو کر کام نہیں کر سکیں اور نہ ہی خود کو مذکورہ سیاسی مافیا کے مقابلے میں عوام کے لیے قابل قبول مترادف کے طور پر سامنے لانے میں کامیاب ہو سکی ہیں۔

۔ دعوت و اصلاح کے میدان میں کام کرنے والی تحریکیں اور تنظیمیں سادگی سے بعض بنیادی اسلامی باتیں عوام تک پہنچانے ہی کو آخری ہدف سمجھتی ہیں اور وہ دین کے اعلیٰ اور وسیع تر مفادات اور عملی زندگی پر ان کے انطباق سے عدم اعتناء کی پالیسی پر گامزن ہیں۔ انہیں مغربی تہذیب کی ہلاکت اور اس کی اسلام دشمن پالیسیوں اور اقدامات کے ضرر کا احساس ہی نہیں اور نہ ہی وہ مغربی قوتوں اور ان کے مقامی مہروں کی لادین پالیسیوں سے مسلم عوام کو بچانے کے لیے کوئی لائحہ عمل رکھتی ہیں۔

ان حالات میں اسلام اور پاکستان سے محبت رکھنے والے اور اصلاح احوال کے خواہاں افراد کے لیے ہماری رائے میں یہی راستہ رہ جاتا ہے کہ وہ متحد اور منظّم ہو کر تعلیم، میڈیا اور اصلاح اخلاق کے لیے اور ان کے ذریعے اس طرح کام کریں کہ مسلم عوام کی معاشی، معاشرتی، قانونی اور سماجی مشکلات و

مسائل بھی حل ہو جائیں اور ان کے دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی کا راستہ کھلے۔

اور یہ سارے کام ان آئینی و قانونی حدود کے اندر رہ کر کیے جائیں جن کی آئین پاکستان اجازت دیتا ہے۔ مندرجہ بالا شعبوں میں کیا کیا کام کیے جا سکتے ہیں اور کس طرح کیے جا سکتے ہیں اس کی تفصیلات بھی ہم سابقہ سطور میں دے چکے ہیں۔

تلخیص بحث

اس بحث کو سمیٹتے ہوئے ہم عرض کرتے ہیں کہ:

۔ اس طرح کی تحریک سے احکام شریعت پر عمل ہوگا جو دنیا و آخرت میں کامیابی کے لیے ہر مسلمان کی ضرورت ہے۔ اور یہ پروگرام ایک لحاظ سے مسلم حکمرانوں کی طرف سے شریعت نافذ نہ کرنے کا متبادل بھی ہے کہ اگر تم نفاذ شریعت کی اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتے تو ہم خود جس حد تک شریعت کا نفاذ اپنے اوپر کر سکتے ہیں وہ کر رہے ہیں۔

۔ اس سے ہماری دنیاوی مشکلات کم ہوں گی اور ہمارے مسائل حل ہوں گے۔ اور اس سے بڑھ کر بھلائی اور نیکی کیا ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کو دکھوں اور تکلیفوں سے نجات دلانے کی کوشش کی جائے۔

۔ اگرچہ یہ تحریک غیر سیاسی انداز سے کام کرے گی لیکن اس کا فائدہ بہرحال دینی سیاسی جماعتوں کو ہوگا اور ان کا ووٹ بنک بڑھے گا کیونکہ اس تحریک کے اپنے تو کوئی سیاسی اہداف ہوں گے نہیں اور نہ یہ دینی سیاسی جماعتوں کی مخالفت کرے گی البتہ اس کی سرگرمیوں کی وجہ سے عوام میں دینی شعور بڑھے گا اور اسلامی نظام زندگی کے لے ان کی تڑپ بڑھے گی اس لیے سیاسی لحاظ سے اس کا فائدہ دینی سیاسی جماعتوں کو ہی ہوگا۔

۔ ہم کوئی بہت انوکھی، نرالی اور تصوراتی قسم کی بات نہیں کہہ رہے جو قابل عمل نہ ہو۔ ہماری مجوزہ تحریک سے ملتا جلتا کام ترکی اور انڈونیشیا میں ہو رہا ہے اور بہت مؤثر اور مفید ثابت ہوا ہے۔ تاہم ہر معاشرے اور ملک کے مخصوص حالات ہوتے ہیں لہٰذا کسی بیرونی تحریک یا تنظیم کی نہ تو پوری نقل کی جا سکتی ہے اور نہ کرنی چاہیے۔

ہم آخر میں البرہان کے قارئین اور خصوصاً اہل علم و فضل سے درخواست کریں گے کہ وہ ہماری اس تجویز کے حسن و قبح پر تبصرہ فرمائیں۔ ہم اس کے حق میں اور اس کے خلاف لکھی جانے والی دونوں طرح کی شائستہ اور مدلل تحریروں کو البرہان میں شائع کریں گے، ان شاء اللہ۔

امریکی غلامی سے اللہ کی پناہ

ہماری اشرافیہ کی اکثریت مغرب زدہ اور اعلیٰ اخلاقی اصول واقدار سے محروم ہے۔ یہ بات تو سب کو معلوم تھی لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ اقتدار، ملازمت اور پیسے کی خاطر یہ لوگ ذہنی غلامی کے مرحلے سے گزر کر ملت اور وطن فروشی کی حد تک گر جائیں گے لیکن افسوس کہ ہماری بدقسمت آنکھیں یہ سب کچھ دیکھ رہی ہیں اور نہ زمین پھٹتی ہے اور نہ آسمان گرتا ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ہماری سیاسی اور عسکری قیادت نے امریکہ و یورپ کی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگ میں ان کا حلیف بننا قبول کیا، مسلمان ہمسایہ ملک کو کچلنے میں ان کی مدد کی اور آج تک کر رہے ہیں۔ اپنی زمین، فضا اور سمندر ان کے حوالے کر دیے، انہیں اڈے، لاجسٹک اور انٹیلی جنس سپورٹ مہیا کی۔ ان کے کہنے پر قبائلی علاقوں پر حملے کیے، انہوں نے اسرائیل، روس، افغانستان اور بھارت کو ساتھ ملا کر پاکستان کے خلاف گوریلا جنگ شروع کر رکھی ہے، بلوچستان کو باقی ملک سے کاٹا اور توڑا جا رہا ہے، ڈرون حملے ہو رہے ہیں، اور اب دشمن نے ایبٹ آباد پر حملہ کر کے ان کی خوئے غلامی پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ کون کہتا ہے کہ پاکستان ایک آزاد اور خود مختار ملک ہے؟ کیا آزاد اور خود مختار ملک ایسے ہوتے ہیں؟

پھر یاد رکھیے کہ ہمارا قصور بڑا ہے۔ امریکہ و یورپ نے عراق کو غلام بنا کے چھوڑ دیا، کویت کو غلام بنا کر چھوڑ دیا لیکن ہمیں وہ غلام بنا کر بھی نہیں چھوڑے گا۔ اس لیے کہ ہم نے اس ملک کو اسلام کے نام پر بنایا اور اسے اسلام کا قلعہ بنانے کا اعلان کیا اور اگرچہ ہم اسے اسلام کا قلعہ نہیں بنا سکے لیکن ہمارے عوام اور دینی عناصر اس دعوے سے دست بردار ہونے کو آج بھی تیار نہیں اور پھر ہم ان کی مرضی کے خلاف ایٹمی قوت بھی بن گئے۔ یاد رکھیے ہمارے وجود کا ازلی دشمن بھارت بھی ان کے ساتھ ہے لہٰذا ہمارے دشمن ہمارا ایٹمی اسلحہ تباہ کر کے یا اس پر قبضہ کر کے بھی ہمیں نہیں چھوڑیں گے بلکہ وہ ہمارا ملک توڑنا چاہتے ہیں، ہمارا نام ونشان مٹانا چاہتے ہیں۔ (اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے شر سے بچائے اور انہیں تباہ و برباد کرے)۔

اب بچنے کی ہمیں تو ایک ہی صورت نظر آتی ہے کہ جو لوگ اس صورت حال کی نزاکت کو سمجھ رہے ہیں (اور ماشاء اللہ وہ بہت ہیں) وہ متحد ہو کر متحرک ہو جائیں۔ اور عوام کو اپنے ساتھ ملائیں اور موجودہ سیاسی وعسکری قیادت سے جان چھڑائیں اور اُن کے بعد اور ان کے بغیر ملک چلانے کا انتظام کریں کیونکہ جب تک موجودہ سیاسی اور عسکری قیادت موجود رہے گی امریکی غلامی سے نہ نکلا جا سکے گا کیونکہ وہ یہ غلامی قبول کر چکے ہیں۔ کرنے کا کام اب صرف وہ ہے جو ہم نے عرض کیا ہے باقی قراردادیں، کمشن، وعدے، نعرے یہ سب لیپاپوتی اور status quo بحال رکھنے کی براہ راست یا بالواسطہ کوششیں ہیں۔

اے اللہ! ہم آپ کی پناہ چاہتے ہیں امریکی غلامی سے اور امریکی غلاموں سے!

تزکیۂ نفس

احمد جاوید

خودنمائی وخود بینی ـــــ مضرات وعلاج

فرمان نبوی

۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ کو غیرت آتی ہے اور اللہ کی غیرت یہ ہے کہ آدمی وہ کام کرے جو اللہ نے اس پر حرام کیا ہے۔(متفق علیہ)

[غیرت یہاں اس غضب کا نام ہے جو بے وفائی یا بغاوت پہ آئے۔ اللہ کی غیرت سرکشی، بغاوت اور بے وفائی پر جوش میں آتی ہے]۔

۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ ایک مجلس میں لوگوں سے محو گفتگو تھے کہ ایک دیہاتی آیا اور اس نے پوچھا قیامت کب آئے گی؟ آپ ﷺ گفتگو فرماتے رہے۔ لوگوں میں سے کسی نے کہا دیہاتی نے جو کچھ کہا ہے وہ آپ ﷺ نے سن تو لیا ہے لیکن اسے پسند نہیں فرمایا۔ کچھ نے کہا سنا ہی نہیں۔ یہاں تک کہ جب آپ ﷺ نے اپنی بات مکمل فرمائی تو فرمایا قیامت کے بارے میں پوچھنے والا کہاں ہے؟ پوچھنے والے نے عرض کیا میں حاضر ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا جب امانت ضائع کی جائے تو قیامت کا انتظار کرو۔ اس نے پوچھا امانت کا ضائع کرنا کیسے ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا جب دین و دنیا کا معاملہ نااہل لوگوں کے سپرد کردیا جائے تو قیامت کا انتظار کرو۔(صحیح بخاری)

۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کو شہروں کے تمام حصوں میں سب سے زیادہ محبوب وہ حصے ہیں جن میں مسجدیں ہیں اور سب سے زیادہ ناپسند حصے ان کے بازار ہیں۔(صحیح مسلم)

۔ حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: اگر تو طاقت رکھے تو سب سے پہلے بازار میں داخل ہونے والا اور سب سے آخر میں نکلنے والا ہرگز نہ بن اس لیے کہ یہ شیطان کا اڈہ ہے اور اس میں وہ اپنا جھنڈا نصب کرتا ہے۔

....

آج ہم کوشش کریں گے کہ ایک ایسے مرض پر بات کریں اور اس کا علاج ڈھونڈیں جو دور جدید میں زیادہ خطرناک صورت اختیار کرگیا ہے۔ جدید زندگی کی بناوٹ ایسی ہوگئی ہے کہ اس میں شامل

رہنے کے لیے اس مرض میں مبتلا رہنا، لگتا ہے کہ ناگزیر ہوگیا ہے اور وہ مرض ہے خود بینی اور خود نمائی۔ اس مرض کا تعلق تکبر کے خاندان سے ہے۔ تکبر تمام گناہوں کی جڑ ہے اور یہ شرک ہے۔ اس تکبر کے بیج سے جو چیز بھی پیدا ہوگی اس میں شرک کا عنصر ضرور ہوگا۔ اس میں گناہ کی مشرکانہ صورت ضرور ہوگی۔ گناہ تو دیگر بھی بہت سے ہیں ممکن ہے ان گناہوں میں کہیں بے بسی شامل ہو، کہیں کمزوری داخل ہو۔ تکبر جیسی خطرناک بیماری کا لازمی عنصر ہوتا ہے دوسروں کو حقارت کی نظر سے دیکھنا اور حقارت کی نظر سے دیکھنے میں صرف اتنا نہیں ہے کہ وہ کوئی گھٹیا کام کر رہے ہیں اور آپ انہیں حقارت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ بلکہ یہ بھی کہ دوسرے چونکہ مجھ سے بہت چھوٹے ہیں لہٰذا ان کے ساتھ تحقیر کا رویہ اختیار کرنا فطری ہے۔ جس کو بھی اللہ کے فضل سے اپنا تزکیہ مطلوب ہے وہ یہ بات جان لے کہ حقارت سے دیکھنا چاہے سبب سے ہو چاہے بلاسبب ہو یہ تکبر کی نشانی ہے۔ یعنی آپ کے پاس کسی کی حقارت کا کوئی سبب بھی اگر ہو اور اس سبب کی آڑ لے کر آپ اس کی تحقیر کریں (جیسے اللہ کا نام لے کر اس کی تحقیر کریں) تو اس کا قوی امکان ہے کہ جس خرابی کی بنیاد پر آپ اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں اس سے کہیں بڑی خرابی میں آپ خود مبتلا ہیں۔

تکبر کا یہ لازمی عنصر یعنی دوسروں کو حقارت کی نظر سے دیکھنا خود بینی اور خود نمائی میں پوری طرح کارفرما ہوتا ہے۔ خود بینی کہتے ہیں ہر صورت حال میں اپنی بڑائی اور اپنے مفاد کو ترجیح دینا یعنی خود ہی کو دیکھتے رہنا۔ زندگی گویا آئینے کے سامنے کھڑے ہو کے گزار دینا۔ اور یہ بھی کہ اگر کوئی ماحول اس کی بڑائی کو قبول نہ کرے تو وہ اس ماحول سے نکل جائے یا اس میں فساد برپا کر دے۔ دوسرا یہ کہ ہر صورت میں اپنے مفاد کو، اپنی راحت کو، اپنے فائدے کو مقدم رکھنا۔ یعنی جہاں ہم ۲۰ آدمی ہیں تو یہاں کسی ایک آدمی کو ایثار کرنا چاہیے کیونکہ کھانا ۱۹ آدمیوں کا ہے تو اگر ۲۰ آدمیوں کے مجمع میں ہر شخص یہ پیش کش اور اصرار نہیں کرے گا کہ میرا پیٹ بھرا ہوا ہے تو وہ انسانی معاشرت کا کوئی فعال حصہ نہیں ہے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے بنائے ہوئے نظام تعلق کا کوئی کارآمد پرزہ نہیں ہے۔ خود بینی آپ ﷺ کی بنائی ہوئی معاشرت اور اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی گئی فطرت کے خلاف ہے۔ اللہ نے ہمیں اپنی طرف یکسو رہنے کے لیے بھیجا ہے اپنی طرف منہ کر کے کھڑا رہنے کے لیے نہیں بھیجا ہے۔ اگر کسی شخص میں خود بینی اور خود نمائی دونوں برائیاں اکٹھی ہوگئی ہیں کہ وہ ہر مجلس کا صدر بننا چاہتا ہے اور ہر فائدے کا لپک کر خودطلب گار ہے اور اس میں ایسی شدت ہے کہ کسی کے نقصان کی قیمت پر بھی اپنا فائدہ حاصل کرنے کو مقدم رکھتا ہے۔ کسی کی تکلیف کی اسے پرواہ نہیں ہے۔ کسی کے نام پر سیاہی لگ جائے اسے کوئی پرواہ نہیں

ہے۔ اسے اپنے نام کو سب سے اونچی جگہ neon sign کی طرح چمکاتے رہنا ہے۔ اگر یہ دونوں علامتیں کسی بے چارے میں جمع ہیں تو وہ یقیناً متکبر ہے۔ اس کا کوئی بھی وصف قابل اعتبار نہیں ہے۔

اور پھر جس آدمی کو صرف اپنی بڑائی عزیز ہوگی وہ بڑائی کو ثابت کرنے والی صلاحیتیں بھی حاصل کرے گا۔ وہ خوب قابلیت بھی پیدا کرے گا کہ اسے اپنا مفاد عزیز ہوگا۔ وہ اس مفاد تک پہنچنے کے راستے ہم سب کے مقابلے میں زیادہ جانتا ہوگا۔ اس میں ذہن بھی بہت ہوگا، صلاحیت (skill) بھی بہت ہوگی تو گویا یہ شخص بڑے بڑے اوصاف، بڑی بڑی فضیلتیں حاصل کرتا ہے۔ یہ شخص تہجد کو دو گھنٹہ تک چلا دینے کی مشق رکھتا ہے۔ یہ شخص ہر رکعت میں سو آیتیں پڑھنے کی پریکٹس رکھتا ہے۔ اور یہ شخص دنیا کے اندر فائدہ پہنچانے کی جتنی openings ہیں ان سب کو اندر سے جھانکنے والی نظر اور قابلیت بھی رکھتا ہے۔ ان تمام اچھی باتوں کو اس نے حاصل اس لیے کیا ہے کہ یہ وہ دوسروں کے مقابلے میں خود کو بڑا بنادے تاکہ اس کی بڑائی کا دعویٰ claim دوسروں کے لیے سہولت سے قابل قبول ہوجائے۔ اور یہ کہ یہ دوسروں کے مقابلے میں اپنے مفادات تک زیادہ تیزی سے دوڑ کر انہیں حاصل کرسکے۔ تو یہ چیز جدید آدمی کا مرض ہے۔ جن لوگوں نے بھی جدید زندگی کو اختیار کر رکھا ہے۔ چاہے نوکری کی سطح پر، چاہے پسند ناپسند کی سطح پر اور چاہے تعلیم کی سطح پر۔ ان پر اللہ کا کوئی خاص کرم ہو تو شاید وہ اس خود بینی سے بچ گئے ہوں ورنہ جدید تعلیم سے لے کر جدید معاشرت تک سب میں یہ تاثیر پائی جاتی ہے کہ وہ آدمی کو خود بینی میں مبتلا کر کے رہتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ جدید تعلیم کا خاصہ خود بینی کیوں ہے؟ جدید تعلیم مارکیٹ کی مسابقت (market competition) پہ کھڑی ہے۔ انسانوں میں مسابقت ہوتی ہے۔ یہ ماحول بھی فطری ہے اور یہ دوڑ بھی فطری ہے۔ لیکن جدید تعلیم میں یہ مسابقت بنیوں جیسی ہے۔ یہاں ہر علم اپنے آخر پر ایک پروانۂ ملازمت (appointment letter) کے حصول کا نام ہے جبکہ ہمارے روایتی نظام تعلیم میں سبقت لیتے تھے اخلاقی طور پر۔ اب جدید زندگی دکھاوے پر کھڑی ہے۔ جدید تعلیم شکاری کتوں کی دوڑ ہے۔ جدید زندگی کی تمام اقدار دکھاوے کی ہیں۔ جو آپ نہیں ہیں وہ pose کریں۔ آپ امیر ہیں نہیں، امارت pose کریں۔ آپ ذہین ہیں نہیں لیکن کانٹ اور افلاطون آکر آپ سے اپنا فلسفہ بیان کریں تو آپ بہت سر پرستانہ انداز میں سر ہلائیں کہ ہاں ٹھیک کہہ رہے ہو۔ آپ بااخلاق ہیں نہیں لیکن اخلاق pose کر رہے ہیں کہ بہت نرم گفتار ہیں، بہت شریں کلام ہیں۔ اخلاق جتنا دنیا کا material بن سکتا ہے وہ اس جدید زندگی کا اسم اعظم ہے اسی لیے اس زندگی میں

صلاحیت اور حمیت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔

اخلاق کہتے ہیں مضبوطی کے ساتھ نرم دلی کو۔مطلوب اخلاق یہ ہے کہ مضبوط آدمی کا دل نرم ہونا چاہیے۔حق کے ساتھ وفادار اور خلق کے ساتھ شفیق، یہ ہے اخلاق۔اخلاق وہ انداز تعمیر ہے جس میں حسن بھی ہو اور مضبوطی بھی ہو۔صاحب اخلاق وہ ہے جس سے حق کا دشمن خوف زدہ رہے اور کبھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونے پائے کہ یہ بھی ہماری طرح ہے یا اس کا اور ہمارا کسی قیمت پہ اتفاق ہوسکتا ہے۔اور اسی طرح اس کا دوست اس کی طرف سے بے فکر رہے۔دشمنوں پر ہیبت اور دوستوں کی تسکین کا ذریعہ ہونا یہ آپ ﷺ کا برتا ہوا اخلاق ہے جس کو قرآن نے آئیڈیل کی شکل دی ہے۔ جدید زندگی نے مضبوطی کے تمام عناصر کو بازار کی قربان گاہ پہ پچھاڑ کر ان کا گلا کاٹ دیا ہے۔جدید آدمی مضبوطی کے تمام غیر شخصی مقاصد کو بھول چکا ہے۔اس کے لاشعور میں بھی یہ نہیں رہا کہ میرے لیے مضبوطی کی بنیاد حق ہے، میں خود نہیں ہوں یا یہ بازار نہیں ہے یا میرے یہ ادنیٰ اور گھٹیا مقاصد نہیں ہیں کہ میں ان کی طرف صاحب استقامت ہوکر دکھاؤں۔تو یہ آدمی بازار کے ٹائم کا اتنا ہی پابند ہے جتنے صدیقِ اکبرؓ اپنے معمولات عبادت کے تھے۔یعنی جدید کامیاب آدمی پابندیٔ وقت (punctuality) کی اعلیٰ ترین سطح پر ہے اور پابندیٔ وقت کی عین اسی سطح پر ہے جس سطح پر صحابہ، اولیاء اللہ اور آئمہ ہوتے تھے لیکن اس کی ساری (punctiality) کا محور دنیا ہے۔اور دنیا کا مرکز خود اس کی ذات ہے۔اس نے اللہ کی طرف سے بندگی کے لیے فراہم کی گئی تمام قوتوں کو دنیا پر نثار کر کے اس میں خود کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔اس کے اندر اس طرح کے جذبات، احساسات اور تصورات رہ ہی نہیں گئے جو اس کی نفی کر سکیں۔خود اس کی نظر میں جدید آدمی cross لگانے کے سو طریقے سیکھ کر آیا ہے، کچھ فلسفے سے اور کچھ سائنس سے۔''نہ'' کہنے کے ہزار طریقے یہ جانتا ہے اور نہیں جانتا تو اپنی نفی کا کوئی طریقہ نہیں جانتا۔تو وہ آدمی انسان نہیں ہے محض ایک جاندار (biological being) ہے جو اپنی نفی کرنے کا مسلسل اظہار نہیں کرتا رہتا۔خود بینی اس بنیادی انسانی ضرورت کے خلاف ہے کیونکہ جب آپ اپنی نظر میں رہنے کے عادی ہوجاتے ہیں تو آپ اپنی نظر کا ہدف بنے رہنے کے لیے make up بہت سارے کرتے ہیں۔جدید آدمی کی الماری میں دو چار سو نقابیں ہوتی ہیں جو وہ روز پہن کر نکلتا ہے۔یہ وہ بدنصیب مخلوق ہے جس نے اپنے آپ کو اپنے لیے خالی کیا ہوا ہے۔ایک خالی ہیولیٰ اور ایک وہمی وجود کو ''میں'' کہہ کر اس کی طرف متوجہ ہے۔اس نے خود بینی (self abstraction) کی انتہا کر دی ہے۔اس کی کوئی ٹھوس چیز جبلی اور حیوانی سطح

سے اوپر کی نہیں ہے۔ محض جبلت پر کاربند رہنے کے لیے خود کو اور دوسروں کو دینے کے لیے دھوکہ ہے کہ دیکھتے نہیں ہو میں نے NGO بھی بنا رکھی ہے۔ دیکھتے نہیں ہو کہ میں نے گلی کی نکڑ پہ ڈسپنسری بھی بنا رکھی ہے۔ تم دیکھتے نہیں ہو میرے پانچ مقالے فلاں رسالے میں چھپ چکے ہیں—— تو یہ زندگی کے انسانی سطح کے اعمال کا جو بھی شبہ پیدا کرتا ہے ان کا اس کے حقیقی وجود کی تعمیر میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔

خودنمائی

خود بینی کی جڑواں بہن ہے خودنمائی۔ خود بینی خود پر خود کو impose کرنا ہے اور خودنمائی خود کو دوسروں پہ impose کرنا ہے۔ دنیا میں ایک آدمی ہمارے پاس ہمیشہ موجود ہے وہ ہمیں خدا ماننے کو بھی تیار ہے، نبی ماننے کو بھی تیار ہے، عظیم فاتح ماننے کو بھی تیار ہے، خلاصۂ وجود ماننے کو بھی تیار ہے۔ ہر آدمی کے پاس ایک ایسا آدمی ضرور ہے اور وہ، وہ خود ہے۔ اس مسخرے نے اپنی اس طرح کی فرضی شکل خود کو باور کرا رکھی ہے کہ یہ اس کا make up کر کے دوسروں سے اصرار کرتا ہے کہ تو بھی میرے self image پر ایمان لے آ۔ یہ اپنی جھوٹی self image کو دوسروں کے لیے binding بناتا ہے کہ میں خود کو کیونکہ آئن سٹائن سے بڑا سائنس دان سمجھتا ہوں لہٰذا دیکھتے نہیں ہو کہ میں نے سفید کوٹ بھی پہن رکھا ہے، اس کی طرح بال بھی اوپر کر رکھے ہیں اور مجھے حساب وغیرہ بھی آتا ہے لہٰذا تم پر لازم ہے کہ تم بھی اسی یقین سے اس حقیقت کو مانو جس سے میں خود کو مانتا ہوں۔ اور جتنی آپ مزاحمت کریں گے وہ اس کا نتیجہ یہ نکالے گا کہ آپ میں اس جیسی پہچان نہیں ہے کیونکہ آپ چھوٹے لوگوں میں رہنے کے عادی ہیں۔ تو جو عظمت وہ رکھتا ہے اس کا کوئی تجربہ، مشاہدہ اور علم آپ کو حاصل ہی نہیں ہوا تو آپ اس لیے اس کو پہچاننے سے قاصر ہیں تو وہ آپ سے مسکرا مسکرا کے ملتا رہے گا۔ ہوسکتا ہے ناراض نہ ہو، یہ ہے وہ تحقیر جس کا ہم ذکر کر رہے تھے۔ دنیا میں اجتماعی سطح پر انسانوں کے ساتھ ایسا تمسخر کبھی نہیں ہوا جیسا تمسخر جدیدیت نے آئینِ دنیا بنا کر دکھا دیا ہے۔ وہ تمسخر یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو وہ دیکھو جو تم نہیں ہو اور دوسروں کو بھی وہی معدوم چہرہ دکھاؤ اور اسی پر اصرار کرو کہ میں یہ ہوں وہ نہیں ہوں۔

خود بینی اور خودنمائی ایک ہی آدمی کے دو امراض ہیں۔ اگر ہمیں ان سے بچنا ہے کہ جھوٹی آنکھ سے خود کو نہیں دیکھنا اور دوسروں سے بھی نہیں لڑنا کہ تم اپنی آنکھ نکال کر میری بنائی ہوئی وہ آنکھ اپنے سر میں لگا لو جو غیر موجود کو موجود دیکھتی ہے اور موجود کا انکار کرتی ہے۔ پوری جدیدیت اسی اصول پر کھڑی ہے کہ موجود کا انکار کرو اور معدوم کا اثبات کرو۔

یہ ایک بہت بڑی روایت ہے کہ حاضر کو دکھاؤ اور غائب کو چھپاؤ لیکن ان مسخروں نے آئیڈیلز کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ اب اگر اس ماحول میں جس میں ہر طرف ایک بیماری پھیلی ہو مثلاً الرجی ہی کو لے لیں اور ایک آدمی آ کر کہتا ہے کہ مجھے تو کبھی چھینک بھی نہیں آئی تو ایسے آدمی پہ شک کرنے کا ہمیں حق حاصل ہے۔ آج کی دنیا میں کوئی شخص اگر خودنمائی اور خود بینی سے بچا ہوا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو اس پہ شک کا ہمیں حق حاصل ہے۔ مدرسے اور یونیورسٹی میں پڑھانے والے دونوں ایک ہی پھندے کے دو رنگ کے قیدی ہیں، وہ ہے جدیدیت کا پھندا۔ اور جس پر اپنی یہ بیماری واضح نہیں وہ الرجی زدہ علاقے میں ماسک پہن لے کہ کل چھینک آ سکتی ہے۔

خود بینی اور خود نمائی کا لازمی عنصر ہے تنقید کو ناپسند کرنا خواہ ایسا شخص market manners کے طور پر لوگوں سے ہنس ہنس کر ملتا رہے۔ اس مزاج کی دو عمومی نشانیاں ہیں: ایک یہ کہ غصہ آئے دوسرا یہ کہ آپ کا اور میرا تعلق ویسا نہ رہے جیسا تنقید سے پہلے تھا۔ اور تیسری چیز شیطان کے خاص مصاحبین کو ودیعت ہوتی ہے کہ آپ نے مجھ پر سخت تنقید کر دی تو میں آپ کے پاس پہلے پندرہ دن میں ایک دفعہ آتا تھا اب ہفتے میں ایک دن آنے لگوں گا۔ آپ کے گلے میں ہاتھ ڈال ڈال کر تصویریں کھنچواؤں گا۔ آپ کے بچوں کو باور کراؤں گا کہ میں تمہارے باپ کا عاشق ہوں اور یہ سب کچھ عناد کے ساتھ ہوگا اور اس جذبے کے ساتھ ہوگا کہ میری کیا شان ہے کہ میں ایسے گھٹیا ناقدوں اور دشمنوں کے ساتھ بھی حسن سلوک کرتا ہوں۔

تنقید کا غلط اور درست ہونا بعد میں دیکھا جاتا ہے لیکن پہلا تاثر اگر ناگواری کا ہے تو یہ خود بینی ہے۔ اور میں چونکہ ٹوپی پہن کے باہر نکلتا ہوں تو اگر دوست ملنے آ جائے اور ٹوپی نہ پہن رکھی ہو تو پہلے اس سے زیادہ فاصلہ طے کر کے ٹوپی پہنوں گا اور پھر اس سے ملوں گا تو یہ خودنمائی ہے۔

اسی طرح اگر میں آپ کے سوال کا جواب دینے کی اہلیت نہیں رکھتا لیکن میں اس سوال کا جواب نہ دے سکنے کا اظہار کرنے کی بجائے اس کو ٹالوں یا غلط سخن سازی کروں اور کبھی ایسا نہ کروں کہ آپ سے کہوں کہ بھائی یہ سوال میری سمجھ میں نہیں آیا یا میری سمجھ میں تو آ گیا ہے لیکن اس کا جواب میرے ذہن سے اونچا ہے۔ اگر یہ ٹائپ ہے کہ آدمی مجیب کُل بنا ہوا ہے تو یہ خودنمائی ہے۔ آپ اگر کیمسٹری کا سوال مجھ سے پوچھنے آئیں گے تو مجھے ڈر جانا چاہیے کہ میرے اندر ایسی کیا خودنمائی ہے کہ آپ کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ میں کیمسٹری بھی جانتا ہوں۔ خودنمائی ہماری اصطلاح میں ''وبا'' ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ اپنے علاج یا حفاظت کا مسلسل اہتمام کرتے رہیں۔

اکتسابِ فضائل

احمد جاوید

فکرِ آخرت

آخرت کا تصور نہ ہو تو دین اور اس کے تمام عقائد و احکام بے معنی ہیں۔ بندے اور اللہ کے تعلق کی تمام بنیادیں اور تمام نتائج اس پر موقوف ہیں۔ ویسے بھی ہمارے دین کا مزاج یہ ہے کہ مسلمان کے لئے موت زندگی سے زیادہ اور آخرت دنیا سے زیادہ یقین اور حقیقی ہے۔ اس انتہائی ضروری عقیدے میں پختہ رہنے کے لئے اور اسے اپنی زندگی اور بندگی میں کمال پیدا کرنے والی قوت کے طور پر مستحضر رکھنے کے لئے ذہن، طبیعت اور عمل کا اس کی طرف یکسو رہنا ضروری ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے ئے چند فضائل کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے تو انشاء اللہ یہ عقیدہ ہمارے لئے ایک بہت بڑے اخلاقی محرک کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ حالت میں حاضر رہے گا اور ہماری شخصیت اپنے تمام اجزاء میں بندگی کے اصول پر مائل بہ ترقی حالت میں قائم رہے گی۔ وہ امور یہ ہیں:

- تعمیل احکام
- فکر آخرت
- موت سے وحشت نہ ہونا
- احساس ذمہ داری

تعمیل احکام

تعمیل احکام یعنی عمل صالح آدھا دین ہے۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ ایمان لانے کے بعد بھی نجات کے لئے اس کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے یہ تعمیل احکام ہی ہے جو آخرت کو بندے کے لئے حسی طور پر یقینی بناتی ہے اور بندگی کی ماہیت یعنی مجاہدہ وطاعت سے ہمیں وابستہ رکھتی ہے۔ یہاں جملۂ معترضہ کے طور پر یہ کہنا مناسب ہے کہ بندگی کے دو اجزاء ہیں۔ انہیں خوف اور امید کہہ لیں یا مجاہدہ اور طلب اجر کا نام دے لیں، بات ایک ہی ہے۔ دنیاوی زندگی میں مجاہدے کا غلبہ ہونا چاہئے اور آخرت میں عذاب سے بچنے یا اجر پانے کی امید ہونی چاہئے۔ محنت، مجاہدہ، سخت کوشش وغیرہ بندگی کے لوازم ہیں جن کے بغیر آدمی بندہ بننے کے تجربے سے نہیں گزر سکتا۔ احکام الٰہیہ کی بڑی مصلحت یہی

ہے کہ ہمیں بندگی کا وہ تجربہ میسر آ جائے جس کی بنیاد پر ہم اپنا بندہ ہونا باور کر سکیں۔

احکام اور ان کی تعمیل کا اصول فطری مسلمات میں سے ہے یعنی اس کی جو بھی تشریح کی جائے یہ اس سے زیادہ واضح ہے لہٰذا اس کی تعریف اور توضیح درکار نہیں۔ ہاں! اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ حکم ہمیشہ محکم ہوتا ہے، اس کی مراد واضح ہوتی ہے، اسے سمجھنے کی بجائے اس پر عمل کرنے کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اور تعمیل حکم کی اولیں شرط وہ ایثار ہے جس کی رو سے آدمی یہ کہنے اور سمجھنے میں سچا ہو سکتا ہے کہ میں اور میری خواہشات تصورات وغیرہ اللہ کے حکم اور مرضی کے آگے کوئی چیز نہیں۔ یہ سپرٹ نہ ہو تو تعمیل احکام کا داعیہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ قانونی زبان میں کہا جائے تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ اطاعت میں کوئی شرط نہیں۔ جدید ذہنیت اور طبیعت کو دیکھتے ہوئے اس اصول پر کوئی سمجھوتا نہیں کرنا چاہئے۔

اس سلسلے میں ایک بات یاد رہنی چاہئے کہ تعمیل احکام کا عمل اپنے دوران میں عموماً ناخوشگوار یا سخت ہوتا ہے اس کی تکمیل البتہ راحت واطمینان کی موجب ہوتی ہے۔ ابتدائی ناخوشگواری اور سختی کو اس ایثار کے بغیر نہیں جھیلا جا سکتا جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا۔ اس لئے اپنی جہت اطاعت کو مضبوط بنانے کے لیے سب سے پہلے اپنی توجہ اس طرف رکھنی چاہئے کہ تعمیل احکام میری وہ سب سے بڑی ضرورت ہے جو تکلیف اٹھائے بغیر پوری نہیں ہو سکتی۔ یہ خیال اگر پختہ ہو جائے تو اس عمل میں اخلاص اور یکسوئی شامل ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی آخرت کا تصور جو تکلیف کو گوارا بناتا ہے، اوجھل نہیں ہوتا۔

گویا آخرت کے حوالے سے تعمیل احکام کے دو بڑے فائدے ہیں۔ آخرت کی بہتری اور آخرت کا استحضار۔ ہمیں بس یہی درکار ہیں۔ احکام پر پوری طرح چلنے کا بیان ہم ان شاء اللہ فضائل اعمال میں کریں گے یہاں جو کچھ رہ گیا ہے اسے وہاں دیکھا جا سکتا ہے۔

فکر آخرت

یہ سادہ سا اصول ہے جس پر زیادہ گفتگو کی ضرورت نہیں۔ آخرت کا تصور دو طرح سے ہوتا ہے: یوم الحساب اور روز جزاء۔ معاد کے عقیدے کو اپنے لئے بامعنی اور حقیقی بنانے کے لئے یوم الحساب کے تصور کو غالب رکھنا زیادہ مفید ہو سکتا ہے۔ فکر آخرت اسی کا نام ہے۔

آدمی کے لئے یہ فطری بات ہے کہ وہ فائدہ حاصل کرنے کے مقابلے میں نقصان سے بچنے کی

زیادہ خواہش رکھتا ہے۔ اسی کے پیش نظر آخرت کی فکر دنیاوی زندگی میں زیادہ اثرات کی حامل ہے۔ اس فکر کو پیدا کرنے اور بڑھانے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آدمی موت کو کثرت سے یاد کرے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ روز رات کو سونے سے پہلے دن بھر کے اعمال کا محاسبہ کرے۔ غلطیوں پر استغفار کرے اور نیکیوں پر اللہ کا شکر بجا لائے۔ پہلا طریقہ آخرت کو براہ راست پیش نظر رکھنے کے قابل بناتا ہے اور دوسرا طریقہ آخرت کو زیادہ دیر تک بھولنے نہیں دیتا۔ آخرت کی یاد، اس کے دونوں پہلوؤں یعنی یاد رکھنا اور فراموش نہ کرنا، ان دو طریقوں سے دسترس میں آ جاتی ہے اور اس طرح آخرت کی یاد طبعی کے ساتھ ساتھ شعوری اور ارادی بھی بن جاتی ہے۔

س: موت کو کثرت سے یاد کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

ج: یہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے اور اس کی مراد واضح ہے۔ اس کا طریقہ کیونکہ آپ ﷺ نے خود متعین نہیں فرمایا لہٰذا ہمارے لئے یہی مناسب ہے کہ اس کی مراد کو سامنے رکھیں اور طریقہ خود وضع کر لیں۔ اس رویے میں حکمت یہ ہے کہ موت کی یاد کو محض حافظے تک محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ اس میں طبیعت کو متاثر کرنے کی قوت بھی ہونی چاہیے۔ طبیعت یکسانی سے متاثر نہیں ہوتی۔ اس کے لئے تنوع چاہیے۔ موت کی یاد بھی طبیعت کو اسی وقت متاثر کرے گی جب اس میں تنوع ہو۔ اس کا قابل عمل طریقہ یہ ہے کہ گھر سے نکلتے وقت، رات کو سوتے وقت، نماز پڑھتے ہوئے اور دعاء کے دوران میں اپنی موت کے خیال کو حاضر رکھا جائے اس طرح موت کی مطلوبہ یاد اپنے پیکر خود تراش لیتی ہے۔

باقی یہ کہ موت کی یاد کا بڑا مقصود گناہ اور نافرمانی سے بچنا ہے۔ انسانی طبائع میں گناہ گاری کے مختلف اسالیب پائے جاتے ہیں مثلاً لذت پسندی، کاہلی، سرکشی، بے حیائی وغیرہ۔ آدمی کی طبیعت کا میلان ان میں سے جس خرابی کی طرف زیادہ ہو اس کا خیال اور ارادہ کرتے وقت موت کو تکلف سے یاد کر لینا چاہیے۔ ایسا کرنا فوری طور پر بھی موثر ہوگا اور مستقل تاثیرات کا دروازہ بھی اسی سے کھلے گا۔ گویا موت کی یاد گناہ کی کوشش اور عزم کے وقت فیصلہ کن تاثیر رکھتی ہے بشرطیکہ بندہ ایسا کر لے۔

موت سے وحشت نہ ہونا

س: موت سے وحشت نہ ہونے کا کیا مطلب ہے؟

ج: موت سے وحشت یا کراہت نہ ہونا دو پہلوؤں کا حامل ہے۔ایک پہلونفسیاتی ہے اور دوسرا دینی یا ایمانی۔نفسیاتی پہلو سے موت سے وحشت یا ڈر بڑی حد تک ایک طبعی چیز ہے۔ایک آدمی جونفسیاتی طور پر نارمل بھی ہو اس کی طبیعت مرنے کی طرف رغبت نہیں رکھتی۔ یہ بے رغبتی اگر محض طبیعت تک محدود رہے تو ایمانی اعتبار سے بعض شرائط کے ساتھ طبیعت کا نقص تو کہلائے گی لیکن اس کا اثر بنیادی دینی تقاضے پر نہیں پڑتا۔ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ جس طبیعت میں موت کی طرف سے وحشت اور بے رغبتی نہ ہو وہ دینی اعتبار سے ایک کامل بندے کی طبیعت ہے لیکن یہ حکم لگانا کہ ایسی حالت شریعت کے مقتضٰی کے خلاف ہے اور کوئی دینی خرابی ہے، ٹھیک نہیں۔انسانی طبیعت کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ اس میں زندگی اور راحت کی طرف ایک قوی میلان پایا جاتا ہے۔موت، جیسا کہ ظاہر ہے، اس میلان سے متصادم ہے لہٰذا طبیعت میں موت کا ڈر ٹھیٹھ انسانی صورت حال میں کوئی ایسی چیز نہیں جسے غیر فطری یا غیر اخلاقی یا غیر دینی کہا جائے البتہ اس ڈر کو انسانیت کی سب سے بڑی اساس یعنی تصور آخرت پر غالب نہیں آنا چاہئے۔ یہ اصول دینی اور نفسیاتی دونوں اعتبار سے محکم ہے۔دینی موقف تو واضح ہے۔

نفسیاتی لحاظ سے بھی ایک نارمل انسان کی طبیعت یعنی بنیادی میلانات کو اس کے شعور اور فہم یعنی عقائد ونظریات پر غالب نہیں آنا چاہیے۔اسی پہلو سے ہم نے اوپر کہا تھا کہ موت سے وحشت کو دینی شخصیت کا نقص کہا جا سکتا ہے لیکن خرابی یہ اس وقت ہو گی جب اس کی وجہ سے آخرت نا مطلوب اور غیر مرغوب ہو جائے۔ دینی پہلو سے موت سے وحشت اور کراہت اس کے طبعی وقوع کا انکار یا تردید نہیں ہے۔ یہ جب آخرت کے تصور کو نا قابل قبول، ناپسندیدہ اور نظر انداز کئے جانے کے قابل بنا دیتی ہے تب ایک دینی موقف قائم ہو جاتا ہے۔اس صورت میں موت سے وحشت نفس کی امارگی ہے اور طبیعت کے فساد کا یقینی مظہر ہے جو بندگی کے بنیادی مقاصد کو مجروح کرتا ہے (جاری ہے)۔

مفتی عبدالقدوس ترمذی ☆

دینی مدارس میں تدریس فقہ واصول فقہ

یہ حقیقت تو سب پر واضح ہے کہ دین کی بنیاد قرآن وسنت پر ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ اجماع امت بھی بڑی اہمیت اور عظمت کا حامل ہے اور جو قیاس مستنبط **من هذه الأصول الثلاثه** ہے اس کا بھی اپنا ایک درجہ ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ ایک عظیم نظام ہے کہ اس نے اپنے دین کی حفاظت کے لیے حضور اکرم ﷺ کے عہد اقدس میں حضرات صحابہ کرامؓ کی جماعت کو پیدا فرمایا، جنہوں نے براہ راست حضور اکرم ﷺ سے دین کو حاصل کیا۔ آپؐ کے بارے میں قرآن مجید نے وضاحت فرمائی ہے ''**ويعلمهم الكتاب والحكمة**'' کہ آپؐ کی بعثت کے مقاصد میں بنیادی مقصد کتاب وسنت کی تعلیم ہے، تو صحابہ کرامؓ نے آپؐ سے قرآن وسنت کی تعلیم بھی حاصل کی اور آپؐ نے ان کا تزکیہ بھی فرمایا اور پھر اس عظیم جماعت سے دین کی حفاظت کا کام لیا گیا۔ صحابہ کرامؓ کی اس عظیم جماعت میں چند ہستیاں ایسی تھیں جن کو اللہ تعالیٰ نے تفقه في الدين کی دولت سے نوازا اور انہیں بطور خاص فقہ میں بڑی عظیم مہارت عطا فرمائی۔ انہوں نے قرآن وسنت کو سمجھا اور ان میں خوب غور وخوض فرمایا اور بعض واقعات سے واضح ہے کہ جہاں ضرورت پیش آئی انہوں نے قرآن وسنت کو سامنے رکھ کر اجتہاد بھی فرمایا۔ چنانچہ جب حضور اکرم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کی طرف بھیجا تو ان سے پوچھا کہ تم وہاں کیا طریقہ اختیار کرو گے؟ کس طرح فیصلے کرو گے؟ حضرت معاذ بن جبلؓ نے واضح طور پر عرض کیا کہ میں قرآن پاک کو دیکھوں گا، پھر سنت کو اور اس کے بعد فرمایا ''**اجتهد برأيي**'' اسی طرح اور بھی بعض مجتہدین اور فقہاء صحابہ کرامؓ ہیں جن کا علامہ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں ذکر کیا ہے۔

یہ ''اعلام الموقعین'' ہے یا ''موقِّعین'' ہے یہ بھی ایک قابل تحقیق مسئلہ ہے۔ شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ نے ''قواعد فی علوم الحدیث'' کے مقدمہ ''اعلاء السنن'' کی تعلیقات میں اس لفظ کی خاص تحقیق فرمائی

☆ مہتمم جامعہ حقانیہ ساہیوال، سرگودھا (جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ، اقبال ٹاؤن لاہور میں دینی مدارس کے اساتذہ کی تربیتی نشست سے خطاب)۔

ہے اور بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ اہل علم اس کی طرف مراجعت کریں اور اس کے لیے اعلاء السنن کا مقدمہ دیکھیں۔

بہرحال علامہ ابن قیم نے ''**اعلام الموقعین**'' میں ان صحابہ کرامؓ کا ذکر کیا ہے جو اپنے دور میں قرآن وسنت کے ماہر، فقہ کے امام اور فتاویٰ کے لیے مرجع تھے۔ فقہ وفتاویٰ کا علم بہت زیادہ وسیع ہے اس لیے کہ قرآن وسنت میں قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ قرآن وسنت پر عمل پیرا ہوں، اب ظاہر ہے کہ قیامت تک آنے والے تمام واقعات اور حوادث کا بیان قرآن پاک میں واضح طور پر تو نہیں ہے کیونکہ قرآن پاک ''**تبیان لکل شیء**'' ہے، یعنی اس میں ہر چیز کا بیان اجمال کے ساتھ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر چیز کے اصول اس میں آ گئے ہیں۔ بعض چیزوں کے اصول حضور اکرم ﷺ کی سنتوں اور احادیث طیبہ میں آئے ہیں جبکہ بعض چیزوں کی تفصیل بھی موجود ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ قیامت تک کے ہر واقعہ کا حکم اس میں آ جائے۔ حضرات صحابہ کرامؓ کے دور میں یہ سلسلہ شروع ہوا کہ انہوں نے قرآن اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کو سامنے رکھتے ہوئے نئے وقائع، حوادث اور حالات کا استنباط فرمایا۔ اصل میں فقہ بڑا وسیع، عمیق اور بہترین علم ہے اور ''تفقہ'' اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے جس کو بھی وہ عطا فرما دیں، **کما قال رسول اللہ ﷺ ''من یرد اللہ خیرا یفقھه فی الدین''**۔ حدیث شریف میں ایک واقعہ آتا ہے، بخاری شریف کی روایت ہے کہ جریر نامی ایک بڑے عابد عبادت کر رہے تھے۔ اس دوران ان کی والدہ نے ان کو پکارا، انہوں نے جواب نہ دیا، چنانچہ ان کی والدہ نے ان کو بددعا دے دی جس پر ان کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا کہ ایک بچے کے بارے میں ان پر تہمت لگا دی گئی، لیکن جب وہ بچہ ان کے پاس لایا گیا تو انہوں نے پوچھا کہ بتاؤ تمہارا والد کون ہے؟ ان کی کرامت تھی کہ بچے نے بول کر بتا دیا کہ اس کا والد کون ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ لوگ پہلے ان سے انتہائی متنفر ہوئے کیونکہ لوگ اصل بات کی تحقیق نہیں کرتے، فرمان باری تعالیٰ'' **ان جاء کم فاسق بنبا فتبینوا**'' پر تو عمل ہے ہی نہیں، چنانچہ جب ان پر تہمت لگی تو لوگ ان پر برہم اور برافروختہ ہوئے حتیٰ کہ جس جگہ وہ عبادت کر رہے تھے اس کو بھی انہوں نے گرا دیا۔ اب جب کرامت دیکھی تو کہنے لگے کہ ہم آپ کی عبادت گاہ کو سونے کا بنا دیتے ہیں، حضرت جریر نے فرمایا کہ بس اس کو ویسا ہی بنا دو جیسی کہ پہلے تھی، بہرحال جب حضورؐ کے سامنے یہ

واقعہ ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا: ''لو کان فقیھاً لأجاب امه'' کہ جریر فقیہ ہوتے تو اپنی ماں کو جواب دیتے ۔ یہ تفصیل اپنی جگہ ہے کہ نفل نماز کا کیا حکم ہے اور فرض کا کیا ہے؟ کب جواب دینا چاہیے اور کب نہیں، اس بات کا تعلق بھی فقہ سے ہے۔

بہرحال فقہ ایسا عظیم الشان علم ہے کہ اگر انسان کے سامنے فقہ کے اصول ہوں تو قیامت تک پیش آنے والے واقعات اور حالات کے احکام کے بارے میں اس کو کوئی پریشانی پیش نہیں آسکتی، لیکن یاد رکھیے! ہر شخص کے بس کی بات نہیں کہ وہ فقیہہ بن جائے اور یہ دعویٰ کرنے لگے کہ میں فقیہہ ہوں اور مجتہد ہوگیا ہوں۔ آج کل یہ بھی مسئلہ ہے کہ **اذا صلی الحائک رکعتین وانتظر الوحی**، اللہ تعالیٰ رحم فرمائیں کہ اب یہ عجیب مسئلہ چل پڑا ہے۔

بہرحال فقہ کا یہ عظیم علم صحابہ کرام کے دور میں شروع ہوا پھر تابعین، تبع تابعین میں بہت سے فقہاء کرام پیدا ہوئے، حضرت امام اعظم سیدنا ابوحنیفہ تابعین میں سے ہیں، ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ میں آپ کی وفات ہے۔ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کی پیدائش ۱۵۰ھ میں ہوئی۔ اس پر ایک لطیفہ بھی ہے کہ بعض احناف نے شوافع سے کہا کہ جب تک ہمارے امام زندہ رہے آپ کے امام نہیں آسکے تو وہ کہنے لگے کہ جب ہمارے امام آگئے تو آپ کے امام چلے گئے۔

میں نے عرض کیا کہ امام ابوحنیفہ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ میں آپ کا انتقال ہوگیا۔ آپ نے قرآن وسنت اور فقہ کی بہت خدمت کی اور بے شمار مسائل کا استنباط کیا۔ آپ کے علاوہ بھی بہت سے حضرات فقہاء امام شافعی، امام مالک، امام احمد بن حنبل اور امام اوزاعی رحمہم اللہ اور ان کے علاوہ بہت سے آئمہ نے فقہ کی تدوین کے لیے بڑی خدمات سرانجام دی ہیں، **جزاهم الله احسن الجزاء**۔

لیکن حضرت امام صاحب کے ہاں فقہ وفتاویٰ اور استنباط مسائل کے حوالے سے جو کام ہوا ہے وہ نہایت عظیم الشان اور بے مثال ہے۔ فقہ حنفی وہ واحد فقہ ہے جس میں یہ نظام ہے کہ بہت سے علماء کو جمع کرکے ان کے سامنے مسائل رکھے گئے، پھر ان کے بارے میں مشاورتیں ہوئیں، اجلاس ہوئے۔ ہمارے آج کل کے اجلاس تو عام طور پر نشستن، گفتن و برخاستن سے زیادہ نتیجہ خیز نہیں ہوتے لیکن ان مجالس میں لاکھوں مسائل کا استنباط کیا گیا، علماء کی اس کمیٹی کے اندر بارہ لاکھ سے زائد مسائل کا استنباط ہوا۔ یہ کمیٹی کا لفظ آپ کے سمجھانے کے لیے عرض کر دیا، اس لفظ کے بغیر شاید آپ

بات کو سمجھ نہ سکیں، یہ ہماری آج کل کی مجبوری ہے۔ حضرت مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ لوگ ہمارے پاس سوال کرنے کے لیے آتے ہیں تو اردو سے زیادہ انگلش کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، فرماتے تھے کہ میں تو ان کی بات سمجھتا ہی نہیں کہ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟ ان کا مقصد کیا ہے؟ جب اردو میں بات ہورہی ہے تو اردو بولیں، اور اگر آپ انگلش میں بات کرنا چاہ رہے ہیں تو ٹھیک ہے انگلش میں بات کریں، لیکن جب آپ اردو میں بات کررہے ہیں، اور میں بھی اردو میں بات کررہا ہوں تو پھر کم از کم اردو تو بولیں اس میں بھی آپ نے انگلش اور دوسری زبانوں کے الفاظ ٹھونس دیے، یہ کیا بات ہوئی؟

بہرحال فقہاء کی اس لجنہ میں (جس کو آج کل کمیٹی کہہ دیا جاتا ہے) کیسے کیسے حضرات شامل تھے؟ امام ابو یوسف، امام محمد، امام زفر جیسے حضرات جن میں ایک ایک اپنے وقت کا عظیم فقیہہ ہے، بلکہ حضرات فقہاء نے یہ تصریح کی ہے کہ حضرت امام ابو یوسف اور امام محمد بھی مجتہد تھے۔ مجتہد سے میری مراد مقید (مجتہد فی المذہب) نہیں بلکہ ان حضرات کو مجتہد مطلق شمار کیا گیا ہے۔ لیکن ان حضرات نے اپنے استاذ محترم کی عظمت کی وجہ سے اپنے آپ کو ان کی طرف منسوب کیا، اس لیے یہ حضرات مجتہد منتسب کہلاتے ہیں۔ مجتہد منتسب اس کو کہا جاتا ہے جو اپنے علم اور اپنے مقام کے اعتبار سے مجتہد (مطلق) ہو لیکن کسی دوسرے مجتہد کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرلے۔

پھر امام محمدؒ نے امام صاحب کے مذہب کو اس انداز سے مدون اور مرتب کیا کہ ان کو محرر مذہب ابو حنیفہ کہا جانے لگا۔ حضرت امام محمد نے نو سو ننانوے کتابیں تصنیف فرمائیں **كما في مقدمة الدرالمختار للعلامة علاء الدين الحصكفيؒ**، جن میں مشہور چھ کتابیں ہیں جو کہ فقہ حنفی میں ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ اب ماشاء اللہ یہ کتابیں شائع بھی ہوگئی ہیں۔ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے امام محمد کی کتاب ''**السير الكبير**'' یا غالباً ''**المبسوط**'' کے بارے میں یہ واقعہ بیان فرمایا کہ اس کتاب کا نسخہ اونٹ پر لاد کر خلیفہ کے دربار میں لایا جارہا تھا، راستے میں کوئی عیسائی ملا، اس نے پوچھا یہ کیا ہے؟ بتایا گیا کہ یہ امام محمد کی کتاب کا مسودہ ہے جو انہوں نے تصنیف کی ہے، اس کو خلیفہ کے دربار میں پیش کررہے ہیں تاکہ ان کو پتہ چلے کہ یہ ان کے دور کے اتنے بڑے عالم ہیں۔ ہمارے یہاں کے وزراء اور صدور کے سامنے کوئی کتاب پیش کی جائے مثلاً ''اعلاء السنن'' یا کوئی اور کتاب ان

کے پاس لے کے چلے جائیں تو شاید نام کا تلفظ بھی بار بار دہرانا پڑے گا کیونکہ وفاق المدارس کے آخری درجے کی سند الشہادۃ العالمیہ جب سینٹ میں پیش کی گئی تو اس وقت کے وزیر تعلیم اس کو الشہادۃ الأ لمیہ پڑھ رہے تھے، اور یہ تلفظ بھی انہوں نے کئی تکلفات اور بڑی محنت کے بعد گویا آخری درجے میں ادا کیا، اس سے پہلے وہ کوئی اور لفظ کہتے رہے۔ نوائے وقت کے ''سراہے'' نے اس پر بہت اچھا لکھا کہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ پاکستان کے وزیر تعلیم کو عربی کا ایک لفظ بھی صحیح پڑھنا نہیں آتا۔

تو جب المبسوط کا وہ مسودہ خلیفۂ وقت کے پاس لے جایا جارہا تھا، اس عیسائی نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ بتایا گیا کہ یہ امام محمد کی کتاب ہے، تو اس نے جواب میں کہا **هذا محمد کم الأصغر** یہ تو تمہارے چھوٹے محمد کا حال ہے **فکیف محمد کم الأکبر** تو تمہارے بڑے محمد کا کیا حال ہوگا؟ اس پر اس نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہوگیا۔

انہی امام محمد کا قول یاد آیا، فرماتے ہیں: **ان صناعتنا هذه من المهد الی اللحد** کہ اس علم کا معاملہ ختم نہیں ہوا یہ مسلسل ارتقاء پذیر ہے۔ خود امام ابو یوسف کا جب انتقال ہورہا تھا اس وقت ایک مسئلہ پر بحث ہوگئی کہ حج میں رمی راکباً ہوگی یا راجلاً؟ افضل طریقہ کیا ہے؟ اس پر گفتگو ہوئی آخری گفتگو کر کے وہ صاحب باہر نکلے ابھی دہلیز پر نہیں پہنچے تھے کہ امام صاحب کا انتقال ہوگیا۔ بہرحال میرے بزرگو اور دوستو! امام محمد کا یہ ارشاد: ''**ان صناعتنا هذه من المهد الی اللحد**'' کہ یہ ختم ہونے والا مسئلہ نہیں، یہ تو آخری وقت تک چلتا ہے۔

تو دیکھ لیجیے! ان حضرات نے کتنے لاکھ مسائل کا استنباط فرمایا، اور فقہ تو ایک بہت گہرا علم ہے کسی بھی ایک علم پر اگر انسان صحیح طور پر محنت کر لیتا ہے تو وہ علم بھی اس کو تمام علوم کی طرف لے جانے کا ذریعہ ہوجاتا ہے۔ خود امام محمدؒ نے اپنے خالہ زاد بھائی حضرت امام کسائی کو، جو قاری بھی ہیں اور بہت بڑے نحوی بھی ہیں، جب دیکھا کہ ان کا زیادہ تر نحو میں اشتغال ہے ــــ بعض اوقات آدمی کسی چیز میں محو ہوجاتا ہے جیسا کہ ایک شخص کشتی میں سوار ہوا تو ملاح سے پوچھا کہ آپ کو نحو بھی آتی ہے؟ ملاح نے جواب دیا کہ مجھے تو نحو نہیں آتی، تو کہنے لگے کہ آپ کی آدھی زندگی تباہ ہوگئی اس پر ملاح کو بڑا افسوس ہوا اور رنج ہوا کہ اس شخص نے بہت بڑا اعتراض کر دیا کہ تیری آدھی زندگی داؤ پر لگ گئی۔ کچھ دیر بعد ایسا ہوا کہ کشتی بھنور میں پھنسنے لگی تو ملاح نے مولوی صاحب سے کہا کہ آپ کو تیرنا بھی آتا

ہے؟ مولوی صاحب نے کہا نہیں مجھے تیرنا نہیں آتا، تو اس ملاح نے کہا کہ آپ کی تمام زندگی تباہ ہوگئی، اب آپ بالکل فارغ ہیں۔

تو جب امام محمدؒ نے دیکھا کہ امام کسائی کا نحو میں اشتغال زیادہ ہے تو فرمانے لگے، **لم لا تشغل بالفقه**؟ یعنی فقہ میں آپ کیوں مشغول نہیں ہوتے؟ فقہ پر کام کرو، اس کو پڑھو اس کو پڑھاؤ۔ امام کسائی نے جواب میں فرمایا **من احکم علما فذلک یهدیه الی سائر العلوم** کہ آدمی ایک علم میں مضبوط ہوجائے تو وہ ایک علم ہی اس کو تمام علوم کی طرف لے جانے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ان کا بہت بڑا دعویٰ تھا۔ وہ بھی امام محمد تھے، فرمانے لگے میں آپ کا امتحان لیتا ہوں، ایک شخص پر نماز میں سجدۂ سہو واجب ہوگیا، اس کے بعد وہ شخص نماز میں پھر بھول گیا، تو اس شخص کے ذمے نماز کے آخر میں ایک سجدہ ہوگا یا کئی سجدے ہوں گے؟ اس پر امام کسائی فرمانے لگے کہ بھائی ایک سجدہ ہوگا۔ امام محمد نے پوچھا کہ یہ بتاؤ کہ تم نے نحو کے کون سے قاعدے اور ضابطے سے یہ جواب دیا ہے؟ تو امام کسائی نے بلا تامل یہ فرمایا کہ **المصغر لا یصغر** ایک دفعہ جب کسی اسم کی تصغیر ہوجائے تو دوبارہ نہیں ہوتی۔ یہ قاعدہ تو ہم نے بھی پڑھا ہے لیکن پڑھنے پڑھنے میں فرق ہے۔ صاحب البحر علامہ ابن نجیمؒ نے یہ واقعہ البحر الرائق میں بیان فرمایا ہے۔

حکیم الامت حضرت تھانوی نے اپنا قیام دیوبند کا واقعہ بیان فرمایا کہ ایک دفعہ راستے میں میری حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ سے ملاقات ہوگئی، حضرت نے بلالیا۔ حضرت تھانوی کا داخلہ دارالعلوم دیوبند میں ۱۲۹۵ھ میں ہوا ہے۔ اور حضرت نانوتویؒ کی وفات ۱۲۹۷ھ میں ہے تو یہ حضرت نانوتویؒ کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے کا واقعہ ہوگا۔ بہرحال حضرت نانوتویؒ نے آپ کو بلالیا، فرمایا کیا پڑھتے ہیں آپ؟ حضرت فرماتے ہیں میں نے جواب میں عرض کیا کہ میں ہدایہ پڑھتا ہوں — یہ فقہ کی مشہور کتاب ہے، میں نے ایک دوست سے پوچھا کہ آپ نے منطق میں کیا پڑھا؟ فرمانے لگے کہ مختصر المعانی۔ بڑا مختصر جواب دیا لیکن معانی نہیں تھے، یا پھر اس کے کچھ اور ہی معانی ہوں گے۔

بہرحال حضرت تھانوی نے فرمایا کہ میں ہدایہ پڑھ رہا ہوں، اس پر حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ نے فرمایا کہ مولوی صاحب! ایک ہے ہدایہ کا پڑھنا اور ایک ہے ہدایہ کا گھُنّا☆، پڑھنے اور گھُننے میں فرق ہے۔ اس پر حضرت قاسم نانوتویؒ نے یہ واقعہ بیان فرمایا کہ ایک جگہ دعوت تھی اور دعوت میں

☆یعنی مکمل دسترس رکھنا

بڑے علماء کو مدعو کیا گیا تھا۔ دعوت کا قبول کرنا تو آپ جانتے ہیں کہ سنت ہے اس کا ترک کسی حال میں نہیں ہوسکتا۔ اس دعوت میں اہل علم جمع تھے، کسی صاحب نے کوئی سوال کیا اور مسئلہ پوچھا۔ ایک عالم نے اس کا جواب دیا، وہ صاحب کہنے لگے کہ جی اس کا حوالہ کہاں ہے؟ وہ عالم فرمانے لگے کہ ہدایہ میں ہے، وہاں پر ایک عالم موجود تھے، جو بہت بڑے عالم تھے اور تھے نابینا، ظاہر ہے کہ ان کو ساری کتابیں زبانی ازبر ہونی چاہئیں، اس لیے ان کو ہدایہ زبانی یاد تھی، وہ فرمانے لگے کہ یہ ہدایہ میں نہیں ہے، اب بینا اور نابینا میں تعارض ہوگیا۔ وہ عالم فرمانے لگے کہ ہدایہ لے آؤ میں دکھا دیتا ہوں۔ ہدایہ لائی گئی تو اس عالم نے ہدایہ کی ایک عبارت پڑھی اور اس کی ایک قید سے بتادیا کہ مسئلہ یوں ہے تو وہ نابینا عالم رونے لگے اور فرمایا کہ اصل میں ہدایہ تو انہوں نے پڑھی ہماری تو ساری زندگی ضائع ہوگئی۔ اس کو کہتے ہیں گننا، نہ یہ کہ سرسری طور پر تو ساری کتاب سے گزر جائے لیکن سمجھ کر نہ پڑھا جائے۔ ہمارے طلباء کا زیادہ تر عمل اسی پر ہے کہ **ان فی العبور لبرکة** کہ عبور میں بھی برکت ہے عبور اور مرور ہی ہوجائے، بھائی یہ کوئی میدان عرفات تو نہیں ہے کہ مرور ہوگیا تو حج ہوگیا، بہرحال صرف پڑھنا تو مقصود نہیں۔

ہمارے حضرت مفتی جمیل احمد تھانویؒ صاحب ایک واقعہ بیان فرمایا کرتے تھے اور بارہا انہوں نے یہ واقعہ سنایا کہ حکومت برطانیہ نے ایک مرتبہ منصوبہ بنایا کہ تمام مسلم اوقاف کو حکومت کی تحویل اور کنٹرول میں لیا جائے۔ اس کے خلاف تحریک چلی، حکومت نے بھی کچھ مسودات جاری کیے، جن کا جواب فقہی اعتبار سے تیار کرنا تھا۔ اس کے لیے حضرت تھانویؒ نے علماء کا ایک اجتماع کیا اور ان کی ایک کمیٹی تشکیل دی۔ اس کو کمیٹی کہہ لیں یا لجنہ، جو بھی کہیں بہرحال مقصد تو ایک ہی ہے، جیسا کہ شاعر کہتا ہے:

اوری بسعدی والرباب وانما انت الذی تعنی وانت المؤکل
عباراتنا شتی وحسنک واحد وکل الی ذاک الجمال یشیر

حضرت نے مفتیٔ اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ اور میرے جد امجد حضرت مفتی عبدالکریم صاحب گمتھلویؒ کے ذمے لگایا کہ آپ فقہی عبارات دیکھیں اور جمع کریں، پھر حکومت کے اس مسودے کا جواب لکھا جائے گا۔ حضرت مفتی جمیل احمد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ میرے ذمہ البحر الرائق لگائی گئی جو علامہ ابن نجیم کی مشہور کتاب ہے۔ حضرت امام کسائی کا واقعہ میں نے اسی کتاب

کے حوالہ سے بتایا ہے۔ تو البحر الرائق حضرت مفتی جمیل احمد تھانوی صاحبؒ کے ذمہ تھی، باقی کتابیں دوسرے حضرات دیکھ رہے تھے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کتاب میں سے دیکھ کر کچھ عبارتیں لکھیں پھر کسی کام سے باہر گیا، واپس آیا تو البحر الرائق کے جو صفحات میں دیکھ چکا تھا انہی صفحات میں سے مزید کچھ عبارتیں حضرت مفتی عبدالکریم صاحب تحریر فرما چکے تھے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ بہت سی عبارتیں انہی صفحات کی لکھی ہوئی تھی جن کو میں دیکھ چکا تھا، اس پر حضرت مفتی صاحب احقر کے جدامجد سے کہنے لگے کہ میں اس کام کے لائق نہیں ہوں، میں یہ کام نہیں کرتا، میں نے ان صفحات میں سے جتنی عبارتیں لکھیں، میرا اپنے طور پر خیال تھا کہ ہمارے مقصد کی بس یہی عبارتیں ہیں، لیکن ان عبارتوں کو دیکھ کر اب یہ معلوم ہوا کہ بہت سے عبارتیں ایسی تھیں جو ہمارے مقصد کی تھیں لیکن میری سمجھ میں نہیں آئیں، اس لیے میں اس کام کا اہل نہیں ہوں، میں یہ کام نہیں کرتا۔ اس پر حضرت داداجان نے فرمایا کہ مولوی صاحب ایسا نہیں ہے۔ حضرت مفتی صاحب اس وقت مظاہرالعلوم میں پڑھاتے تھے اور شیخ الادب تھے۔ داداجان فرمانے لگے کہ آپ اس شعبہ کے آدمی بھی نہیں ہیں اس کے باوجود آپ نے جتنی عبارتیں نقل کی ہیں وہ سب کی سب مفید مطلب ہیں، ایسا بھی تو ہوسکتا تھا کہ غیر مفید عبارتیں نقل کردیتے جیسا کہ آج کل عام طور پر نقل میں ایسا ہی ہوتا ہے، آپ کی سب کی سب عبارتیں مدعیٰ پر دال ہیں، اور آپ نے صحیح انتخاب کیا ہے، اس لیے آپ کو گھبرانا نہیں چاہیے یہ کام تو ظاہر ہے کہ عرصہ دراز تک کرنے کے بعد انسان کی سمجھ میں آتا ہے۔

اس پر حضرت داداجان فرمانے لگے کہ آپ پریشان نہ ہوں مجھے یہاں خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں فتاویٰ کا کام کرتے ہوئے ۱۵ سال ہوگئے ہیں، اور جب سوالات آتے ہیں تو ہم ان کے جوابات کے لیے فقہی کتابوں میں عبارتیں تلاش کرتے ہیں لیکن جواب نہیں ملتا۔ بالآخر ہم حضرت تھانوی کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ حضرت اس مسئلے کا کوئی جزئیہ نہیں مل رہا، تو حضرت کا ایک ہی جواب ہوتا ہے کہ لائیو ''ہدایہ''۔ عرض کرتے ہیں کہ حضرت ''ہدایہ'' تو ہم نے دیکھ لی ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں جو کہہ رہا ہوں لے آؤ ''ہدایہ''۔ ہدایہ لے کر آئے تو حضرت ہدایہ کی عبارت کی کسی قید سے یہ بتا دیتے

کہ اس قید سے یہ مسئلہ نکل رہا ہے، تم کہہ رہے ہو کہ ہدایہ میں نہیں ہے، پھر ہماری سمجھ میں بھی آیا کہ یہ تو ہدایہ کے اندر لکھا ہوا ہے۔

حضرت (احقر کے والد) صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ایک دور تھا کہ ہدایہ پڑھانے والے کے گھر پر جھنڈا لگتا تھا جو اس بات کی علامت تھا کہ یہ بڑا عالم ہے جو ہدایہ کو پڑھا سکتا ہے، اور اس کو حل کر سکتا ہے، میرے خیال میں اب تو سب مکانات پر جھنڈے ہونے چاہئیں۔ میں نے ایک طالب علم سے پوچھا کہ ہدایہ کا اصل نام کیا ہے؟ یہ کونسی کتاب سے ماخوذ ہے تو بیچارہ کبھی کچھ بتاتا کبھی کچھ، بہر حال جب سے علامہ عبدالحئی لکھنوی نے ہدایہ پر حاشیہ لکھا ہے اس وقت سے تقریباً ہم سب مرور تو کراہی رہے ہیں۔

آپ حضرات کو معلوم ہی ہے کہ شیخ الاسلام برھان الدین المرغینانیؒ صاحب ہدایہ بڑے آدمی تھے۔ انہوں نے ۱۳ سال کی مدت میں یہ کتاب لکھی ہے، اصل میں یہ کتاب ''**كفاية المنتهى**'' کا اختصار ہے جو قاہرہ کے کتب خانہ میں ۸۰ جلدوں میں موجود ہے پھر اس کا خلاصہ صاحب ہدایہ نے ۱۳ سال کی مدت میں لکھا پھر فرمایا کہ تمہاری مرضی ہے وہ پڑھ لو یا یہ پڑھ لو، **وللناس فيما يعشقون مذاهب**۔ ہماری حکومتوں کا علم کی قدردانی کا یہ حال ہے کہ **كفاية المنتهى** کا پتہ ہی نہیں کہ وہ کہاں ہے؟ میں نے تو آپ کو بتا دیا کہ وہ قاہرہ کے کتب خانہ میں موجود ہے کوشش کیجیے جدوجہد سے مل جائے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔ تو ہدایہ بڑی زبردست اور عظیم کتاب ہے اور پھر کمال یہ ہے کہ جیسے امام ابوحنیفہؒ کی فقہ عظیم الشان ہے جس کی تدوین کے لیے علماء کے اجلاس بلائے گئے، مشورے کیے گئے، پھر مسائل کا استنباط ہوا، ایسا ہی معاملہ ہدایہ کا ہے کہ فقہ حنفی میں جتنی کتابیں ہیں ان سب میں ہدایہ سب سے عظیم کتاب ہے اور یہ صرف فقہ حنفی کی خصوصیت ہے۔ دیگر فقہا کے ہاں بھی فقہ کی جو کتابیں ہیں ان میں ہدایہ جیسی کوئی کتاب نہیں (جاری ہے)۔

مغربی تہذیب پر لیکچر سیریز

صفاء انسٹی ٹیوٹ میں جمعرات ۱۲ مئی ۲۰۱۱ء کو احمد جاوید صاحب کا لیکچر ہوا جس میں اہل علم نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ اگلا لیکچر ان شاء اللہ ۱۴ جون ۲۰۱۱ء کو ہوگا۔

ڈاکٹر محمد امین

دینی مدارس اور عصری تعلیم

دینی مدارس کے سامنے آج کل ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنے طلبہ کو عصری تعلیم دیں یا نہیں؟ اس سوال کا دوٹوک جواب دینے کے لیے کئی پہلوؤں پر غور ضروری ہے:

خارجی دباؤ

بظاہر یہ مسئلہ خارجی دباؤ کا نتیجہ لگتا ہے۔ مغربی حکومتیں پاکستان کی حکومت پر دباؤ ڈالتی ہیں کہ دینی مدارس میں اصلاحات کی جائیں اور نتیجتاً پاکستانی حکومت یہ دباؤ مدارس پر منتقل کر دیتی ہے۔ اب دینی مدارس چلانے والے علماء کرام چونکہ حکومت کا اس طرح کا کوئی دباؤ قبول کرنے کے لیے بالکل تیار نہیں ہیں کہ وہ دینی مضامین میں یا ان کے نصاب میں کوئی تبدیلی قبول کریں۔ اس لیے لے دے کر حکومت کے پاس یہی ایجنڈا رہ جاتا ہے کہ مدارس پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہ اپنے ہاں عصری مضامین پڑھائیں۔ بظاہر اس کے پیچھے یہ خواہش کارفرما محسوس ہوتی ہے کہ اس طرح دینی مدارس عام تعلیم کے دھارے کے قریب آ جائیں گے، ان کے طلبہ میں مزعومہ 'انتہاپسندی' کم ہو جائے گی اور اگر اس کے نتیجے میں کچھ طلبہ عصری تعلیم حاصل کر کے مارکیٹ میں ملازمتیں حاصل کر لیتے ہیں تو اس سے بھی دینی مدارس کے، جو معاشرے سے کٹے ہوئے ہیں، 'منفی اثرات' میں کمی واقع ہوگی۔ اسے وہ دینی مدارس کی Modernization and Mainstreaming کہتے ہیں۔

دینی مدارس کے مقاصد تعلیم

دینی مدارس کے عصری تعلیم دینے یا نہ دینے کے حوالے سے جو بنیادی اور اصولی بات ہمارے دینی مدارس کے غور کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ کیا وہ اپنے مقاصد تعلیم پر نظر ثانی کرنے کے لیے تیار ہیں یا نہیں؟

ہمارے موجودہ دینی مدارس جو اصلاً ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں مسلم حکومت کے خاتمے کے بعد بننے والے ان مدارس ہی کا تسلسل ہیں جو اُس زمانے کے مخصوص حالات کے پیش نظر اِس محدود مقصد کے لیے بنائے گئے تھے کہ مسلم حکومت کے خاتمے کے بعد مسلمانوں کی مساجد آباد رہیں اور معاشرے میں اسلامی روایت کے مطابق نکاح، طلاق اور خوشی وغم کی رسمیں جاری رکھی جا سکیں تا کہ ہندوستان پر

انگریز کے غلبے کے بعد اسلام اور مسلمانوں کے وجود اور بقاء کو جو خطرات لاحق ہو گئے تھے، ان کا سد باب کیا جا سکے۔

ظاہر ہے قیام پاکستان کے بعد اس صورت حال میں ایک بنیادی تبدیلی آ گئی لیکن نئے حکمرانوں کی اسلامی آئین، اسلامی طرز حیات اور اسلامی تعلیم سے عدم دلچسپی کو دیکھتے ہوئے مدارس اسی پرانے ڈھرے پر چلتے رہے اور اپنے اسلاف کے قائم کردہ اس موحد نظام تعلیم کی طرف نہ لوٹ سکے جو مسلم معاشرے اور ریاست کے سارے شعبوں کے لیے افراد کار تیار کرتا تھا نہ کہ صرف مساجد و مدارس کے لیے۔ جو تعلیمی ثنویت انگریزی عہد میں تاریخی جبر کے طور پر ہندی مسلمانوں کو قبول کرنا پڑی تھی کہ مذہبی تعلیم کے لیے دیوبند اور دنیاوی تعلیم کے لیے علی گڑھ الگ الگ ہوں گے، قیام پاکستان کے بعد اسے جاری رکھنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ اس کے دو انتہائی خطرناک نتیجے نکلے، ایک یہ کہ ریاست اور معاشرے کا نظام ان لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا جن کے نظام تعلیم میں مذہبی تعلیم یا تعلیم کا دینی تناظر ایک مؤثر عامل کے طور پر موجود ہی نہ تھا اور نہ اس میں علماء کے لیے عملاً کوئی کردار تھا۔ دوسرا یہ کہ دینی مدارس جو افراد پیدا کر رہے تھے وہ سوائے مدارس اور مساجد میں کام کرنے کے اور کوئی مصرف نہ رکھتے تھے یوں وہ عملاً معاشرے اور ریاست سے کٹ کر رہ گئے۔

موجودہ عصری تعلیم کی خرابیاں

اس کا حل یہ نہیں ہے کہ دینی مدارس وہ عصری تعلیم دینا شروع کر دیں جو پاکستانی اور سکولوں کالجوں میں دی جاتی ہے کیونکہ اگر انہوں نے ایسا کیا تو اس کے درج ذیل بڑے نقصانات ہوں گے:

i۔ پاکستان میں عصری تعلیم کا سارا نظام مغربی تہذیب کے ملحدانہ افکار (سیکولرزم، ہیومنزم، کیپٹل ازم، لبرلزم۔۔۔وغیرہ) اور اقدار و تربیت پر مبنی ہے جس کے ذرے ذرے میں الحاد و بے دینی ایسے ہی موجود ہے جیسے جسم میں خون گردش کرتا ہے اور جس طرح خون انسانی جسم کی صحیح پرداخت پر اثر انداز ہوتا ہے اسی طرح جدید نظام تعلیم کا نصاب، طریقِ تربیتِ اساتذہ، ہم نصابی سرگرمیاں، درس گاہ کا ماحول۔۔۔۔غرض اس کی ہر چیز مغربی فکر و تہذیب کو ابھارتی ہے اور اسلامی ذہن و فکر کو تاراج کرتی ہے جس کا منطقی اور لازمی نتیجہ مسلم شخصیت میں فکری انتشار، عدم یکسوئی اور بے کرداری ہے۔اور اگر دینی مدارس اس نظام تعلیم اور اس کے نصاب، نصابی کتب اور اساتذہ کو اپنائیں گے تو

اس کا زہر لازماً دینی مدارس کے طلباء پر بھی اثر انداز ہوگا اور ان کے طلبہ کی شخصیت، فکر اور کردار کو لازماً مسموم کرے گا۔

ii۔ دونوں طرح کے نصابات کو جمع کرنے سے طلبہ پر بوجھ لازماً بڑھے گا جس سے دینی تعلیم کا معیار بھی متاثر ہوگا۔ ممکن ہے کچھ ذہین اور محنتی طلبہ اس بوجھ کو محسوس نہ کریں لیکن اس کے دوررس اثرات طلبہ کی اکثریت پر بحیثیت مجموعی لازماً منفی ہوں گے اور دینی تعلیم میں بتدریج سطحیت آئے گی اور رسوخ فی العلم کم ہوگا جو پہلے ہی کئی اسباب کی بناء پر روبہ زوال ہے۔

iii۔ جدید تعلیم اور اس میں اچھے نتائج چونکہ اچھی ملازمت ملنے میں ممد ہوں گے لہٰذا دینی تعلیم کی وقعت اور اہمیت بتدریج کم ہوتی چلی جائے گی اور عصری تعلیم کی اہمیت دن بدن شعوری و لاشعوری طور پر بڑھتی چلی جائے گی۔

لہٰذا ہم اس بات کو غیر مفید سمجھتے ہیں کہ دینی مدارس اپنے ہاں موجودہ عصری تعلیم کا انتظام کریں اور دونوں کو علی حالہ قائم رکھتے ہوئے جمع کریں۔ چونکہ یہ معاملہ ابھی ابتدائی مرحلے میں ہے اور کچھ بڑے دینی مدارس نے ہی اس پر عمل شروع کیا ہے اس لیے اس کے بُرے نتائج ابھی واضح ہوکر سامنے نہیں آئے لیکن ہم شعبۂ تعلیم میں اپنے طویل تجربے کی بناء پر پورے یقین سے کہتے ہیں کہ دینی مدارس کو اپنے نظام تعلیم میں موجودہ عصری تعلیم کو جمع کرنے سے نقصان ہوگا۔ **فھل من مدکر؟**

حل کیا ہے؟

سوال یہ ہے کہ اگر دینی مدارس کے لیے اپنے نظام میں موجودہ عصری تعلیم کو جمع کرنا نقصان دہ ہے تو اس مسئلے کا حل کیا ہے؟ دیکھیے! اگر حکومت پاکستان تعاون کرے اور نظام تعلیم سے ثنویت ختم کرنا چاہے اور اسے اسلامی امنگوں اور عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالنا چاہے اور موجودہ اندھی مغرب پرستی کی روش ترک کرنا چاہے تو معاملات سہل ہو سکتے ہیں اور وہ یوں کہ ابتدائی دس بارہ سال کی تعلیم سب مسلمان طلبہ کے لیے مشترک ہو اور یہ ایسی ہو جس سے اسلامی اور عصری دونوں طرح کی ضرورتیں پوری ہونے کی مستحکم بنیاد مہیا ہو جائے اور اس کے بعد علوم وفنون میں تخصص کا مرحلہ ہو جس میں موجودہ دینی مدارس علوم اسلامیہ میں درجہ تخصص کی ڈگری دیں اور سوشل و نیچرل سائنسز کے باقی شعبوں کا نظام و نصاب بھی اسلامی اقدار و مقاصد کے مطابق ہو۔ اس سے نظام تعلیم میں وحدت بھی پیدا ہو جائے گی اور ہمارا تعلیمی مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔

لیکن حکومت پاکستان نے پچھلے ۶۳ سال میں یہ کام نہیں کیا اور اِس وقت ملک کے سیاسی حالات جہاں تک پہنچ چکے ہیں اُن میں اپنے حکمرانوں سے یہ توقع بھی نہیں کی جاسکتی کہ وہ اس معاملے میں کوئی پیش رفت کریں گے☆ گویا اب نظام تعلیم کی مکمل اصلاح و بہتری کی ذمہ داری علماء کرام کے سرآن پڑی ہے کہ تعلیم کا وہ حصہ جو ان کے پاس ہے وہ اسے بھی بہتر بنائیں اور جو عصری تعلیم معاشرے میں مروج ہے اس کی بھی اصلاح کریں۔

یہ کام کیسے ہوسکتا ہے اور اس کے کم ازکم تقاضے کیا ہیں؟ ہم اس بارے میں اپنی طالب علمانہ گزارشات دینی مدارس کے علماء کرام کے غور وفکر کے لیے ان کی خدمت میں پیش کررہے ہیں۔

ابتدائی تقاضا

اس کا سب سے پہلا اور ابتدائی تقاضا یہ ہے کہ سارے وفاقوں کے علماء کرام مل بیٹھ کر سوچیں اور دینی مدارس کے نظام تعلیم کے مقاصد پر نظر ثانی کرتے ہوئے یہ اقرار واعلان کریں کہ مسلمانوں کا نظام تعلیم ایک ہونا چاہیے اور اس میں دین و دنیا کی ثنویت نہیں ہونی چاہیے اور یہ کہ اس نظام تعلیم کا مقصد ایسے افراد کی تیاری ہے جو اچھے اور باعمل مسلمان ہوں، دنیاوی زندگی اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق گزارسکیں اور مسلم معاشرے اور ریاست کو اسلامی مقاصد اور عصری ضرورتوں کے مطابق چلانے میں اپنا کردار ادا کرسکیں اور اس طرح اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرسکیں۔

اس اقرار و اعلان کا تقاضا یہ ہے کہ علماء کرام نہ صرف مذہبی تعلیم کے اُس حصے کا ازسرنو جائزہ لیں اور اسے بہتر ومؤثر بنائیں جو اِس وقت اُن کے زیرانتظام ہے بلکہ تعلیم کے اُس عصری حصے کی اصلاح اور اسے اسلامی امنگوں اور تقاضوں کے مطابق ڈھالنے اور چلانے کی ذمہ داری بھی وہ قبول کریں جو اِس وقت دوسرے لوگوں کے ہاتھ میں ہے اور وہ اسے مغربی تہذیب کے تناظر میں چلا رہے ہیں۔ان دونوں حوالوں سے علماء کرام کی حکمت عملی اور لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے؟ ہم علماء کرام کے غور وفکر کے لیے اس کا ایک خاکہ ان کی خدمت میں پیش کررہے ہیں (جاری ہے)۔

☆ اگرچہ ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر علماء کرام صحیح معنوں میں متحد ہوکر جدوجہد کریں اور حکومت پر دباؤ ڈالیں تو حکومت ان کے مطالبے ماننے پر مجبور ہوجائے گی لیکن اسکے لیے بھرپور جدوجہد کی ضرورت ہے خواہ اس کے لیے ایجی ٹیشن کرنا اور جیل جانا پڑے ـــــ اور ظاہر ہے نظام تعلیم کو اسلامی بنانے کے لیے ایسی جدوجہد علماء کرام نے آج تک کی نہیں۔

ڈاکٹر محمد امین

بچوں کی اسلامی تربیت میں سکول انتظامیہ کا کردار (۲)

چند اعتراضات اور ان کے جوابات

بچے کی اسلامی تربیت میں سکول انتظامیہ کے کردار کے حوالے سے ہم نے جو کچھ کہا ہے اگر چہ وہ بالکل واضح ہے لیکن جس ماحول اور معاشرے میں ہم رہ رہے ہیں، ہمیں احساس ہے کہ ہمارے اس مؤقف پر سکول چلانے والوں کے ذہن میں کئی سوالات پیدا ہوں گے اور اگر چہ ہم سکولوں کے لیے مینوئل/ ہینڈ بک لکھنے بیٹھے ہیں کوئی نظریاتی کتاب نہیں لیکن ہمیں ڈر ہے کہ اگر ہم نے اپنے قارئین کو مطمئن نہ کیا اور ان کے ذہنوں میں اٹھنے والے سوالات کے اطمینان بخش جوابات نہ دیے تو وہ ہمارے اس تربیتی مینوئل پر عمل نہیں کر پائیں گے اس لیے طوالت کے خطرے کے باوجود ہم یہاں سکول انتظامیہ کے افراد کے ذہنوں میں اٹھنے والے ممکنہ سوالات کے جوابات دینا چاہیں گے۔

سوال: آپ نے سطور بالا میں تعلیم کو روزگار اور بزنس بنانے کی مذمت کی ہے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم لوگ سکول بند کر کے کوئی اور کام شروع کر دیں؟

جواب: ہمارا ہرگز یہ مقصد نہ تھا بلکہ ہم یہ کہنا چاہتے تھے کہ لوگوں نے تعلیم کو روزگار اور کاروبار بنالیا ہے لیکن وہ اس کے اسلامی تقاضے پورے نہیں کر رہے اور جو تعلیم وہ دے رہے ہیں وہ ناقص اور غیر اسلامی ہے۔

دیکھیے جناب! مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے تعلیم کبھی مسلم معاشرے میں تجارت اور انڈسٹری نہیں رہی بلکہ ہمیشہ خدمت (service) اور خدمت خلق رہی ہے اور مسلم معاشرہ اس کی اہمیت کے بارے میں اتنا حساس رہا ہے کہ یہ کام اس نے ریاست وحکومت پر بھی نہیں چھوڑا بلکہ اپنے ہاتھ میں رکھا۔ چنانچہ تعلیم مسلم تاریخ میں اکثر و بیشتر پرائیویٹ سیکٹر میں رہی ہے اور ہمیشہ خدمت اسلام اور خدمت خلق کے جذبے سے لوگ اس کے لیے زندگیاں وقف کرتے اور وسائل مہیا کرتے رہے ہیں۔ حکمران، وزراء، امراء اور عام کھاتے پیتے لوگ اس کام کے لیے پیسے، زرعی زمینیں اور عمارتیں وقف کر دیتے تھے اور یوں تعلیمی اداروں کے اخراجات پورے ہوتے رہتے تھے، اساتذہ کی مالی کفالت ہوتی رہتی تھی اور اساتذہ بھی اس کام کو خدمت، مشن بلکہ دینی فریضہ سمجھ کر ادا کرتے تھے نہ کہ اسے محض روزگار کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ پس جس آدمی میں ذوق اور صلاحیت ہوتی تھی اور وہ کار تعلیم میں لگ جاتا تھا تو معاشرہ اس کی کفالت اپنے ذمے لے لیتا تھا۔ ہمارے

معاشرے میں دینی مدارس آج بھی اسی اصول پر کام کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں بھی انگریزوں کے آنے سے پہلے مسلمانوں کا تعلیمی نظام اوقاف (وقف یعنی ٹرسٹ) پر مبنی تھا جس سے لوگوں کی دینی ضروریات بھی پوری ہو رہی تھیں اور معاشرے اور ریاست کو رجال کار بھی مہیا ہو رہے تھے۔

عالمی سطح پر تعلیم کو کاروبار بنانا مغرب کی ملحدانہ فکر اور اس کے سرمایہ دارانہ معاشی نظام کا ثمر ہے جس کے پیش نظر صرف دنیا اور دنیا کی خوشحالی ہے اور ان کے ہاں بزنس سے مقصود صرف نفع اندوزی بلکہ ہر قیمت پر زیادہ سے زیادہ نفع اندوزی ہے جس میں دین اور اخلاق کا کوئی کردار نہیں اور چونکہ مغربی تہذیب اس وقت دنیا کی غالب تہذیب ہے جس نے مسلمانوں کو صدیوں تک محکوم رکھا ہے اور مسلم معاشرہ اس وقت جس ذہنی غلامی، معاشی زبوں حالی اور سیاسی عدم استحکام کا شکار ہے وہ براہ راست نتیجہ ہے اہل مغرب کی حاکمیت، سازشوں اور مسلم دشمنی کا۔ لہٰذا مغربی تہذیب کے تتبع میں مسلم ممالک اور پاکستان میں بھی تعلیم پرائیویٹ سیکٹر میں بڑی حد تک کاروبار بن چکی ہے۔

تعلیم کو کاروبار بنانا کئی لحاظ سے غیر اسلامی ہے۔ بنیادی بات نیت کی ہے جس کا صحیح ہونا اسلام میں بہت ضروری ہے۔ ایک صحابی مکان تعمیر کرا رہے تھے اور انہوں نے کمرے میں روشن دان رکھوایا۔ آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم نے روشن دان کیوں رکھوایا ہے؟ تو اس صحابی نے جواب دیا کہ روشنی اور ہوا کے لیے۔ تو آپ ؐ نے فرمایا اگر تم یہ کہتے کہ روشن دان اس لیے رکھوایا ہے کہ تم اذان کی آواز سن سکتے اور نماز باجماعت کے لیے بر وقت مسجد میں پہنچ سکتے تو روشنی اور ہوا تو پھر بھی آتی رہتی۔ اسی طرح ایک آدمی کسب رزق کے لیے بہت بھاگ دوڑ کر رہا تھا اور آپ ﷺ کی مجلس کے پاس سے گزرا تو کسی صحابی نے تبصرہ کیا کہ کاش یہ اتنی محنت دینی کاموں کے لیے کرتا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر اس آدمی کی نیت اپنے اہل وعیال کو رزق حلال مہیا کرنے کی ہے تو یہ عین دینی کام ہی تو کر رہا ہے۔ اسی طرح ایک مسلمان طبیب/ ڈاکٹر اگر نیت یہ کرے کہ اس نے اللہ کی خوشنودی کے لیے مخلوق خدا کی خدمت کرنی ہے اور ان کے دکھ درد دور کرنے ہیں تو لوگ پھر بھی اس کو دوا کی قیمت اور اس کی مہارت کا معاوضہ تو دیں گے ہی (یا وہ لے سکتا ہے) لیکن اس کے مقابلے میں اگر اس نے طب/ میڈیسن پڑھی اور سیکھی ہی اس نیت سے ہو کہ اس نے اس پیشے سے کروڑوں کمانے ہیں اور لوگوں کو لوٹنا ہے تو ظاہر ہے یہ نیت پہلی کی مقابلے میں بہت کمتر اور بُری ہے۔

ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان اگر پیشۂ تدریس کو اپناتا ہے یا تعلیمی کاموں پر اپنا مال صرف کرتا ہے تو اس کی نیت یہ ہونی چاہیے کہ وہ اللہ کی خوشنودی کے لیے اپنے طلبہ کو اچھا مسلمان

بنائے گا، ان کو دین اور دنیا کی تعلیم دے گا تا کہ وہ اپنے مالک وخالق کی رضا کے مطابق زندگی گزار سکیں تو اس نیت کی وجہ سے اس کا کام عین عبادت اور عین دینی کام بن جائے گا خواہ طلبہ اور ان کے والدین اس کی محنت وکوشش کی بناء پر اس کی خوب مالی خدمت کریں اور وہ آسودہ حال ہو جائے۔ لہٰذا نیت کا درست رکھنا ضروری ہے اور اگر نیت درست ہو اور پیش نظر اللہ کی خوشنودی اور اس کی مخلوق کی خدمت ہو تو سارے دنیوی کام عبادت اور نیکی بن جائیں گے۔ پھر اس نیت کے اچھے اثرات بھی ہوتے ہیں مثلاً اگر کوئی مریض یا طالب علم ڈاکٹر اور استاد کی مالی خدمت اس لیے نہیں کرسکتا کہ وہ مفلس و نادار ہے تو استاد یا ڈاکٹر اس کو پھر بھی تعلیم اور دوا دے گا تا کہ یہ اللہ کے نزدیک اس کی نیکی شمار ہو اور اسے ثواب ملے۔ اس طرح معاشرے میں محبت اور بھائی چارہ بڑھے گا اور یہ رویہ پیدا نہیں ہوگا کہ جو سکول یا ڈاکٹر کی فیس نہیں دے سکتا وہ اسے تعلیم اور علاج ہی سے محروم کر دے۔

تعلیم کو کاروبار سمجھنے کی ذہنیت کا نقصان یہ ہوا ہے کہ زیادہ سے زیادہ نفع اندوزی اور لالچ وحرص نے ان مسلمان علم بیچنے والوں اور تعلیم کو کاروبار سمجھنے والوں کو مغربی تجارتی اخلاق سے بھی محروم کر دیا ہے (اسلامی اخلاق تو غیر متعلق ہو ہی چکے) کیونکہ مغرب کے تجارتی اخلاق کا بھی تقاضا یہ ہے کہ اگر قیمت اچھی وصول کرنی ہے تو مال بھی اچھی کوالٹی کا دیا جائے اور گاہک کی ضرورت اور مرضی کا بھی خیال رکھا جائے۔ لیکن ہمارے تعلیم کو کاروبار بنانے والوں کی اکثریت کا یہ حال ہے کہ وہ قیمت (یعنی فیس) پوری وصول کرتے ہیں لیکن مال (تعلیم) کوالٹی کا نہیں دیتے۔ تعلیم کی اعلیٰ کوالٹی کا تقاضا یہ ہے کہ:

۱۔ استاد اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں لیکن ہمارے یہ علم بیچنے والے اعلیٰ تعلیم یافتہ استاد نہیں رکھتے کیونکہ انہیں تنخواہ زیادہ دینا پڑتی ہے اس لیے یہ کم پڑھے لکھے استاد رکھتے ہیں تا کہ انہیں تنخواہ کم دینا پڑے۔ اس غرض سے یہ تربیت یافتہ اساتذہ بھی نہیں رکھتے کیونکہ انہیں بھی زیادہ تنخواہ دینا پڑتی ہے۔ اور یہ خود بھی ان کی ٹریننگ کا انتظام کر سکتے ہیں لیکن نہیں کرتے کیونکہ اس کے لیے پیسے خرچ کرنے پڑیں گے اور محنت بھی کرنی پڑے گی جبکہ یہ ان دونوں کاموں کے لیے تیار نہیں ہوتے کیونکہ وہ Quality Conscious ہی نہیں ہوتے اور ان کی نیت اعلیٰ کوالٹی کی تعلیم دینے کی ہوتی ہی نہیں۔

۲۔ یہ موزوں نصاب اور نصابی کتب کی تیاری اور فراہمی پر بھی محنت نہیں کرتے۔

۳۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ طلبہ سے زیادہ سے زیادہ فیسیں لیں اور انہیں کم سے کم سہولتیں دیں تا کہ بچت زیادہ سے زیادہ ہو۔

۴۔ ہم نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں پر بھی یہ کم سے کم خرچ کرتے ہیں اور حیلے بہانے والدین سے زیادہ سے زیادہ فنڈز لینے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

۵۔ تعلیم کو اگر تجارت سمجھا جائے تو مال (تعلیم) کا گاہک کی مرضی اور ضرورت کے مطابق ہونا بھی ایک اہم اخلاقی تقاضا ہے لیکن ہمارے تعلیم بیچنے والے اس کا بھی لحاظ نہیں کرتے۔ اپنے بچوں کو ان کے تعلیمی اداروں میں بھیجنے والوں کی اکثریت مسلمان ہوتی ہے اور ایک مسلمان کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ خود وہ خواہ کتنا ہی گنہگار کیوں نہ ہو اپنے بچوں کے لیے اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اچھے مسلمان بنیں۔ لہٰذا ہر مسلمان چاہتا ہے کہ اس کی اولاد لائق ہو، محنتی ہو، اس کے اخلاق اچھے ہوں، کردار اچھا ہو۔ سب مسلم والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کا بچہ جھوٹ نہ بولے، چوری نہ کرے، گالی نہ دے، لڑائی جھگڑا نہ کرے۔ لیکن ہمارے ہاں تعلیم کے سوداگر اس بات کا ذرا لحاظ نہیں کرتے اور بچوں کی ذرا بھی تربیت نہیں کرتے۔

۶۔ پھر ہر معاشرے کو یہ مطلوب ہوتا ہے کہ اس کے تعلیمی ادارے ایسا فرد پروان چڑھائیں جو اس معاشرے کے نظریات و معتقدات کے مطابق ہو، جس کے اخلاق و عادات اور رویے معاشرے سے ہم آہنگ ہوں تاکہ وہ اچھا شہری اور معاشرے کا کارآمد اور مفید کارکن بن سکے لیکن ہمارے سوداگرانِ تعلیم معاشرے کی اس ضرورت کو پورا کرنے کا سامان بھی نہیں کرتے بلکہ وہ مسلمان معاشرے کے لیے کالے انگریز پیدا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اگر بامر مجبوری ہم نے تعلیم کو کاروبار بنا ہی لیا ہے تو بھی ہمارے تعلیمی سوداگروں کو اتنا تو ضرور کرنا چاہیے کہ وہ اعلیٰ کوالٹی کی تعلیم دیں اور ایسی تعلیم دیں جس میں دنیاوی علوم و فنون کے ساتھ ساتھ مؤثر دینی تعلیم بھی ہو۔ بچوں کی اس طرح تربیت کریں جس طرح والدین اور معاشرہ چاہتا ہے یعنی ان کی تعمیر سیرت و کردار اسلامی اصولوں پر کریں اور اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو یہ نہ صرف اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے بلکہ یہ مغرب کے طے کردہ تجارتی اصولوں (Business Ethics) کے بھی خلاف ہے۔

سوال: آپ کا اس بات پر اصرار کہ اسکول اسلامی ہو اور مغربی تہذیب کو رد کرے محض ایک نعرہ اور

تھیوری (Theoretical Assumption) ہے جس کا عملی زندگی کے حقائق سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں تو یہ حالت ہے کہ سکول انگلش میڈیم نہ ہو اور آکسفورڈ کی کتابیں نہ لگوائیں تو والدین اپنے بچے کو ایسے سکول میں داخل ہی نہیں کراتے اور نہ اچھی فیس دینے پر تیار ہوتے ہیں۔شلوار قمیض والے اردو میڈیم سکول کو اب کون پوچھتا ہے؟

جواب: ہمیں آپ کی رائے میں کچھ مبالغہ محسوس ہوتا ہے۔ معاملے کے صحیح فہم کی خاطر یہاں دو باتوں میں فرق کرنا چاہیے: ایک اصولی اور آئیڈیل مؤقف اور دوسرے عملی اصلاح کی خاطر صحیح نیت کے ساتھ لیکن کراہت و مجبوری کے تحت کچھ Compromises کر لینا۔

اصولی اور آئیڈیل مؤقف یہ ہے کہ:

۱۔ ہمارا موجودہ نظام تعلیم دور غلامی کی یادگار اور اس کا تسلسل ہے۔ یہ غلام ذہن کے مغرب زدہ ملازمین پیدا کرنے کے لیے وضع کیا گیا تھا اور یہ وہی کام آج بھی خشوع وخضوع سے کر رہا ہے۔

۲۔ اس میں درخ اندوزی (patch work) یعنی معمولی کمی بیشی سے کوئی بڑی تبدیلی نہیں لائی جا سکتی۔ یہ مکمل اوور ہالنگ مانگتا ہے۔ اگر ہم غلامانہ ذہنیت سے اوپر اٹھ کر سوچ سکیں تو یہ دریا برد کرنے کے قابل ہے یا اس کی راکھ سے ققنس☆ کی طرح ایک نئے نظام کی ولادت درکار ہے۔ جس کے مقاصد اپنے ہوں، اسلامی تقاضوں کے مطابق نیا نصاب ہو، تربیت اساتذہ کا نیا منہج ہو اور جس میں سکولوں کے ماحول کو بدلنے کے لیے ہم نصابی وغیر نصابی سرگرمیوں کو نیا آہنگ دیا جائے۔

۳۔ تعلیم کی ویسٹرنائزیشن کو علی الاعلان پوری شعوری قوت کے ساتھ رد کر دیا جائے کیونکہ:

(i) مغربی فکر وتہذیب ملحدانہ اور کافرانہ فکر وتہذیب ہے اور یہ بات ہم غلامی کے ردعمل اور مغرب کے خلاف تعصب یا نفرت کی وجہ سے نہیں کہہ رہے بلکہ دلائل کی بنیاد پر، مغربی فکر وتہذیب کے مطالعے کے بعد عقلی و منطقی بنیادوں پر کہہ رہے ہیں کہ مغرب کی بنیادی فکر اور اس کا ورلڈ ویو (تصور

☆ ایک فرضی پرندہ جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کے گانے سے اس کے آشیانے میں لکڑیوں کو آگ لگ جاتی ہے جس میں یہ خود جل کر مر جاتا ہے۔ پھر جب کبھی بارش برستی ہے تو اس کی راکھ سے انڈا پیدا ہوتا ہے اور اس انڈے سے دوسرا ققنس پیدا ہوتا ہے۔

انسان، تصور کائنات اور تصور الٰہ) خلاف اسلام ہے☆

مغرب کے ورلڈ ویو کی بنیاد ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم اور ایمپریسزم پر ہے۔ ہیومنزم کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنا خدا خود ہے، کسی 'الٰہ' کا 'عبد' نہیں ہے۔ سیکولرزم کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی نے خدا کو ماننا ہی ہے تو اپنی نجی زندگی میں مان لے لیکن اجتماعی زندگی یعنی معاشرے (سول سوسائٹی) اور ریاست کے امور میں بہرحال خدا کی خدائی کا اتباع نہیں کیا جا سکتا۔ کیپٹل ازم کے مفاہیم کا نچوڑ یہ ہے کہ دنیا کی زندگی ہی سب کچھ ہے انسان کی ساری تگ و دو اور اس کی کوششوں کا محور یہی دنیا کی بہتری اور مادی ترقی و فوائد ہونے چاہئیں اور آخرت کے تصور کو اس کے آڑے نہیں آنا چاہیے۔ ایمپریسزم کا مطلب یہ ہے کہ 'حق' کی بنیاد ہماری حسّوں (senses) سے موصول ہونے والا معلوماتی مواد ہے جس کا ہم اپنی عقل استعمال کرتے ہوئے تجربہ اور مشاہدہ کر سکتے ہیں لہٰذا انسانی زندگی پر وحی اور خدائی ہدایت (یعنی مذہب) کا غلبہ اور حاکمیت (sovereignty) قبول نہیں کی جا سکتی۔

یہ ہے وہ فکر اور ورلڈ ویو جس پر مغرب کی تہذیب کھڑی ہے۔ اب ہر شخص یہ دیکھ اور سمجھ سکتا ہے کہ مغرب کی یہ فکر اور ورلڈ ویو اسلام کی فکر اور ورلڈ ویو کے بالکل متضاد ہے۔ کیونکہ اسلام نام ہی اس چیز کا ہے کہ اللہ ایک ہے، وہ سب سے بڑا ہے۔ خالق، مالک، رب، نفع ونقصان اور زندگی وموت پر قادر ہے اور انسان محض اللہ کا عبد اور بندہ ہے جس کا کام اللہ کی عبادت اور غیر مشروط و لامحدود اطاعت ہے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر گوشے کو محیط ہے اور اس کی زندگی کی آخری غایت اللہ کی خوشنودی کا حصول ہے۔ آخرت کی زندگی کو دنیا پر ترجیح حاصل ہے اور انسان کی ہدایت کا انحصار اللہ تعالیٰ کی رہنمائی یعنی وحی (قرآن وسنت) پر ہے۔ لہٰذا مغرب کی فکر اور ورلڈ ویو خلاف اسلام ہے اور مسلمانوں کے لیے ناقابل قبول ہے۔ خلاصہ یہ کہ مغرب کے علوم اور اس کی تعلیم، اس کا نصاب، اس کا منہج تربیت اساتذہ اور اس کی ساری نصابی، ہم نصابی اور غیر نصابی سرگرمیاں جو اس خلاف اسلام ورلڈ ویو پر مبنی ہیں، مسلمانوں کے لیے ناقابل قبول ہیں۔

(ii) دنیا کی کسی قوم اور ملک نے آج تک اپنی تہذیب چھوڑ کر کسی دوسری تہذیب، اس کے علوم،

☆ یہ بات ہم نے اپنی کئی کتابوں میں تفصیل سے کہی ہے دیکھئے مثلاً 'مسلم نشاۃ ثانیہ — اساس اور لائحہ عمل'، 'اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش' اور 'ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل'۔

اس کی تعلیم، اس کی زبان، اس کے رہن سہن (لائف اسٹائل) اور اس کے لباس کی نقالی کر کے ترقی نہیں کی۔ ہمارے سامنے جاپان اور چین نے ترقی کی لیکن دونوں کا اپنا نظام تعلیم ہے، اپنی زبان ہے، اپنی پالیسیاں ہیں۔ یہاں تک کہ خود یورپ میں فرانس کے فرانسیسی، اٹلی کے اٹالین اور جرمنی کے جرمن انگریزی بولنے سے احتراز کرتے ہیں اور اپنی زبان بولنے، لکھنے اور پڑھنے پر اصرار کرتے ہیں کیونکہ اسی سے ان کی انفرادیت اور پہچان ہوتی ہے لہٰذا اہل پاکستان کو بھی اپنے دین، اپنی تہذیب، اپنی زبان، اپنی تعلیم، اپنے علوم اور اپنی تعلیمی پالیسیوں پر عمل اور فخر کرنا چاہیے اور اس اصول کو کسی عقلی اور منطقی دلیل سے کوئی رد نہیں کر سکتا سوائے اس شخص کے جو امریکہ و یورپ کا ذہنی غلام ہو۔

ان دو اصولوں کو تسلیم کر کے کہ پاکستان کے نظام تعلیم کی اساس اسلامی ورلڈ ویو پر ہونی چاہیے اور مغربی ورلڈ ویو پر مبنی تعلیم رد کی جانی چاہیے (سوائے کچھ محتاط استفادے کے جو خصوصاً نیچرل سائنسز میں ہو سکتا ہے)۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ سکول انتظامیہ کے پاس طلبہ کی اسلامی تعلیم و تربیت کے جو تین بڑے ذرائع ہیں (یعنی نصاب، اساتذہ اور ہم نصابی سرگرمیاں) ان میں اسے کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے (تفصیل میں جانے کی بجائے ہم محض اشارات پر اکتفا کریں گے — تفصیلات کے لیے دیکھئے ہماری کتاب 'ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل')۔

۱۔ نصاب

۔ ہر سطح کی تعلیم کے تمام مضامین کے نصاب، نصابی کتب اور نصابی مواد کی تدوین نو تعلیم کے اسلامی مقاصد اور تناظر میں کی جائے اور ثنویت کا خاتمہ کیا جائے۔

۔ انگلش میڈیم کو فی الفور ختم کر کے اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے اور انگریزی مڈل سے اختیاری مضمون کے طور پر پڑھائی جائے، انگریزی ذریعہ تعلیم انتہائی غیر سائنسی اور تعلیمی لحاظ سے سخت نقصان دہ ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے ہمارا بروشر 'انگلش میڈیم — فائدے اور نقصانات' جو خط لکھ کر بلا معاوضہ طلب کیا جا سکتا ہے)۔

۔ غیر مسلم اور غیر پاکستانی مؤلفین کی نصابی کتابوں کی بجائے معیاری نصابی کتب مقامی طور پر تیار کی جائیں اور غیر ملکی پبلشرز سے بھی معذرت کر لی جائے۔

۔ غیر ملکی یونیورسٹیوں اور امتحانی بورڈوں کے امتحانات (او اور اے لیول اور یونیورسٹیوں کے

سپلٹ پروگرام) ختم کئے جائیں اور مقامی امتحانی نظام کو مؤثر بنایا جائے۔

- نصاب سارے ملک کے لیے یکساں ہونا چاہیے اور یہ شعبہ مرکز کے پاس رہنا چاہیے۔
- نصاب میں مؤثر دینی تعلیم وتربیت کا اہتمام ہونا چاہیے (موجودہ نصاب خاصا ناقص ہے)
- طالبات کا نصاب ان کی صنفی ضرورتوں کے مطابق طلبہ سے الگ ہونا چاہیے

۲۔ اساتذہ

- تربیت کے بغیر کسی استاد کو پڑھانے کی اجازت نہ ہو۔
- تربیت میں فنی پہلو کے ساتھ اخلاقی اور دینی تربیت پر توجہ مرکوز کی جائے اور اساتذہ کو بتایا جائے کہ وہ اپنے طالب علموں کو عملی مسلمان کیسے بنائیں اور خود انہیں رول ماڈل بن کر کیسے دکھائیں ؟ کہ یہی ان کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔
- اساتذہ کی تنخواہیں اور معاشرتی حیثیت بڑھانے کے لیے فوری اقدامات کیے جائیں۔ ایک سادہ فارمولہ یہ ہے کہ ان کی تنخواہیں اور آسائشات دگنی کر دی جائیں تاکہ ذہین اور محنتی لوگ اس شعبے میں آئیں۔

۳۔ انتظامی اقدامات/ ہم نصابی وغیر نصابی سرگرمیاں

- غیر ملکی یونیفارم ختم کر کے مقامی لباس کو رواج دیا جائے اور اسلامی روایات کو ملحوظ خاطر رکھا جائے۔
- مخلوط تعلیم ختم کر دی جائے اور تدریسی سطح پر خواتین اور مردوں کا میل جول ختم کر دیا جائے۔
- تربیت کے لیے عملی اقدامات کئے جائیں

(تفصیل کے لیے دیکھئے ہماری کتاب 'تعلیمی ادارے اور کردار سازی' اور پروفیسر محمد سلیم صاحب کی کتاب 'درسگاہ کی ہم نصابی سرگرمیاں')۔

سطور بالا میں ہم نے جن امور کی نشان دہی کی ہے، سچی بات تو یہ ہے کہ صحیح وہی ہے اور اسی پر عمل ہونا چاہیے لیکن جب حکومت پاکستان ان باتوں پر عمل کرنے اور کرانے کے لیے تیار نہ ہو تو پھر ساری ذمہ داری پرائیویٹ سیکٹر پر آ پڑتی ہے اور دینی جماعتوں اور تحریکوں کا فرض ہے کہ وہ اس تعلیمی صورت حال کی اصلاح کے لیے کوششیں کریں اور تعلیم کے سارے شعبوں کی اسلامی تعلیمات کے مطابق اور مغربی تہذیب کے رد پر مبنی تنظیم نو کے لیے عملی اقدامات کریں مگر ہم افسوس کے ساتھ کہتے

ہیں کہ ہماری دینی تحریکوں اور جماعتوں نے اس معاملے کی طرف کماحقہ، توجہ نہیں دی۔ حالانکہ اگر دینی تحریکیں اصلاح تعلیم کی طرف توجہ دیتیں تو وہ یہ کام کرسکتی تھیں اور ایسے تعلیمی ادارے قائم کرسکتی تھیں جو مالی طور پر منفعت بخش نہ بھی ثابت ہوتے تو وہ اصلاح کی خاطر اس مالی خسارے کو برداشت کرسکتی تھیں لیکن افسوس کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا۔

اب اس صورت حال میں کہ نہ حکومت نظام تعلیم و تربیت میں مندرجہ بالا دو اصولوں کی بنیاد پر اصلاح کے لیے تیار ہے اور نہ دینی تحریکیں و جماعتیں اس پر کماحقہ، توجہ دے رہی ہیں تو ہماری تحریک اصلاح تعلیم (ٹرسٹ) کی طرح کے اکا دکا کم وسائل کے حامل اداروں کو چھوڑ کر باقی لوگ تعلیم میں ویسٹرنائزیشن قبول کرنے پر اور برائے نام اسلامائزیشن کا ذکر کر دینے پر قانع ہوگئے ہیں۔ اس مجمع میں وہ لوگ جو ذاتی لحاظ سے دینی پس منظر رکھتے تھے یا کسی دینی تحریک سے وابستہ تھے جب وہ تعلیم میں بزنس کلچر کو قبول کر کے آئے تو اپنے دینی پس منظر کی وجہ سے نعرہ تو انہوں نے اسلامی تعلیم، اسلامی نظام تعلیم اور دین و دنیا کے حسین امتزاج وغیرہ کا لگایا لیکن عملاً وہ ویسٹرنائزیشن کے جال سے بچ نہ سکے اور Compromises پر اتر آئے اور انہوں نے مجبوری اور معاشرے کے دباؤ کے عنوان سے انگلش میڈیم، آکسفورڈ کی کتابیں، او اور اے لیول، مخلوط تعلیم، مغربی یونیفارم وغیرہ کو قبول کرلیا اور اپنا لیا۔ اس رویے کے جو نتائج نکلے وہ یہ ہیں:

- اس تضاد نے ان کو غیر مؤثر کر دیا کیونکہ نظریاتی اور نفسیاتی لحاظ سے تحرک اور فعالیت اسی وقت آتی ہے جب ذہنی اور فکری یکسوئی ہو اور یہاں اسی کا فقدان تھا۔

- بعض پڑھے لکھے لوگوں نے ان Compromises کو فلاسیفائز کرنے کی کوشش شروع کر دی اور کہنا شروع کر دیا کہ عصر حاضر میں اسلامی تعلیم کا صحیح تصور اور طریقہ ہی یہ ہے اور یہ کہ اسلام زمانے کے ساتھ چلنے سے منع تو نہیں کرتا وغیرہ وغیرہ۔ اور اگرچہ ایسے لوگ اسلامی تحریکوں، تنظیموں کی پبلک میٹنگوں میں مدافعانہ رویہ اختیار کرتے ہیں لیکن اپنے نجی حلقے میں اور اپنے تعلیمی اداروں میں وہ اپنے نقطۂ نظر کو مدلل بنا کر پیش کرتے اور اپنے رویے کو justify کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

- اس رویے کا حتمی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اس نے مسلم معاشرے میں مغرب کی ملحدانہ فکر و تہذیب سے مرعوبیت پیدا کی ہے، معاشرہ مغرب زدہ ہو رہا ہے اور مسلم معاشرے میں مغرب کے علمی، فکری تعلیمی اور تہذیبی غلبے کی راہ ہموار ہوئی ہے اور ان شعبوں میں اسلامی فکر و تہذیب پسپا ہوئی ہے۔

۔ ان دینی عناصر کے ادارے (سول سوسائٹی کے دیگر تعلیمی اداروں سے مل کر) مغربی اثرات کے تحت مسلم معاشرے کی اس معاشی و معاشرتی طبقہ واریت کو مستحکم کر رہے ہیں جن کی بنیاد نظام سرمایہ داری پر ہے اور جس میں ہر سطح کا نچلا طبقہ معیار زندگی کی دوڑ میں اوپر والے طبقے میں شامل ہونا چاہتا ہے اور جیسا کہ تفصیلاً ذکر آرہا ہے کہ اوپر کا ہر طبقہ مغرب زدگی میں آگے بڑھ رہا ہے اور اسلامیت میں پیچھے آرہا ہے۔

۔ بعض اوقات یہ تضاد بھی سامنے آتا ہے کہ ایک دینی تحریک یا جماعت سیاسی سطح پر مغرب کی مخالفت کررہی ہوتی ہے لیکن تعلیمی سطح پر وابستہ افراد اور ان کے ادارے مغربی نظام تعلیم کو اپنائے ہوئے ہوتے ہیں۔

ہماری رائے میں یہ نتیجہ ہے ایمان کی کمزوری کا اور مغربی فکر وتہذیب کے غلبے اور اس کے اثرات کو قبول کرنے کا (خواہ وہ لاشعوری ہی کیوں نہ ہو)۔ اگر اخلاص ہوتا اور ایمان مضبوط ہوتا تو ان دینی عناصر کو چاہیے تھا کہ مسلم نظام تعلیم میں مغرب کے اثرات کی مزاحمت کرتے اور اسی بنیاد پر اپنے تعلیمی ادارے چلاتے۔ اس سے ممکن ہے ان کو آمدنی کم ہوتی لیکن اس ایثار سے معاشرہ اسلام کے قریب آتا اور مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب سے دور ہوتا اور ہمیں یقین ہے کہ اگر ان عناصر کا رویہ مستحکم رہتا اور اس میں تسلسل رہتا تو جلد یا بدیر معاشرہ بھی ان کے نقطۂ نظر کو سمجھنے لگتا اور جدید تعلیم کو اسلامی تناظر میں دینے کے عمل کو اسلامی کاز سمجھنے لگتا اور یوں معاشرے کی حمایت ان عناصر کو میسر آجاتی۔ ہمارے معاشرے میں دینی مدارس کا کامیابی سے چلتے رہنا بلکہ ان میں دن بدن اضافہ ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ قوم تعلیم کے جس کام کو 'دینی' سمجھتی ہے اس کے لیے پھر مالی وسائل کی کمی نہیں رہتی۔ لیکن بدقسمتی سے ان دینی عناصر نے اپنے مؤقف پر قائم رہ کر اسے عوام میں پھیلانے اور ان کی حمایت حاصل کرنے کی بجائے تعلیم میں مغربی تہذیب کا بزنس کلچر اور فیسوں اور ٹیوشنوں کا نظام قبول کرلیا جس کے نتیجہ میں اسلام تو آیا نہیں (اور منطقی طور پر آنا بھی نہیں چاہیے تھا) البتہ مغربیت سکہ رائج الوقت بن چکی ہے اور معاف کیجیے گا مغرب زدگی کا مطلب ہے اسلام کی نفی اور دیس نکالا اور مغرب کی ملحدانہ تہذیب اور کافرانہ اقدار کا غلبہ (جاری ہے)۔

محمد عاصم حفیظ

دینی طبقہ پرنٹ میڈیا کو کیسے استعمال کرے؟

پرنٹ میڈیا یعنی اخبارات، رسائل و جرائد وغیرہ اہم ترین ذرائع ابلاغ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ دینی حلقے زیادہ تر اسی پر انحصار کرتے ہیں جبکہ یہ بھی اچھی بات ہے کہ ہمارے ملک میں سیکڑوں کے حساب سے دینی جرائد شائع ہوتے ہیں۔ اخبارات دینی ایڈیشن شائع کرتے ہیں جبکہ اہم مذہبی تہواروں کے موقعہ پر بھی خصوصی اشاعت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ تصاویر کے معاملے پر معمولی اختلاف کے علاوہ دینی طبقہ اس قسم کی صحافت میں کافی حد تک دلچسپی رکھتا ہے اور شائد یہی وجہ ہے کہ مذہبی جماعتوں کی سب سے زیادہ سرگرمی بھی اسی میدان میں نظر آتی ہے۔ بہت سی جماعتوں نے اپنے اخبارات جاری کرنے کے تجربات بھی کیے ہیں جو کہ کسی حد تک کامیاب بھی رہے ہیں جبکہ علمائے کرام اور دینی سمجھ بوجھ رکھنے والے افراد دیگر اخبارات اور رسائل کے لیے بھی دینی مواد فراہم کرتے رہتے ہیں جس سے عوام الناس کو یقیناً فائدہ پہنچتا ہے۔ ان سب کوششوں کے باوجود اب بھی پرنٹ میڈیا کے میدان میں محنت کی ضرورت ہے۔ میرے خیال میں اس کی بڑی وجہ تربیت یافتہ افراد کی کمی ہے۔ مذہبی جماعتوں کے شعبہ نشر و اشاعت اور مختلف دینی رسائل کے ذمہ داران بغیر کسی پیشہ ورانہ تربیت کے اس کام سے منسلک کر دیے جاتے ہیں۔ یہ بات ایک المیہ سے کم نہیں کہ آج کے اس دور میں کہ جب ذرائع ابلاغ کا شعبہ انتہائی اہمیت اختیار کر چکا ہے دینی اور مذہبی جماعتیں شعبہ نشر و اشاعت میں محض خانہ پری کے لیے تقرریاں کرتی ہیں یعنی جس کسی اہم بندے کے لیے کوئی بھی عہدہ نہ بچے تو اسے شعبہ نشر و اشاعت کا ذمہ دار بنا دیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض بڑی مذہبی جماعتوں کے شعبہ نشر و اشاعت بھی کچھ زیادہ سرگرمی دکھانے میں ناکام رہتے ہیں۔ دراصل یہ لوگ اپنے رہنماؤں کی خبریں چھپوانے کے لیے بھاگ دوڑ میں مصروف نظر آتے ہیں۔ پاکستانی پرنٹ میڈیا کا سٹرکچر کچھ ایسا ہے کہ اس میں حکومتی عہدیداروں کے علاوہ سیاسی، مذہبی اور دیگر شخصیات کو اپنے آپ کو خبروں میں رکھنے کے لیے مخصوص ہتھکنڈے استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ خبریں چھپوانے کے لیے رپورٹرز کی خوشامد اور بعض مواقع پر رشوت بھی دی جاتی ہے۔ خیر بہت سی جماعتیں اس قسم کا خرچہ برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں اس لیے ان کے رہنما ہمیشہ خبروں میں رہتے ہیں۔

ایک اور بات واضح کرنا ضروری ہے کہ اخبارات میں شائع ہونے والی خبریں کبھی بھی دعوتی

حوالے سے مفید ثابت نہیں ہوسکتیں کیونکہ ان کی نوک پلک سنوارنے والے سب ایڈیٹرز ہر خبر کو بے ضرر اور سیاسی ماحول کے مطابق بنا دیتے ہیں۔ اخبار کی خبر نظریاتی پیغام کو واضح نہیں کرتی۔اس سے صرف یہ فائدہ ہوتا ہے کہ بعض رہنما اپنے بیانات کے ذریعے عوامی مقبولیت برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔معمول یہی ہے کہ اخبار میں خبر صرف مشہور علمائے کرام اور سیاست سے منسلک مذہبی رہنماؤں کی ہی چھپتی ہے جبکہ دینی تبلیغ اور خالص علمی کاموں میں مصروف علمائے کرام کو خبروں میں بالعموم جگہ نہیں مل سکتی۔اس وضاحت کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ اخبارات میں بیانات چھپوانے کے لیے دکھائی جانیوالی سرگرمی دینی اور مذہبی جماعتوں کے اصل مقصد کے لیے کچھ زیادہ فائدہ مند ثابت نہیں ہوتی۔اس سے ہرگز یہ مراد بھی نہیں کہ دینی جماعتوں کے عہدیداران اور مذہبی رہنما بالکل ہی اس سے لاتعلق ہو جائیں بلکہ میرا مقصد تو بس یہ کہنا ہے کہ دینی جماعتوں کو چاہیے کہ صرف بیانات چھپوانے کے لیے ہی کوششیں نہ کی جائیں۔دینی حلقے پرنٹ میڈیا سے بے پناہ فوائد حاصل کر سکتے ہیں۔ دینی جماعتوں کے جاری کردہ اخبارات اور رسائل تو ان کے پیغام کے عکاس ہوتے ہی ہیں جبکہ دیگر اخبارات اور جرائد کو بھی دینی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

سب سے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ دینی جماعتیں اپنے زیرانتظام چلنے والے اخبارات اور جرائد کو معیاری بنائیں۔ ان کی تیاری اور اشاعت کو بہتر بنانے کے لیے پیشہ ورافراد کا تقرر کیا جائے۔ ہمارے ہاں ہوتا یہ ہے کہ کسی دینی رسالے کو چلانے اوراس کی تیاری وغیرہ کا کام بھی رضا کارانہ طور پر کارکنوں سے ہی لیا جاتا ہے۔تحریریں مختلف قارئین روانہ کر دیتے ہیں یا پھر زیادہ تر مختلف کتابوں سے اخذ کردہ مواد ہی قسط وار مضامین کی شکل میں شائع کیا جاتا ہے۔ بہت کم دینی رسائل اور اخبارات ایسے ہیں کہ جن میں قارئین کو ان کی ضرورت کے مطابق اور نیا مواد پڑھنے کو ملتا ہے۔ان رسائل کو تیار کرنیوالے افراد کے اخلاص پر تو شک نہیں کیا جا سکتا لیکن پیشہ ورانہ تربیت کی کمی اور تحریروں کو عوامی مزاج کے مطابق نہ ڈھالنے کے باعث دینی رسائل زیادہ مقبولیت حاصل نہیں کر پاتے اور اکثر ایک محدود طبقے تک ہی رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔دینی رسائل میں زیادہ تر تحریریں مشکل پیرائے میں لکھی گئی ہوتی ہیں جو عام لوگوں کے لیے زیادہ کشش نہیں رکھتیں۔اشتہارات کی کمی اور وسائل نہ ہونے کے باعث دینی رسائل مشکل سے ہی معیار برقرار رکھ پاتے ہیں۔اس لیے ضروری یہ ہے کہ دینی طبقہ سب سے پہلے تو اپنے زیرانتظام ہونے والی صحافت کو لوگوں کے لیے زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنائے۔دینی رسائل کا اسلوب زیادہ سے زیادہ عوامی بنایا جائے تاکہ

یہ رسائل زیادہ سے زیادہ لوگوں تک رسائی حاصل کر سکیں ۔ بڑی دینی جماعتیں اور اچھی مالی حیثیت رکھنے والے دینی اخبارات کے لیے مذہبی رجحان رکھنے والے پیشہ ور افراد کو متعین کیا جائے ۔ یا پھر پہلے سے مقرر عملے کے لیے صحافتی اصول وضوابط اور پراپیگنڈا کے طور طریقوں کی تربیت کا اہتمام کیا جائے ۔ دینی رسائل میں چھپنے والی ہر ایک تحریر کو خوب جانچ پرکھ کر آسان فہم بنایا جائے تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے مستفید ہو سکیں ۔ اس کے لیے بعض نامور لکھاریوں سے بھی تحریریں لکھوائی جا سکتی ہیں یا ان سے ایڈیٹنگ کے سلسلے میں مدد لی جا سکتی ہے ۔ یہ لوگ تحریروں کو زیادہ پرکشش بنانے کا فن جانتے ہوتے ہیں جبکہ موضوعات کے انتخاب کے سلسلے میں بھی مفید رہنمائی فراہم کر سکتے ہیں ۔ ضروری نہیں کہ انہیں کُل وقتی ملازم ہی رکھا جائے بلکہ ان سے جز وقتی کام بھی لیا جا سکتا ہے ۔ اکثر اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض اچھے لکھاری دینی حلقے سے عقیدت تو رکھتے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ان کی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کے حوالے سے کوئی میدان عمل موجود ہی نہیں ہوتا ۔ اس لیے دینی جماعتوں کو چاہیے کہ میڈیا کے شعبوں کو مضبوط بنائیں تا کہ ایسے افراد کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا جا سکے ۔

دوسری جانب وسائل کی کمی اور محدود رسائی کی وجہ سے دینی رسائل کے لیے تازہ مواد کی فراہمی انتہائی دشوار گزار مرحلہ ہوتا ہے ۔ اس مقصد کے لیے ہر رسالے کے ذمہ دار کو چاہیے کہ وہ اپنے وسائل کے لحاظ سے ایک پالیسی ترتیب دیں ۔ اگر ممکن ہو تو کسی اچھے، تربیت یافتہ اور دینی سمجھ بوجھ رکھنے والے صحافی کو ہی رسالے کی ادارت دی جائے ۔ اگر یہ ممکن نہیں تو اپنے بندوں کے لیے تربیت کا اہتمام کیا جائے ۔ دیگر اخبارات اور رسائل کی طرح دینی جرائد کے بھی مختلف علاقوں میں نمائندگان کا تقرر کریں جو کہ نہ صرف ان کی اشاعت بڑھانے کا باعث بنیں گے بلکہ مواد کی فراہمی کا بھی باعث ہوں گے ۔ جس طرح اخباری نمائندگان سرکاری، سیاسی اور معاشرتی سرگرمیوں کی رپورٹ بھیجتے ہیں بالکل اسی طرح دینی رسائل کے نمائندگان دینی سرگرمیوں کی رپورٹ بھیجیں جبکہ اس سے بھی ضروری یہ ہے کہ اپنے علاقے کے اہل علم سے اچھی تحریریں لکھوائیں ۔ یہ نمائندگان رسالے کا تعارف کرائیں اور اپنے نظریے کے حامل پڑھے لکھے افراد اور علمائے کرام کو رسالے کے لیے مواد فراہم کرنے پر راضی کریں ۔ اس طرح دینی رسائل کے لیے کافی زیادہ تازہ مواد مل سکتا ہے جس سے یقیناً لوگوں کی دلچسپی بھی بڑھے گی ۔ ان نمائندگان کی رسالے کے لیے اہل علم، دینی رہنماؤں، بزرگوں اور اہم علمائے کرام کے انٹرویوز وغیرہ کرنے کی ڈیوٹی بھی لگائی جا سکتی ہے ۔ دینی جماعتوں کے کارکنان بغیر کسی معاوضے کے یہ ذمہ داری نبھانے پر تیار ہو جاتے ہیں ۔ صرف ان کو چند بنیادی باتوں سے متعلق تربیت

فراہم کر دی جائے۔ انٹرویوز وغیرہ کے لیے ان کو سوالنامہ ایڈیٹر (مدیر) کی جانب سے بھی بھیجا جا سکتا ہے جبکہ ان کی تحریروں کو مزید بہتر اور قابل اشاعت بنانے کی ذمہ داری بھی آخر کار ایڈیٹر کی ہی ہو گی۔

مذہبی رسالے کی اشاعت کے ذمہ دار افراد کے لیے ضروری ہے کہ وہ حالات حاضرہ سے بخوبی آگاہ ہوں اور خالص دینی احکام ومسائل کے ساتھ دیگر موضوعات پر بھی مواد شامل کریں۔ مذہبی جماعتوں کو چاہیے کہ اپنے رسائل میں دینی مسائل کی علمی بحثوں کے ساتھ ساتھ عوامی مزاج کے مطابق تحریریں بھی شائع کریں۔ یعنی کچھ رسائل تو علمی سطح کے ہوں جبکہ بعض کو عوامی بنانے کی کوشش کی جائے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی ایک ہی رسالے میں علمی مباحث اور عوامی تحریروں کو جمع کر دیا جائے۔ دینی رسائل اور اخبارات کو معاشرے کی ضرورتوں کے لحاظ سے تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ لا دین اور سیکولر طبقہ لوگوں کی توجہ دین سے ہٹانے کے لیے پرنٹ میڈیا کو بھرپور طریقے سے استعمال کر رہا ہے۔ دینی طبقہ کو بھی چاہیے کہ ان کے بنائے گئے معیارات کو بدلنے کی کوشش کرے۔ لوگوں کے لیے ایسا متبادل اور دلچسپ مواد پیش کیا جائے جو ایک طرف دینی تقاضوں کو پورا کرتا ہو تو دوسری جانب اس قدر دلچسپ اور عوامی نوعیت کا بھی ہو کہ بڑے پیمانے پر پڑھا جائے۔ انشاء اللہ اس بارے میں اسلامی پروپیگنڈا کے باب میں مزید بحث کی جائے گی۔ دینی رسائل کے ایڈیٹرز معاشرتی مسائل کو زیر بحث لائیں اور ان کے متعلق دینی موقف واضح کریں۔ اپنے قارئین کو عالمی حالات سے آگاہ رکھیں اور رسالے کو متنوع موضوعات سے مزین کریں۔ بچوں، خواتین اور نوجوان طبقے کے لیے مواد کی تیاری ایسی ہونی چاہیے کہ جو انہیں اسلامی روایات کا پاسدار بنانے اور دینی احکام ومسائل کا پابند بنانے میں مددگار ہو۔ اس مقصد کے لیے اخلاص، دینی علم، بھرپور محنت کے ساتھ ساتھ تربیت اور پیشہ ورانہ اصول وضوابط پر عمل پیرا ہونے کی بھی ضرورت ہے۔ نظریات، عقائد، اسلامی روایات اور دیگر مذہبی احکام ومسائل کو بدلنے کی نہیں بلکہ ان کو سمجھانے کی ضرورت ہے۔ اور جس دن اسلامی تحریکوں نے پرنٹ میڈیا کا ایسا استعمال شروع کر دیا کہ جس کے ذریعے عوام کے ایک بڑے طبقے کو متاثر کیا جا سکے تو یقیناً اس سے ایک انقلابی تبدیلی رونما ہو گی۔ بعض دینی رسائل اور اخبارات اس میدان میں اچھی کارکردگی دیکھا رہے ہیں۔ اگر دیگر حلقوں میں بھی یہ جذبہ بیدار ہو جائے جبکہ پہلے سے موجود افراد اپنی محنت میں اضافہ کر دیں تو یقیناً بہت ہی مفید نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

اسی طرح موجود پرنٹ میڈیا کو دینی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا سوال بھی کافی اہم ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان سمیت کہیں بھی پرنٹ میڈیا کو روزانہ ہی کافی زیادہ تازہ مواد کی ضرورت

ہوتی ہے۔خبروں کے علاوہ اخبار یا رسائل کے دیگر حصوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔کالم ،رنگین صفحات ، ایڈیشنز ،خصوصی اشاعتیں اور دیگر سلسلوں کے لیے دینی سوچ اور فہم رکھنے والے افراد کو مواد فراہم کرنا چاہیے ۔دینی جماعتوں کے شعبہ نشر واشاعت کو چاہیے کہ خبریں چھپوانے کے علاوہ اس طرف بھی توجہ دیں ۔ پاکستانی اخبارات میں ہر جمعۃ المبارک کے دن دینی ایڈیشن شائع کیا جاتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ دینی حلقے تمام اخبارات کے ان دینی ایڈیشنز کے لیے ہی مضامین اورعوامی دلچسپی کا مواد فراہم نہیں کر پاتے ۔اکثر ان ایڈیشنز میں مختلف بڑے علماء کرام کی کتابوں کو ہی قسط وار شائع کیا جاتا ہے ۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ دینی سمجھ بوجھ رکھنے والے پڑھے لکھے افراد اور علمائے کرام باقاعدگی سے ان ایڈیشنز میں لکھا کریں ۔ حالات حاضرہ کے مطابق اور ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جائے جن سے اخبار کے قارئین زیادہ متاثر ہوں مثلاً اگر یورپ میں حجاب پر پابندی کا مسئلہ درپیش ہے تو اخبارات کے دینی ایڈیشنز میں دلائل کے ساتھ اسلامی موقف واضح کیا جائے نہ کہ ان دینی ایڈیشنز میں کسی حج وعمرے سے متعلق مسائل کی کتاب کو قسط وار شائع کیا جا رہا ہو۔معاشرتی برائیوں کو اسلامی نقطہ نظر سے بیان کیا جائے ۔کرپشن کے قصے اگر اخبار کی خبروں میں ذکر ہو رہے ہیں تو دینی ایڈیشن میں بدعنوانی ، جھوٹ ، رشوت اور اقربا پروری سے متعلق اسلامی احکامات کا تذکرہ ہو ۔اخبارات میں دینی ایڈیشن کے انچارج کو تو اپنا صفحہ بروقت تیار کرنا ہوتا ہے ۔اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ معاشرے کی دینی ضروریات کا خیال رکھتے ہوئے مواد تلاش کرے۔ یہ ذمہ داری تو دینی جماعتوں کی ہے کہ وہ ایسے مسائل جو معاشرے میں لادینیت پھیلا رہے ہیں یا جن سے اسلامی روایات کو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہے انہیں زیر بحث لائیں۔اسی طرح سنڈے میگزین میں بھی ایک خاص حصہ دینی مضامین کے لیے مختص ہوتا ہے ۔اس میں بھی اچھے مضامین شائع کرائے جا سکتے ہیں ۔سنڈے میگزین میں کافی زیادہ جگہ میسر ہوتی ہے اور اس میں مواد شائع کرانا انتہائی آسان ہوتا ہے ۔اس کے موضوعات بھی سیاسی سے زیادہ معاشرتی طرز کے ہوتے ہیں جبکہ دینی موضوعات کو زیر بحث لایا جا سکتا ہے ۔مثلا اسلام میں عورت کا مقام ،اسلام کا نظریہ تفریح ،اسلام اور مغرب کی کشمکش ، مغرب کی اسلام مخالف سازشیں ،صہیونیت کا کردار ، اسلام کا خاندانی نظام ، معاشرتی تبدیلی میں علمائے کرام کا کردار ،مختلف علمائے کرام کے واقعات ، ان کا تعارف وغیرہ وغیرہ ۔اخبارات کی جانب سے مختلف دنوں کی مناسبت اور تہواروں کے موقعہ پر خصوصی اشاعت کا اہتمام کیا جاتا ہے ۔ اگر دینی جماعتوں کے شعبہ نشر واشاعت سے منسلک افراد کو اس کا احساس ہو تو پہلے سے ہی ان کے

لیے مضامین لکھوائے جا سکتے ہیں ۔ یا پھر علمائے کرام بھی اس کا خیال رکھ سکتے ہیں کہ چند روز بعد فادرز ڈے، مدرز ڈے، مزدوروں کا دن، تمبا کونوشی کے خاتمے کا دن، منشیات کے خلاف دن آنے والے ہیں ۔ ان کے لیے پہلے سے ہی اسلامی تعلیمات کے مطابق مضمون لکھ کر اخبارات کو ارسال کیے جائیں ۔ یقین مانیں کہ یہ مضامین ضرور شائع ہوں گے اور اس طرح عوام کو یہ بھی احساس ہوگا کہ دینی طبقہ معاشرے کی ضروریات سے آگاہ ہے اور ایسے مسائل کو بھی زیر بحث لانے کی صلاحیت رکھتا ہے جو موجودہ دور میں انسانی زندگی کے لیے مشکل پیدا کر رہے ہیں ۔ اس کا دوسرا فائدہ یہ بھی ہے کہ منشیات، تمبا کونوشی، ماں اور باپ کے دن وغیرہ کے حوالے سے صرف لادین اور مغرب زدہ طبقہ ہی سرگرم نہ ہو بلکہ ان مواقع کو اسلامی تعلیمات کے فروغ اور لوگوں میں دین سے متعلق شعور کی بیداری کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے ۔ ہمارے ہاں بہت سے حلقے ایسے دنوں کی مخالفت میں ہی پورا زور لگا دیتے ہیں حالانکہ ان کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہیے ۔ ہاں البتہ کچھ ایسے تہوار اور دن کہ جو اسلامی تعلیمات کے صریح مخالف ہوں اور ان سے بیہودگی اور فحاشی وغیرہ کا تاثر ملتا ہو یعنی ویلنٹائن ڈے، نیو ائیر نائٹ وغیرہ تو ان کی بھرپور طریقے سے مخالفت بھی کی جا سکتی ہے ۔ لیکن یہ مخالفت صرف آپس میں بحث وتکرار تک ہی محدود نہ ہو بلکہ ان تہواروں کو معاشرے کے لیے مضر اور نقصان دہ ثابت کرنے کے حوالے سے بھرپور مہم چلائی جائے اور میڈیا میں مواد فراہم کیا جائے ۔ ان دنوں کے خلاف اسلام اور معاشرتی زندگی کے لیے نقصان دہ ہونے کے حوالے سے مضامین شائع کیے جائیں ۔ اگر دینی سمجھ بوجھ رکھنے والے کسی لکھاری کا مضمون علمی نوعیت اور موقف کی بھرپور ترجمانی کرتا ہوگا تو ضرور شائع ہو جائے گا ۔ اور اگر مضامین، رنگین صفحات اور سنڈے میگزین وغیرہ میں نہ شائع ہونے کا خدشہ ہو تو اسے ایڈیٹر کے نام خط کے طور پر بھیج دینا چاہیے ۔ اخبارات ایڈیٹرز کے نام خط کے کالم میں ہر قسم کا موقف پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ ایڈیٹر کے نام خط بھی ایک اہم جگہ ہے جہاں آپ اپنا موقف واضح کر سکتے ہیں اور اس کالم کو کافی زیادہ پڑھا بھی جاتا ہے ۔ دینی طبقے سے منسلک افراد کو چاہیے کہ وقفے وقفے سے معاشرتی مسائل، دین سے دوری، بے راہ روی، تہذیب کی بربادی، فحاشی وعریانی اور ایسے ہی مسائل کے حوالے سے چھوٹی چھوٹی تحریریں ایڈیٹر کے نام خط میں لکھتے رہیں جو کہ زیادہ تر شائع ہو جاتی ہیں اور بہت سے لوگ ان سے مستفید ہو سکتے ہیں ۔ سنڈے میگزین وغیرہ میں دین سے دوری اور معاشرتی بگاڑ سے متعلق واقعات بھی ارسال کیے جا سکتے ہیں (جاری ہے)۔

تفھیم مغرب (ڈائیلاگ) حمیرا رانا

مسلم ترقی کے لیے مغربی سائنس وٹیکنالوجی ناگزیر ہے

البرھان نے جنوری ۲۰۱۱ء میں سائنس وٹیکنالوجی پر ایک طویل مجلس مذاکرہ کی رپورٹ شائع کی۔ پھر مارچ اور اپریل کے شماروں میں ڈاکٹر نعمان ندوی صاحب کا مضمون شائع کیا جس میں مغربی سائنس وٹیکنالوجی پر تنقید کی گئی تھی۔ اس شمارے میں دونو جوانوں نے اس کے خلاف مختصر ردعمل ظاہر کیا ہے۔ کوئی اہل علم اس بحث میں حصہ لینا چاہیں تو ہم انہیں خوش آمدید کہیں گے۔ امین

مغربی تہذیب آج کل دنیا پہ چھائی ہوئی ہے اور ساری دنیا پر اس کا غلبہ ہے۔ ہر تہذیب اسی تہذیب کے زیر اثر ہے۔ مغربی تہذیب نے جتنی ترقی کی ہے اس حوالے سے ظاہر ہے کہ مغربی تہذیب ہی وہ راستہ ہے جو ترقی کی طرف جاتا ہے۔ دنیا میں اگر نظر دوڑائیں تو ہر میدان میں اہل مغرب نے ترقی کی ہے۔ سائنس، ٹیکنالوجی، فلسفہ، تعلیم وغیرہ میں اور ان کے بتائے گئے سیاسی نظام کامیابی سے چل رہے ہیں۔

ہیومنزم کے تصور نے انسان کو، جو اس کائنات کا مقصد ہے، ترقی دی اور سائنس نے انسان کی ترقی کے لیے اور اس کی آسائش کے لیے نت نئی ایجادات کیں۔ کمپیوٹر، الیکٹرانک کی گھریلو استعمال کی چیزیں، ہوائی جہاز۔۔۔وغیرہ۔ اس نے انسان کے سکھ کے لیے اور سہولت کے لیے کیا کچھ نہیں کیا جن کے بغیر انسان آج کل زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ انسان اگر اس جدید ٹیکنالوجی کو، جو مغربی تہذیب کی پیداوار ہے، چھوڑ دے تو وہ انسانی ترقی کا تصور بھی نہیں کرسکتا اور بہت پیچھے رہ جائے گا کیونکہ مغربی تہذیب نے ہی اس کو جدید سہولیات سے آراستہ کیا ہے۔ ایٹمی ٹیکنالوجی وہ ہے جس کے بغیر انسان قوت حاصل نہیں کرسکتا اور کسی بھی وقت دوسرے ملک کے قبضے میں جاسکتا ہے، گویا اس تہذیب کی جدید ٹیکنالوجی کو اپنائے ہوئے انسان اپنے ملک کی بقاء اور تحفظ کا باعث بن سکتا ہے۔ انٹرنیٹ جو انسان کو گھر بیٹھے جدید معلومات اور تازہ خبروں سے آگاہ رکھتا ہے اب ہر گھر کی ضرورت بن گیا ہے۔ اس سے تعلیمی میدان میں بھی ترقی کی جاسکتی ہے۔ آج کل کے دور میں اس کے بغیر تعلیمی ترقی ادھوری ہے کیونکہ اب کم وقت میں زیادہ معلومات حاصل کرنا ہوتی ہیں جو اس جدید دور کا تقاضا ہے۔ بیرون ملک لوگوں سے رابطہ اور وہاں کے حالات سے آگاہی بھی اسی مغربی تہذیب

کی ٹیکنالوجی کی بدولت ہے۔

اگر ہم مغربی تہذیب کے تعلیمی نظام کو، جو آج کل ہر طرف چھایا ہوا ہے، چھوڑ دیں تو ہم دنیا میں ترقی نہیں کر سکتے۔ اور ان کی تعلیم سے فائدہ نہ اٹھایا تو ہم سائنسی، سیاسی، معاشی ہر میدان میں بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ آج کل کی جو مغربی معاشی پالیسیاں ہیں وہ انسان کے معاشی مستقبل کے لیے بہت افادیت رکھتی ہیں۔ ہم ان کی تہذیب پر یا ان کی پالیسیوں پر عمل نہ کریں تو معاشی ترقی نہیں کر سکتے۔

اس لیے ہمیں دنیا میں ترقی کے لیے مغربی تہذیب کے طور و اطوار کو اپنانا ہوگا تا کہ ہم بھی جدید ٹیکنالوجی سے آراستہ ہوں اور جدید سہولیات سے فائدہ اٹھائیں کیونکہ انسان اسی وقت کامیاب ہوتا ہے جب وہ دوسروں سے آگے بڑھنے کی لگن رکھے اور مثبت پہلو کو اپنائے۔ اس لیے میری رائے میں مغربی تہذیب کا جو منہاج ہے وہ عصر حاضر میں ترقی کے لیے ناگزیر ہے ورنہ ہم ہر میدان میں پیچھے رہ جائیں گے اور اس منہاج پر عمل کر کے ہی ہم دنیا میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

سہیل احمد

مغربی تہذیب کی پیروی میں کوئی حرج نہیں

تہذیب نتیجہ ہوتی ہے انسانی رویوں کا اور ایک کامیاب تہذیب کا مطلب ہی ترقی ہوتا ہے کیونکہ وہ نتیجہ ہوتی ہے ترقی کے لیے پیدا کردہ مناسب ماحول کا۔

مسلمان اِن انسانی رویوں (Humanist behaviour) سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں جو اہل مغرب نے اپنا رکھے ہیں مثلاً وہ بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کا احترام کرتے ہیں یہاں تک کہ جانوروں سے بھی محبت کرتے ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ رویے اسلامی تعلیمات کے مطابق ہیں لہٰذا مسلمان اگر ان جیسے رویوں میں اہل مغرب کی پیروی کریں تو اس میں کیا مضائقہ ہے؟

مغرب نے انقلابی تبدیلیوں کو قبول کر لای اس لیے وہ ترقی کی معراج پانے میں کامیاب ہو گئے سوال یہ ہے کہ مسلمان کیوں اپنی زندگیوں میں انقلابی تبدیلیاں لانے پر غور نہیں کرتے؟ مثلاً یہ دیکھیے کہ ہمارے ہاں 'اورلڈ ہومز' نہیں ہیں لیکن ہمارے ہاں شرح اموات اہل مغرب سے کہیں زیادہ ہے۔ مغرب میں بہت سے لوگ نوے اور سو سال کی عمر پاتے ہیں کیونکہ وہ ہاتھ سے کام کرنا پسند کرتے ہیں اور حفظانِ صحت کے اصولوں کی پابندی کرتے ہیں۔ اگر مسلمان اس معاملے میں اہل مغرب کی تقلید کریں تو اس میں کیا بُرائی ہے؟

مسلم معاشرے میں خواتین پردہ کرتی ہیں جب کہ مغرب میں ایسا نہیں ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ پردے سے اصل مقصود کیا ہے؟ میری رائے میں یہ کہ مناسب حدود کے اندر رہ کر کام کیا جائے اب دیکھیے کہ مغرب میں خواتین کو اکثر معاملات میں مثلاً کھیلوں، تعلیم، ملازمتوں اور تجاورت وغیرہ میں مردوں کے برابر حقوق حاصل ہیں یوں ان کی صلاحیتیں قومی ترقی میں ممد ثابت ہوتی ہیں۔ اس کے بالمقابل ہم مسلمان اپنی خواتین کو پڑھانے لکھانے کے بعد گھروں میں بٹھا لیتے ہیں اور یوں ان کی صلاحیتیں ضائع ہو جاتی ہیں۔

مسلمان معاشرے میں والدین چاہتے ہیں کہ ان کی اولاد ہمشیہ ان کے ساتھ رہے اور جب وہ بوڑھے ہو جاتے ہیں تو بعض اوقات ناخلف اولاد کی ان خدمت نہیں کرتی اور وہ در در کے دھکے کھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اہل مغرب اپنی اولاد کی تربیت آزادانہ ماحول میں کرتے ہیں اور بچوں پر بے جا پابندیاں نہیں لگاتے نتیجتاً بچوں کے اندر خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے اور آزاد زندگی گزارنے میں ان کو کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

یہ اور اسی طرح کی بہت خوبیاں ہیں جو مغربی معاشرے میں موجود ہیں لیکن مسلم معاشرے ان سے محروم ہیں۔ ان معاملات میں اگر مسلمان مغربی تہذیب کی پیروی کریں تو میری طالب علمانہ رائے میں اس میں کوئی ہرج نہیں۔

ملی مجلس شرعی

انتخابات، قراردادیں اور کمیٹیاں

مختصر تعارف: ۱۳ اگست ۲۰۰۷ء کو ڈاکٹر محمد امین صاحب کی تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ کے زیر اہتمام گلبرگ کے ایک سکول میں دینی مدارس کے علماء کرام کی ایک ورکشاپ میں یہ خیال سامنے آیا کہ ایک علمی وفکری مجلس ایسی ہونی چاہئے جس میں تمام مکاتب فکر کے ثقہ علماء کرام شریک ہوں اور جس میں عصری حوالے سے اسلامی معاشرے کو درپیش جدید مسائل پر غور وخوض کیا جا سکے تا کہ عوام کو اسلامی حوالے سے جدید مسائل میں آگہی ورہنمائی میسر آسکے اور مسلکی سطح سے اوپر اٹھ کر علماء کرام کا ایک مشترکہ اوراجتماعی مؤقف سامنے آسکے جس سے اتحاد امت اور بین المسالک ہم آہنگی کو فروغ ملے۔ چنانچہ اس تصور کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ۱۹ اگست ۲۰۰۷ء کو جامعہ نعیمیہ گڑھی شاہو لاہور میں ایک تاسیسی اجلاس منعقد کیا گیا جس میں 'ملی مجلس شرعی' کے نام سے ایک علمی وفکری مجلس کی بناء ڈالی گئی اور اتفاق رائے سے مولانا ڈاکٹر محمد سرفراز نعیمی شہید کو مجلس کا کنوینر اور پروفیسر ڈاکٹر محمد امین صاحب کو رابطہ سیکرٹری بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔

مجلس اب تک مندرجہ ذیل موضوعات پر تمام مکاتب فکر کے جید اور ثقہ علماء کا مشترکہ مؤقف سامنے لا چکی ہے:

۱۔ تصویر اور ٹی وی کی شرعی مقاصد کے لئے استعمال کی اجازت (مطبوعہ ماہنامہ محدث شمارہ جون ۲۰۰۸ء)

۲۔ دینی مدارس کے نظام اور نصابات کی اصلاح

۳۔ پاکستان معاشرے میں بڑھتی ہوئی عریانی وفحاشی کے انسداد اور حیاء وعفت کے فروغ کے لئے پر امن جدوجہد کو منظّم ومتحرک کرنا۔

۴۔ دینی تنظیموں، سیاسی جماعتوں اور سول سوسائٹی کو متوجہ کرنا کہ وہ قومی خود مختاری کے تحفظ اور پاکستان سے غیر ملکی اثرات کے خاتمے کے لئے ایک پرامن عوامی تحریک چلائیں۔

۵۔ مجلس نے تقریباً ایک سال کی محنت سے پاکستان میں متفقہ تعبیر شریعت اور نفاذ شریعت کے متفقہ رہنما اصول وضع کیے ہیں تا کہ اس حوالے سے موجود کنفیوژن ختم ہو اور حکمرانوں، سیاست دانوں، علماء کرام

اور عامۃ الناس کو ایک واضح ڈائریکشن مل جائے۔

مجلس کا مستقبل کا ایک منصوبہ اتحاد بین العلماء کا بھی ہے تا کہ مختلف مکاتب فکر کے علماء کرام کے درمیان بُعد اور اختلاف کم ہو اور فکری ہم آہنگی اور اتحاد و تعاون میں اضافہ ہو۔ مجلس مستقبل میں اپنا دائرہ کار پورے ملک تک وسیع کرنا چاہتی ہے اور اپنا مرکز بنانا چاہتی ہے جس میں بحث و تحقیق کی سہولت بھی ہو اور جس میں سارے دینی مکاتب فکر کے مشترکہ اہداف کے مطابق نشر و اشاعت اور تعلیم و تربیت کا سامان بھی ہو۔

انتخابات: مجلس کے تاسیسی اجلاس میں جن علماء کرام نے شرکت کی تھی، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: مولانا ڈاکٹر محمد سرفراز نعیمی شہید۔ مولانا مفتی محمد خان قادری۔ مولانا حافظ فضل الرحیم۔ مولانا زاہد الراشدی (گوجرانوالہ)۔ مولانا حافظ عبدالرحمٰن مدنی۔ مولانا عبد المالک (منصورہ) مولانا محمد صدیق ہزاروی۔ مولانا عبد الرؤف فاروقی۔ مولانا ارشاد الحق اثری (فیصل آباد)۔ مولانا حافظ صلاح الدین یوسف۔ پروفیسر محمد رفیق چودھری۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد امین۔

مولانا ڈاکٹر سرفراز نعیمی صاحب کی شہادت کے بعد مولانا مفتی محمد خان قادری صاحب کو کنوینر مقرر کیا گیا جب کہ ۱۸ مئی ۲۰۱۱ء کے اجلاس میں اتفاق رائے سے مجلس منتظمہ کا انتخاب کیا گیا ہے جس میں درج ذیل عہدیداران کا بھی تقرر کیا گیا:

صدر	مولانا مفتی محمد خان قادری	**سینئر نائب صدر**	مولانا زاہد الراشدی
نائب صدر	مولانا عبدالغفار روپڑی	**نائب صدر**	مولانا عبدالمالک
نائب صدر	علامہ محمد حسین اکبر	**ناظم اعلیٰ**	ڈاکٹر محمد امین
نائب ناظم اعلیٰ	مولانا خلیل الرحمٰن قادری	**ناظم مالیات**	مولانا راغب حسین نعیمی
ناظم نشر و اشاعت	مولانا شیخ محمد یعقوب		

ارکان مجلس منتظمہ

مولانا حافظ فضل الرحیم	مولانا عبدالرؤف فاروقی	علامہ احمد علی قصوری
مولانا عبدالرحمٰن مدنی	حافظ عاکف سعید	ڈاکٹر فرید احمد پراچہ

قراردادیں

ملی مجلس شرعی کے تحت سارے مکاتب فکر کے علماء کرام نے اپنے اجلاس مورخہ ۱۸ مئی ۲۰۱۱ء میں مندرجہ ذیل قراردادیں اتفاق رائے سے منظور کیں:

قرارداد ۱　　قومی خودمختاری کا تحفظ

افغانستان کے خلاف امریکہ اور اس کے حلیفوں کا ساتھ دینا، انہیں خفیہ معلومات مہیا کرنا، انہیں سامان رسد بہم پہنچانا، اپنے ہوائی اڈے ان کے سپرد کرنا، ڈرون حملوں پر خاموش رہنا، ذلت آمیز شرائط پر ان کی مالی امداد قبول کرنا اور انہیں بلاقید و شمار ویزے جاری کرنا۔۔۔یہ سب پرویز مشرف اور اس کے بعد موجودہ حکومت کے وہ اقدامات تھے جنہوں نے پاکستان کی خودمختاری کا خاتمہ کر کے اسے امریکی کالونی بنانے کی راہ ہموار کی اور اب سانحہ ایبٹ آباد نے تو کسی ممکنہ خوش فہمی کی گنجائش ہی نہیں رہنے دی اور پاکستان کی خودمختاری پر ایسی کاری ضرب لگائی ہے کہ عوام و خواص چیخ اٹھے ہیں۔

ہم ملی مجلس شرعی کے علماء کرام اس صورت حال کی پرزور مذمت کرتے ہیں اور موجودہ سیاسی و عسکری قیادت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ امریکہ کی نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ سے فی الفور دست بردار ہو جائیں جو درحقیقت اسلام اور مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگ ہی کی ایک شکل ہے اور اس سلسلے میں امریکہ سے ہر قسم کا تعاون ختم کر دیں اور اپنے داخلی حالات درست کرنے کی طرف توجہ دیں۔ ہمارے نزدیک آئندہ ایسے کسی سانحے سے بچنے کی واحد مؤثر صورت یہ ہے کہ عوام امریکہ نواز قیادت کا بوجھ سر سے اتار پھینکیں اور امریکی غلامی سے نجات کیلئے قومی خودمختاری کے ایک نکاتی ایجنڈے پر جمع ہو جائیں۔

قرارداد ۲　　توہین قرآن مجید

ملی مجلس شرعی کے سارے مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے علماء کرام کا یہ نمائندہ اجلاس بعض امریکی پادریوں کی طرف سے علی الاعلان قرآن حکیم جلانے کی اور امریکی حکومت کے اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرنے اور ان کے خلاف ایکشن نہ لینے کی بھرپور مذمت کرتا ہے۔ اہل مغرب کی یہ

گھناؤنی سازش ہے کہ وہ بار بار مسلمانوں کے مقدسات کی بے حرمتی کرتے ہیں، کبھی توہین رسالت کرتے ہیں اور کبھی قرآن حکیم کو جلاتے ہیں۔

اس قسم کے واقعات سے نہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انتہا پسند اہل مغرب اوران کے حکمران اسلام اور مسلمانوں سے کس قدر نفرت کرتے ہیں اور ان کے مقدسات کی بے حرمتی کر کے انہیں مشتعل کرتے ہیں تا کہ اگر وہ ردعمل ظاہر کریں تو ان کے خلاف انتہاپسندی اور دہشت گردی کا جھوٹا پروپیگنڈا کیا جاسکے حالانکہ ان کا یہ طرز عمل خود اس بات کی گواہی دے رہاہے کہ ان میں قوت برداشت موجود نہیں اور وہ خود انتہا پسند اور دہشت گرد ہیں۔

ہم مسلم نمائندوں کی حیثیت سے امریکہ کے متعصب اور جنونی پادریوں کی بھرپور مذمت کرتے ہیں اور حکومت پاکستان سے پرزور مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ او آئی سی کے سربراہان اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی وسلامتی کونسل کے ذریعے ایسے واقعات کے سد باب کیلئے مؤثر قانون سازی اور ان پر فوری عملدرآمد کو یقینی بنائے۔ اجلاس حکومت امریکہ سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ مذکورہ دریدہ دہن پادریوں کوسخت سزا دے تا کہ آئندہ کسی کو مسلمانوں کی دل آزاری کی جرأت نہ ہو۔

کمیٹیوں کا قیام

مجلس نے مستقبل کے کاموں کے لیے دوکمیٹیاں قائم کیں:

کمیٹی برائے اتحاد بین العلماء

۱۔ مفتی محمد خان قادری ۲۔مولانا زاہدالراشدی ۳۔ مولانا عبدالمالک
۴۔ مولانا عبدالغفار روپڑی ۵۔ علامہ ڈاکٹر محمد حسین اکبر

کمیٹی برائے اصلاح میڈیا

۱۔ ڈاکٹر فریداحمد پراچہ ۲۔ مرزا ایوب بیگ ۳۔ مولانا مجیب الرحمٰن انقلابی
۴۔ مولانا خلیل الرحمٰن قادری ۵۔ڈاکٹر محمد امین

مدیر کے نام

ایسے دور میں جہاں باتیں بہت زیادہ ہیں، اور عمل بہت کم، باتیں بھی ایسی ہیں کہ ان سے امتِ مسلمہ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، اس کے برعکس ان سے مزید انتشار پیدا ہوتا ہے، ایسے دور میں بہت کم رسالے ایسے ہیں جنہیں میں ذاتی طور پر اوّل سے آخر تک پڑھتا ہوں، انہیں قیمتی اثاثہ سمجھ کر اپنی لائبریری میں خاص جگہ دیتا ہوں، تا کہ مصر میں فخر کے ساتھ اپنے شاگردوں اور دوست احباب کو دکھاؤں، اور اسے پڑھ کر عربی ترجمے کے ساتھ سناؤں۔ آپ کا رسالہ (البرھان) انہی رسائل میں سرفہرست ہے۔ اسلام سے کامل وابستگی اور مسلمانوں سے خلوص ومحبت پر مبنی اداریہ اور قیمتی مضامین اس رسالے کا خاصہ ہے۔ سارے مقالے قارئین کو غور وفکر، سوچ بچار اور فکر وتدبر پر اُکساتے ہیں۔ اور ان کی معلومات میں اضافہ اور فہم و ادراک میں وسعت پیدا کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ رسالہ (البرھان) مسلمانوں کو بیدار کرنے میں اہم کردار کر رہا ہے۔ لہٰذا آپ کو (البرھان) تسلسل کے ساتھ نکالنے پر مبارکباد دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کے لیے جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

ڈاکٹر ابراہیم محمد ابراہیم السید
صدر شعبہ اردو، الازہر یونیورسٹی۔ قاہرہ

اطباء اور طبی اداروں کی توجہ کے لیے

ڈاکٹر محمد امین صاحب کے تعلیمی ٹرسٹ کے پاس سوہاوہ کے قریب پوٹھوہار کے خوبصورت علاقے میں ایک ہزار کنال زمین تعلیمی مقاصد کے لیے موجود ہے۔ مجھے طب مشرق اور طب نبوی سے بہت دلچسپی ہے اور میں اسے اپنے لوگوں کے لیے بہت کارآمد و مفید سمجھتی ہوں۔ اس لیے میری تجویز یہ ہے کہ کوئی طبیب یا طبی ادارہ اس ٹرسٹ کی جگہ پر طبیہ کالج قائم کرے جس کے ساتھ کم از کم ۵۰ بیڈ کا ہسپتال ہو، ادویہ بنانے کی فیکٹری ہو، وسیع نباتاتی باغ ہو جس میں جڑی بوٹیاں اگائی جائیں اور ریسرچ سنٹر ہو۔ یوں اس پراجیکٹ کو طب نبوی کی تاریخ کی پہلی اور تاریخ ساز یونیورسٹی بنا دیا جائے۔

میری رائے میں اس جگہ یہ سارے کام نہ صرف خدمت کے جذبے سے ہو سکتے ہیں بلکہ مالی لحاظ سے بھی مفید ہو سکتے ہیں ۔ میری تجویز یہ ہے کہ اطباء اور طبی ادارے اس امر پر غور فرمائیں اور ڈاکٹر صاحب سے رابطہ کر کے اس نیک اور مفید کام کا جلد سے جلد آغاز کریں۔ امید ہے اللہ تعالیٰ اس پراجیکٹ کو کامیابی سے ہمکنار فرمائے گا۔

پروفیسر شاہدہ چودھری
اقبال کالونی۔ سرگودھا

برائے رابطہ:

سراج محمود ناصر 0300-460 9522
ڈاکٹر محمد امین 0300-435 4673

تالیفات ڈاکٹر محمد امین

تعلیم و تربیت	صفحات	قیمت
۱۔ **ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل۔ چند نظریاتی مباحث** (دوسرا ایڈیشن) اسلامی تناظر میں تعلیمی نظام کی تشکیل نو۔ ماڈل اسلامی سکول، یونیورسٹی اور نظام تعلیم کا عملی خاکہ ثنویت کے خاتمے کا طریق کار، نفاذ اسلام اور مسلم نشأۃ ثانیہ میں تعلیم کا کردار، وغیرہ	۵۴۴	۱۵۰ روپے
۲۔ **ہمارا دینی نظام تعلیم** ☆ دینی تعلیم کے چار وفاقوں کے ذمہ دار علماء سے طویل مشاورت اور مباحثے کے نتیجے میں دینی مدارس کے لیے اصلاحی تجاویز اور متبادل نصاب	۳۱۴	۳۵۰
۳۔ **تعلیمی ادارے اور کردار سازی** اس سوال کا جواب کہ جدید تعلیمی اداروں میں اسلامی نقطہ نظر سے بچے کی تربیت اور کردار سازی کیسے کی جا سکتی ہے؟	۱۵۳	۸۰
۴۔ **جدید اسلامی نصاب تعلیم** ☆ پہلی سے بارھویں جماعت تک، سارے مضامین کے لیے، دینی اور عصری علوم کے امتزاج پر مبنی	۲۳۱	۲۶۰
۵۔ **پاکستان میں تعلیم کی اسلامائزیشن** ☆	۴۲	۴۷
۶۔ **مطالعۂ قرآن وحدیث** (برائے جماعت اوّل تا پنجم) ہر جماعت کے لیے الگ۔ مروجہ دینیات سے الگ اور زائد مطالعہ کے لیے	۲۴۰	۱۹۰
۷۔ **بروشرز**		
۱۔ پرائیویٹ سکولوں کے نام ایک اہم پیغام	۱۲	
۲۔ طلبہ کی اسلامی تربیت۔ کیوں اور کیسے؟	۱۶	
۳۔ انگلش میڈیم۔ فائدے اور نقصانات	۱۲	۵۰
۴۔ دینی مدارس کے نام۔ ایک اہم پیغام	۱۲	
۵۔ والدین کے نام ایک اہم پیغام	زیر طبع	
۶۔ نوجوانوں کے نام ایک اہم پیغام	زیر طبع	

تربیت وتزکیہ

۱۔ **اسلام اور تزکیۂ نفس۔مغربی نفسیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ** ۹۰۴ ۶۰۰

تعمیرِ سیرت کا اسلامی منہج قرآن وسنت کی روشنی میں۔مسلم ادارے اور
تجربات۔مغربی فکر وعمل سے ان کا موازنہ۔ایک علمی،فکری اور تحقیقی تجزیہ

۲۔ **ترکِ رذائل** ۲۹۲ ۱۹۰

بُرے اخلاق،ان کے اسباب،نقصانات اور ان سے بچنے کے عملی طریقے

۳۔ **حقیقتِ تزکیۂ نفس** (سوالاً جواباً) ☆ ۵۵ ۵۲

مختصر،سادہ،عام فہم اور غیر اختلافی انداز میں اہم مسئلے کی وضاحت

۴۔ **حقیقتِ تصوف** ۸ ۵

قرآن وسنت

۱۔ **سورہ یٰسین** زیرِ طبع

دو رنگوں میں،بیک وقت تین تراجم (لفظی،بامحاورہ اور تفسیری)
مع قرآنی عربی الفاظ کے اردو استعمالات کی نشاندہی کے

۲۔ **Riyadh-us-Saliheen (2 Vols)** ۱۴۵۴ ۱,۰۰۰

حدیث اور تزکیۂ نفس کی معروف کتاب ریاض الصالحین
اور اس کے حواشی کا انگریزی ترجمہ

۳۔ **Noble Quran, Part 1** ☆ ۷۰ ۶۰

قرآن حکیم کے پہلے پارے کا انگریزی میں لفظی ولغوی ترجمہ

۴۔ **Noble Quran, Part 2-9** ☆ ۸۳۸ ۹۳۸

پارہ ۲ تا ۹ کا انگریزی میں لفظی ولغوی ترجمہ

فقہ وقانون

۱۔ عصرِ حاضر اور اسلام کا نظامِ قانون ☆ ۲۷۳ ۳۰۰

۲۔ **Islamization of Laws in Pakistan** ۲۵۸ ۲۰۰

پاکستان میں مروجہ قوانین کو اسلامی ڈھانچے میں ڈھالنے کی
جدوجہد کا علمی تجزیہ،ضیاء الحق دور کا خصوصی مطالعہ

۳۔ السلطة التشريعية۔دراسة مقارنة **(عربی)** ☆ ۱۲۹ ۱۹۵

اسلام میں اجتہاد اور مغرب میں قانون سازی کے عمل کا تقابلی مطالعہ

مسلم امہ

۱۔ **مسلم نشأۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل** ۴۰۷ ۲۵۰

اس اہم سوال کا جواب کہ مسلمان کس طرح زوال کے موجودہ گرداب سے نکل سکتے ہیں اور کس طرح دوبارہ غلبہ وعروج سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔ مکمل لائحہ عمل

۲۔ **اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش۔ ایک تجزیہ، ایک مطالعہ** (دوسرا ایڈیشن) زیرِ طبع

۳۔ **جہاد اور دہشت گردی۔ عصری تطبیقات** ۱۳۰ ۱۰۰

۴۔ **مسلمانوں کی ترقی کا واحد راستہ** ۱۲ ۸

سیاسیاتِ اسلام

۱۔ **اسلام اور پاکستان**☆ ۱۲۷ ۱۵۵

پاکستان میں نفاذ اسلام کا صحیح طریق کار

۲۔ **اسلامی انقلاب۔ مفہوم، تقاضے اور حکمت عملی**☆ ۱۳۳ ۱۴۰

۳۔ **سیاسی جماعتوں کی شرعی حیثیت**☆ ۴۵ ۵۰

۴۔ **اسلام اور جدید سیاسی مسائل** زیرِ طبع

اسلام (متفرق)

۱۔ **رزم حق و باطل**☆

ان مسلم داعیوں اور حریت پسندوں کا تذکرہ جنہیں کج فہم مسلم حکمرانوں سے کشمکش کرنا پڑی ۱۱۸ ۱۳۰

۲۔ **مقالاتِ امین (دو جلدیں)**☆ ۱۲۵۸ ۱۳۵۰

ان مضامین ومقالات کا مجموعہ جو مختلف اوقات میں جرائد واخبارات میں چھپتے رہے

۳۔ **عصر حاضر میں تعبیر دین** زیرِ طبع

۴۔ **ایک نئی دینی تحریک کی ضرورت** زیرِ طبع

☆ فوٹو کاپی مہیا کی جا سکتی ہے۔

۔ خرید کتب کے لیے تحریک اصلاح تعلیم کے دفتر سے رابطہ کیجیے، فون نمبر 0300-4609522

۔ مندرجہ بالا قیمتوں میں ڈسکاؤنٹ شامل ہے ڈاک خرچ شامل نہیں جو موجودہ قیمت کا ۱۵% ہوگا۔

طریق ادائی: منی آرڈر یا پے آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ، A-71 فیصل ٹاؤن، لاہور۔

نرمی یا علماء کرام! نرمی

پچھلے دنوں اخبارات پر نظر دوڑاتے ہوئے چند خبریں نظر سے گزریں۔ ایک یہ کہ سعودی عرب میں علماء کرام کی عدالت نے ڈرائیونگ کرنے والی سعودی خاتون کو دس سال سزائے قید دے دی۔ دوسری یہ کہ وسط ایشیائی ممالک میں حسینۂ عالم کے انتخاب میں حصہ لینے والی ایک مسلمان لڑکی کو اسلامی تحریکوں نے قتل کرنے کا فتویٰ جاری کر دیا۔ اور تیسری یہ کہ بعض پاکستانی علماء کرام نے بائبل کے خلاف مقدمہ چلانے کا اعلان کر دیا۔

ہم عرض کرتے ہیں کہ اسلامی اقدار ہم سب کو عزیز ہیں اور ان پر عمل ہونا چاہیے اور مغرب کی ملحدانہ تہذیب کی اندھی پیروی سے باز آنا چاہیے لیکن کیا اسلام صرف جبر اور کوڑوں کا دین ہے؟ کیا اس کی اولین ترجیح سختی اور حدود کا نفاذ ہے؟ شریعت لانے اور نافذ کرنے والے پیغمبر اسلام (ﷺ) نے اس کمزور اور غریب شخص کو معاف کر دیا تھا جس نے رمضان کا روزہ عملاً توڑ دیا تھا، آپ ﷺ نے اس خاتون کی توبہ کو عظیم الشان قرار دیتے ہوئے اس کے لیے دعائے مغفرت کی تھی جس سے زنا کا جرم سرزد ہو گیا تھا اور ایک دفعہ فرمایا کہ میں کعبے کی توسیع کرنا چاہتا ہوں لیکن قریش کے ردعمل کی وجہ سے رکا ہوا ہوں۔ اور فرمایا حضرت عائشہ صدیقہؓ نے کہ اگر اسلام پہلے ہلّے ہی میں شراب نوشی پر پابندی لگا دیتا تو کوئی اس پر عمل نہ کرتا۔ اور فرمایا ماضی قریب کے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے کہ اگر مجھے اقتدار مل جائے تو نفاذ حدود سے پہلے دس سال تک لوگوں کی اصلاح کروں گا۔ اور فرمایا اسلامی انقلاب کی علمبردار جماعت اسلامی کے بانی مولانا مودودیؒ نے قیام پاکستان کے بعد کہ جب تک ماحول کو نہ بدلا جائے حدود نافذ نہیں ہونی چاہئیں!

ہم درخواست کرتے ہیں علماء کرام سے، اسلامی سکالرز سے اور دین نافذ کرنے کی خواہش مند تحریکوں اور جماعتوں سے کہ خدا کے لیے! نرمی، رِفق اور شفقت اللہ کی مخلوق پر اور محمد ﷺ کی امت پر جسے اللہ نے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا اور ایک دوسرے پیغمبر کی زبان سے کہلوایا کہ 'اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ'☆۔ لوگوں پر سختی کرنے سے پہلے انہیں پیار و محبت سے سمجھایئے، ان کے دل و دماغ کو بدلنے کی کوشش کیجیے۔ آپ نفرت کیجیے بدی سے نہ کہ بدوں سے اور گناہ سے نہ کہ گناہگاروں سے۔

☆ حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم سے فرمایا تھا ''اور میں تو جہاں تک بس چلے اصلاح ہی کرنا چاہتا ہوں (ھود۱۱:۸۸)

ڈاکٹر محمد امین

سماجی تبدیلی ــ وقت کی اہم ضرورت

معروف ماہر معاشیات جناب محمود مرزا صاحب کا ایک مضمون سماجی تبدیلی کے حوالے سے ایک مقامی روزنامے میں شائع ہوا ہے۔ ان کی تجویز بہت معقول ہے کہ ہمارے سیاستدانوں کو سماجی تبدیلی کے لیے کام کرنا چاہیے اور قوم کو اسے ہی بطور معیار انتخابات کے وقت سامنے رکھنا چاہیے۔ تاہم، ہمارے ہاں جس قسم کا سیاسی کلچر اور سیاستدان پائے جاتے ہیں، ان سے اس بات کی توقع کم ہی ہے کہ وہ اس طرف آئیں گے۔

البتہ سماجی تبدیلی کے حوالے سے ہمارے ذہن میں ایک تجویز ہے جسے ہم اہل دانش کے سامنے غور وفکر کے لیے پیش کر رہے ہیں تا کہ اگر اس میں وزن ہو تو اس پر عمل در آمد کی راہیں کھلیں۔

ہمارا موقف یہ ہے کہ:

ا۔ سماجی تبدیلی حکم شرعی ہے یعنی اگر مسلمان قرآن وسنت کے احکام پر عمل کریں تو اس کے نتیجے میں سماجی تبدیلی لازماً واقع ہوتی ہے لہٰذا سماجی تبدیلی لانا اور اس کا ذریعہ بننا ہر مسلمان کے لیے ایک شرعی تقاضا ہے مثلاً معاشی شعبے میں اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں کہ غریب کو کھانا کھلاؤ اور اپنا زائد از ضرورت سرمایہ غرباء ومساکین پر خرچ کرو اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہ مومن نہیں ہے جو خود پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا ہمسایہ بھوکا سوئے۔ سماجی شعبے میں فرمایا کہ راستے سے کانٹا ہٹانا بھی صدقہ ہے اور وہ مسلمان نہیں جو دوسروں کی اذیت کا سبب بنے لیکن جب سٹریٹ لائٹ نہیں ہوتی یا گلی کے گٹر اُبل رہے ہوتے ہیں تو ہم بے حسی سے یہ سب دیکھتے رہتے ہیں اور ہمیں ذرا احساس نہیں ہوتا کہ ہم احکام شریعت کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ عدل وانصاف کے ضمن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہر صورت میں عدل کرو خواہ اس کی زد خود تم پر ہی پڑتی ہو اور اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ لوگوں نے کہا مظلوم کی مدد تو واضح ہے ظالم کی مدد کیسے کی جائے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اسے ظلم نہ کرنے دو۔ اسی طرح اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ لوگوں کو اچھی باتوں کا حکم دو اور انہیں بُری باتوں سے روکو تا کہ معاشرے کی اصلاح ہوتی رہے اور بگاڑ اور فساد بڑھ نہ جائے۔

ہم نے اختصار کی خاطر اور محض بطور مثال دو تین شعبوں کی چند دینی تعلیمات کا یہاں ذکر کیا ہے

ورنہ ظاہر ہے زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں اللہ و رسول ﷺ کے احکام اسی طرح کے ہیں لیکن یہ ہماری نالائقی ہے کہ ہم نے دین کو صرف نماز روزے جیسی چند عبادات یا چند ظاہری اعمال جیسے داڑھی بڑھانا، سر ڈھانپنا یا شلوار قمیض پہننا تک محدود کر رکھا ہے۔اسی طرح ہمارے علماء کرام مسجدوں اور مدرسوں میں یہ آیات و احادیث ہمیں سناتے ہیں لیکن عملی زندگی پر ان کا اطلاق نہیں ہو پاتا لیکن صوفیاء کرام نے اسے عملی جہت دی اور ان کے لائحہ عمل میں اللہ کے ذکر اور صحبت صالح کے ساتھ خدمت خلق کا نکتہ بھی لازماً شامل ہوتا تھا یعنی اللہ کو راضی کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی مخلوق کی خدمت کی جائے اور ان کی پریشانیاں اور مشکلات دور کی جائیں۔ یہ عین اسلامی سپرٹ ہے۔

۲۔ ہمارے معاشرے کو جو مسائل آج درپیش ہیں اور جنہوں نے گھمبیر صورت اختیار کر کے زندگی کو بدصورت اور نا قابل برداشت بنادیا ہے اور معاشرہ رہنے کے قابل نہیں رہا، یہ شدید مسائل حل ہو سکتے ہیں یا کم از کم ان میں معتد بہ کمی آ سکتی ہے اگر ہمیں احساس ہو جائے کہ جن امور کا ہمیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہے اور جن سے سماجی تبدیلی واقع ہوتی ہے اور جن سے ہمارے مسائل حل ہو سکتے ہیں، ہم ان پر عمل ہی نہیں کر رہے اور ہم اس کے لیے منظّم و متحرک ہی نہیں ہیں۔ ہمارے مسائل کیا ہیں؟ اتنی غربت کہ لوگ بھوک کے مارے خودکشیاں کر رہے ہیں (معیشت)۔ انصاف کا نہ ملنا کہ برسوں تک عدالتوں میں مقدمے چلتے رہتے ہیں (عدل و انصاف)، شہری سہولتوں کی نایابی جیسے سٹریٹ لائٹ کا نہ ہونا، اُبلتے ہوئے گٹر یا پارکوں میں لاابالی نوجوانوں کی غیر صحت مند سرگرمیاں (معاشرت)۔

۳۔سوال یہ ہے کہ اگر حکومت ہمارے معاشرے کے یہ مسائل حل نہیں کر رہی۔ ہمارے حکمرانوں کو اس کا احساس نہیں یا ان میں اس کی صلاحیت نہیں اور ہماری بیوروکریسی بھی بے حس ہے۔ اور ہمارے وہ سیاستدان جو اس وقت اپوزیشن میں ہیں اور اقتدار میں آ کر ہمارے مسائل حل کرنا چاہتے ہیں (خواہ وہ سیکولر ہوں یا مذہبی) ان کی ساری جدوجہد اور کوششوں کا ہدف سیاست اور سیاسی تبدیلی ہے اور سماجی تبدیلی کے لیے نہ ان کے پاس وقت ہے اور نہ توجہ، تو آخر کیوں نہ ہم سول سوسائٹی کے لوگ جو مسلمان ہیں متحرک اور منظّم ہو جائیں اور ان کاموں کو، جنہیں کرنے کا اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ہمیں حکم دیا ہے، منظّم انداز میں کریں تاکہ ہمارا دینی فریضہ بھی پورا ہو جائے اور لوگوں کے مسائل بھی حل ہو جائیں۔ ہم پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ ممکن ہے۔ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ جو لوگ اس بات کو سمجھیں وہ متحرک اور منظّم ہو کر یہ کام پرائیویٹ سیکٹر میں کریں اور اس میں کوئی امر مانع نہیں۔ یہ کام

آئین اور قانون کی حدود میں رہتے ہوئے مؤثر انداز میں کیا جا سکتا ہے اور جو جمہوریت ہمارے ہاں موجود ہے وہ بہت ناقص اور بُری سہی لیکن اس کام کی گنجائش بہر حال اس میں موجود ہے۔

اس منہج سے زندگی کے ہر شعبے میں کام کیا جا سکتا ہے اور مسائل حل کیے جا سکتے ہیں مثلاً ایسی زکوٰۃ فاؤنڈیشن بنا کر جس میں قوم کے نیک نام، ثقہ اور قابل اعتماد افراد شامل ہوں، زکوٰۃ وصدقات کے کروڑوں روپے جمع کر کے غریبوں محتاجوں کی مدد کی جا سکتی ہے اور صحت اور تعلیم کے منصوبے چلائے جا سکتے ہیں۔ ہر گاؤں، قصبے اور شہر میں مصالحتی عدالتیں بنائی جا سکتی ہیں جن میں مقامی علماء ریٹائرڈ جج وغیرہ شامل ہوں تا کہ لوگوں کو سستا اور فوری انصاف مل سکے۔ ہر محلے میں ایک کمیٹی بنائی جا سکتی ہے جو خدمت خلق اور اصلاح معاشرہ کا کام کرے مثلاً بیواؤں، محتاجوں کی مدد کے لیے مقامی طور پر فنڈز اکٹھے کیے جائیں۔ گلی میں روشنی اور پانی کی نکاسی کی نگرانی ---جیسے کام بھی یہی کمیٹی کر سکتی ہے اور امن و امان کی خاطر محلے کے نوجوانوں کی ڈیوٹی لگائی جا سکتی ہے کہ وہ رات کو باری باری پہرہ دیں تا کہ چوری چکاری سے محفوظ رہا جا سکے۔ غرض ہر شعبۂ زندگی میں مسائل کے حل کے لیے اسی طرح کام کیا جا سکتا ہے مثلاً غریبوں کے لیے ڈسپنسری اور سکول کھولے جا سکتے ہیں، تعمیری میڈیا پروگرام بنائے جا سکتے ہیں---وغیرہ۔ یہ چند باتیں ہم نے بطور مثال عرض کی ہیں ورنہ ہر شعبۂ زندگی کی اصلاح اور مسائل کے حل کے لیے ایک تفصیلی فہرست بنائی جا سکتی ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے ماہنامہ البرہان، لاہور شمارہ مارچ و اپریل میں ہمارا مضمون 'ہمارے معاشرے کا بحران اور اس کا حل')۔

ہماری یہ اسکیم ممکن ہے ان لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے یا انہیں بھلی نہ لگے جو مغربی تہذیب کے زیر اثر سیکولر سوچ رکھتے ہیں ورنہ جہاں تک عام مسلمانوں کا تعلق ہے وہ شریعت کے احکام پر عمل کرنا چاہتے ہیں اور یہ بھی جانتے اور مانتے ہیں کہ شریعت نام ہی ان اصولوں اور تعلیمات کا ہے جو زندگی گزارنے کا طریقہ سکھاتی ہیں اور ان پر عمل دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی کے لیے ضروری ہے۔ ہماری خامی یہ ہے کہ ہم ان تعلیمات پر کما حقہٗ عمل نہیں کرتے ورنہ جس طرح ہمارے اسلاف نے ان تعلیمات پر عمل کیا تھا اور دنیا میں سرخروئی حاصل کی تھی، اسی طرح ہم بھی یہ کر سکتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ سول سوسائٹی کے افراد متحد اور متحرک ہو کر مطلوبہ سماجی تبدیلی کے لیے جدوجہد کر سکتے ہیں اور اپنے بیشتر مسائل حل کر سکتے ہیں خواہ حکومت اور سیاستدانوں کی کمک انہیں نہ بھی حاصل ہو۔ اس طرح کا کامیاب تجربہ ترکی میں گولن تحریک نے کیا ہے، انڈونیشیا میں بھی انہی خطوط پر کام ہو رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم یہ کام پاکستان میں کیوں نہیں کر سکتے؟

دینی مدارس کا نظام تعلیم ونصاب

اصلاحی پیکج پر چاروفاقوں کے علماء کرام کا اتفاق

راقم نے ۲۰۰۰ء میں مجلس فکر ونظر☆ کے پلیٹ فارم سے اہل سنت کے سارے مکاتب فکر کے علماء کرام سے مل کر دینی مدارس کے نظام تعلیم خصوصاً ان کے نصاب کی اصلاح اور اسے مزید مؤثر بنانے کے لیے منظّم جدوجہد کا آغاز کیا۔ اس سلسلے کا پہلا اجلاس جامعہ اشرفیہ لاہور میں ۱۲ جولائی ۲۰۰۰ء کو ہوا اور پھر ایک ورکنگ پیپر تیار کر کے مختلف مکاتب فکر کی جامعات میں اس پر شق وار بحث ہوتی رہی۔ بالآخر ۶ فروری ۲۰۰۱ء کو جامعہ مرکز علوم اسلامیہ منصورہ لاہور میں سارے مکاتب فکر کے علماء کرام کے ایک مشترکہ اجلاس میں متفقہ طور پر ایک اصلاحی پیکج منظور کرلیا گیا اور دینی تعلیم کے چاروں وفاقوں سے تعلق رکھنے والے سارے مکاتب فکر کے علماء کرام نے اس پر اپنے تائیدی دستخط ثبت فرمادیے۔ مذکورہ اصلاحی پیکج کی متفقہ سفارشات کے مندرجات قارئین البرہان کے لیے شائع کیے جارہے ہیں۔ مذکورہ پیکج اور متعلقہ مباحث ہماری کتاب 'ہمارا دینی نظام تعلیم' کا ایک حصہ ہیں جو مکتبہ البرہان سے طلب کی جاسکتی ہے۔ امین

مقاصد

ان سفارشات کا مقصد یہ ہے کہ:

۱۔ دینی مدارس کے طلبہ کے علم میں مزید رسوخ پیدا ہو۔

۲۔ ان کے اخلاق ولٰلّہیت میں اضافہ ہو۔

۳۔ مسلکی تعصّبات کا خاتمہ ہو۔

۴۔ طلبہ میں عصری تحدیات سے نمٹنے کی صلاحیت پیدا ہو۔

علماء کی تیاری کے مقاصد

۱۔ مساجد میں امامت وخطابت اور قرآن ناظرہ وحفظ کے علاوہ ترجمہ قرآن اور تدریس حدیث۔

۲۔ دینی مدارس میں تدریس

۳۔ جدید سکولوں/کالجوں/یونیورسٹیوں میں اسلامی اور عربی علوم کی تدریس وتحقیق

۴۔ عام افراد معاشرہ کی دینی تعلیم اور اصلاح

نصاب درس نظامی

(مدت تدریس: ۸ سال، داخلہ برائے مڈل پاس)

☆ یہ ایک علمی مجلس تھی جسے ملی مجلس شرعی اور تحریک اصلاح تعلیم (ٹرسٹ) کا پیش رو سمجھنا چاہیے۔

اسلامی علوم

۱۔ قرآن حکیم

۱۔ مکمل قرآن حکیم کا لفظی و بامحاورہ ترجمہ مع صرفی ونحوی تراکیب
۲۔ قرآن حکیم کے بعض منتخب حصوں کا تفسیری اور تحقیقی مطالعہ جس میں متنوع مناہج کی تفاسیر (مثلاً اثری، لغوی، فقہی، کلامی، سائنسی اور معاصر تفاسیر) شامل ہوں۔
۳۔ علوم القرآن
۴۔ تجوید کا ایک کورس سب کے لیے۔
۵۔ باقاعدہ درس قرآن کے ذریعے قرآنی مفاہیم ومقاصد کو طلبہ کے ذہن نشین کرانا
۶۔ غیر حفاظ طلبہ کے لیے حفظ کا نصاب
۷۔ آخری سال دورۂ قرآن یعنی مکمل قرآن حکیم کی تدریس
۸۔ ہر وہ مدرسہ جامعہ جہاں مکمل درس نظامی اور دورۂ حدیث کا انتظام ہو۔ وہاں شیخ الحدیث کی طرح شیخ التفسیر کا ہونا ضروری ہو۔

۲۔ حدیث وسیرت

۱۔ صحیح بخاری ومسلم کا بالاستیعاب تحقیقی مطالعہ (جو فرقہ واریت سے مبرا ہو) آخری دورۂ حدیث سے پہلے۔
۲۔ باقی کتب صحاح ستہ کا دورہ آخری سال
۳۔ علوم الحدیث
۴۔ مطالعہ سیرت النبی ﷺ

۳۔ فقہ واصول فقہ

۱۔ فقہ القرآن والسنہ
۲۔ حنفی اصول فقہ
۳۔ حنبلی، مالکی، شافعی، ظاہری اور شیعی اصول فقہ کا مطالعہ
۴۔ ان سب کا تقابلی مطالعہ اور عصر حاضر کے مسائل کے حوالے سے عملی مشق
۵۔ حنفی فقہ کا ایک متن

۶۔ دیگر فقہوں کے منتخب متون کا مطالعہ

۴۔ عقیدہ

۱۔ ماضی کے کلامی مباحث و مذاہب کا منتخب مطالعہ

۲۔ معاصر مذاہب ضالّہ (قادیانیت و پرویزیت)

۳۔ تقابل ادیان

۵۔ منطق

منتخب متون کا تعارفی مطالعہ

۶۔ مطالعۂ احوال امت

۱۔ مسلمانوں کی ماضی کی تاریخ کا اجمالی مطالعہ

۲۔ موجودہ مسلم دنیا کی تاریخ اور جغرافیہ

۷۔ دعوت و تربیت

۱۔ اصول دعوت (دوسروں تک دعوت پہنچانے کے آداب و شروط)

۲۔ گفتگو اور تقریر کی عملی مشق

۳۔ اصول تربیت اور اخلاق (قرآن و سنت اور کتب تزکیۂ نفس سے)

۴۔ اس کی عملی مشق

۸۔ تحقیق

۱۔ ہر ہفتے لائبریری پریڈ

۲۔ ساتویں سال طرق تحقیق کی تدریس و عملی مشق

۳۔ آخری سال تحقیقی مقالہ لکھنا

جدید علوم

۹۔ جدید سماجی علوم (معاشیات، سیاسیات، فلسفہ وغیرہ) کا تعارفی و تنقیدی مطالعہ

۱۰۔ جدید سائنسی علوم (طبیعیات، حیاتیات، کیمیا وغیرہ) کا تعارفی و تنقیدی مطالعہ

۱۱۔ کمپیوٹر ٹیکنالوجی کا تعارفی پیکج

زبانیں

۱۲۔ عربی: سمجھنے کے علاوہ عربی بولنے اور لکھنے (انشاء) کی عمدہ مہارت

ضروری اقدامات

۱۔ عربی کے متخصص اساتذہ کا تقرر
۲۔ طریقہ مباشر اور طریق قواعد کے امتزاج پر مبنی نیا تدریسی منہج
۳۔ پہلے سال کے بعد عربی زبان کے پیریڈ میں اردو بولنے پر پابندی اور آخری دو سالوں میں ذریعہ تعلیم بھی عربی ہو۔
۴۔ پندرہ روزہ بزم ادب اور تقریری و تحریری مقابلے
۵۔ ترجمہ

۱۳۔ اردو: اور دو بولنے اور لکھنے کی عمدہ صلاحیت

اقدامات

۱۔ اردو کے دینی ادب کی تدریس
۲۔ اردو کے متخصص اساتذہ کا تقرر
۳۔ پندرہ روزہ بزم ادب اور تقریری و تحریری مقابلے

۱۴۔ انگریزی: انگریزی پڑھنے، سمجھنے اور بولنے کی متوسط درجے کی صلاحیت

اقدامات

۱۔ متخصص استاد کا تقرر
۲۔ اندازاً بی اے کی سطح تک کی تدریس

۱۵۔ فارسی: پڑھنے اور سمجھنے کی صلاحیت

۱۶۔ علاقائی زبانوں میں اظہار مدعا کی حوصلہ افزائی

دراسات علیا

بڑے دینی مدارس اپنے آپ کو آٹھ سالہ درس نظامی تک محدود نہ رکھیں بلکہ اس کے بعد تخصص اور تحقیق کی تعلیم بھی جاری رکھیں جس کی کچھ تفصیل یوں ہے:

۱۔ درجہ تخصص (درس نظامی کے بعد دو سالہ تحقیقی پروگرام: مساوی ایم فل)
پہلے تین ماہ طرق تحقیق و اساسی موضوعات کی تدریس و تسجیل موضوع

موضوعات

۱۔ قرآن وعلوم القرآن، حدیث وعلوم الحدیث، فقہ واصول فقہ، اسلام اور جدید مسائل وغیرہ

۲۔ درجۂ تحقیق (درجہ تخصص کے بعد ۳ سالہ فل ٹائم اور ۵ سالہ پارٹ ٹائم تحقیقی پروگرام: مساوی پی ایچ ڈی)

موضوعات کی تسجیل کے وقت مندرجہ ذیل امور کا خیال رکھا جائے:

۱۔ تقابلی مطالعے کو ترجیح دی جائے

۲۔ پٹے پٹائے موضوعات کی بجائے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جائے جن کی عصر حاضر اور پاکستانی معاشرے کے حوالے سے اہمیت ہو۔

۳۔ تحقیق میں تخلیقیت اور اصالت پر اصرار کیا جائے۔

متفرق امور

داخلہ: درس نظامی میں داخلہ صرف ایسے مڈل پاس طلبہ کو دیا جائے جو ناظرہ پڑھ سکتے ہوں یا ان حفاظ کو جو مطلوبہ استعداد رکھتے ہوں۔

امتحان: ۱۔ ہر تعلیمی سال کو دو حصوں میں تقسیم کردیا جائے اور ہر حصے کے آخر میں امتحان نہائی ہوجائے۔

۲۔ امتحان میں معروضی سوالات بھی دیے جائیں

۳۔ پاس ہونے کے لیے ۴۰ فیصد نمبر حاصل کرنا ضروری ہوں اور مجموعی طور پر ۵۰ فیصد۔

۴۔ تقریری/زبانی امتحان بھی ہونا چاہیے

تدریس اساتذہ

۱۔ نئے اساتذہ کی تربیت

۲۔ موجودہ اساتذہ کے لیے ریفریشر کورسز

۳۔ ناظمین و مہتممین مدارس کی تربیت

تربیت طلبہ

۱۔ ہر مدرسہ میں تربیت طلبہ کے کام کو اہمیت دی جائے اور اس کو منظم کیا جائے مثلاً اساتذہ میں سے ہر کلاس کا ایک مربی ہو، طلبہ میں سے بھی ایک مربی ہو۔ ناظم مدرسہ (یا اس کا نامزد کردہ استاد) بطور مرکزی مربی کام کرے۔ ان لوگوں پر مشتمل ایک تربیتی کمیٹی ہو جس کا اجلاس ہر ماہ باقاعدگی سے ہو۔

۲۔ ہر امتحان میں عملی تربیت کا ایک پرچہ ہو جس کے ۱۰۰ نمبر ہوں اور اس میں پاس ہونا لازمی ہو۔

۳۔ صالح طلبہ کے لیے حوصلہ افزائی کے انعامات رکھے جائیں۔

۴۔ تربیت کے لیے ذکر وفکر کے ایسے حلقوں اور صحبت صالحین کا اہتمام کیا جائے جہاں قرآن و سنت کی تعلیمات کی سختی سے پابندی کی جاتی ہو۔

۵۔ جس طرح جدید تعلیمی اداروں میں ہفتۂ صفائی منایا جاتا ہے اسی طرح دینی مدارس میں ہفتہ صفائی کے علاوہ اخلاقی تطہیر کے لیے بھی (رذائل سے بچنے اور حصول فضائل کے لیے) ہفتے منائے جائیں اور متعلقہ موضوع کے حوالے سے ہفتہ بھر عملی پروگرام رکھے جائیں۔

متفقہ سفارشات کا خلاصہ

۔ قرآن مجید اور اس کے علوم (تجوید، تحفیظ، تفسیر، دورۂ قرآن وغیرہ) کو نصاب میں مرکزی حیثیت دی جائے

۔ کتب حدیث کے عمومی سریع مطالعے کے ساتھ ساتھ منتخب متون کا علمی اور تحقیقی مطالعہ بھی کیا جائے۔

۔ مطالعہ سیرت النبی ﷺ کو نصاب کا جزو بنایا جائے

۔ فقہ و اصول فقہ میں فقہ مقارن کو رواج دیا جائے۔

۔ عربی زبان اس طرح سکھائی جائے کہ لکھنے، بولنے اور ترجمتین کی صلاحیت بھی طلبہ میں پیدا ہو۔

۔ منطق، فلسفہ اور علم کلام کا مطالعہ تعارفی ہونا چاہیے۔

۔ مسلم تاریخ، معاصر مذاہب ضالّہ، احوال امت، دعوت و اصلاح، تدریس فارسی و اردو اور تقابل ادیان کو بھی نصاب کا حصہ ہونا چاہیے۔

۔ جدید علوم اور ٹیکنالوجی خصوصاً انگریزی زبان، سماجی و سائنسی علوم اور کمپیوٹر کا بھی تعارفی مطالعہ ہونا چاہیے۔

۔ علمی اختلاف برداشت کرنے اور مسلکی تعصب ختم کرنے کی کوشش کی جائے۔

۔ رسوخ فی العلم کے لیے طلبہ میں وسعت مطالعہ اور تحقیق کی عادات پختہ کی جائیں۔

۔ طلبہ کی دینی و اخلاقی تربیت کو بنیادی ہدف قرار دیا جائے۔

متفقہ سفارشات پر مبنی نصاب

اہل سنت کے چار وفاقوں کے سرکردہ علماء کرام کی طرف سے تیار کردہ مذکورہ بالا متفقہ سفارشات پر مبنی ایک نصاب بھی تیار کیا گیا ہے جو ہماری کتاب 'ہمارا دینی نظام تعلیم' میں مطبوعہ موجود ہے۔

متفقہ سفارشات پر علماء کرام کے دستخط

ہمیں ان سفارشات سے اتفاق ہے:

Settings\8822\My Documents\My
Pictures\pic 2.tif not found.

ڈاکٹر محمد امین

دینی مدارس اور عصری تعلیم (۲)

دینی مدارس کو موجودہ صورت میں عصری علوم کی تدریس کا اہتمام اپنے ہاں کرنا چاہیے یا نہیں؟ یہ بڑے دینی مدارس کے لیے ایک اہم سوال ہے۔ ہم نے اس بارے میں اپنی طالب علمانہ رائے پیش کردی ہے کہ انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے اور یہ کہ اس کام کو صحیح طریقے سے کرنے کا منہاج دوسرا ہے۔ ہم درخواست کرتے ہیں کہ علماء کرام بھی اس موضوع پر غور فرمائیں اور اس پر لکھیں۔ البرہان ان کی رائے کو خوشی سے شائع کرے گا۔ امین

اگر علماء کرام نظام تعلیم کی وحدت کا اصول تسلیم کرلیں اور دینی و دنیاوی تعلیم کا فرق ختم کر کے دونوں طرح کی تعلیم کو باہم سمونے اور عصری تعلیم کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کو اپنی ذمہ داری قرار دے لیں اور یہ دیکھتے ہوئے کہ حکومت اس ضمن میں کچھ کرنے کو تیار نہیں، یہ فیصلہ کرلیں کہ تعلیم کی اصلاح کا کام کلی طور پر انہیں خود ہی کرنا ہے۔ صرف دینی تعلیم اور اس کی اصلاح اور اسے مؤثر بنانے کا کام ہی نہیں بلکہ عصری تعلیم اور اس کی اصلاح اور اسے اسلام کے مطابق ڈھالنے اور مغربیت سے بچانے کا کام بھی اب انہیں ہی کرنا ہے اور یہ سابقہ مؤقف ترک کرنا ہے کہ عصری تعلیم ان کی ذمہ داری نہیں، تو انہیں اس بات سے گھبرانا نہیں چاہیے کہ وہ تو بڑی مشکل سے دینی مدارس چلا رہے ہیں، عصری سکولوں کالجوں کے لیے مالی وسائل کہاں سے آئیں گے؟ ہم انہیں یقین دلاتے ہیں کہ قوم ان کا ساتھ دے گی اور جس طرح مسلم قوم نے برصغیر میں مسلم حکومت ختم ہونے کے بعد دینی مدارس بلکہ عصری تعلیم کے اداروں کو بھی زندہ رکھا (علی گڑھ کے علاوہ انجمن حمایت اسلام کے تعلیمی ادارے، پشاور کا اسلامیہ کالج، گجرات کا زمیندار کالج وغیرہ) وہ تعلیم کی کمرشلائیزیشن کے موجودہ مغربی رجحان کے باوجود علماء کرام کے قائم کردہ عصری علوم کے اداروں کے ساتھ بھی مالی تعاون کریں گے۔

اب اگر علماء کرام کو مذہبی اور عصری تعلیم دونوں کی ذمہ داری اٹھانا ہے تو وہ سمجھ سکتے ہیں کہ جو چیلنج انہیں درپیش ہے اس کے تین مرحلے ہیں:

۱۔سکول کی تعلیم ۲۔دینی تعلیم کا تخصص ۳۔عمرانی و سائنسی علوم کے دیگر تخصصات۔ ہر مرحلے پر تعلیم کو اسلامی تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے جو اقدامات کیے جانے مطلوب ہیں ہم برسوں سے

ان پر غور کررہے ہیں اور ان پر کئی مختصر اور مفصل مضامین لکھ چکے ہیں اور کتابیں مرتب کر چکے ہیں☆ تاہم ان کا مختصر ذکر ہم سطور ذیل میں بھی کررہے ہیں تا کہ قارئین کو ہمارے نقطۂ نظر کا کچھ اندازہ ہوجائے۔ البتہ ایک بات ابتداء ہی میں سمجھ لینے کی ہے کہ اس کام کے دو اساسی تقاضے ہیں:

۔ ایک یہ کہ دینی تعلیمات کو نصابی کتب میں اس طرح مؤثر انداز میں سمویا جائے کہ وہ اپنی دیگر خصوصیات کے ساتھ ساتھ عصری تقاضوں اور مسائل کے حل کے طور پر بھی سامنے آئیں اور لازماً ایک ایسی ہمہ جہت اور متوازن شخصیت کو جنم دیں جو دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی کی اہل ہو۔

۔ دوسرے یہ کہ مغربی فکر و تہذیب کو رد کر دیا جائے کیونکہ اس کی اساس ایسے ملحدانہ نظریات پر ہے (جیسے ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم، سائنٹزم، لبرلزم وغیرہ) ہیں جو خلاف اسلام ہیں اور یہود و نصاریٰ کی مسلم خیر خواہی نہ صرف قرآن و سنت کی رو سے مشکوک و کالمعدوم ہے بلکہ عملاً بھی ان کی اسلام اور مسلم دشمنی ہم سب کے تجربے میں ہے لہٰذا مسلم تعلیم میں مغربی فکر و تہذیب کے اثرات کو رد کرنا عین اسلامی تقاضا ہے کیونکہ جب تک ہم مغرب کی ذہنی غلامی سے نہ نکلیں گے ہم نہ آزادانہ سوچ سکیں گے، نہ اسلام کی طرف رجوع کرسکیں گے اور نہ تعلیم (اور دوسرے شعبوں کو) اسلامی تقاضوں کے مطابق ڈھال سکیں گے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ہم اسلام اور مغربی فکر و تہذیب کو جمع نہیں کر سکتے کیونکہ اجتماع ضدین ہونے کی وجہ سے یہ ادغام ممکن ہی نہیں بلکہ اس کا لازمی نتیجہ فکری انتشار و خلفشار ہے اور فکری انتشار کا لازمی نتیجہ ایمان کی کمزوری، شخصیت کا عدم استحکام اور بے کرداری ہے جبکہ اسلامی تعلیمات پر عمل نہ کرنا اور نہ کرسکنا ہی ہماری ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔ اسی لیے ہم نے ابتداء میں کہا تھا کہ تعلیم کی اسلامی تناظر میں تشکیل نو کرتے ہوئے ہمیں مغربی فکر و تہذیب اور مسلم تعلیم میں اس کے اثرات کو شعوری طور پر رد کرنا ہوگا۔

ان دو اصولوں کو سمجھ لینے کے بعد جن کے مطابق ہم نے تعلیم کی اصلاح اور اسلامی تشکیلِ نو کرنا ہے اب آیئے اس تشکیل نو کی بعض تفصیلات کی طرف جن میں سے بعض مطلوبات (یعنی وہ کام جو کرنے چاہئیں) اور بعض منہیات (جو کام نہیں کرنے چاہئیں) کا ذکر ہم یہاں کریں گے۔ تفصیلات کے لیے ہماری دیگر تحریروں کی طرف رجوع کیا جائے۔ اور جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، ابتداء کرتے ہیں اسکول کی تعلیم سے۔

☆ دیکھیے مثلاً ہماری کتب: 'ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل'، 'ہمارا دینی نظام تعلیم' اور 'تعلیمی ادارے اور کردار سازی' وغیرہ یہ کتابیں مکتبہ البرہان سے منگوائی جا سکتی ہیں۔

سکول کی تعلیم (پہلی سے بارھویں تک)

مطلوبات: ۱۔اسلامیات کے موجودہ مضمون کی توسیع کی جائے اور اسے جامع بنایا جائے۔ ۲۔مطالعہ قرآن وحدیث کے مضمون کا اجراء پہلی سے بارھویں تک جن میں پرائمری میں تجوید (یعنی صحیح مخارج کے ساتھ قرآن پڑھنا) اور ناظرہ کی تکمیل مع حفظ نماز و پارۂ عم کی آخری سورتیں مع ترجمہ۔ مڈل میں آخری پارہ اور اہم سورتوں کا حفظ۔ دسویں تک لفظی ترجمے کی تکمیل اور ایف اے (ثانویہ خاصہ) میں تفسیر۔ ۳۔قرآنی عربی پہلی سے بارھویں تک لازمی ہو۔ ۴۔سیکنڈری (ثانویہ) کی سطح پر گورنمنٹ کے اکثر موجودہ امتحانی بورڈز بھی سائنس گروپ اور آرٹس گروپ کی طرح اسلامک سٹڈیز گروپ کے امتحان کی سہولت مہیا کرتے ہیں۔ ان مضامین کی سکول میں باقاعدہ تدریس ہونی چاہیے بلکہ مڈل ہی سے اس کا آغاز کر دینا چاہیے جیسا کہ آج سے کچھ عرصہ پہلے ہوتا تھا، تاکہ جو طلبہ سکول کے بعد دینی تعلیم میں تخصص کرنا چاہتے ہیں انہیں مضبوط بنیاد میسر آجائے۔ نصاب، تدریس اور ماحول ایسا رکھا جائے کہ طلبہ دینی تعلیمات پر عمل کرنے لگیں۔ ۵۔دینی عناصر مل کر ایک نصاب ساز ادارہ بنائیں جو نئے اسلامی مضامین کی نصابی کتب تیار کرے اور دیگر مضامین کی کتب بھی اسلامی تناظر میں مدون کرے۔ ۶۔ دینی عناصر کو چاہیے کہ ایک امتحانی تعلیمی بورڈ حکومت سے منظور کرالیں (جیسے آغا خان نے منظور کرایا ہے) جو حکومت کے مقررہ کردہ مضامین کے ساتھ اسلامی مضامین کا بھی امتحان لے اور سند جاری کرے۔

منہیات: مغرب کی ذہنی غلامی سے بچنے اور دینی تعلیمات پر یکسوئی کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات بالکل ناگزیر ہیں: ۱۔انگریزی ذریعۂ تعلیم کا خاتمہ ۲۔غیر پاکستانی اور غیر مسلم مصنفین اور اداروں کی نصابی کتب کی ممانعت ۳۔او اور اے لیول کے امتحانات کا ترک ۴۔انگریزی یونیفارم اور دیگر مغرب زدہ ہم نصابی سرگرمیوں اور تعلیمی ماحول کا ترک ۵۔ہوشربا فیسوں کا خاتمہ۔

دینی عناصر کو چاہیے کہ وہ نظام تعلیم میں ان مطلوبات کے اضافے اور مذکورہ منہیات کے نصاب سے اخراج کے مطالبات مرکزی اور صوبائی حکومتوں سے منوانے کے لیے متحد ہو کر منظم کوششیں کریں، بھرپور دباؤ ڈالیں اور ناگزیر ہو تو احتجاجی تحریک چلائیں اور اپنے سکولوں میں تو کسی صورت ان پر عمل نہ کریں۔

دینی تخصص کی تعلیم

۱۔ جو دینی مدارس سکول سطح کی تعلیم دینا چاہیں وہ بطور سکول اپنی رجسٹریشن کرالیں ورنہ سکول کے بعد کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کریں۔

۲۔ اگر طلبہ ثانویہ خاصہ کے بعد دینی مدارس میں داخلہ لیں تو ہماری تجویز ہوگی کہ دینی مدارس انہیں ۴ سال میں عالیہ(مساوی بی اے)اورکل ۶ سال میں عالمیہ(مساوی ایم اے) کرائیں۔ہماری حکومت عرصے سے گریجوایشن (بی اے) کو چار سال کا کرنے کی کوشش کر رہی ہے لہٰذا وہ اس کی تجویز کو خوشدلی سے قبول کرے گی۔

۳۔ عربی زبان ابتدائی کلاسوں میں اردو میں اور بعد میں عربی میں پڑھائی جائے اور زبان سیکھنے کی چاروں مہارتیں (سننا، سمجھنا، بولنا اور لکھنا) سکھائی جائیں۔قواعد رٹنے کا طریقہ ترک کر دیا جائے اور طریق مباشر و تطبیق کو ملا کر پڑھایا جائے۔

۴۔ قرآن حکیم کو تدریس میں وافر حصہ دیا جائے۔لفظی ترجمے کے ساتھ تحلیلی و تحقیقی مطالعہ، قدیم و جدید تفسیریں داخل نصاب ہوں۔

۵۔ مطالعۂ حدیث میں آخری سال میں مرور سریع کی بجائے مطالعہ حدیث کا تحقیقی مطالعہ کئی سالوں پر پھیلا دیا جائے اور حجیت حدیث کو شامل نصاب کیا جائے۔

۶۔ فقہ و اصول فقہ میں تقابلی مطالعے کو ترجیح دی جائے یعنی آئمہ اربعہ، اہل ظاہر اور شیعی فقہ کا تقابلی مطالعہ بھی شامل نصاب ہو۔اسی طرح مغربی اور انگریزی قانون بلکہ بعض بین الاقوامی قوانین اور پاکستانی آئین و قوانین کا مطالعہ بھی شامل نصاب ہو۔قرآن و حدیث کی تدریس ہرگز فقہی بنیادوں پر نہ کی جائے۔

۷۔ اسلامی تاریخ و جغرافیہ، اسلامی فکر و تہذیب، اسلامی معاشیات، اسلامی سیاسیات، تقابل ادیان، اسلام اور جدید مسائل اور اسلام اور مغربی فکر و تہذیب جیسے نئے مضامین داخل نصاب کیے جائیں۔

۸۔ مذکورہ بالا مضامین کے عصری مباحث انگریزی زبان میں پڑھائے جائیں اور انگریزی زبان کے فنکشنل استعمال اور بطور علمی و دعوتی زبان کے اس کا مزید مطالعہ بھی ساتھ جاری رکھا جائے۔

۹۔ بڑے دینی مدارس عالمیہ کے بعد جدید یونیورسٹیوں کی طرز پر اسلامی علوم میں تخصص و تحقیق کا عمل جاری

رکھیں اور دو سال میں ایم فل اور مزید تین سال میں پی ایچ ڈی کروائیں ☆ اس غرض سے وہ حکومتوں سے باقاعدہ یونیورسٹی چارٹر بھی لے سکتے ہیں اور موجودہ یونیورسٹیوں کے ساتھ مل کر بھی کام کر سکتے ہیں۔

۱۰۔ معاشرے میں مسلک پرستی اور فرقہ واریت کا زور توڑنے کے لیے اگر دینی مدارس یہ کر سکیں تو بہت اچھا ہو کہ دینی تخصص میں داخلہ مسلک کی بنیاد پر نہ دیا جائے اور نہ اساتذہ کا تقرر مسلک کی بنیاد پر کیا جائے۔ وتلک عشرہ کاملة

دیگر تخصصات

ا۔ دینی عناصر کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ دیگر علوم خصوصاً سوشل سائنسز (معاشیات، سیاسیات، تعلیم، فلسفہ، نفسیات، قانون وغیرہ) اور نیچرل سائنسز (فزکس، کیمسٹری، بیالوجی وغیرہ) کی اسلامی تناظر میں تدوین نو کریں۔ فی الوقت یہ علوم مغرب کی ملحدانہ فکر و تہذیب کے پس منظر میں وضع کئے گئے ہیں او مسلم طلبہ کے لیے بالکل غیر موزوں ہیں۔ یہ انہیں مغربی فکر و تہذیب سے مرعوبیت سکھاتے اور انہیں ذہنی غلام بناتے ہیں اور ان سے اسلام پر ان کی یکسوئی میں خلل پڑتا ہے جس سے مسلم شخصیت غیر مستحکم ہوتی ہے اور بے کرداری جنم لیتی ہے۔ علماء کرام کو حکومت کی توجہ اس طرف مبذول کرانی چاہیے اور اگر وہ کچھ نہ کرے (جیسا کہ توقع ہے) تو دینی عناصر کو اس کام کے لیے ایک بڑا تحقیقی مرکز خود قائم کرنا چاہیے۔

خلاصۂ بحث

دینی مدارس کو موجودہ حالات میں اپنے طلبہ کو مروجہ عصری تعلیم اور اسناد دینے اور دلانے کا کام نہیں کرنا چاہیے بلکہ انہیں تعلیمی ثنویت ختم کرنے کا اعلان کرنا چاہیے اور عصری تعلیم کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے اور اگر وہ متحد و منظّم ہو کر یہ جدوجہد کریں تو یہ ان شاء اللہ کامیاب ہو سکتی ہے۔ جب تک حکومت اصلاح نہیں کرتی اس وقت تک خود دینی عناصر اور علماء کرام کو عصری تعلیم کو اپنی ذمہ داری سمجھنا چاہیے اور اسلامی تناظر میں اس کی اصلاح کر کے اسے مسلمان عوام کو مہیا کرنا چاہیے اور سکول و کالج قائم کرنے چاہئیں۔ اسی طرح دینی مدارس میں دین کی تخصصی تعلیم بھی اصلاح کی متقاضی ہے اور اسے مؤثر بنانے کے لیے اس پر نظر ثانی ناگزیر ہے۔ ان سب امور کے لیے جو تبدیلیاں درکار ہیں ہم نے ان کی طرف اختصار سے اشارہ کر دیا ہے۔ کاش علماء کرام ان امور پر غور فرمائیں۔

☆ ان ڈگریوں کے وہ اپنے نام رکھ سکتے ہیں۔

محمد عاصم حفیظ

مدارس میں میڈیا کی تعلیم

وقت کی ایک اہم ضرورت

آج کے ترقی یافتہ دور میں میڈیا کی اہمیت مسلم ہے۔مختلف قسم کے ذرائع ابلاغ نے ٹیکنالوجی کے سہارے اس وسیع وعریض کرہ ارض کو ایک گلوبل ویلیج میں بدل کے رکھ دیا ہے۔میڈیا نے انسان کو ہر ہر لمحے باخبر رکھنے میں اہم ترین کردار ادا کیا ہے۔آج کے دور کا اہم ترین مسئلہ معلومات کی قلت نہیں بلکہ بے پناہ معلومات کے سمندر نے انسانوں کو فکری پریشانیوں میں مبتلا کر رکھا ہے۔آج کے میڈیا کا سب سے بڑا استعمال ذہن سازی اور مخصوص مقاصد کے لئے کیا جانیوالا پروپیگنڈا ہے ۔میڈیا کے شوروغل نے سچ اور جھوٹ کی پہچان مشکل بنا دی ہے۔ مباحثوں ، خبروں اور دلکش پروگراموں کے ذریعے فکر، سوچ اور ذہن کو مسخر کیا جاتا ہے۔ملکی اور غیر ملکی میڈیا کی بھرپور یلغار کی بدولت آج ہمیں پاکستان کے اسلامی معاشرے میں فحاشی وعریانی، رقص وسروراور سب سے بڑھ کر لادینی جیسی لعنتوں کا سامنا ہے۔ ہندووانہ رسومات عام ہو رہی ہیں جبکہ ہماری ثقافتی روایات روبہ زوال ہیں۔میڈیا کے منفی کردار نے ہی آج پاکستانی نوجوانوں کو مغربی تہذیب کا دلدادہ بنایا ہے۔ بوڑھوں کے نصیب سے مساجد اور عبادات کی لگن چھینی ہے۔ بچوں کو ہندووانہ رسم و رواج سے آشنا کرایا ہے جبکہ حکمرانوں کو روشن خیالی کا درس دیا ہے۔آج کے دور میں میڈیا سے پیچھا چھڑانا ممکن نہیں ہے۔میڈیا سے آگاہی کی آج سب سے زیادہ ضرورت ہے۔اگر ہم معاشرتی ترقی کی منزل پانا چاہتے ہیں تو میڈیا سے ہمقدم ہوتے ہوئے اس بے قابو جن سے دوستی کرنا ہوگی ۔ میڈیا کو اپنی معاشرت وروایات سے ہم آہنگ کرنے کے لئے بھرپور تیاری کی ضرورت ہے۔ذرائع ابلاغ کے کردار وعمل سے آگاہی کے لئے نصاب تعلیم میں ان کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔کس طرح میڈیا معاشروں کو بدلتا ہے، پروپیگنڈا کے رائج طریقوں اور دوسرے اصول وضوابط کا علم ہی لوگوں کو اس کے اثرات سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

دوسرے بہت سے مضامین کی طرح ذرائع ابلاغ کے بارے میں بنیادی علم کو بھی مدارس دینیہ کے نصاب میں شامل کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ یہی وہ طبقہ ہے جس نے صرف اور صرف رضائے الٰہی کی خاطر خود کو دین کی خدمت کے لئے وقف کر رکھا ہے۔دین حنیف کی اشاعت اور معاشرے میں اسلامی روایات کے فروغ کے لئے صرف پاکستان میں ہی لاکھوں بچے دینی مدارس کا رخ کرتے

ہیں۔آج کے دور میں دینی تعلیم کی طرف راغب ہونا کوئی آسان بات نہیں ۔حکومتوں کے سفاک رویے اور مخالفانہ پروپیگنڈے کی بھرمار کے باوجود آج بھی ایسے افراد کی کمی نہیں جو دنیاوی عیش و عشرت کوٹھکرا کرمنبر ومحراب کے وارث بننے پرفخرمحسوس کرتے ہیں ۔دینی مدارس کا رخ کرنے والوں کا مقصد اللہ تعالی کی خوشنودی کی خاطر اپنی صلاحیتوں کو وقف کرنا ہوتا ہے۔اس لئے ضروری ہے کہ ایسے مخلص اور بے لوث طبقے کو ابلاغیات کے جدید اصول وضوابط سے آگاہی حاصل ہو کہ جن کو استعمال کرکے دعوت دین کے کام کومزید مؤثر بنایا جا سکے ۔ ابلاغ کا علم دعوت دین کے لئے انتہائی مفید ثابت ہوسکتا ہے اور دینی مدارس سے فارغ التحصیل ہونیوالے طلبہ میڈیا کے بارے میں جان پہچان ہونے کی وجہ سے معاشرے میں بہتر کردارادا کر سکتے ہیں ۔میڈیا کی یلغار ہی وہ سب سے بڑا چیلنج ہے کہ جس نے معاشرے کے دیگر طبقات کی طرح مدارس دینیہ کے طلبہ وطالبات کوسب سے زیادہ متاثر کیا ہے ۔آج کے بچے کم سنی سے ہی گھنٹوں الیکٹرانک میڈیا سے مستفید ہوتے ہیں جس کا مطلب ہے کہ وہ میڈیا کے استعمال کا بھرپورشعور رکھتے ہیں ۔تفریح کے نام پر ہماری نسلوں کو بدلا جا رہا ہے ۔اس سیلاب کے آگے بند باندھنے کی واحدصورت ان معصوم ذہنوں کوتفریح کے نام پر ہونے والے پروپیگنڈے سے آگاہ کرنا ہے ۔نصاب میں میڈیا سے متعلقہ مضمون شامل نصاب ہونے کی صورت میں یہ طلبہ خودکومغربی و ہندوثقافت کی یلغار سے بہتر طریقے سےمحفوظ کرسکیں گے اور غیرملکی پروپیگنڈے اور دھوکے کی سازش کے بارے میں کم ازکم آگاہی ضرور حاصل کر لیں گے ۔

ہر امتحان کی تیاری سے ہی کامیابی ممکن ہوتی ہے ۔کسی بھی مشینری یا ٹیکنالوجی کا استعمال جانے بغیر اسے مصرف میں لانا ہمیشہ خطرناک نتائج کا باعث بنتا ہے ۔میڈیا بھی ایک ٹیکنالوجی کی مانند ہے جسے استعمال کرنے سے پہلے اس کی بنیادی باتوں کا علم ہونا ضروری ہے ۔میڈیا کے بہتر استعمال کے لئے ماہرین سے رائے طلب کی جائے جو عام لوگوں کومیڈیا کا بہتر طریقے سے استعمال سکھائیں ۔ مثالوں اور حقائق کے ذریعے پروپیگنڈے سے بچنے کا ہنر عام کیا جائے ۔ اسی طرح مدارس کے اساتذہ کے لئے ورکشاپس اور سیمینارز کا اہتمام کیا جانا چاہیے کہ جہاں انہیں ذرائع ابلاغ کے چیلنج سے آگاہ کیا جائے ۔جی ہاں! ہمیں اپنا معاشرہ بچانے کے لئے یہ سب کرنا ہوگا ۔

۔ میڈیا کو برائی کی جڑ قرار دینے کی باتیں تو بہت ہوچکیں ،اب ہمیں چاہیے کہ اس ٹیکنالوجی کو دعوت دین کے لئے استعمال کرنے کی تدبیر کریں ۔اگر مدارس کے طلبہ اور دینی شعور رکھنے والے افراد پیشہ ورانہ طریقے سے میڈیا کو دینی تبلیغ کرنے کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیں تو یقیناً فحاشی وعریانی اور کفر والحاد کی یلغار کوکسی حد تک روکا جا سکتا ہے اور اگر ہماری ہمت جواب نہ دے تو معاشرتی تباہی پھیلاتے اس میڈیا کو اسلامی ثقافت وروایات کا امین بھی بنایا جا سکتا ہے۔ہمیں اپنی نوجوان نسل کو بتانا

ہوگا کہ کیسے تفریح اور غیر جانبداری کی آڑ میں گمراہی پھیلائی جاتی ہے۔ ان غیر ملکی چینلز کے اصل کردار اور مقاصد سے آگاہ کرنا ہوگا جو مخصوص ایجنڈے کی تکمیل میں مصروف ہیں اور ہمارے معاشرے پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔

کیسے اور کس طرح خفی پیغام معاشروں کے بدلنے میں کردار ادا کرتے ہیں۔ ابلاغ عامہ کے مختلف نظریات اور اس شعبے میں ہونے والی تحقیق آسان الفاظ میں سب کو بتانے کی ضرورت ہے۔ یہ سب اس لئے ضروری ہے کہ ہمارے لوگ صرف معصوم صارف ہی بن کر نہ رہ جائیں اور یہ بھی کہ غیر لوگ ان کو اپنے مذموم مقاصد کے لئے استعمال نہ کر سکیں۔ میڈیا کے مندرجات کو سمجھنے والے ہی مخالف پروپیگنڈے سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ اور اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ کفار و سیکولر ذہنوں سے مقابلے کے لیے ہمارے ہراول دستے یعنی مدارس دینیہ کے طلبہ کو یہ ہنر سیکھنے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ ملکی اور غیر ملکی میڈیا سے استفادہ ہرگز بری چیز نہیں لیکن ایسا کرتے ہوئے ہوشمندی سے کام ضرور لینا چاہیے تاکہ آپ کو دھوکہ نہ دیا جا سکے۔ ہمیں اپنے معاشرے کو اتحاد و یکجہتی کے رشتے میں پرونے اور اسلامی روایات کے فروغ کے لئے میڈیا کی مدد چاہیے۔ اسی لئے میڈیا کے علم کو شامل نصاب کرنا ضرور ہے۔ ٹیکنالوجی کے اس ترقی یافتہ دور میں ہمیں اب کمیونٹی جرنلزم کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔ چھوٹے پیمانے پر ہونے والی یہ صحافت ہی وہ اصل طاقت ہے جو معاشرتی تبدیلی لاتی ہے۔ کیبل کے پھیلاؤ کے باعث شہروں کے ٹی وی چینلز سامنے آ رہے ہیں جبکہ ایف ایم ریڈیوز بھی کمیونٹی جرنلزم کی ہی مثال ہیں۔ اس مقصد کے لئے ایسے باشعور افراد کی ضرورت ہے جو بہتر طریقے سے اپنی کمیونٹی کی نمائندگی کر سکیں۔ چھوٹے پیمانے پر ہونے والی اس صحافت کا مواد بھی عام شہری ہی فراہم کرتے ہیں۔ اگر ہمارے طلبہ مدارس میں میڈیا کے استعمال سے آگاہ ہوں گے تو ان کے لئے یہ سب کرنا آسان ہوگا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد بلکہ دوران تعلیم ہی یہ طلبہ اس قابل ہو جائیں گے کہ میڈیا کو اسلامی نہج پر چلانے کے لئے اپنا حصہ ڈال سکیں۔ کسی بھی عالمی یا ملکی مسئلہ پر اسلامی نقطہ نظر کو واضح کر سکیں گے۔ پرنٹ، کمیونٹی، براڈ کاسٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر اپنی رائے دینے کے قابل ہو جائیں گے۔

اسی طرح ابلاغ عامہ کے ماہرین کو بڑے مدارس کے سٹاف میں شامل کرنے کی ضرورت ہے تاکہ طلبہ و طالبات میں حالات حاضرہ کے بارے میں شعور بیدار ہو۔ کسی بھی اہم ملکی یا غیر ملکی مسئلہ پر یہ لوگ طلبہ کو معلومات فراہم کریں۔ میڈیا کے مندرجات اور ان کے اثرات سے آگاہ کریں۔ طلبہ کو ملکی مسائل پر لکھنے اور اپنے رائے دینے کا ہنر سکھائیں۔ صرف اسی طرح طلبہ کو قومی و عالمی معاملات سے آگاہ رکھا جا سکتا ہے جو ان میں یقیناً بہتر تبدیلیاں پیدا کرے گا۔

مدارس میں میڈیا کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد طلبہ و طالبات سب سے زیادہ سوشل میڈیا کو استعمال کر سکتے ہیں جو انتہائی سستا اور تیز ترین ذریعہ ہے۔ سوشل میڈیا ذرائع ابلاغ کی ایک نئی قسم ہے۔ موبائل اور انٹرنیٹ ٹیکنالوجی میں تیز رفتار ترقی کی بدولت پیغام رسانی انتہائی آسان ہو چکی ہے اور دنیا بھر میں ہونے والے کسی بھی واقعے کی خبر چند سیکنڈز کے اندر آپ تک پہنچ جاتی ہے۔ ذرائع ابلاغ کی ان نئی اقسام نے معاشرے میں اثرات اور معلومات کی فراہمی کے حوالے سے پرنٹ، الیکٹرانک اور براڈ کاسٹ میڈیا کو کافی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ موبائل فون اب ہر شخص کی ضرورت بنتا جا رہا ہے۔ یہ ہر وقت آپ کے ساتھ ہوتا ہے اور اسی لئے تیز ترین رسائی کا ذریعہ بھی ہے۔ ٹی وی یا ریڈیو تو تب ہی ابلاغ کا کام کر سکیں گے کہ جب آپ اس جگہ جہاں یہ آلات موجود ہوں جائیں اور چلا کر اہتمام سے دیکھیں یا سنیں، اسی طرح اخبار سے مستفید ہونے کے لئے بھی اس کو خریدنے اور بغور پڑھنے کا مرحلہ آتا ہے۔ سوشل میڈیا کا دائرہ کار اس حوالے سے کافی وسیع ہے۔ یہ تو ہر وقت آپ کے ہاتھ میں موجود موبائل فون کے ذریعے معلومات فراہم کرتا ہے جب کہ انٹرنیٹ کی سہولت بھی اب زیادہ تر موبائل فونز پر موجود ہے۔ سوشل میڈیا معلومات کی فراہمی میں دیگر ذرائع ابلاغ سے سبقت رکھتا ہے جبکہ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ اسے اپنی پسند کے مطابق استعمال کیا جا سکتا ہے۔ سوشل میڈیا کے حوالے سے میڈیا کی تعلیم سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ یہ ایک انتہائی طاقتور ہتھیار ہے جیسے نادان ہاتھوں میں نہیں دیا جا سکتا۔ نوجوانوں میں اس حوالے سے شعور بیدار کرنے کی ضرورت ہے کہ ان کی بنائی ہوئی ویڈیو یا تصویر کہاں تک پہنچ سکتی ہے اور اس کے ذریعے کیا کیا مقاصد حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ موبائل فون کے ذریعے ویڈیو بنا کر بلیک میل کیا جاتا ہے۔ اس لئے اگر بچوں کو موبائل ویڈیو کے اثرات سے آگاہ نہ کیا گیا تو مستقبل میں تباہ کن نتائج نکل سکتے ہیں۔ مذاق مذاق میں بنائی گئی ویڈیو کسی کی زندگی بھی لے سکتی ہے یا پھر کسی عزت دار گھرانے کو بدنام کیا جا سکتا ہے۔ اکثر اوقات شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں موبائل کیمرہ کا کثرت سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ نوجوانوں کو اس بارے میں آگاہی دینے کی ضرورت ہے کہ یہ سب کس طرح ان کی زندگی کو متاثر کر سکتا ہے۔ اور یہ سب تبھی ممکن ہے جب تعلیمی اداروں میں ان موضوعات کو زیر بحث لایا جائے۔

دینی مدارس کے طلبہ بھی میڈیا کی اس صورت کو استعمال میں لا سکتے ہیں۔ ان کو پتہ ہونا چاہیے کہ ویڈیو کلپس کی کیا اہمیت ہے اور ان سے کیا کیا تبلیغی و دینی مقاصد حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ خوبصورت تلاوت، نظم، رنگ ٹونز، نصیحت آموز موبائل کلپس کو عام کرنے سے معاشرے میں مثبت اثرات مرتب کئے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح اچھے مطالعے اور بولنے کی صلاحیت رکھنے والے طلبہ کو چاہیے کہ وہ

الیکٹرانک میڈیا اور براڈ کاسٹ میڈیا کی طرف توجہ دیں ۔آجکل تقریبا تمام بڑے شہروں میں مقامی ایف ایم ریڈیوسٹیشنز موجود ہیں ۔ان کے پروگرامز مقامی طور پر ہی تیار ہوتے ہیں ۔ مدارس کے طلبہ ایف ایم ریڈیو کے لئے پروگرام تیار کر سکتے ہیں جولوگوں کی ایک بڑی تعداد سنے گی ۔اسی طرح سی ڈی چینلز کو بھی دعوتی مقاصد کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے ۔ مدارس کے اندر ہونے والے مباحثوں اور اہم مسائل پر علمائے کرام کی تقاریر کوسوشل میڈیا کے ذریعے عام کرنا چاہیے تا کہ معاشرے کے دیگر طبقات کوعلم ہو سکے کہ دینی طلبہ کے اندر کس قدر صلاحیت موجود ہے۔ ویب سائٹس پر فورم ، بلاگس ، سوشل نیٹ ورکنگ، ویب سائٹس غرض بے شمار سہولیات موجود ہیں جنہیں استعمال کر کے دعوت دین کو بڑے پیمانے پر لوگوں میں پھیلایا جا سکتا ہے ۔ایسا صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب طلبہ کو یہ سب سکھایا جائے ۔ پرنٹ میڈیا میں تو دینی مدارس کے طلبہ کے لئے بے شمار مواقع موجود ہیں ۔ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ مواد کومکمل پیشہ ورانہ طریقے سے تیار کیا جائے ۔ دینی رسائل، اخبارات کے دینی ایڈیشنز ، کالم ، ایڈیٹر کے نام خط کی صورت میں دینی طلبہ اپنی تحریریں شائع کرا سکتے ہیں ۔اسی طرح اگر مدارس میں میڈیا کی تعلیم دی جائے تو دینی رسائل کے لئے بھی اچھا مواد مل سکے گا اور روایتی طرز سے ہٹ کر ایسا مواد سامنے آئے گا جو معاشرے کی بڑی تعداد کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو گا۔

اگر ملک کے ایسے بڑے دینی مدارس جہاں سینکڑوں طلبہ زیرتعلیم ہیں ان میں سے ہر مدرسہ سال میں اگر چار پانچ ایسے نوجوان بھی سامنے لا سکے جو میڈیا کا کافی حد تک علم رکھتے ہوں، انہیں اپنی بات کہنے کا ہنر آتا ہو اور وہ میڈیا پر آ کر اپنا موقف بے دھڑک بیان کر سکیں تو یقیناً ہمارے معاشرے میں میڈیا کی تباہ کاریوں میں کمی لائی جا سکتی ہے ۔

حاصل کلام یہ کہ آج جب ہم دیکھتے ہیں کہ غیرملکی میڈیا ہماری معاشرتی ،سماجی اور دینی اقدار کو آہستہ آہستہ ختم کر رہا ہے تو ان حالات میں ہمیں آنے والے چیلنجز کا بھرپور تدارک کرنا چاہیے اور ان کے خاتمہ کے لیے کوششیں تیز کر دینی چاہئیں ۔نوجوان نسل کو آج فلموں ، ڈراموں ، اشتہارات ، خبروں ، انٹرنیٹ حالات حاضرہ کے پروگراموں وغیرہ کے ذریعے ہونے والے پروپیگنڈے سے آگاہ کرنے کی ضرورت ہے اور اس کا بہترین حل ابلاغ عامہ کے علم کو شامل نصاب کر دینا ہے تا کہ ہم اپنی روایات کی حفاظت کر سکیں، ہماری خودمختاری پر آنچ نہ آنے پائے، ہمارے ملک میں اسلامی ثقافت و روایات کا بول بالا ہو اور ہم ایک باعزت و باوقار قوم کے طور پر کردار ادا کر سکیں ۔۔

تربیہ مینوئل

ڈاکٹر محمد امین

بچوں کی اسلامی تربیت میں سکول انتظامیہ کا کردار (۳)

چند اعتراضات اور ان کے جوابات

سوال: آپ نے کافی تفصیل سے ہمارے سوال کا جواب دیا ہے لیکن معاف کیجئے گا ہمیں دوٹوک انداز میں اس کا جواب نہیں ملا کہ تعلیم میں بزنس کلچر اور اس کے نظریاتی پہلو میں ہم آہنگی کیسے پیدا کی جائے اور موجودہ ماحول میں ان دونوں چیزوں کو ساتھ رکھ کر کامیاب تعلیمی ادارہ کیسے چلایا جائے؟

جواب: آپ کے سوال کا جواب دینے سے پہلے مناسب محسوس ہوتا ہے کہ ہم اپنے معاشرے کے اسلامی، معاشی، سماجی اور تعلیمی حالات کا ایک معروضی جائزہ لیں جو ہمارے مطالعے مشاہدے اور فہم کی حد تک یہ ہے:

۱۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا پاکستانی معاشرہ سماجی اور معاشی لحاظ سے کئی طبقات میں بٹ چکا ہے:

۱۔ بہت امیر ۲۔امیر ۳۔اعلیٰ متوسط طبقہ ۴۔متوسط طبقہ ۵۔نچلا متوسط طبقہ ۶۔غریب ۷۔بہت ہی غریب

۲۔ مغربی اثرات کے قبول وعدم قبول اور دینی تعلیمات واقدار پر عمل وعدم عمل کے حوالے سے بھی پاکستانی معاشرہ کئی طبقات میں تقسیم ہو چکا ہے☆

		مغربی تہذیب کی قبولیت	اسلامی اثرات
۔ بہت امیر طبقہ		%90	%10
۔ امیر طبقہ		%80	%20
۔ اعلیٰ متوسط طبقہ		%65	%35
۔ متوسط طبقہ		%50	%50
۔ نچلا متوسط طبقہ		%40	%60
۔ غریب	لاتعلقی 40%	%30	%30
۔ بہت غریب	لاتعلقی 60%	%20	%20

اس تقسیم پر تبصرے کے حوالے سے ہمارے دو ملاحظات ہیں:

☆ یہ اعداد وشمار تخمینی ہیں اور ہمارے معاشرتی مشاہدے پر مبنی ہیں۔ ہمارے علم میں کوئی ایسی تحقیق نہیں جس میں حقیقی سروے وغیرہ کی بنیاد پر اس طرح کی کوئی سٹڈی کی گئی ہو۔

i۔ ایک چیز جو ان سب طبقات میں مشترکہ طور پر پائی جاتی ہے وہ یہ کہ ہر سطح کا نچلا طبقہ چھلانگ لگا کر اوپر کے طبقے میں شامل ہونا چاہتا ہے اور یہ چھلانگ نہ صرف معاشی ہوتی ہے بلکہ دینی اور معاشرتی بھی ہوتی ہے یعنی نچلے طبقے کا فرد جب معاشرتی لحاظ سے اوپر کے طبقے میں شامل ہوتا ہے تو اس طبقے کے معاشرتی اور دینی رویے بھی اپنا لیتا ہے۔ بالفاظ دیگر آپ کہہ سکتے ہیں ان میں مغربی تہذیب کی قبولیت کا تناسب بڑھتا اور دینی تعلیمات و اقدار پر قائم رہنے کا تناسب کم ہوتا جاتا ہے۔

ii۔ غریب اور امیر طبقات کا تصور دین زیادہ تر ''روایتی'' ہے شعوری اور حقیقی نہیں مثلاً غریب آدمی نماز پڑھ کر اور روزے رکھ کر سمجھ لیتا ہے کہ پورے دین پر عمل ہو گیا۔ اسی طرح امیر طبقہ نماز پڑھ کر یا مسجد و مدرسہ کی تعمیر میں چندہ دے کر سمجھتا ہے کہ اس نے دین کا حق ادا کر دیا جب کہ متوسط طبقے کا دین و ایمان کچھ شعوری بھی ہوتا ہے، وہ دین کا کچھ مطالعہ بھی کرتا ہے اور دینی حوالے سے عصری تقاضوں کا بھی کچھ ادراک رکھتا ہے چنانچہ یہی طبقہ اکثر و بیشتر جدید دینی تحریکوں اور اداروں کا حصہ بنتا ہے۔

۳۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا کہ ہمارے تعلیمی ادارے (بشمول دینی لوگوں کے جدید تعلیم کے ادارے ـــــ الاّ ماشاء اللہ) اس وقت اس طرح کی تعلیم دے رہے ہیں جو مغربیت (ویسٹرنائیزیشن) کو قبول کرتی ہے۔ اس کے لئے ان کا بہانہ یا جواز (justification) یہ ہے کہ یہ پبلک کی ڈیمانڈ ہے۔ یہاں چند لمحے رک کر یہ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ:

۱۔ آیا یہ پبلک کی ڈیمانڈ ہے؟ اگر ہے تو کیوں؟

۲۔ پبلک کی اس ڈیمانڈ کو پورا کرنے کے طریقے کیا ہو سکتے ہیں؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں پبلک کی ڈیمانڈ کسی حد تک موجود ہے لیکن اگر آپ غور کریں تو جان جائیں گے کہ یہ ڈیمانڈ جینوئن نہیں fake ہے: فطری نہیں جعلی (fabricated) ہے اور اسے اہل مغرب نے دنیا پر اپنی ملحدانہ تہذیب کے غلبے اور مسلم معاشروں کو کمزور، محکوم اور اسلام سے دور رکھنے کے مذموم مقاصد سے پروان چڑھایا ہے لہٰذا اس جعلی ڈیمانڈ کو پورا کرنے کی بجائے اسے رد کرنے کی ضرورت ہے اور اگر رد کرنا بوجوہ ممکن نہ ہو تو اس کے امالے کی ضرورت ہے۔

ہم نے سطور بالا میں کچھ عرض کیا ہے وہ چونکہ مجمل ہے لہٰذا اس کی تفصیل ناگزیر ہے:

۔ ڈیمانڈ جینوئن بھی ہو سکتی ہے اور غیر جینوئن بھی۔ مسلمانوں میں سے جو لوگ تہجد پڑھتے ہیں یا فجر کی

اذان دیتے ہیں بلکہ عام مسلمانوں کو بھی رمضان میں اس کا تجربہ ہوتا ہے خصوصاً ان کو جو دیہات میں کھلی فضا میں رہتے ہیں اور جو وقت کے لئے شہری لوگوں کی طرح صرف گھڑی پر اکتفا نہیں کرتے کہ صبح صادق سے پہلے صبح کاذب بھی طلوع ہوتی ہے۔ اسی طرح ہم نے قدرتی طریق علاج پر ایک جرمن ڈاکٹر لوئی کوہنی کی کتاب پڑھی تھی جس میں وہ کہتا ہے کہ جب تک سچی بھوک نہ لگے کھانا مت کھاؤ۔ یہ حقیقت ہے کہ بعض لوگ بھوک کے کچے ہوتے ہیں اور ہر چند گھنٹے بعد انہیں کھانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہ دراصل جھوٹی بھوک (جوع کاذب) ہوتی ہے اور اگر وہ چند گھنٹے مزید نہ کھائیں تو پھر انہیں سچی بھوک لگتی ہے۔

اسی مفہوم میں ہم کہہ رہے ہیں کہ مسلم معاشرے میں مغربی تہذیب سے متاثر و مرعوب نظام تعلیم کی ڈیمانڈ جینوئن نہیں ہے بلکہ لوگ دراصل یہ چاہتے ہیں کہ ان کی اولاد کو اچھی انگریزی آ جائے تا کہ انہیں اچھی ملازمت مل سکے کیونکہ جس کو اچھی انگریزی آتی ہے اسے اچھی ملازمت مل جاتی ہے۔ معاشرے میں اس کی ''ٹور'' یعنی عزت ہوتی ہے۔ یہ اس لئے بھی ہے کہ پاکستان میں دفتری زبان ابھی تک انگریزی ہے، مقابلے کے امتحانوں کی زبان بھی انگریزی ہے اور اسی لئے پاکستان میں انگریزی پہلی جماعت سے لے کر بی اے تک بطور لازمی مضمون رائج ہے اور اکثر پرائیویٹ سکول انگلش میڈیم ہیں۔

انگریزی زبان اور مغرب سے مرعوب و متاثر نظام تعلیم کا مسلم معاشروں خصوصاً پاکستان میں تسلسل سے جاری رہنا کوئی حادثہ نہیں بلکہ یہ مغربی استعمار کی پلاننگ کا ایک حصہ ہے۔ جب مغربی استعمار نے مسلم ممالک پر قبضہ کر لیا تو ہر جگہ اس نے وہاں کا نظام تعلیم ختم کر کے اپنا نظام تعلیم جاری کر دیا تا کہ ان کی نسلوں میں خوئے غلامی رچ بس جائے اور وہ سر اٹھانے اور جہاد اور آزادی کا نہ سوچیں۔ پھر جب مغرب مشیت ایزدی کے تحت باہمی جنگوں سے کمزور ہو گیا (جنگ عظیم اوّل و دوم میں) تو وہ مسلم ممالک کو آزادی دینے پر مجبور ہو گیا جب کہ مسلم ممالک میں ہر جگہ آزادی کی تحریکیں بھی چل رہی تھیں لیکن جانے سے پہلے اس نے یہ انتظام کیا کہ نو آزاد ممالک میں حکمران انہی کی مرضی کے رہیں، سول اور فوجی بیوکروکریسی ان کی پسند کی رہے، تعلیمی نظام، معاشی نظام، سیاسی نظام، قانونی نظام۔۔۔سب میں اسی کی مرضی چلے اور اس کے لئے جو حکمت عملی اس نے اختیار کی اس میں وہ کامیاب رہا۔ اس لئے ہم کہہ رہے ہیں کہ اگر پاکستان میں انگریزی اور مغرب سے متاثر و مرعوب تعلیمی نظام ہے تو یہ کوئی حادثہ نہیں بلکہ یہ مغرب کی پلاننگ کا نتیجہ ہے۔ اور مغرب کی سرمایہ دارانہ اور

تاجرانہ ذہنیت نے اسے یہ سکھایا ہے کہ پہلے ڈیمانڈ پیدا کرو تو مارکیٹ اور بازار کے اصولوں کے مطابق سپلائی کے ذرائع خود بخود حرکت میں آ جائیں گے چنانچہ جب استعمار نے ڈیمانڈ یہ پیدا کی کہ ملازمت اسے ملے گی جسے اچھی انگریزی آتی ہوگی تو ایک وقت ایسا آیا کہ مسلمانوں میں سے بعض لوگ اٹھ کھڑے ہوئے کہ یہ ڈیمانڈ ہم پوری کریں گے۔ برصغیر میں اس کے بانی سرسید احمد خان تھے۔

غرض سادہ لوح مسلم عوام تو غلط نظام تعلیم اور غلط نظام حیات کی وجہ سے بیماری کی اصل جڑ کا ادراک ہی نہیں رکھتے وہ تو محض اچھی ملازمتوں اور اچھے روزگار کے متلاشی ہیں۔ اہل مغرب کی ہوشیاری یہ ہے کہ انہوں نے ملازمتوں کے اس نظام کو ابھی تک انگریزی اور انگریزی نظام تعلیم سے باندھا ہوا ہے۔ آج انگریزی کو اس مقام سے ہٹا کر اردو اور اسلامیات کو اس کی جگہ دے دیں تو لوگ انگریزی چھوڑ کر اردو اور اسلامیات پڑھنے لگیں گے۔ جامعہ رحمانیہ لاہور کے مولانا حافظ عبدالرحمٰن مدنی بتاتے ہیں کہ جب جنرل ضیاء الحق نے عدالتی نظام کو اسلامی بنانے کی کوشش کی اور قاضی کورٹس بنانے کا اعلان کیا تو ہم نے قاضی کلاسیں شروع کر دیں۔ پہلے گروپ میں چند لوگ آئے، دوسرے میں درخواستوں کی تعداد سیکڑوں اور تیسرے میں ہزاروں تک پہنچ گئی اور وزیروں کے سفارشی فون آنے لگے اور ہم نے فضلاء کے لئے سعودی عرب کی ایک جامعہ سے بات کر کے کچھ تربیت کا وہاں انتظام بھی کر لیا۔ لیکن جب قاضی کورٹس عملاً نہ بنیں تو لوگوں کا رجحان بھی نہ رہا۔ اور اب وہی جامعہ رحمانیہ ہے اور وہی حافظ مدنی ہیں لیکن نہ کوئی قاضی کلاس وہاں ہوتی ہے اور نہ کوئی قاضی کلاس میں داخلہ لینے والا ہے۔ تو خلاصہ یہ کہ انگریزی اور انگریزی نظام تعلیم کی جعلی ڈیمانڈ انگریز نے پیدا کی ہے۔

اس کا حل کیا ہے؟ اگر مسلم عوام وخواص کو اس مرض کا ادراک ہو جائے تو اس نظام کو بدلا جا سکتا ہے لیکن جن لوگوں نے سیاسی جدوجہد کے ذریعے اس نظام کو بدلنے کی کوشش کی انہیں بوجوہ اس میں ناکامی ہوئی (جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں) چنانچہ اب اس نظام کو اگر ہم ختم نہیں کر سکتے، اس کا ازالہ نہیں کر سکتے تو اس کی اصلاح اور امالہ تو کر سکتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ معاشرہ کے ذہین، اسلامی اور مخیّر عناصر مل کر ایسے تعلیمی ادارے قائم کریں جن میں انگریزی تو اچھی ہو لیکن انگریزی کلچر کا غلبہ نہ ہو۔ سوشل سائنسز ایسے پڑھائی جائیں کہ اس میں مغربی علم کے ساتھ اسلامی علم اور روح بھی ان میں موجود رہے۔ یہ کام ہو سکتا ہے اور حکومت کی مدد کے بغیر بھی ہو سکتا ہے لیکن اس کے لئے ایسے ذہن کی ضرورت ہو جو محض تاجرانہ نہ ہو بلکہ مذکورہ اصلاح اور امالے کے لئے مخلص اور کمٹڈ ہو اور وہ کوشش کرے کہ Compromises کم سے کم ہوں اور اسلامی مقاصد بھی حاصل ہو جائیں۔

پاکستانی معاشرے کی طبقاتی تقسیم کے تناظر میں اس کام کی حکمت عملی یہ ہوسکتی ہے:

۔ جہاں تک غریبوں کے لئے تعلیمی اداروں کا تعلق ہے تو چونکہ وہ مالی طور پر محتاج ہیں اور اسلامیت کے بھی مخالف نہیں لہٰذا معاشرہ اور اسلامی NGOs منظّم ہوکر مطلوبہ اسلامی تعلیم کا انتظام کرسکتی ہیں مطلب یہ کہ یہاں بڑی حد تک کلی اصلاح ممکن ہے۔

۔ متوسط طبقے کے لئے تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں جن میں انگریزی تو بہت اچھی ہو لیکن انگریزی نظام کی شیطانی روح اس میں موجود نہ ہو۔ یوں یہاں compromises کو minumum یعنی کم سے کم کیا جاسکتا ہے۔ایسے ایک ادارے کے خدوخال نیچے دیے جارہے ہیں:

۔ امیروں کے لئے ایسے تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں جہاں ان compromises کو مجبوراً قبول کرلیا جائے لیکن اگر اخلاص نیت اور کمٹمنٹ ہو تو موزوں نصاب، اساتذہ اور تعلیمی ماحول کے ذریعے ایسے حالات پیدا کئے جاسکتے ہیں کہ ان اداروں سے نکلنے والے طلبہ بھی معاشرے کے اسلامی آئیڈیلز سے دور نہ ہوں بلکہ انہیں سمجھتے ہوں، ان سے ہمدردی رکھتے ہوں اور ان میں سے کچھ ایسی سعید روحیں بھی نکل آئیں گی جو سو فیصد حق کو قبول کرلیں اور اسلام کے حق میں توانا آواز بن کر کھڑی ہو جائیں۔ اس طرح کے مجوزہ سکول کا مختصر خاکہ بھی آئندہ سطور میں ملاحظہ فرمائیں۔

متوسط طبقے کے لئے امالے کے اصول پر مجوزہ سکول کے خدوخال

۱۔ اس تعلیمی پراجیکٹ کو کامیاب بنانے کی پہلی ضرورت اخلاص اور کمٹمنٹ کی ہے یعنی محض پیسے کے لئے اپنے اسلامی اور تعلیمی اہداف سے ہٹنا نہیں بلکہ اصلاح کے لیے ڈٹے رہنا ہے۔

۲۔ دوسری شرط کوالٹی کی ہے کہ آپ عملاً کوالٹی ڈیلیور کریں محض نعرے نہ لگائیں۔ اس مجوزہ سکول میں کوالٹی کیسے آسکتی ہے؟ اس کے لئے چند تجاویز درج ذیل ہیں:

i۔ سکول خوبصورت اور صاف ستھرا ہو۔ پھول، پودے، گملے ، درخت، کیاریاں اور روشیں ہوں۔ کمروں میں رنگ و روغن ہو چکا ہو۔فرنیچر پالش شدہ ہو ٹوٹا ہوا نہ ہو۔

ii۔سکول میں نظم و ضبط ہو، ہڑبونگ اور شور شرابا نہ ہو۔سکول کے سارے پروگراموں میں وقت کی پابندی کی جائے۔

iii۔ اساتذہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ٹرینڈ ہوں (اگر کوئی ڈگری نہ ہو تو سکول خود ان کی ٹریننگ کرے) یعنی انہیں پڑھانے کا فن آتا ہو۔ وہ مہذب ہوں، طلبہ کو مار پیٹ اور سختی نہ کریں، گالی نہ دیں۔ اساتذہ کو

معقول معاوضہ ملنا چاہیے تا کہ وہ مایوس اور بد دل نہ ہوں۔

iv۔ ماہانہ اور سہ ماہی ٹیسٹ لئے جائیں جن کا نتیجہ والدین کو بھجوایا جائے۔ اس کے علاوہ بھی والدین سے رابطہ رکھا جائے۔

v۔ طے شدہ فیس کے علاوہ والدین سے حیلے بہانے پیسے نہ بٹورے جائیں۔

vi۔ بچے خود اور ان کا یونیفارم صاف ستھرا ہو۔

vii۔ ہوم ورک با قاعدگی سے چیک کیا جائے (بہتر یہ ہے کہ سکول ہی میں کروا دیا جائے تا کہ بچوں کو ٹیوشن سنٹر نہ جانا پڑے)

viii۔ تعلیمی معیار بہت اونچا ہو۔ ٹارگٹ یہ ہونا چاہیے کہ بچے بورڈ کے امتحان میں پوزیشن لیں یا کم از کم سارے فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوں۔

ix۔ بچوں کی انگریزی (خصوصاً ادائیگی الفاظ) بہت اچھی ہونی چاہیے، اتنی اچھی کہ وہ انگلش میڈیم سکولوں سے بہتر ہو یا کم از کم ان کے مقابلے کی ہو۔

x۔ بچوں کو تقریر کی پریکٹس کرائی جائے اور انہیں بیت بازی اور مباحثوں میں شریک کیا جائے تا کہ سکول کے بچے مقامی اور ضلعی تقریری مقابلوں میں جیتیں اور انگلش میڈیم سکولوں کو ہرائیں۔

xi۔ بچوں کو ٹور اور پکنک پر لے جایا جائے اور انہیں تاریخی اور مشہور مقامات کی سیر کرائی جائے۔

xii۔ سکول مندرجہ بالا نتائج تبھی دے سکتا ہے جب اس کا سربراہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور تجربہ کار ہو اور سکول کا وژن اور اسے بلندیوں پر لے جانے کا مشن ہمہ وقت اس کے سر پر سوار رہے۔

ہم یقین اور دعوے سے کہتے ہیں کہ اگر کوئی سکول ان باتوں پر عمل کرے اور ان اقدامات سے جو اچھے نتائج نکلنے چاہئیں، وہ نکال کر دکھائے تو اسے طلبہ اور فیسوں کی کمی کی شکایت نہیں رہے گی اور اصل مقصد بھی حاصل ہو جائے گا خواہ سکول انگلش میڈیم نہ ہو اور آکسفورڈ کی کتابیں نہ ہوں۔۔۔

اسلامی تربیت کے لئے امالے کے اصول پر امیروں کے سکول کے خدوخال

۱۔ اگر اخلاص، کمٹمنٹ اور صحیح سمت میں کوششوں میں تسلسل ہو تو انگلش میڈیم، آکسفورڈ کی کتابوں، او اور اے لیول کے باوجود بھی اچھے نتائج نکل سکتے ہیں۔

۲۔ کوالٹی ناگزیر ہے جس کے لئے اساتذہ اعلیٰ تعلیم یافتہ، ٹرینڈ اور اچھی تنخواہ کے حامل ہونے چاہئیں۔ مطلوبہ اسلامی ذہن کے اساتذہ اگر مارکیٹ سے نہ ملیں تو سکول انتظامیہ کو ذہین اور اسلامیت کو قبول کر سکنے والے تازہ فضلاء (Fresh Graduates) لے کر خود ان کی تربیت کرنا چاہیے۔

۳۔نصاب میں سکول اپنی طرف سے کچھ اضافی چیزیں پڑھا سکتا ہے۔اس کے لئے ہر کلاس کے نصاب اور طلبہ کی ذہنی و تعلیمی استعداد کو سامنے رکھ کر مواد تیار کرنا ہوگا۔ یہ کام بعض جگہوں پر ہو رہا ہے اس لئے اس طرح کا تیار مواد بھی مل سکتا ہے لیکن اس کے حصول اور مقامی ضروریات کے مطابق اسے Tailor کرنے کے لئے سکول انتظامیہ کو محنت کرنا ہوگی۔(یہ مواد کہاں سے مل سکتا ہے۔اس کے لئے رہنمائی اس ہینڈ بک میں دوسری جگہ موجود ہے)۔

۴۔ یہ کلیہ ذہن میں رہے کہ اگر استاد اچھا اور موزوں ہو تو وہ نصاب کی خامی اور کمی آسانی سے دور کرسکتا ہے خواہ اضافی نصابی مواد نہ بھی موجود ہو۔ استاد کی تربیت کرتے وقت اس کے ذہن نشین کردیا جائے کہ وہ مدرس (teacher) نہیں مربی (mentor) ہے۔

۵۔سکول میں انتظامیہ ہم نصابی وغیر نصابی سرگرمیوں کے ذریعے ایسا ماحول پیدا کرسکتی ہے جس میں بچوں کی اسلامی تربیت ہو(یہ ہم نصابی وغیر نصابی سرگرمیاں کیا ہوسکتی ہیں؟ اس کی تفصیل اس تربیتی ہینڈ بک میں دوسری جگہ موجود ہے)۔

۶۔ انگلش میڈیم میٹرک میں بہت اچھی نصابی کتب موجود ہیں۔ او اور اے لیول میں بھی اسلامک سٹڈیز موجود ہے اور اگر اس مضمون کا استاد اپنے مضمون کا ماہر اور اس سے لگن رکھنے والا ہو، تو وہ بہت کام دکھا سکتا ہے۔اگر لوگ اسلامیات سے الرجک ہوں تو 'ethics' کے عنوان سے ڈسپلن رکھ کر بالواسطہ طور پر اسلامی اخلاقیات کی تعلیم دی جاسکتی ہے۔

ہم یقین سے کہتے ہیں کہ اگر امیروں کے سکول کی انتظامیہ اسلامی اہداف حاصل کرنے کے لئے مخلص ہو تو وہ ایسا کرسکتی ہے لیکن اس کے لئے کمٹمنٹ اور صحیح سمت میں جدوجہد ضروری ہے۔ جہاں تک سمت (direction)، طریق کار اور حکمت عملی (methodology) کا تعلق ہے تو اس ہینڈ بک میں اس موضوع پر کافی رہنمائی موجود ہے۔

اسلامی تربیت کے لئے سکول انتظامیہ کا طریق کار

ہم شروع میں ذکر کر چکے ہیں کہ طلبہ کی اسلامی تربیت اور شخصیت کی تعمیر کے لئے سکول انتظامیہ کو جو وسائل (tools) درکار ہیں وہ تین ہیں: ۱۔نصاب ۲۔اساتذہ ۳۔تعلیمی ادارے کا ماحول۔ ان تینوں کے بارے میں اختصار کے ساتھ ذکر سطور بالا میں آچکا، ان کی تفصیل اسی باب میں آگے آرہی ہے لہٰذا ہم یہاں موضوع کو مکمل کرنے کی خاطر بعض اشارات پر اکتفا کریں گے:

نصاب

ا۔ نصاب میں مؤثر دینی تعلیم شامل کرنا ۲۔ دیگر علوم خصوصاً سوشل سائنسز کی اسلامی تناظر میں تدوین نو ۳۔ مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں ایسے مواد کا انتخاب جو تربیت میں مدد ہو ۴۔ مذکورہ دونوں اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے حسب ضرورت اضافی مواد کی تیار ۵۔ جہاں ممکن ہو وہاں پورے نصابی ڈھانچے پر نظر ثانی اور اس کی تدوین نو۔ ۶۔ مارکیٹ میں موجود نصابی کتب اور مواد میں سے اسلامی حوالے سے احسن ترین اور موزوں ترین کتب و مواد کی تلاش اور انتخاب۔

استاد

ا۔ایسے اساتذہ کا حصول جو سکول کے وژن اور مشن سے متفق ہوں اور اس کے لئے جذباتی لگن رکھتے ہوں

۲۔ ایسے اساتذہ اگر مارکیٹ سے نہ ملیں تو فریش گریجوایٹس ہائر کر کے خود ان کی تربیت کرنا

۳۔مذکورہ تربیت میں فنی اور پیشہ ورانہ پہلوؤں کے ساتھ اس امر پر ترکیز کہ خود اچھا مسلمان کیسے بننا ہے اور طلبہ کو کیسے بنانا ہے؟ اساتذہ کو بہت اچھی تنخواہ دینا

۴۔ ایسے پرنسپل کا انتخاب جو اس مقصد کے لئے ٹیم کی رہنمائی کر سکے اور ٹیم کو متحرک کر کے اہداف حاصل کر سکے۔

تعلیمی ادارے کا ماحول

ا۔اس کے لئے ہم نصابی وغیر نصابی سرگرمیوں کی تنظیم۔ان سرگرمیوں کی تفصیل اس ہینڈ بک میں دوسری جگہ موجود ہے بطور مثال:

۔ طلبہ کے درمیان تقریری وتحریری مقابلے اور ان میں ایسے موضوعات کا انتخاب جو اسلامی ہوں۔ ہر طالب علم کی فائل بنانا جس میں تربیتی حوالے سے اس کا ریکارڈ ہو۔طلبہ کی تربیت کے لئے لائحہ عمل تیار کرنے اور تربیتی مسائل کے حل کے لئے تربیت کمیٹی کا قیام اور اسے فعال ،متحرک اور مؤثر بنانا۔ تربیت کے حوالے سے والدین سے رابطہ اور ان کی استعانت۔کھیل اور تعمیری تفریح کے مواقع مہیا کرنا۔سکول میں اچھی لائبریری قائم کرنا اور اس سے استفادے کے عملی مواقع۔سکول اور ہوم ورک کے لئے ٹائم ٹیبل بنانا اور اس پر مؤثر عمل درآمد۔۔۔۔وغیر ذلک

پہلا لیکچر

احمد جاوید

مغربی تہذیب کا فکری پس منظر

ہم نے معروف مربی، محقق، ادیب اور دانشور جناب احمد جاوید صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ ہمارے ادارے صفاء انسٹی ٹیوٹ میں ''مغربی فکر وتہذیب کا تنقیدی مطالعہ: اسلامی تناظر میں'' کے موضوع پر ایک لیکچر سیریز شروع کریں۔ ہمیں خوشی ہے کہ انہوں نے ہماری درخواست قبول فرمائی اور اس سلسلے میں ۱۴ مئی ۲۰۱۱ء کو پہلا لیکچر دیا۔ یہ لیکچر تحریری صورت میں حاضر خدمت ہے۔ لیکچر کے بعد، جو سوال وجواب ہوئے ان میں سے بھی بعض اہم یہاں دے دیے گئے ہیں۔ امین

ڈاکٹر امین صاحب نے جو موضوع تجویز فرمایا ہے اور اس کے کچھ حصوں پر گفتگو کرنے کی خدمت میرے سپرد کی ہے اس کے بارے میں کچھ تمہیدی باتیں عرض کر دوں اور ممکن ہے کہ ان تمہیدی باتوں میں ہی آج کا وقت تمام ہو جائے کیونکہ میرے ذہن میں ہے کہ یہ سلسلہ کوئی دس بیس نشستوں تک تو چلے گا اور میں ان میں کسی لیکچرر کی پوزیشن نہیں لینا چاہتا بلکہ ان نشستوں کو آپس میں نتیجہ خیز گفتگو کا ذریعہ بنانا چاہتا ہوں۔ میرے ذہن میں یہ نہیں ہے کہ میں یہاں کچھ سکھانے کے لیے حاضر ہوا ہوں، میرے ذہن میں اگر ہے تو صرف اتنا کہ ہم اپنے یقینی اسباب زوال کو پہچان کر انہیں دور کرنے کا وہ لائحہ عمل کیسے اختیار کریں کہ جس کے لیے ایک مضبوط شعور اور ایک بڑے کردار کی ضرورت ہوتی ہے۔

دنیا میں وہ تہذیبیں فنا ہو جاتی ہیں جو Logical Perfection تو رکھتی ہیں لیکن اپنے Ideals کو actualize نہیں کر پاتیں۔ ہمارے تنزل کی تمام قسموں کا سبب ایک تو یہ ہے کہ ہم اپنی اقدار کو رو بہ عمل میں نہیں لا سکے اور اس سے بھی زیادہ سنگین بات یہ کہ وہ اقدار ہمارے حافظے میں بھی کسی مرکزی جگہ پر موجود نہیں ہیں یعنی ہماری تمام زندگی اور انسان کے بارے میں بنیادی قدریں جو ہیں وہ شعور میں جگہ بنانے والی منطق بھی ہمارے لیے lose کر چکی ہیں اور طبیعت میں راسخ ہو جانے کے لیے جو رغبت درکار ہے وہ رغبت بھی ہماری وجہ سے کھو چکی ہے۔ یہ ہے وہ بڑا مسئلہ جس کا اول تو ہمیں تفصیل کے ساتھ شعور ہونا چاہیے اور دوسرے مرحلے پر اس کے تدارک کی نتیجہ خیز کوشش ہونی چاہیے۔

اس مقصود کو حاصل کرنے کا جدید دنیا میں سب سے بڑا راستہ یہ ہے کہ ہم مغرب کے بارے

میں اپنے علم کو صحیح کریں، ہم مغرب کے بارے میں اپنے علم کو ضروری حد تک کامل بنائیں کیونکہ اس دنیا میں بگاڑ اور سدھار کے جتنے بھی راستے نکلیں گے وہ سب مغرب کے رد و قبول کے نتیجے میں نکلیں گے۔ اس بات سے عملاً انکار نہیں ہوسکتا کہ یہ دنیا جو کچھ بھی بنے گی وہ مغرب کو رد یا قبول کرنے کے نتیجے میں بنے گی جیسے افلاطون کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ فلسفے کی تمام پیش قدمی یا تو افلاطون سے اختلاف پر کھڑی ہے یا اس سے اتفاق کا نام ہے۔ تو مغرب نے انسان کی نفسیاتی دنیا اور اس کے آفاق میں ایک ایسا مرکزی تسلط بہرحال اختیار کر لیا ہے کہ اب انسان اور انسانی دنیا کے بارے میں ہمارا کوئی تصور اپنی تشکیل کے عمل سے گزر ہی نہیں سکتا تاوقتیکہ ہم مغرب کے تصورِ انسان اور تصورِ دنیا کو زیرِ بحث نہ لائیں۔ اب اگر دنیا کو آگے چل کر ہمارے ہاتھوں سے بگڑنا یا سنورنا ہے تو ہمیں پہلے ہی قدم پر موجودہ دنیا کو بنانے والی سب سے بڑی بلکہ واحد قوت کے بارے میں اپنے موقف کو قائم کرنا پڑے گا، درستی کے ساتھ، ذہانت کے ساتھ اور ایک بڑے نصب العین کی طرف یکسوئی کے ساتھ۔

تکرار کے خدشے کے باوجود میں اپنے اطمینان کے لیے کہ میں اپنی بات پوری طرح کہنے میں کامیاب ہوا ہوں میں اس چیز کو دہرانا چاہتا ہوں کہ تہذیبیں پیدا ہوتی ہیں اپنی نفسیاتی بنیاد میں۔ میں تہذیبوں کی metaphysicality پر بات نہیں کر رہا۔ انسانی تہذیب اپنی مکینیکل اور نفسیاتی سطح پر structural ہیئتوں میں دو تصورات کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے: ایک یہ کہ اس کا تصورِ آدمی کیا ہے اور دوسرے یہ کہ اس کا تصورِ دنیا کیا ہے؟ ہر تہذیب اپنے تصورِ آدمی اور اپنے تصورِ دنیا کو جس حد تک عمل میں لا کر نتیجہ خیز بنانے میں کامیاب ہوتی ہے اسی حد تک وہ اپنی بقا کے اسباب اور اپنے وجود کا جواز فراہم کرتی ہے۔

اس نقطۂ نظر سے میں یہ عرض کر رہا تھا کہ موجودہ دنیا کا تصورِ آدمی ہو یا تصورِ عالم ہو یہ دونوں الف سے ی تک مغرب کے بنائے ہوئے ہیں۔ اس وقت اگر کوئی تصورِ آدمی نتائج پیدا کرنے میں عملاً کامیاب ہے تو وہ مغرب کا تصورِ آدمی ہے، اگر اس وقت کوئی تصورِ دنیا عمل میں آنے میں کامیاب ہوا ہے تو وہ مغرب کا تصورِ دنیا ہے اور اس میں جو کچھ بھی کمی رہ گئی ہے وہ کمی اس لیے نہیں ہے کہ اس تصور کے مخالف کچھ تصورات پنپ رہے ہیں اسے چیلنج کرنے کے لیے یا اسے remove کرنے کے لیے بلکہ وہ کمی اس لیے رہ گئی ہے کہ ان کی global audiance میں ان کی قبولیت کی استعداد کم ہے یعنی مغرب کے پھیلاؤ میں اگر کوئی کمی رہ گئی ہے تو اس کا سماجی سبب یہ ہے کہ پوری دنیا

کے بعض طبقات اگر پوری طرح westernise نہیں ہو رہے یعنی مغربی تصورِ دنیا اور تصورِ آدمی کو اپنے اندر برسرِعمل نہیں لا پا رہے تو اس کا سبب مغرب کے ورلڈ ویو کی ناکامی نہیں ہے بلکہ ان کی قبولیت کے مادے کی کمزوری ہے اس وقت دنیا یا تو westernise ہو چکی ہے اپنے بنیادی تصور کی سطح پر یا westernise ہونے کی امید وار ہے۔ اس situation پر خوش بھی ہوا جا سکتا ہے اور اس صورتحال پر فکر مند بھی ہوا جا سکتا ہے۔ لیکن ہماری خوشی ہو یا ہماری فکرمندی ہو اس سے مغربی تہذیبی غلبے کے ثبوت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا اور جو ہماری موجودہ روش ہے وہ روش اس خطرے کی مزاحمت کرنے کے لیے ابتدائی درجے پر بھی کافی نہیں ہے۔ یہ ہم انشاء اللہ وقتاً فوقتاً مباحث کی مناسبت سے دیکھتے رہیں گے۔

عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ کم از کم میری حد تک اس ساری گفتگو کا مقصد ایک ہے۔ وہ مقصد یہی ہے کہ ہم اپنے آپ کو فنا کی اس طغیانی سے بچائیں جس کی رفتار روز بروز تیز ہوتی جا رہی ہے اور اس معاملے میں تین رویے جو ہم نے مجموعی طور پر اختیار کر رکھے ہیں ان تین رویوں سے خود کو نکالیں اور میری گفتگو میں کچھ ایسے مراحل نظر آ سکتے ہیں کہ جو مایوسی پھیلانے والے لگیں لیکن آپ میں سے ہر شخص کو کم از کم میری اس بات پر اعتبار ہونا چاہیے کہ مغرب سے دشمنی کے تصور اور جذبے میں آپ حاضرین میں سے کوئی شخص یقیناً ایسا نہیں ہوگا جس سے مجھے کم سمجھا جائے۔ اس پس منظر میں آپ کو میرا مؤقف سمجھنے میں آسانی رہے گی۔ ہم نے جس سفاک ہاتھ سے غیروں کو پکڑنے کی مشق شروع کر رکھی ہے اصل میں ضرورت ہے کہ اس سفاک ہاتھ کو ہم اپنی گردن کی طرف بڑھائیں۔ ہم اپنی اصلاح کی طرف سفا کی دکھائے بغیر ان خطرات سے خود کو بچا نہیں سکتے جن میں سے محض چند کا ہمیں شعور اور اندازہ ہے۔ اس معاملے میں کسی غلط فہمی کا امکان ہو سکتا تھا لہٰذا اس کے پیشگی ازالے کے لیے میں نے یہ عرض کیا۔

دوسرے مغرب کی ارتقائی تاریخ، یہ phrase اچھی نہیں ہے لیکن ہم یہ ان کی زبان بول رہے ہیں کہ مغرب کی تاریخی اور تہذیبی پیش قدمی کی جو تفصیل ہے اس کا مطالعہ اور اس کو سمجھنا ہمارے لیے مفید ہو سکتا ہے۔ افادیت کی وہ جہت یہی ہے کہ اس وقت مغرب غالباً دنیا کی واحد قوت ہے جس نے اپنے کم و بیش تمام orders عمل میں لا کر دکھا دیئے ہیں اور جس نے اپنے ورلڈ ویو کو شعور کی اعلیٰ سطحوں پر پہنچا کر عمل کے تمام تر پھیلاؤ میں نافذ کر کے بھی دکھا دیا ہے۔ مطلب یہ کہ اُن کا کوئی ایسا

نظریہ نہیں ہے جس کی تائید میں وہ اس نظریے سے پیدا ہونے والے عملی نتائج پیش نہ کر سکیں۔

اس سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں کہ ideals کو actualize کرنے کے آداب وضوابط اور وسائل واسباب کیا ہیں؟ یہ ہم سیکھ سکتے ہیں۔ اور دوسرے ہم یہ سیکھ سکتے ہیں کہ اپنے تہذیبی مقاصد کو عملی طور پر کچھ ناکامی کی صورتحال میں رہنے کے باوجود شعور کے ایک زندہ مرکز کی حیثیت دے کر محفوظ کیسے رکھا جا سکتا ہے کیونکہ تہذیبیں اپنی اقدار کو اگر عمل میں نہیں لا سکتیں تو ان کی طرف یکسو رہنے کے لیے اپنے شعور میں ان کی مرکزیت کا اہتمام ضرور کرتی ہیں۔ اگر ہمیں اپنا جائزہ لینا ہو تو ایک سوال کا ہمیں بہت غیر جانب داری اور selflessly سامنا کرنا چاہیے کہ ہم اپنی مسلمہ اقدار کو آدمی اور دنیا کی سطح پر عمل میں لانے میں کامیاب ہوئے ہیں یا نہیں؟ اس سوال کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ کیا ہم ان اقدار کو واقعتاً عمل میں لانا بھی چاہتے ہیں یا نہیں؟ ان دو سوالوں کا پوری دیانت اور پورے selfless ماحول میں ہمیں سامنا جلد یا بدیر کرنا ہوگا تو بہتر ہے کہ ہم اس موضوع سے فائدہ اٹھا کر اپنی بہتری یا بقا کا یہ سامان بھی کرتے چلے جائیں۔

اب پہلے کچھ درسی باتیں کر لیتے ہیں اس کے بعد ہم اس طرف آئیں گے جو میرے ذمے آج کے لیے کیا گیا ہے کہ میں مغرب کے یونانی origin پر کچھ تعارفی باتیں کروں۔

انسان کی قدیم تاریخ میں کم از کم تین روایتیں ایسی ہیں جنہوں نے بڑی بڑی تہذیبوں کو آگے چل کر جنم دیا۔ ایک ہندو روایت، ایک چینی روایت اور ایک یونانی روایت۔ یہ کلاسیکل ادوار کی تین بڑی روایتیں ہیں جنہوں نے آدمی کے grand perspective کو تشکیل دیا اور دنیا کی تہذیبی ساخت کا مسالہ فراہم کیا یعنی انسان کی نفسیاتی دنیا کی تعمیر کے اسباب فراہم کیے اور انسانی دنیا میں اس کی تہذیبی structuring کی۔ ان تین تہذیبوں میں سے ہندو تہذیب اپنے مزاج میں metaphysical ہے۔ ہندو metaphysics کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ میں یہ تمہید اس لیے باندھ رہا ہوں کہ یونانی روایت کے ایک امتیاز کا پتا چل جائے جو مغربِ جدید کو سمجھنے میں ہماری کچھ مدد کرے گا۔

ہندو روایت transcendent کی روایت ہے۔ ہندو روایت کو transcendent کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حقیقت اپنی substantial form میں اور اپنے assense میں اس کائنات سے لاتعلقی کی حد تک ماوراء ہے۔ اس جملے کو اگر آپ سمجھنا چاہیں تو دو مظاہر سے سمجھ سکتے ہیں۔ ہندو میٹافزکس pure transcendent کی میٹافزکس ہے۔ pure transcendent کا مطلب یہ ہے

کہ حقیقتِ واحدہ اس کائنات سے لاتعلقی کی حد تک بلند ہے اور اس کی ساخت وجودی نہیں شعوری ہے۔ اسی وجہ سے اُپنشد کا خلاصہ یہ ہے کہ حق ذات نہیں شعور ہے۔ اس کو سمجھنے کے اگر تیکنیکی اسباب یا فلسفیانہ استعداد میسر نہ ہوتو دو واقعات سے ہندوتہذیب کی دو مستقل خصوصیات کو سمجھا جا سکتا ہے کہ pure transcendence ہوتی کیا ہے۔

ہندوتہذیب میں دو چیزیں نہیں ہیں: ایک تاریخ اور دوسرے tragedy۔ ہندوتہذیب تاریخ کو آفاق سے خارج کرتی ہے اور tragedy کو انفس سے منہا کرتی ہے کیونکہ tragedy ہو یا history یہ دو جڑواں بچے ہیں دنیا کے اور آدمی کے تعلق کے نتیجے میں پیدا ہونے والے۔ یعنی آدمی اور دنیا کا تعلق دو نتائج ضرور پیدا کرے گا: ایک تاریخ اور دوسرے tragedy۔ یعنی تاریخ آفاق کا mechanism ہے اور tragedy انفس کی روح ہے تو ہندوتہذیب ان دونوں سے اپنے آپ کو define نہیں کرتی۔ ان کے ہاں نہ تاریخ ہے نہ المیہ۔ ہندوتہذیب کے بارے میں یہاں اتنا ہی کافی ہے۔

چینی تہذیب ایک میٹافزیکل causation کا نام ہے۔ چینی تہذیب نام ہے اس بات کا کہ حقیقت اپنے شعور کی رو سے ماوراء ہے، اپنے وجود کی رو سے productive ہے یعنی حقیقت کا موجود ہونا کائنات سے ظاہر ہے، حقیقت کا معلوم ہونا کائنات سے میسر نہیں اس کو co-principle کہتے ہیں۔

ان دو قدیم تر روایتوں کے ہوتے ہوئے یونانی روایت کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے ایک فلسفیانہ مابعد الطبیعیات (philosophical metaphysics) کو جنم دیا۔ یہ جو دو روایتیں ہیں یہ مذہبی روایتیں ہیں، اعتقادی روایتیں ہیں، یونانی روایت نے metaphysical themes کو فلسفے کا موضوع بنایا اور انہوں نے میٹافزیکل مباحث کو تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک کلنیکل رنگ دینے کی کوشش کی۔

جس یونانی روایت کے بارے میں ہم بتا رہے ہیں کہ یہ مابعد الطبیعیات کی دو بڑی روایتوں کے بالمقابل یہ امتیاز رکھتی ہے کہ اس نے میٹافزکس کو تقریباً empericise اور logicise کرنے کی کوشش کی۔ مطلب یہ ہے کہ اس نے میٹافزکس کو محسوساتی استدلال دینے کی کوشش کی اور ریاضیاتی Argument دینے کی سعی کی۔ انہوں نے میٹافزکس کو ایک logic فراہم کی اور میٹافزکس کو ایک scientific argumentation کے tool عطا کیے۔ یہ ہے یونانی روایت کا اصل امتیاز۔

تمام میٹافزکس دو پولز کے درمیان شعور کے مستقل فیصلے کا نام ہے۔ دو پولز کیا ہیں، روایتی میٹافزکس کے دو پول کیا تھے؟ حقیقت اور اعتبار (reality and Illusion)۔ یہ مابعد الطبیعی شعور کا

بنیادی مادہ ہے۔حقیقت اور اعتبار مابعد الطبیعی شعور کے تقدیری مسلمات ہیں۔وہ چین میں ہوں، چاہے ہندوؤں میں ہوں اور بعد میں چاہے نیو پلاٹونزم میں ہوں۔یونانیوں نے آ کر مابعد الطبیعی ذہن کے اس اسٹرکچر کو بدلا اور انہوں نے حقیقت اور اثر کو دو پولز بنایا۔انہوں نے reality اور illusion کے تقدیری پولز کو بدل کر reality اور effects کے پول تعمیر کیے اور ان سے نتیجہ خیز علوم پیدا کر کے دکھائے۔یونانیوں کے اس بنیادی کارنامے کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسانی ذہن کی استعداد سے پیدا ہونے والے تقریباً تمام علوم یونانی مآخذ سے پیدا ہوئے ہیں یعنی تاریخ انسانی میں انسانی شعور نے جتنے علوم ایجاد کیے ہیں وہ تقریباً تمام کے تمام Greek Episteme پر ایجاد ہوئے ہیں۔

Greek Episteme (یا یونانی فلسفۂ علم کے منہاج) سے علوم ایجاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ شعور کا ایک بنیادی اندازِ ادراک یا ایک خلقی اسلوبِ ادراک ہوتا ہے، وہ اسلوبِ ادراک ہی تمام علوم کی ماں ہوتا ہے، وہ اسلوبِ ادراک ایک grand تصور کے تابع ہوتا ہے۔اسلوبِ ادراک پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے تو پھر انسانی ذہن جتنے بھی علوم ایجاد کرتا ہے ان علوم میں معانی پیدا کرنے کا پورا نظام اس grand تصور سے حاصل ہوتا ہے۔ان علوم کے مقاصد کا پورا شعور اس ذہنیت سے حاصل ہوتا ہے جو اس grand تصور نے پیدا کیے ہیں۔

یونانیوں کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے شعور کی مستقل ماہیت اور شعور کی مستقل ضرورت کو اتنے کمال، شدت اور جامعیت کے ساتھ متعین کر دیا کہ شعور میں جاننے کا مزاج اور شعور میں جاننے کی urge اور شعور میں جاننے کے مقاصد وہ سارے کے سارے Greek episteme کے تابع ہو گئے۔یہ اثر یعنی انسانی شعور اور اس کی کارکردگی پر ایسا تقدیری اثر کسی اور کلاسیکل روایت کا نہیں ہے۔یعنی انسانوں نے اپنے آپ کو جاننے کے لیے کچھ علوم ایجاد کیے، انسان نے اس دنیا کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے کچھ علوم ایجاد کیے اور انسانوں نے اس دنیا کی حقیقت کو دریافت کرنے کے لیے کچھ علوم پیدا کیے۔ان تینوں دائروں میں جتنے بھی علوم پیدا ہوئے ہیں ان کا basic episteme اور ان کی basic logic یونانی ہے۔یہ ہے یونانی روایت کا وہ امتیاز جس نے مغرب کو پیدا کیا اور اسلام میں مذہبی شعور کی چند بڑی روایتوں کو جنم دیا۔یعنی یونانی روایت کی اثر اندازی کا یہ عالم ہے کہ یہ مذہب اور تہذیبوں کے امتیازات کو پھلانگ کر ایک شانِ عالمگیری کے ساتھ انسانی ذہن پر اثر انداز ہوا ہے۔باقی تمام روایتیں یونانی روایت کے مقابلے میں فلسفے کی دنیا کے اندر مقامی نوعیت کی

(local) ہیں، فلسفے کی دنیا میں اگر کوئی روایت بین الاقوامی نوعیت کی ہے تو وہ یونانی روایت ہے۔

آپ ذرا غور کیجیے کہ تمام فزیکل علوم، تمام سوشل علوم، تمام سائیکولوجی، تمام انٹالوجی، تمام بنیادی تصورات کو تخلیق کرنے والے علمی اصول ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کی جڑیں یونانی روایت میں واضح طور پر نہ ملتی ہوں اور پھر آپ دیکھیے کہ عیسائیوں کو فلسفے کے بالمقابل اپنے مذہب کے دفاع کی ضرورت پڑی تو اس کی دستگیری یونان نے کی، مسلمان متکلمین کو اپنے دفاع کے لیے یا فلسفیوں کو اپنے اظہار کے لیے کسی روایت کی حاجت ہوئی تو وہاں یونانی آ گئے حتیٰ کہ ہندوؤں میں بھی یونان کی اثر اندازی موجود ہے۔ پھر اس روایت نے اپنے آواگون کا پورا نظام وضع کر رکھا ہے۔ ایک جگہ یہ افسردہ اور پژمردہ ہوتی ہے تو دوسری جگہ اپنی نئی زندگی کا سامان کر لیتی ہے۔ کوئی روایت ایسی نہیں ہوئی جس سے جنم لینے والے بچے بھی mother tradition بنے ہوں سوائے یونانی روایت کے۔ یہ وہ روایت ہے مغرب جس کا وارث ہونے کا دعویدار ہے۔ ہم بھی اس سے متاثر ہوئے لیکن ہم نے اس کا وارث بننا، بہت درست بنیاد پر، بہت ہی بڑی تہذیبی بصیرت کی روشنی میں، قبول نہ کیا۔ یہ ہماری دینی، تہذیبی اور نفسیاتی بصیرت تھی کہ اس نے مسلمانوں کی Hellenization کے عمل کو روک دیا لیکن مغرب تو اس کا مدعی ہے کہ Renaissance سارے کا سارا Hellenization کا عمل تھا۔

یونانی روایت کے چار بڑے موضوعات ہیں جن کی حیثیت ان کے تمام علوم کی بنیادوں کی ہے۔ ایک ان کی Ontology ہے، ان کی Cosmology ہے۔ انٹالوجی کا مطلب ہے وہ علم جو یہ جواب دے کہ وجود کیا ہے؟ وجود کا origin کیا ہے؟ کاسمولوجی یہ ہے کہ کائنات اپنا Prime Matter کون سا رکھتی ہے؟ کائنات کے Prime Matter کی تحقیق کا علم کاسمولوجی کہلاتا ہے۔ ان کا تیسرا شعبہ سائیکالوجی ہے کہ انسان کیا ہے؟ جو علم اس کا جواب دے وہ علم سائیکالوجی ہے۔ چوتھی ان کی روایت ہے Orphism کی، وہ الگ ہے۔

یہ تین انتہائی اہم Disciplines of Knowledge ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ یہ اہل یونان نے پیدا نہیں کیے لیکن یونانیوں نے ان تین علوم کی جو definition کر دی اس definition میں آج تک ادنیٰ درجے کی تبدیلی نہیں آ سکی۔ یہ تو ہوئی ایک بات دوسری یہ کہ یہ یونانی تھے جنہوں نے آ کر بتایا کہ انسان کے دو سب سے بڑے مسائل ہیں یعنی انسان کی دو سب سے بڑی ضرورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ

اس پر واضح رہنا چاہیے کہ خدا کیا ہے؟، کائنات کیا ہے؟ انسان کیا ہے؟ اور اس 'کیا ہے' کا جواب ایک سطح پر تین ہونے چاہئیں اور اس سے بلند سطح پر ان تینوں سوالوں کا ایک ہی جواب ہونا چاہیے۔

دوسرا مسئلہ جو فیثا غورث نے اٹھایا— اور فیثا غورث ایسا آدمی ہے کہ جس کا نام ذہن میں آ جائے تو شعور کی سطح بلند ہو جاتی ہے۔ یہ اتنے بڑے لوگ ہیں۔ فیثا غورث یقیناً ایسا آدمی ہے، گو ابھی اس کے بارے میں معلومات کم ہیں — تو ہم نے یونانی فلسفے کی تفصیل گویا سقراط اور افلاطون سے شروع کی ہے، اس سے پہلے کی زیادہ تفصیلات ہمارے پاس نہیں ہیں لیکن فیثا غورث ایک ایسا آدمی ہے جس نے ان تین سوالوں کے تین جوابات اور ایک جواب دونوں دے کر دکھایا۔ اس پر ان شاء اللہ پھر کبھی گفتگو ہوگی۔

یہ دوسرا مسئلہ ذرا سا ٹیڑھا ہے، اور اتنا مشکل ہے کہ اسے منہ سے نکالتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے۔ وہ مسئلہ ہے شعور اور وجود کی identity کا۔ فیثا غورث کہتا ہے کہ انسانی وجود کو کمال کی اور انسانی شعور کو realization کی ضرورت ہے۔ انسان کی دو سب سے بڑی ضرورتیں ہیں: perfection اور realization۔ پرفیکشن وجود کی ضرورت ہے اور ریلائزیشن شعور کی حاجت ہے۔ یہ جو شعور اور وجود ہیں اگر یہ ایک نہ ہو پائیں تو نہ پرفیکشن میسر آئے گی نہ ریلائزیشن حاصل ہو گی۔ 'حقیقت' فیثا غورث کے الفاظ میں نام ہے شعور اور وجود کے ایک ہو جانے کا۔ اب شعور اور وجود کے ایک ہو جانے کے مبحث کو اٹھا کر اس نے انسان کے وجودی مطالبات اور انسان کی علمی ضروریات میں کتنی بڑی بڑی رفعتوں کے دروازے کھولے ہیں، یہ ہم ان شاء اللہ آئندہ عرض کریں گے۔

سوال و جواب

سوال: ہمارے ایک بزرگ گزرے ہیں امام رازی۔ بہت بڑے عالم تھے ان کی تفسیر کبیر کئی جلدوں میں ہے اور ان کے بارے میں علماء کرام کا ایک تاثر یہ ہے کہ جس قوت سے انہوں نے فرق ہائے ضالہ کے اعتراضات اٹھائے ہیں اتنی قوت سے ان کا رد نہیں کر پائے۔ آپ نے اہل یونان اور ان کی فکر کی جس طرح توصیف و تعریف کی ہے، خدانخواستہ کہیں امام رازی والا معاملہ نہ ہو جائے — کیونکہ ہمارا تو مرض ہی مغربی فکر و تہذیب سے مرعوبیت ہے اور اسی کا علاج تو مطلوب ہے جس کے لیے ہم یہاں بیٹھے ہیں۔

جواب: بھائی! یہ نہایت ہی نرم تنقیدی ردعمل آیا ہے۔ اسی کی پیش بنی کر کے کہہ رہا تھا کہ مغرب پر لعنت بھیجنے کے لیے بھی لعنت بھیجنے والے کو کسی رائے کا حامل ہونا چاہیے۔ رستم کو کمزور سمجھ کر گرانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ ہم یونانی روایت کی بات کر رہے ہیں وہ ہماری بھی محسن روایت ہے۔ یہ یونانی روایت کی مداحی ہو رہی تھی، مَیں مغرب جدید کی تعریفیں نہیں کر رہا تھا۔ اور جو شخص افلاطون کی تعظیم کا تصور نہیں رکھتا وہ قرآن بھی نہیں سمجھ سکتا، اس کو علم سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہے۔ اس کے اندر انسان ہونے کی qualification ہی نہیں ہے جو سقراط، افلاطون اور فیثا غورث سے متاثر نہیں ہوسکتا اور ان کے لیے تعظیمی جذبات نہیں رکھتا۔ ہمارے ذہنوں کا عامیانہ پن ہمارے دشمنوں کی گہری پلاننگ کا جواب نہیں ہوسکتا۔ ہم تمام مسائل کو چند جارحانہ جذبات اور چند عامیانہ خیالات سے face کرنا چاہتے ہیں، یہی ہمارے زوال کا سب سے بڑا سبب ہے کہ جس قوت سے لڑنے کے لیے غزالی جیسا آدمی چاہیے ہم اس قوت سے لڑنے کے لیے امام جمعہ پر تکیہ اور انحصار کر رہے ہیں۔ آپ لوگ اس کو سمجھیں اور ابھی بہت سے خطرات ہمارے لیے پیدا کرنے کا مغرب مصمم ادارہ کر چکا ہے جن کا فی الحال ہمارے یہاں شعور بھی نہیں پایا جاتا۔

میری اس طرح کی مصروفیات کا واحد مقصد یہ ہے کہ آپ کی خدمت میں عرض کروں کہ ہم مغرب کے دجل سے جو اسلام کو اب تک پیش آنے والا سب سے بڑا چیلنج ہے، عہدہ برآ کیسے ہوں اور اپنی survival کا درست رخ کے ساتھ اہتمام کیسے کریں؟۔ اور اس زوال اور بے بسی میں جس قدر ذمہ داری ہماری ہے ہم اسے بھلا کر سارا الزام مغرب کو دینے کی ایک عادت بنا چکے ہیں، یہ عادت نہ صرف ہمارے لیے مضر ہے بلکہ یہ عادت بعض مرتبہ مغرب کے جال میں پھنسنے کا سبب بنتی ہے۔ ابھی تو وہ آ کے سکھائے گا کہ قرآن کیسے پڑھتے ہیں اور اسلام کیسا ہونا چاہیے؟ اور آپ ہی میں سے کچھ لوگ اٹھ کر کہیں گے کہ جی ہاں، جی ہاں، اسلام ایسا ہی ہونا چاہیے۔

اس سے نکلنے کا پہلا راستہ یہ ہے کہ آپ کو یہ معلوم ہو کہ مغرب ہے کیا اور وہ آپ کو کتنا نقصان پہنچا چکا ہے، کتنا نقصان پہنچانا چاہتا ہے اور کتنا نقصان پہنچا سکتا ہے؟ آپ نے دیکھا کہ نائن الیون کے بعد سے کم از کم سو بہت ہی زیادہ پڑھی جانے والی کتابیں اسلام کے خلاف چھپ چکی ہیں۔ وہ سو کتابیں جو بہت ہی high سکالرشپ کے ساتھ لکھی گئی ہیں، ان سو کتابوں میں سے دس برس میں کسی ایک کا جواب پورے عالم اسلام میں سے کسی نے نہیں دیا۔ یہ ہمارے کرتوت ہیں۔

دوسرے یہ کہ چلو ہمارے ذہن کچھ پیچھے رہ گئے لیکن ہم کردار میں ان سے آگے نکل گئے ہوتے۔ ذہن اور کردار یہ نیکی کی دیگر شخصی اقسام سے بڑھ کر دینی ضرورتیں ہیں۔ یہ ہمارے دین کی ضرورت ہے کہ ہمارا ذہن اپنے زمانے کے معیارِ ذہانت پر حاکم ہو اور ہمارا کردار اپنے زمانے میں prevail کرنے والی سطح اخلاق پر حاوی ہو۔ کیا ہم ہیں؟

سوال: آپ نے بڑی وضاحت کے ساتھ بتایا ہے کہ یونانی روایت کی ایک بڑی خوبی حقیقت پر ان کا اعتبار ہے ان کے دیگر تصورات کے بارے میں بھی آپ نے گفتگو کی ہے لیکن آپ نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ ان کا تصورِ حقیقت ہے کیا؟

جواب: بہت عمدہ! دیکھیں سوال ایسا ہونا چاہیے۔ گفتگو میں یہ ایک بڑی کمی رہ گئی تھی جس کا اگلی گفتگو میں پورا ہونے کا امکان بھی نہیں تھا۔ یہ بات کرنے کا موقع ابھی ہے۔

جس طرح ہندوؤں کے ہاں حقیقت ایک Transcendent Principle ہے، ایک Conscious Principle ہے، Being Principle نہیں ہے۔ جس طرح چینیوں کے ہاں حقیقت ایک Being Principle ہے لیکن وجودی طور پر Transcendent نہیں ہے۔ یونانیوں کے ہاں حقیقت ایک order کی طرح ہے، ان کے یہاں حقیقت کی بناوٹ Cosmic ہے۔ حقیقت کے بارے میں یونانیوں کی بنیادی اپروچ یہ ہے کہ حقیقت میرے تصور سے ثابت نہیں ہو گی بلکہ کائنات کے order سے برآمد یا reflect ہو گی۔ یونانیوں نے پہلی مرتبہ حقیقت کو ایک cosmic order کے طور پر تصور کرنے اور ایک ریاضیاتی منطق کے نتیجے میں ثابت کرنے کی روایت پیدا کی۔ ان کی دوسری روایت ہے symbolism کی لیکن یہ فیثاغورث کے بعد چلی نہیں جس پر ہائیڈیگر نے کہا کہ اصل فلسفہ تو pre-Socratic ہے۔ symbolism کی روایت یہ ہے کہ حقیقت ایک symbolized origin ہے لیکن یہ روایت چونکہ چل نہیں پائی لہٰذا ہمارے پاس کافی data موجود نہیں ہے کہ ہم اس پر تفصیل سے گفتگو کر سکیں لیکن Reality ایک Cosmic Order ہے، ایک Changeless Cosmic Order، یہ تصور یونانیوں کا دیا ہوا ہے۔

ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی☆

وسطیہ

اسلام کا فلسفۂ اعتدال

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی ہر چیز کو کسی نہ کسی مقصد اور حکمت کے تحت پیدا کیا۔ کائنات کی تمام مخلوقات میں سب سے نمایاں مقام انسان کو حاصل ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے عقل وفکر اور علم کی صلاحیتوں سے نوازا ہے، ساتھ ہی یہ دنیا اس کے لیے دارالامتحان بھی ہے۔ اس لیے کہ انسان اس دنیا میں خیر وشر دونوں صلاحیتوں کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا'' (الشمس ۹۱:۷۔۸)

''اور قسم ہے انسانی جان کی اور اس ذات کی جس نے اسے درست اور معتدل اعضاء کے ساتھ بنایا، اور پھر خیر وشر دونوں کی سمجھ اور صلاحیت القاء کی۔''

ہر انسان نیکی اور بدی دونوں صلاحیتوں کے ساتھ دنیا میں آتا ہے، لیکن طفولیت کے آغاز میں نیکی کا شعور غالب ہوتا ہے، اس لیے کہ ہر بچہ کی پیدائش دین فطرت کے مطابق ہوتی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے موقعہ پر جو نفخ روح کا عمل ہوا تھا اس نے انسان کو اس قابل بنا دیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اوصاف کو اپنے اندر اجاگر کر سکے، نفخ روح نے ہی ایک طرف علم وفکر کی بلندیوں کو چھونے کی صلاحیت پیدا کی تو دوسری طرف روحانی واخلاقی بلندیوں کے حصول کی صلاحیت بھی پیدا کر دی۔ اب اگر انسان کو سازگار اور تعمیری ماحول میسر ہو، تعلیم وتربیت کا بہتر انتظام ہو تو وہ انسانیت کے اعلیٰ مقام کو حاصل کر سکتا ہے، اور اپنے علم وفکر، اخلاقِ فاضلہ اور کردار سے معاشرہ اور گردوپیش کے ماحول پر بہت عمدہ، صحت منداور تعمیری اثرات مرتب کر سکتا ہے۔

سورۂ روم میں وارد آیت فطرت کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کی اصل خیر پر مبنی ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اس دین فطرت پر پیدا فرمایا جو سراسر خیر ہے:

''فَاَقِمْ وَجْهَکَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا، فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِکَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَ لٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ'' (الروم:۳۰:۳۰)

☆ سابق ڈائریکٹر جنرل شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

''پس (اے محمدؐ) یکسو ہو کر اپنا رخ دین حنیف (اسلام) کی طرف کر لیجیے، اللہ تعالیٰ کی اس فطرت پر ثابت قدم رہیے جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے، اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں ہونی چاہیے، یہی سیدھا دین ہے، لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔''

اس آیت مبارکہ سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ پیدائشی طور پر ہر انسان دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے، اسے حق و باطل کی معرفت حاصل ہوتی ہے، اگر انسان اسی فطرت سلیمہ پر قائم رہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا ہے تو وہ ہمیشہ حق وصداقت کی طرف مائل رہے گا۔ اس بات کی وضاحت احادیث میں بھی ملتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے:

''کل مولود یولد علی الفطرة فابواہ یھودانه و ینصّرانه کما تناتج الابل من بھیمة جمعا، ھل تحس من جدعاء'' (سنن ابی داؤد حدیث نمبر ٤٧١٤، صحیح بخاری، کتاب الجنائز حدیث نمبر ١٢٩٦؛ صحیح مسلم، کتاب القدر، حدیث نمبر ٤٨:٣)

''ہر بچہ جو بطن مادر سے پیدا ہوتا ہے وہ اصل فطرت پر پیدا ہوتا ہے، بعد میں اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں، (اس کی مثال ایسے ہے جیسے) جانور کے پیٹ سے مکمل صحیح وسالم بچہ پیدا ہوتا ہے، کوئی بچہ بھی کٹے ہوئے کان لے کر نہیں آتا۔''

حجاج بن منہال ''فطرہ'' کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس میں اشارہ ہے اس عہد کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے ارواح آدم سے لیا تھا۔ الست بربکم کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تمام ارواح نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اعتراف کیا۔ (دیکھیے ابو داؤد، سنن، حدیث نمبر ۴۷۱۶) گویا ہر فرد عہد الست والی فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔(۱) ان آیات واحادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل فطرت تو اللہ تعالیٰ کی توحید، اس کی ربوبیت اور اس کے معبود ہونے کے اعتراف پر مبنی ہے، لیکن ولادت کے بعد انسانوں کا پیدا کردہ ماحول اثر انداز ہوتا ہے، اس لیے کہ ماحول کا اثر نہ صرف انسان کے ظاہر پر ہوتا بلکہ فکر اور کردار پر بھی گہرا اثر پڑتا ہے۔ صحتمند جسمانی اور فکری ارتقاء کے لیے ہر فرد کو ایک بہتر صحت منداور صالح ماحول کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ اس ماحول میں اس کی ذہنی، فکری، ظاہری اور باطنی صلاحتیں بہتر طور پر پروان چڑھ سکیں۔ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا محور بھی یہی رہا ہے کہ وہ تعلیم

۱۔ وکل مولود فی العالم علی ذالك الاقرار وھو الحنیفه التی وقعت الخلقة علیھا و ان عبد غیره، کما قال تعالیٰ ولئن سألتھم من خلقھم لیقولن اللّٰه، و قالوا: وما نعبدھم الا لیقربونا الی الله زلفی۔ البغوی معالم التنزیل ۳ض ٤٨٣۔

وتربیت اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ذریعہ انسانی معاشرہ کے لیے ایسا مضبوط اور موثر ماحول پیدا کرتے ہیں جس میں شر کی قوتیں تو سمٹ کر رہ جاتی ہیں اور خیر کی تمام قوتوں کو پھلنے پھولنے کے مواقع میسر آتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام انسانوں کی فطرت کی حفاظت اور ان میں اعتدال کو برقرار رکھنے کے لیے ایسا ماحول پیدا کرتے ہیں کہ جس میں اللہ تعالیٰ کی ودیعت کردہ خیر کی صلاحیتیں پھلیں پھولیں اور اس قدر توانا ہو جائیں کہ شر کی صلاحیت ان کے سامنے ماند پڑ جائے اور غیر موثر ہو جائے۔

اس قسم کے ماحول کی تشکیل کے لیے انبیاء علیہم السلام اپنے کام کا آغاز انسانوں کی فکری تطہیر اور اخلاقی تربیت سے کرتے ہیں۔ جہاں تک فکری تطہیر کا تعلق ہے تو انبیاء انسانیت کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہیں، ایمان، اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل یقین انبیاء علیہم السلام، جو وحی الٰہی کی عملی تشکیل کا بہترین نمونہ ہوتے ہیں، کی مکمل اطاعت اور آخرت میں اپنے تمام اعمال کے حساب و کتاب اور اعمال کی بنیاد پر آخرت میں جزا وسزا کے عقیدہ سے کرتے ہیں۔

عقیدہ توحید، اس کی وسعت و ہمہ گیری کا شعور، عقیدہ رسالت اور رسالت مآب سے ہمارے تعلق کا ادراک، اس کائنات کی حقیقت اور اس کائنات میں انسانی منصب و مقام کا فہم اور اسی اعتبار سے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا شعور انسانی فکر کو نہ صرف مستحکم کرتا ہے بلکہ کمال کی جانب ارتقائی مراحل طے کرنے میں بھی مددگار ثابت ہوتا ہے۔

دوسرا اہم کام انسانی رویوں کی تعمیر و تہذیب کا ہے، انبیاء علیہم السلام دو پہلوؤں سے یہ فریضہ انجام دیتے ہیں، سب سے پہلے وہ انسانوں کے قلوب کے تزکیہ اور باطن کی تطہیر کا کام کرتے ہیں۔ تزکیہ نفس انبیاء علیہم السلام کے فرائض منصبی میں تلاوت وحی کے بعد سب سے مقدم کام ہے۔ تطہیر باطن کے لیے ضروری ہے کہ نفس انسانی میں اگر حرص وطمع، کذب و نفاق، حسد وتعصب، نفرت و عداوت، خیانت و بدگمانی، خود پرستی و شہوت پرستی کی آلودگیاں پائی جاتی ہوں تو جب تک باطن کو ان امراض اور آلودگیوں سے پاک صاف نہیں کیا جاتا اس وقت تک قلوب میں فضائل کو پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ انبیاء علیہم السلام ان تمام رذائل کو کھرچ کھرچ کر صاف کرتے ہیں اور پھر تعمیر انسانیت اور شخصیت سازی کا عمل اخلاص و یقین، صدق و امانت، صبر و تقوی، رحم دلی اور جذبہ عفو درگزر کی تعلیم و تربیت سے کرتے ہیں۔

یہاں اس بات کی وضاحت کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں ایمان اور اخلاق لازم وملزوم ہیں۔لہذا انبیاء کے مشن میں ایمان اور اخلاق کی تعلیم یکساں اور ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ایمان کا تعلق قلب سے ہے، اس کا اصل اظہار اعلی اخلاقی اقدار میں ہوتا ہے۔مندرجہ ذیل احادیث ایمان اور اخلاق کے تعلق کو خوب واضح کرتی ہیں:

"**لا ایمان لمن لا امانة له ولا دین لمن لا عهد له**" (مسند احمد بن حنبل حدیث نمبر ۱۲۵،۱۵٤،۲۱۰)

''جس میں امانت داری نہیں اس میں ایمان بھی نہیں اور جو عہد کی پاسداری نہیں کرتا اس کا کوئی دین و ایمان نہیں۔''

''**والذی نفسی بیده لا یؤمن عبد حتی یحب لجاره ما یحب لنفسه**'' (مسلم حدیث نمبر ۱۷۱،۷۲؛ صحیح بخاری، کتاب الایمان حدیث نمبر ۷)

''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری زندگی ہے، کوئی بندہ مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے پڑوسی کے لیے بھی وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔''

''**لیس المؤمن الذی یشبع و جاره جائع الی جنبه**'' (بخاری ، الادب المفرد حدیث نمبر ۱۱۲؛بیهقی، السنن الکبری ج ۱۰ص ۳۰)

''وہ شخص مومن نہیں جو خود شکم سیر ہو اور اس کا پڑوسی بھوکا ہو۔''

لا یؤمن الذی لا یأمن جاره بوائقه (**کنزالعمال حدیث نمبر ۱۹۴۲**)

''وہ شخص مومن نہیں ہوسکتا جس کا پڑوسی اس کے شر سے محفوظ نہ رہے۔''

امام بخاری نے اس حدیث کو اس طرح نقل کیا ہے:

''**من کان یومن بالله فلیکرم جاره**'' (**صحیح بخاری، کتاب الادب حدیث نمبر ۳۱؛ مسلم کتاب لایمان حدیث نمبر ۷٤**)

''جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے پڑوسی کا احترام کرے۔''

زبیری نے اسی مفہوم کی حدیث کو اس طرح نقل کیا ہے:

''**لا یؤمن باللّٰه من لم یکرم جاره**'' (**اتحاف السادة المتقین للزبیری ج ۷،ص ۳۵۸ (بیروت، ت ن)**)

''وہ شخص تو مؤمن نہیں ہوسکتا جو اپنے پڑوسی کی عزت نہ کرتا ہو۔''

"**لا یؤمن بالله والیوم الآخر من اذا حدث کذب**" (**السیوطی، الدرالمنثور ج ۴، ص ۱۳۱، دارلفکر،**

بیروت، ت ن)

''وہ شخص اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے والا نہیں ہوسکتا جو بولتا ہے تو جھوٹ ہی بولتا ہے۔''

"لا یؤمن العبد حتی یحب لا خیه ما یحب لنفسه یا لا یؤمن احدکم حتی یحب لأخیه ما یحب لنفسه" (بخاری، صحیح بخاری، کتاب الایمان، حدیث نمبر ۷: صحیح مسلم، صحیح مسلم، کتاب الایمان حدیث نمبر ۱۷)

''کوئی بندہ خدا بندہ مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔''

"لا ایمان لمن لا حیاء له" (المنذری، الترغیب والترهیب ج۳، ص ۴۰۰ (مطبوعه مصطفی الحلبی ، قاهره، ت ن)

''اس شخص کا ایمان معتبر نہیں جس میں شرم وحیا نہیں۔''

ابن جریر الطبر یؒ نے حضرت عبداللہ بن جواد کی ایک روایت نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ایک مجلس میں حضرت ابوالدرداءؓ نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! کیا کوئی مؤمن چوری کا ارتکاب کرسکتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں کبھی مؤمن سے ایسی غلطی سرزد ہوسکتی ہے۔ انہوں نے پھر سوال کیا کہ یا رسول اللہ! کیا کوئی مؤمن زنا کرسکتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں کیوں نہیں، چاہے ابو الدرداء کو کتنا ہی برا کیوں نہ لگے، انہوں نے مزید سوال کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! کیا کوئی مؤمن جھوٹ بھی بول سکتا ہے آپؐ نے فرمایا کہ جھوٹ تو وہی بول سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ پھر فرمایا کہ بندہ سے لغزش ہو جاتی ہے لیکن پھر وہ اپنے گناہ پر احساس ندامت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے، توبہ کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کو قبول فرما لیتے ہیں۔ (تهذیب الآثار ج ۳، ص ۱۳۵، حدیث نمبر ۲۲۳)

یہاں ہم مذکورہ بالا چند احادیث پر اکتفاء کرتے ہیں، یہ احادیث اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ ایمان وہی معتبر ہے جو اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ کے ساتھ مزین ہو، اس بات کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایک خاتون کا تذکرہ کیا جاتا ہے کہ وہ بہت عبادت گذار ہے، صدقہ بھی خوب کرتی ہے، لیکن اپنی زبان پر اسے کنٹرول نہیں، اس کے پڑوسی اس کی بدزبانی سے تنگ ہیں، آپؐ نے فرمایا کہ یہ خاتون جہنمی ہے۔ ایک دوسری خاتون کا تذکرہ ہوا کہ وہ عبادات وصدقات میں تو کمزور ہے لیکن پڑوسیوں کی راحت و آرام کا خیال رکھتی

ہے، ان کے ساتھ حسن کلام سے پیش آتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ عورت جنتی ہے۔ (مسند امام احمد ابن حنبل ج:۲ص۴۴۰، حدیث نمبر ۹۶۷۳)

انسان کی زندگی میں صحیح توازن اور اعتدال پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے انسانی فکر کا قبلہ متعین کر دیا جائے اور انسانی رویوں کو اعلیٰ اخلاقی اصولوں کے مطابق ڈھال لیا جائے۔ انبیاء علیہم السلام اس منہج تربیت کے مطابق افراد کی ذہنی وفکری اصلاح اور ان کے ظاہری و باطنی اخلاق کی اصلاح کر کے انسانی معاشرہ تشکیل دیتے ہیں۔ اگر افراد اچھے ہوں گے تو ہمارے ادارے، تنظیمیں اور معاشرے بھی اچھے ہوں گے۔ لیکن اگر افراد کی اس نہج پر تربیت کا اہتمام نہ کیا جائے تو ان میں فکری بے راہ روی اور اخلاقی دیوالیہ پن کے جراثیم پرورش پائیں گے۔ چنانچہ وہ افراد جن کے افکار منفی و پراگندہ ہوں اور جن کے رویوں میں ایسے افراد جو فکری بے راہ روی کا شکار ہوں اور ان کے رویوں میں فساد و شر کے جراثیم بھرے ہوئے ہوں وہ اپنے ہی جیسے افراد کو منظّم کر کے جو تنظیمیں بنائیں گے، یا ایسے افراد پر مشتمل جو ادارے قائم کیے جائیں گے، ان سے کسی خیر کی توقع رکھنا، یا ان کی ذریعہ معاشرہ میں عدل و اعتدال کے فروغ کی امید رکھنا بالکل عبث ہے۔ ایسے ادارے اور تنظیمیں فساد اور برائی کو زیادہ منظّم کر کے معاشرہ کو مزید تباہی کی طرف دھکیل دیتی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے مکی زندگی میں تیرہ برس تک لوگوں کی فکری، علمی اور اخلاقی تربیت فرمائی۔ جب ایمان قبول کرنے والوں کی واضح اکثریت ایمان و یقین اور اخلاق و کردار کے اعتبار سے اس قدر مضبوط ہوگئی کہ ہر امتحان اور ہر آزمائش کی گھڑی میں انہوں نے ثابت کر دیا کہ نہ تو کوئی حادثہ و آزمائش ان کے ایمان کو متزلزل کرسکتا ہے نہ ہی اخلاق و کردار کے جس بلند مقام کو وہ حاصل کر چکے ہیں اس میں کوئی ضعف اور کمزوری پیدا ہوسکتی ہے، اس لیے کہ امت مسلمہ ہر طرح سے اعتدال کی راہ پر گامزن ہو چکی ہے۔ اس میں وہ توازن اور اعتدال پیدا ہو چکا ہے جو اس دنیا میں منصب خلافت کی ادائیگی کے لیے ضروری ہے۔ اس پس منظر میں ۲ھ ہجری میں تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا، جو امت مسلمہ کے لیے اس بات کا اعلان تھا کہ دنیا بھر کی امامت و قیادت کی ذمہ داری اب ان کے سپرد کی جا رہی ہے۔ اسی موقعہ پر یہ آیت بھی نازل ہوئی:

"وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا"
(البقرہ۲:۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تمہیں امتِ وسط (معتدل) بنایا تا کہ تم دنیا بھر کے لوگوں پر (حق کے) گواہ رہو۔

اس آیت مبارکہ میں امت مسلمہ کو امتِ وسَط قرار دیا گیا ہے، وَسَط کو اردو زبان میں توازن اور اعتدال سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، یعنی ایسی امت جو اپنے تمام معاملات میں متوازن اور معتدل ہو، اس لیے کہ توازن اور اعتدال کے بغیر نہ تو شہادت حق کا فریضہ انجام دیا جا سکتا ہے، نہ ہی امامت و خلافت کے عظیم منصب کی ذمہ داریوں کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ امت مسلمہ دنیا بھر کے لوگوں کے سامنے حق کی گواہ ہے اور گواہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ عادل ہو، عدل کی صفت اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی جب تک صدق اور امانت داری کی صفات نہ پائی جاتی ہوں، گویا عدل کا وجود سچائی اور امانت داری کے بغیر ممکن نہیں، لہذا گواہ کے لیے جو شرائط مقرر ہیں امتِ مسلمہ کے ہر فرد کو ان شرائط پر پورا اترنا لازمی ہے۔ ابوالسعو دالعمادیؒ نے امتِ وسَط کے تعریف اس طرح کی ہے:

''**ای متصفه بالخصال الحمیدة خیارا، عدولا، مزکین باالعلم والعمل**'' (۱) ''یعنی ایسی امت جو اخلاق حمیدہ سے متصف ہو، خیر کا پیکر ہو، عدل وانصاف کو پوری طرح قائم کرنے والی ہو اور مکمل طور پر علم وعمل سے آراستہ ہو۔''

اس تعریف میں خصال حمیدہ کی شرط لگا کر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ امت وسط کا منصب اس وقت حاصل ہو گا جب مجموعی طور پر افرادِ امت میں فضائل اخلاق اجاگر ہو جائیں۔ ''خیارا'' کے لفظ سے قرآن حکیم کی درج ذیل آیات کی طرف توجہ مبذول کرانا مقصود ہے:

''**وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ**'' (آل عمران ۳:۱۰۴)

''تم میں ایک گروہ ضرور ایسا ہونا چاہیے جو لوگوں میں بھلائی کے کاموں کی دعوت دے، اچھے کاموں کا حکم دے اور برائی کی روک تھام کرے، یہی لوگ کامیاب ہوں گے۔''

اسی طرح قرآن حکیم کا یہ فرمان:

''**كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ**'' (آل عمران ۳:۱۱۰)

۱۔ ارشاد العقل السلیم (داراحیاء التراث العربی، بیروت ت ن) ج ۱ ص ۱۷۲

''تم بہترین امت ہو، تمہیں دنیا بھر کے لوگوں کی رہنمائی کے لیے بھیجا گیا ہے، تم اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو، منکرات کی روک تھام کرتے ہو اور (سب سے بڑھ کر یہ کہ) تم اللہ تعالیٰ پر یقین رکھتے ہو''

تیسری شرط امت کا عدول ہونا ہے۔ عدول عربی زبان میں ایسے فرد کو کہا جاتا ہے جس میں صفت عدل خوب راسخ ہو۔ اعتدال اور توازن کا عدل سے بہت گہرا تعلق ہے۔ جو معاشرہ عدل و انصاف کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے وہاں خیر کی قوتوں کو پھلنے پھولنے کا موقع ملتا ہے۔ عدل فرد اور معاشرہ دونوں میں اعتدال اور توازن برقرار رکھنے میں مددگار رہتا ہے، جبکہ ظلم، شر کی قوتوں کو ابھارتا ہے۔ ظلم تلخ ہوتا ہے اور منفی ردعمل پیدا کرتا ہے جو معاشرہ میں قائم توازن کو بگاڑ دیتا ہے۔ ظلم کو ظلم سے نہیں روکا جا سکتا، ظلم کے اثرات کو ختم کرنے کے لیے بھی عدل کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

چوتھی شرط مزکین بالعلم والعمل ہے۔ اسلامی معاشرہ کی ابتداء تعلیم و تعلم سے ہوتی ہے۔ انسان کی تعلیم کا آغاز تو تخلیق انسانی کے وقت سے ہی شروع ہو گیا تھا، اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ اسلام کو پیدا فرمایا تو انہیں علم سے بھی نوازا۔ وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (البقرہ ۲ : ۳۱) اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام سکھا دیے۔ رسول اللہ ﷺ پر پہلی وحی کا آغاز اقرء سے ہوا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام میں علم کو ہر چیز پر فوقیت حاصل ہے۔ صحابہ کرام کو پہلی وحی کی پانچ آیات سے حصول علم کی اہمیت کا خوب اندازہ ہو گیا تھا۔ خود رسول اللہ ﷺ نے تعلیم و تعلم کا فیصلہ ترجیحی بنیادوں پر طے فرمایا اور ملت کے ہر فرد کے لیے حصول علم کو فرض قرار دیا۔

ہم نے گزشتہ صفحات میں اصلاح و تطہیر فکر اور اصلاح رویہ کے بارے میں گفتگو کی ہے، فکر اور رویہ کی اصلاح کے ساتھ جب انسان علم کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ علم خود بخود عمل کا قالب اختیار کر لیتا ہے، پھر علم اور عمل میں تضاد باقی نہیں رہتا، اصلاحِ فکر کے نتیجہ میں عقل سلیم پیدا ہوتی ہے جو علم نافع کے حصول پر آمادہ کرتی ہے، اور اصلاحِ رویہ کے نتیجہ میں قلب سلیم پیدا ہوتا ہے، فکر سلیم اور قلب سلیم مل کر ایک ایسے مستحکم معاشرہ کو وجود بخشتے ہیں جس میں ہر خیر، ہر خوبی اور ہر جدید صالح کو قبول کرنے کی بھرپور صلاحیت ہوتی ہے۔ یہی معاشرہ قرآن حکیم کی اصطلاح میں امتِ وَسَط کہلاتا ہے، جو ہر قسم کے غلو اور ہر قسم کی تقصیر سے پاک ہوتا ہے اور اسلام کی یہ تعلیمات معاشرہ کو راہ اعتدال پر گامزن رکھتی ہیں (جاری ہے)۔

مولانا عبدالقیوم حقانی

غامدی مکتب فکر

ہم ذیل میں مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب (مہتمم جامعہ ابوہریرہ خالق آباد (نوشہرہ)، سرپرست ماہنامہ القاسم ومصنف کتب کثیرہ) کا ایک مضمون ''عمار خان ناصر۔کس راستے پر چل نکلے'' ماہنامہ القاسم کے شکریے کے ساتھ دے رہے ہیں۔

عمار خان ناصر صاحب (صاحبزادہ مولانا زاہد الراشدی صاحب و مدیر ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ) جاوید احمد غامدی صاحب کے تلمیذ خاص ہیں۔ہمیں جاوید غامدی صاحب اوران کے مکتب فکر سے بنیادی اختلاف ہی یہ ہے کہ وہ عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب سے متاثر ومرعوب ہوکر کررہے ہیں۔ دینی معاملات اورعصری مسائل میں انہوں نے جو مؤقف اختیار کیا ہے، رجم سے لے کر حقوق نسواں بل تک اور قادیانیت سے لے کر توہین رسالت تک، ہر جگہ وہ اسی تجدد اور اعتزال کا مظہر ہے۔ چونکہ بات وہ شائستگی ،متانت اور بظاہر دلیل سے کرتے ہیں اور مغرب نے اپنی سیاسی، حربی، علمی اور تہذیبی برتری سے اور ترغیب وتشویق کے سارے پُرامن ذرائع استعمال کرتے ہوئے اور پاکستانی معاشرے میں اپنی گماشتہ حکومتوں کے قیام سے چونکہ یہاں مغرب زدگی کی عام فضا قائم کررکھی ہے اس لیے بعض جدید تعلیم یافتہ افرادان سے متاثر ہورہے ہیں۔

علاوہ ازیں بعض دانشوروں کا خیال یہ ہے کہ مغرب خصوصاً امریکہ اپنی تہذیبی ونظریاتی بالادستی قائم رکھنے، مسلمانوں کو مغلوب اور زیردست رکھنے اور مسلم معاشرے سے مسلم نشأۃ ثانیہ کے لیے اٹھتی لہروں کو دبانے کے لیے اسلام کے ایک ایسے ماڈل کو، جو اُس کی فکری ضرورتوں اور عملی تقاضوں کے مطابق ہو، مسلم معاشرے میں ابھار رہا ہے اور ہر جگہ وہ ایسے دینی سکالرز کو تلاش کرکے ان کی حوصلہ افزائی اور حمایت کر رہا ہے اور ان سے کام لے رہا ہے جو دین کی تفہیم وتشریح اس کی ضرورتوں کے مطابق کرنے کو تیار ہوں۔ ان کے نزدیک استعمار کی یہ خدمت جس طرح ماضی میں سرسید، قادیانی اور پرویز بجالائے آج کل یہی خدمت پاکستان میں جاوید غامدی صاحب اور ان کے شاگرد بجالا رہے ہیں۔

ہمارے علماء کرام جاوید غامدی صاحب یا ان کے کسی شاگرد کے خلاف قلم اٹھاتے ہوئے اگر اس صورت حال کو بھی سامنے رکھیں تو وہ ان کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے اور اپنے قارئین کو زیادہ مؤثر انداز میں ان کی حقیقت سے آگاہ کر سکیں گے۔ امین

عمار خان ناصر۔کس راستے پر چل نکلے؟

قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت اور تحفظِ ناموس رسالت ﷺ کے سلسلے میں آئینی تحفظات اور قانونی کاوشوں کو ڈائنامیٹ کردینے کی جدید سائنٹفک مذموم مساعی

عمار خان ناصر اپنے علمی اور قلمی قد وقامت، خاندانی نسبت وشرافت اور ایک مؤقر جریدے کی ادارت کے حوالے سے بظاہر ذمہ دار عالم و فاضل کا عنوان اور علماءِ دیوبند کی نسبت کے حوالے سے

ایک جواں سال فکری کاوش کا نام اور پہچان ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کی استقامت سے امت کو استحکام اور پھسلنے سے ایک پوری جماعت کے گمراہ ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

انہی اندیشہ ہائے دور دراز کے پیشِ نظر ماہنامہ القاسم کے ایک بیدار مغز، حساس اور مخلص قاری نے ماہنامہ ''اجتہاد'' (اسلام آباد شمارہ ۵، مئی ۲۰۰۹ء) میں شائع ہونے والے ایک مقالے بعنوان ''نفاذ شریعت، تزکیۂ نفس یا نفاذِ قانون'' کی فوٹو کاپی بھیجی ہے۔ مضمون نگار جناب عمار خان ناصر مدیر ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ ہیں۔

اب کے بار جو مقالہ پڑھا تو رونگٹے کھڑے ہوگئے اور یقین نہیں آ رہا ہے کہ کیا واقعتاً بھی عمار خان ناصر جیسے ذی علم، ذی استعداد اور صاحب فضل و کمال بھی ایسی بات لکھ سکتے ہیں۔ اگر یہ بات کسی پرویزی، کسی غامدی، کسی قادیانی، کسی بے دین کالم نویس نے لکھی ہوتی تو کبھی کڑھن نہ ہوتی اور نہ اس سلسلہ میں کچھ لکھنے کی ہمت ہوتی کہ برتن سے وہی ٹپکتا ہے جو اس کے اندر ہوتا ہے۔ میرے خیال میں آں عزیز کی اس نوعیت کی تحریری کاوشوں سے ملحدوں، دہریوں اور نفاذِ اسلام کی جدوجہد کے خلاف کام کرنے والے دین دشمنوں بالخصوص قادیانیوں کی مذموم تحریکات کو تقویت ملتی بلکہ ان کی ترجمانی ہوتی ہے۔ عمار خان ناصر تحریر فرماتے ہیں:

''اگر کسی معاشرے میں کشف و الہام انفرادی دائرے سے اٹھ کر ایک باقاعدہ ادارتی صورت اختیار کر چکے ہوں، ان کی بنیاد پر شخصیات اور جماعتوں کے عنداللہ مقبول ہونے یا نہ ہونے کے فیصلے کیے جاتے ہوں، لوگوں کی ان کی طرف دعوت جاتی اور ان کے ساتھ وابستہ ہونے والوں کو نجات کی بشارت دی جاتی ہو، القاء والہام کی بنیاد پر مراقبہ وسلوک کے نظام مرتب کیے جاتے بلکہ سیاسی و مذہبی اختلافات میں بھی حق و باطل کی تفریق کرنا ایک عام چلن ہو، جہاں خواب اور بشارات کسی کے مامور من اللہ ہونے کا ایک مستند ذریعہ سمجھے جاتے ہوں، ایسی فضا میں اگر کوئی شخص ''شانی سے کلیمی دو قدم ہے'' کا نعرۂ مستانہ بلند کردے اور لوگ اس کے فریب میں مبتلا ہوکر اسے ایک ''امتی نبی'' مان لیں تو انہیں کس حد تک اس کا قصور وار ٹھہرایا جا سکتا ہے اور راہ راست پر لانے کی ہمدردانہ کوشش کرنے کے بجائے ان کا معاشرتی مقاطعہ کرنے اور قانونی اقدامات کے ذریعے انہیں مسلمانوں سے بالکل الگ تھلگ کر دینے کو کس حد تک اخلاق، حکمت اور دعوتِ دین کے تقاضوں کے مطابق قرار دیا جا سکتا ہے؟ ایک ایسی سوسائٹی جس میں فحاشی اور جنسی بے راہ روی کے محرکات و ترغیبات بکثرت میسر جبکہ مناسب

عمر میں آسان شادی کے مواقع معدوم ہوں، جہاں عالمی سرمایہ دارانہ معیشت کے تحت درآنے والے تہذیبی و اخلاقی اثرات اور ایک ناہموار سماجی ڈھانچے سے پیدا ہونے والی ترجیحات بنیادی کردار ادا کرتی ہوں، جہاں پیشہ ورانہ بدکاری معاشرے میں خواتین کی محکومانہ حیثیت اور ان کے استیصال پر مبنی ایک مضبوط نظام کی پیداوار ہو، اس صورتِ حال میں زنا کی سزا کو محض قانون کی کتاب میں درج کر دینے سے معاشرے کی اخلاقی تطہیر و تربیت کے وہ تقاضے کیونکر پورے ہوں گے جو شریعت کا اصل مطلوب ہے اور کیا دین کے تجویز کردہ اخلاقی و سماجی ڈھانچے کے بغیر یہ سزائیں ایک بے جوڑ سی چیز دکھائی نہیں دیں گی؟'' (ماہنامہ اجتہاد، اسلام آباد، ص۱۶)

پہلے تو یہ بتایا جائے کہ وہ کون سے لوگ ہیں اور کہاں ہیں جنہوں نے کشف والہام اور القاء کو واقعتاً بھی ایک مرتب نظام کے تحت باقاعدہ ادارتی صورت دے رکھی ہے، اور خواب و بشارت کو کسی کے مامور من اللہ ہونے کے لیے ایک مستند ذریعہ سمجھتے ہیں؟ اور ملک میں غالب اکثریت بھی انہی کی ہے۔

''شبانی سے کلیمی دو قدم ہے'' کے شاعرانہ نعرۂ مستانہ سے متاثر ہو کر ایک شخص ''امتی نبی'' ہونے کا دعویٰ کرے اور لوگ اسے ''امتی نبی'' مان بھی لیں تو نبوت کے دعویدار اور اس کے پیروکار کو قصوروار ٹھہرانا، ان کا معاشرتی مقاطعہ کرنا اور قانونی اقدامات کے ذریعہ انہیں مسلمانوں سے الگ تھلگ گروہ اور غیر مسلم اقلیت قرار دینا، عمار خان ناصر کے ہاں اخلاق، حکمت اور دعوتِ دین کے تقاضوں کے سراسر خلاف ہے۔

جس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اکابر و مشائخ اور قومی و ملی زعماء کی نفاذ شریعت سے متعلق تمام تر پارلیمانی جدوجہد بھی بے سود اور بے ہدف تھی، شریعت بل کا معرکہ، حدود وقصاص کا نفاذ، قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینا اور عظیم تحریک ختم نبوت کا برپا کرنا گویا سعی لاحاصل تھا۔ محدث العصر مولانا محمد یوسف بنوری، قائد ملت مولانا مفتی محمود، شیخ الحدیث مولانا عبدالحق، ضیغم اسلام مولانا غلام غوث ہزاروی، شیخ الحدیث مولانا سرفراز خان صفدر، حضرت خواجہ خان محمد رحمہم اللہ اور دیگر تمام علماء کرام کی تمام تر مساعی گویا بے سود اور بے جوڑ سی چیز کے لیے رائیگاں جدوجہد تھی، العیاذ باللہ۔

افغانستان میں تو طالبان نے تزکیۂ نفس اور لوگوں کی تربیت کا منفرد خصوصی اہتمام کیے بغیر جو اسلام کا مکمل نظام قانون نافذ کر دیا تھا جس نے پندرھویں صدی میں بھی خلاف راشدہ کی یادیں تازہ کر دی تھیں۔ عمار خان ناصر کے ہاں سب کچھ اکارت گیا۔ عمار خان ناصر اپنی یہی بات الفاظ کے ہیر

پھیر سے ماہناہ اجتہاد کے صفحہ ۸ پر یوں تحریر فرماتے ہیں:

''اس کے علاوہ عملاً جن قوانین مثلاً قادیانیوں کے خلاف امتناعی قوانین یا توہین رسالت ﷺ کی سزا وغیرہ پر عمل درآمد پر اصرار کیا گیا، ان کے پس منظر میں زیادہ تر عوامی سطح پر پائے جانے والے جذبات کارفرما تھے جبکہ حقیقی معاشرتی اصلاح کا پہلو اُن میں نمایاں نہیں تھا۔ گویا یہ ساری جدوجہد اصلاً چند خطرات اور تحفظات کے تناظر میں تھی اور اس کے محرکات میں اسلام کے ریاستی و معاشرتی کردار کے تحفظ کے مخلصانہ جذبے کے ساتھ ساتھ مذہبی طبقات کی سیاسی اور معاشرتی بقا (Political & Social Survival) سے نفاذِ اسلام کا تصور نہ صرف عوام بلکہ خود مذہبی طبقات میں پروان چڑھا، وہ مثبت معنوں میں ایک پاکیزہ اور خدا کے مقرر کردہ حدود کے پابند معاشرے کا تصور نہیں، بلکہ محض یہ تھا کہ بعض خلافِ اسلام عناصر کے خلاف امتناعی اور تعزیری اقدامات کتاب قانون میں شامل کر لیے جائیں۔'' (ماہنامہ اجتہاد، ص ۸)

عمار خان ناصر کا یہ کہنا کہ'' قادیانیوں کے خلاف امتناعی قوانین یا توہینِ رسالت کی سزا۔۔۔ان کے پس منظر میں زیادہ تر عوامی سطح پر پائے جانے والے چند خطرات، تحفظات، جذبات کارفرما تھے۔'' جناب عمار خان ناصر کی گفتگو میں تضاد ہے، معاشرتی بُرائیاں ،عریانی، بے حیائی بقول ان کے بعض صوفیاء کا مذموم کردار، دہشت گردی ،قتل و غارت اور بدامنی لاریب معاشرتی بُرائیاں ہیں مگر مضمون نگار نے قادیانیت اور توہین رسالت جیسے عقائد کے مسائل کو بھی ان میں شمار کر دیا ہے جبکہ قادیانیت اور توہین رسالت کا تعلق عقائد سے ہے، معاشرتی بُرائیوں سے اسے کیا واسطہ ہے؟

جناب عمار ناصر! یہ عوامی سطح کے جذبات نہ تھے یہ تو پوری امت کا مسئلہ تھا۔ دین وعقیدہ اور ایمان کا مسئلہ تھا، عوام اور عوامی سطح کے جذبات نہیں ایمانیات اور خواص یعنی علماء، زعماء دین و سیاسی رہنما سب کا یہی ایمان تھا اور سب کے ایمانی جذبات تھے جس نے پارلیمنٹ میں قادیانیوں کو متفقہ طور پر غیر مسلم قرار دیا اور توہین رسالت کی سزا کو قانونی تحفظ دے دیا۔ پھر توہین رسالت کی سزا بھی عوامی سطح کے ''چند خطرات، تحفظات'' جذبات نہیں ہیں بلکہ دنیا بھر کے مسلم اور غیر مسلم سب اس کے قائل ہیں۔ ختم نبوت اور تحفظ ناموسِ رسالت کے قوانین کو آپ جن خطرات اور تحفظات کے پس منظر میں غیر ضروری قرار دے رہے ہیں کیا آپ بتاسکیں گے کہ وہ خطرات اور تحفظات کیا تھے؟ دنیا بھر کے ملکوں کا یہ قانون ہے، اور دنیا بھر میں توہین رسالت کی سزا کا قانون مروج ہے۔ پاکستان میں

۱۹۷۳ء کے آئین کی شق نمبر ۱۹ کو پوری قومی اسمبلی نے متفقہ طور پر منظور کیا۔ دیگر ممالک میں بھی یہ قانون موجود ہے۔ مصر، عرب، ترکی، سری لنکا، برما، برطانیہ، امریکہ، ڈنمارک، فرانس، اٹلی، سویڈن، نیپال میں توہین رسالت کی سزا کا قانون نافذ العمل ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ماہنامہ القاسم مئی ۲۰۱۱ء)

خود کو ''امتی نبی'' کہلوانے والے غلام احمد قادیانی اور ان کے متبعین کی تکفیر، اور اسے مسلمانوں سے الگ گروہ قرار دیے جانے کی آئینی جدوجد کے پس منظر میں تحریک ختم نبوت کے تاریخ ساز کردار کو بے وزن اور بے معنی قرار دیے جانے کی مذموم حرکات، الفاظ کی بازی گری کا مذموم کھیل، نظری مباحث، ادب و تحقیق اور تجزیہ و تبصرہ کے ذوق کی تکمیل میں ناموس رسالت کی توہین اور شرعی قوانین سے استہزاء اور مذاق ایک بدترین اور مذموم کھیل ہے۔ یہ بات بہرحال میری سمجھ میں آنے کی نہیں کہ یہ کھیل دانستہ کھیلا جارہا ہو اور اگر ایسی نازیبا فکری اور قلمی حرکتیں نادانستہ بھی سرزد ہو رہی ہوں تب بھی میں یہی عرض کروں گا کہ:

یہ کھیل کہاں سے کھیلا جارہا ہے؟ کون کھیل رہا ہے؟ کس سے اور کن سے کھیلا جارہا ہے؟ کس نسبت کو استعمال کیا جارہا ہے؟ اور اس کی زد کہاں پڑتی ہے؟ کس کی بے وقعتی ہے؟ کن مسائل، احکام اور نظام کو اٹھا کر باہر پھینکنے کا اشارہ دیا جارہا ہے، کس کی روح کو بے چین کیا جارہا ہے؟ کہیں گنبد خضریٰ کے مکین کی روح کو تو بے قرار نہیں کیا جارہا؟

آزادیٔ تقریر و تحریر اور نظری مباحث چھیڑنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں قرار دیا جاسکتا کہ جب کوئی من چلا چاہے توہینِ رسالت کے قانون سے کھیلنے لگے، قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیے جانے والی آئینی جدوجہد اور شرعی احکام کے قانونی تحفظ کو بے جوڑ اور غیر مؤثر قرار دینے کی مذموم مساعی میں لگ جائے۔ حدود و قصاص اور اسلامی سزاؤں کے قانونی تحفظ کی بے وقعتی کرے، علماء و اکابر کی عظیم الشان قربانیوں اور متحدہ تاریخی کاوشوں کو قلمی یلغار کے ذریعہ بلڈوز اور ڈائنامیٹ کرنے کی جسارت کرے اور نفاذِ قانون سے پہلے تزکیۂ نفس کی فکری و نظری بحث چھیڑ کر اکابر کی قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے، تحفظ ناموسِ رسالت ﷺ کے لیے قانونی تحفظات حاصل کرنے اور شرعی احکام کے نفاذ کے لیے آئینی جدوجہد کی تمام تر پارلیمانی / آئینی اور قانونی مساعی کو بے سود قرار دے، جس کو عمار خان ناصر مذہبی طبقات کی سیاسی اور معاشرتی بقاء (Political & Social

Survival) کی کارفرمائی اور اسے محدود اور ایک رُخے اندازِ فکر (Approach) کا نام دے رہے ہیں۔ امت اسے عین ایمان، عین دین اور پوری امت کا متفقہ مسئلہ قرار دیتی ہے۔

عمار خان ناصر! نفاذِ شریعت کے لیے نظام شریعت کو آئینی اور قانونی تحفظ دے کر افغانستان کے طالبان کی طرح مخلص اور مومن قیادت کو اقتدار سونپنا ہوگا۔ جہادی کردار کے ذریعہ منافق قیادت کا قلع قمع کرنا ہوگا اور پندرہویں صدی میں بھی عدیم الوسائل طالبان کی طرح یورپی عالمی برادری کی شدید مزاحمت و مقابلہ کے باوجود اسلامی نظریۂ حیات اور نظام امن و عدل کو نافذ کر کے اس گئے گزرے دور میں بھی نظامِ خلافت راشدہ کی جھلکیاں دکھانا ہوں گی۔

ہماری سرگرمیاں

☆ 'مغربی تہذیب کا تنقیدی جائزہ۔اسلامی تناظر میں' کے موضوع پر جناب احمد جاوید صاحب کا دوسرا ماہانہ لیکچر ۹ جون ۲۰۱۱ء بروز جمعرات صفاء انسٹی ٹیوٹ میں ہوا۔

☆ کراچی یونیورسٹی سے جناب خالد جامعی صاحب (ناظم شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ و ایڈیٹر ماہنامہ 'ساحل' و 'جریدہ') اور پروفیسر ڈاکٹر عبدالوہاب سوری (شعبۂ فلسفہ) کے ساتھ ایک فکری نشست ۱۱ جون ۲۰۱۱ء بروز ہفتہ 'مسلم معاشرہ اور مغربی تہذیب کا چیلنج' کے موضوع پر صفاء انسٹی ٹیوٹ میں ہوئی۔

☆ صفاء انسٹی ٹیوٹ میں قرآنی عربی کلاسوں کا آغاز ۲۷ جون ۲۰۱۱ء سے ہو رہا ہے۔

☆ جناب ناصر مجتبیٰ صاحب ۱۹ جون ۲۰۱۱ء کو اسلام آباد سے صفاء انسٹی ٹیوٹ میں تشریف لائے اور انہوں نے اپنے مجوزہ اسلامی سکول کے بارے میں مشاورت کی۔ جناب پروفیسر ارشد جاوید صاحب ۲۲ جون ۲۰۱۱ء کو ادارے میں تشریف لائے اور اپنے مجوزہ Success School System کے بارے میں مشاورت کی جو کلاس روم میں نفسیاتی تکنیکس پر زور دیتا ہے۔

☆ صفاء انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام اسلامی تربیت پر تین روزہ تعلیمی کانفرنس جولائی کے تیسرے ہفتے میں ان شاء اللہ لاہور میں منعقد ہوگی جس میں ملک بھر کے اسلامی سکولوں کو شرکت کی دعوت دی جا رہی ہے۔

☆ ملی مجلس شرعی کا ایک اجلاس ۱۳ جون ۲۰۱۱ء کو مرکز القادسیہ چوبرجی میں ہوا جس میں سارے مکاتب فکر کے علماء کرام نے شرکت کی۔ مجلس کی ذیلی کمیٹی برائے اتحاد امت کانفرنس کا اجلاس ۲۱ جون کو مولانا مفتی محمد خان قادری صاحب کی جامعہ اسلامیہ لاہور میں ہوا جس میں اتحاد امت کانفرنس ۲۴ ستمبر ۲۰۱۱ء کو لاہور میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

تزکیۂ نفس احمد جاوید

فکرآخرت (۲)

س: آخرت پر پورے یقین کے باوجود موت کا خوف ایک حقیقت ہے اس کے بارے میں کیا کہا جائے گا؟

ج: دین دار آدمی میں موت کا خوف دراصل جوابدہی کا خوف ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اس ملک القہار کے آگے جواب دہی کا تصور اچھے اچھوں کا دل دہلانے کے لئے کافی ہے۔ اس میں کوئی ہرج نہیں بلکہ اس میں دینداری کی وہ قوت ہے جو زندگی کو اللہ کی مرضی کے مطابق گزارنے کا داعیہ پیدا کرتی ہے۔ احکام الٰہیہ کی اطاعت کا بڑا سبب ظاہر ہے، کہ موت کا خوف ہے نہ کہ موت کی رغبت یعنی بندگی کا جوہر دنیاوی زندگی میں مرنے اور مرنے کے بعد حساب کتاب کے ڈر کی بنیاد پر ظاہر ہوتا ہے اور تکمیل کو پہنچتا ہے۔ اس معنی میں موت کا خوف ایک روحانی قوت ہے جس کی بناء زندگی یا دنیا سے محبت پر نہیں بلکہ اللہ کی پکڑ کے اندیشے پر ہے۔

البتہ کسی دین دار آدمی میں اس کے ساتھ ساتھ موت کا نفسیاتی اور طبعی خوف بھی پایا جا سکتا ہے۔ بہت سے لوگ بیماری کی تکلیف سے ڈرتے ہیں، سکرات کی اذیت سے خوفزدہ ہوتے ہیں، قبر میں دبائے جانے کے تصور سے انہیں وحشت ہوتی ہے یا اپنے عزیزوں دوستوں کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ جانے کا قلق ان کے اندر موت کو ایک خوفناک یا غیر مرغوب چیز بنا دیتا ہے۔ ان تمام باتوں میں بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ اول تو یہ اختیاری نہیں اور دوسرے ان کی وجہ سے اس آدمی کی زندگی کے طور طریق پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔ دل کی کمزوری، طبیعت کی حد سے بڑھی ہوئی نرمی، مزاج کی نزاکت اور اعصابی کمزوری سے اس طرح کی حالت پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ یہ حالت جب تک شرعی اور اخلاقی ضرر تک نہیں پہنچاتی دینی اعتبار سے مذموم نہیں ہے۔

س: موت سے وحشت اگر فطری وطبعی ہے تو پھر دینی اعتبار سے خرابی کیوں ہے؟

ج: موت سے وحشت ایک غیر اختیاری احساس کے طور پر جب تک وہ نتائج نہیں پیدا کرتی جو عقیدے اور عمل صالح کے منافی ہوں، شریعت اس پر کوئی حکم نہیں لگاتی لیکن اگر یہ وحشت اپنی طبعی حد

سے تجاوز کر کے کسی محکم خیال یا ذہنیت اور کسی مسلسل عمل یا طرز زندگی میں ڈھل جائے تو شریعت کا حکم جاری ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک آدمی طبعاً ڈرپوک ہے تو وہ از روئے شریعت گناہگار نہیں ہے لیکن اس کی یہ حالت اگر جہاد سے رکاوٹ بن جائے یا حق بات کہنے سے روک دے یا کسی بھی زبردست کی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور کر دے تو اس صورت میں اس شخص کو دینی اعتبار سے ناقص، کمزور بلکہ بے دین تک کہا جا سکتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ طبعی داعیات ایک سطح تک کوئی اخلاقی معنی نہیں رکھتے۔ ان کی قانونی حیثیت وہی ہے جو مثلاً اوہام اور وساوس کی ہے۔ ہاں! جب یہ داعیات شعور اور ارادے میں اپنی قبولیت پیدا کر کے باقاعدہ ایک فکری اور عملی رویے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو پھر انہیں شرعی معیارات پر دیکھا جاتا ہے اور ان کے صحیح و غلط کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ دین کو موت سے ایسی وحشت ہی ناپسند ہے جو دینی فکر، دینی طبیعت اور دینی عمل کے بنیادی سانچے پر اثر انداز ہوتی ہو۔ اس طرح کی وحشت اپنے سبب میں بھی محض طبعی نہیں ہوتی بلکہ دنیا کی محبت اور عارضی زندگی کی کشش کا نتیجہ ہوتی ہے۔ کم از کم ہر آدمی اس بات کو بآسانی پہچان سکتا ہے کہ اس کے اندر پائی جانے والی موت سے وحشت کا سبب کیا ہے۔ اگر سبب یہ دوسرا ہے تو پھر طبیعت وغیرہ کا عذر جھوٹا اور ناقابل قبول ہے۔

س: دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگوں کو موت سے وحشت نہیں بلکہ اس کی طرف شدید رغبت ہوتی ہے۔ آپ ان لوگوں کا تجزیہ کس طرح کریں گے؟

ج: وحشت کی طرح رغبت کی بھی دو بنیادیں ہیں۔ دینی اور نفسیاتی۔ نفسیاتی اعتبار سے یہ ایک عارضہ ہے جو ناکامی، بے اطمینانی اور ڈیپریشن وغیرہ سے پیدا ہوتا ہے۔ البتہ دینی نقطۂ نظر سے موت کی طرف رغبت، بعض شرائط کے ساتھ، شخصیت کے ایک مثبت پہلو پر دلالت کرتی ہے۔ وہ مثبت پہلو اللہ کی محبت اور حصول جنت کی قوی امید ہے۔ بعض لوگوں کی دینی شخصیت اتنی مکمل اور حقیقی ہوتی ہے کہ اللہ سے ملاقات کا تصور ان کے لئے ہر چیز سے بڑھ کر محبوب اور مرغوب ہو جاتا ہے۔ شخصیت کا یہ رنگ دین کو مطلوب ہے لیکن بعض قیود کے ساتھ۔

س: وہ شرائط اور قیود کیا ہیں؟

ج: بہت سی ہیں، مثال کے طور پر:

۱۔ اللہ کی ہیبت اور خوف اس محبت سے خارج نہ ہو۔
۲۔ بندگی عمل کا بھی نام ہے اس لئے عملی پہلو کمزور نہیں ہونا چاہیے۔
۳۔ اللہ کی معبودیت کا رنگ انسانی محبوبیت سے بالکل پاک ہونا چاہیے۔ غلبۂ عشق عموماً اصلاح نفس کی فکر سے بے گانہ کر دیتا ہے۔ یہ بیگانگی نہیں ہونی چاہیے اور اپنی اصلاح کے لئے جو مجاہدہ، جیسی فکر اور جتنی شکستگی درکار ہے وہ اوروں کے مقابلے میں زیادہ پختگی اور کمال کے ساتھ موجود ہونی چاہیے۔ عاشقانہ بے تکلفی اللہ کی جناب میں گستاخی ہے۔ یہ نہیں ہونی چاہیے۔
۴۔ اللہ محض جمال نہیں ہے صاحب قہر و جلال بھی ہے۔ یہ تصور بھی پورے تیقن اور شدت کے ساتھ موجود ہونا چاہیے۔
۵۔ اتباع سنت کے معروف اور عمومی مفہوم سے منفرد اور متجاوز نہیں ہونا چاہیے۔
۶۔ احوال، تصورات اور اعمال صحابہ کے نمونے پر ہونے چاہئیں۔

مختصر یہ کہ اللہ سے ملاقات کا شوق اس کے وصل وغیرہ کی خواہش کا نام نہیں ہے یہ تو ایک عاجز اور مخلص بندے کی سب سے گہری تمنا ہے جو وہ خوف و رجاء کے مثالی توازن کے ساتھ اپنے اندر ہمیشہ موجود رکھتا ہے۔

احساس ذمہ داری

س: احساس ذمہ داری سے آپ کی کیا مراد ہے؟
ج: عمل کا نتیجہ یقینی ہو تو آدمی اس عمل کو جس انداز سے سرانجام دیتا ہے اس انداز کو احساس ذمہ داری کہتے ہیں یعنی مومن کے لئے یہ دنیا دارالعمل ہے، زندگی پوری کی پوری ایک سلسلۂ اعمال ہے جس کے نتائج آخرت میں نکلیں گے، یہ یقین دنیاوی زندگی میں جس چیز کو ہمیشہ زندہ رکھتا ہے وہ ہے احساس ذمہ داری۔ بندہ دنیا میں رہتے ہوئے اللہ سے تعلق میں مطلوب بہت سے احساسات کو وقتاً فوقتاً معطل رکھ سکتا ہے لیکن اپنی ذمہ داری کے احساس کو زندگی کے کسی مرحلے پر بھی فراموش نہیں کر سکتا۔ دنیاوی زندگی کا سب سے بڑا تقاضا اور اس زندگی میں آخرت کو ماننے کا سب سے بڑا داخلی ثبوت یہی احساس ذمہ داری ہے۔ بندگی کی پوری عمارت دنیا میں اسی بنیاد پر قائم ہے۔

س: کیا احساس ذمہ داری کا تعلق صرف عمل سے ہے؟
ج: جی نہیں! اس کا تعلق دین کے تمام تقاضوں کی تکمیل سے ہے خواہ وہ عقیدے کی صورت میں ہو یا عمل کی، اخلاق کی صورت میں ہو یا خیالات کی۔ دینی ذمے دارے رکھنے والا ایک سنجیدہ شخص اس فکر سے کبھی آزاد نہیں ہوسکتا کہ اس کی بندگی کا ہر پہلو مطابق دین، صحیح اور مکمل ہونا چاہیے۔ ہمارے اندر اصلاح اور ترقی کا ہر عمل اسی کی مسلسل فکر سے پیدا ہوتا ہے۔

س: احساس ذمہ داری کے مظاہر کیا ہیں؟
ج: تعمیل احکام، اپنی دینی اصلاح کی مکمل کوشش اور اتباع سنت۔

س: اس کے حصول کا طریقہ کیا ہے؟
ج: احساس ذمہ داری کی پیدائش کے دو اسباب فطری ہیں: سزا کا خوف اور حمیت۔ خوفِ سزا کا محرک ہونا واضح ہے لہٰذا اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ حمیت کے معاملے کو تھوڑا سا سمجھ لینا چاہیے۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لانا مکمل طور پر ایک اختیاری چیز ہے۔ ہم مسلمان ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ اپنے اختیار کے ساتھ مسلمان ہیں مجبوراً نہیں۔ گویا دوسرے لفظوں میں ہم نے اپنے لئے اسلام کو پسند کر کے اللہ سے مسلمان بننے اور رہنے کا وعدہ کیا ہے۔ اس وعدے کو توڑنا طبعاً خلاف حمیت ہے اسی لئے احساس ذمہ داری تسلسل کے ساتھ اس وقت تک برقرار نہیں رہ سکتا جب تک اس کے پیچھے جذبۂ حمیت کام نہ کر رہا ہے۔

س: کیا احساس ذمہ داری کی یہی دو بنیادیں ہیں؟
ج: جی نہیں! ہم نے یہ دو ایسے اسباب بیان کئے تھے جو تمام انسانوں میں مشترک اور فطری ہیں۔ اس درجے کی اور بھی کچھ چیزیں ہیں جنہیں بیان ہونا چاہیے لیکن اس سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ کوئی ذمے داری لے کر اس کو نبھانے کا مستقل احساس اور خیال اپنی بناوٹ میں نفسیاتی بھی ہے اور طبعی بھی۔ اخلاقی بھی ہے اور دینی و روحانی بھی۔ جب ہم کسی چیز کو فطری کہتے ہیں تو اس کا پہلا اور ابتدائی مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ چیز ایک نفسیاتی اور طبعی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ عام بات ہے۔ دوسرے درجے میں فطری کا لفظ ایک خصوصیت اختیار کرتا ہے یہاں اس کے اندر اخلاق کے معنی پیدا ہو جاتے

ہیں یعنی جس آدمی میں اخلاقی شعور اور حس ہوگی اس کے لئے یہ چیز فطری ہے۔ تیسرے درجے میں فطری کا مطلب روحانی یا دینی ہے۔ یہاں یہ اپنی حیثیت کو بالکل خاص کر لیتا ہے اور صرف ان لوگوں کے لئے مخصوص ہو جاتا ہے جن کے اندر روحانی احساس اور دینی شعور و جذبہ بنیادی قوت کی حیثیت رکھتا ہے۔ آسان لفظوں میں یوں سمجھیں کہ یہاں فطری کا تعین شخصیت کے اعتبار سے ہوگا۔ شخصیت میں ایک عموم ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک سطح پر ہر انسان شخصیت کا حامل ہے وہ سطح نفسیات اور طبیعت کی ہے۔ دوسری سطح پر انسانوں کی اکثریت ایک شخصیت کی مالک ہے۔ یہ اخلاقی شخصیت ہے۔ اور اپنے انتہائی درجے میں اخلاقی شخصیت رکھنے والوں کی اکثریت ایک خاص شخصیت رکھتی ہے۔ اسے ہم نے روحانی یا دینی کا نام دیا ہے۔

جب کوئی ایسا وصف مطلوب ہو جو شخصیت کی تمام سطحوں کے لئے ضروری ہو تو اس کی پیدائش کے اسباب تمام درجات شخصیت کی مناسبت سے تلاش کرنے چاہئیں۔ اس میں قابل عمل اصول یہ ہے کہ اس کی پیدائش کا عمل شخصیت کے عام درجے سے شروع ہو اور پھر خاص سے خاص الخاص حصے تک پھیل جائے۔ اس اصول کے پیش نظر ہم نے شخصیت کے عمومی حصے میں احساس ذمہ داری کی دو بنیادیں یا دو اسباب و محرکات عرض کئے تھے۔ اس سے اوپر اٹھ کر یعنی اخلاقی شخصیت کی سطح پر ظاہر ہے کہ اسباب و محرکات بدل جائیں گے۔ یہاں سزا کا خوف برقرار رہے گا بلکہ یہ خوف آخر تک برقرار رہے گا لیکن اس کی معنویت بدل جائے گی۔ اس سطح کا اصل محرک تصور خیر ہے۔ اخلاقی شخصیت رکھنے والا بندہ خیر اساس ہوتا ہے۔ اس کے تمام فیصلے، اعمال اور تصورات خیر ہی کے گرد گھومتے ہیں۔ اس کی طلب خیر کو بڑھا دیا جائے تو اس کے اندر خیر کے ساتھ وابستگی کے تمام تقاضے پورے کرنے کی وہ قوت اور استعداد پیدا ہو جاتی ہے جسے احساس ذمہ داری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ گویا اب تیسرا سبب یا محرک ہوا طلب خیر کا داعیہ۔

دینی شخصیت کے لئے اس احساس کی پیدائش، ترقی اور تکمیل کے سب سے بڑے اسباب و محرکات خشیت و محبت ہیں یعنی اللہ کا خوف اور اللہ کی محبت۔ ان دونوں کے ملنے سے وہ کمال وفا داری ہاتھ آتا ہے جو اصل بندگی ہے اور دین کے تمام مطالبات کی روح ہے۔ یہ نہ ہو تو نہ ایمان کوئی چیز ہے اور نہ اخلاق و اطاعت۔ گویا دین ہی بے معنی ہے اگر دین کو ماننے والا ہر حال میں اپنے معبود

کا وفادار نہیں۔ اس انتہائی بنیادی ضرورت کی تکمیل کا انحصار اسی احساس ذمہ داری پر ہے لہٰذا اسے محض نفسیاتی یا اخلاقی معنی میں نہیں لینا چاہئے بلکہ اس کو بندگی کی شرط لازم اور دین سے وابستگی کی سب سے بڑی صورتوں میں سے ایک سمجھنا چاہئے اور اس میں کمی کے ازالے کی کوشش اس کی یہ اہمیت ملحوظ رکھ کر کرنی چاہئے۔

مختصر یہ کہ دین ایک عملی شخصیت کا مطالبہ کرتا ہے جس کے بغیر آدمی کا یہ دعویٰ نا قابل قبول ہے کہ وہ دین کے ساتھ سچی نسبت رکھتا ہے۔ اس شخصیت کا جوہر احساس ذمہ داری ہے جو اس کی نیت کو خالص اور عمل کو صحیح اور مستقیم رکھتا ہے۔ یہی دین کی مطلوبہ عملی شخصیت ہے کہ بندہ نیت میں خالص اور عمل میں صحیح و مستقیم ہو۔

کس قیامت کے یہ نامے

☆ جناب ایڈیٹر صاحب! آپ عجیب سادہ لوح آدمی ہیں کہ مختلف دینی مکاتب فکر کے درمیان اتحاد پیدا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ارے صاحب! یہ مکاتب فکر نہیں، یہ فرقے ہیں فرقے اور فرقے بنانا حکم قرآنی کی صریح خلاف ورزی ہے۔ یہ شرک اور حرام ہے۔ آپ کس خوش فہمی میں مبتلا ہیں اور کس کار بے خیر میں لگے ہوئے ہیں۔

آفتاب عروج، چنیوٹ

☆ محترم ایڈیٹر صاحب! ما شاء اللہ آپ نے اپنے رسالے کی پیشانی پر قرآنی آیت لکھ کر اس کا مقصد اصلاح قرار دیا ہے ـــ تعلیم کی اصلاح، میڈیا کی اصلاح، فرد کی اصلاح، معاشرے کی اصلاح۔۔۔ اور آپ کو اتنا نہیں معلوم کہ فرد اور معاشرے کی اصلاح کا سب سے بڑا ذریعہ جہاد ہے لیکن آپ کو اس موضوع پر کبھی ایک حرف لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہدایت دے۔

خادم المجاہدین، پشاور

☆ آپ کی ڈبل پی ایچ ڈی سے توقع تھی کہ آپ کا پرچہ علمی اور تحقیقی ہوگا لیکن البرہان دیکھ کر مایوسی ہوتی ہے۔ نہ حوالے، نہ مراجع، نہ فہرست کتابیات، نہ ٹھوس علمی مضامین۔ اخباری قسم کے مضامین ہوتے ہیں اور وہ بھی زیادہ تر مدیر صاحب کے اپنے۔ کیا اس ملک میں اہل علم وتحقیق کا کال پڑ گیا ہے یا کوئی آپ کو گھاس نہیں ڈالتا؟

۔۔۔۔ جامعہ پنجاب

☆ آپ کے البرہان کا جو شمارہ بھی دیکھو مغربی تہذیب کے خلاف ایک دو مضمون ضرور ہوتے ہیں۔ کیا مغربی تہذیب میں کوئی خوبی آپ کو نظر نہیں آتی؟ کیا یہ کفر ہے؟ یہ ہوتا ہے فکر کا یک رُخا پن جبکہ حقیقی سکالر ہمیشہ غیر جانبدار اور معروضیت کے علمبردار ہوتے ہیں نہ کہ ہمیشہ کسی ایک نظریے کو رگیدنے والے۔

شمس الحق، راولپنڈی

تالیفات ڈاکٹر محمد امین

تعلیم وتربیت	صفحات	قیمت
۱۔ **ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل ۔ چند نظریاتی مباحث** (دوسرا ایڈیشن)	۵۴۴	۱۵۰ روپے
اسلامی تناظر میں تعلیمی نظام کی تشکیل نو۔ ماڈل اسلامی سکول، یونیورسٹی اور نظام تعلیم کا عملی خاکہ ثنویت کے خاتمے کا طریق کار، نفاذ اسلام اور مسلم نشأۃ ثانیہ میں تعلیم کا کردار، وغیرہ		
۲۔ **ہمارا دینی نظام تعلیم** ☆	۳۱۴	۳۵۰
دینی تعلیم کے چار وفاقوں کے ذمہ دار علماء سے طویل مشاورت اور مباحثے کے نتیجے میں دینی مدارس کے لیے اصلاحی تجاویز اور متبادل نصاب		
۳۔ **تعلیمی ادارے اور کردار سازی**	۱۵۳	۸۰
اس سوال کا جواب کہ جدید تعلیمی اداروں میں اسلامی نقطہ نظر سے بچے کی تربیت اور کردار سازی کیسے کی جا سکتی ہے؟		
۴۔ **جدید اسلامی نصاب تعلیم** ☆	۲۳۱	۲۶۰
پہلی سے بارھویں جماعت تک، سارے مضامین کے لیے، دینی اور عصری علوم کے امتزاج پر مبنی		
۵۔ **پاکستان میں تعلیم کی اسلامائزیشن** ☆	۴۲	۴۷
۶۔ **مطالعۂ قرآن وحدیث** (برائے جماعت اوّل تا پنجم)	۲۴۰	۱۹۰
ہر جماعت کے لیے الگ۔ مروجہ دینیات سے الگ اور زائد مطالعہ کے لیے		
۷۔ **بروشرز**		
۱۔ پرائیویٹ سکولوں کے نام ایک اہم پیغام	۱۲	
۲۔ طلبہ کی اسلامی تربیت ۔ کیوں اور کیسے؟	۱۶	
۳۔ انگلش میڈیم ۔ فائدے اور نقصانات	۱۲	۵۰
۴۔ دینی مدارس کے نام ۔ ایک اہم پیغام	۱۲	
۵۔ والدین کے نام ایک اہم پیغام	زیر طبع	
۶۔ نوجوانوں کے نام ایک اہم پیغام	زیر طبع	

تربیت وتزکیہ

۱۔ **اسلام اور تزکیۂ نفس۔مغربی نفسیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ** تعمیر سیرت کا اسلامی منہج قرآن وسنت کی روشنی میں۔مسلم ادارے اور تجربات۔مغربی فکر وعمل سے ان کا موازنہ۔ایک علمی، فکری اور تحقیقی تجزیہ	۹۰۴	۶۰۰
۲۔ **ترکِ رذائل** بُرے اخلاق، ان کے اسباب، نقصانات اور ان سے بچنے کے عملی طریقے	۲۹۲	۱۹۰
۳۔ **حقیقتِ تزکیۂ نفس** (سوالاً جواباً) ☆ مختصر، سادہ، عام فہم اور غیر اختلافی انداز میں اہم مسئلے کی وضاحت	۵۵	۵۲
۴۔ **حقیقتِ تصوف**	۸	۵

قرآن وسنت

۱۔ **سورہ یٰسین** دو رنگوں میں، بیک وقت تین تراجم (لفظی، بامحاورہ اور تفسیری) مع قرآنی عربی الفاظ کے اردو استعمالات کی نشاندہی کے	زیر طبع	
۲۔ **Riyadh-us-Saliheen (2 Vols)** حدیث اور تزکیۂ نفس کی معروف کتاب ریاض الصالحین اور اس کے حواشی کا انگریزی ترجمہ	۱۴۵۴	۱,۰۰۰
۳۔ **Noble Quran, Part 1** ☆ قرآن حکیم کے پہلے پارے کا انگریزی میں لفظی ولغوی ترجمہ	۷۰	۶۰
۴۔ **Noble Quran, Part 2-9** ☆ پارہ ۲ تا ۹ کا انگریزی میں لفظی ولغوی ترجمہ	۸۳۸	۹۳۸

فقہ وقانون

۱۔ عصر حاضر اور اسلام کا نظامِ قانون ☆	۲۷۳	۳۰۰
۲۔ **Islamization of Laws in Pakistan** پاکستان میں مروجہ قوانین کو اسلامی ڈھانچے میں ڈھالنے کی جدوجہد کا علمی تجزیہ، ضیاء الحق دور کا خصوصی مطالعہ	۲۵۸	۲۰۰
۳۔ السلطة التشريعية۔دراسة مقارنة **(عربی)** ☆ اسلام میں اجتہاد اور مغرب میں قانون سازی کے عمل کا تقابلی مطالعہ	۱۲۹	۱۹۵

مسلم امہ

۱۔ **مسلم نشأۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل**	۴۰۷	۲۵۰
اس اہم سوال کا جواب کہ مسلمان کس طرح زوال کے موجودہ گرداب سے نکل سکتے ہیں اور کس طرح دوبارہ غلبہ وعروج سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔ مکمل لائحہ عمل		
۲۔ **اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش۔ ایک تجزیہ، ایک مطالعہ** (دوسرا ایڈیشن)	زیرِ طبع	
۳۔ **جہاد اور دہشت گردی۔ عصری تطبیقات**	۱۳۰	۱۰۰
۴۔ **مسلمانوں کی ترقی کا واحد راستہ**	۱۲	۸

سیاسیاتِ اسلام

۱۔ **اسلام اور پاکستان** ☆	۱۲۷	۱۵۵
پاکستان میں نفاذ اسلام کا صحیح طریق کار		
۲۔ **اسلامی انقلاب۔ مفہوم، تقاضے اور حکمت عملی** ☆	۱۳۳	۱۴۰
۳۔ **سیاسی جماعتوں کی شرعی حیثیت** ☆	۴۵	۵۰
۴۔ **اسلام اور جدید سیاسی مسائل**	زیرِ طبع	

اسلام (متفرق)

۱۔ **رزم حق و باطل** ☆		
ان مسلم داعیوں اور حریت پسندوں کا تذکرہ جنہیں کج فہم مسلم حکمرانوں سے کشمکش کرنا پڑی	۱۱۸	۱۳۰
۲۔ **مقالاتِ امین (دو جلدیں)** ☆	۱۲۵۸	۱۳۵۰
ان مضامین و مقالات کا مجموعہ جو مختلف اوقات میں جرائد واخبارات میں چھپتے رہے		
۳۔ **عصر حاضر میں تعبیر دین**	زیرِ طبع	
۴۔ **ایک نئی دینی تحریک کی ضرورت**	زیرِ طبع	

☆ فوٹو کاپی مہیا کی جا سکتی ہے۔

۔ خرید کتب کے لیے تحریک اصلاح تعلیم کے دفتر سے رابطہ کیجیے، فون نمبر 0300-4609522

۔ مندرجہ بالا قیمتوں میں ڈسکاؤنٹ شامل ہے ڈاک خرچ شامل نہیں جو موجودہ قیمت کا ۱۵% ہوگا۔

طریق ادائی: منی آرڈر یا پے آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ، A-71 فیصل ٹاؤن، لاہور۔

آخر ایسا کیوں نہیں ہوسکتا؟

آخر ایسا کیوں نہیں ہوسکتا کہ ہم دنیا بھر میں پھیلے ہوئے پونے دو ارب مسلمان ایک امت بن کر سوچیں اور امت کی سطح پر سوچیں؟ ہمارا مسئلہ واضح ہے، دو اور دو چار کی طرح کہ ہم اپنے نظریے کے ساتھ اور اس کے مطابق جینا چاہتے ہیں، دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی کے لیے۔ اور مغربی تہذیب و عالم کفر ہمیں دبائے رکھنا چاہتا ہے، اپنے راستے پہ چلانا چاہتا ہے تاکہ ہم ان کی غلامی پہ قانع رہیں، تاکہ ہمیں دنیا میں سربلندی ملے نہ آخرت میں کامیابی۔

اس چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کے لیے امت کے مختلف لوگ، مختلف طبقے کئی طرح سے جدوجہد کررہے ہیں؛ کچھ تعلیم وتربیت کے شعبے میں، کچھ دعوت کے میدان میں، کچھ پُر امن سیاسی جدوجہد کے ذریعے اور کچھ میدان جنگ میں کفر کی مزاحمت کرتے ہوئے۔ اور حالت یہ ہے کہ یہ چاروں گروہ ایک دوسرے کا گریباں پکڑے ہوئے ہیں۔ ایک کہتا ہے تم غلط ہو، دوسرا کہتا ہے تم گمراہ ہو۔ حالانکہ چاروں کا مقصد ایک ہے، ان کی منزل ایک ہے، وہ منزل کی طرف رواں دواں ہیں، صرف منزل تک پہنچنے کے راستے مختلف ہیں۔

آخر ہم اپنے اپنے مکتب فکر، دائرہ کار اور نقطۂ نظر سے اوپر اٹھ کر کیوں نہیں سوچتے؟ ہم ایک امت بن کر کیوں نہیں سوچتے؟ ایک امت کی طرح کیوں نہیں سوچتے؟ ایک دوسرے کو ہمدردی، محبت، توجہ اور اخلاص کی نظر سے کیوں نہیں دیکھتے کہ بالآخر ہم ایک ہیں، ہماری منزل ایک ہے، ہمارا مقصد حیات ایک ہے، اور ہمارا دشمن بھی ایک ہے (الکفر ملۃ واحدہ) جو نہیں چاہتا کہ ہم ایک ہوں، ایک رہیں اور اپنی منزل کی طرف گامزن رہیں۔

امت یہود کے، مٹھی بھر لوگوں نے، مل بیٹھ کر سوچا، پروٹوکولز بنائے، ان کے مطابق جدوجہد کی اور کامیاب ہوئے، ہمارے دیکھتے، حالانکہ وہ مٹھی بھر تھے اور ہم تو کروڑوں اربوں ہیں۔ آخر ایسا کیوں نہیں ہوسکتا کہ تعلیم و تدریس والے، دعوت والے، پُر امن سیاسی جدوجہد کرنے والے اور کفر کے خلاف مسلح مزاحمت کرنے والے سب ایک جگہ مل بیٹھیں، اپنے اپنے طریقے پر رہتے ہوئے ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو ہمدردی سے سنیں، اختلاف رائے کو برداشت کریں، ایک دوسرے کے اخلاص کی قدر کریں، باہم مشاورت کریں اور ایک دوسرے کی خیر خواہی کریں کہ بالآخر منزل تو سب کی ایک ہے۔ اس اتحاد میں مانع کیا ہے؟ آخر ایسا کیوں نہیں ہوسکتا؟

احمد جاوید☆

تعلیم کے روحانی اور تربیتی اہداف

میرے لیے یہ واقعتاً اعزاز کی بات ہے کہ انسانی معاشرے میں جس طبقے کو سب سے زیادہ اہمیت اور مرتبت حاصل ہے یا ہونی چاہیے، اس کے چند بہترین نمائندوں کے سامنے مجھے اپنی چند معروضات پیش کرنے کا موقع مل رہا ہے، میں اس کے لیے منتظمین کا بہت ممنون ہوں۔

جوعنوان مجھے تفویض کیا گیا ہے اس کے حوالے سے کچھ ابتدائی باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ ہمارا جو نظریۂ علم ہے، ہمارا تصورِ تعلیم ہے (ہمارا سے مراد مسلم سوسائٹی کا) وہ اپنے دین سے اخذ کیا گیا ہے۔ ہمارے اس تصورِ تعلیم کا کوئی بھی مقصد پورا نہیں ہوسکتا، اس کا کوئی بھی سرا اُس وقت تک پکڑا نہیں جاسکتا جب تک ہم اُس کے اِس مطالبے کو تسلیم نہ کرلیں کہ تعلیم کا مقصد انسان کی روحانی ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ روحانی ضرورت سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنی روحانی سطح پر ایک تعلیمی سیلف ہوتا ہے یعنی جو ہماری روحانی شخصیت ہے وہ ہمارے اُس ایمان سے تشکیل پاتی ہے، اُن عقائد سے اس کی تعمیر ہوتی ہے جن عقائد کے بارے میں ہمارا دعویٰ اور یقین یہ ہے کہ ان سے ہم پوری زندگی کو Define کرسکتے ہیں۔ زندگی اپنی بنیادی اور اخروی تمام تفصیلات میں ہمارے ایمانیات سے Define ہوسکتی ہے۔ یہ روحانی شخصیت ہے، یہ ہمارا روحانی وجود ہے جو تعلیم کا سب سے پہلا مقصد ہے۔ یہ مقصد ایسا ہے کہ جس کے مقابلے میں دیگر تمام مقاصدِ علم ضمنی اور ذیلی مقاصد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سب سے بڑا مقصد تعلیم کا یہ ہے کہ ہم اپنی روحانی زندگی کی فلاح کا ہر ممکن سامان فراہم کریں کیونکہ ان ضرورتوں کی تکمیل ہی سے ہمارے دنیاوی مفادات وابستہ ہیں مثلاً ہمیں دنیا میں اس لیے نہیں بھیجا گیا کہ ہم یہاں پر دستیاب تمام مفادات کو حاصل کرنے کی بلا روک ٹوک کوشش کریں۔ دنیا مفادات کا گڑھ ہے، نقصانات کی جگہ ہے۔ ان مفادات میں سے وہی مفادات میرے لیے اور آپ کے لیے قابل قبول ہونے چاہئیں جو میرے روحانی مفادات سے متصادم نہ ہوں۔ یہاں مجھے اُن ہی نقصانات سے بچنا ہے، جو میرے لیے روحانی نقصانات کا سبب ہوں۔ تو یہ نقطہ یاد نہ رکھنے سے کوئی سوسائٹی یا کوئی قوم اس دنیاوی زندگی میں اپنے وجود کی روحانی اور نظریاتی بنیادوں کی حفاظت کرنے کے قابل نہیں رہتی۔

مطلب یہ کہ فرد اور قوم یہ فیصلہ کرلے اور اس فیصلہ پر قائم رہنے کی ضروری صلاحیت حاصل کرلے کہ اس کا مفاد وہی ہے جو اس کے لیے ترتیب دیا گیا ہے اور اس کا نقصان وہی ہے جس کو

☆ مربی، محقق، دانشور اور ادیب (اقبال اکیڈمی، لاہور)

نقصان کہہ کر ہمارے سامنے ہمارے دین کی طرف سے رکھا گیا ہے اور باقی ہر فائدہ، ظاہر میں نظر آنے والا فائدہ ہے، ہر نقصان محض دکھائی دینے والا نقصان ہے۔ اس تصور پر ہماری زندگی کی تمام قدریں استوار ہیں۔ اگر ہم اپنی زندگی کی تمام قدروں اور ایمانی مطالبات کو ایکچو لائز (Actualize) کرنے کا سامان نہیں کرتے تو ہم گویا اپنے قوی مؤقف پر قائم رہنے کی صلاحیت سے دستبرداری کا اظہار کرتے ہیں۔

موجودہ صورت حال میں یہ ممکن نہیں ہے کہ میرا روحانی وجود (Believing Self) اس زندگی کے دائرے میں رہتے ہوئے نشوونما پائے اور پھر میرا دنیاوی وجود، میری دنیاوی صلاحیتیں اس دنیا میں مفید نہ ہوں اور اس دنیا میں پیدا ہونے والی کسی بھی صورتِ حال کو اپنے لیے مفید بنانے پر قادر نہ ہوں۔

مقصدِ تعلیم

رسول اللہ ﷺ اپنے لیے معلم کا لفظ اور معلم کی ذمہ داری کو تمام ذمہ داریوں پر ترجیح دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا معلم ہونا، یعنی آپ ﷺ کے معلم ہونے کی سنت کو مسلم سوسائٹی نے سیکڑوں برس اپنی بساط کے مطابق کامیابی سے محفوظ، مضبوط اور متواتر رکھا ہے۔ یہ مسلک اور یہ توازن سرسید کے آنے کے بعد ختم ہوا۔ اس سے پہلے پوری عالم گیر سطح پر امت نے رسول اللہ ﷺ کی سنتِ تعلیم کو اپنی بساط بھر کچھ خلا، کچھ نقائص کے باوجود اُس کی بنیادی اسپرٹ کے ساتھ عمل میں محفوظ رکھ کے دکھایا۔ وہ سنتِ تعلیم کیا ہے؟ وہ سنتِ تعلیم یہ ہے کہ میرے کردار کی تمام تر بنیادیں روحانی اور ایمانی ہیں۔ یعنی رسول اللہ ﷺ نے معلم کی حیثیت سے اپنے شاگردوں میں کسی مستقل تربیت کا ایسا کوئی نظام نہیں بنایا کہ جو زیادہ ذہین ہے، جو زیادہ پڑھا لکھا ہے وہ زیادہ اہمیت رکھتا ہے بلکہ آپ ﷺ نے صرف یہ دیکھا کہ میری تعلیم کے روحانی، ایمانی اور نفسیاتی احساسات جس شخص میں زیادہ پورے ہوتے ہیں وہ میری لائی ہوئی تعلیم کے نظامِ مراتب میں اعلیٰ درجے پر فائز ہوتا ہے۔

تو سب سے پہلے یہ تصور درست کرنا چاہیے کہ تعلیم کا مقصد ذہن کی کسی خاص Functioning یا محض ذہانت کو فروغ دینا نہیں ہے۔ وہ آدمی نادان ہے جس کا ذہن اس کے کردار سے غیر متعلق رہ جائے۔ اس وقت جدید آدمی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے یا سب سے بڑے المیوں میں سے ایک المیہ یہ ہے کہ اُس نے ذہن کو پالش کرلیا لیکن ذہن کو وجود کے اور کردار کے جن دوسروں حصوں کی تکمیل میں صرف ہونا تھا ان سے لاتعلق کرلیا۔ اقبال نے

بہت اچھا کہا ؎

یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا؟
دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بے باک

بدقسمتی سے ہمارا موجودہ نظامِ تعلیم ایسا آدمی تیار کرتا ہے جس کی نگاہ روشن ہو، دماغ چالاک ہو لیکن دل تاریک ہو۔ افسوس کہ ہم اس عیب میں پھنس گئے ہیں اور ہم میں جو تھوڑی بہت تعلیمی استعداد یعنی سیکھنے سکھانے کی استعداد باقی رہ گئی ہے وہ اس مقصد کے لیے صرف ہورہی ہے۔ معاف کیجیے گا ہمارا تصورِ آدمی یہ نہیں ہے۔ ہمارا تصورِ آدمی یہ ہے کہ دل روشن ہونا چاہیے نگاہ چاہے کمزور ہو، دماغ چاہے سادہ اور بھولا ہو۔ ہماری سوسائٹی میں طبیعت کا بھولا، ذہن کا معصوم اور دل کا روشن آدمی بہت قیمتی آدمی ہے، چاہے وہ حرف شناس بھی نہ ہو۔ وہ ہمارے تمام مقاصد کی حفاظت کا زیادہ فعال اور مکمل ذریعہ ہے اُن لوگوں کے مقابلے میں، جن کے ذہن خوب روشن ہیں، جو خوب تحقیق و تفتیش کررہے ہیں، جو خوب ذہین ہیں اور جو تمام موضوعات پر بے تکان بول سکتے ہیں لیکن یہ لوگ ہمارے نمائندہ لوگ نہیں ہیں۔ ہماری نمائندگی کا نظام رسول اللہ ﷺ نے اس ذہن کی بنیاد پر بنایا ہی نہیں ہے۔ اور ویسے بھی یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ فرد اور وہ معاشرہ زندہ اور باقی نہیں رہ سکتا جس میں تمام ذہنی صلاحیتیں اس کے کردار کی ضروریات کے تابع نہ ہوں۔ یہ الٹی ترتیب ہے کہ میری بے لگام ذہانت، میرے کردار کو ایک بے لگام حدود میں آزاد چھوڑ کے تشکیل دے۔ یہ ہمارا تصور نہیں ہے۔

ہمارا نظریۂ علم

دوسری بات یہ کہ ہر نظامِ تعلیم کی تشکیل نظریۂ علم اور کسی ورلڈ ویو کے تابع ہوتی ہے۔ ورلڈ ویو ہی یہ طے کرتا ہے کہ ہم دنیا میں اپنے لیے کیا کردار تجویز کرتے ہیں اور اس دنیا میں اپنی نظریاتی نشوونما کے لیے اپنی شخصیت کو کس طرح تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ ان تمام سوالات یا ان تمام مقاصد کا حصول ایک مکمل نظامِ تعلیم کی موجودگی کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔

ہمارے ورلڈ ویو کی تمام تفصیلات منضبط، محفوظ اور معلوم ہیں۔ ایک عام مسلمان کو بھی یہ معلوم ہے کہ تاریخ میں سروائیو(Survive) کرنے کی کیا کیا ضرورتیں ہیں؟ اور اپنی بقاء کا کون کون سا سامان ہمیں کب رکھنا چاہیے؟ ان سب چیزوں سے مسلمان غافل نہیں ہے۔ جو لوگ مسلمانوں کے لیے بنیادی فکر لے کر آئے تھے، وہ بھی اس طرف سے معاذ اللہ بے خبر

نہیں تھے کہ دنیا میں کامیابی اور بقاء کے لیے ہنگامی ضرورتیں کیا ہوتی ہیں؟ لیکن ہمارے تصورِ دنیا اور ہمارے ورلڈ ویو کی جو سب سے پہلی بنیادوں میں سے ایک بنیاد ہے، وہ ہے دنیا کی محبت سے مکمل طور پر آزاد رہنا۔ وہ شخص رسول اللہ ﷺ کے دین سے مزاجی مناسبت نہیں رکھتا جو دنیا کی محبت کے صحرا میں ایک ذرے کے اندر بھی گرفتار ہے۔ دنیا کی محبت، مسلم سائیکی میں وہی ضرر رکھتی ہے جو مسلم عقائد میں شرک کا ہے۔ جتنا شرک سے بچنے کا اہتمام ضروری ہے اتنا ہی دنیا کی محبت سے پاک رہنے کی کاوش بھی ضروری ہے۔ افسوس کہ ہم اپنی زندگی کا پورا انداز بدل جانے کی وجہ سے، اپنے ذہن اور طبیعت کا پورا پیراڈائم بدل جانے کی وجہ سے اس مطالبے کی بنیادی اہمیت کی تفہیم سے محروم ہو چکے ہیں۔ مطلب یہ کہ ہماری نظر میں یا تو یہ مطالبہ ہے ہی نہیں، اور اگر ہے بھی تو ہم اپنے ذہن کی تمام قوتوں کے ساتھ اور اپنی شخصیت کے تمام میلانات کے ساتھ پوری کوشش کرتے ہیں کہ ہم اس بات کا استحضار نہ کریں۔ ہم اپنے دین کے اس انتہائی بنیادی مطالبے کو اپنی نظروں سے اوجھل رکھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ زندگی کو بے مزا کرنے والا یہ مطالبہ ہمارے سامنے نہ ہی آئے تو اچھا ہے۔

ہمارا موجودہ نظامِ تعلیم اس روحانی انتشار کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ یہ نظامِ تعلیم سوائے دنیادار طبقات پیدا کرنے کے اپنا کوئی ہدف نہیں رکھتا۔ اس کے لیے تعلیم کا مقصود اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس تعلیم سے اچھی نوکری حاصل ہوگی اور اُس تعلیم سے اُس سے بھی اچھی نوکری حاصل ہوگی۔ تو گویا نظامِ تعلیم آپ کو دنیا کا نوکر بنانے کی مشین بنا ہوا ہے۔ یہ طرزِ احساس اور طرزِ فکر معاشرے کو تعلیم کے اسلامی اور روحانی پہلوؤں کی طرف کیسے متوجہ کر سکتا ہے؟ جب کہ ان فکری پہلوؤں کی طرف توجہ دلانا، اور نہ صرف توجہ دلانا بلکہ ان پر قائم رہنے کی نفسیاتی اور روحانی استعداد پیدا کرنا، آپ جیسے معلمین اور ماہرین تعلیم کی بنیادی ذمہ داری ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کے اثرات

اس صورت حال کے اسباب کئی ایک ہیں۔ جس دنیا میں ہم رہتے ہیں اس کا سب سے بڑا فتنہ سرمایہ دارانہ نظام ہے، یعنی آج اگر نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طریقے پر دنیا میں نفاذِ حق کی کوئی بھی جدوجہد کی جائے گی تو وہ اپنا سب سے پہلا ہدف سرمایہ دارانہ نظام کو بنائے گی۔ اور اگر سرمایہ دارانہ نظام کو دینی فکر اپنا دشمن نہیں مانتی تو معاف کیجیے گا میری رائے میں وہ دینی فکر ہے ہی نہیں۔ مطلب یہ کہ سرمایہ دارانہ نظام آپ کو آپ کی تمام اقدار سے محروم

کرتا چلا جا رہا ہے۔ اس سے پہلے ہم نے اپنی تاریخ کے کسی بھی مرحلے میں یہ تجربہ نہیں کیا کہ کوئی ایسا قاتل نظام ہمارے اندر پھیلا دیا جائے جو زندگی کے ہر شعبے میں رسائی رکھتا ہو اور ایک کامیاب دسترس رکھتا ہو۔ یعنی انسانوں میں کوئی ایسا نظریہ اپنے عالمگیر پھیلاؤ کے ساتھ ظہورِ عمل میں نہیں آیا جیسا کہ سرمایہ دارانہ نظام کا نظریہ ظہور عمل میں آیا ہے۔ تو اس نظریے سے لڑنا میری اور آپ کی دینی ذمہ داریوں کی فہرست میں بہت اونچے درجے کی ذمہ داری ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام شرک ہے، یہ رسول اللہ ﷺ کے مزاج کے، آپ ﷺ کی تعلیم کردہ معاشرت کی بنیادی اقدار کے اور آپ ﷺ کی شخصیت سازی کے بنیادی اصولوں سے براہ راست متصادم ہے۔ اس نظام کا ادنیٰ پہلو یہ ہے کہ یہ دنیا کی محبت پر قائم ہے، یہ دنیا کی محبت کو اتنی کامیابی کے ساتھ استعمال کر رہا ہے کہ آج دنیا کا ہر آدمی چاہے وہ دنیاوی اعتبار سے کامیاب ہو یا ناکام، وہ مسلسل ایک ترسنے کے عمل میں مبتلا ہے۔ مطلب یہ کہ اس نظام نے دنیا کو آپ کے لیے اتنا پرکشش اور قابل حصول بنا دیا ہے کہ آپ ہر حال میں یعنی آپ اسے حاصل کر لیں تو بھی اُس کے لیے ترستے رہتے ہیں اور اگر آپ اسے حاصل نہ کر سکیں تو بھی اُس کے لیے ترستے رہتے ہیں۔

اس سرمایہ دارانہ نظام نے اب تعلیم کو چند منافع بخش کاروباروں میں سے ایک کاروبار بنا دیا ہے۔ یعنی پرائیویٹ سیکٹر میں تعلیم کے فروغ کے لیے کی جانے والی تمام تر کوششیں اصل میں کاروباری کوششیں ہیں اور ان کوششوں میں اساتذہ کا مثبت کردار نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔ دنیا میں کوئی بھی قوم، چاہے وہ کسی بھی نظریے کی حامل ہو، اس وقت تک کامیاب نہیں ہوئی جب تک اس قوم نے تعلیم میں مشنری جذبے کو تسلسل کے ساتھ استعمال نہیں کیا۔ اور ہماری تو حالت یہ ہے کہ استاد اگر مشنری جذبے اور زاہدانہ زندگی پر عامل نہ ہو تو اس کی دی ہوئی تعلیم ہمارے نظریۂ علم میں فِٹ ہی نہیں بیٹھتی لیکن سرمایہ دارانہ نظام میں زاہدانہ زندگی کو ایک خوفناک چیز بنا دیا گیا ہے۔ معاشرہ نہ صرف یہ کہ اس سے ڈرتا ہے بلکہ اس طرز زندگی سے واقعتاً بعض بڑے نقصانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ معاشرے کی موجودہ ساخت میں اسے اختیار ہی نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی اب مشنری جذبہ، زاہدانہ طرزِ زندگی کے ساتھ پروان چڑھانا ممکن ہی نہیں رہا۔ تو ان حالات میں یہ جو تعلیم کا کاروبار کرنے والے حضرات ہیں ان کی طرف سے ایسی کوششیں الا ما شاء اللہ ہی دیکھنے میں آتی ہیں کہ یہ اساتذہ کو اس بے رحم معاشرے میں قدم جمانے کے لیے جتنے معاشی تحفظات کی ضرورت ہے وہ فراہم کرتے ہوں۔ ایک مہذب

معاشرے میں معاشی اعتبار سے بھی سب سے اوپر اس کے طبقۂ معلمین کو ہونا چاہیے لیکن ہمارے یہاں یہ اتنی نایاب چیز ہے کہ اس کو سوچنا اور بیان کرنا بھی عجیب سا لگتا ہے۔

بنیادی اوصاف

اس وقت تک میں نے جو عرض کیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تعلیم مشنری جذبے کے بغیر طلبہ میں منتقل نہیں کی جاسکتی۔ دوسرے یہ کہ ہماری تعلیم ہمارے Believing Self کو ترقی اور استحکام دینے کے لیے ہے۔ تیسرے یہ کہ ہمارا ہر نظریۂ تعلیم ہمارے ورلڈ ویو کا نمائندہ، ترجمان اور ذریعہ ہونا چاہیے۔ ہماری سائیکی تو یہی ہے کہ ہم ایک ایسا آدمی پیدا کریں۔ سائیکی سے مراد ہے ہمارے کردار کے بنیادی اصول، ہماری ضروریات اور ہماری تربیت سازی کے عمل کے بنیادی مقاصد۔

میں عرض کروں کہ اسلام کا مطلوبہ انسان پیدا کرنا مسلمانوں میں مروج ہر نظامِ تعلیم کی بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ اسلام کا طلوب انسان دو اوصاف سے مرتب ہوتا ہے اگر یہ دو اوصاف کسی میں پائے جاتے ہیں تو وہ مسلم سوسائٹی کاایک مثالی فرد ہے، وہ مسلم سوسائٹی کو فنکشنل (Functunal) رکھنے کا ایک بہت مثالی ذریعہ ہے۔ وہ اوصاف ذوقِ عبادت اور حسن معاشرت ہیں جس شخص میں ذوقِ عبادت ہے یعنی اس کے لیے سب سے زیادہ مرغوب چیز اللہ کے آگے کھڑا ہونا ہے اور جس شخص میں حسن معاشرت ہے یعنی جس کی سب سے بڑی تگ ودو یہ ہے کہ مجھ سے میرے پڑوسی کو، میرے ساتھی کو فائدہ پہنچ جائے، یہ آدمی اسلام کا مطلوب آدمی ہے۔ اِس ذوقِ عبادت اور حسن معاشرت کو مسلم نفسیات میں راسخ اور داخل کرنے کے لیے آپ معلم حضرات کی ضرورت ہے۔ اگر آپ کی تمام تعلیمی سرگرمیاں ان دو مقاصد کو حاصل کرنے میں ہمارے کام نہیں آتیں تو ہمیں اس پورے نظام کو بغیر کسی تاخیر کے رد کر دینا چاہیے اور از سرِنو یہ سوچنا چاہیے کہ ہمارا تعلیمی ڈھانچہ کیسا ہو کہ ہم اپنے شاگردوں کو ان دو مقاصد سے ہم آہنگ کر سکیں۔

ذوقِ عبادت تو ایک زاہدانہ بات ہے جس کی تفصیلات میں جانا شاید اس وقت موزوں نہ ہو لیکن حسن معاشرت تو آپ حضرات کی تعلیمی ضرورت ہے اور اسی کے نہ ہونے سے مسلم سوسائٹی اس وقت سرنگوں ہے۔ مسلمانوں کے اس وقت اس دنیا میں جتنے بھی معاشرے ہیں وہ اسلامی ہونا تو دور کی بات ہے مروجہ معیار سے وہ انسانی بھی نہیں ہیں۔ اس کا کیا سبب ہے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ حسن معاشرت کے لیے درکار لوازم ہم اپنے اندر زندہ اور فراہم رکھنے سے قاصر ہیں۔

ہمارے تصورِ دین میں ایک جارحانہ پن پایا جاتا ہے، ہمارے دینی جذبات میں بھی جارحیت پائی جاتی ہے اور محبت کی بنیاد عنقا نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمیں ایسے لوگ بہت کم ملتے ہیں جن میں کشش ہو، جنہیں دیکھ کر یہ لگے کہ ان کے احساسات اور جذبات کا منبع محبت ہے۔

جس شخص نے اپنے دینی احساسات اور جذبات کو نفرت، غصے اور اس طرح کے جارحانہ رویوں پر استوار کرنے کی عادت ڈال لی ہوتو وہ آدمی رسول اللہﷺ کے دین کا نمائندہ کیسے ہوسکتا ہے؟ کیونکہ صحابہ کرامؓ تو گردن بھی مارتے تھے تو خیر خواہی کے جذبے سے، مطلب یہ کہ کفار کا مسلمانوں سے بڑھ کر خیر خواہ ہو ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا ہمیں اس جارحانہ طرزِ فکر کو اپنے اندر سے ختم کرنا ہوگا۔ رسول اللہﷺ نے اپنے اسوۂ مبارک میں حسن معاشرت بالکل آئیڈیل حالت میں عمل میں لاکر دکھا دی تھی اور آپﷺ کے تربیت یافتہ افراد نے اس سوسائٹی کو برسوں چلا کر دکھایا اور صدیوں تک اس کے چلنے کا سامان پیدا کر گئے۔ وہ سوسائٹی ایک ایسے فرد پر کھڑی تھی جس کے رویے میں دو چیزیں بہت بنیادی تھیں، ایک تواضع اور دوسرے ایثار۔ جس آدمی میں تواضع نہ ہو اور جس آدمی میں ایثار نہ ہو وہ حسن معاشرت کے قیام کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔

رسول اللہﷺ کے اسوۂ مبارک کو دیکھیے کہ آپ کے یہاں تواضع کی سطح کیا تھی؟ ہم کیا تواضع اختیار کریں گے، ہم تو اتنے نیچے پڑے ہوئے ہیں کہ اس سے نیچے کوئی جگہ ہی نہیں ہے، تو ہماری کیا تواضع؟ رسول اللہﷺ کی تواضع دیکھیے کہ جنت کی کوئی نعمت ایسی نہیں ہے جو رسولﷺ کے کُرتے پر لگے ہوئے ایک بٹن کے برابر بھی ہو۔ آپ دیکھیے کہ وہ کس طرح جنگ کرتے ہیں؟ وہ کس طرح ایثار کرتے ہیں؟ یہ دیکھیے کہ وہ لوگوں کی کس درجے کی بدتمیزیوں پر درگزر فرماتے ہیں؟ یہ دیکھیے کہ اپنی واقعی شان کا اظہار اپنے کسی جملے سے اُس وقت تک نہیں کرتے جب تک اس کا حکم نہ ہو۔ یعنی رسول اللہﷺ کی شان بتانے کے لیے اللہ تعالیٰ کو وحی بھیجنی پڑتی ہے۔ آپﷺ خود اپنی شان بتانے سے خائف تھے، یہ ہوتی ہے تواضع۔ اور یہ تواضع اسی میں ہوتی ہے جس میں ذوقِ عبادت ہوگا۔ ایثار کہتے ہیں اپنے بھائی کے لیے اپنے حق سے دستبرداری، خوش دلی کے ساتھ اور یہ ایثار بھی وہ بنیادی وصف ہے جو ہر مسلمان کی شخصیت کا لازمی جزو ہونا چاہیے یہ اخلاص کا لازمی تقاضا ہے۔ اس کا متضاد ہے خود غرضی اور ایک سچا مسلمان کبھی خود غرض نہیں ہوسکتا۔ اب اگر آپ کا طالب علم، آپ سے تربیت اور تعلیم پانے والا بچہ ان دو اوصاف کو پیدا کیے بغیر آپ کے ادارے سے پاس ہو کر نکل جاتا ہے تو یہ

بہت زیادہ فکر کی بات ہے، یہ بہت زیادہ ڈرنے کی بات ہے۔

معلم کا کردار

تعلیم کتابوں سے نہیں ہوتی، تعلیم نصاب سے نہیں ہوتی، تعلیم معلم سے ہوتی ہے۔ یہی معلم اپنے آپ کو ایک دینی ماڈل کے علاوہ ایک معاشرتی ماڈل کے طور پر بھی اپنے بچوں بچیوں کے سامنے رکھے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ بچے بچیوں میں یہ دو اوصاف جڑ نہ پکڑ لیں۔ بدقسمتی سے ہم جس معاشرے میں زندہ ہیں وہاں والدین کے تربیت دینے کا ذکر کم سے کم ہوتا جا رہا ہے اور والدین بچوں کی تربیت کو اپنی ذمہ داری ہی نہیں سمجھتے تو ایک ایسے معاشرے میں معلم کی ذمہ داری روایتی معاشروں سے کہیں زیادہ ہے۔ میں اپنے تجربے سے جانتا ہوں کہ میرے لیے (اور میرے ساتھ والوں کے لیے) سکول کے زمانے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ مجھے اپنے والد سے زیادہ محبت ہے یا اپنے اساتذہ سے، بلکہ میرے لیے آج بھی یہ مشکل ہے کہ میں نے سکول میں جن اساتذہ سے پڑھا تھا مجھے ان سے زیادہ محبت ہے یا اپنے والد سے۔اور بعض اساتذہ ایسے ہیں جن کے بارے میں میرا دل یکسو ہوکر کہتا ہے کہ ان سے مجھے وہ محبت ہے جو اپنے والد سے بھی نہیں ہے۔آپ یہ سوچیں کہ آپ کے بارے میں آپ کا کوئی طالب علم اس مشکل میں گرفتار ہے؟ اگر نہیں تو یہ بڑی کمی کی بات ہے۔ میرے نزدیک وہ شخص معلم ہونا کوالیفائی نہیں کرتا جو اپنے طالب علم کے لیے ایسا آئیڈیل نہ بنے کہ وہ اس کے متعلق محبت کے مذکورہ جذبات نہ رکھے۔ میرے کم از کم بیس اساتذہ ایسے ہیں جن کے بارے میں آج سوچتا ہوں تو مجھے رونا آنے لگتا ہے۔ اُن کا خیال دل میں لاتا ہوں تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہوجاتی ہے۔۔۔اور یہ دینی تعلیم کے اساتذہ نہیں ہیں سکول و کالج کے اساتذہ ہیں اور میں ان کے بارے میں واقعتاً فیصلہ نہیں کرسکتا کہ میں اپنے والد سے ان سے زیادہ محبت کرتا ہوں۔

تو اس حوالے سے اپنے شاگردوں کے لیے خود کو آئیڈیل بنانے کے لیے جدوجہد کریں اور آپ اُسی وقت اپنے شاگردوں کے آئیڈیل ہیں جب وہ اس مشکل میں گرفتار ہوجائیں اور یہ فیصلہ نہ کرپائیں کہ انہیں آپ زیادہ عزیز ہیں یا ان کے حقیقی والد؟ تو اللہ آپ کو بھی توفیق دے اور مجھے بھی توفیق دے، ہمارے تصورات کو درست کرے اور ان درست تصورات کو قابل عمل بنانے کے لیے جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے، جس اخلاص کی حاجت ہے، اس کی بھی وہ ہمیں توفیق دے۔

ڈاکٹر محمد امین

تربیت کی فکری بنیادیں

آج کی نشست کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ طلبہ کی اسلامی تربیت کیسے کی جائے؟ اب تربیت ایک عملی کام ہے اور یہ اس وقت تک نہیں کیا جاسکتا جب تک یہ طے نہ کیا جائے کہ تربیت کی اساس کیا ہے؟ ہم طلبہ کی تربیت کرنا چاہتے ہیں تو کس اصول پر؟ تو اس حوالے سے آج کے لیکچر کا موضوع یہ ہے کہ تربیت کی فکری بنیادیں کیا ہونی چاہئیں؟

یہ ''فکر'' کی بات بہت اہم ہے اس لیے کہ اسی کی بنیاد پر ہم یہ طے کرنے کے قابل ہوسکیں گے کہ تربیت سے ہماری کیا مراد ہے اور یہ تربیت کیسے کی جاسکتی ہے؟ اس کے لیے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ بنیادی فکری اساسات کیا ہیں جن پر ہمارا معاشرہ کھڑا ہے؟ لوگ کن باتوں میں یقین رکھتے ہیں؟ ان کی رائے میں زندگی کا مقصد کیا ہے؟

اب اگر آپ اس بات کو لیں کہ بحیثیت پاکستانی اور بحیثیت مسلمان ہمارا مقصدِ زندگی کیا ہے تو قرآن وسنت کی تعلیمات سے پتہ چلتا ہے کہ ایک مسلمان کا مقصدِ زندگی یہ ہوتا ہے کہ اس کا رب اس سے راضی ہوجائے، آخرت میں اسے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوجائے۔

۔ ﴿مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ﴾ (الحدید ۵۷:۲۷)

''یعنی پیغمبروں کے ذریعے ہم نے پہلی قوموں کو یہی پیغام بھجوایا تھا کہ ان پر اللہ کی رضاجوئی واجب ہے۔''

۔ ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾ التوبہ ۹:۷۲)

''یعنی ہم نے مومنوں سے وعدہ کیا ہے کہ ان کے نیک اعمال کے بدلے میں آخرت میں انہیں ایسے باغات ملیں گے جن میں چشمے بہتے ہوں گے اور عالی شان محل ہوں گے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اور سب سے بڑھ کر اللہ کی خوشنودی کی نعمت جو درحقیقت سب سے بڑی کامیابی ہے۔''

۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ (التوبہ ۹:۱۱۱)

''یعنی اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی زندگی خرید لی ہے اس کے بدلے میں انہیں جنت ملے گی۔''

تو گویا ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد ہے یہ ہے کہ آخرت میں اللہ اُس سے راضی ہوجائے اور اُسے

جنت ملے۔ یہ قرآن مجید کا فیصلہ ہے۔

اللہ کیسے راضی ہوگا؟ اور آخرت میں ہمیں اُس کی خوشنودی کیسے حاصل ہوسکتی ہے؟ اس کا جواب بھی قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں دے دیا ہے اور وہ طریقہ بھی بتا دیا ہے جس پر عمل کر کے ہم آخرت میں اللہ کی خوشنودی اور اس کی رضا حاصل کر سکتے ہیں۔ فرمایا:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ (الذاریات ۵۱:۵۶)

یعنی ہم نے انسانوں اور جنوں کو سوائے اس مقصد کے کسی اور مقصد سے پیدا نہیں کیا کہ وہ ہماری پرستش اور اطاعت کریں۔

گویا اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت کرتے ہوئے اگر اس کی مرضی کے مطابق ہم یہ زندگی گزاریں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آخرت میں اللہ کی خوشنودی ہمیں ملے گی۔ دوسرے لفظوں میں دنیا میں ہمارے کرنے کا جو کام ہے اور جو ہمارا مقصدِ زندگی ہے وہ یہ ہے کہ ہم اس دنیا کی زندگی اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق گزاریں۔

اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق یہ زندگی ہم کیسے گزاریں؟ اس کا انتظام بھی اللہ تعالیٰ نے کمالِ مہربانی سے کر دیا ہے۔ وہ یوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی ایک بندے کو لوگوں کی ہدایت کے لیے مختص اور منتخب کر لیتا ہے جنہیں ہم پیغمبر اور رسول کہتے ہیں۔ وہ پیغمبر اور رسول اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہم تک پہنچاتا ہے اور ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ کی مرضی کے مطابق ہم یہ زندگی کس طرح گزار سکتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ پیغمبر ہمیں اس طرح کی ایک ماڈل زندگی گزار کر دکھاتا ہے کہ یہ نمونے کی زندگی جو اللہ کو مطلوب ہے، اس طرح کی زندگی گزارو گے تو آخرت میں اللہ کی خوشنودی ملے گی۔

پیغمبر یہ کام کیسے کرتا ہے؟ یعنی وہ کیسے لوگوں کو ذہنی و قلبی طور پر اس پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ برضا ورغبت ایسی زندگی گزاریں کہ ان کا اللہ ان سے راضی ہو جائے! اس کا جواب بھی ہمیں قرآن حکیم سے ملتا ہے اور وہ یہ کہ اس غرض سے اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو جو طریق کار بتایا ہے وہ ہے تعلیم وتزکیہ کا ﴿وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ﴾ (البقرۃ ۲:۱۲۹) یعنی پیغمبر لوگوں کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے ان کا تزکیہ کرتا ہے اور یہ محض نبی کریم ﷺ کا طریق کار نہیں تھا بلکہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ پہلے پیغمبروں کا طریق کار بھی یہی تھا، چنانچہ فرمایا:

﴿اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ○ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى﴾ (الاعلیٰ ۸۷:۱۸،۱۹)

یعنی جو پہلے پیغمبر گزرے ہیں اور ان پر جو کتابیں نازل ہوئیں تھیں ان میں بھی یہی پیغام دیا گیا تھا کہ تزکیہ ہی سے لوگ کامیاب ہوں گے۔ گویا ہدایت کا فارمولہ ہے تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ۔ اب تعلیم کتاب تو واضح ہے کہ اس سے مراد قرآنِ حکیم کی تعلیم اور وہ تعلیم جو قرآن پر مبنی ہو اور اس کی تعلیمات کے خلاف نہ ہو۔ لیکن تعلیم حکمت سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد ہے (من جملہ دوسری باتوں کے) قرآن کے ماسوا ان علوم کی تعلیم جو فہمِ قرآن کے لیے ضروری ہیں جیسے حدیث، عربی اور فقہ وغیرہ، اور ان علوم وفنون کی تعلیم جن کی انسانوں کو دنیاوی زندگی گزارنے کے لیے ضرورت پڑتی ہے جیسے زراعت وصنعت وغیرہ۔

لیکن قرآن محض تعلیم کی بات نہیں کرتا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر تزکیہ کی بات بھی کرتا ہے۔ تزکیہ قرآنی اور شرعی اصطلاح ہے جسے شعبۂ تعلیم میں 'تربیت' کہتے ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو لوگوں کی اصلاح اور ان میں مطلوب تبدیلی لانے کے لیے جو دو نکاتی فارمولا عطا فرمایا ہے وہ ہے تعلیم اور تربیت کا۔

اور قرآن حکیم ہی سے پتہ چلتا ہے کہ اصل مقصود تزکیہ وتربیت ہے تعلیم نہیں۔ کیونکہ قرآن حکیم میں جہاں تعلیم وتزکیہ کا حکم آیا ہے وہاں ایک جگہ تزکیہ کا لفظ تعلیم وتربیت سے پہلے آیا ہے اور دوسری جگہ اس کے بعد۔ گویا تعلیم سے اوّل وآخر مقصود تزکیہ ہی ہے اور تعلیم بھی ایک ذریعہ ہے، تزکیہ کے حصول کا۔

یہ 'تزکیہ' کیا ہے اور اس سے کیا مراد ہے؟ تزکیہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں ''ناپسند باتوں کو چھوڑنا اور پسندیدہ باتوں کو اپنانا''۔ یہ جو ہم زکوٰۃ کا لفظ بولتے ہیں اس سے دراصل مراد ہوتی ہے ''زکوٰۃ المال'' جس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ مال جو ہم نے کمایا ہے، جو ہماری آمدنی ہے، اسے کماتے وقت ہم سے جو کوتاہیاں ہوگئی ہیں ان کا گند مند نکل جائے اور جو اس کا اجلا پہلو ہے، برکت کا پہلو ہے اس کو مزید جلا مل جائے۔ گویا شخصیت کا تزکیہ یہ ہے کہ انسان ان سب افعال و اعمال کو چھوڑ دے جو غیر فطری ہیں، انسان کے لیے ضرر رساں ہیں، غیر مفید اور بُرے ہیں۔ اور وہ ان اعمال وافعال کو انجام دے جو فطری ہیں، اس کے لیے مفید اور اچھے ہیں۔ یہ ہے تزکیہ۔ اب اچھا کیا ہے اور بُرا کیا ہے؟ اس کا انحصار دوسرے معاشروں میں، دوسری قوموں کے لیے کچھ بھی ہوسکتا ہے مگر ہم مسلمانوں کے لیے اس کی ایک خاص صورت ہے۔ آپ غور فرمایئے کہ ''مسلم'' کس کو کہتے ہیں؟

مسلم وہ ہے جو اسلام قبول کرے۔''اسلام'' کیا ہے؟ اسلام یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت کریں غیر مشروط طور پر۔

میں نے ابھی آپ کے سامنے آیت پڑھی تھی کہ انسانوں کو اللہ نے پیدا کیا ہے بندگی کے لیے، کہ وہ اس کی اطاعت کریں اور اس کی پرستش کریں۔ اس ''اطاعت'' میں سارے معروفات پر عمل اور سارے منکرات سے بچنا شامل ہے اور یہی تزکیہ ہے۔ اور ہم نے اپنی آزاد مرضی سے، برضا و رغبت اسلام کو قبول کیا ہے یعنی اللہ کی غیر مشروط اطاعت کو قبول کیا ہے تو اب ہم خود فیصلہ نہیں کر سکتے، کوئی مسلمان جو اسلام کو مانتا ہے اور جس نے اسلام کو اپنا طرزِ زندگی بنالیا ہے یہ فیصلہ نہیں کرسکتا کہ اچھا کیا ہے اور بُرا کیا ہے؟ بلکہ یہ فیصلہ اللہ کرے گا کہ اچھا کیا ہے اور بُرا کیا ہے۔ گویا تزکیہ یہ ہے کہ ہم ہر وہ کام کریں جس کا اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے کرنے کا حکم دیا ہے اور ہر اس کام کو چھوڑ دیں جس سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے منع کیا ہے، یہ ہے اسلام میں تزکیہ کا تصور۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے پیغمبر بھیجے ہیں ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام سے لے کر محمد ﷺ تک کہ وہ لوگوں کا تزکیہ کریں۔ کیسے کریں؟ تعلیم کے ذریعے۔ گویا ہم اس نتیجے تک پہنچے کہ اصل چیز یہ ہے کہ انسانوں کا، مسلمانوں کا، اس طرح تزکیہ کیا جائے کہ وہ اپنی زندگی اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق گزاریں تا کہ انہیں آخرت میں اللہ کی خوشنودی اور رضا و سرفرازی حاصل ہو۔ اب یہ تزکیہ حاصل ہوتا ہے تعلیم کے ذریعے۔ کون سی تعلیم؟ تعلیم کتاب وحکمت!

اب مقصدِ تعلیم واضح ہوگیا کہ وہ ہے تربیت اور تزکیۂ نفس۔ گویا اگر ہمارا نظامِ تعلیم ایک ایسی شخصیت پروان چڑھا رہا ہے جو اسے عملی مسلمان بناتی ہے تو نظام تعلیم کامیاب ہے اور اگر ہمارا نظام تعلیم ایسا فرد ڈویلپ (Delevop) نہیں کر رہا جو اپنی زندگی اللہ کے احکام کے مطابق گزارے تو وہ نظام تعلیم غیر اسلامی ہے، وہ ناقص ہے، وہ غلط ہے، وہ ناکام ہے۔ تو ہمارے نظام تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے طلبہ و طالبات کو ایسی تعلیم دیں، ان کی ایسی تربیت کریں کہ وہ عملی مسلمان بنیں تا کہ وہ زندگی اللہ کے احکام کے مطابق گزار سکیں اور وہ آخرت میں اللہ کے حضور کامیابی حاصل کرسکیں۔

دیکھیے! یہ بات حتمی ہے کہ جو آدمی اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گزارتا ہے اسے آخرت میں کامیابی ملتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہاں علم کے ساتھ عمل بلکہ صحیح تر لفظوں میں صحیح علم کے ساتھ عمل صالح کی شرط ہے۔ یہاں آپ کا دھیان اس حدیث کی طرف نہ جائے جس میں نبی کریم ﷺ نے

فرمایا کہ جس نے لا الہ الا اللہ پڑھا وہ جنت میں جائے گا کیونکہ اس حدیث میں آگے یہ بھی ہے کہ جب حضرت ابو ہریرہؓ آپ ﷺ کا یہ پیغام لوگوں کو بتانے جارہے تھے تو حضرت عمرؓ نے انہیں روک دیا اور انہیں واپس لے آئے اور آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ اس طرح تو لوگ عمل چھوڑ دیں گے۔ آپ ﷺ نے حضرت عمرؓ کی بات تسلیم فرمائی۔ اس حدیث کا اصل مفہوم یہ ہے کہ صحیح عقیدہ بہت اہم ہے اس کے بغیر اچھے اعمال کا صدور ممکن نہیں اور ہو بھی تو وہ بے معنی ہے۔ نیز صحیح احادیث سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ گناہگار مسلمانوں کو بھی پہلے اپنے گناہوں کی سزا بھگتنا ہوگی پھر ہی وہ جنت میں داخل کیے جائیں گے گویا اصل چیز عمل ہے۔ عمل کے بغیر کچھ نہیں ہوتا اور عمل تزکیے ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ تزکیہ و تربیت خود بھی ایک عملی کام ہے اور اس کا نتیجہ بھی عمل ہے اور جو شخص کتاب و حکمت کے مطابق اپنا تزکیہ کرلیتا ہے وہ اپنی زندگی عملاً اللہ کے احکام کے مطابق گزارنے پر قادر ہوجاتا ہے اور آخرت میں اس کا نتیجہ حتمی کامیابی کی صورت میں نکلتا ہے۔

یہ ہم ذکر کر رہے تھے فرد کا کہ فرد اگر اپنا تزکیہ کرلے تو دنیا میں اطاعت وعبادتِ رب اور عمل صالح پر قادر ہوجاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ تزکیے کا اجتماعی نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ معاشرہ چونکہ افراد ہی سے مل کر بنتا ہے اس لیے اگر معاشرے کا ہر فرد مزکیٰ (تزکیہ یافتہ) ہوجائے تو پورا معاشرہ مزکیٰ ہوجائے گا۔ اور جو معاشرہ مزکیٰ ہوجائے تو اس کے نتیجے میں اسے حاصل ہوتی ہے دنیا کی کامیابی، بلکہ مجھے کہنے کی اجازت دیجیے کہ دنیا میں حتمی کامیابی۔ اور یہ کوئی خواب وخیال کی بات نہیں، تھیوری کی بات نہیں۔ دنیا نے دیکھا کہ جب معاشرہ مزکیٰ ہوگیا تو حضرت عمرؓ وعثمانؓ کے عہد میں بارہ تیرہ سال کے اندر دنیا کی سپر پاورز، ایران وروم، ان کے آگے سرنگوں ہوگئیں۔ کیا یہ ایٹم بم چلانے کا نتیجہ تھا؟ کیا یہ سائنس وٹیکنالوجی میں ترقی کرنے کا نتیجہ تھا؟ نہیں! ایٹم بم تو اس وقت تک ایجاد بھی نہ ہوا تھا اور آلاتِ حرب میں بھی مسلمانوں کو اپنے حریفوں پر کوئی فیصلہ کن برتری حاصل نہ تھی۔ یہ فتوحات نتیجہ تھیں قوتِ ایمانی کا، قوتِ کردار کا، جس کا منبع ہے تعلیم کتاب وحکمت وتزکیہ۔۔۔ یہاں کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہم سائنس وٹیکنالوجی کی ترقی کے منکر ہیں یا اس کی اہمیت سے انکار کرتے ہیں۔ نہیں! ہم سائنس وٹیکنالوجی کی ترقی کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے لیکن لوگ سطحی سوچ رکھتے ہیں۔ یہ غور نہیں کرتے کہ سائنس وٹیکنالوجی میں ترقی کیسے ممکن ہے؟ سائنسی ترقی کے لیے ضرورت ہے قیمتی تجربہ گاہوں اور بڑے تحقیقی وتعلیمی اداروں کی جنہیں چلانے کے لیے خطیر رقوم درکار ہیں جو صرف اسی

وقت حاصل ہوسکتی ہیں جب معاشی استحکام ہو۔معاشی استحکام کے لیےضروری ہے کہ سیاسی استحکام ہو اور سیاسی استحکام کے لیے ضروری ہے کہ عوام اور حکمرانوں میں ذہنی ہم آہنگی ہو۔فرد قیادت کی اطاعت کا خوگر ہو،فرد میں اجتماعی ایثار کی خوبی ہو، وہ قوم کے ساتھ مخلص ہو، اپنا کام محنت، دیانت داری اور منصوبہ بندی سے کرے وغیرہ وغیرہ۔تو فرد میں یہ خوبیاں کیسے پیدا ہوں گی؟ صحیح تعلیم اور تزکیے سے، گویا ہم بالآخر وہیں پہنچ گئے کہ سائنس وٹیکنالوجی کی ترقی کے لیے بھی جو بنیادی چیز درکار ہے اس کی بنیادفرد کی تبدیلی ہے اور فرد تبدیل ہوتا ہے صحیح عقیدے اور ایمان محکم سے، جو نتیجہ ہوتا ہے تعلیم اور تزکیہ وتربیت کا۔

خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا جو طویل ہوگیا، میں یہ عرض کررہا تھا کہ اگر معاشرے کا، معاشرے کے افراد کا بہترین تزکیہ ہوجائے تو دنیا میں بھی کامیابی ملتی ہے۔اور یہ مَیں نہیں کہہ رہا، کائنات کے رب نے فرمایا: ﴿وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (آل عمران۳:۱۳۹)تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن بن جاؤ۔اور دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَ يٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّ يَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَ لَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ﴾ (ہود۱۱:۵۲) کہ آسمان اپنی برکتیں تم پر نازل کرے گا اور زمین تمہارے لیےخزانے اگل دے گی بشرطیکہ تم میں اللہ کے سچے بندوں والی صفات پیدا ہوجائیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تزکیۂ نفس کو اہمیت دی جائے، اگر معاشرے کے اکثر افراد کا صحیح تزکیہ ہوجائے، جو اللہ اور اس کے رسول کو مطلوب ہے،تو مسلمانوں کو دنیا میں بھی عزت و وقار اور کامیابی ملے گی۔

یہ تو ایک اصولی بات ہوئی لیکن ہماری حالت کیا ہے؟ ہماری حالت یہ ہے کہ آج ہم ذلیل ورسوا ہیں، دنیا میں سب سے کمزور ہیں۔خون بہتا ہےتو مسلمانوں کا،عزتیں لٹتی ہیں تو ان کی بہو بیٹیوں کی، گھر جلتے ہیں تو ان کے، معاشرہ تباہ ہوتا ہےتو ان کا۔آج دنیا میں سب سے کمزور، سب سے حقیر اور سب سے ذلیل وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے ہیں۔کیوں؟ وسیع موضوع ہے تفصیل میں جانا اس وقت پیش نظر نہیں۔بنیادی بات یہ ہے کہ ہم نے صحیح تعلیم اور تزکیے کو چھوڑ دیا ہے۔جب ہمارا نظام تعلیم وتزکیہ ٹھیک تھا تو اس کے نتیجے میں طاقت کی ایک لہر اُٹھی جس نے ہمیں ایک ہزار سال تک تقدم عطا کیے رکھا۔اگرچہ پانچ سو سال بعد چنگیز خان اور ہلاکو نے جو حملہ کیا اس نے مسلم معاشرے کو ایک زبردست جھٹکا دیا لیکن مسلم فکر وتہذیب اس بڑے جھٹکے کو سہار گئی اور مزید پانچ سو سال نکال گئی۔

ایک ہزار سال تک ہماری تہذیب پوری شان وشوکت اور آب وتاب کے ساتھ قائم رہی اور معروف دنیا کے بڑے حصے پر مسلمانوں کا غلبہ رہا۔ وہ علم وتحقیق میں، سوشل سائنسز میں، سائنس وٹیکنالوجی میں، آلاتِ حرب میں غرض ہر شعبے میں ساری دنیا سے آگے تھے۔

اس وقت تک ہم نے جو کچھ کہا ہے اس سے ظاہر ہے کہ ہمارے زوال کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہمارا نظام تعلیم تباہ ہوگیا ہے۔ ہمارا تزکیہ وتربیت کا نظام خراب ہوگیا۔ اب اگر ہم گرنے کے بعد اٹھنا چاہتے ہیں تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ ہم اپنے تربیت اور تعلیم کے نظام کو ٹھیک کریں۔ ہمارے تعلیم وتربیت کے نظام کو ٹھیک کرنے میں جو موانع اور جو رُکاوٹیں ہیں وہ دو طرح کی ہیں: پہلی جو رکاوٹ ہے میں اسے داخلی سبب کہتا ہوں۔ داخلی سبب یہ ہے کہ ہمارے ایمان لانے کی معنویت ختم ہوگئی ہے ہم نمازیں پڑھ لیتے ہیں، روزے رکھ لیتے ہیں، کچھ لوگ داڑھیاں بھی رکھ لیتے ہیں، کچھ لوگ تسبیح بھی پکڑ لیتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہماری اجتماعی حالت نہیں بدلتی اس لیے کہ ہمارا تعلیم اور تزکیے کا نظام غلط ہوجانے کی وجہ سے بحیثیت مجموعی وہ فرد پیدا ہی نہیں ہو رہا جو اسلام کو مطلوب ہے۔ حضرت عمرؓ ایک دفعہ مسجد نبوی میں بیٹھے تھے کہ دفعتاً اٹھے، منبر پر گئے اور کہنے لگے: ایک وقت تھا کہ عمر چند ٹکوں کے عوض لوگوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا، یہ کہہ کر نیچے اتر آئے۔ لوگوں نے کہا کہ جناب یہ کیا بات ہوئی؟ کہنے لگے کہ مجھے میرا نفس ورغلا رہا تھا کہ تو بڑی شے ہوگیا ہے تو میں نے سوچا کہ اسے اس کی اوقات یاد دلواؤں اور سب کے سامنے جا کر یہ اقرار کروں کہ میں چند ٹکوں کے عوض لوگوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ وہ عمرؓ جو چند ٹکوں کے عوض لوگوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا وہ دنیا کا مدبّر اعظم کیسے بن گیا؟ ایک مستشرق نے کہا ہے کہ اگر مسلمانوں میں ایک عمرؓ اور پیدا ہوجاتا تو قیامت تک مسلمان دنیا پر غالب رہتے۔ ایک عمرؓ اگر ان میں اور پیدا ہوجاتا! اتنا بڑا مدبّر، اتنا بڑا فاتح، اتنا بڑا ایڈمنسٹریٹر، اتنا بڑا منصوبہ ساز، دس سال کی حکمرانی میں دو سپر پاورز کو ملیا میٹ کر دیا۔ یہ طاقت کہاں سے آئی؟ کیا عمرؓ کے پاس جادو کی چھڑی تھی؟ نہیں! یہ نبی کریم ﷺ کا نظام تربیت تھا جس نے پتھروں کو ہیرا بنا دیا، چرواہوں کو مدبّر اعظم بنا دیا، خالد بن ولیدؓ جیسا سپہ سالار اس نے پیدا کیا، حضرت علیؓ جیسا فقیہ اور حضرت ابوبکرؓ جیسا سٹیٹس مین (Statesman) پیدا کیا۔

مجھے میرے لفظوں کے لیے معاف کیجیے گا کہ خدانخواستہ توہینِ صحابہ مقصود نہیں کہ یہ معمولی لوگ تھے۔ اگر نبی کریم ﷺ ان میں مبعوث نہ ہوتے تو تاریخ میں ان کا ذکر تک نہ ہوتا لیکن نبی کریم ﷺ

تو کندن تھے، جس کو مس کیا سونا بنا دیا۔ لوہے کو مس کیا تو سونا بنا دیا، پیتل کو مس کیا تو سونا بنا دیا۔ تو یہ سب اثر تھا نبی کریم ﷺ کی تربیت کا جس نے بدوؤں کو براعظموں کا حاکم بنا دیا۔

تو بات یہ ہو رہی تھی کہ اصل خرابی ہمارے داخل میں ہے، ہمارے باطن میں ہے۔ اسلام آج ہمارے لیے قال ہے، حال نہیں۔ معاف کیجیے گا لفظوں سے، وعظوں سے، تحریروں سے دل نہیں بدلتے، دل کردار سے بدلتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ میں کردار پیدا کیا۔ وہ کردار کی قوت اتنی زبردست تھی کہ ہمیں ایک ہزار سال تک آگے کھینچ کر لے گئی یہاں تک کہ ہمارا نظام تعلیم و تربیت بالکل ہی کند ہو کر رہ گیا اور ہم زوال کے گڑھے میں گرتے چلے گئے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم احیا کریں اس نظام تعلیم کا، اس نظام تربیت کا، جس کی بنیاد رکھی نبی کریم ﷺ نے اور آپ ﷺ کے صحابہ کرامؓ نے۔ اس نظام تعلیم و تربیت کا احیا کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ دس ملین ڈالر کا سوال ہے۔ میں نے اس پر بہت سوچا ہے اور بہت لکھا ہے لیکن یہ میرا آج کا موضوع نہیں ہے اس پہ ان شاء اللہ آئندہ کبھی گفتگو ہو گی۔ آج کا موضوع یہ ہے کہ ہماری تربیت کی بنیاد کیا ہے؟ اور اس کا ایک لفظی جواب یہ ہے کہ ہمارے نظام تربیت کی بنیاد اسلام ہے، اسلام کا صحیح تصور ہے۔ جب صحیح تربیت نہ رہی تو ہم زوال پذیر ہو گئے اور آج بھی ہم زوال پذیر ہیں۔ اور اس زوال سے نکلنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم اپنا نظام تعلیم و تربیت ٹھیک کریں۔ خصوصاً اس وقت تربیت کی بات ہو رہی ہے، تزکیے کی بات ہو رہی ہے، تو سمجھ لیجیے کہ اصل چیز صحیح تربیت ہے تاکہ آدمی بدلے، جب آدمی بدلیں گے تو ان میں قوت آ جائے گی اور وہ قوت آپ کو پھر اسی بلندی پر لے جائے کہ جس پر آپ کبھی تھے۔

یہ تو داخلی رکاوٹ کا ذکر تھا۔ اب خارجی رکاوٹ کو لیجیے۔ وہ کیا ہے؟ وہ ہے ویسٹرنائزیشن (Westernization) یعنی مغربی فکر و تہذیب کا ہمارے دل و دماغ پر غلبہ۔ یہ خارجی رکاوٹ اتنی اہم ہے، اتنی زبردست ہے کہ بعض اوقات یوں لگتا ہے کہ شاید ہماری داخلی رکاوٹ کا سبب بھی یہی ہے۔ یہاں ابتدا ہی میں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے اور وہ غلط فہمی یہ ہے کہ عام آدمی یہ سمجھتا ہے کہ مغرب اس وقت بالا دست ہے، ترقی یافتہ ہے، غالب ہے۔ لہٰذا اگر ہم ترقی کرنا چاہتے ہیں، ہم بھی آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی مغرب کی پیروی کرنی چاہیے۔ ہمیں بھی ان اصولوں پر عمل کرنا چاہیے جن پر عمل کر کے مغرب نے ترقی کی ہے۔ اس طرح ہم بھی ترقی یافتہ ہو جائیں گے، یہ

بہت بڑی غلطی ہے جس میں اکثر پڑھے لکھے مسلمان مبتلا ہیں۔

صحیح صورتِ حال کیا ہے؟ صحیح صورتِ حال یہ ہے کہ دنیا کی کامیابی چند اسباب کا نتیجہ ہوتی ہے۔ وہ اسباب پیدا کرنے کی صلاحیت انسانوں میں ، معاشروں میں پیدا ہوتی ہے اپنے ورلڈ ویو (Worldview) سے کمٹمنٹ (Commitment) کی وجہ سے۔ ہمارا جو ورلڈ ویو ہے یعنی خدا، رسالت اور آخرت پر ایمان، جب ہماری اس کے ساتھ کمٹمنٹ تھی، اس کے مطابق ہم نے اپنے آپ کو بدلا تو ہم دنیاوی لحاظ سے بھی کامیاب ہوگئے ۔اس لیے کامیاب ہوگئے کہ ہمارے اندر بھی وہ صلاحیتیں پیدا ہوگئیں جو دنیا میں کامیابی کے لیے ضروری ہیں۔مغرب کا خدا، رسول اور آخرت کا وہ تصور نہیں ہے، بلکہ ہمارے برعکس ان کی مذہبی تعلیمات سے چونکہ سائنسی نظریات ٹکراتے تھے اور ان میں کش مکش پیدا ہوتی تھی اس لیے ان کے مفکرین نے مذہب کو رد کر دیا۔مغربی تہذیب نے مذہب کو رد کر کے ترقی کی ہے۔مغربی تہذیب کی فکری بنیاد کیا ہے؟ ہیومنزم (Humanism)، سیکولرزم (Secularism)، ایمپریسزم (Empericism) اور کیپٹل ازم (Capitalism)، اب دیکھیے کہ ہیومنزم کیا ہے؟ ہیومنزم یہ ہے کہ انسان خود مختار بلکہ مختار مطلق ہے اور اپنا خدا خود ہے۔ بقول سارتر کہ ہمیں کسی خدا کی ضرورت نہیں، خدا مر چکا ، ہم اس عفریت کو زندہ کرنا نہیں چاہتے۔ نعوذ باللہ، یہ ہے ہیومنزم۔سیکولرزم کیا ہے؟ سیکولرزم یہ ہے کہ اگر کوئی خدا ہے بھی تو جسے اس کو ماننا ہے اپنی ذاتی زندگی میں مان لے، اجتماعی زندگی میں اس خدا کو دخل دینے کی بہرحال اجازت نہیں دی جاسکتی۔ ہمارا سیاسی نظام کیسا ہو؟ ہماری معاشرت کیسی ہو؟ ہمارا معاشی نظام کیسا ہو؟ ہمارا قانونی نظام کیسا ہو؟ مغرب کی فکر یہ ہے کہ اس میں اللہ کو دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ یہ انسانوں کا کام ہے، یہ ریاست اور سول سوسائٹی کا کام ہے کہ وہ یہ امور طے کرے، ان امور کے بارے میں فیصلے کرے۔تو یہ ہے مغرب کا سیکولرزم کہ انسان کی اجتماعی زندگی میں خدا کو دخل دینے کا حق نہیں۔ ایمپریسزم کا مطلب یہ ہے کہ شک و شبہ سے ماورا یقینی علم وہ ہے، حق صرف وہ ہے جسے ہم دیکھ سکیں، چھو سکیں، جس کا لیبارٹری میں تجربہ کر سکیں۔ وہ علم کی تعریف ہی یہ کرتے ہیں کہ جس کا مشاہدہ اور تجربہ کیا جاسکے۔عقیدے کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ تو faith ہے، علم نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں خدا، رسول، فرشتوں اور آخرت پر ایمان بے علمی، جہالت اور توہم پرستی ہے۔ یوں مغربی تہذیب اپنی اصل میں الحاد اور بے دینی پر مبنی ہے۔مغرب کا اگلا اصول ہے کیپٹل ازم یعنی سرمایہ دارانہ نظام۔

اس نظام کا حاصل یہ ہے کہ زندگی بس اس دنیا کی زندگی ہے آخرت کس نے دیکھی ہے۔ دنیا سے محبت کرو، اس کے لیے جیو، اس کے لیے مرو۔ اس کی بہتری کے لیے ساری تگ و دو کرو۔ یہ اصول بھی اسلام کی عین ضد ہے کیونکہ اسلام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دو۔ اسلام میں دنیا کو آخرت پر قربان کیا جاسکتا ہے لیکن آخرت کو دنیا پر قربان نہیں کیا جاسکتا۔

تو خلاصہ یہ کہ مغرب کی جتنی فکری اساسات ہیں وہ اسلام کی مخالف ہیں۔ ہیومنزم اور سیکولرزم کا مطلب ہے خدا کی خدائی کا انکار۔ ایمپیریسزم کا مطلب ہے وحی اور قرآن کا انکار۔ سرمایہ داری کا مطلب ہے آخرت کا انکار۔ مطلب یہ کہ مغرب کی جو فکر ہے، نہ صرف اسلامی اصولوں سے مختلف ہے بلکہ ان کی مخالف ہے، ان سے متضاد ہے اور ان کی نفی کرتی ہے۔ چنانچہ اگر مسلمان اسلامی تعلیمات چھوڑ کر مغربی تعلیمات اپنائیں گے تو ان کی شخصیت کش مکش کا شکار ہوکر کمزور ہوجائے گی جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ دنیا میں بھی کمزور اور ذلیل ورسوا ہوں گے اور آخرت میں تو ہوں گے ہی۔

یہ نقطہ اہل مغرب نے بھی خوب سمجھ لیا اور اس غرض سے انہوں نے اپنا نظام تعلیم وتربیت ہم پر مسلط کردیا۔ یہ کوئی افسانہ نہیں ہے جو میں آپ کو سنا رہا ہوں۔ اسی برصغیر میں آج سے پونے دوسو سال پہلے ایک شخص تھا جس کا نام تھا لارڈ میکالے۔ اس نے تعلیم پر ایک رپورٹ لکھی تھی ۱۸۳۷ء میں ،چھپی ہوئی موجود ہے انگریزی میں بھی اور اردو میں بھی۔ انگریز جب یہاں آئے تو انہوں نے اقتدار مسلمانوں سے چھینا تھا لہٰذا وہ انہیں دبا کر رکھنا چاہتے تھے تاکہ وہ ان کے خلاف اٹھ نہ سکیں، اس کے لیے انہوں نے کئی طریقے اختیار کیے۔ پہلے تو سوچا کہ انہیں عیسائی بنادیا جائے۔ حکومت ہند کی مرضی سے، بلکہ منصوبہ بندی سے پادریوں کا ایک غول یہاں آیا، اور انہوں نے لوگوں کو عیسائی بنانے کی کوشش شروع کی۔ میں داد دیتا ہوں مسلمان علماء کو، اللہ ان کی قبریں منور کرے اور ٹھنڈی رکھے، انہوں نے کہا کہ ہم نے دنیاوی طور پر شکست تو کھالی ہے، غلام تو ہم ہوگئے ہیں لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ اب اپنا دین بھی بدل لیں۔ تو اس گئی گزری حالت میں بھی، جو کہ علمی لحاظ سے بھی تھی اور فکری لحاظ سے بھی تھی انہوں نے ہار نہیں مانی۔ انہوں نے عیسائیوں کو مناظروں اور مباحثوں میں شکست دی اور وہ شکست کھا کر یہاں سے بھاگے۔ اس کا ریکارڈ موجود ہے چیزیں چھپی ہوئی موجود ہیں۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی اظہار الحق دیکھ لیجیے۔ دوسری کتابیں بھی موجود ہیں۔

پھر انگریز نے سوچا کہ اس طرح تو مسلمان قابو میں نہیں آئے تو پھر لارڈ میکالے نے اپنی

رپورٹ مرتب کی۔ اس نے کہا کہ ان کو میٹھا زہر دو۔ ان کا نظام تعلیم بدل دو، ان کا نظام تربیت بدل دو۔ یہ نام کے مسلمان رہ جائیں گے اور اندر سے ہماری تہذیب کے رسیا ہو جائیں گے، اس پر چلنے لگیں گے۔ چنانچہ انگریز نے اس پالیسی پر عمل کیا اور کامیاب ہوا۔

اس وقت فارسی ہماری دفتری اور قومی زبان تھی انگریز نے اسے ختم کر دیا اور انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنا دیا۔ اس وقت محاورہ بنا تھا ''پڑھیں فارسی بیچیں تیل''۔ یعنی فارسی پڑھ کر نوکری نہیں ملے گی، انگریزی پڑھو۔ یہ ابتدا تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے انگریزی پڑھنا شروع کر دی، روٹی کھانے کے لیے، نوکری کرنے کے لیے اور سرسید نے اسی نقطۂ نظر سے علی گڑھ یونیورسٹی قائم کی۔

مغربی تعلیم و تربیت کو اپنانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے ہاں مغربی تہذیب غالب آگئی ساری دنیا میں اس وقت مغربی تہذیب غالب ہے، اس کی فکر غالب ہے۔ اسی وجہ سے بہت سے مسلمانوں کا اور خصوصاً ان کے معاشرے کے بالادست اور حکمران طبقات کا ذہن یہ ہے کہ مغرب کی پیروی کرو، مغربی فکر و تہذیب کی پیروی کرو تا کہ اچھی ملازمت مل سکے، تا کہ دنیا کی خوشحالی اور کامیابی مل سکے۔ معاف کیجیے گا ہمارے جتنے نصابات بنتے ہیں وہ مغربی فکر کا چربہ ہیں۔ دیکھیے تعلیم کس چیز کو کہتے ہیں۔ میں نے شروع میں تعریف کر دی تھی کہ علم کیا ہوتا ہے؟۔ آپ ماشاء اللہ پڑھے لکھے لوگ ہیں، علم پیداوار ہوتا ہے نظریۂ علم (Theory of Knowledge) کا اور نظریۂ علم نتیجہ ہوتا ہے ورلڈ ویو کا۔ جیسا کسی کا تصورِ انسان، تصورِ الٰہ اور تصورِ کائنات ہوتا ہے، اسی طرح کا نظریۂ علم وجود میں آتا ہے اور جیسا کسی کا نظریۂ علم ہوتا ہے ویسے ہی اس کے علوم ہوتے ہیں اور ویسی ہی تعلیم ہوتی ہے۔

تو مغرب کی فکر کو جو آدمی مطلوب ہے وہ صرف دنیا کا آدمی ہے، وہ ہر قیمت پر صرف اور صرف دنیا کی کامیابی چاہتا ہے۔ آخرت اور اس کی ترجیح کا تصور وہاں بے معنی ہے، یہ ان کے پیش نظر ہے ہی نہیں۔ لہٰذا میں کہتا ہوں کہ اگر بطور مفروضہ، بحث کی خاطر، ان مسلمانوں کی بات مان بھی لی جائے جو مغرب کی پیروی کر کے دنیا میں ترقی کرنا چاہتے ہیں اور دنیا میں کامیابی چاہتے ہیں (گو میں اوپر دلائل سے ثابت کر چکا ہوں کہ ایسا ممکن نہیں) تو انہیں سوچنا چاہیے کہ انہیں یہ ترقی و کامیابی کس قیمت پر ملے گی؟ آخرت کی قیمت پر! میرے علم میں آج تک کوئی ایسا مسلمان نہیں آیا جو آخرت کی قیمت پر دنیاوی کامیابی چاہتا ہو، جو یہ علی الاعلان اور شعوری طور پر کہے کہ مجھے دوزخ میں جانا منظور ہے لیکن مجھے دنیا کی سہولتیں دے دو۔ دیکھیے ہم گناہ گار ضرور ہیں لیکن کسی مسلمان کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ

شعوری طور پر ببانگ دہل زبان سے یہ کہے کہ مجھے آخرت کی ضرورت نہیں، مجھے دنیا دے دو کیونکہ اس سے اس کی ذات کی نفی ہوتی ہے، اس کی شخصیت کی نفی ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں ممکن ہے کوئی گناہ گار مسلمان کسی کمزور اور جذباتی لمحے میں یہ کہہ بھی دے لیکن شعوری طور پر وہ نہیں کہہ سکتا، یہ کہہ کر وہ مطمئن زندگی نہیں گزار سکتا۔ وہ ایک حیوانی سطح کی زندگی تو گزار سکتا ہے لیکن ایک سوچنے سمجھنے والے انسان کی زندگی نہیں گزار سکتا۔ کیونکہ مسلمان کہتے ہی اس شخص کو ہیں جو شعوری طور پر یہ تسلیم کرے کہ وہ اللہ کا عبد ہے، اپنی مرضی سے دستبردار ہوتا ہے اور اللہ کی مرضی کے آگے بلاشرط سر تسلیم خم کرتا ہے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا کہ مسلمان کی تعریف ہی یہ ہے لہٰذا کوئی مسلمان، مسلمان رہتے ہوئے، یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزاروں گا، مغربی تہذیب کے مطابق گزاروں گا اور اللہ و رسول ﷺ کے احکام کے مطابق نہیں گزاروں گا۔

دیکھیے! اسلام بھوکوں، ننگوں اور کمزوروں کا دین نہیں ہے۔ یہ بھی دنیا میں کامیابی اور ترقی کی ضمانت دیتا ہے۔ بشرطیکہ آپ مسلمان ہو جائیں، سچ مچ کے مسلمان۔ میں ایک فرد کی بات نہیں کر رہا، پورے معاشرے کی بات کر رہا ہوں اور دنیا کی کامیابی کی یہ گارنٹی میں نہیں دیتا، خود خالق و مالک کائنات دیتا ہے۔ فرمایا: ﴿وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔ معاف کیجیے گا! اللہ جھوٹ نہیں بولتا ہم جھوٹ بولتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا اور کہنے لگا کہ میرے بھائی کا پیٹ خراب ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: جا کے اسے شہد پلایا، اس نے جا کر شہد پلائی، تو اس کے بھائی کے موشن اور تیز ہو گئے۔ وہ گھبرا کر آپ ﷺ کے پاس آیا کہ بھائی زیادہ بیمار ہو گیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جا کر اسے شہد پلاؤ۔ وہ گیا اور بھائی کو شہد پلایا۔ اس کے موشن اور تیز ہو گئے۔ وہ صحابی آپ ﷺ کے پاس آیا اور پریشان ہو کر کہنے لگا کہ اب تو اس کی حالت بہت ہی پتلی ہو گئی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اسے جا کر شہد پلاؤ۔ اس آدمی نے ڈرتے ڈرتے ادب سے کہا: جناب آپ ﷺ کے حکم پر پہلے بھی شہد پلا چکا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا، تمہارے بھائی کا پیٹ جھوٹ بول سکتا ہے، اللہ نہیں، اس نے فرمایا ہے کہ شہد میں شفا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ تمہارے بھائی کو شفا نہ ہو۔ وہ آدمی گیا اس نے اپنے بھائی کو مزید شہد پلایا۔ بتدریج اس کے بھائی کے پاخانے رک گئے اور وہ ٹھیک ہو گیا۔ اس وقت میڈیکل نقطۂ نظر سے بات نہیں ہو رہی کہ وہ کیسے ٹھیک ہو گیا؟ بات یہ ہو رہی ہے کہ ہم جھوٹے ہو سکتے ہیں، ہمارا فلسفہ جھوٹا ہو سکتا ہے، لیکن معاف کیجیے گا اللہ جھوٹا

نہیں ہوسکتا۔ ﴿وَ لَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ﴾ (الانبیا۲۱:۱۰۵) ہم نے لکھ دیا ہے، آج نہیں زبور میں بھی لکھ دیا تھا بلکہ اس سے پہلے لوح محفوظ میں ہی لکھ دیا تھا کہ زمین کا اقتدار اللہ کے صالح بندوں کے لیے ہوگا۔ یہ حتمی فیصلے ہیں اللہ تعالیٰ کے۔ اور معاف کیجیے گا اللہ جھوٹ نہیں بولتا، ہم جھوٹ بولتے ہیں، ہمارا ایمان کا دعویٰ جھوٹا ہے۔ ہمارا اسلام کا تصور جھوٹا ہے اور اس سے بدتر بات یہ ہے کہ ہم کفر کے نظام پر عمل کرکے اور اس کی پیروی کرکے یہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں کامیاب ہوجائیں۔ اصول اور منطق کی بات ہے کہ ایسی صورت میں ہمیں کامیابی نہیں مل سکتی۔ دو کشتیوں کا مسافر کبھی ساحل پر نہیں پہنچتا۔ یہ تو وہی مثل ہوئی آدھا تیتر آدھا بٹیر۔۔۔ یا زیادہ سخت لفظوں میں ''دھوبی کا کتا، نہ گھر کا نہ گھاٹ کا''۔ ۱۹۲۴ء میں اتاترک نے اسلامی خلافت کو اور اسلامی طرزِ زندگی کو ختم کرکے یورپ کی اندھی تقلید شروع کی تھی۔ اس بات کو ۸۳ برس گزر چکے ہیں۔ کیا وہ ترقی یافتہ ہوگئے ہیں؟ کیا ترکی عالم اسلام میں آج سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک ہے؟ کوئی بھی اس کا جواب ہاں میں نہیں دے سکتا۔ اس کا سبب کیا ہے؟

آپ تو ماہر تعلیم ہیں۔ دوسروں سے بہتر اس بات کو سمجھ سکتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ جب ہم مغرب کی فکر کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں تو کیونکہ وہ اپنی اصل میں الحادی ہے، غیر اسلامی ہے لہٰذا وہ فکری کشمکش کا سبب بنتی ہے، کنفیوژن پیدا کرتی ہے۔ یہ فکری انتشار ہماری شخصیت سازی میں رکاوٹ بنتا ہے۔ مستحکم شخصیت کے لیے فکری یکسوئی ضروری ہے۔ مغربی فکر کی پیروی کرکے آپ فکری یکسوئی سے محروم ہوجاتے ہیں۔ اس لیے ایک مستحکم شخصیت پیدا ہی نہیں ہوسکتی۔ ہاں اگر آپ مغربی فکر کے مطابق ترقی کرنا چاہتے ہیں تو آپ کرسکتے ہیں بشرطیکہ آپ اسلام کو چھوڑ دیں اور مغرب کے فلسفے پر دل و جان سے عمل کریں تو آپ کامیاب ہوجائیں گے۔ دنیا میں کامیاب ہوجائیں گے، آخرت نہیں ملی گی۔ کیونکہ وہ تو مغرب کے پیش نظر ہے ہی نہیں۔

ہم اگر مغربی فکر اور اسلام کو ملا کر جینے کی کوشش کریں گے تو ہم ذلیل ہوں گے، رسوا ہوں گے، دنیاوی لحاظ سے کمزور ہوجائیں گے کیونکہ اس بازار میں کھوٹا سکہ نہیں چلتا۔ منافقت نہیں چلتی۔ ہاں! کفر چل سکتا ہے بشرطیکہ وہ خالص ہو۔ تو یا تو خالص مسلم بن جایئے یا خالص کافر۔ اسلام کو چھوڑ کر مغرب کو اپنا لیجیے تو آپ کو دنیا ملے گی۔ اسلام کو اپنا لیجیے تو آپ کو دنیا بھی ملے گی اور آخرت بھی۔ لیکن اسلام میں دنیا ملنے کی شرط یہ ہے کہ پورا معاشرہ اسلام پر چلے۔ ایک فرد یا چند افراد نہیں۔

بحیثیت فرد میری اور آپ کی ترجیح کیا ہونی چاہیے؟ آخرت، نہ کہ دنیا لیکن اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ دنیا غیر اہم ہے۔ نہیں! دنیا بھی اہم ہے کیونکہ دنیا کی محنت کے نتیجے میں ہی ہمیں آخرت میں پھل

ملنے والا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دعا کرنا سکھائی: ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ (البقرۃ ۲:۲۰۱) یعنی دنیا پہلے اور آخرت بعد میں۔ لہٰذا جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں دنیا نہیں چاہیے وہ غلط کہتے ہیں۔ دنیا مومن کو مطلوب ہے اس لیے کہ اسے دنیا کی بنیاد پر، اسے دنیا میں بھلائی کی بنیاد پر ہی آخرت میں اللہ کی خوشنودی و کامیابی ملے گی۔ لیکن دنیا میں مطلوب یہ ہے کہ زندگی اللہ کے حکم کے مطابق گزاری جائے۔ سارا معاشرہ اللہ والی زندگی گزارے گا تو دنیا میں کامیاب ہوگا، اکیلا فرد گزارے گا تو کامیاب نہیں ہوگا۔ اگر ایک دفتر میں پچاس آدمی ہوں اور ۴۹ رشوت لیتے ہوں (جیسے ہمارے ہاں پولیس، ریونیو یا پی ڈبلیو ڈی وغیرہ میں ہوتا ہے) اور ایک آدمی کہے کہ میں رشوت نہیں لوں گا تو وہ ایک آدمی دھکے کھائے گا۔ اسے دنیا میں کامیابی نہیں ملے گی لیکن اسے بھی دنیا میں ایک چیز ملے گی وہ ہے اطمینان قلب ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ (الرعد ۱۳: ۲۸) اور یہ دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے جو کروڑوں روپے سے بھی نہیں خریدی جاسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اہل مغرب کو دنیا کی ہر نعمت میسر ہے لیکن وہ اطمینانِ قلب سے محروم ہیں، اور مغرب میں جو لوگ مسلمان ہو رہے ہیں اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ وہاں کی بے دینی، فکری انتشار اور بے مقصد زندگی سے وہ تنگ آئے ہوئے تھے، اسلام قبول کرنے سے انہیں زندگی میں سکونِ قلب مل گیا۔ یہ وہ دولت ہے جو اربوں ڈالر خرچ کرنے سے بھی نہیں ملتی اور ہر انسان کی ضرورت ہوتی ہے۔

تو اگر فرد کامیابی حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ اپنا تزکیہ کرے۔ تزکیہ ہوگا تو کامیابی ملے گی، اور اگر معاشرے کے اکثر افراد کا تزکیہ ہوجائے تو دنیا میں بھی کامیابی ملے گی۔ گویا مسلمان معاشرے کو اگر دنیا میں ترقی کرنا ہے تو اس کا انحصار بھی تزکیے پر ہے۔ تزکیہ کیا ہے؟ تزکیہ یہ ہے کہ شریعت طبیعت بن جائے یعنی اللہ کے حکم پر عمل کرنا سہل ہوجائے، اس کا شوق ہوجائے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: مومن وہ ہے جس کا دل مسجد میں اٹکا رہے، مومن وہ ہے جو اپنی بہترین چیز اللہ کی راہ میں دے، مومن وہ ہے جس کے دل میں شوقِ شہادت جاگ اٹھے۔ مومن وہ ہے جس سے غلطی ہوجائے تو سزا کے لیے خود عدالت میں پہنچ کر اپنی غلطی کا اقرار اور سزا کا مطالبہ کرے۔ مطلب یہ کہ اللہ کی اطاعت کرنا اور دینی زندگی گزارنا مسلمان کے لیے حکم نہ رہے جو اسے مارے باندھے بجالانا ہے بلکہ دل کی رغبت اور طبیعت کا شوق بن جائے، مزاج کا حصہ اور تقاضا بن جائے۔ یہ ہے تزکیۂ نفس۔

تو خلاصہ میری گزارشات کا یہ ہے کہ اسلام میں مقصود یہ ہے، مقصد زندگی یہ ہے کہ آدمی کو جنت ملے، آدمی سے اللہ راضی ہوجائے۔ قرآن نے اس کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ دنیا کی زندگی اللہ کے احکام

کے مطابق گزاروگے تو اللہ راضی ہوجائے گا۔ اگر فرد اپنا تزکیہ کرے، قرآن پر عمل کر کے، سنت پر عمل کرے، تو اسے آخرت میں کامیابی ملے گی، حتماً۔ دنیا میں اسے ایک چیز ملے گی اطمینانِ قلب، حتماً۔ میں نے ان شاء اللہ نہیں کہا حتماً کہا ہے کیونکہ میں اپنی طرف سے بات کر ہی نہیں رہا، میں تو اللہ کا قانون اور اس کی سنت بتا رہا ہوں۔ اگر چہ ہمارا ایمان ہے کہ اس کے حکم کے بغیر اس دنیا میں ایک پتہ بھی نہیں ہلتا، نہیں ہل سکتا۔ اور اس سب کا فارمولا کیا ہے؟ ﴿وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ﴾ (البقرۃ ۲:۱۲۹) تعلیم اور تربیت۔ تعلیم ٹھیک ہو، یعنی قرآن کی ہو، قرآن کے حکم کے مطابق ہو، اس کے خلاف نہ ہو۔ اور تربیت بھی اس کے مطابق ہو۔ انسان اس کے مطابق بدل جائے، انسان کی طبیعت اور مزاج بدل جائے۔ انسان کے لیے اللہ کے حکم پر چلنا سہل ہوجائے۔ اس پر چلنے کا شوق پیدا ہوجائے۔ دیکھیے! ایک صحابی تھے، ان سے زنا سرزد ہوگیا، آئے نبی کریم ﷺ کے پاس۔ سزا کا پتا ہے، رجم یعنی زندہ انسان کو اتنے پتھر مارے جائیں کہ موت واقع ہوجائے، یہ اتنی دہشت ناک سزا ہے کہ آج کل کے جدید اور مغرب زدہ ذہن کے لیے اس کا تصور کرنا محال ہے تو ان صحابی کو سزا کا پتہ ہے۔ وہ گھر بیٹھ سکتے تھے، نہیں بیٹھے آپ ﷺ کے سامنے آ کر انہوں نے اقرار کیا تو آپ ﷺ نے منہ دوسری طرف پھیر لیا، یہ دوسری طرف سے آئے تو آپ ﷺ نے پھر منہ پھیر لیا۔ یہ اس طرف چلے گئے اور کہا یارسول اللہ ﷺ میں پاگل نہیں ہوں۔ صحیح العقل ہوں لیکن میں پاک ہونا چاہتا ہوں۔ اسی طرح ایک خاتون بھی آئی، عورتیں بڑی کمزور ہوتی ہیں، لیکن وہ خود آئی، اپنی مرضی سے آئی، جرم کا اقرار کیا اور کہا جی مجھے سزا دی جائے۔ یعنی لوگوں میں اتنا جذبہ اللہ کی اطاعت کا پیدا ہوجاتا ہے جب ان کا صحیح تزکیہ وتربیت ہوجائے کہ ایسی سزا پانے کے لیے وہ راضی خوشی تیار ہوجاتے ہیں۔ ایسی سزا جو اندوہناک ہے، جس کا تصور بھی ہم نہیں کر سکتے۔ تو اصل مقصود کیا ہے؟ اسلام میں تربیت مطلوب ہے بلکہ تربیت ہی مطلوب ہے اور اس کا ذریعہ ہے تعلیم۔ اس وقت مجھے اس موضوع پر بات نہیں کرنی کہ تعلیم کیسی ہونی چاہیے؟ یہ ایک الگ اور مستقل موضوع ہے جس پر پھر کسی وقت بات ہوگی، ان شاء اللہ۔ اس وقت بات یہ ہورہی ہے کہ ہمیں تعلیم ہی نہیں تربیت بھی مطلوب ہے، تعلیم سے بھی تربیت ہی مقصود ہے اور صرف تربیت نہیں، اسلامی تربیت یعنی ہمیں اپنے طلبہ کو اچھی ملازمت کے لیے صرف دنیاوی علوم اور مہارتوں کی تعلیم ہی نہیں دینا، انہیں دنیا کے آداب ہی نہیں سکھانے بلکہ جو اصل مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ اس تعلیم وتربیت کے نتیجے میں آپ ایک ایسا انسان، ایسا مسلمان معاشرے کو تیار کر کے دیں جو اپنی زندگی اللہ کے احکام کے مطابق گزارے تاکہ اس کا اللہ اس سے راضی ہوجائے تاکہ اس کی دنیا بھی سنور جائے اور آخرت کی کامیابی بھی اس کا مقدر بنے۔ یہ ہے اسلام کا نظام تربیت اور یہ ہے اس کی فکری بنیاد۔

پروفیسر ارشد جاوید

پاکستان کی ترقی میں تعلیم کا کردار

پروفیسر ارشد جاوید صاحب، جو پاکستان کے معروف ماہر نفسیات ہیں، ان کا یہ مضمون دلچسپ بھی ہے اور مفید بھی۔ ان کے مؤقف کا لب لباب یہ ہے کہ تعلیم بغیر اخلاقی تربیت کے بیکار بلکہ وبال جان ہے اور ہمارے بہت سے مسائل کا منبع بھی، لہٰذا صحیح تعلیم صرف وہ ہے جو اخلاقی تربیت بھی کرے اور اچھے مسلمان، اچھے انسان اور اچھے پاکستانی تیار کرے۔ امین

گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ نے انسانی خدمات کے حوالے سے انہیں دنیا کا عظیم انسان قرار دیا ہے۔ یہ بچہ انڈیا میں پیدا ہوا۔ بچپن میں اسے سکول بھیجا گیا مگر اس کا دل پڑھائی میں نہ لگتا تھا، جس کی وجہ سے اس نے چوتھی کلاس میں مدرسہ چھوڑ دیا۔ وہ کچھ کر دکھانا چاہتا تھا۔ پڑھائی چھوڑ کر اس نے ایک دکان پر ''چھوٹے'' کے طور پر ۵ روپے ماہوار پر ملازمت کر لی۔ یہ بڑی محنت سے دکان پر جھاڑو دیتا اور صفائی کرتا۔ تاہم وہ جلد ملازمت سے اکتا گیا اور دوبارہ سکول جانے لگا۔ مزید دو سال سکول میں پڑھا، مگر اسے تعلیم میں دلچسپی نہ تھی، چنانچہ ۱۳ سال کی عمر میں اس نے تعلیم کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا۔

تقسیم ہند کے بعد اس کا خاندان بھی ہجرت کر کے پاکستان آ گیا۔ یہ پندرہ سالہ بچہ غریبوں کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ یہ اونچے خواب دیکھتا۔ اس نے خواب دیکھا کہ وہ غریبوں کے لیے ہسپتال بنائے گا، غریبوں کی ٹریننگ اور ملازمت کے لیے ایک فیکٹری بنائے گا، معذور لوگوں کے لیے ایک گاؤں بسائے گا۔

ان تمام منصوبوں کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی، چنانچہ اس نے اپنے شہر میں کام شروع کیا۔ یہ بچہ ہول سیل میں پنسلیں، ماچسیں اور دستی تولیے خریدتا۔ پنسلوں اور ماچسوں کو ایک ٹرے میں سجاتا اور تولیوں کو کندھے پر رکھتا اور شہر کے مصروف بازاروں میں چل پھر کر یہ چیزیں فروخت کرتا۔ اس طرح جب اس نے کچھ پیسے جمع کر لیے تو اس نے ایک ریڑھی کرائے پر لی، اس پر موبائل پان شاپ بنائی اور گھوم پھر کر پان فروخت کرنے لگا۔

اس دوران میں اس نے کچھ رقم جمع کر لی جو دو ہزار تین سو روپے تھی۔ اس رقم سے اس نے ایک چھوٹی سی دکان خریدی اور اپنی ذاتی ڈسپنسری کا آغاز کیا۔ اس ڈسپنسری سے لوگوں کو کم قیمت پر ادویات اور علاج و معالجہ کی سہولت مہیا کی جاتی۔ ڈسپنسری ۲۴ گھنٹے کھلی رہتی۔ اسے اپنے کام سے عشق تھا۔ وہ ساری رات دکان پر موجود رہتا۔ جب مریض نہ آتے تو وہ ڈسپنسری کے باہر سیمنٹ کے بینچ پر سو جاتا۔ دن بھر کی مشقت کی وجہ سے اسے پتھر پر بھی گہری نیند آتی۔ بعد ازاں اس نے ایک پرانی وین خریدی، اسے رنگ

روغن کر کے اپنی پہلی ایمبولینس سروس شروع کی، جسے اس نے ’’غریب وین‘‘ کا نام دیا۔ اب عبدالستار ایدھی نہ صرف دنیا کی سب سے بڑی ایمبولینس سروس بلکہ بہت سے رفاہی ادارے چلا رہے ہیں۔

دنیا بھر میں اس چیز پر زور دیا جاتا ہے کہ بچہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر لے اور اس میں زیادہ سے زیادہ نمبر حاصل کرے۔ حالانکہ صرف اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ گریڈ کبھی بھی کامیابی اور ترقی کی ضمانت نہیں ہوتے۔ ہارورڈ یونیورسٹی کی ایک ریسرچ کے مطابق کامیابی اور ترقی میں اعلیٰ تعلیم کا کردار صرف ۱۵ فیصد ہے۔

کامیاب، خوشحال اور دولت مند لوگ صرف اپنی تعلیم کی وجہ سے کامیاب اور خوشحال نہیں ہوتے۔ دنیا کے امیر ترین فرد بل گیٹس گریجوایٹ نہیں۔ اکثر کروڑ پتی اور کامیاب لوگ اوسط درجے کی تعلیم اور ذہانت کے مالک ہوتے ہیں۔ پاکستان کے میاں شریف میٹرک پاس تھے۔ وفات کے وقت وہ کم از کم ۳۰ ملوں اور بڑے اداروں کے مالک تھے۔ ان کا ایک بیٹا (شہباز شریف) پاکستان کے سب سے بڑے صوبے پنجاب کا تین بار وزیر اعلیٰ بنا، دوسرا بیٹا (نواز شریف) دوبار پاکستان کا وزیر اعظم منتخب ہوا۔ اسی طرح چوہدری شجاعت حسین کے والد چوہدری ظہور الٰہی معمولی تعلیم یافتہ اور پولیس سپاہی تھے۔ شہادت کے وقت وہ کئی ملوں کے مالک تھے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے کبھی کسی یونیورسٹی کی شکل نہ دیکھی اور نہ ہی کسی دینی مدرسے سے باقاعدہ تعلیم حاصل کی مگر انہیں بیسویں صدی کے ان چند مفکرین میں شمار کیا گیا ہے جنہوں نے دنیا کو متاثر کیا۔ ان کی کتب ہر اسلامی ملک میں پڑھائی جاتی ہیں۔ ان کی بعض کتب یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہیں۔ اسی طرح ان کی بعض کتب کے دنیا کی ۷۶ مختلف زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں۔ اسی طرح وارث شاہ ایم۔اے پنجابی نہ تھے مگر ان کو پڑھے بغیر ایم۔اے پنجابی کی ڈگری نہیں ملتی۔

اگرچہ اعلیٰ تعلیم، خوشحالی، کامیابی اور ترقی کی ضمانت نہیں مگر اس کی مدد سے کامیابی اور ترقی کا سالوں کا سفر مہینوں میں طے کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اعلیٰ تعلیم کا کامیابی اور ترقی میں کردار بہت اہم ہے۔ کوئی بھی قوم سائنس دانوں اور ماہرین (Experts) کے بغیر ترقی نہیں کر سکتی اور یہ صرف اعلیٰ تعلیم سے حاصل ہوتے ہیں۔

پاکستان کی ترقی اور خوشحالی کے لیے تعلیم کے حوالے سے دو معروف نکتہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں۔ عام خیال ہے کہ اگر پاکستان میں تعلیم عام ہو جائے تو ملک ترقی کرے گا اور خوشحال ہو جائے گا۔ یہ بات صرف ایک حد تک درست ہے کیونکہ صرف تعلیم ترقی اور خوشحالی کی ضمانت نہیں۔ سری لنکا نے اس نظریہ کو غلط ثابت کر دیا۔ سری لنکا میں شرح تعلیم تقریباً ۹۸ فیصد ہے جبکہ سری لنکا کا شمار دنیا کے غریب ممالک میں ہوتا ہے۔ دوسرا نظریہ محسن پاکستان جناب ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا ہے۔ ان کا

خیال ہے کہ پاکستان صرف اس صورت میں ترقی کرسکتا ہے کہ یہاں ٹیکنیکل تعلیم عام ہو۔ یہ نظریہ بہت حد تک درست ہے مگر بدقسمتی سے ۱۰۰ فیصد درست نہیں۔ کسی دوسرے ملک میں تو یہ تصور درست ہوسکتا ہے مگر پاکستان میں نہیں۔ ایٹم بم اور میزائل ہم بنارہے ہیں جبکہ ترقی ملائشیا، ترکی اور ایران کررہے ہیں۔ دراصل پاکستانی قوم میں شرح تعلیم سو فیصد ہوجائے اور ہر پاکستان ٹیکنیکل تعلیم میں پی ایچ ڈی ہو اور یہاں ہرروز ایجادات ہوں تو بھی پاکستان ترقی کرے گا اور نہ ہی خوشحال ہوگا کیونکہ بدقسمتی سے بحیثیت قوم ہم کرپٹ ہیں۔ ہمارے ہاں تقریباً ۹۸ فیصد لوگ جھوٹے اور بددیانت ہیں، جبکہ سچائی، اور ایمانداری کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی، لہٰذا ہمارے ہاں اصل مسئلہ تعلیم کا نہیں بلکہ تربیت کا ہے۔ اگر قوم سچی، ایماندار اور باکردار ہوگی تو کم شرح تعلیم سے بھی ملک ترقی کرے گا۔

قوموں کی ترقی افراد کی ترقی کے ساتھ منسلک ہوتی ہے افراد ترقی کریں گے تو قوم ترقی کرے گی۔ کامیابی اور ترقی کے چند اصول ہیں اور ہر کامیاب فرد شعوری طور پر ان اصولوں پر عمل کرتا ہے۔ اگر کوئی فرد ان اصولوں سے آگاہ ہوجائے تو اس کی کامیابی کا سفر آسان ہوجاتا ہے۔ چنانچہ کامیابی اور ترقی کے لیے ضروری ہے کہ طلبہ کو اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ کامیابی کے بنیادی اصولوں سے بھی آگاہ کیا جائے اور ان میں کامیاب لوگوں کی خوبیاں بھی پیدا کی جائیں۔

پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے۔ ہر مسلمان کا مقصد حیات اس دنیا اور آخرت کی کامیابی ہے۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر طالب علم اعلیٰ تعلیمی ڈگری حاصل کرنے کے ساتھ محبِّ وطن پاکستانی، ایک سچا مسلمان اور کامیاب انسان بنے۔

اس ضرورت کے پیش نظر ہم نے تعلیم کا ایک خاص نظام تیار کیا ہے جس کا مقصد قرآن وسنت کی روشنی میں بچوں کی اس طرح تعلیم وتربیت کرنا ہے کہ وہ بہترین طالب علم، اچھے پاکستانی، سچے مسلمان اور کامیاب انسان بنیں، یعنی وہ زندگی کے ہر شعبہ میں کمال حاصل کریں اور انسانیت کے لیے نافع ہوں۔ اس مقصد کے لیے ہم نے کلاس پریپ سے دہم تک کلاس وار سلیبس تیار کیا ہے جس میں تعلیم کے ساتھ تربیت کا خصوصی انتظام کیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے ہم نے چھ کتب تیار کی ہیں۔ اس سسٹم سے موجودہ نظام تعلیم میں کوئی تبدیلی لائے بغیر فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے روزانہ یا ہفتہ وار صرف ۳۰ منٹ درکار ہوں گے۔ تعلیمی کارکردگی کو شاندار بنانے اور فرد میں جلد تبدیلی لانے کے لیے نفسیات کے دو جدید طریقے شخصی ہپناٹزم اور NLP استعمال کیے جائیں گے۔ اس خاص نظام تعلیم کی مدد سے پاکستان میں ۱۰، ۱۵ سال میں انقلابی تبدیلیاں لائی جاسکتی ہیں۔ مزید معلومات کے لیے مجھ سے اس نمبر ۰۳۰۰-۹۴۸۴۶۵۵ پر صبح ۱۰ بجے سے ایک بجے تک رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

دوسرا لیکچر

احمد جاوید

مغربی تہذیب کی فکری بنیادیں (۲)

یونانی و رومن اثرات

ہم لوگ ایک بڑے مقصد کو حاصل کرنے کی کچھ جزوی کوششوں میں شرکت کر رہے ہیں۔ وہ بڑا مقصد یہ ہے کہ کسی بھی تہذیب کو اپنی فنا کے جتنے آثار پیش آ سکتے ہیں وہ ہمیں آج درپیش ہیں۔ جن آثار کے ظاہر ہونے کے بعد تہذیبیں صفحۂ ہستی سے محو ہو جایا کرتی ہیں ان آثار کا اپنی تہذیب کے لیے ہمیں اپنے ابتدائی درجے میں سامنا ہے۔ پہلے کی دنیا میں یا یوں کہہ لیں کہ مغربی معیارات تہذیب کے تسلط سے پہلے کی دنیا میں تہذیبوں کو درپیش چیلنجز مقامی ہوتے تھے، جزوی ہوتے تھے اور کبھی اندر سے اور کہیں باہر سے ہوا کرتے تھے۔ کیونکہ ہم یہاں یہ مشق کرنے کے لیے بھی بیٹھے ہیں کہ موجودہ طرزِ علم کو آج کل کی بامعنی اصطلاحوں میں بیان کرنے اور سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو لہٰذا اس بات کو اس انداز میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ پہلے تہذیبیں ایک thesis کی حیثیت رکھتی تھیں اور ان کا anti-thesis محدود نوعیت کا ہوتا تھا۔ مطلب یہ کہ ایک تہذیب کے لیے کوئی دوسری تہذیب جو محدود جغرافیہ، محدود تاریخ اور محدود وسعت رکھتی تھی وہ کامیاب یا ناکام چیلنج بنا کرتی تھی لیکن مغرب کے غلبہ پا لینے کے بعد سے اب تھیسز تو کئی ہو سکتے ہیں لیکن اینٹی تھیسز واحد اور گلوبل ہے یعنی مغربی تہذیب۔ اِس وقت انسان کے نظام اقدار کو، اس کے نفسیاتی سٹرکچرز کو اور اس کے مادۂ وجود کو اگر کوئی واحد ہمہ گیر چیلنج درپیش ہے تو وہ مغرب ہے یعنی ہر تہذیب اپنی فنا اور بقا کے جتنے مراحل طے کر سکتی ہے وہ تمام مراحل مغرب generate کر رہا ہے۔ یہ صورتحال تاریخ انسانی میں آدمیوں کو کبھی پیش نہیں آئی جس کا ہمیں سامنا ہے اور اس وقت ساری دنیا سے بڑھ کر امت مسلمہ کو ان گلوبل اینٹی تھیسز کا براہِ راست سامنا ہے کیونکہ بقیہ تہذیبیں خود کو اس میں ضم کرنا قبول کر چکی ہیں یہ صرف مسلم تہذیب ہے جو اس تہذیب میں نہ صرف یہ کہ مدغم ہونے سے انکار کر رہی ہے بلکہ اس کے لیے جوابی چیلنج بننے کی تیاری میں بھی ہے لیکن پریشانی یا جذبۂ عمل جگانے والے محرک کی حیثیت رکھنے والی بات یہ ہے کہ ہماری تہذیب کی اندرونی استعداد یعنی ہماری تہذیب کے societal Stage اور Psychic Structure اتنے مضبوط نہیں ہیں جو اس آندھی کا سامنا کر سکیں۔

اس درپیش انتہائی غیر معمولی چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہماری موجودہ تیاریاں مضحکہ خیز

حد تک ناکافی ہیں اور اس کے لیے گویا ہمیں نئے سرے سے اپنے تمام اداروں کو restructure کرنا پڑے گا۔ اس پر چند جملے کہہ کے پھر میں مغرب کے تجزیے کی طرف آؤں گا۔ ہماری مذہبیت اپنے مادۂ اخلاق، اپنے حد علم اور اپنے معیارِ عمل میں ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ اس بڑی زمین پر رسول اللہ ﷺ کے دین کی بنیاد رکھی جائے۔ لبرل علوم میں ہماری قابلیت ہرگز اس لائق نہیں ہے کہ اس عینک کو آنکھوں پر چڑھا کر دنیا کو کھنگالنے اور دیکھنے کی کاوش کی جائے۔ ہمارا human substance ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ مغرب کی بنائی ہوئی جھوٹی انسانی اقدار کی چمک دمک کا سامنا کر سکے۔ غرض یہ کہ انسانی زندگی کو انسانی انفرادیت اور انسانی اجتماعیت تشکیل دینے کے لیے جو جو صلاحیتیں درکار ہوتی ہیں ہم ان میں سے اپنی کسی ایک صلاحیت پر بھی تکیہ کر کے مغرب سے پنجہ کشی کا ارادہ نہیں کر سکتے اور اس سیلاب باد و باراں سے بچانے والا سائبان اپنے اوپر نہیں تان سکتے کہ اس کے لیے ہمیں نئے سرے سے اپنے آپ کو اپنے دین کے جوہر سے دوبارہ موجود ہو کر دکھانا ہوگا۔ اس کے علاوہ ہماری بقاء کی کوئی اور صورت نہیں ہے۔

ہم یہ آخر میں دیکھیں گے کہ ہمارے دین کا وہ جوہر کیا ہے جو گویا ہمیں خلقت ثانی کے عمل سے گزارنے کی اب بھی واحد ضمانت ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ لیکن اس سے پہلے ڈاکٹر امین صاحب نے میرے ذمے جو ذمہ داری لگائی ہے وہ یہ کہ ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ مغرب میں پوری دنیا کے لیے بیک وقت خطرہ اور معیار بننے کی یہ جو قوت پیدا ہوئی ہے اس کا ماضی، اس کے اسباب اور وجوہات کیا ہیں؟ یعنی مغرب نے خود کو ایک ایسی طاقت میں convert کیسے کر لیا ہے کہ اب انسان اور دنیا کا جو بھی مجسمہ بنایا جائے گا وہ اسی کے گارے سے بنایا جائے گا، اسی کی چھلنی سے چھیلا جائے گا اور اور اسی کے رنگ سے رنگین کیا جائے گا۔ اس کے لیے ہم نے پچھلی مرتبہ دیکھا تھا کہ مغرب کے دو پاؤں ہیں۔ پاؤں سے مراد یہ ہے کہ پاؤں مجسمے میں پہلے بنتے ہیں اور سر آخر میں جا کر بنتا ہے۔ مغرب کے عناصر تشکیل میں بلحاظ ترتیب و تاریخ دو عناصر کو تقدم اور اولیت حاصل ہے۔ ایک Hellenization اور دوسرے Romanization یعنی مغرب میں تمدن بننے کی یہ دو بنیادیں ہیں یا یوں کہیے کہ مغرب تمدن بننے کے لائق ان دو بنیادوں پر استوار ہو کر ہوا۔ لیکن فی الحال اس کی تاریخی تفصیل سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم اس کے اصول کے بیان کی حد تک محدود رہتے ہوئے کوشش کریں گے کہ جلدی سے مغربِ جدید تک پہنچ جائیں۔

مغرب نے اپنی تہذیب کے لیے دماغ یونانیت سے اخذ کیا گو کہ اس بات میں ذرا سی ٹیڑھ

ہے۔اور وہ ٹیڑھ یہ ہے کہ یونانی عنصر رومن ازم سے قدیم تر ہے لیکن مغرب میں رومنائزیشن Christianity سے پہلے ہوئی اور Hellenization بعد میں ہوئی۔لیکن ہم اس تاریخی تقدیم و تاخیر میں پڑے بغیر ان کے اصول بیان کرتے ہیں۔اصول برسرعمل آنے کے بعد یہ دیکھنا شاید زیادہ مفید نہیں ہوتا کہ کونسا اصول پہلے اخذ کیا گیا تھا اور موجودہ مغرب میں یہ دونوں اصول صَرف ہوئے ہیں۔اب اس سے زیادہ فرق نہیں پڑتا کہ کس اصول کو انہوں نے پہلے اور کسے بعد میں اختیار کیا۔

Hellenization کہتے ہیں یونانی فکر کا یونان کی حدیں پھلانگ کر اٹلی اور ترکی وغیرہ کے مغرب میں معیارِعلم اور مدارِنظریہ سازی بن جانا یعنی یونانی ورلڈ ویو کا خود یونان کے حدود کو پھلانگ جانا اس کو کہتے ہیں Hellenization اور Hellenization کا عمل یونانیوں کے ہاتھ سے انجام نہیں پایا بلکہ اطالویوں، رومیوں اور اسی طرح کی غیر یونانی اقوام کے ہاتھوں ہوا حتی کہ اس میں مصری بھی شریک تھے۔یہ نہ صرف ان لوگوں کے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچا بلکہ اس کا آغاز بھی انہی اقوام سے ہوا۔Greek Rationale مذہبی تمدن کا تا حال دماغ ہے۔(جب ہم آگے بڑھیں گے تو یہ بات زیادہ واضح ہوکر سامنے آئے گی)۔تہذیب کو دماغ کے ساتھ دوسری جو چیز درکار ہوتی ہے وہ ہے power۔یعنی دماغ اور طاقت یہ تہذیب کے لازمی عناصر ہیں۔یہ تہذیب کے دو لازمی ستون ہیں۔ان دونوں ستونوں کو ایستادہ کیے بغیر تہذیب کی عمارت کو کھڑا نہیں کیا جا سکتا۔مغرب نے اپنی دماغی صلاحیت یونانیت سے حاصل کی اور اپنی پاور کی ضرورت رومنائزیشن سے پوری کی۔

یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ رومن پاور اور یونانی علمیت (episteme) یعنی یونانیوں کا بنایا ہوا دماغ اور رومیوں کا بنایا ہوا جسم یہ مغربی تہذیب کے دو بنیادی ستون ہیں۔ان کی کارفرمائی کے تمام مظاہر ہم مغربِ جدید میں آگے چل کر دیکھیں گے ابھی ہم صرف ان کے اصولِ بعیدہ کی یوں سمجھیں ایک فہرست بنا رہے ہیں۔یونانی ذہن کو اگر ایک فقرے میں بیان کرنا ہو یعنی اہل یونان کی عقلی اور علمی روایت میں کارفرما بے شمار اختلافات کے علی الرغم اگر کوئی اسے ایک فقرے میں بیان کرنا چاہے تو وہ فقرہ میں عرض کرنے کی کوشش کرتا ہوں ـــ اس میں اہل یونان منفرد ہیں اور اس میں ان کا کوئی شریک نہیں ہے، کوئی پرانی روایت بھی ان کی شریک نہیں ہے ـــ وہ یہ ہے کہ وحی کی عدم موجودگی سے پیدا ہونے والے مابعد الطبیعی (Metaphysical) خلا کو عقل سے کیسے پُر کیا جائے؟ اس کا پوری تاریخ انسانی میں اگر کوئی ایک ماڈل موجود ہے تو وہ یونانی ماڈل ہے یعنی وحی بطور مابعد الطبیعی علم اگر کسی تہذیب کے اصل منبع میں سے غائب ہو تو وہ تہذیب اپنی metaphysics کو

rationalise کر کے کس طرح پورا کرنے کی کاوشیں کرتی ہے؟ اس پورے عمل کو آپ سمجھ نہیں سکیں گے اگر یونانی روایت کو نظر میں نہیں لائیں گے۔ عقل کی metaphysicality کو اپنی بنیاد بنا کر ایک cosmic order کی تشکیل دینا یہ یونانی فکر کا مقصودِ اعظم رہا ہے۔ کوئی بھی عقل جب کوئی بھی cosmic order تشکیل دے گی ـــ cosmic order کا مطلب یہ ہے کہ تخلیق کی حقیقت، تخلیق کی غایت اور تخلیق کے mechanics جب یہ سب ایک دائرے میں پہنچ کر define ہو جائیں تو اسے کہتے ہیں cosmic order یعنی کائنات اپنی اصل میں کیا ہے؟ کائنات میرے شعور میں کیا ہے اور کائنات کا وجود اپنے mechanics میں کیا ہے؟ کائنات اپنی physicality میں کیا ہے؟ کائنات اپنی knowability میں کیا ہے؟ کائنات اپنے Essence اور اپنی reality میں کیا ہے؟ ان سب سوالوں کا جواب اگر سمجھ میں آ گیا تو اس کو cosmic order کہیں گے ـــ یونانی فکر کا مقصودِ اعظم اس cosmic order کی تشکیل تھا، وحی کی لازمی رہنمائی سے محرومی کی حالت میں۔ ایک بات یاد رکھیے گا کہ وحی کے نہ ہونے سے شعور کو جو پیاس لگی تھی اسے یونانی ذہن نے عقل کے چشمے سے سیراب کرنے کی کوشش کی ہے یہی ان کا سب سے بڑا امتیاز ہے اور یہی مغربی ذہن کا تا حال سب سے بڑا جوہر ہے۔

اب جست کر کے میں ایک دوسرے مرحلے کو بیان کرتا ہوں کہ جیسے ہندو روایت کے بارے میں آپ جانتے ہیں کہ ان کا مسئلہ تھا reality of knowing یعنی ہندو ذہن act of knowing کا نام تھا۔ اسی منہج پر یونانی ذہن act of being کو حقیقت کا لازمی وصف سمجھتا تھا۔ ہندوؤں کے لیے حقیقت act of knowing کا حاصل تھی، یونانیوں کے لیے حقیقت act of being کا محرک ہے۔ یونانی پیراڈائم (Paradigm) وجود (یعنی being) تھا یعنی یونانی فکر کا محور مسئلہ وجود تھا جب کہ ہندو فکر کا محور مسئلہ علم تھا۔ یونانی فکر کی اس خصوصیت کو واضح کرنے کے لیے ہمیں ہندو روایت کا یہاں ذکر کرنا پڑا۔

یونانی فکر میں سقراط اور افلاطون کو اگر تھوڑی دیر کے لیے الگ رکھا جائے تو وجود اپنی حقیقت اور ماہیت میں انسانی نہیں تھا کائناتی تھا یعنی وجود کو define کرنے کے لیے کائنات کے definer کی ضرورت تھی، شعور کو definer نہیں بنایا جاتا تھا، انسان کو معیار نہیں بنایا جاتا تھا۔ وجود کیا ہے؟ کے سوال کو حل کرنے کی پچاس زاویوں سے بھی کوشش کی جائے تو کہیں بھی انسان کو معیار نہیں بنایا جاتا تھا۔ یونانی ذہن میں سے اگر آپ سقراط کو الگ کر دیں کیونکہ سقراط philosopher of

being نہیں تھا وہ ایک الگ روایت ہے، تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ یونانیوں کا تصورِ وجود آفاقی، کونی اور کائناتی تھا یعنی یونانیوں کے نزدیک being ایک آرڈر تھا کوئی ذات نہیں تھی۔ وحی کے خلا سے یہ انہیں جھیلنا پڑا کہ وہ حقیقت کو ذات تک پہنچانے سے قاصر رہے اور کائنات کو مادۂ وجود اور منتہائے وجود مان لینے کی مجبوریوں میں اسیر رہے۔ اس وجہ سے انہوں نے کائنات کے ساتھ اپنے شعور کی تمام فطری طلب جو مابعد الطبیعیات کے حصول کیلئے درکار تھی صَرف کردی۔۔ یہ میں آپ کو مغرب کا جوہر بتا رہا ہوں مغربِ جدید کا، کہ انہوں نے شعور کے داعیۂ مابعد الطبیعیت کو جو فطرتِ شعور ہے، شعور sense of metaphysicality سے ایک لمحے کے لیے جدا ہونے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ شعور کی اس urge of metaphysicality کو وحی کی رہنمائی مہیا نہ ہونے کی وجہ سے عقل کی انگلی تھام کر چلنے کی مجبوری کی وجہ سے انہوں نے حقیقت کا سارا اسٹرکچر کائنات کی شبیہ پر فرض کر لیا وہ اس کو اس کے self hood تک پہنچنے اور دیکھنے سے قاصر رہے کیونکہ حقیقت کا اور حقیقت الحقائق کا ذات ہونا یہ عقل جن جن logicizations سے مانوس ہے ان میں سے کسی ایک کے بس کی بات بھی نہیں ہے۔ یعنی حقیقت الحقائق کو متحرک بالارادہ، متصدق بالعلم ذات کی حیثیت دے دینا عقل کے پورے منطقی مزاج سے ماورا چیز ہے۔ یہ مَیں نہیں کہہ رہا کہ خلاف ہے لیکن یہ استعداد کہ حقیقت کو ذات میں متشخص کیا جائے وحی کے علاوہ کوئی راستہ ہے ہی نہیں۔ اسی وجہ سے انہوں نے ذاتِ خالق کے اوصاف کائناتی structure of being میں صَرف ہوتے ہوئے دیکھے کبھی فارم کی شکل میں، کبھی pythagorean numbers کی شکل میں، کبھی ارسطو کے Prime Mover کی صورت میں جو ذات بنتے بنتے رہ گیا۔ Prime Mover ایک activity ہے کوئی actor نہیں ہے۔ اس غلط فہمی میں نہ رہیے کہ ارسطو کا Prime Mover کوئی ذات ہے۔ ارسطو کا Prime Mover ایک Elementary Reality ہے۔

اب آپ نے یونانی ذہن کا یہ المیہ دیکھا کہ انہوں نے تمام Essence of Metaphysicality کو مادی کائنات میں صَرف کرنے کی کوتاہی مجبوراً کی، جیسے ہمارے شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کا عارفانہ قول ہے۔ کاش ہماری مذہبیات میں یہ چیزیں بھی پڑھائی جاتیں —— کہ یونانیوں سے کیا سند لانی وہ تو وجود سے آگے ہی نہیں بڑھتے۔ اس جملے کے معانی ہماری روایت کی تائید میں اتنے ضرور ہیں کہ آج ہماری دستگیری کرسکیں، آج ہمارے ذہنی افلاس کو ختم کرسکیں لیکن اس کے معانی پھر دیکھیں گے۔

مغربی ذہن میں شعور کے مابعد الطبیعی مقتضیٰ کو عالم طبیعی میں ترک کر دینے کا جو رجحان آج تک غالب نظر آتا ہے ان کے فلسفوں میں اور ان کے طبیعاتی علوم میں وہ اس یونانی بیج سے پھوٹنے والا درخت ہے۔ اب آپ سمجھے کہ لنک کتنا ڈائریکٹ ہے کہ جدید فزکس میٹافزیکل claims سے لٹکی ہوئی ہے اور ان سے بھرے ہوئے محسوس علوم کا مجموعہ ہے یعنی جدید فزکس کے سارے claims میٹافزیکل jugdement، میٹافزیکل certainty، میٹافزیکل bindingness اور میٹافزیکل wholeness پر مبنی ہیں۔ یہ جو مزاج پیدا ہوا ہے اس کی اصل، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، یونانی فکر میں کارفرما ہے۔

دوسرے یہ کہ مغربی تہذیب کو پاور اور مزاج قوت یعنی تہذیب کو powerfulness کا مزاج اور پاور کا تصور یہ سارے کا سارا رومنائزیشن سے حاصل ہوا ہے۔ ان کے تصور قوت کو سمجھنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ رومن تہذیب کے اصول قوت کو دیکھیے، اس کے استعمال قوت کو دیکھیے، اس کے مصارفِ قوت کو دیکھیے اور اس کی مذہبیتِ قوت کو دیکھیے کہ وہ کیا ہے؟ رومن تہذیب کا مزاج قوت اور نظریۂ طاقت کیا ہے؟

یہ ''ہے غلبہ فائدے کے لیے حاصل کرنا نظریے کے لیے نہیں''۔ یہ ہے رومن Essence of Power کہ طاقت فائدہ حاصل کرنے کا ذریعہ ہے کسی نظریے کو پھیلانے اور نافذ کرنے کا ذریعہ نہیں ہے۔ فائدہ مستقل ہے، فائدے کی تعریف بدل نہیں سکتی جبکہ نظریے کی تعریف آج کچھ ہے، کل کچھ اور ہے۔ رومن تہذیب کا یہی تصورِ قوت کہ مجھے اپنے فائدے کے لیے اقتدار اور طاقت چاہیے، مجھے مقتول کو قتل کرنے سے زیادہ اس کو نچوڑ دینے سے دلچسپی ہو گی۔ یہی مغربی قوت کا خاصہ ہے۔ یہ تباہی نہیں چاہتی، اپنے مقاتل کو منہدم نہیں کرنا چاہتی، یہ اپنے مفتوح کو گائے کی طرح رکھنا چاہتی ہے اور اسے دودھ دینے کے لیے انجکشن دے دے کر دودھ کی پیدائش میں اضافہ کرنا چاہتی ہے۔ رومیوں کے سسرو (Cicero) کا، اگر کسی نے پڑھنا ہو تو سسرو کے خطوط ضرور پڑھے، وہ رومن تہذیب کے سب سے بڑے نمائندوں میں سے ایک ہے اور ایک فلسفی بادشاہ تھا، اس کا ایک خط ہے اس بارے میں کہ غلاموں کے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے؟ رومنوں کا جہانِ قوت دو بنیادوں پر کھڑا ہوا ہے: آقا اور غلام۔ اس کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ غلام کو غلطی پر سزا نہ دو جرمانہ عائد کرو۔ اس قول کے مزاج میں ذرا سا غور کریں تو آپ پر ان کا پورا مزاجِ قوت واضح ہو جائے گا۔ اسی وجہ سے رومنوں نے نسل کشی نہیں کی انہوں نے تاجرانہ فتوحات کی ہیں۔ تو یہ دوسرا مزاج قوت ہے۔

میں نے یہ جو دو باتیں عرض کی ہیں یہ مکمل اصول ہیں، یہ ستون ہیں تہذیب کے۔ اب ان

اصولوں کے ساتھ وابستگی، ان پر استواری اور اس استواری کے نتیجے میں حاصل ہونے والی بہت اہم لیکن ثانوی تفصیلات بہت سی ہیں جیسے ارسطو کا یونانی ذہن کو تبدیل کر دینے والا یہ نظریہ مغرب کی میراثِ تمدن ہے کہ Forms شے سے ماورا نہیں ہوتیں شے میں ہوتی ہیں۔ آپ سمجھے کہ اس سے کتنا بڑا فرق پڑا ہے۔ اس کا استاد کہتا تھا کہ Forms، Ideas، عیان یا حقائق یہ صورت اور شے سے ماورا ہوتے ہیں ان کا عالم اور سکیل ہی الگ ہے۔ شاگرد رشید نے آ کر کہا کہ کوئی عالم والم نہیں ہے، یہ جو Forms میں، یہ جو حقائق ہیں یہ شے ہی کی properties ہیں۔ اس سے پورا جہانِ فکر بدل گیا۔ ارسطو کی عظیم الشان شخصیت، اس کی منطق اور empericism میں اس کی unparalleled قابلیت نے اُس کے اِس تصور میں اپنی قوت مجتمع کر کے پورے Greek Episteme کو بدل ڈالا اور یہ ہے موجودہ مغربی Episteme کا سقم کہ Forms کی حقیقت شے سے باہر نہیں ہے شے ہی میں ہے۔ پوری مغربی علمی کائنات اپنے تمام disciplines میں اس بات پر متفق ہے اور اس امر کی طرف یکسو ہے کہ مجھے حقیقت کو شے کے تجزیے کے نتیجے میں حاصل کرنا ہے شے پر کسی اور چینل سے impose نہیں کرنا۔ مجھے شے جو دعوت دے گی سمجھنے کی اسے اسی طرح سمجھنا ہے، مجھے شے کو کوئی نظریاتی معلومیت کی بیڑی نہیں پہنانی۔ یہ مغربی Episteme کا اسم اعظم ہے۔ ان کی فزکس ہو، ان کا فلسفہ ہو، ان کا ادب ہو، ان کا پورا مزاجِ علم ہو، ان کا پورا مادۂ دانش ہو وہ اسی بنیادی تصور (Mother Concept) پر کھڑا ہوا ہے۔ اسی ماں کی اولاد ہے۔

Hellenization اور Romanization سے ذہن اور قوت کا ایک نیا امتزاج پیدا ہوا۔ قوت فائدے کے لیے چاہیے، اب علم بھی فائدے کے لیے درکار ہے۔ یہ وہ نقطۂ اتصال ہے مبنی بر مفاد جو جا کر مغرب کے شجرۂ نسب کے مورث اعلیٰ کی پیدائش کا سبب بنا، جو کیپٹل ازم (Capitalism) ہے۔ کیپٹل ازم علم کی پرستش اور طاقت کی پرداخت کا سب سے بڑا سرچشمہ ثابت ہوا اور جس کی غایتِ علم اور جس کا منتہائے قوت صرف فائدہ تھا اور اس میں ایسے ایسے لطیفے ہیں جو میرے استاد کے استاد محمد حسن عسکری صاحب نے اپنی کتاب میں لکھے ہیں اور اس کے علاوہ بھی جان رائٹ کی کتاب ہے '*Organisation Man*' وہ ہر شخص پڑھے، اس میں اس نے بے شمار مثالیں دی ہیں۔ میں ایک لطیفہ آپ کو سناتا ہوں کہ کیپٹل ازم کی پیدا کردہ ذہنیت کیسی ہوتی ہے؟

ایک محقق نے نظریہ ارتقا پر کوئی کتاب لکھی، تحقیق کی اور یہ مسئلہ اٹھایا کہ فلاں بات غلط طور پر ڈارون سے منسوب ہوگئی ہے وہ دراصل اسپنسر نے کہی تھی لیکن یہ غلط العام ہو کر ڈارون سے منسوب ہو

گئی۔ اس بے چارے محقق نے اس غلط العام کی تصحیح کر دی اور کہا کہ اسپنسر نے فلاں جگہ پر فلاں موقع پر یہ کہا تھا۔تو پبلشر جو تھا وہ یونیورسٹی تھی اور اس کا پورا پبلشنگ بورڈ تھا۔اس کے پاس جب یہ کتاب پیش ہوئی تو انہوں نے مصنف کوطلب کیا اور کہا کہ بھئی کتاب تو تمہاری بہت اچھی ہے بس اس میں ایک تبدیلی کرلو۔ بولا: وہ کیا؟ کہا: یہ جوتم نے تحقیق کی ہے یہ ایک پیرے میں تو کی ہے، یہ ایک پیرا نکال دو۔ اس نے کہا جناب یہ ایک پیرا ہی تو کتاب کے زندہ رہنے کی وجہ ہے کہ میں نے ایک غلطی کو درست کیا ہے۔ کہا کہ دیکھو اب سب اس بات کو ڈارون کی بات کے طور پر ماننے لگے ہیں تمہاری اس تحقیق سے بلاوجہ ذہنوں پر بوجھ پڑے گا لہٰذا تم اس کو نکال دو، باقی سب ٹھیک ہے۔ یہ ہے وہ مزاج جس کے لیے حق مفادِ عاجلہ کے لیے اختیار کیا جائے، جس کے لیے قوت فوری فائدے کے لیے استعمال کی جائے۔

مغرب جدید کے اصولِ بعیدہ تو یہ یونانی اور رومن وغیرہ ہیں اور اصل قریبی جو ہے وہ ہے ڈیکارٹ کا نظریہ ثنویت یعنی Dualism اور تاریخ انسانی میں تہذیبی اثر کی اتنی وسعت رکھنے والا شائد کوئی دوسرا نظریہ پیش نہ کیا جا سکے جس نے انسانی شعور، ذہن، تہذیب اور نفسیات کو ہمیشہ کے لیے globe میں دولخت کر دیا ہو اور جس نے انسانوں کو باقاعدہ دو انواع میں بانٹ دیا ہو۔ وہ ہے ڈیکارٹ کا نظریۂ ثنویت یعنی یہ کہ مادہ اور روح، ایک دوسرے سے مختلف وجود پر تو ہیں ہی یعنی مادے کی موجودیت کے اصول وعناصر روح کی موجودیت کے اصول وعناصر سے بالکل ہی مغایر اور بالکل مختلف تو ہیں ہی ان کے اندر معلوم ہونے کا جو طریقہ ہے وہ بھی ایک دوسرے سے اتنا ہی مختلف ہے جتنا ان کے موجود ہونے کا انداز ایک دوسرے کے مخالف ہے۔ گویا روحانی علم کو مادی قانون نہیں بنایا جائے گا اور مادی قانون کو روحانی حجت نہیں بنایا جائے گا۔

اسی اَن گھڑت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے پورے global human perspective کو دولخت کر دیا۔ ڈیکارٹ کی ثنویت اب انسانوں پر ان کی تقدیرنحس کی طرح مسلط ہے اور شاید رہے گی یعنی human perspective اگر دو واضح کیمپوں میں منقسم ہے تو وہ ڈیکارٹ کی ثنویت کی بنیاد پر ہے اور مغرب ڈیکارٹ کی اس ثنویت سے بننے والا ذہن ہی نہیں ہے بلکہ اس سے ایجاد ہونے والی تہذیب بھی ہے۔ اسے ہمیں سمجھنے کی ضرورت ہے۔

سوال وجواب

سوال: آپ کے استاد کون ہیں اور ان کے استاد سے کون مراد ہے؟

جواب: میرے استاد سلیم احمد ہیں اور ان کے استاد حسن عسکری صاحب ہیں۔

سوال: یونانی مائتھالوجی (Mythology) کی بنیاد کیا ہے؟ اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایئے کہ جب یونانیوں سے پہلے بہت سے انبیاء آئے تھے تو کیا ان کے اثرات یونان تک نہیں پہنچے؟

جواب: ارسطو کے بعد تو شاید واضح طور پر اب trace ہو گیا ہے یعنی جب اہل یونان اٹلی اور ایشیائے کوچک تک پہنچے تب تک تو trace ہو گیا ہے۔ اسی وجہ سے آگے چل کر انہی میں Plotinus پیدا ہوا جس نے فکر کو نیا آہنگ دیا لیکن ارسطو سے پہلے تک یہ واضح نہیں۔ بعض مرتبہ شبہ ہوتا ہے کہ Pythagoras وغیرہ وہ حکیم تو نہیں ہیں، شبہ ہوتا ہے لیکن ہمارے پاس کوئی ڈیٹا نہیں ہے جس کی بنیاد پر ہم حتماً کچھ کہہ سکیں کہ وحی کے فراہم کردہ علوم اُس وقت ایک زندہ Presence رکھتے تھے؟ دوسرے یہ کہ تمام فلسفی کسی نہ کسی مذہب کے نام سے مائتھالوجی سے وابستہ رہے اور مائتھالوجی پیدا ہی ایامِ فترت میں ہوتی ہے یعنی وحی ہو اور پھر غائب ہو جائے تو اس کے زمانۂ غیاب میں مائتھالوجی مذہبی عقائد اور مذہبیت کی جگہ لے لیتی ہے۔ Pythagoras سے لے کر حتی کہ سقراط تک مائیتھولوجی سے وفاداری کا اظہار ہوتا ہے لیکن کسی بھی تہذیب میں مائتھالوجی کا وجود یہ بات ثابت کرتا ہے کہ اس میں کہیں نہ کہیں، کبھی نہ کبھی وحی کا نفوذ اس کی تاثیر یا اس کے قبول کا عمل ضرور ہوا ہوگا جو مدہم پڑ جانے یا غائب رہ جانے کے نتیجے میں مائتھالوجیز کے قیام کی روایت میں بدل جاتا ہے۔ جس طرح Religious Anthropology کا ایک اصول ہے کہ شرک کو بھی انسانوں کی مذہبیت کے ثبوت کے طور پر دیکھا جائے گا یعنی انسانوں میں مذہب کب سے جاری ہے اگر کسی مرحلے پر ہمیں بت پرستی کا سراغ مل جائے تو یہ مذہبیت کا ویسا ہی علمی ثبوت ہوگا جیسا توحید کا سراغ مل جانے کا ہو سکتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ شرک ایک Essence of Religiosity سے خالی نہیں ہوتا۔ اسی طرح Mythology بھی ایک میٹافزیکل Essence ہی کی نمود ہوتی ہے جو وحی کے غائب رہ جانے کی وجہ سے ابھر آتی ہے، چاہے وہ حق پر استوار نہ بھی ہو۔

سوال: کیا سقراط کی شخصیت کی تاریخی حیثیت مشکوک ہے؟

جواب: ہمیں تین ذرائع سے سقراط کا پتہ چلتا ہے مطلب یہ کہ اس کی شخصیت معرضِ شک میں نہیں ہے۔ گو ہمارے پاس تفصیلات نہیں ہیں لیکن وہ بہرحال ایک تاریخی شخصیت ہے۔ ہمیں تین ذرائع سے اس کی سوانح اور اس کے بعض افکار کا علم ہوتا ہے صرف افلاطون سے نہیں دو اور ذرائع بھی ہیں۔

۔ ایک چیز رہ نہ جائے وہ نوٹ کر لیں کہ Pythagorian Symbolism اور Platoniac Idealism کو بھی ایک anti-thesis درپیش ہوا جو یونانی ذہن کے مزاج میں

تبدیل ہو گیا، چاہے وہ یونانی ذہن کے نظریات میں شامل نہ ہوا ہولیکن اس کی ساخت اور مزاج میں داخل ہو گیا، وہ ہے Sophism یعنی سوفسطائیت۔ یہ یونانی ذہن کے مزاج میں بہت قوت کے ساتھ موجود ہے چاہے یونانی نظریات کی تشکیل میں صَرف نہ ہوا ہو تو اس Sophism کو بعد میں جدید مغرب کے تصورِ علم نے اپنے استعمال میں لا کے دکھایا۔ اس Sophism کو ضرور ذہن میں رکھیے گا یہ مغربی ذہن کے بہت basic currents میں سے ایک ہے۔

دیکھیں ایک گُر کی بات عرض کرتا ہوں۔ ہر شے، شعور کے موضوع کو فلسفے میں شے کہتے ہیں، کے دو تقدیری modes ہوتے ہیں ایک اس کی معلومیت یعنی میرے شعور میں وہ شے کس طرح ہے اور دوسرے اس کی موجودیت یعنی اپنے وجود میں میرے شعور سے باہر ہو کر وہ شے کس طرح ہے۔ انسانی تہذیب کا سب سے بڑا جوہر یا انسان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ شے کی معلومیت اور موجودیت کے خمیر کو اپنے مسلمات سے تیار کرے۔ جو تہذیبیں شے کی معلومیت اور موجودیت کو متعین کرنے سے عاجز رہ جائیں وہ اپنے وجود کو برقرار تو رکھ سکتی ہیں لیکن کسی جواز کے بغیر۔ بوجھ بھی کندھے پر دھرا رہتا ہے لیکن وہ قوت نہیں ہوتا۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے موجود ہونے کے نئے اسالیب اپنے دین کے مادۂ اخلاق اور مادۂ تحقیق سے نہیں نکالے، ہم نے معلوم ہونے کے نئے pattern چیزوں کو ودیعت نہیں کیے۔ ہمارا زوال صرف معاشی اور فوجی نہیں ہے، ہمارا زوال اصل میں علمی اور اخلاقی ہے۔ ہماری مادی کمزوری ہمارے زوال کا سبب نہیں ہے، آپ سوچیے اور اس پر غور کیجیے گا۔ چیز اپنا انداز وجود مجھ سے اخذ کرے۔ چیز اپنا اسلوبِ معلومیت مجھ سے پوچھ کر متعین کرے۔ چیز کی ایک fixed neutralization جس پر مغرب بہت سفاکی کے ساتھ ہمارے لیے اقرار کرتا ہے اور اس پر بڑے بڑے فلسفے بنا کے دکھا رہا ہے۔ یہ جو ایک fixed neutralization ہے وہ ہر object کو انسانی دنیا سے باہر پھینکنے والی قوت کا نام ہے یعنی علم کو مطابق شے ہونا چاہیے۔ یہ ایک فراڈ کیا گیا۔ وجی آئی کس لیے ہے کہ شے کو مطابق علم ہونا چاہیے۔ شے کی تقدیر علمی یہ ہے کہ وہ اللہ کی نشانی بنے۔ شے اپنی physical properties میں کون سی اللہ کی نشانی ہے۔ اللہ مجھے پابند کر رہا ہے کہ میں شے کو اس کے وجودی perspective، اس کے وجودی جواز، اس کی صورت معلومیت پر کام کروں، اس کو اللہ کی نشانی کے موقف پر رکھوں، اپنے شعور میں بھی اور اس کے وجود میں بھی یہ شے پر تصرف نہیں ہے۔ ہم کچھ بھی نہ کر سکے، افسوس کچھ بھی نہ کر سکے۔ خود ہی اللہ کی نشانی بن کر نہیں رہے تو دوسروں کو کیا اللہ کی نشانی بنائیں گے۔

صفاءانسٹی ٹیوٹ میں فکری نشست

سید خالد جامعی ☆
ڈاکٹر عبدالوہاب سوری ☆☆

مسلم معاشرہ اور مغربی تہذیب کا چیلنج

کراچی یونیورسٹی سے سید خالد جامعی صاحب اور ڈاکٹر عبدالوہاب سوری صاحب جون میں لاہور تشریف لائے تو ہم نے صفاءانسٹی ٹیوٹ میں ان کے ساتھ ایک فکری نشست کا اہتمام کیا۔ چنانچہ ان دونوں حضرات نے 'مسلم معاشرہ اور مغربی تہذیب کا چیلنج' کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔ وقت کی کمی کی وجہ سے سوال وجواب کا موقع نہ مل سکا۔ البرہان کی تنگ دامنی کی وجہ سے سوری صاحب کی مکمل تقریر نہیں دی جا سکی۔ ایف سی کالج یونیورسٹی کے پروفیسر شاہد رشید صاحب ڈاکٹر سوری صاحب کے مؤقف پر کچھ کہنا بھی چاہتے ہیں۔ اگلے شمارے میں یہ بحث ان شاءاللہ مکمل ہوجائے گی۔ امین

سید خالد جامعی

مسلم معاشرے کے لیے مغربی تہذیب کا جو چیلنج ہے اور اس نے جو سوالات پیدا کیے ہیں ان کی ایک ترجمانی 'خطبات اقبال' کے ذریعے ہوئی۔ اور خطبات اقبال کے بارے میں سلیم احمد کا قول ہے جو سہیل عمر صاحب کی کتاب 'خطبات اقبال - نئے تناظر میں' میں بھی درج ہے کہ اگر ہم مغرب سے پیپسی اور کوٹ پتلون کے علاوہ کچھ اور بھی سیکھنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے 'خطبات اقبال' ہماری رہنمائی کرتا ہے اور 'خطبات اقبال' عہد حاضر کی انجیل ہے۔ 'خطبات اقبال' میں مغربی تہذیب سے درپیش چیلنج کا جو جواب دیا گیا تھا میرے خیال میں کم وبیش سو سال کے عرصے میں عالم اسلام کے مفکرین کی جانب سے وہی حل پیش ہوتا رہا ہے خواہ وہ مفتی محمد عبدہ ہوں، جمال الدین افغانی ہوں، سرسید احمد خاں ہوں، چراغ علی ہوں، خواہ وہ آپ کے وحید الدین خاں ہوں، خواہ وہ جاوید احمد غامدی ہوں، خواہ وہ یوسف قرضاوی ہوں، بلکہ جو راسخ العقیدہ علما ہیں اور راسخ العقیدہ مکاتب فکر ہیں ان کی جانب سے بھی ایک ہی جواب دیا گیا ہے کہ مغرب کا سب سے بڑا چیلنج سائنس اور ٹیکنالوجی ہے اور عالم اسلام اس وقت تک مغرب کا مقابلہ کرنے سے قاصر رہے گا جب تک کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی حاصل نہیں کرتا۔

یہ وہ حل ہے جو مشترکہ طور پر راسخ العقیدہ اور لبرل اسلامک ماڈرنسٹ لوگوں کے اندر ایک عموم کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اس کا جو حل بیان کیا گیا گزشتہ سو سال کے عرصے میں وہ ایک ہی حل تھا

☆ ناظم شعبۂ تصنیف وتالیف وترجمہ، جامعہ کراچی
☆☆ شعبۂ فلسفہ، جامعہ کراچی

اور اس کا جو تناظر تھا وہ بھی ایک ہی تناظر تھا اور وہ تناظر یہ تھا کہ چونکہ عالم اسلام سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں مغرب سے پیچھے رہ گیا ہے لہٰذا مغرب نے اپنی عسکری یلغار سے عالم اسلام کو مغلوب کر لیا ہے لہٰذا اگر عالم اسلام کو غالب آنا ہے تو اسے وہ ہتھیار، وہ سائنس اور وہ ٹیکنالوجی حاصل کرنا ہوگی جس کے ذریعے مغرب کو ہم پر غلبہ حاصل ہوا ہے۔ یہ وہ مشترکہ حل ہے جو ہر شخص کی طرف سے الفاظ کے رد و بدل کے ساتھ، استدلال کے حسن اور لطافت و نزاکت کے ساتھ، اپنے اپنے استعارات اور محاوروں میں پیش کیا گیا ہے لیکن حل یہی ہے۔ حتیٰ کہ مولانا مودودیؒ جب یہ کہتے ہیں کہ اسلام کا عروج ہوگا تو وہ کہتے ہیں کہ جہاد اور اجتہاد کے ذریعے ہوگا۔ تو اجتہاد سے ان کی مراد ہوتی ہے سائنس اور ٹیکنالوجی جبکہ اسلامی تہذیب اور اسلامی روایت میں اجتہاد کا مطلب سائنس اور ٹیکنالوجی کبھی ہمارے ہاں نہیں لیا گیا۔ بنیادی استدلال یہ ہے کہ سترھویں صدی میں مغرب دنیا بھر میں اپنے جونوآبادیات قائم کرتا چلا گیا تو اس کے پاس وہ ہتھیار اور وہ ٹیکنالوجی تھی جو عالم اسلام کے پاس نہیں تھی اس لیے عالم اسلام کو شکست ہوگئی۔ یہ عمومی مقدمہ ہے جو تمام اکابر کے ہاں ہمیں ملتا ہے۔

عبدالوہاب سوری صاحب اپنے پوسٹ ڈاکٹریٹ تھیسز کے لیے اس موضوع پر کام کر رہے ہیں اس لیے میں خاص طور پر انہیں اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں اور انہوں نے اس پر کام بھی کیا ہے لہٰذا یہ اس پر تفصیل سے کلام کریں گے۔ ویسے تقریباً تین سال سے ہم اس موضوع پر تحقیق کر رہے ہیں اور ہم نے تقریباً تین ہزار صفحات اس پر مرتب کیے ہیں جو آپ کی خدمت میں ان شاء اللہ اگلے چند ماہ میں پیش کر دیئے جائیں گے۔

بنیادی سوال یہ ہے کہ جب مغرب نے ہندوستان پر یلغار کی یا وہ عرب پر حملہ آور ہوا یا ترکی پر حملہ آور ہوا تو کیا عالم اسلام کی حکومتوں کے پاس یا خلافت عثمانیہ کے پاس یا مغلیہ سلطنت کے پاس ہتھیار اور اسلحہ ان سے کم تر تھا؟ یہ ہے بنیادی مقدمہ۔ اگر یہ مقدمہ ثابت ہو جائے تو ان مفکرین کا جو حل ہے وہ آدھے سچ کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے پورے تھیسز کے طور پر پھر بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ تو اس کا جواب عبدالوہاب سوری صاحب دیں گے۔ کچھ سوال میں اور بھی پیش کرتا ہوں جن کا جواب سوری صاحب دیں گے اور ان جوابات میں بھی انشاء اللہ ایک ادراک، ایک فہم، تاریخ، تہذیب اور ایک حقیقت اپنا چہرہ کھولتی نظر آئے گی۔

مثال کے طور پر اگر اس مقدمے کو ٹھیک تسلیم کر لیا جائے تو ہمارا سوال یہ ہے کہ جب تاتاریوں

نے عباسی حکومت پر یلغار کی جو اس وقت تین براعظموں پر پھیلی ہوئی تھی اور اس کے پاس بیت الحکمت بھی تھا جس میں اٹھائیس زبانوں میں ترجمے کی صلاحیت تھی اور عباسی خلفا کے دربار میں مناظرے بھی ہوتے تھے علم پر، منطق پر، اور فلسفے پر تو عباسیوں کے پاس بھی گھوڑے اور تلواریں تھیں اور تاتاریوں کے پاس بھی گھوڑے اور تلواریں تھیں تو پھر تاتاریوں نے عباسیوں کو شکست کیوں کر دے دی؟ پھر اس کے بعد یہ ہوا کہ عباسیوں نے یا عالم اسلام نے تاتاریوں کی فتح کو شکست میں بدل دیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایسا انہوں نے ہتھیاروں کے بل پر کیا تھا؟ کیا انہوں نے ایٹم بم ایجاد کر لیا تھا جو انہوں نے تاتاریوں پر پھینک کر غلبہ حاصل کر لیا؟ نہیں! بلکہ ایسا عالم اسلام نے اپنی علمیت، اپنی علمی قوت اور اپنے دین کے آفاقی پیغام کے ذریعے کیا۔ اور وہ آفاقی پیغام بلا شک وشبہ آج بھی اتنی ہی قوت رکھتا ہے جتنی قوت وہ تاتاریوں کی یلغار کے زمانے میں رکھتا تھا۔ تو عباسیوں نے جو دوبارہ فتح حاصل کی وہ تلوار کے ذریعے، ایٹم بم کے ذریعے اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعے حاصل نہیں کی بلکہ انہوں نے تاتاریوں کو مسلمان کر لیا اور یوں ان کو شکست دے دی۔ عسکری میدان میں شکست کھانے کے باوجود ان کو علم کے میدان میں شکست دے دی۔

تہذیبوں اور قوموں کا مقابلہ اکثر علم کے میدان میں ہوتا ہے۔ اگر آپ کی تہذیب کی علمی برتری قائم ہے، اگر آپ کا علم آفاقی ہے، اگر اس علم کے اندر کوئی قوت، کوئی تاثیر اور کوئی خوبی موجود ہے تو وہ آج بھی مغرب کو شکست دینے کے لیے کافی ہے اور اگر عسکری میدان میں ایک دوبار کی شکست ہو بھی جائے تو اس سے تہذیب کی قوت پر اور اس کی علمیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس کے لیے دو مثالیں اور میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

ایک مثال فاطمیوں کی حکومت کی ہے۔ فاطمیوں نے آکر عباسی خلافت پر قبضہ کر لیا۔ عباسیوں نے تین مرتبہ اپنی خلافت چھیننے کی کوشش کی لیکن فاطمیوں کو شکست نہیں دے سکے اور 274 سال مصر پر فاطمیوں کا قبضہ رہا۔ یوں مصر پر عباسی سلطنت کو جو غلبہ حاصل ہوا وہ تلوار کے ذریعے نہیں ہوا، وہ کسی ایٹم بم، سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعے نہیں ہوا وہ صلاح الدین ایوبی کے ذریعے ہوا۔ صلاح الدین ایوبی نے فاطمیین مصر کو جو ایک لڑکھڑاتی اور سسکتی ہوئی تہذیب کے نمائندے بن گئے تھے، ان کو اپنی فطری موت مرنے دیا اور جیسے ہی آخری فاطمی خلیفہ مرا، سلطان صلاح الدین ایوبی نے عباسیوں کا خطبہ جاری کر دیا، بغیر خون خرابے کے خلافت اسلامیہ ایک بار پھر اوج پر آ گئی۔

دوسری مثال میں آپ کے سامنے اندلس کی پیش کرتا ہوں جسے آج کل ہم اسلامی دنیا میں ایک رول ماڈل کے طور پر پیش کرتے ہیں اور اب تو اسلام آباد میں قرطبہ کے نام سے ایک شہر بھی بن رہا ہے۔ غالبًا نیا قرطبہ بنانے والوں کو پرانا قرطبہ بنانے والوں کا انجام یاد نہیں رہا۔ اسلامی تہذیب میں یہ کوئی آئیڈیل نہیں ہے یہ زوال کی آخری علامت ہے جس کو آپ عروج کے طور پر اسلام آباد کے اندر پیش کر رہے ہیں۔ علمی و فکری افلاس اِس وقت عالم اسلام کا عمومی مسئلہ ہے۔ مسلمانوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں سب سے زیادہ ترقی کی ہے اندلس کے اندر، اس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی بات نہیں ہے۔ برٹرنڈ رسل نے اپنے ایک مضمون میں کہا ہے کہ جس وقت اندلس کی سڑکوں پر چراغ جلتے تھے اس وقت پیرس کی گلیوں میں کیچڑ اور اندھیرا ہوتا تھا۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس وقت اندلس میں کتابوں کی 326 دکانیں تھیں جبکہ اس وقت پورے یورپ میں کتابوں کی صرف 13 دکانیں تھیں اور اندلس میں علم کی ارزانی کا یہ عالم تھا کہ ایک عالم کتابوں کی دکان پر کتاب خریدنے کے لیے پہنچا اور اس نے کتاب کے دام لگائے تو اس کے برابر کھڑے ہوئے ایک شخص نے اس سے بھی زیادہ دام لگائے، اُس نے اِس سے زیادہ دام لگائے تو اُس شخص نے اِس سے زیادہ دام لگا دیے حتیٰ کہ وہ کتاب اُس آدمی نے خرید لی۔ عالم اس سے بڑا متاثر ہوا کہ شاید یہ مجھ سے بھی بڑا عالم ہے جسے اس کتاب کی ضرورت ہے۔ اس نے پوچھا: حضرت! آپ کا شوق کیا ہے، مشاغل کیا ہیں؟ اس نے کہا: میں قصائی ہوں، عالم نے کہا: آپ یہ پڑھتے ہیں کیا؟ قصائی نے کہا: مجھے کتابیں جمع کرنے کا شوق ہے۔ جب قومیں کتابیں جمع کرتی ہیں تو تاریخ کے دفتر کے اندر خود بھی جمع ہو جاتی ہیں۔ اس پر مزید گفتگو کے لیے میں عبدالوہاب سوری صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ اس مقدمے کو آگے بڑھائیں۔

ڈاکٹر عبدالوہاب سوری

سائنس اور ٹیکنالوجی کے حوالے سے جب عمومی بحث ہوتی ہے تو اس میں جو دو تین بنیادی تصورات اور مفروضے (fundamental presumptions) زیر بحث آتے ہیں پہلے ہم ان کو identify کر لیتے ہیں اور یہی وہ تصورات ہیں جو ہمارے بڑے بھی ہمیں دیتے آئے ہیں اور ہم ان سے سنتے بھی رہے ہیں۔ پہلا تصور ٹیکنالوجی کے بارے میں یہ کہ سائنس و ٹیکنالوجی دونوں کو باہم مترادف سمجھا جاتا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی دو الگ الگ چیزیں

ہیں۔سائنس کی application اس طرح سے آپ کی عملی زندگی میں ہو کہ اس کے ذریعے آپ کے سرمائے میں اضافہ ہو تو اسے ٹیکنالوجی کہتے ہیں:

Technology is derived from the application of scientific laws for the maximisation of capital accumulatioin otherwise technology will never transfer to the common people

کوئی بھی سائنٹفک لاء جب اس قابل ہوتا ہے کہ اس کو زندگی کے کسی دائرے پر اپلائی کر کے ایک ایسی چیز بنائی جا سکے جس پر جتنا پیسہ خرچ کیا جا رہا ہو اس سے زیادہ پیسہ وصول ہو سکے تب وہ ٹیکنالوجی کی شکل میں ہم تک پہنچتی ہے ورنہ اگر اس کی لاگت (cost) زیادہ ہو چاہے وہ جتنی بھی اہم ہو وہ آپ کے گھر تک نہیں پہنچے گی کیونکہ اس کی cost بڑھ جائے گی۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ ٹیکنالوجی کا کیپٹل ازم سے ایک خاص نوع کا تعلق ہے۔جس پر ہم آئندہ بات کریں گے۔اس وقت ہم یہ کہہ رہے تھے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں لوگ فرق نہیں کرتے حالانکہ ہر سائنس ٹیکنالوجی میں ٹرانسفر نہیں ہو سکتی۔سائنس کا ایک معمولی طالب علم بھی یہ جانتا ہے کہ ہر سائنٹفک تھیوری ٹیکنالوجی میں تبدیل نہیں ہو سکتی جیسے مثلاً راکٹ سازی سائنس کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسری presumption یہ ہے کہ ٹیکنالوجی بذاتِ خود ویلیو نیوٹرل ہوتی ہے یعنی ٹیکنالوجی کی اپنی کوئی ویلیو نہیں ہوتی بلکہ آپ اس میں جو ویلیو داخل کرنا چاہیں کر سکتے ہیں مثلاً موبائل فون ٹیکنالوجی ہے اور اس کی اپنی کوئی قدر نہیں ہے۔اسے میں اپنے بزرگوں سے بات کرنے کے لیے استعمال کروں یا اسے میں جوائنٹ سٹاک مارکیٹ میں پیسہ لگانے کے لیے استعمال کروں۔کس مقصد کے لیے استعمال کروں اس کا تعین مَیں خود کروں گا یہ چیز نہیں کر سکتی۔جیسا کہ بچپن سے ہم سکول سے سنتے آئے ہیں کہ تلوار ایک ہتھیار، ایک ٹیکنالوجی ہے جس سے آپ اپنی گردن بھی کاٹ سکتے ہیں اور دوسروں کی بھی۔اب یہ تلوار چلانے والے پر منحصر ہے کہ وہ اسے اپنی گردن پر چلاتا ہے یا کسی دوسرے کی گردن پر۔ٹیکنالوجی کے بارے میں یہ دوسری presumption ہے کہ یہ اپنی کوئی ویلیو نہیں رکھتی، ویلیو نیوٹرل ہے۔اس کے اندر ہر معاشرہ اور ہر تہذیب اور ٹیکنالوجی کا استعمال کرنے والا اپنی ویلیو داخل کر سکتا ہے۔یورپین معاشرہ اگر یہ ٹیکنالوجی استعمال کر رہا ہے تو وہ اس میں اپنی ویلیوز داخل کر سکتا ہے اور اگر کوئی مسلمان وہ ٹیکنالوجی استعمال کرے گا تو وہ اس میں اپنی ویلیو نہ داخل کر سکے گا۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ دونوں presumptions غلط ہیں۔ اور یہ میں آپ کو کوئی اطلاع نہیں دے رہا اور نہ یہ محض میری ذاتی رائے ہے بلکہ یہ ان لوگوں کی رائے ہے جو ٹیکنالوجی کے فیلڈ میں اتھارٹی ہیں اور دنیا کے مشہور آدمی ہیں۔ ان میں سے ایک ہے ایلول جس نے ٹیکنالوجی پر بہت لکھا ہے۔ ان میں سے ایک ہوزے مارلیس ایکرڈ ہے جو ٹیکنالوجی کے حوالے سے ایک بڑا نام ہے۔ ان میں سے ایس پرویز منظور بھی ہے Islamisation of knowledge کا آدمی ہے لیکن یہ مشہور مصنف ہے جس کی ٹیکنالوجی موضوع پر کئی اہم کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور مشہور آدمی ہے جس کا نام چارس ٹلی ہے جس کا ٹیکنالوجی پر زبردست کام ہے۔

ان سب کا اس بات پر اجماع ہے حالانکہ یہ مختلف مکاتب فکر کے آدمی ہیں، ان میں کوئی leftist ہے، کوئی قدامت پسند مسلمان ہے، کوئی لبرل ٹائپ کا انسان ہے، چارس ٹلی سوشل ڈیموکریٹ ہے۔ ان سب کا اس بات پر اجماع ہے کہ ٹیکنالوجی اپنے ساتھ اپنی ویلیوز لے کر آتی ہے۔ ہر ٹیکنالوجی کی اپنی ویلیوز اس کے اندر in built ہوتی ہیں۔ گویا کہ Technology is inchangably value ridden۔ دوسری بات یہ کہ سائنس اور ٹیکنالوجی بالکل دو الگ چیزیں ہیں۔ ان دونوں باتوں کو ہم اپنے لیکچر میں واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس سے پہلے کہ ہم ان کو refute کریں ہم ایک دو معروضات پیشگی عرض کرنا چاہتے ہیں۔ پہلی چیز یہ کہ نئی ٹیکنالوجیز متعارف ہونے کی رفتار بہت تیز ہوگئی ہے مثلاً انیسویں صدی میں پچاس سال کا آدمی اپنی پوری زندگی میں دو یا تین نئی ٹیکنالوجیز سے متمتع ہوتا تھا، دو یا تین ٹیکنالوجیز کو سیکھنے میں ہی اس کی عمر گزر جاتی تھی اور وہ انتقال کر جاتا تھا جبکہ عصر حاضر میں پچاس سال کا آدمی تیس ٹیکنالوجیز اپنی زندگی میں متعارف ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اور چارلس ٹلی کا خیال ہے کہ ابھی اس کی رفتار میں اور زیادہ تیزی آئے گی۔ خصوصاً یہ نوٹ کیجیے کہ جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی آنے کے بعد تبدیلی کتنی زیادہ اور کتنی تیزی سے رونما ہو رہی ہے۔

اٹھارویں صدی تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ پوری انسانیت مل کر جو علم تخلیق کرتی ہے وہ اگلے تین سو سال میں دوگنا ہوجاتا ہے۔ مثلاً فرض کیجیے کہ اگر سترھویں صدی میں پوری انسانیت نے مل کر جو علم تخلیق کیا وہ 10 یونٹ تھا تو اس کو دوگنا ہونے کے لیے مزید 3 سو سال درکار تھے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی آنے کے بعد یہ 3 سو سال چار گھنٹوں کے برابر ہوگئے ہیں۔ اب علم اتنی تیزی سے تخلیق

کیا جار ہا ہے کہ وہ ہر چار گھنٹے بعد دوگنا ہوجا تا ہے ہم دوپہر کا کھانا کھا کر چلے تھے اور یہاں پہنچے ہیں تو اس وقت تک علم کی مقدار دوگنا ہوچکی ہے کیونکہ چار گھنٹے گزر چکے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ٹیکنالوجی کی تخلیق کی رفتار اتنی تیز کیوں ہوگئی ہے؟ اس کا ایک جواب عام طور پر لوگ یہ دیتے ہیں کہ لوگ پڑھ لکھ گئے ہیں۔ لوگ ذہین ہو گئے ہیں۔ تو کیا اچانک ذہین ہو گئے ہیں؟ لوگوں کی ذہانت تو ہر دور میں رہی ہے ابن سینا کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ وہ ایک لائبریری کا انچارج تھا۔ لائبریری میں آگ لگ گئی اور کتابیں جل گئیں۔ خلیفہ وہاں آتا تھا کتابیں پڑھنے لوگ ڈر گئے کہ خلیفہ آیا اور کتابیں نہ ہوئیں تو وہ ناراض ہوگا۔ ابن سینا نے کہا: کوئی بات نہیں کاغذ قلم لاؤ اور اس نے وہ 5 سو کتابیں دوبارہ مرتب کر دیں تو یہ عالم تھا ابن سینا کی ذہانت کا۔

آج کے دور کا انسان اتنا ذہین ہوگیا ہے کہ وہ ہر لمحے ایک نئی ٹیکنالوجی تخلیق کر رہا ہے تو ہمیں دیکھنا ہوگا کہ ہمارا طرز عمل کیا ہو؟ اس وقت ہم اسلام وغیرہ کی باتیں بالکل نظری سطح پر کرتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ٹیکنالوجی میں ترقی کے کون کون سے ماڈل دنیا میں روبہ عمل ہیں اور امت مسلمہ اگر امریکہ اور یورپ کو شکست دینا چاہتی ہے تو وہ کون سے ماڈل کو اپنائے؟

بیسویں صدی میں ٹیکنالوجی کی ترقی کے دو ماڈل ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک ماڈل ہے leftists شوشل ماڈل جو کمیونسٹ دنیا نے استعمال کیا اور دوسرا ماڈل وہ ہے جو مغرب کے سرمایہ دارانہ لبرل نظام کے اندر استعمال کیا گیا۔ دونوں کی اپنی اپنی انفرادیت اور حاصلات ہیں۔ پہلے ہم لیتے لیفٹ کے ماڈل کو۔ لیفٹسٹوں کی سائنس کے ساتھ کمٹمنٹ اتنی زیادہ تھی کہ مارکس اپنے آپ کو فلسفی نہیں کہتا تھا بلکہ کہتا تھا کہ ہم سائنس دان ہیں۔ تو جتنے بھی لیفٹسٹ ہوئے ہیں مارکس کے بعد لینن، سٹالن یا ویت نامی اور کیوبا والے تو ان میں سے زیادہ تر لوگوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی کو مذہب کے متبادل کے طور پر پیش کیا ہے۔ وہ مذہب کو افیون کہتے تھے اور سائنس و ٹیکنالوجی کو ترقی کی واحد اساس سمجھتے تھے۔

سائنس و ٹیکنالوجی کے ساتھ کمیونسٹوں کی کمٹمنٹ تھی اور اس کمٹمنٹ کی یہ حالت تھی کہ سٹالن نے ایک ہی دن میں اٹھارہ پادریوں کے گلے پر چھری پھیری تھی حالانکہ وہ انقلابی بننے سے پہلے خود پادری تھا۔ تو سٹالن کہتا ہے کہ مذہب تو مسائل کی جڑ ہے ہمیں سائنس اور ٹیکنالوجی کو استعمال کرنا چاہیے تا کہ لوگوں کی بنیادی ضروریات پوری ہوسکیں اور ان کا معیار زندگی بلند ہو سکے (جاری ہے)۔

عبدالرشید ارشد

مغربی تہذیب سے مرعوبیت کیوں؟

سطحی علم اور سطحی سوچ رکھنے والوں کو، خواہ اعلیٰ تعلیمی ڈگریاں اُن کی جھولی میں ہوں، ہر چمکدار چیز سونا نظر آتی ہے۔ پنجابی کی ایک ضرب المثل ہے کہ ''پرائی کھُر لی دے ٹنڈے مٹھے لگ دے نیں'' یعنی مویشیوں تک کی نفسیات یہ ہے کہ اپنے سامنے مہنگی کھل بنولہ بھی کیوں نہ پڑی ہو دوسرے مویشی کے سامنے پڑے خشک چارے میں منہ ضرور ماریں گے۔ یہی حال انسانوں کا ہے کہ دوسرے کی بیوی یا بیوی کو دوسروں کے شوہروں میں خوبیاں نظر آتی ہیں۔ اپنا میاں اور اپنی بیوی بس ''مجبوری'' ہی رہتی ہے۔

مذکورہ سطور ہم نے اس لیے بطور تمہید لکھی ہیں کہ ماہنامہ ''البرہان'' کے تازہ شمارہ میں دو محترم مصنفین کی تحریریں ''مسلم ترقی کے لیے مغربی سائنس وٹیکنالوجی ناگزیر ہے'' (حمیرا رانا) اور ''مغربی تہذیب کی پیروی میں کوئی حرج نہیں'' (سہیل احمد) سامنے آئیں جو مغربی تہذیب و تمدن سے مرعوبیت کی نشاندہی کرتی ہیں۔ مغربی تہذیب وتمدن کا دور سے 'مطالعہ' یا 'مشاہدہ' ایسے خیالات کو جنم دیتا ہے جبکہ اس تہذیب کو قریب سے دیکھنے اور چکھنے والوں کا نکتہ نظر اس کے برعکس ہے مثلاً علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ اور بانیٔ پاکستان محمد علی جناح برسوں یورپ میں بغرضِ تعلیم مقیم رہے اور تہذیب مغرب انہیں مرعوب نہ کرسکی۔

؎ تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت ہے حضرت انسان کے لیے اس کا ثمر موت

؎ نظر کو خیرہ کرتی ہے تہذیب یورپ کی مگر یہ جھوٹے نگینوں کی ملمع سازی ہے

؎ یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

مختصراً یہ علامہ اقبالؒ کا تہذیب کے حوالے سے یا مسلمانوں کی تہذیب مغرب سے مرعوبیت کے نقطۂ نظر سے فرمان ہے۔ تہذیبِ مغرب کے مقابلے میں اسلامی تہذیب وتمدن ہے اس پر قائداعظمؒ کا فرمان یا نکتہ نظر بھی ملاحظہ فرمایئے جو ان کے علم اور قرآن حکیم اور شریعت حقّہ پر محکم ایمان کا اعلان بھی ہے۔

''مسلمان کے نزدیک صحیح آزادی کا تصور یہ ہے کہ وہ ایسی اسلامی حکومت کو معرض وجود میں لائے جو قرآن کے ضابطہ خداوندی کی متشکل ہو۔۔۔مسلمان کے نزدیک ہر

وہ نظام باطل ہے جو کسی انسان کا وضع کردہ ہو کیونکہ اس کے پاس ایک محکم دستور ہے جو اس کی ہر موقع اور ہر زمانہ میں راہنمائی کر سکتا ہے۔''

''۔۔۔لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا محدود اور مقید مفہوم و تصور نہیں ہے۔ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کا مطالعہ کیا ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی و سماجی ہو یا معاشی، غرض کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔۔۔'' (حیات قائداعظم، از چودھری سردار محمد خان عزیز، ص ۲۵۵)

تہذیب و تمدن کیا ہے؟ معاشرتی و سماجی، سیاسی و معاشی اقدار کے مجموعے کا نام ہی تو تہذیب و تمدن ہے۔ اسلام واحد مذہب ہے جس نے ان پہلوؤں میں اعلیٰ اقدار کو متعارف کراتے ہوئے مثالی تہذیب و تمدن کی بنیاد رکھی۔ تاریخ عالم نے پہلا مثالی معاشرہ تقریباً ساڑھے چودہ سو سال قبل دیکھا یہاں تک کہ مسلمان فاتح جس جس ملک میں گئے وہاں یہ تہذیب متعارف ہوئی تو غیر مسلم اس کے گرویدہ ہو گئے۔ عملی زندگی کے ہر میدان میں اس تہذیب نے مثالی کارہائے نمایاں سرانجام دیے مثلاً سائنس و ٹیکنالوجی کے میدان میں، علم و ادب کے میدان میں غرض کوئی شعبہ زندگی خالی یا ادھورا نہ رہا اور مغرب نے یہیں سے خوشہ چینی کر کے سب کچھ لیا۔ جب اور جہاں مسلمان اپنی اصل سے جس قدر دور ہوئے تہذیب و تمدن کی ڈور ڈھیلی ہوتی چلی گئی مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اصل (قرآن) کی جھولی خالی ہو گئی تھی۔ لینے والوں کا ظرف ہمت ہارتا رہا، اور مسلمان کہلوانے والے بے ہمتی کا مظاہر کرتے کرتے خود خوشہ چین بن گئے۔

حمیرا رانا کا نکتہ ہمارے نزدیک اپنے ''سرمایہ'' کی حقیقت کو نہ جاننا اور تہذیب مغرب کی چکا چوند سے متاثر ہونا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے اُن کا فرمان:

''۔۔۔اگر ہم مغربی تہذیب کے تعلیمی نظام کو، جو آج کل ہر طرف چھایا ہوا ہے چھوڑ دیں تو ہم ترقی نہیں کر سکتے اور ان کی تعلیم سے فائدہ نہ اٹھایا تو ہم سائنسی، سیاسی، معاشی ہر میدان میں بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ آج کل کی جو مغربی معاشی پالیسیاں ہیں وہ انسان کے معاشی مستقبل کے لیے بہت افادیت رکھتی ہیں۔ ہم ان کی تہذیب

پر یا ان کی پالیسیوں پر عمل نہ کریں تو معاشی ترقی نہیں کر سکتے'' (البرھان، ص ۴۶)

حمیرا رانا مذکورہ نکتہ نظر کو ان الفاظ کے ساتھ سمیٹتی ہیں ''اس لیے ہمیں دنیا میں ترقی کے لیے مغربی تہذیب کے طور و اطوار کو اپنانا ہوگا تا کہ ہم بھی جدید ٹیکنالوجی سے آراستہ ہوں اور جدید سہولیات سے فائدہ اٹھائیں''

مغربی نظام تعلیم ماضی کی نسبت آج بہت زیادہ بگاڑ کا باعث ہے۔ کم و بیش ۶۰، ۶۵ سال قبل علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ لارڈ میکالے کی ذریت ہماری تعلیم کو جدید خطوط پر جو جہت دینا چاہتی ہے اس کا مقصد ہے ؎

اک لُردِ فرنگی نے کہا اپنے پسر سے منظر وہ طلب کر کہ تیری آنکھ نہ ہو سیر!
تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر!
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر!

لارڈ میکالے نے جو مغربی نظام تعلیم غیر منقسم ہندوستان میں متعارف کرایا تھا اور جس سے ہند و پاک میں گندمی رنگ کی نسل علم کی وارث بنی۔ اس کے کھلائے گُل آج جو بہار دکھا رہے ہیں وہ ہر باشعور کے سامنے ہے۔ صدی کا سفر طے کرتے آج یورپی علم جہاں پہنچ چکا ہے وہ مسلمان قوم کی تباہی کا مکمل سامان سمیٹے ہوئے ہے۔ مخلوط تعلیمی درسگاہیں مغرب کی نسل کو جہاں لے آئی ہیں حمیرا رانا انتہائی خیر خواہی سے اہل وطن کو بھی وہاں پہنچانا چاہتی ہیں مگر ایک یورپی دانشور کا نکتہ نظر دیکھیے:

''۔۔۔انسانیت کی پوری تاریخ میں کوئی مثال بھی اس قسم کی نہیں ملتی کہ کوئی ایسی سوسائٹی تہذیب تمدن کی بلندی تک پہنچ گئی ہو، جس کی لڑکیوں کی پرورش اور تربیت ایسے ماحول میں ہوئی ہو جس میں مرد و زن مخلوط رہے ہوں۔ تاریخ عالم میں کوئی بھی ایسی مثال نہیں ملے گی کہ وہ قوم اپنی تہذیبی و تمدنی بلندی کو قائم رکھ سکی ہو۔ اس کے برعکس صرف وہی اقوام تہذیب کی انتہائی بلندیوں کو پہنچ سکی ہیں جنھوں نے مخلوط میل جول پر پابندی عائد کی''

''۔۔۔کوئی قوم کیسے ہی جغرافیائی ماحول میں رہتی ہو، اس کی تمدنی سطح بلند ہو گئی تھی یا نیچے گر گئی تھی، اس بات کا انحصار صرف ان حالات پر ہے کہ اس نے اپنے ماضی و

حال میں مرد اور عورت کے میل جول کے لیے کس قسم کے ضوابط مرتب اور نافذ کر رکھے تھے''

''اگر کسی قوم کی تاریخ آپ دیکھیں کہ کس وقت اس کی تمدنی سطح بلند تھی یا پست تو تحقیق سے معلوم ہوگا کہ اس قوم نے مرد وزن کے تعلقات میں کیا تبدیلی کی تھی جس کے نتیجے میں اس کی سطح بلند تھی یا پست''(Sex and Culture, (Dr. J. Unwin, Cambridge University

حمیرارانا کا یہ خیال کہ'' آج کل جو مغربی معاشی پالیسیاں ہیں وہ انسان کے معاشی مستقبل کے لیے بہت افادیت رکھتی ہیں،ہم ان کی تہذیب پر یا ان کی پالیسیوں پر عمل نہ کریں تو معاشی ترقی نہیں کر سکتے'' دراصل حمیرارانا کا مذکورہ نکتہ نظر اسلام کے نظام تہذیب وتمدن اور نظام معیشت کو نہ سمجھنے کے سبب ہے۔کسی بھی باشعور سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ کسی بھی چیز کا موجد اپنی ایجاد کے ضمن میں اتھارٹی تسلیم کیا جائے گا یا اس کے مدِّ مقابل کوئی دوسرا اتھارٹی ہونے کا دعویٰ کرے تو اسے سچا تسلیم کر لیا جائے گا۔عقل و دانش موجد کو ہی اتھارٹی تسلیم کرے گی۔اللہ تعالیٰ اس کائنات کا،اس کے اندر موجود ہر نوع کی مخلوق کا منصوبہ ساز اور موجد ہے۔اسے اپنی ''ایجاد'' کے ہر ہر پرزے کی کارکردگی، اس کی ضروریات کا مکمل ادراک ہے۔اس نے اپنی ایجاد کو مؤثر بنانے کے لیے ہدایات کی مکمل و مدلل کتاب نازل فرمائی جس میں تہذیب وتمدن، معاش ومعیشت، عدل واصولِ حکمرانی غرض ہر شعبہ پر راہنمائی دی ہے۔

''موجد'' کی ہدایات پر تو عمل نہ کیا جائے اور خود اِدھر اِدھر ٹامک ٹوئیاں مارتے، گردوپیش سے کچے پکے طور طریقوں کی نقالی سے کامیابی کی منزل پانے کا عزم محض عزم تو ہوسکتا ہے حقیقی منزل تک رسائی ممکن نہیں ہے۔آج یورپ تو اسلام کے نظام معیشت کی طرف پلٹنے کی کوشش کر رہا ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ بے شمار مغربی بنکوں میں اسلامی بنکاری کے کاؤنٹر کھل رہے ہیں۔معاشی پالیسیوں کی اصلاح کی کوشش ہو رہی ہے اور جن کی جھولی میں پارس پتھر ہے وہ جھوٹے نگینوں کے لیے بے تاب ہیں۔اپنے اصل سے انحراف نے ہمیں سوچ کے اس انداز تک پہنچایا ہے۔

مغربی تہذیب وتمدن کے دلدادہ سہیل احمد صاحب کا نکتہ نظر بھی حمیرارانا سے مختلف نہیں بلکہ ان

کی سوچ ان سے بھی چند قدم آگے ہے۔ ان کے نزدیک ''مغربی تہذیب کی پیروی میں کوئی حرج نہیں'' ان کا یہ فرمان کہ: ''تہذیب نتیجہ ہوتی ہے انسانی رویوں کا اور ایک کامیاب تہذیب کا مطلب ہی ترقی ہوتا ہے کیونکہ وہ نتیجہ ہوتی ہے ترقی کے لیے پیدا کردہ مناسب ماحول کا'' قابل توجہ ہے۔ ان کی اس سوچ کی نفی مغرب میں اسلام قبول کرنے والوں کے بیانات ہیں خصوصاً اسلام کے دامن میں آنے والے مردوں اور عورتوں کے:

''۔۔۔مغرب کے لوگ اپنی سوسائٹی سے مایوس ہو رہے ہیں جس میں بڑھتے ہوئے جرائم، خاندانی نظام کی تباہی، منشیات و شراب نوشی کا دور دورہ ہے۔ بالآخر وہ اسلام کے دیے ہوئے نظم وضبط اور تحفظ کی تعریف کرتے ہیں''۔

''برطانیہ کی نومسلم خواتین نے ہمیں بتایا کہ اسلام میں ہمارے لیے کشش کا سبب ہی یہ ہوا کہ اسلام مرد و زن دونوں کے لیے علیحدہ علیحدہ دائرہ کار تجویز کرتا ہے جو دونوں کی جسمانی ساخت کے عین مطابق ہے'' (Daily Times London, Nov 9, 1993, A Survey Report "Why Europion women embrace Islam?)

سہیل احمد صاحب کے نزدیک ترقی کی راہ میں رکاوٹ ''مغرب کی طرح انقلابی تبدیلیوں کو قبول نہ کرنا'' اور عورت کا پردہ کرنا ہے۔ مغرب نے انقلابی تبدیلیوں کو ''قبول'' کرلیا اور پردہ سے جان چھڑالی اور آج یورپ ترقی کی معراج انجوائے کر رہا ہے۔ ترقی کی تعریف ہر کسی کے نزدیک مختلف ہے مثلاً ''یورپی ترقی'' جنسی آزادی اور ہم جنس پرستی کی قانونی حیثیت ہے۔ کیا مسلم معاشرے کو اسے قبول کرکے ترقی حاصل کرلینی چاہیے؟ یورپی معاشرہ مادر پدر آزاد معاشرہ ہے۔ کیا اسلام ایسے معاشرے کی اجازت دیتا ہے؟ اسلام کا اپنا ضابطہ اخلاق ہے، ضابطہ معاش و معیشت ہے، ضابطہ عدل وحکمرانی ہے۔

فاضل مضمون نگار ماشاء اللہ مسلمان ہیں۔ قرآن حکیم کو یقیناً کتاب اللہ تسلیم کرتے ہیں۔ اس قرآن کا آغاز الحمدللہ رب العالمین، الرحمٰن الرحیم سے ہوتا ہے۔ رب کے معنی پرورش کنندہ ہے۔ والد اپنے کنبہ کی پرورش کرتا ہے تو صرف کھانا دینا، صرف لباس دینا یا صرف کسی ایک پہلو کو پیش نظر

رکھنا پرورش نہیں کہلاتا۔ پرورش کے لوازم ہمہ جہت ہیں۔ اور ان کی تکمیل کے لیے محبت وشفقت اور جذبہ رحم ضروری ہے جس سے خالق نے مخلوق کو نوازا ہے۔ یہی جذبہ ہے جو اولاد کی پرورش میں خیر و شر کے پہلوؤں کو پیش نظر رکھتا ہے۔

خالق مخلوق کا پرورش کنندہ ہے اور رحمٰن و رحیم ہے یعنی لازوال رحم وشفقت اس کی صفت ہے۔ اس خالق نے اپنی احسن تخلیق شدہ جنس انسانی کے لیے جو ضوابط مقرر کیے وہ غیر حکیمانہ اور نقصان دہ کیسے تسلیم کر لیے جائیں کہ ہر تقاضے کی تہ میں حکمت اور خیر خواہی ہے مثلاً سماجی و معاشرتی زندگی میں عورت کے لیے حدودِ ستر (پردہ) کا اہتمام، معاش و معیشت کو سودی لعنت سے محفوظ رکھنا، نظام تعلیم و تربیت کو قرآن وسنت کے تابع رکھنا وغیرہ۔ ان امور کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھنے کا مطلب تو یہ ہوا کہ معاذ اللہ، اللہ تعالیٰ مسلمان کو ترقی کرتا دیکھنا پسند نہیں کرتا، اسے کافر کی ترقی پسند ہے۔

جہاں تک فنی اور سائنسی ترقی کا تعلق ہے مسلمان انجنیئر ، ڈاکٹر، زرعی صنعتی ماہرین اور سائنس دان انتہائی باصلاحیت ہیں۔ خود یورپ و امریکہ ان کی صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ کر رہا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ امریکہ و یورپ کے پاس سرمایہ یہود کا اور صلاحیتیں غیر امریکی و غیر یورپی ماہرین فن کی زیادہ ہیں۔ پاکستان کے ایٹمی محسن ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو کہاں سے کھینچ کر لایا گیا تھا۔ تحقیقی لیبارٹری کہوٹہ کی ہو یا پی سی ایس آئی آر ہو یا ایوب ریسرچ انسٹیٹیوٹ ہو ہر جگہ باصلاحیت لوگ صبح شام مصروف عمل ہیں۔ یہ صلاحیتیں قوم کے سامنے اس لیے نہیں آتیں کہ بعض مؤثر غیبی ہاتھ ایسے کسی تحقیقی کام کو سامنے آنے نہیں دیتے کیونکہ ان کا مفاد بھارت سے، امریکہ و یورپ سے ''ترقی'' اور ''ترقی یافتہ'' درآمد کرنے سے مشروط ہے۔ چونکہ قوم کے سامنے تصویر کا ایک ہی رُخ ہے اس لیے سہیل احمد صاحب اور دوسروں کو ترقی نظر نہیں آتی ؎

اپنے خورشید پہ پھیلائے ہیں سائے ہم نے اغیار سے ڈھونڈتے پھرتے ہیں مٹی کے چراغ

محمد انور عباسی

سائنس وٹیکنالوجی اور مسلم ترقی

البرہان کے شمارہ فروری و مارچ میں درج بالا موضوع پر ڈاکٹر نعمان ندوی صاحب کی تحریر پڑھ کر جہاں یہ اندازہ ہوا کہ سائنس وٹیکنالوجی اسلام کے لیے کتنی خطرناک ہے وہاں بہتوں کی جنرل نالج میں بھی اضافہ ہوا ہوگا کہ جزیرۃ العرب کی سرزمین مرکز کائنات ہے ۔گلیلیو کے دور میں پادری حضرات بھی اسی قسم کے ایمانیات کا پرچار کرتے تھے ۔گلیلیو نے آکر زمین کو مرکزِ کائنات کے چکر سے نکالا تاہم اتنے ماہ وسال گزرنے کے بعد ندوی صاحب محترم نے پھر سے نہ صرف زمین کو بلکہ زمین میں سے بھی جزیرۃ العرب کی سرزمین کو مرکزِ کائنات بنادیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس مرکز کائنات کو جاہل و ان پڑھ قسم کی قوم کا مسکن بھی قرار دے دیا اور بھول گئے کہ یہ ان پڑھ قوم کس قدر اعلیٰ درجے کا ادبی ذوق رکھتی تھی ۔کعبہ کی دیوار پر اپنے اشعار کس طرح لٹکا لیتی تھی ۔ اس دور کے مشہور سبعہ معلقات ان پڑھ و جاہل قوم سے کیونکر اور کس طرح سرزد ہو گئے تھے؟

ڈاکٹر صاحب محترم! اس قوم کو امی اس لیے نہیں کہا جاتا تھا کہ وہ ان پڑھ تھے بلکہ اس لیے کہ اس میں الہامی کتاب کا وجود نہ تھا۔ وہ تو اپنے علاوہ ہر قوم کو گونگا گردانتے تھے ۔امّی کا مطلب جاہل لینا بڑا ہی عجیب ہے اور یہ دعویٰ تو عجیب تر ہے کہ 'انیسوی صدی کے آخر تک مکہ معظّمہ میں فراہمی آب و نکاسی فضلات کا کوئی باقاعدہ نظام موجود نہیں تھا،صحرائی وریگستانی ماحول کے بدویانہ طرزِ زندگی میں اس طرح کی جدید سہولیات کی عدم موجودگی کو ہم سائنسی علوم کے غیر اہم ہونے پر دلیل قائم کر رہے ہیں حالانکہ بالکل ابتدائی دور میں حضرت عائشہؓ کا بیان قابل غور ہے جو آپ نے واقعہ افک کی تفصیلات بتاتے ہوئے دیا تھا۔ یہ واقعہ تفاسیر کی تمام متداول کتابوں میں موجود ہے ۔آپ کا ارشاد ہے کہ ''ایک روز رات کے وقت رفع حاجت کے لیے میں مدینے کے باہر گئی ۔ اِس وقت تک ہمارے گھروں میں یہ بیت الخلا نہ تھے اور ہم جنگل میں جایا کرتے تھے''۔ یہ بیان اس بات کی شہادت ہے کہ حضرت عائشہؓ کی زندگی میں ہی گھروں میں بیت الخلا بن چکے تھے اور اس دور کے اپنے ماحول کے مطابق یقیناً یہ ٹیکنالوجی کا ہی استعمال تھا جس کے ذریعے سے Drainage System معرض وجود میں آیا تھا۔

حضور اکرم ﷺ نے اپنی جنگی مہمات میں بہتر ٹیکنالوجی اختیار کی ۔غزوۂ خندق میں کس کو معلوم نہیں کہ حضرت سلمان فارسیؓ کی تجویز پر خندق کھودی گئی جو عرب کی جنگی تاریخ میں پہلی دفعہ بیرونی ٹیکنالوجی کا استعمال تھا۔اسی وجہ سے دشمن کو ہزیمت اٹھانا پڑی ۔ پیدل سپاہی کے مقابلے میں گھڑسوار

اور گھڑسواری کے مقابلے میں تیراندازی کیا بہتر ٹیکنالوجی کا استعمال نہیں ؟ کیا ہمارے نبیﷺ کی سنت یہی ہے کہ میزائل وایٹم بم کے مقابلے میں تلوار سے مقابلہ کیا جائے اور یہ توقع کی جائے کہ ہم اس طرح ہر محاذ پر فتح یاب ہوں گے کیونکہ سنت کی پیروی کا یہ لازمی نتیجہ ہے؟

اگر صاحب مضمون کا دعویٰ محض یہ ہوتا، جیسے انہوں نے ایک جگہ فرمایا ہے کہ ''فضیلت، برتری، کامیابی اور استخلاف کا واحد سبب محض سائنس وٹیکنالوجی کو سمجھ لیا گیا ہے''۔ (البرہان، فروری 2011، ص 58) تو ہم کہہ سکتے تھے کہ واقعی یہ واحد سبب نہیں ہے۔

لیکن کس اہلِ علم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ واحد سبب ہے؟ یقیناً یہ واحد سبب نہیں لیکن اس مقدمے سے سائنس وٹیکنالوجی ترقی کے لیے غیر اہم کس طرح ثابت ہوگئی ؟ اس مضمون میں قرآن کریم کی جتنی آیات کا حوالہ دیا گیا ہے ان کا نفس مضمون سے دور کا تعلق بھی نہیں بنتا۔ ہمیں حیرت ہے کہ قرآنی آیات کا حوالہ دے کر غلط نتیجہ نکال کر ہمیں بتایا جاتا ہے کہ '' سائنس وٹیکنالوجی نہ جاننے والوں کو قرآن کی کسی آیت میں بھی جہنم کی وعید نہیں سنائی گئی'' (البرہان، فروری، ص 59) دوسرے الفاظ میں صاحبِ مضمون ہمیں بتانا یہ چاہتے ہیں کہ چونکہ سائنس وٹیکنالوجی نہ جاننے والوں کو قرآن نے جہنم کی وعید نہیں سنائی اس لیے اس کا حصول غیر اہم ہے۔ اگر اس طرزِ استدلال کو ہم علم کی معراج سمجھ کر اختیار کرنا شروع کر دیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کی کسی آیت میں بھی پانی نہ پینے اور کھانا نہ کھانے والوں کو جہنم کی وعید نہیں سنائی گئی لہذا پانی اور خوراک کا استعمال مسلم ترقی وسربلندی کے لیے غیر اہم ہے۔

بالکل درست کہ ''استخلاف کی کسی آیت میں کسی نبی کو یہ حکم نہیں دیا گیا کہ وہ زمین میں اقتدار کے بعد سائنس وٹیکنالوجی کے علم کی تدریس وتعلیم کو اولیت دیں گے''۔ (ایضاً ص 58) تو کیا ڈاکٹر صاحب موصوف ہمیں کسی ایک آیت کا حوالہ دے سکتے ہیں جس میں زمین میں اقتدار کے بعد پانی وخوراک کے حصول میں اولیت دی گئی ہو؟ اصل یہ ہے کہ یہ عقل عام (Common Sense)، اگر چہ یہ اتنی عام نہیں، کا تقاضا ہے کہ حیات ارضی میں بہتر سے بہتر وسائل کا بھرپور استعمال کیا جائے۔ دراصل سائنس وٹیکنالوجی کو بروئے کار لا کر ہی بہتر وسائل کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بغیر ممکن نہیں۔ یہی قرآن کا حکم ہے (سورۃ الانفال آیت 60) اور یہی سنت نبویﷺ بھی۔ کیا ڈاکٹر صاحب اورالبرہان والے اپنی روز مرہ زندگی میں قرآن کے خلاف عمل کر رہے ہیں؟ مثلاً البرہان کمپیوٹر کے ذریعے کمپوز کیا جا رہا ہے یا دستی کتابت کے ذریعے؟ یہ مضمون جس قلم سے لکھا گیا ہے کیا وہ سرکنڈے کو کاٹ کر قلم تراش سے بنایا گیا ہے یا وہ پین یا بال پوائنٹ کسی فیکٹری کی ٹیکنالوجی کی پیداوار ہے؟

ڈاکٹر صاحب نے مغرب کے معاشرے میں خودکشی کا سبب بھی سائنس وٹیکنالوجی کو ہی قرار دیا

ہے ۔فرماتے ہیں :'' جدید مغربی تہذیب ، اس کی سائنس،ٹیکنالوجی اور اس کے بطن سے پھوٹنے والے مسائل گلز ڈیلیوز کی خودکشی کا سبب بنے'' (البرہان ، مارچ ص 42) لیکن خود ہی اپنی تردید کرتے ہوئے کانٹ اور ہیگل کے خیالات بھی پیش کر دیے کہ انسان خودکشی کیوں کرتا ہے؟ ہمیں نہیں معلوم کہ کوئی ذی شعور انسان ڈاکٹر صاحب کا مضمون پڑھ کر خودکشی کو سائنس وٹیکنالوجی کا شاخسانہ قرار دے سکتا ہے ۔ ڈاکٹر صاحب نے تاریخی استدلال کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے روم و ایران سے مسلمانوں کی جنگوں کو بھی اپنے نظریات کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ'' مسلمانوں کے پاس روم و ایران کی سائنس وٹیکنالوجی کے مقابلے میں صرف ایمان کی قوت تھی'' (البرہان مارچ ص 44)''صرف ایمان کی قوت تھی'' میں صرف پر زور دے کر یہ بتایا جا رہا ہے کہ مسلمان سائنس وٹیکنالوجی سے نہ صرف کہ واقف نہیں تھے بلکہ حد درجہ لاپرواہ بھی تھے ، اسی لیے مسلمانوں کو فتح ہوئی اور سائنس و ٹیکنالوجی کو شکست ۔ اس استدال کا لازمی نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ ملا عمر کے طالبان کو فتح نصیب ہوتی اور امریکہ کو شکست فاش ۔مگر نہ معلوم کہ اچانک کیا ہوگیا ۔ واقعی ۔ 'مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی' کا مفہوم اب سمجھ میں آ سکتا ہے ۔!

ڈاکٹر صاحب کے لیے واجب تو یہ تھا کہ وہ روم و ایران کی سائنس وٹیکنالوجی کی مسلمانوں پر برتری ثابت کرتے تا کہ ان کی بات میں وزن پیدا ہوتا۔ حالانکہ مورخ ان کی شکست کے اسباب میں ان کی داخلی کمزوریوں کو سرفہرست رکھتے ہیں ۔ یہ دونوں طاقتیں نہ صرف ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہ کر کمزور ہو چکی تھیں بلکہ اندورنی خلفشار میں بھی مبتلا تھیں ۔ ایڈورڈ گبن کی مشہور زمانہ کتاب کا حوالہ دے کر ہم اپنے اوپر مغرب سے مرعوبیت کا الزام نہیں لینا چاہتے تھے مگر کیا حرج ہے کہ اس کا سرسری سا مطالعہ ہی کر لیا جائے ۔

ہم اس مضمون کی اشاعت کو ''البرہان'' کے صفحات کا ضیاع ہی سمجھتے ہیں ۔تاہم اس فکر کو شاید ''البرہان'' کی پالیسی نہ سمجھا جا سکے ۔ کیونکہ اسی شمارے کے آخر میں پروفیسر ارشد جاوید صاحب کی کتاب کا تعارف کروایا گیا ہے جس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ'' مسلمانوں کا ہزار سالہ عروج سیاسی ، سائنسی،طبی وعلمی ۔۔۔۔ وہ دور اب بھی واپس آ سکتا ہے جس میں مسلم تہذیب نے زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں،خصوصاً سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبے میں'' (البرہان ، مارچ ص 53) بلکہ زیادہ درست رویہ یہ ہوگا کہ ہم اس تحریر کا اختتام ''البرہان'' کے مدیر محترم ڈاکٹر محمد امین صاحب کے مضمون'' مسلمانوں کی ترقی کا واحد راستہ'' کے چند جملوں پر کریں ۔

مدیر محترم رقمطراز ہیں :

۱۔'' اگر ہم قرآن وسنت کی روشنی میں قوموں کے عروج و زوال کا جائزہ لیں تو درج ذیل اصول ہمارے سامنے آتے ہیں:

انسان: اس کائنات اور انسان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے، اس نے انسان کو کائنات میں تصرف کی صلاحیت اور اختیار دیا ہے اور کائنات اس کے لیے پیدا کی ہے۔ انسان کو اس نے زمین میں قیامت تک کے لیے سامان زیست مہیا کیا ہے تا کہ وہ یہاں بخوبی زندگی گزار سکیں۔ (ص46)

۲۔'' آج اہلِ مغرب کامیاب ہیں، اگرچہ وہ اللہ کی اطاعت کے راستے پر نہیں چل رہے اور دنیوی زندگی گزارنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کو انہوں نے رد کر دیا ہے۔ ان کی کامیابیوں کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو منظّم کر کے اسبابِ زندگی مہیا کرنے پر دوسروں سے بہتر قدرت حاصل کر لی ہے'' (ایضاً ص48)

۳۔ '' آج مسلمان اس لیے دنیا میں ناکام ہیں کہ ان کا معاشرہ اور ان کی اکثریت اللہ کی اطاعت کی زندگی نہیں گزار رہی۔ اگر وہ اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گزار رہے ہوتے تو ان کی انسانی صلاحتیں بھی بہتر طور پر منظّم ہو جاتیں، وہ اسباب زندگی مہیا کرنے پر بھی قادر ہو جاتے اور یوں دنیا میں بھی کامیاب ٹھہرتے۔ (ص48)

۴۔ (مسلمان) احکامِ الٰہی کی عدم اطاعت کا راستہ اختیار کرنے کی وجہ سے اس قوت سے محروم ہو جائیں گے کہ اپنی صلاحیتوں کو منظّم کر سکیں اور اسبابِ زندگی مہیا کرنے پر قادر ہو سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان آج دنیا میں ذلیل وخوار ہو رہے ہیں۔ (ص40)

۵۔'' دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی کا طریقہ یہی ہے کہ دنیوی زندگی اللہ کے احکام کے مطابق گزاری جائے اس سے نہ صرف آخرت میں کامیابی یقینی ہو جائے گی بلکہ انسانی صلاحیتوں کے بہتر استعمال کی وجہ سے مسلمان اسباب دنیا مہیا کرنے میں بھی دوسروں سے آگے نکل جائیں گے۔'' (ص49)

اس مضمون کا خلاصہ کرتے ہوئے مدیرِ محترم ہمیں سائنس وٹیکنالوجی کے بارے میں درست و معتدل رویہ اپنانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ آپ کے بقول'' دنیا میں مسلمانوں کی ترقی اور کامیابی کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ سچ مچ اللہ کی اطاعت کا راستہ اختیار کر لیں اور منافقت و دوعملی چھوڑ دیں۔ اس طرح ان کی انسانی صلاحیتوں کی بہتر نشونما ہو گی اور وہ دوسروں سے بہتر انداز میں اسباب زندگی مہیا کرنے پر قادر ہو جائیں گے۔ (ص50)

اور ہمارا خیال ہے کہ دوسروں سے بہتر انداز میں اسباب زندگی حاصل کرنے ہی کا دوسرا نام سائنس وٹیکنالوجی کا دوسروں سے بڑھ کر استعمال ہے جو مسلمانوں کا سب سے زیادہ حق ہے۔

ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی

وسطیه (۲)
اسلام کا فلسفۂ اعتدال

توازن اور اعتدال میں بگاڑ کے اسباب

توازن اور اعتدال کو بگاڑنے والے اسباب بہت سے ہیں، ان تمام اسباب کی روک تھام ضروری ہے۔ ان میں ایک سبب غلو یا انتہاء پسندی ہے۔ انتہاء پسندی کا دائرہ مذہبی امور سے لے کر معاشرتی رسوم ورواج اور سیاسی افکار ونظریات سب کو محیط ہے۔

قرآن حکیم نے اہل کتاب کے غلو فی الدین کو رد کیا ہے اور دینی امور میں غلو کو ممنوع قرار دیا ہے، اہل کتاب نے حضرت عیسی علیہ السلام کو مقامِ رسالت سے بلند کر کے درجہ الوہیت پر فائز کر دیا تھا، انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ کہہ کر خدائی میں شریک کر دیا۔ سورہ نساء میں ارشاد ہے:

''یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ وَ لَا تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ اِلَّا الْحَقَّ اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَ کَلِمَتُہٗ'' (النساء۴:۱۷۱)

اے اہل کتاب: اپنے دین کے معاملہ میں حد سے نہ بڑھو اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں حق کے سوا کچھ نہ کہو، مسیح بن مریم تو محض اللہ کے رسول اور اس کا کلمہ (نشانی) تھے۔

عیسائیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے کے دعوے کو اس قدر شدت سے پھیلایا کہ اس پروپیگنڈے نے دیگر مذاہب کے لوگوں سے نہ صرف تصادم کی صورت اختیار کی بلکہ تثلیث کے من گھڑت عقیدہ کی اشاعت بھی شروع کر دی۔ دوسری طرف ایک پاک دامن اور باکردار خاتون پر زنا کی تہمت لگائی، یہ سب دین میں انتہاء پسندی تھی۔ ایک اور آیتِ مبارکہ میں غلو فی الدین سے اس طرح منع کیا گیا ہے:

''قُلْ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ غَیْرَ الْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعُوْٓا اَھْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَ اَضَلُّوْا کَثِیْرًا وَّ ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ'' (المائدہ۵:۷۷)

اے محمد ﷺ اہل کتاب سے کہہ دیجیے کہ اپنے دین کے معاملہ میں ناحق غلو نہ کرو، اور نہ لوگوں کی خواہشاتِ نفسانی کی پیروی کرو کہ جو خود پہلے گمراہ ہوئے اور پھر بہت سے لوگوں کو سیدھے راستہ سے بھٹکایا۔

یہود ونصاریٰ دونوں کی جانب سے غلو پایا جاتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام قرار دے لیتے ہیں اور حرام کردہ چیزوں کو حلال کر لیتے ہیں، اس طرح دین میں تحریف اور افراط وتفریط کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں (۱)

تعدّی بھی اعتدال کو بگاڑنے کا ایک سبب ہوتا ہے، تعدی کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی قانونی اور اخلاقی حدود کو پامال کر کے دوسرے کو نقصان پہنچائے یا اس کے ساتھ زیادتی کرے۔ عام طور پر اس کی وجہ خود غرضی، حسد، تعصب یا حرص ولالچ ہوتے ہیں، قرآن وسنت کی رو سے یہ تمام رذائل حرام ہیں۔ قرآن حکیم نے اعتداء یا تعدی کو ظلم کے مترادف قرار دیا ہے:

"وَ مَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ" (البقرہ۲:۲۲۹)

جو شخص اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود سے تجاوز کر جائے تو ظالموں میں شامل ہے۔

اس آیت مبارکہ کا تعلق عائلی نظام سے متعلق احکام سے ہے، یہ احکام اللہ تعالیٰ کی جانب سے مقرر ہیں خاندان کے نظم میں اللہ تعالیٰ نے کچھ حدود و قیود مقرر کر دی ہیں تا کہ خاندانی نظام کی نہ صرف حفاظت کی جا سکے بلکہ عدل کے تقاضوں کو بھی پورا کیا جا سکے۔ قرآن حکیم نے تو میدان جنگ میں بھی دشمن کے ساتھ بھی اعتداء سے منع کیا ہے:

"وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْن" (البقرہ۲:۲۲۹)

جو لوگ تم سے قتال کرتے ہیں تو تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں ان سے قتال کرو مگر زیادتی نہ کرنا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں سے محبت نہیں رکھتا۔

"وَ لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْکُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا" (المائدہ:۵:۲)

اور ان لوگوں کی دشمنی جنہوں نے تمہیں مسجد حرام جانے سے روک دیا تھا، تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم ان پر زیادتی کرنے لگو۔

قرآن حکیم میں تقریباً ۳۴ (چونتیس) آیات ہیں جن میں اعتداء کا ذکر ہے، جن میں اللہ تعالیٰ نے اس کو انتہائی ناپسندیدہ اور گناہ قرار دیا ہے اور اس کی روک تھام کے لیے ہدایات دیں ہیں۔

اعتدال اور توازن میں بگاڑ کا ایک اہم سبب ظلم ہے۔ مسلمان مفکرین کے بقول ظلم کا مفہوم یہ

۱۔ دیکھیے: آل عمران ۳۱:۹۳

ہے **وضع الشیئی فی غیر محله**(۱) یعنی کسی چیز کو اس کے اصل مقام سے ہٹا کر غیر موزوں مقام پر رکھنا ظلم ہے۔ اس تعریف کے لحاظ سے ظلم کا دائرہ بہت وسیع ہے، اس میں وہ تمام اسباب بھی آجاتے ہیں جنہیں ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں، یہاں ہم اس کو ایک بڑے سبب کے طور پر الگ سے بیان کر رہے ہیں اور ظلم کی اصطلاح کو اس معروف مفہوم میں استعمال کر رہے ہیں جس مفہوم میں آج ہمارے معاشرہ میں اسے استعمال کیا جاتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ کسی فرد، جماعت یا علاقہ کے لوگوں کے جان، مال اور علاقوں پر جارحیت کا ارتکاب کرنا۔

ظلم جسمانی تشدد کی صورت میں بھی ہوسکتا ہے، معاشی استحصال کی صورت میں بھی ہوسکتا، ناجائز سیاسی تسلط اور دباؤ کے ذریعہ بھی ہوسکتا ہے، اعتدال کی قوتوں کو سب سے زیادہ خطرہ اس ظلم سے ہوتا ہے جو ایک ملک کی جانب سے دوسرے ملک کے لوگوں پر کیا جاتا ہے۔ گزشتہ صدی کی ظلم کی بدترین مثال تو وہ ہے جو ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے قیام سے لے کر آج تک تسلسل کے ساتھ چلی آرہی ہے۔ دنیا کے مختلف علاقوں کے یہودیوں کو فلسطین میں آباد کرنے کے لیے فلسطینیوں کے علاقوں پر قبضہ کیا گیا۔ نہتے فلسطینیوں کا قتل عام کیا گیا۔ اردن اور شام کے علاقوں پر ناجائز قبضہ کیا گیا۔ یہودیوں کی ناجائز بستیوں کے قیام کا سلسلہ اب تک جاری ہے، ہزاروں فلسطینی اب تک شہید ہو چکے ہیں، ہزاروں بے گھر ہو گئے ہیں، ان کے گھروں اور بستیوں پر غاصبوں کا قبضہ ہے۔ مظلوم فلسطینیوں کی کوئی دادرسی نہیں ہوئی۔ فلسطینیوں کے خلاف ظالمانہ کارروائیوں میں صرف اسرائیل تنہا نہیں، اس میں امریکہ سمیت بہت سی طاقتیں شریک ہیں۔

فلسطینیوں کی طرح کشمیری بھی مظلوم ہیں۔ بھارتی حکومت اور فوج نے گذشتہ ساٹھ سالوں میں سیکڑوں کشمیریوں کو شہید کیا۔ اقوام متحدہ نے قرارداد کے ذریعہ جو رائے شماری کا حق دیا تھا کشمیری آج تک اس سے محروم ہیں۔ کون سا ظلم ہے جو بھارتی حکومت اور فوج نے ان پر نہ ڈھایا ہو حتی کہ انہیں بنیادی انسانی حقوق بھی حاصل نہیں۔ نہتے نوجوانوں، خواتین اور بچوں پر ہر قسم کا تشدد کیا جا رہا ہے۔

سرزمین عراق بھی امریکیوں کے ظلم سے محفوظ نہیں رہی، امریکیوں نے یہ بہانہ بنا کر حملہ کیا تھا کہ عراق کے پاس وسیع پیمانہ پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار ہیں، لیکن آج تک وہ ہتھیار عراق میں دستیاب

۱۔ تعریف اصمعی نے کی ہے، دیکھیے، ابو منصور محمد بن احمد الازھری، تہذیب اللغہ، دار احیاء الترث العربی بیروت ۲۰۰۱)۔ ۱۴۹/ص ۲۷۴ء

نہیں ہو سکے، اگر اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ جس ملک کے پاس وسیع پیمانہ پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار ہوں تو اس ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے تو اس پر بہت سے ترقی یافتہ ممالک پورے اتریں گے۔ کیا ان کے خلاف بھی ایسی ہی کارروائی ہونی چاہیے؟ عراقی تو بیچارے امریکی دہشت گردی کا شکار ہو گئے۔ لاکھوں معصوم انسان امریکی بمباری کے نتیجہ میں ہلاک، اپاہج اور معذور ہو گئے، عراقیوں کے تیل اور دیگر وسائل پر ناجائز قبضہ جما لیا گیا۔ آج عراقی بیرونی جارحیت اور ظلم وستم کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔

افغانستان بھی بیرونی ظلم کی ایک جیتی جاگتی مثال ہے۔ افغانیوں کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ کسی بیرونی استعمار کی غلامی کو قبول نہیں کرتے۔ افغانستان پہلے روسیوں کی جارحیت کا شکار ہوا۔ افغانی پوری جرأت کے ساتھ سالہا سال روسی استعمار کے خلاف نبرد آزما رہے۔ اب یہ افغان امریکی اور اس کے اتحادی استعمار کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ طاقت کا توازن افغانیوں کے حق میں بہت کمزور ہے، اس لیے استعمار کو مکمل شکست سے دو چار ہونے میں وقت لگ رہا ہے۔ بہرحال عدل وانصاف کی نظر سے دیکھنے والے افغانیوں پر ڈھائے جانے والے ظلم وستم کو محسوس کر سکتے ہیں۔

ظلم کی ایک اور مثال پاکستان کے شمالی علاقوں میں بیرونی ڈرون حملے ہیں۔ شمالی علاقوں کے بے شمار لوگ بمباری کی وجہ سے ہلاک، زخمی اور اپاہج ہو رہے ہیں، جو لوگ ڈرون حملوں کا شکار ہو رہے ہیں انہیں ہم تین قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

مجرم: یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے خلاف کوئی جرم عدالتی یا مجاز عدالتی کارروائی کے نتیجہ میں ثابت ہو چکا ہو۔ ہماری معلومات کی حد تک ان حملوں میں کوئی مجرم ہلاک نہیں ہوا۔

ملزم: دوسرا درجہ ملزم کا ہے۔ ملزم وہ ہوتا ہے جس کے خلاف کوئی الزام عائد کیا گیا ہو۔ ایسے فرد کے بارے میں دونوں احتمال ہوتے ہیں وہ معصوم بھی ہوسکتا ہے اور مجرم بھی۔ دنیا کے کسی قانون میں کسی ملزم کو اس وقت تک سزا نہیں دی جا سکتی جب تک اس کے خلاف جرم ثابت نہ ہو جائے

معصوم: تیسرے وہ لوگ ہیں جو معصوم کہلاتے ہیں۔ نہ مجرم ہیں نہ ہی ملزم بلکہ عام معصوم شہری ہیں۔

شمالی علاقوں میں میزائل حملوں اور بمباری کے نتیجہ میں پانچ یا چھ فیصد لوگ ایسے ہوں گے جنہیں ملزم کہا جا سکے، باقی پچانوے فیصد معصوم شہری شہید ہو رہے ہیں جن میں بوڑھے، بچے اور خواتین شامل ہیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ اس ظلم کے خلاف کوئی مؤثر آواز نہیں اٹھائی گئی۔ آخر آزادی کے ان متوالوں کا

خون ناحق کب تک بہتا رہے گا! تقریباً پچاس برس قبل ویت نام کے بے گناہ شہری بھی سالہا سال تک امریکی بربریت اور ظلم وستم کا شکار رہے، لیکن جارح استعمار کے خلاف بڑے عزم و ہمت اور دلجمعی کے ساتھ لڑتے رہے۔ بالآخر ظالم قوت کو وہاں سے نکلنا پڑا۔

یہ چند واقعات بطور مثال یہاں بیان کیے گئے ہیں، ورنہ استعماری قوتوں کی داستان ظلم وستم بہت طویل ہے، یہ مقالہ ظلم کی مزید داستانوں کی تفصیل کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ ان مثالوں کو بھی یہاں صرف اس لیے بیان کیا گیا ہے تاکہ اس بات کی وضاحت کی جا سکے کہ بین الاقوامی طور پر لوگوں میں بے چینی، خوف و دہشت پھیلنے کے اسباب کیا ہیں، اعتدال اور توازن میں بگاڑ کیوں پیدا ہو رہا ہے اور پھر نتیجتاً کس قسم کا ردعمل پیدا ہو رہا ہے۔

قرآن حکیم نے ظلم کو حرام قرار دیا ہے لیکن مظلوم کو نہ صرف یہ کہ بدلہ لینے کا حق دیا ہے، بلکہ مظلوم کی دادرسی کو بھی ضروری قرار دیا:

"وَلَمَنِ انتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِکَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْل" (الشوریٰ ۴۲:۴۱)

اور جو کوئی اپنے اوپر ظلم کیے جانے کے بعد بدلہ لے تو ان پر کوئی الزام نہیں۔

" اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِکَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ" (الشوریٰ ۴۲:۴۲)

الزام تو ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں، اور زمین میں ناحق فساد پھیلاتے ہیں یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔

"وَ مَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّى الْقَتْلِ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا" (الاسراء ۱۷:۳۳)

اور جو شخص بطور ظلم قتل کیا گیا تو ہم نے اس کے وارث کو (قصاص کا) حق دیا ہے، اسے چاہیے کہ قصاص میں زیادتی نہ کرے، بلاشبہ اس کی مدد کی جائے گی۔

" اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ" (الحج ۲۲:۳۹،۴۰)

جن لوگوں پر (خوامخواہ) جنگ مسلط کی گئی، انہیں اجازت دی جاتی ہے کہ وہ بھی لڑیں، کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے، اور اللہ تعالیٰ ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ناحق ان کے گھروں سے نکالا

گیا۔ ان کا قصور سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ وہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا رب صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

ان آیات سے واضح طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مظلوم کو بے یارومددگار نہ چھوڑا جائے، گویا شرعاً مظلوم کی مدد کرنا فرض ہے۔ ایک حدیث میں آپ کا ارشاد ہے

انصر اخاک ظالما او مظلوما(۱)

اپنے بھائی کی مدد کرو، ظالم ہو یا مظلوم، صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مظلوم کی مدد کی بات تو سمجھ میں آتی ہے، مگر ظالم کی کیسے مدد کی جائے؟ آپؐ نے فرمایا ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روک دو۔

ہمارے فقہاء کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ظلم کا خاتمہ ضروری ہے، اور جنگ کا محرک بھی ظلم ہی کا خاتمہ ہے نہ کہ مذہبی مخالفت۔ احناف کی رائے یہ ہے کہ انسان کی زندگی و حیات قابل احترام ہے اسے شرعی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا موقع ملنا چاہیے، جبکہ قتل کی اباحت عارضی ہے جس کی اجازت شر کو دفع کرنے کے لیے دی گئی ہے۔ فقہاء احناف کی رائے ہے کہ محض کفر، کفار کے ساتھ جنگ کا سبب نہیں بلکہ ظلم و شر اس کا سبب ہوتا ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک بھی کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنا خون بہائے یا دوسرے کا۔ ہاں مگر حق کے ساتھ۔**(۲)**

ہماری مندرجہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مظلوم کو نہ صرف صدائے احتجاج بلند کرنے کا حق ہے، جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

"لاَ يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْماً "

[النساء۴:۱۴۸]

اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کسی کو علانیہ برا بھلا کہا جائے، ہاں مگر جو مظلوم ہے اسے حق ہے، اور اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

مظلوم کو نہ صرف بدلہ لینے اور جوابی کارروائی کرنے کا حق ہے بلکہ مظلوم کی بھرپور حمایت کرنا بھی تمام انصاف پسند لوگوں کے لیے ضروری ہے۔ انہیں تنہا نہیں چھوڑا جا سکتا۔ عدل و انصاف کی خاطر تمام منصف مزاج لوگوں اور قوموں کو مظلوم کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ عدل

۱۔ بخاری، الجامع الصحیح، ابواب المظالم۔ مسلم، الجامع الصحیح، باب نصر المسلم ظالماً اومظلوماً

۲۔ وھبہ زحیلی، بین الاقوامی تعلقات، ترجمہ حکیم اللہ، شریعہ اکیڈمی، ۲۰۱۰ء، ص ۱۳۸

کے بغیر اعتدال کو قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ دنیا بھر میں اعتدال وتوازن برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان تمام اسباب کا سدباب کیا جائے جن سے نفرتیں اور دشمنیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک پر امن اور پرسکون معاشرہ قائم کرنے کے لیے ہمیں ظلم، عداوت، تعصّبات، نفرتوں اور ناانصافیوں کو ہر سطح پر ختم کرنا ہوگا۔

مدیر کے نام

☆ محلے کی مسجد میں پہلے آپ سے وقتاً فوقتاً ملاقات ہوجاتی تھی۔ اب میں پچھلے کئی ماہ سے علیل ہوں چل بھی نہیں سکتا اس لیے مسجد جانے سے بھی معذور ہوں۔ اب نظر بھی تقریباً بند ہوگئی ہے اور میرے لیے پڑھنا ممکن نہیں رہا۔ اس کے باوجود میں البرہان کی زراعانت کے ۴۰۰ روپے بھجوا رہا ہوں تاکہ اس میں میرا حصہ بھی شامل ہوجائے۔ البرہان بہت معیاری پرچہ ہے اور مجھے بہت پسند ہے۔

عبدالرشید، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

☆ میں آپ کے ماہنامہ ''البرہان لاہور'' کا باقاعدہ قاری ہوں۔ جو درد اور احساس آپ کے دل میں ہے اور جو آپ کی تحریروں سے بھی عیاں ہے وہ قابل تحسین اور لائق داد ہے۔ اس وقت ملک عزیز چاروں طرف سے گھمبیر مسائل کا شکار ہے اور ہر طرف مایوسی اور ناامیدی کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ میں آپ سے صد فیصد اتفاق کرتا ہوں کہ ان سب مسائل کا واحد حل صرف اور صرف معیاری اور بامقصد تعلیم و تربیت میں پنہاں ہے۔ آپ ان مسائل کے حل کے لیے تگ و دو کر رہے ہیں اور ''اپنے حصے کی شمع'' روشن کیے ہوئے ہیں۔ یہ شمع روشن کرنے والوں اور اس کے لیے تگ و دو کرنے والوں کو میرا سلام پہنچا دیجیے گا۔

میں قوی امید رکھتا ہوں کہ آپ کی جلائی ہوئی شمع اہل عقل و دانش اور ملک کے لیے فکر کرنے والوں کے لیے چراغ راہ ثابت ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا فکر و فلسفہ ہی ہمارے تمام مسائل کا حل ہے۔ آپ جن تعلیمی کاوشوں کے لیے سرگرم ہیں ضروری ہے کہ ہمارے دور کے دیگر اہل دانش اس طرف کان دھریں اور عملی اقدامات کے لیے کوششیں تیز کریں۔ مجھے یقین ہے کہ بالآخر ہماری نجات مثبت تعلیمی انقلاب میں ہے جس کی نوید آپ اور اپ کے ساتھیوں کی تحریروں میں موجود ہوتی ہے۔ آپ اور آپ کے ساتھی اپنے اپنے حصے کی شمع روشن کر رہے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ دوسرے بھی اس طرف توجہ دیں اور ملک عزیز کو عظیم تر بنانے میں اپنا تعمیری اور مثبت کردار ادا کریں کیونکہ:

شکوۂ ظلمت شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

محمد اسلم بھٹی
وائس پرنسپل پاک ترک انٹرنیشنل سکولز اینڈ کالجز، لاہور

ڈاکٹر محمد امین کی بعض اہم تالیفات

اردو

۱۔ ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل
۲۔ ہمارا دینی نظامِ تعلیم
۳۔ تعلیمی ادارے اور کردار سازی
۴۔ مسلم نشأۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل
۵۔ اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش
۶۔ اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی نفسیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ)
۷۔ حقیقتِ تزکیۂ نفس
۸۔ ترکِ رذائل (اصلاح اعمال و اخلاق کا حصہ اول)
۹۔ اسلام اور پاکستان
۱۰۔ اسلامی انقلاب۔ مفہوم، تقاضے اور حکمت عملی
۱۱۔ عصر حاضر اور اسلام کا نظامِ قانون
۱۲۔ مقالاتِ امین (دو جلدیں)
۱۳۔ مطالعۂ قرآن و حدیث (برائے جماعت اول تا پنجم)

بروشرز

۱۴۔ پرائیویٹ سکولوں کے نام ایک اہم پیغام
۱۵۔ طلبہ کی اسلامی تربیت۔ کیوں اور کیسے؟
۱۶۔ انگلش میڈیم۔ فائدے اور نقصانات
۱۷۔ دینی مدارس کے نام۔ ایک اہم پیغام
۱۸۔ مسلمانوں کی ترقی کا واحد راستہ
۱۹۔ حقیقتِ تصوف

انگریزی

۲۰۔ Riyadh-us Saliheen (2 Vols)
۲۱۔ Noble Quran, Part 1
۲۲۔ Islamization of Laws in Pakistan

عربی

۲۳۔ السلطة التشريعية ۔ دراسة مقارنة

ہم حمایت کرتے ہیں

امت مسلمہ زوال سے نکلنے کی جدوجہد کررہی ہے۔ منزل سب کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں دینی احکام پرعمل اور اعلاء کلمۃ اللہ ہے۔ اسے آپ اسلامی نظام کہہ لیجیے، نفاذ شریعت کہیے، اسلامی انقلاب کا نام دیجیے یا بحالیٔ خلافت و نظامِ مصطفیٰ کہیے، بات ایک ہی ہے۔ اور اس منزل تک پہنچنے کے لیے لوگ مختلف طریقوں سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ کوئی دعوت دین میں مصروف ہے تو کوئی فرد کی اصلاح کے لیے کوشاں ہے۔ کوئی سیاسی جدوجہد کررہا ہے تو کوئی تعلیمی میدان میں مشغول ہے اور کوئی کفار کا غلبہ اپنے معاشرے سے ختم کرنے کے لیے مسلح جدوجہد کررہا ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ ساری کوششیں محمود ہیں۔ ان کے کرنے والے قابل مبارکباد اور حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔ یہ کم نظری ہوگی کہ یہ آپس میں الجھیں اور ایک دوسرے سے کہے کہ تم غلط ہو اور دوسرا تیسرے سے کہے کہ تمہارا منہج درست نہیں ہے اور ہر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ صرف اس کا منہج ہی درست ہے اور حق اس کے مؤقف میں منحصر ہے؛ کیونکہ کسی پر وحی نازل نہیں ہوتی اور نہ کوئی پیغمبر ﷺ کی طرح معصوم ہے۔ اجتہادی رائے ٹھیک بھی ہوسکتی ہے اور غلط بھی اور اخلاص کے ساتھ اگر غلط بھی ہو تو قابل ثواب ہے۔ لہٰذا ہمارا مؤقف یہ ہے کہ یہ سارے منہج درست ہیں۔ یہ سب لوگ اس وقت تک صحیح ہیں جب تک وہ اپنی منزل کے بارے میں یکسو ہیں اور اس کی طرف پیش قدمی کررہے ہیں۔ طریق کار کا اختلاف بے معنی ہے بلکہ ہمیں کہنے دیجیے کہ یہ رحمت ہے کہ اس میں وسعت ہے، اس میں لوگوں کی صلاحیتوں اور مزاجوں کا لحاظ ہے۔ جو لڑ نہیں سکتا وہ پڑھا تو سکتا ہے اور جو معلم نہیں ہے وہ داعی تو بن سکتا ہے اور جو کچھ نہیں کرسکتا وہ شریعت پر عمل تو کرسکتا ہے **وقس علی ذلک**۔

لہٰذا ہم ان سب کی حمایت کرتے ہیں۔ ان کی بھی جو جہاد کررہے ہیں، ان کی بھی جو تعلیم دے رہے ہیں، ان کی بھی جو دعوت دین میں مصروف ہیں اور ان کی بھی جو سیاسی جدوجہد کررہے ہیں اور ان کی بھی جو فرد کی اصلاح کے لیے کوشاں ہیں۔ اے دین کی راہ پر چلنے والو! اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو، تمہاری کوششوں میں برکت دے اور تمہیں کامیابی سے ہم کنار کرے۔

ہاں! ہم حمایت نہیں کرتے ان کی جو اللہ کی نافرمانی پر دلیر ہیں، جو شیطان کے بہکاوے میں آئے ہوئے ہیں، جو نفس کے غلام اور دنیا کے بندے بننے پر راضی ہیں یا جو کفار کے گماشتے ہیں، ان سے مرعوب ہیں اور ان کے راستے پر چلنے میں عافیت اور کامیابی محسوس کرتے ہیں۔ مسلمان کی شان تو یہ ہے کہ ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ

نظام تعلیم کی وحدت

یہ مضمون خلاصہ اور ضمیمہ ہے مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی معرکۃ الآراء کتاب 'برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت' کا چنانچہ وہ کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں ''منجملہ دیگر اہم مقاصد کے جو اس کتاب کے لکھنے میں مصنف کے پیش نظر تھے، بڑا مقصد 'نظام تعلیم کی وحدت' کے نظریہ کو پیش کرنا تھا، خدا کا شکر ہے کہ بعض ممتاز مفکرین اور ارباب سعی و عمل نے اس کو مستحق توجہ قرار دیا ہے بلکہ مولانا سید سلیمان ندوی نے خصوصیت کے ساتھ مختصر لفظوں میں خاکسار مصنف سے چاہا کہ اس 'تعلیمی خاکے' کو مرتب کر کے اُن کی خدمت میں پیش کروں۔ سید صاحب موصوف نے 'معارف' ماہ جولائی ۱۹۴۵ء میں شذرات کے تعارفی نوٹ کے ساتھ اس خلاصے کو شائع بھی کر دیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کی اس جلد کے ساتھ اس خلاصہ کو بھی ضمیمہ بنا دیا جائے۔''

یہ مضمون پڑھ کر ہمیں حوصلہ ہوا کہ پچھلی ربع صدی سے ثنویت کے خاتمے کی جو اذان ہم صحرا میں دے رہے ہیں تو اس میں ہمیں مولانا مناظر احسن گیلانیؒ جیسی ہستی کی متابعت کا شرف حاصل ہے۔ کاش ہمارے علماء کرام دینی مدارس کے نظام تعلیم پر نظر ثانی فرمائیں اور مولانا کی تجویز پر سنجیدگی سے غور فرمائیں۔ امین

مسلمانان ہند کی تعلیمی مشکلات ہی کا حل میری کتاب نظام تعلیم تربیت میں پیش کیا گیا ہے جو سالہا سال کے غور وفکر اور مختلف تعلیمی نظاموں کے تجربہ کے بعد مجھے معلوم ہوا ہے۔ چونکہ کتاب دو جلدوں میں پھیل گئی ہے اس لیے اس کا خلاصہ پیش کرتا ہوں:

ابتدا ہی میں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ مسلمان رہتے ہوئے اور حتی الوسع اسلامی زندگی سے اپنی زندگی کی آبیاری کرتے ہوئے مسلمان کس طرح تعلیم حاصل کر سکتے ہیں؟ میری بحث کا دائرہ صرف اسی بحث تک سر دست محدود ہے۔ چاہتا ہوں کہ اپنی تجویزوں کو پیش کرنے سے پہلے یہ عرض کروں کہ جن مشکلات کے تصور نے ان تجویزوں کے سوچنے پر مجھے مجبور کیا ہے، وہ کیا ہیں۔

۱۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے برخاست ہوجانے کے بعد حکومت مسلطہ نے تعلیم کا جو نظام ملک میں (اسکولوں اور کالجوں وغیرہ) کے نام سے قائم کیا، مشاہدہ بتا رہا ہے کہ اس نظام کی تعلیم سے استفادہ کرنے والے مسلمانوں میں بتدریج اسلام اور اسلامی زندگی سے بُعد پیدا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ جن خاندانوں میں جدید تعلیم تیسری اور چوتھی پشت میں اس وقت تک پہنچ چکی ہے، ان میں اسلام کا صرف نام رہ گیا ہے، عام ابتدائی باتیں بھی ان لوگوں کو اسلام کی معلوم نہیں۔ یہ سنی ہوئی نہیں دیکھی ہوئی بات ہے کہ اچھے لکھے پڑھے لوگ جن کا نام بھی مسلمان کا سا تھا، لیکن وہ

اپنے پیغمبرﷺ کی شخصیت تک سے ناواقف نظر آئے۔ظاہر ہے کہ اپنے دین سے جو اس حد تک دور ہو چکا ہو، وہ دین کی دوسری باتوں سے کس حد تک واقف رہ سکتا ہے! یہ واقعہ ہے کہ جیسے جیسے دن گزرتے جاتے ہیں اس قوم کے نام نہاد مسلمانوں کی تعداد بھی بڑھتی چلی جارہی ہے اور حالات میں کوئی تغیر اگر خدانخواستہ واقع نہ ہوا تو یہ تعداد یوں ہی اور بڑھتی چلی جائے گی۔

۲۔ حکومت کا میلان عموماً تعلیم کے لزوم کی طرف بڑھتا چلا جارہا ہے۔اس وقت تک تو اس تعلیم کے دائرے کو وسیع ہی کرنے پر حکومت قناعت کررہی ہے لیکن وہ دن دور نہیں ہے کہ ملک کے ہر باشندے کو مجبور کیا جائے گا کہ حکومت کے منظورہ کردہ نصاب کی تعلیم لازماً اپنے بچے اور بچیوں کو دلائے جس کے معنی یہی ہوسکتے ہیں کہ عام مسلمانوں کو تھوڑا بہت تعلق اسلام سے ابھی جو باقی ہے، تعلیم کی وسعت اور اس کا لزوم اس تعلق کو بھی کمزور کرتا چلا جائے گا۔تعلیم یافتہ طبقہ سے مایوس ہوکر علماء اسلام جن عام مسلمانوں کی دینی عقیدت پر بھروسہ کیے ہوئے ہیں اس عقیدت کی عمر بھی زیادہ دراز نظر نہیں آتی۔

۳۔ مذہب کے خلاف ہر زمانہ میں مختلف تحریکیں مختلف بھیسوں میں رونما ہوتی رہی ہیں۔ان تحریکوں کا مقابلہ ہر زمانہ کے علماء نے ان تحریکوں کی گہرائیوں تک خود پہنچنے کے بعد کیا ہے اور ہے بھی یہی بات کہ مرض کا علاج مرض کی صحیح واقفیت ہی کے بعد ممکن ہے، لیکن مرض کو مرض جیسی ناپاک چیز قرار دے کر اگر طبیب اس کے جاننے سے گریز کرے گا تو مریضوں کا علاج ہو چکا۔

دراصل یہی تین باتیں ہیں جنہیں دیکھ دیکھ کر شعوری اور غیر شعوری طور پر اسلام کے مخلصین بے چین ہیں۔خاکسار بھی ان حالات سے ہمیشہ متاثر رہا ہے۔تیس چالیس سال کے اس طویل عرصہ میں کیا کیا تجویزیں خود میرے دماغ میں آئیں، یا مجھ سے پہلے لوگوں نے اس سلسلہ میں مشکلات کے حل کی جو تدبیریں سوچیں ان سے بحث میں طوالت ہوگی۔اس وقت جن تجویزوں کو اپنے دماغ میں رکھتا ہوں اور تفصیلی ذکر جن کا اپنی کتاب تعلیم وتربیت میں مَیں نے کیا ہے ان کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم کے جو دو مستقل نظام (حکومتِ مُسلطہ) کے قیام کے بعد جاری ہوگئے ہیں اس کی دوئی اور ثنویت کو مٹا کر صرف ایک ہی نظام کو قبول کرلیا جائے۔اسی لیے اپنی تعلیمی تجویز کا نام میں نے 'وحدت نظام تعلیم' رکھا ہے۔

میں نے اپنی کتاب میں بتایا ہے کہ حکومت مسلطہ سے قبل مسلمانان ہند میں تعلیم کا جو نظام بظاہر

قائم تھا عام طور پر 'درس نظامیہ' کے نام سے جسے شہرت حاصل ہوگئی ہے اس کے متعلق لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کی صرف دینی تعلیم کا نظام تھا۔ میں نے تفصیل سے دکھایا ہے کہ درحقیقت اس نصاب میں اس عہد کی دفتری زبان فارسی کی نظم و نثر و انشاء وغیرہ کی بیسیوں کتابوں کے ساتھ ساتھ حساب، خطاطی وغیرہ کی مشق کرانے کے بعد اعلیٰ تعلیم عربی زبان کی کتابوں کے ذریعہ دی جاتی تھی۔ ابتداء سے آخر تک اس زمانہ کے تعلیمی نصاب کے ختم کرنے کی مدت پندرہ سولہ سال سے کم نہ تھی اور اس پوری مدت تعلیم میں درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے علماء صحیح معنوں میں خالص دینیات کی کل تین کتابیں پڑھا کرتے تھے یعنی چند مختصر فقہی متون کے سوا قرآن کے متعلق جلالین (جو عربی زبان میں قرآن کا ترجمہ اور مختصر حل ہے)، حدیث کے متعلق مشکوٰۃ اور فقہ کے سلسلہ میں گو بہ ظاہر نام تو دو کتابوں کا لیا جاتا تھا یعنی شرح وقایہ اور ہدایہ لیکن ہدایہ کے ان ابواب کو نہیں پڑھایا جاتا تھا جو شرح وقایہ میں پڑھائے جاتے تھے اسی لیے میں کہتا ہوں کہ حکماً وعملاً یہ ایک ہی کتاب کی تعلیم تھی۔ زیادہ سے زیادہ میرے اس بیان پر یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ ڈھائی پارے قرآن کے تفسیر بیضاوی کی مدد سے بھی پڑھائے جاتے تھے۔ اولاً یہ ڈھائی پارے ہر جگہ نہیں پڑھائے جاتے تھے خیر آبادی خانوادے میں صرف سوا پارہ بیضاوی کا جز و نصاب تھا لیکن اگر مان لیا جائے کہ بیضاوی بھی قرآن کے متعلق ایک کتاب درس نظامیہ والوں کو پڑھائی جاتی تھی تو مطلب کیا ہوا؟ یہی تو کہ پندرہ سولہ سال کی مدت میں گویا خالص اسلامی دینیات کی چار کتابوں کا پڑھنا دینی علوم سے مناسبت پیدا کرنے کے لیے کافی سمجھا جاتا تھا۔ ان چار کتابوں کے سوا تعلیم کی اس طویل مدت میں طلباء جو کچھ پڑھتے تھے، فارسی (یعنی دفتری زبان) کی مذکورۂ بالا بیسیوں نظم و نثر کی کتابوں کے سوا منطق، فلسفۂ ہئیت، اقلیدس، ادب عربی، اور بعض ایسے عقلی و ادبی علوم جنہیں خود مسلمانوں نے ایجاد کیا تھا یعنی علم کلام اور علم اصول فقہ، معانی و بیان وغیرہ۔ ان ہی علوم وفنون کی اتنی کتابوں کا ختم کرنا ضروری تھا جن میں صرف منطق و فلسفہ کی کتابوں کی تعداد آخر زمانہ میں چالیس پچاس سے متجاوز تھی۔

میں نے بزرگوں کے اسی طرز عمل کو پیش کرتے ہوئے یہ عرض کیا تھا کہ دینیات کی عمومی تعلیم کے لیے جب تین یا زیادہ سے زیادہ چار کتابوں کا پڑھ لینا کافی خیال کیا گیا تھا اور زیادہ وقت غیر دینی علوم ہی کی تعلیم میں صرف ہوتا تھا تو آج کل بھی کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ غیر دینی علوم کے اس حصہ کو جس کے اکثر نظریات و مسائل مسترد ہو چکے ہیں، کم ازکم دنیا میں ان کی مانگ باقی نہیں رہی ہے، ان کو

نکال کر عصر جدید کے مقبولہ علوم اور عہد حاضر کی دفتری زبان انگریزی کے نصاب کو قبول کر کے مذہب کی تعلیم کو ان ہی تین کتابوں کے معیار کے مطابق باقی رکھتے ہوئے دینی اور دنیاوی تعلیم کے مدارس کی اس تفریق کو ختم کر دیا جائے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے حکومت سے یہ استدعا کی جائے کہ جیسے پہلے ان کی تعلیم میں دین کا عنصر ہر زمانہ میں ایک لازمی اور ضروری مضمون کی حیثیت رکھتا تھا اب بھی اس عنصر کو لازم کر دیا جائے اور اس طور پر لازم کر دیا جائے کہ جیسے درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے دین کا علم ان کتابوں کے معیار کے مطابق اپنے پاس رکھتے تھے، اسی طرح بی اے کی تعلیم سے فارغ ہونے والے، اس زمانہ میں بھی اس حد تک مذہب کے عالم ہو کر نکلا کریں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں پھر دینیات کے مدارس کے نام سے الگ عام مدرسوں کے قائم کرنے کی ضرورت مسلمانوں کو باقی نہ رہے گی۔ ہر عالم اس وقت گریجوایٹ ہوگا اور ہر گریجوایٹ عالم۔ ملا ہی مسٹر ہوں گے اور مسٹر ہی ملا۔ عالم و تعلیم یافتہ کی تفریق کا قصہ ختم ہو جائے گا۔

یہ ہے خلاصہ اس تجویز کا جسے ''نظریۂ وحدت نظام تعلیم'' کے نام سے اپنی کتاب میں میں نے پیش کیا ہے اور اس کے تمام پہلوؤں پر جہاں تک میرے امکان میں تھا بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہاں درج کرتا ہوں۔ میری تجویز پر جو شبہات کیے جاتے ہیں ان ہی کا جواب اس خلاصہ میں دیا جائے گا۔ پہلا شبہ یہ ہے کہ دینیات کی ان تین کتابوں کے پڑھنے کے لیے عربی زبان سے کافی واقفیت ناگزیر ہے اور عربی زبان کا سیکھنا آسان نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ عربی زبان کے الفاظ کا ایک حصہ تو وہ ہے جس میں مسلمانوں کی دینی چیزیں مثلاً قرآن و حدیث وفقہ وغیرہ محفوظ ہیں، اس حصہ کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اردو بولنے والی قوموں کے لیے عربی زبان کا یہ حصہ تقریباً زبان کی حیثیت رکھتا ہے، یعنی اسی پچاسی فیصد الفاظ اس حصے کے اردو بولنے والے ہندی مسلمان کو باضابطہ عربی زبان سیکھے بغیر یوں ہی معلوم ہیں۔ چند اصولی باتوں کے جان لینے کے بعد اس عربی کو آدمی خود بخود سمجھنے لگتا ہے، البتہ عربی زبان کا وہ ذخیرہ جس میں ایام جاہلیت و عہد اسلامی کے شعراء کے اشعار یا محاضرات و معامرات و انشاء خالص ادبی نثر و نظم کی کتابیں ہیں یقیناً دشوار ہے لیکن اس عربی کے سیکھنے کی ضرورت ہر اس شخص کو نہیں ہے جو اپنی واقفیت صرف اسلامی امور تک محدود رکھنا چاہتا ہے۔

دوسرا شبہ یہ کیا گیا ہے کہ صرف ان تین کتابوں کے پڑھنے سے کیا اسلام کے دینی علوم میں ماہرانہ

قابلیت اور تبحر کیا کوئی حاصل کرسکتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ عام لزومی واقفیت اور چیز ہے اور تبحر و اختصاص کسی علم میں یہ بالکل ایک جداگانہ مقصد ہے۔ میری گفتگو صرف عام لزومی واقفیت تک محدود ہے۔ درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے عام علماء کی واقفیت و مناسبت کا جو معیار اسلامی علوم کے متعلق ہوتا تھا یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ ان تین کتابوں کو صحیح طور پر پڑھ لینے کے بعد امید کی جاتی ہے کہ اب بھی ان کے پڑھنے والے واقفیت و مناسبت کے اس معیار تک پہنچ سکتے ہیں۔

باقی تبحر و اختصاص اور ان علوم میں سے کسی خاص علم میں مہارت خصوصی کا مالک ہونا اس کے لیے ظاہر ہے کہ خصوصی مدارج کی تعلیم کی یقیناً ضرورت پڑے گی، جیسے دینی علوم کے معیار کو خصوصی کلاسوں کی تعلیم سے بلند کیا جاتا ہے وہی طرزِ عمل ہم اسلامی علوم کے متعلق بھی اختیار کر سکتے ہیں بلکہ طبعًا اختیار کرنا چاہیے۔

تیسرا شبہ یہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے اربابِ فکر ونظر نے اب تک جو کچھ سوچا، سمجھا، لکھا، پڑھا تھا دین سے ان کا خواہ تعلق نہ بھی ہو تو کیا ان کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا مناسب ہوگا، علی الخصوص ایسے علوم جن کا دین سے گونہ تعلق بھی ہے خصوصاً جن فنون کو مسلمانوں نے اسلام ہی کی صحیح تشریح وتوضیح کے لیے ایجاد کیا تھا مثلاً اصول فقہ، کلام یا بیان و معانی و بدیع وغیرہ کا جو حال ہے میں نے اس کا اپنی کتاب میں جواب دیا ہے کہ ان علوم کو زندہ رکھنے کے لیے یہ مناسب ہوگا کہ دوسرے اختیاری مضامین کے ساتھ ان مضامین کو بھی اختیاری مضامین کے ذیل میں رکھ دینا کافی ہوگا۔ کچھ لوگوں کا پڑھنا، پڑھانا ان کی بقاء اور ارتقاء کے لیے کافی ہے۔ بلکہ عربی زبان کے دوسرے ادبی حصہ کے متعلق بھی میرا خیال ہے کہ ان کو وہی اختیاری مضامین میں شریک کر کے زندہ رکھا جائے لیکن ہر مسلمان کو میلان باقی رکھنے کے لیے خصوصاً موجودہ حالت میں یعنی دماغ کی تعلیمی بیداری کے بعد اس عربی کی لزومی تعلیم قطعاً ضروری نہیں ہے۔

ایک شبہ یہ بھی کیا جاتا ہے کہ موجودہ مغربی تعلیم گاہوں کے نصاب میں دینیات کی تعلیم کے لازم کر دینے کے بعد اس کی توقع کی جاسکتی ہے کہ پڑھنے والوں کی زندگی اسلامی زندگی بن جائے گی؟ کیا ان کو جو ماحول میسر ہے، اس کے رسمی اثرات کے ازالہ کے لیے صرف تعلیم کافی ہے؟ بلاشبہ یہ آخری سوال بڑا جان گسل، زہرہ گداز اور حوصلہ شکن سوال ہے۔ ماحول حکومت کے نقطۂ نظر کا تابع ہوتا ہے، جب تک حکومت غیر اسلامی ہے اس کے پیدا کردہ ماحول میں اسلام کی قدر وعزت کی توقع

غلط توقع ہے لیکن پھر کیا کیا جائے؟ کیا مسلمانوں کو اسی حال میں چھوڑ دیا جائے؟ میرا خیال ہے کہ تعلیم کا بھی کچھ نہ کچھ اثر قلوب پر ضرور پڑتا ہے خصوصاً اگر پڑھانے والوں میں اثر کو متعدی کرنے کا سلیقہ ہو۔ اس کے ساتھ طبائع بھی ایک طرح کے نہیں ہوتے، اسی مخالفانہ ماحول سے آخر مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مولانا محمد علی جوہر مرحوم، ڈاکٹر اقبال مرحوم جیسے لوگ پیدا ہوتے رہے۔ جب ناواقفیت کے باوجود اسلام نے ان لوگوں کو اتنا متاثر کیا کہ بالآخر ان کو صحیح اسلام سے واقف ہونا پڑا تو پھر خدا کی رحمت سے ناامیدی کی راہ کیوں اختیار کی جائے؟ ہوسکتا ہے کہ قرآن کی پیغمبر کی زندگی کی، اسلامی نظام حیات (فقہ) کی تعلیم ان کو خود متاثر کرے۔ سب کو نہیں تو بعض کو تو ان شاء اللہ ضرور متاثر کر کے رہے گی اور ان بعض کا اثر ان شاء اللہ دوسروں کے متاثر ہونے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

بلکہ تعلیمی نظام کی وحدت کے ساتھ ساتھ مسلمان محکومیت کے اس دور میں اتنا کام اسی تعلیم کے متعلق اپنے ذمہ اگر اور لے لیں، یعنی ہر تعلیم گاہ کے ساتھ ساتھ مسلمان طلباء کے لیے خاص اسلامی اقامت خانے بھی قائم کیے جائیں، اور ان اقامت خانوں کی نگرانی ارباب تقویٰ و دیانت کے سپرد کی جائے ان کا ماحول بالکلیہ اسلامی ماحول رکھا جائے گا۔ تو اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے اس کے علاج کی ایک کافی کارگر صورت یہ بھی ہوسکتی ہے۔

علاوہ ان تمام باتوں کے ایک چیز اس سلسلہ میں قابل غور یہ بھی ہے کہ انگریزی جامعات اور مغربی طرز کی یونیورسٹیوں کے ماحول پر اگر ہم قابو نہیں پاسکتے تو آج مسلمانوں کے جو دینی مدارس ہیں ان میں جب جدید نصاب کو جاری کر دیا جائے گا تو ان کے ماحول تو ہمارے زیر اقتدار رہ سکتے ہیں۔ جدید علوم و فنون اور سرکاری عصری زبان کی تعلیم کے لیے مدرسین ان مدارس میں ایسے منتخب کیے جائیں جو نام کے ساتھ کام بھی مسلمانوں جیسے کرتے ہوں۔ بحمدللہ اب ان کی ایک کافی تعداد ملک میں پیدا ہوچکی ہے تلاش سے ایسے لوگ مل سکتے ہیں اور بالفرض سردست نہ بھی ملیں تو ایسی صورت میں میرا خیال ہے کہ بجائے ملحد اور بے دین نام نہاد مسلمانوں کے غیر اقوام کے اہل تقرر کر کے ہم خود اپنے ہاں ایسے لوگ پیدا کر سکتے ہیں جو آگے نکل کر خود ہمارے قدیم علوم و فنون کی تعلیم کا کام انجام دے سکتے ہیں۔ میں ملحد مسلمانوں سے غیر اقوام کے دھرمی معلموں کو اس باب میں زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔

آخری بات اس سلسلہ میں ابتدائی تعلیم کے متعلق میری جو تجویز ہے، اس کا پیش کرنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مسلمانوں پر عربی تعلیم کے لزوم کا مطالبہ شروع ہی سے حکومت کے آگے پیش کرنا چاہیے لیکن عربی

پڑھانے کا طریقہ یہ اختیار کرنا چاہیے کہ پہلے بچوں کو بغدادی قاعدہ کے اصول پر عربی حروف ہجا سے آشنا کیا جائے اور اسی طرح آشنا کیا جائے کہ جیسے اِس وقت کیا جاتا ہے۔ پھر ناظرہ قرآن بھی ہر بچے کو اسی طرح پڑھایا جائے جیسے اب تک رواج ہے قرآن کے بعد یا موقع ہو تو قرآن کے ساتھ ان ہی عربی حروف کی دوسری شکل یعنی خط نستعلیق ☆ سے بھی ان کو آشنا کیا جائے یعنی اردو پڑھائی جائے اور یہ دیکھ لینے کے بعد کہ خواندگی کی قدرت بچے میں اردو کی پیدا ہو چکی ہے، اور آئندہ اردو کو چھوڑ کر فارسی کے آمد نامہ اور کچھ تھوڑی بہت مناسبت اس سے پیدا کرا کے عربی میں طلبہ کو لگا دیا جائے یہی عربی پڑھتے ہوئے بی۔اے تک پہنچے گی اور اسی سلسلہ میں کچھ تھوڑی بہت ابتدائی عربی کے بعد دینیات کی مذکورہ بالا درس نظامیہ والی کتب ثلاثہ کے ختم کرانے کی کوشش کی جائے گی۔ عربی زبان کی تعلیم کا مطلب دینیات کی ان ہی تین کتابوں کو پڑھانا ہوگا۔

میری تجویز کا یہ اجمالی خاکہ ہے رہیں تفصیلات تو اصول کے طے پا جانے کے بعد ان کا مسئلہ چنداں دشوار نہیں ہے، مشورہ سے ان تفصیلات کو مرتب کیا جا سکتا ہے، البتہ اجمالاً چند کلی باتیں اس سلسلہ میں بھی جو میری سمجھ میں آئی ہیں اگر عرض کر دوں تو نامناسب نہ ہوگا:

۱۔ تعلیم کی مدت اگر وہی باقی رکھی جائے جو اس وقت یونیورسٹیوں میں مقرر ہے تو میٹرک تک عربی کے اس سلسلہ کو اس طریقہ سے پہنچنا چاہیے کہ میٹرک پاس کرنے والے معنی اور مختصر مطلب کے ساتھ قرآن ختم کر لیں اور انٹرمیڈیٹ پاس کرنے والوں کو مشکوٰۃ یا اسی قسم کی کوئی کتاب مجموعۂ حدیث کی پڑھا دی جائے اور بی اے پاس کرنے والوں کو فقہ کے متعلق اتنی معلومات حاصل کر لینی چاہئیں جو شرح وقایہ اور ہدایہ کے پڑھنے سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دینیات کی جن تین کتابوں کا تذکرہ شروع سے مَیں کرتا چلا آ رہا ہوں ان میں سے قرآن کو تو بہرحال قرآن ہی کے ذریعے سے پڑھانا چاہیے لیکن مشکوٰۃ و ہدایہ وغیرہ کا تذکرہ میں نے تمثیلاً کیا ہے، مقصود معیار کو تعین کرنا ہے یعنی ان کتابوں کے پڑھ لینے کے بعد حدیث و فقہ میں جتنی دسترس کے حاصل ہونے کی توقع کی جاتی ہے اس کو کسی ذریعہ سے حاصل کرنا چاہیے۔ املاء کا طریقہ اگر مفید سمجھا جائے تو اسی کو اختیار کیا جائے اور

☆ نستعلیق یا فارسی حروف سے طلبہ کو آشنا کرنے کی ضرورت بھی اسی وقت تک ہے جب تک طباعت کے لیے نسخ کے حروف کو اردو کے لیے تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اگر یہ مسئلہ طے ہو گیا تو پھر اس کی بھی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ البتہ لکھنے کی حد تک نستعلیق کو باقی رکھنا چاہیے، انگریزی میں طباعت اور کتابت کے حروف کی شکل جیسے ذرا بدلی ہوئی ہے، یہی طرز عمل ہم بھی اختیار کریں گے، نسخ طباعت کے لیے اور نستعلیق کتابت کے لیے۔

اگر خیال ہو کہ کتاب کے ذریعے سے زیادہ فائدہ پہنچ سکتا ہے تو کتابی تعلیم کے اس طریقے کو باقی رکھا جائے جواب تک عربی مدرسوں میں جاری ہے۔

۲۔ میرا خیال ہے کہ وحدت تعلیم کے نظریہ پر اگر اتفاق کرلیا جائے تو عربی کے عام مدارس جن ذرائع سے یہ خبر مجھ تک پہنچی ہے اس میں شک کی بہ ظاہر کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی، تو یوں سمجھیے کہ جس مطالبہ کی منظوری میں لوگ مایوسی کا اظہار کررہے ہیں، حکومت اس مطالبہ کو منظور کرچکی ہے۔ کلاسیکل زبانوں کی تشریح وتفصیل خود ہم مسلمانوں کو اسی شکل میں کرنا چاہیے جس کا ذکر اپنی تجویز میں خاکسار نے کیا ہے، جس میں اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں کی تعلیم عربی زبان کی تعلیم کی عملی شکل ہوگی۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اردو زبان کے مسئلہ کو بھی اسی تعبیر اور اسی تدبیر سے ہم بغیر کسی کش مکش کے بآسانی حل کرسکتے ہیں۔ میں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اردو کو مضبوط اور قوی کرنے کا صحیح ذریعہ یہ نہیں ہے کہ اردو کی ایک کتاب کے بعد اردو ہی کی دوسری کتاب مسلسل بچوں کو پڑھائی جائے بلکہ اردو کو قوی کرنے کے لیے ضرورت ہے فارسی سے مناسبت پیدا کرانے کی اور فارسی میں قوت وہی حاصل کرسکتا ہے جس نے عربی زبان سیکھی ہو۔ پانی میں پانی ملاتے چلے جانے سے کوئی نئی کیفیت پیدا نہیں ہوسکتی، اسی طرح اردو کی ایک کتاب کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری پڑھانے سے زیادہ بہتر ہے کہ جو وقت اردو کے پڑھانے میں صرف کیا جاتا ہے اسی وقت میں اردو کے بعد فارسی کے بعد عربی سے طلباء کا لگاؤ پیدا کیا جائے۔ یہ اردو ہی کے قوی کرنے کا ایک کارگر وبے خطا نسخہ ہوگا۔ بعض بزرگوں نے میری تجویز پر یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ علوم جدیدہ خصوصاً سائنس وکیمیاء وغیرہ جیسے علوم کی تعلیم بہت پُر مصارف ہے عربی کے غریب مدارس سے ان مصارف کی پابجائی کیا ممکن ہے؟ لیکن خاکسار یہ کب کہتا ہے کہ عربی مدارس میں ان علوم کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ میری تجویز تو یہ ہے کہ دینیات کی تعلیم کو ان مدارس میں منتقل کردیا جائے جہاں حکومت نے جدید علوم وفنون کی تعلیم کا نظم کررکھا ہے۔ چاہے تو کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی مدارس کو انگریزی مدارس نہیں، بلکہ انگریزی مدارس جو عموماً اس وقت شہروں اور قصبوں میں قائم ہیں ان کو قرآن کی بامعنی تعلیم کا مدرسہ قرار دے کر جدید علوم وفنون کا ہائی اسکول مسلمانوں کے لیے بنالیا جائے۔ اور اسلامی علوم کی تکمیل تعلیم کا مرکز عربی کے مختلف مرکزی مدارس کو قرار دیا جائے۔

اس وقت ہر صوبہ میں شرکائے وطن کے سیکڑوں فوقانی مدارس یعنی ہائی اسکول موجود ہیں، لیکن

مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ بعض صوبوں میں تو ان کا کوئی اسلامی اسکول ہی نہیں ہے اور جہاں کہیں ہیں بھی تو ان کی تعداد شرکائے وطن کے قائم کردہ اسکولوں کی تعداد کے مقابلہ میں صفر کی حیثیت رکھتی ہے لیکن جو تجویز پیش کی گئی ہے، اگر عمل کا قالب اس نے اختیار کرلیا تو مسلمانوں کے اسکولوں کی تعداد بھی اپنی آبادی کی نسبت سے کم نہ رہے گی بلکہ ہوسکتا ہے کہ اس مناسبت سے ان کی تعداد بڑھ جائے کیونکہ مشکل ہی سے ہندوستان کے کسی صوبہ کا کوئی ضلع، ضلع کا کوئی ایسا تعلقہ برٹش انڈیا خصوصاً شمالی ہند میں ایسا ہوگا جہاں کسی نہ کسی قسم کا عربی مدرسہ نہ قائم ہو۔ جدید علوم وفنون کی تعلیم کو قبول کر لینے کے بعد حکومت کا محکمۂ تعلیمات مالی اعانت پر مجبور ہوگا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ حکومت کی مالی اعانت اور چندوں سے جو امداد اب تک ان مدارس کو مل رہی ہے ان دونوں قسم کی رقوم سے بآسانی ہمارے عام عربی مدارس اچھے ہائی اسکولوں کی شکل اختیار کرلیں گے۔ کہنے کوتو یہ ہائی اسکول کہلائیں گے لیکن دراصل قرآن پڑھانے اور سمجھانے کے یہ مدارس ہوں گے۔ علماء ہی کی نگرانی میں عموماً چونکہ یہ مدارس ہوں گے اس لیے توقع کی جاتی ہے کہ تعلیم کا یہ ابتدائی دور مسلمان بچوں کا اسلامی ماحول ہی میں گزرے گا۔ باوجود اختصار کی شدید کوشش کے مضمون میں پھر بھی کافی طوالت پیدا ہوگئی۔ لیکن کیا کروں ضروری چیزوں سے خاموشی اختیار کرنے پر دل راضی نہیں ہوتا۔ آخر میں اتنی بات جس پر اپنی کتاب میں مَیں نے کافی بحث کی ہے اور بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ مسلمانان ہند کی تعلیم کے ان دو مستقل نظاموں کو ختم کرکے ایک ہی نظام تعلیم عمومی کا اگر نہ قائم کیا جائے گا تو اس علمی رقابت کی وجہ سے جو ان دونوں نظاموں سے استفادہ کرنے والے طبقات میں پیدا ہوگئی ہے، روز بروز اس میں اور شدت پیدا ہوتی چلی جائے گی، اس کا خاتمہ نہیں ہوسکتا۔ آج تو اس کے نتائج چنداں اہم نہیں محسوس ہورہے ہیں لیکن خدانخواستہ بات اگر یوں ہی بڑھتی رہی تو کچھ بعید نہیں ہے کہ مسلمانوں ہی میں مذہب اسلام کے دشمن اس لیے پیدا ہوجائیں کہ مذہب کے نمائندوں سے ان کے قلوب میں نفرت بڑھ رہی ہے، بالکل ممکن ہے کہ مذہبی نمائندوں کی یہ نفرت خدانخواستہ خود مذہب سے نفرت کا ذریعہ بن جائے (لا فعله الله) میرا خیال ہے کہ ملا اور مسٹر یا عالم اور تعلیم یافتہ کی تفریق کا جہاں تک جلد ممکن ہو خاتمہ کردینا چاہیے اور نظام تعلیم کی وحدت کے سوا اس کا بظاہر کوئی دوسرا علاج کم ازکم میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔

بلکہ آج اپنے مذہب اور مذہب کی اساسی کتابوں سے ناواقف تعلیم یافتہ مسلمانوں کو یہ دھوکا

جو دیا جار ہا ہے کہ جس شکل میں مذہب ان کے سامنے پیش کیا جار ہا ہے، یہ مولویوں کا خود تراشیدہ مذہب ہے، اس مغالطہ کے ازالہ کی شکل بھی یہی ہے کہ ہر پڑھے لکھے مسلمان میں اس کی صلاحیت پیدا کردی جائے کہ اپنے دین کی بنیادی کتابوں کا وہ خود مطالعہ کر سکے۔ جو تجویز خاکسار نے پیش کی ہے انشاء اللہ اس سے یہ توقع پوری ہو جائے گی۔ یہ خدشہ کہ جدید تعلیم یافتہ طبقات کو قرآن و حدیث سے واقف بنانا ڈاکو کے ہاتھ میں تلوار دینے کے انجام کو کہیں نہ پیدا کرے، ظاہر بے بنیاد خطرہ نہیں ہے لیکن بلکہ اولاً قرآن کی لاہوتی قوت پر اعتماد کرنا چاہیے، تجربہ اس کا مصدق ہے کہ انسانی دماغ کی منطق کے سلجھانے میں قرآن سے زیادہ کارگر کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی۔ یہ درست ہے کہ مغربی تعلیم کے باطنی رجحانات آدمی کی فطرت کو سلامتی وصحت کے نقطۂ اعتدال سے ہٹا دیتے ہیں اور اسی لیے **هر چه گیرد علّتی علت شود** کا خطرہ نہیں ہے۔ ڈر ہے کہ مذہب بھی ان کے ہاتھوں میں پہنچ کر علت کی شکل نہ اختیار کر لے لیکن پہلے بھی میں نے کہا ہے کہ ہمیں یہ امید رکھنی چاہیے کہ ان ہی الجھے ہوؤں میں سے ان شاء اللہ سلجھے ہوئے بھی نکلتے رہیں گے اور بگڑے ہوؤں کو درست کرنے کا کام بھی ان شاء اللہ وہی انجام دیں گے۔ بہر حال مذہب اور مذہبی تعلیم کی عمومیت سے گریز میرے نزدیک تو برہمنیت ہے۔ اسلام نے ان خطرات کا مقابلہ کیا ہے۔ ہمارا کام صرف یہ ہے کہ جس حد تک عمومیت اس کی تعلیم میں پیدا ہونے کا امکان ہو، اس سے نفع اٹھائیں اور اس قسم کے خطرات کو خدا کے سپرد کر دیں وہ اپنے آخری دین کی بہر حال حفاظت فرمائے گا۔ **والله متم نوره ولو كره الكافرون**۔

وہ علم نہیں زہر ہے اَحرار کے حق میں
جس علم کا حاصل ہو جہاں میں دو کفِ جَو

اقبالؒ

ڈاکٹر محمد امین

نئے انداز کے دینی مدارس کی ضرورت

پاکستان کے موجودہ دینی مدارس دراصل دینی تعلیم کے اس رول ماڈل ہی کی ایک توسیع ہیں جو بعض علماء کرام نے انگریزوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے نظام تعلیم کے خاتمے کے بعد ۱۸۶۶ء میں دیوبند میں قائم کیا تھا تاکہ مسلمانوں کی مساجد آباد رہ سکیں اور ان کے عائلی قوانین (جیسے نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ) اور خوشی وغم کی سماجی رسوم میں دینی احکام پر عمل جاری رہ سکے۔ علماء کرام نے انتہائی کس مپرسی کے عالم میں جب مقتدر انگریز حکومت ان کی مخالف تھی اور مسلم معاشرہ ہر لحاظ سے زبوں حالی کا شکار تھا، ایثار وقربانی کی شاندار روایات قائم کرتے ہوئے ان مدارس کو جاری رکھا اور وہ ان مقاصد واہداف کو پانے میں بڑی حد تک کامیاب رہے جو اِن مدارس کے قیام کے وقت ان کے پیش نظر تھے۔

ہم یہ بات بھی اس تحریر کے آغاز ہی میں کہہ دینا چاہتے ہیں کہ ہم دینی مدارس کے بہی خواہ اور ان کے ہمدرد ہیں لہٰذا اس مضمون سے مقصود مدارس پر بے جا تنقید، ان کی مخالفت اور ان کا استخفاف و ہوا خیزی نہیں بلکہ اگر ہم ان کے کردار میں کچھ تبدیلی چاہتے ہیں تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہمیں ان سے ہمدردی اور محبت ہے۔ ہم ان کے خیر خواہ ہیں اور مسلم معاشرے وریاست میں ان کا کردار زیادہ وسیع، زیادہ مفید اور زیادہ مؤثر دیکھنا چاہتے ہیں۔

ہمارا بنیادی مقدمہ یہ ہے کہ اسلام میں دین ودنیا کی کوئی تفریق نہیں بلکہ شریعت تو کہتے ہی ان ہدایات اور تعلیمات کو ہیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ہمیں دنیاوی زندگی گزارنے کے لیے دی ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کا نظام تعلیم شروع ہی سے موحد (Integrated) اور ایک رہا ہے اور انہی مدارس میں، جو دین کے علماء پیدا کرتے تھے اور انہیں علماء ہی چلاتے تھے، دینی علوم کے علاوہ ہر قسم کے عمرانی اور سائنسی علوم بھی (جیسے طب، ہیئت، ہندسہ، حساب، فلسفہ، منطق، ادب، السنہ، قانون وغیرہ) بھی پڑھائے جاتے تھے اور ایسا فرد تیار کیا جاتا تھا جو معاشرے اور ریاست کا مفید کارکن ہوتا تھا یعنی جو لوگ ان مدارس سے فارغ ہوتے تھے وہ تجارت اور کاروبار کرتے تھے، ہنرمند (Skilled)، پیشہ ور (Professionals) اور آزاد پیشہ (Self Employed)

ہوتے تھے جیسے نجار، حداد، طبیب وغیرہ اور بعض مسلم ریاست میں بطور قاضی (جج)، مفتی (ایڈووکیٹ)، منتظم (کلیکٹر)، کاتب (کلرک) اورفوجی وغیرہ ملازمت کر لیتے تھے۔ خود وہ نصاب جسے ملا نظام الدین سہالویؒ کی نسبت سے درس نظامی کہا جاتا ہے ایسا ہی جامع نصاب تھا جو معاشرے اور ریاست کے لیے کارکن تیار کرتا تھا اور صرف مساجد و مدارس کے لیے علماء ہی تیار نہیں کرتا تھا جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کا دینی علوم کا نصاب بہت ہلکا تھا (علوم القرآن میں صرف جلالین اور بیضاوی اور حدیث میں صرف مشکوٰۃ پڑھائے جاتے تھے) اور باقی سارے علوم (فلسفہ و حکمت، منطق، ریاضی، فقہ واصول فقہ، کلام، صرف ونحو اور بلاغت وغیرہ) وہ تھے جو مسلم معاشرے اور ریاست کے لیے مفید شہری اور کارکن تیار کرتے تھے۔

یہ بات اتنی معروف تھی کہ دیو بند بنتے ہی اس کے بانی حضرات مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے علی گڑھ (جو مسلمانوں کی دنیاوی تعلیم کا ادارہ تھا) سے رابطہ کیا اور طلبہ کے تبادلے (Student Exchange) کا منصوبہ تیار کیا تا کہ دیو بند کے طلبہ دنیاوی علوم بھی حاصل کیا کریں۔ بعض وجوہ سے اس پر عمل نہ ہو سکا لیکن اس کا خیال کبھی علماء دیو بند کے ذہنوں سے گیا نہیں چنانچہ جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھنے والے خود شیخ الہند مولانا محمود حسن تھے جو دیو بند کے سربراہ تھے۔ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے نظام تعلیم کی وحدت کا نعرہ پورے زور سے لگایا (ان کی کتاب 'برصغیر میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت' اسی موضوع پر ہے) اور مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ان کے مضمون کو اہتمام سے 'معارف' میں طبع کیا۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ نے دیو بند کے نصاب میں تبدیلی اور خصوصاً انگریزی کی تدریس کی حمایت کی اور سلہٹ کے مدارس کے لیے نیا نصاب بھی تیار کیا لیکن تاریخ کا جبر یہ ہے کہ ان ساری کوششوں کے باوجود دیو بند اور علی گڑھ کے دونوں رول ماڈل اپنے اپنے ڈھرے پہ چلتے رہے اور نظام تعلیم کی وحدت کا خواب خواب ہی رہا اور نہ وہ ندوہ میں پورا ہوا اور نہ جامعہ ملیہ میں۔ قیام پاکستان کے بعد چونکہ حکمرانوں کے رویوں میں کوئی تبدیلی آئی اور نہ انہوں نے تعلیم کی اصلاح کی کوئی کوشش کی لہٰذا علماء کرام بھی پرانے ڈھب پر دینی مدارس چلاتے رہے اور آج بھی چلائے جا رہے ہیں۔ امریکہ اور مغرب کی طرف سے دینی مدارس کی مخالفت نے اور گماشتہ مقامی حکمرانوں کے ذریعے مدارس میں مداخلت نے دینی مدارس کو ردعمل میں حفاظت خود اختیاری کے جذبے کے تحت اپنے اندر سمٹنے اور بیرونی اثرات قبول نہ کرنے کے رجحان میں مزید سختی پیدا کی۔

یہ وہ حالات ہیں جن میں دینی مدارس ہماری اور ہم جیسے دوسرے مخلصین کی اصلاحی تجاویز پر غور کرنے کو تیار نہیں اور نہ اپنے اندر عصری ضرورتوں اور وحدت تعلیم کے حوالے سے کوئی تبدیلی لانے کو تیار ہیں۔ یہ تعلیمی صورت حال چونکہ امت اور مسلم معاشرے کے لیے نقصان دہ ہے اس لیے اب اہل درد یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ موجودہ دینی مدارس کی اصلاح کی کوشش جاری رکھی جائے لیکن اس پر تکیہ کرنے کی بجائے مسلم معاشرے اور ریاست کی عصری ضرورتوں کو پورا کرنے اور اسلاف کی طرز پر وحدت تعلیم کے تصور کے مطابق نئے انداز کے دینی مدارس قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔

فرق: نئے مجوزہ دینی مدارس، موجودہ دینی مدارس سے کس طرح مختلف ہوں گے اس کا اندازہ ذیل کے جدول سے کیجیے:

موجودہ دینی مدارس	نئے مجوزہ دینی مدارس
۱۔ یہ عوام کی محدود مذہبی ضروریات پوری کرتے ہیں جیسے مساجد اور مدارس کی آبادی اور مذہبی رسوم پر عمل۔	۱۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی میں معاشرے اور ریاست کے مفید کارکن بن سکیں گے۔
۲۔ مساجد اور مدارس کے علاوہ کوئی اور ذریعہ روزگار میسر نہیں	۲۔ پرائیویٹ اور پبلک سیکٹر میں ہر جگہ کام کر سکیں گے۔
۳۔ یہ مسلک پرستی اور فرقہ واریت پر مبنی ہیں	۳۔ یہ مسلک پرستی سے بالاتر رہتے ہوئے کام کریں گے۔
۴۔ عام شہری زندگی (Mainstream life) سے کٹے ہوئے	۴۔ عام لوگوں جیسی شہری زندگی بسر کرنے والے
۵۔ جدید مسائل میں عوام کی رہنمائی سے عاجز	۵۔ جدید مسائل میں عوام کی رہنمائی کے قابل
۶۔ دینی تعلیم کی غیر منظور شدہ ڈگریاں	۶۔ حکومتی منظور شدہ ڈگریاں
۷۔ عصری علوم کی تفہیم و تدریس کے مواقع نہ ہونا	۷۔ عصری علوم کی تفہیم و تدریس کا انتظام
۸۔ دینی علوم کا جامد نصاب جس میں عصری ضرورتوں کو پورا کرنے کا انتظام نہیں	۸۔ دینی علوم کا updated نصاب جو عصری ضرورتیں پوری کر سکتا ہے۔

نصاب: مجوزہ نئے مدارس کا نصاب و نظام کچھ اس طرح ہوگا:

۱۔ مڈل پاس بچوں کو داخلہ دیا جائے گا ۲۔ تعلیمی ادارہ دن بھر کا ہوگا ۳۔ طلبہ ۶ سال میں عالیہ/ بی اے

کریں گے۔

۴۔ عالیہ/ بی اے کے دوسالوں میں طالب علم ایک مضمون وہ بھی پڑھے گا جس میں اس نے ایم اے کرنا ہے۔

۵۔ طلبہ علوم اسلامیہ کے علاوہ عمرانی علوم (سوشل سائنسز) کے کسی دوسرے مضمون میں بھی ایم اے کرسکیں گے جیسے معاشیات، سیاسیات، فلسفہ، تاریخ، صحافت اور انگریزی، اردو، فارسی اور عربی زبانیں ۔۔۔وغیرہ۔

۶۔ طلبہ کا داخلہ اور اساتذہ کی تقرری بلا لحاظ مسلک ہوگی۔

۷۔ دینی علوم اور عصری مضامین الگ الگ اور موجودہ شکل میں نہیں پڑھائے جائیں گے بلکہ نصاب ایک ہی ہوگا اور عصری مضامین بھی اسلامی تناظر میں مدون کیے جائیں گے۔

۸۔ موجودہ دینی نصابات پر باسلوب ذیل نظر ثانی کی جائے گی:

i۔ عربی زبان اس طرح پڑھائی جائے گی کہ اس میں ساری مہارتیں حاصل ہو جائیں

ii۔ قرآن حکیم کا نصاب میں زیادہ حصہ۔قدیم وجدید تفسیروں کا مطالعہ

iii۔ حدیث: آخری سال دورہ کی بجائے حدیث کا تحقیقی وعلمی مطالعہ

iv۔ سیرت النبی ﷺ کا اضافہ

v۔ اصول فقہ کا تقابلی مطالعہ اور جدید اصول قانون کی تدریس

vi۔ فقہ وقانون کا تقابلی مطالعہ: اسلامی مذاہب میں نیز پاکستانی، مغربی اور بین الاقوامی قوانین کا منتخب مطالعہ۔اجتہاد اور جدید مسائل

vii۔ امت کی تاریخ اور جغرافیہ

viii۔ عمرانی علوم کا اسلامی اور تقابلی مطالعہ یعنی معاشیات، سیاسیات، فلسفہ۔۔۔وغیرہ کا جدید اسلامی تناظر میں مطالعہ اوران علوم
میں مغربی نقطۂ نظر کا تنقیدی مطالعہ

ix۔ مغربی فکر وتہذیب کا تنقیدی مطالعہ اور مسلم فکر وتہذیب سے اس کا مقارنہ

x۔ تزکیۂ نفس کو شامل نصاب کرنا

۹۔ زبانوں پر دسترس خصوصاً اردو، عربی، فارسی اور انگریزی پر۔ نیز کسی ایک غیر ملکی زبان جیسے جرمن، فرنچ اور روسی زبان کا سیکھنا۔

۱۰۔ ایم اے میں تقابلی مطالعہ مثلاً اگر معاشیات پڑھنی ہے تو مغربی اور اسلامی معاشیات دونوں پڑھائی جائیں گی مقارنہ اور تنقیدی مطالعے کے ساتھ۔

۱۱۔ تخلیقی تحقیق کی صلاحیت خصوصاً اسلامی تناظر میں مسلم معاشرے کے زندہ مسائل کے حوالے سے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر

۱۲۔ عصری علوم کے نام پر پڑھائے جانے والے مغربی علوم کو اسلامی تناظر میں از سرنو مرتب کیا جائے گا اور ان کا تنقیدی مطالعہ کیا جائے گا

۱۳۔ تزکیہ وتربیت اور تعمیر سیرت وکردار کے لیے خصوصی کوششیں کی جائیں گی اور اس کے لیے باقاعدہ نصاب ونظام مرتب کیا جائے گا۔

یہ کام کون کرے؟

ہماری حکومتیں کروڑوں روپے تعلیم پر ہر سال خرچ کرتی ہیں لیکن دینی تعلیم پر ایک پیسہ خرچ کرنے کی توفیق انہیں نہیں ہوتی حالانکہ دینی تعلیم کا انتظام کرنا ان کی قانونی اور اخلاقی ذمہ داری ہے۔ بدقسمتی سے یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جو تعلیمی ادارے سرکاری کھاتے میں چلے جاتے ہیں وہ آہستہ آہستہ غیر فعال اور غیر مؤثر ہوتے چلے جاتے ہیں اور بالآخر محض کاغذوں میں زندہ رہ جاتے ہیں۔

دوسری صورت پرائیویٹ پبلک پارٹنر شپ کی ہے کہ یہ کام اصلاً تو پرائیویٹ سیکٹر کرے لیکن پبلک سیکٹر (یعنی حکومت) اس کا ہاتھ بٹائے۔ بنگلہ دیش اور انڈونیشیا میں یہ تجربہ کامیابی سے چل رہا ہے۔ بنگلہ دیش میں مدارس عالیہ اور انڈونیشیا میں سنتری کے نام سے ایسے ہزاروں مدارس کامیابی سے چل رہے ہیں جو علماء کرام کے ہاتھ میں ہیں اور دینی علوم کے ساتھ ساتھ عصری علوم کی تعلیم بھی دیتے ہیں اور حکومت ان کو مالی امداد بھی دیتی ہے اور ان کی ڈگریاں بھی تسلیم کرتی ہے۔

اور آخری صورت یہ ہے کہ اگر حکومت کسی قسم کا تعاون نہ بھی کرے تو پرائیویٹ سیکٹر خود اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے۔ عوام اور مخیّر حضرات کی اگر ذہن سازی کی جائے تو جس طرح وہ موجودہ دینی مدارس کی مالی مدد کرتے ہیں وہ نئے مدارس کی بھی اعانت کریں گے اور یہ بتدریج اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں گے۔ بلکہ خود علماء کرام کو وسعت قلب ونظر سے کام لینا چاہیے اور موجودہ دینی مدارس کو اس نئے رول ماڈل کے مطابق ڈھال لینا چاہیے یا اگر کوئی اور یہ کام کرے تو انہیں اس کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے۔ **هذا من عندنا والعلم عندالله۔**

پاکستان کی اہم دینی جامعات

دارالعلوم کراچی
ایک تعارف

اس شمارے سے البرہان ایک نیا سلسلہ مضمون شروع کررہا ہے جس میں ملک کی اہم دینی جامعات اور اسلامی تناظر میں کام کرنے والے جدید تعلیم کے اداروں کا تعارف شائع کیا جائے گا تا کہ عام لوگ بھی ان تعلیمی اداروں سے واقف ہوسکیں اور ملک بھر میں پھیلے ہوئے دینی اور جدید تعلیم کے ادارے ان بڑے مراکز ہائے علمی کے طریق کار اور علمی مناہج سے واقف ہوسکیں۔ اس سلسلے کا آغاز ہم دارالعلوم کراچی کے تعارف سے کررہے ہیں جو دینی جامعات میں ایک بڑا نام ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ البرہان کی تنگ دامنی کے باعث یہ تعارف مختصر ہی رہے گا اور ہم تفصیلات میں نہ جاسکیں گے۔ امین

مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ دارالعلوم دیوبند میں صدر مفتی تھے۔ ۱۹۴۸ء میں پاکستان تشریف لائے تو چندے انتظار کیا کہ حکومت نظام تعلیم کی اصلاح کے لیے اقدامات کرے لیکن مایوس ہو کر اپنا مدرسہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ابتداء میں کراچی کے محلّہ نانک واڑہ میں ایک پرائمری سکول کی متروکہ عمارت مفتی صاحب نے مدرسہ کے لیے الاٹ کرائی اور تدریس کا آغاز کردیا۔ جلد ہی یہ جگہ کم پڑنے لگی تو پہلے آپ نے جامعہ کے لیے وہ جگہ حاصل کی جہاں آج کل اسلامیہ کالج کراچی واقع ہے لیکن بعض موانع کی وجہ سے وہاں کام کا آغاز نہ ہوسکا تو جنوبی افریقہ کے ایک مخیّر تاجر نے وہ ۷۹ ایکڑ جگہ آپ کی خدمت میں پیش کردی جہاں آج کل دارالعلوم کورنگی قائم ہے۔ اس وقت یہ جگہ بے آباد ریگستان اور شہر سے باہر تھی، کورنگی بھی بعد میں آباد ہوا۔ دارالعلوم یہاں ۱۹۵۵ء میں منتقل ہوا تھا۔

اغراض واہداف

۱۔ عامۃ المسلمین میں علوم شرعیہ (قرآن وحدیث، عقائد وفقہ وغیرہ) اور اس کے متعلقہ علوم کی ترویج واشاعت۔

۲۔ قرآن وحدیث، فقہ اور عقائد کی ایسی حکیمانہ اور محققانہ طرز تعلیم کا انتظام جس میں عصر حاضر کے تقاضوں کا خاطر خواہ لحاظ رکھا جائے اور جس سے اہل بصیرت اور ماہر علماء دین پیدا ہوسکیں۔

۳۔ علوم دینیہ کی عمومی تعلیم کے ساتھ ساتھ خصوصی شعبوں میں ایسے متخصصین تیار کرنا جو دین کے اہم شعبوں میں کامل بصیرت اور مہارت حاصل کر کے کسی مخصوص میدان میں مثلاً قضاء وافتاء، دعوت و

تبلیغ،تصنیف وتالیف وغیرہ میں امتیازی خدمات انجام دے سکیں۔

دارالعلوم کا مسلک فقہ حنفی اور مشرب دارالعلوم دیوبند کے منہج کا اتباع ہے۔

دارالعلوم کی خدمات اور سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے لیے انہیں چار بڑے شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ انتظامیہ(Administration) ۲۔شعبۂ تعلیمات (Academics) ۳۔ عصری تعلیم (Contemporary Education) ۴۔ ذیلی خدماتی شعبے(Support Services)

انتظامیہ

دارالعلوم کی مجلس منتظمہ تیرہ افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ دارالعلوم کا سب سے بااختیار دستوری ادارہ ہے جسے دارالعلوم کے سرمایہ،املاک اور نظم ونسق کے بارے میں تمام اختیارات حاصل ہیں۔ دارالعلوم کی انتظامیہ میں صدر، ناظم اور شیخ الحدیث کا اہم کردار ہوتا ہے۔ پہلے مولانا صدر مفتی محمد شفیع صاحبؒ، دوسرے ڈاکٹر عبدالحی عارفی صاحبؒ اور موجودہ صدر مفتی محمد رفیع عثمانی صاحبؒ ہیں جبکہ پہلے ناظم مولانا نور احمد صاحبؒ، دوسرے مولانا سبحان محمود صاحبؒ، تیسرے مولانا شمس الحق صاحبؒ اور موجودہ ناظم مولانا راحت علی ہاشمی صاحب ہیں۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ دارالعلوم کے پہلے شیخ الحدیث تھے، ان کے بعد مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی صاحبؒ، مولانا سلیم اللہ خان صاحب اور مولانا سبحان محمود صاحبؒ نے یہ ذمہ داری نبھائی جبکہ موجودہ شیخ الحدیث مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب ہیں۔

شعبۂ تعلیمات

دارالعلوم اس وقت نہ صرف ایک جامعہ(University) کا روپ دھار چکا ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس کا پہلی جماعت سے لے کر درجۂ تخصص (Post-graduate) تک ایک اپنا مکمل تعلیمی نظام ہے اور چونکہ اس میں مسجد بھی ہے، اساتذہ اور طلبہ کی رہائش گاہیں بھی ہیں،انتظامی دفاتر بھی ہیں، تحقیق،نشر واشاعت اور لائبریری کا انتظام بھی ہے لہٰذا اسے یونیورسٹی ٹاؤن کہنا بجا ہوگا۔

دارالعلوم کے چار بڑے تدریسی شعبے ہیں: درس نظامی، تعلیم تخصص،تحفیظ القرآن اور مدرسۃ البنات۔

۱۔ درس نظامی

اگرچہ درس نظامی کو عموماً ۸ سالہ کورس کہا جاتا ہے (ثانویہ عامہ، خاصہ، عالیہ اور عالمیہ، ہر کورس دو سال کا) لیکن دارالعلوم میں حفظ کے ساتھ پرائمری کی تعلیم کا انتظام بھی موجود ہے اور چھٹی سے

دسویں تک اگلی پانچ سالہ تعلیم کا بھی جسے 'مرحلۂ متوسطہ' کہا جاتا ہے۔طلبہ میٹرک کا امتحان کراچی ایجوکیشن بورڈ کے تحت دیتے ہیں اور درس نظامی کی تکمیل کے بعد تخصص کا انتظام بھی ہے۔

درس نظامی کا تعلیمی سال ۱۶ شوال کو شروع ہوتا ہے اور ۱۵ شعبان کو سالانہ امتحان کے بعد ختم ہوجاتا ہے۔ سال میں تین امتحانات ہوتے ہیں۔ پہلی سہ ماہی کا صفر میں، ششماہی امتحان جمادی الاولیٰ میں اور سالانہ امتحان ماہ شعبان میں ہوتا ہے۔ ۱۵ شعبان سے ۱۰ شوال تک اس شعبے میں تعطیل رہتی ہے۔ ۲۰۰۸ء میں درس نظامی میں اساتذہ کی تعداد ۸۷ تھی جبکہ طلبہ کی تعداد تقریباً ۱۰،۰۰۰ تھی۔ مستحق اور نادار طلبہ کو جامعہ کی طرف سے قیام، طعام اور معقول وظیفہ دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ موسم کے اعتبار سے کپڑے اور لحاف وغیرہ بھی تقسیم کیے جاتے ہیں۔

۲۔ شعبۂ تخصص فی الفقہ والافتاء

مولانا مفتی محمد شفیعؒ صاحب پر فقہی مزاج غالب تھا اور آپ کی خواہش تھی کہ افتاء کی تعلیم کے لیے ایک مستند شعبہ قائم کیا جائے جس میں ذی استعداد طلبہ کو تمرین افتاء کرائی جاسکے چنانچہ آج یہ شعبہ بہترین مفتیوں کے زیرنگرانی چل رہا ہے۔ اس میں داخلے کی اولیں شرط یہ ہے کہ کسی مستند ادارہ سے عالیہ کا امتحان بتقدیر ''ممتاز'' پاس کیا ہو۔ اس شعبہ میں محدود اور لائق طلبہ کو ہی داخلہ دیا جاتا ہے۔ اس کا دورانیہ تین سال کا ہے۔ ابتدائی دو سالوں میں طالب علم میں استخراج مسائل کا اچھا ملکہ پیدا کیا جاتا ہے جبکہ آخری سال میں طالب علم کو تحقیقی مقالہ لکھنا ہوتا ہے۔

دارالعلوم میں پچھلے کچھ عرصے سے تخصص فی الدعوۃ والارشاد کا اجراء بھی کردیا گیا ہے تاکہ اس شعبے میں بھی رجال کار تیار کیے جاسکیں۔

۳۔ شعبۂ تحفیظ القرآن

یہ دارالعلوم کے قدیم شعبوں میں سے ہے، نانکواڑہ کی عمارت اب حفظ و ناظرہ کی تعلیم کے لیے مختص ہے۔ دارالعلوم کورنگی میں اس کے لیے ایک عظیم الشان عمارت تعمیر کی گئی ہے جس میں ۶۲۵ طلبہ زیرتعلیم ہیں اور اساتذہ کی تعداد ۲۴ ہے۔

۴۔ مدرسۃ البنات

کسی بھی معاشرہ میں عورت کے کردار کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ فرد کی تعمیر میں

خصوصاً اس کا کردار بہت اہم ہوتا ہے۔ اسی نظریے کے پیش نظر دارالعلوم میں مدرسۃ البنات کا شعبہ قائم کیا گیا ہے جس کا باقاعدہ افتتاح ۱۹۹۱ء میں ہوا۔ اس میں درس نظامی کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم کے لیے مدرسہ ابتدائیہ و ثانویہ بھی موجود ہیں۔

۵۔ تصنیف و تحقیق

دارالعلوم کا شعبۂ تحقیق مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی نگرانی میں کام کرتا ہے۔ اس ادارے کے تحت موجودہ دور میں پیدا ہونے والے مسائل اور دوسرے دقیق علمی موضوعات پر تحقیق و تصنیف کا کام ہوتا ہے۔ اس شعبہ کے پاس علمی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ اس شعبہ کے تحت جو اہم کتب منظر عام پر آ چکی ہیں ان میں سے ایک **فتح الملهم** ہے جو علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی صحیح مسلم کی شرح ہے۔ وہ اپنی زندگی میں پانچ جلدیں مکمل کر سکے تھے ان کے بعد مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے اس کی تکمیل کی ہے۔ ۲۔ معارف القرآن انگریزی ۳۔ تین جلدوں میں درس ترمذی۔ یہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی جامع ترمذی کی شرح ہے۔ حصہ معاملات مولانا عبداللہ میمن صاحب نے مرتب فرمائی ہے۔ ۴۔ جواھر الفقہ: یہ مولانا مفتی محمد شفیعؒ کے مختلف فقہی رسائل کا مجموعہ ہے۔ ۵۔ امداد الاحکام: یہ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اور مفتی عبدالکریم گمتھلویؒ کے قلم سے لکھے گئے فتاوی ہیں جو مولانا اشرف علی تھانویؒ کی زیر نگرانی مرتب کیے گئے تھے۔

ان کے علاوہ اس شعبے کے تحت ''**ضابطة المفطرات فی مجال التداوی، حاشیة شرح عقود رسم المفتی، مکانة الاجماع فی التشریع الاسلامی**، بائبل سے قرآن تک اور **النحو الصغیر للطبرانی** جیسی علمی اور تحقیقی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔

دارالافتاء

مولانا مفتی محمد شفیعؒ ایک کہنہ مشق فقیہ تھے اور دارالعلوم دیوبند میں صدر مفتی کے منصب پر فائز تھے۔ جب آپ کراچی تشریف لائے تو یہاں بھی لوگ اپنے مسائل کے حل کے لیے کثرت سے آپ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ چنانچہ جب آپ نے دارالعلوم قائم فرمایا تو ساتھ ہی دارالافتاء بھی قائم فرمایا۔ آپ کے زیر سرپرستی آپ کے تربیت یافتہ دیگر مفتی حضرات نے بھی یہ خدمت خوب انجام دی اور دے رہے ہیں جن میں مفتی محمد رفیع عثمانی، مفتی محمد تقی عثمانی، مفتی محمود اشرف عثمانی، مفتی عبدالرؤف سکھروی، مفتی اصغر علی ربانی اور مفتی عبدالمنان صاحب کے نام نمایاں ہیں۔

دارالعلوم کے دارالافتاء سے اس وقت تک پانچ لاکھ سے زیادہ فتاوی جاری ہو چکے ہیں۔ اگر کوئی مسئلہ نہایت اہم اور تحقیق طلب ہوتو ''مجلس تحقیق مسائل حاضرہ'' کے لیے اس کو الگ رکھ دیا جاتا ہے اور سائل کو خط کے ذریعے بتادیا جاتا ہے کہ آپ کا مسئلہ تحقیق طلب ہے اور اس میں وقت لگے گا۔ جو مسائل قدرے غور طلب ہوں وہ دارالافتاء ہی میں متعین مفتی حضرات کے حوالے کیے جاتے ہیں۔ درمیانہ درجہ کے مسائل درجہ تخصص کے سال دوم اور سال سوم کے طلبہ کو لکھنے کے لیے دیے جاتے ہیں اور آسان مسائل درجہ تخصص کے سال اوّل کے طلبہ حل کرتے ہیں، اب سب صورتوں میں بڑے مفتی حضرات کی تصدیق موجود ہوتی ہے۔ان صورتوں میں استفتاء مختلف مراحل سے گزرتا ہے جس کے لیے وقت ناگزیر ہے۔ اس لیے فتوی عموماً ایک ہفتہ بعد مستفتی کو واپس کیا جاتا ہے۔

مسائل بھیجنے کا پتہ ''شعبہ دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کورنگی، کراچی نمبر 14'' اور ٹیلیفون نمبر مندرجہ ذیل ہیں: 021-35046885/35049774

اب تک دارالعلوم سے جتنے فتاویٰ جاری ہو چکے ہیں ان کی تبویب کا کام بھی جاری ہے اور تمام فتاویٰ کمپیوٹر میں محفوظ کیے جارہے ہیں تاکہ بعد میں ان کو شائع کیا جاسکے۔

موسوعۃ الحدیث

یہ شعبہ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب اور بعض دوسرے علماء کی تجویز پر قائم کیا گیا ہے۔ اس شعبہ کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ جتنی بھی احادیث ہیں ان کو اس طرح ایک جگہ جمع کیا جائے کہ کوئی حدیث مکرر نہ ہو اور کوئی حدیث چھوٹنے نہ پائے اور ساتھ ساتھ اس کو ایک نمبر دیا جائے جو سارے عالم اسلام میں مستند شمار ہو جس طرح کہ قرآن کریم کی آیات کے نمبر مخصوص ہیں۔ یہ تجویز مفتی تقی عثمانی صاحب نے ۲۰۰۱ء میں مکہ مکرمہ میں علماء کرام کے ایک اجتماع میں پیش کی تو سب نے اس کا خیر مقدم کیا اور ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے ذمہ اس کے طریقہ کار اور مختلف پہلوؤں پر غور کرنا تھا۔ابتداءً پچاس ایسے مصادر منتخب کیے گئے جن میں احادیث مسندہ مروی تھیں۔ بعد ازاں ان میں اضافہ کردیا گیا اور اب ان مصادر کی تعداد ۱۴۷ ہے۔ اس کے بعد ان مصادر کو جمع کرنے کا کام شروع کیا گیا۔ مصادر جمع ہوتے ہی 2002ء میں باقاعدہ کام کا آغاز کردیا گیا۔ اس شعبہ میں ۷ ذی استعداد فاضلین و متخصصین کام کررہے ہیں۔

نشر و اشاعت

مکتبہ دارالعلوم

یہ شعبہ دارالتصنیف کا اشاعتی ادارہ ہے اور خود کفیل شعبہ ہے۔نشر و اشاعت اور کتابت و طباعت کا سارا انتظام اسی شعبے کے ذمے ہے۔ یہ شعبہ علمی، تبلیغی اور تحقیقی کتابوں کی نشر و اشاعت کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ یہ کتابیں قیمتاً فروخت کی جاتی ہیں اور آمدنی اسی مکتبہ کے لیے جمع رکھی جاتی ہے۔

ماہنامہ البلاغ

دین کی اشاعت، عامۃ الناس کی رہنمائی اور انہیں فتنوں سے بچانے کے لیے دارالعلوم نے ماہنامہ البلاغ کا آغاز ۱۹۶۶ء میں کیا۔ اس وقت اس کے نگران مفتی محمد تقی عثمانی صاحب ہیں اور یہ اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی شائع ہو رہا ہے۔

لائبریری

مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کو کتابوں سے خاص شغف تھا۔ کراچی آنے کے بعد انھوں نے کتب خانہ قائم فرمایا اور اپنا ذاتی ذخیرۂ کتب اس کے لیے وقف کر دیا۔ آج اس کی ایک پر شکوہ عمارت ہے۔ یہ کتب خانہ ملک کے بڑے کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے اور مختلف اسلامی موضوعات پر یہاں ایک لاکھ سے زائد کتابیں موجود ہیں۔ کتابوں کی حفاظت کے لیے نہایت عمدہ نظام موجود ہے۔ کتب خانہ وقف ابتداء سال میں طلبہ کو عاریۃً کتابیں مہیا کرتا ہے جس کو طلبہ آخر سال میں واپس کر دیتے ہیں۔

ہوسٹل (دارالطلبہ)

دارالعلوم نے اپنے طلبہ کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے تاکہ وہ ہمہ وقت اپنی تعلیم پر توجہ دیں اور خارجی ضروریات کے لیے کسی محنت سے مستغنی رہیں ہوسٹل قائم کیا ہوا ہے جو تین ''داروں'' پر مشتمل ہے: دارالصدیق، دارالفاروق اور دارعثمان۔ ہر دار میں ۱۶۸ کمرے ہیں اور ہر کمرے میں پانچ طلبہ رہتے ہیں۔ ہوسٹل کی بلڈنگ چار منزلہ ہے اور ہر منزل میں قیم مقرر ہے۔ طلبہ کے لیے کپڑے دھونے اور سکھانے کے دھوبی گھاٹ، استری روم، مطبخ (کچن) وغیرہ کی سہولیات بھی مہیا کی گئی ہیں۔ ہوسٹل کی توسیع بھی دارالعلوم کے مستقبل کے منصوبوں میں شامل ہے۔

مطبخ

نادار اور غریب طلبہ کے لیے جامعہ کی طرف سے طعام کا بندوبست کیا گیا ہے۔ اس کے لیے ایک عمارت مختص ہے جس میں تقریباً دو ہزار طلبہ کے لیے دو وقت کھانا پکتا ہے۔ طلبہ کی کثرت اور سہولت کو دیکھتے ہوئے مطبخ کی وسیع عمارت زیر تعمیر ہے جس میں بیک وقت چار ہزار طلبہ کھانا کھا سکیں گے۔

توسیعی تعلیمی خدمات

مکاتب تعلیم القرآن

دارالعلوم کے قیام کا ایک اہم مقصد یہ تھا کہ قرآنی تعلیم کو پورے شہر میں عام کر دیا جائے۔ کیونکہ کراچی ایک وسیع شہر ہے اور سارے شہر والوں کے لیے یہاں سے براہ راست استفادہ ممکن نہیں تھا اس لیے شہر کے مختلف حصوں میں مکاتب قرآنیہ کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ اس وقت دارالعلوم کے تحت ۳۰ مکاتب قرآنیہ کام کر رہے ہیں۔ دارالعلوم سے ان کے الحاق کے لیے مخصوص شرطیں ہیں۔ دوتہائی مصارف دارالعلوم کرتا ہے اور ایک تہائی محلّہ کمیٹی کے ذمے ہوتے ہیں۔ دارالعلوم کی طرف سے ان مکاتب کا ایک نگران مقرر ہے جو ان مکاتب کی نگرانی کرتا اور امتحانات وغیرہ کا انتظام کرتا ہے۔ اس وقت ان مکاتب قرآنیہ میں ۲۵۵۹ طلبہ زیر تعلیم ہیں☆۔

دارالعلوم کے تحت مساجد

اس وقت دارالعلوم کے تحت تین مساجد ہیں:

محمدی مسجد: یہ دارالعلوم کے قریب کورنگی انڈسٹریل ایریا میں واقع ہے، اس میں مکتب قرآنی قائم ہے۔

جامع مسجد بیت المکرّم گلشن اقبال: دارالعلوم کے تحت یہاں درجہ رابعہ تک درس نظامی کی تعلیم ہو رہی ہے۔ حفظ و ناظرہ کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ مرکز الاقتصاد الاسلامی کا دفتر بھی یہاں قائم ہے۔

مسجد ناٹک واڑہ: یہاں حفظ و ناظرہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔

عصری تعلیم

مدرسہ ابتدائیہ و ثانویہ

دارالعلوم کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ایسے رجال کار تیار کیے جائیں جو معاشرہ کی تمام

☆ اس مضمون کے تمام اعداد و شمار 2008ء کے ہیں۔

ضروریات سے آگاہ ہوں اور عصری تعلیم بھی رکھتے ہوں۔اس مقصد کی تکمیل کے لیے مدرسہ ابتدائیہ وثانویہ کا قیام عمل میں لایا گیا جس میں اس وقت ۵۰۳ طلبہ زیر تعلیم ہیں۔میٹرک تک یہ مدرسہ کراچی ایجوکیشن بورڈ سے منظور شدہ ہے اور ہر سال یہاں کے طلبہ امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوتے ہیں۔ مختلف کلاسوں کی فیسیں کم وبیش ہیں۔طلبہ کا یونیفارم شلوار قمیض اور ٹوپی ہے۔اس سکول کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ:

۱۔ اگر بچہ میٹرک کے بعد درس نظامی میں جائے تو اسے بنیادی دینی معلومات پہلے سے حاصل ہوں۔

۲۔ اگر کسی دنیاوی ادارے میں چلا جائے تو اچھی دینی معلومات رکھنے کی وجہ سے غیر صالح ماحول سے متاثر نہ ہو۔

۳۔ سرکاری اداروں اور دفاتر میں ایسے لوگ پہنچیں جو دین کی بنیادوں پر مسلمانوں کی خدمت کر سکیں۔

حرا فاؤنڈیشن

یہ دارالعلوم کا جدید شعبہ ہے جس کا مقصد کیمبرج نظام تعلیم کے طرز پر مسلمان بچوں کو جدید تعلیم سے ہم آہنگ کرنا ہے تاکہ وہ نہ صرف جدید علوم سے آراستہ ہوں بلکہ ان کے نظریات بھی اسلامی ہوں۔اس فاؤنڈیشن کے پیش نظر یہ ہے کہ:

۱۔ ایک ایسے جدید اسکول کا قیام عمل میں لایا جائے جو شرعی اصولوں کے تحت چلنے والا اور اعلیٰ سطح کے ہم عصر اسکولوں کا مقابلہ کرنے والا ہو۔

۲۔ جو بچوں کو اسلامی علوم واقدار اور معیاری تعلیم سیکھنے کے لیے ایک اچھا ماحول فراہم کرے اور اس کے ساتھ جدید درسی اسلوب کو بروئے کار لاتے ہوئے کیمبرج اسکولوں کے تحت چلنے والے سکولوں کے طرز پر ہو۔

۳۔ ایسے بچوں کی تیاری جو مسلمانوں کا اتباع کرنے والے اور سچے پاکستانی ہوں، جو خود اعتمادی کے ساتھ عالمی چیلنجوں کا سامنا کر سکتے ہوں اور اپنے اپنے پیشوں/شعبوں میں پوری مہارت رکھتے ہوں۔

۴۔ یہ ایسا سکول ہے جو بچوں کو عالم بننے کے قابل بنائے یا اس قابل بنائے کہ وہ اعلیٰ شہرت کے حامل پیشہ وارانہ تعلیمی اداروں میں اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں۔

مرکز الاقتصاد الاسلامی

مرکز الاقتصاد الاسلامی دارالعلوم کراچی کا ایک ذیلی ادارہ ہے جس کے چیئر مین مفتی محمد تقی عثمانی

صاحب، چیف ایگزیکٹو مولانا عمران اشرف عثمانی صاحب اور شریعہ کنسلٹنٹ مفتی محمد یحییٰ عاصم صاحب ہیں۔اس ادارے کے اغراض و مقاصد درج ذیل ہیں:

۱۔ معاشی اقتصادی اور بینکاری کے شعبوں میں شریعت کی تنفیذ کے لیے ایک وسیع البنیاد مرکز فراہم کرنا۔

۲۔ سود سے پاک اقتصادی نظام کے فوائد کو اجاگر کر کے اسلامی طرز بینکاری، فنانس اور تمویل کی طلب پیدا کرنا۔

۳۔ اس طلب کو پورا کرنے کے لیے بنیادی اور اطلاقی تحقیق کرنا تاکہ اقتصادیات، مالیات اور بینکاری میں شریعت کے اطلاق کے لیے عملی خدوخال طے کیے جاسکیں۔

۴۔ علماء کرام کو مالیات اور بینکاری کے مروجہ نظام اور طریقوں سے عملی طور پر روشناس کرانا تاکہ بینکاری و مالیات کے شعبوں سے واقف پیشہ ور افراد کی ضرورت پوری کی جاسکے۔

۵۔ بذریعہ تربیت شریعت سے واقف بینکاروں کی ٹیم تیار کرنا تاکہ وہ موجودہ سودی بینکاری نظام کو شرعی بینکاری نظام میں ڈھالنے میں معاون ثابت ہو۔

۶۔ مروجہ بینکاری نظام میں غیر اسلامی طریقوں کا کھوج لگانا اور علماء کرام کے ماہر مالیات سے روابط پیدا کر کے متبادل طریقوں کی تلاش کے لیے تحقیق کرنا۔

۷۔ ایک اطلاعاتی مرکز کا قیام جو معلومات جمع کرنے اور انہیں دنیا کے عالمی واقتصادی اداروں تک پہنچانے کا کام کرے گا۔

۸۔ اس سلسلے میں سیمیناروں، کانفرنسوں اور ورکشاپوں کا اہتمام کرتے رہنا۔مختلف ابلاغی ذرائع استعمال کر کے عوام اور کاروباری حضرات کو اسلامی اقتصادی تعلیمات سے آگاہ کرنا۔

سپورٹ سروسز (ذیلی خدماتی ادارے)

اس شعبے کے تحت درج ذیل پانچ ادارے کام کر رہے ہیں:

i۔ شعبۂ تعمیر و ترقی

دارالعلوم تقریباً ۷۹ ایکڑ پر محیط ہے جو چاردیواری میں محصور ہے۔تقریباً ۲۵ ایکڑ تعمیری رقبہ ہے۔اس رقبہ پر اب تک درسگاہیں، دارالطلبہ کے تین بلاک، دفاتر کا ایک بلاک، جدید دارالحدیث،

جدید دارالافتاء، اساتذہ کرام کے گھر، مدرسہ ابتدائیہ، سڑکیں، مرکزی دروازہ وغیرہ تعمیر ہوچکی ہیں۔

زیر تکمیل منصوبوں میں مسجد، مطبخ، حرا فاؤنڈیشن، جنریٹر روم، گیس ہیٹر روم اور سڑکیں وغیرہ شامل ہیں۔ آئندہ منصوبوں میں اساتذہ کرام کے گھروں اور سوئمنگ پول کی تعمیر وغیرہ شامل ہیں۔ یہ شعبہ دارالعلوم کی تمام قدیم و جدید تعمیرات کی اصلاح و ترمیم، جدید منصوبوں کی پلاننگ اور تعمیر و تکمیل کے فرائض انجام دیتا ہے۔ تعمیرات کے علاوہ بجلی اور گیس کی سپلائی بھی اسی شعبہ کا فریضہ ہے۔ اس شعبے کے تحت ۳۶ افراد مستقل بنیادوں پر کام کرتے ہیں۔

ii۔ شعبۂ حسابات

دارالعلوم حکومت کے پاس باقاعدہ رجسٹرڈ ادارہ ہے اور ریونیو بورڈ نے دارالعلوم کی امداد وعطیات کو انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دے رکھا ہے۔ اس شعبے کے ذریعے دارالعلوم کی یومیہ آمدورفت کا حساب رکھا جاتا ہے اور ہر مد کو متعلقہ مصرف میں خرچ کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ آمدورفت میں تمام حسابات رجسٹرڈ آڈیٹر کے ذریعے آڈٹ ہوتے ہیں اور ہر سال آڈٹ رپورٹ تیار ہوتی ہے۔ اس وقت شعبہ محاسبی میں ۱۱ افراد کا عملہ مصروف عمل ہے اور چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کی خدمات بھی حاصل ہیں۔

iii۔ استقبالیہ

یہ شعبہ ڈاک و تار کی ترسیل، ٹیلیفون کی پیغام رسانی، مہمانوں کی ضیافت اور متعلقہ شعبوں میں آنے والوں کی رہنمائی کے فرائض انجام دیتا ہے۔ یہ دارالعلوم میں آنے والے عطیات وصدقات بھی وصول کرتا ہے اور شعبہ محاسبی میں منتقل کرتا ہے۔

iv۔ مرکز صحت

دارالعلوم میں طلبہ کے لیے ایک سند یافتہ اور ماہر طبیب کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ عملہ کے ۳ افراد ہمہ وقت موجود رہتے ہیں۔ طلبہ کو مفت دواؤں کی سہولت بھی میسر ہے اور اگر کوئی طالب علم زیادہ بیمار ہو تو اسے مدرسہ کی طرف سے اچھے ہسپتال میں علاج کے لیے بھیجا جاتا ہے۔

v۔ سیکورٹی (شعبہ محافظین)

دارالعلوم بڑے رقبے پر محیط ادارہ ہے اس کی حفاظت اور دوسرے متعلقہ کاموں کے لیے 'محافظین' کا شعبہ قائم ہے جو ادارے کی حفاظت کے ساتھ ساتھ مدرسہ کے زیر انتظام وقف شدہ زمینوں اور جائیدادوں کی حفاظت بھی کرتا ہے۔

پاکستانیات ملک احمد سرور

پاکستان توڑنے کی امریکی سازشیں

کراچی میں لگی آگ کی تپش سے پشاور تک جھلس رہا ہے اور بلوچستان میں کٹتی گردنوں اور گرتی لاشوں کا درد لاہور تک کو تڑپا رہا ہے مگر اسلام آباد خوش وخرم اور مطمئن ہے۔ موسم برسات نے سرزمین پاکستان کو تو سرسبز و شاداب کر دیا ہے مگر بلوچستان و کراچی میں لگی آگ امیدوں کے خرمن میں بچے آخری خوشے کو بھی بھسم کیے جا رہی ہے۔ عیار و کرپٹ حکمرانوں اور مگرمچھ صفت اپوزیشن کے سامنے عدلیہ کی بے بسی مایوسیوں کی نئی گھٹا بن کر آ رہی ہے۔ افغانستان سے امریکی رخصتی کے بعد طالبان کی بندوقوں کا رُخ تو شاید بدل جائے، آئی ایس آئی کی نئی پالیسی سے بیرونی تخریب کار ایجنسیوں کے پر بھی کٹ جائیں گے مگر سیاسی دہشت گردی، لوٹ مار اور کرپشن کے عفریت عوام کے بچے کھچے چیتھڑے بھی اڑا کر رکھ دیں گے۔ بقول ڈاکٹر عبدالقدیر خان ''ملک انتہائی خطروں میں گھرا ہوا ہے اور حکمرانوں کی آنکھیں بند ہیں۔''

گزشتہ صدی کے آخری سالوں میں ہی مغرب کے سیاسی پنڈتوں اور تھنک ٹینکوں نے یہ پیش گوئیاں شروع کر دی تھیں کہ پاکستان ۲۰۱۰ء تک ٹوٹ جائے گا۔ ۲۰۰۵ء میں ڈیڈ لائن کو ۲۰۱۵ء تک پہنچا دیا گیا مگر بعض کے خیال میں پاکستان ۲۰۲۵ء تک بھی بچارہ سکتا ہے۔ یہ پیش گوئیاں نہیں دراصل امریکہ اور پاکستان دشمن دیگر ممالک کے منصوبے ہیں جنہیں تھنک ٹینکس اپنی تحقیق کے نام پر پیش کرتے رہتے ہیں۔ تجزیہ نگاروں کے مطابق امریکہ و برطانیہ کے ہاتھوں بے نظیر بھٹو کا قتل بھی انہی منصوبوں کا حصہ ہے۔

۲۰۰۵ء میں یو ایس نیشنل انٹیلی جنس کونسل (NIC) اور سی آئی اے کے حوالے سے جو رپورٹ منظر عام پر آئی تھی، اس میں واضح طور پر لکھا تھا کہ پاکستان کی قسمت یوگوسلاویہ کی طرح ہے۔ اگلی دہائی میں پاکستان خانہ جنگی، خون ریزی اور بین الصوبائی لڑائیوں کا شکار ہوگا (Energy Compass March, 2005)۔ NIC اور CIA کے مطابق پاکستان کی قسمت میں 'ناکام ریاست' ہونا لکھا جا چکا ہے۔ پاکستان عشروں کی معاشی اور سیاسی بدانتظامی، لاقانونیت، کرپشن اور لسانی تعصّبات کی دلدل سے آسانی سے نہیں نکل سکے گا۔

بین الاقوامی امور کے ماہرین کے مطابق پاکستان کے لیے امریکی ایجنڈا وہی ہے جو اس نے مشرق وسطیٰ اور وسطی ایشیا کے لیے بنا رکھا ہے۔ امریکہ اپنے ان منصوبوں پر خفیہ ایجنسیوں کے ذریعے لسانی تعصّبات اور مذہبی فرقہ واریت کو ہوا دے کر عمل پیرا ہے۔ وہ مالی امداد اور سازشوں کے ذریعے حکومتی اداروں کو کمزور کر رہا ہے اور مقصد پاکستان کے قومی ڈھانچے کو توڑنا ہے۔ برطانوی خفیہ ایجنسی MI6، اسرائیلی موساد اور بھارتی را امریکی سی آئی اے کی مدد کر رہی ہیں۔ پاکستانی فوج پاکستان کو قائم ودائم رکھنے کے لیے ایک مثالی ادارہ ہے۔ اسے کمزور کرنے کے لیے ''دہشت گردی کے خلاف آپریشنوں'' کے نام پر اسے عوام سے لڑا دیا گیا۔ اس مقصد کے لیے پرویز مشرف کو خصوصی طور پر لایا گیا۔ امپیکٹ انٹرنیشنل جو لندن سے شائع ہوا کرتا تھا، اس نے مارچ ۲۰۰۱ء میں پاکستان کے بارے میں ایک تفصیلی مضمون شائع کیا تھا، اس میں جنرل پرویز مشرف کے بارے میں امریکی منصوبے کا بھی ذکر تھا۔ مسٹر ملٹن بیرڈن ۱۹۸۰ء کی دہائی کے اواخر میں اسلام آباد میں سی آئی اے کا سٹیشن چیف تھا۔ اس نے امریکی سینٹ کی فارن ریلشنز کمیٹی کو بتایا کہ ''جنرل پرویز مشرف پاکستان آرمی آفیسرز کی اس آخری جنریشن کے فرد ہیں جو امریکہ اور پاکستان کی ملٹری پارٹنرشپ کے تربیت یافتہ ہیں، البتہ انہیں اوپر لانے کے لیے آئین معطل کرنا ہوگا۔۔۔ میرے اندازوں میں مشرف کی شخصیت ہماری آخری امید ہے جو دنیا میں ہمارے لیے آخری مضبوط قوت کے طور پر کام کرنے والی ہوگی۔۔۔ نہ صرف جنوبی ایشیا میں پاکستان کو ایک اہم راہ پر ڈال سکتی ہے بلکہ دوسری طرف وسطی ایشیا میں بھی۔'' اور جنرل پرویز مشرف نے امریکی امیدوں سے بھی بڑھ کر کام دکھایا اور اس کے بعد آنے والے تو امریکہ کے بچھائے ہوئے ٹریک پر سرپٹ دوڑنے لگے اور بقول ڈاکٹر عبدالقدیر خان:

''ہمارے حکمران امریکہ کی اس پیش گوئی (کہ پاکستان ۲۰۱۵ء میں ٹوٹ جائے گا) کو پورا کرنے کے ایجنڈے پر عمل پیرا ہیں۔''

ایک دہائی قبل پاکستانی عوام کو فوج سے جو محبت وعقیدت تھی، اس میں دراڑیں پڑ چکی ہیں اور یہ دراڑیں انتہائی خطرناک ہیں۔ آئی ایس آئی کا دفاتر، گلیوں وغیرہ میں جس قابل فخر انداز سے ذکر ہوتا تھا، وہ اب سننے کو نہیں ملتا۔ پاکستان فوج اور آئی ایس آئی کا قصیدہ خواں اسلام پسند طبقہ تھا، جنرل پرویز مشرف کے ذریعے امریکہ نے اسی طبقے کے خلاف آپریشن کروا کے اس محبت وعقیدت اور قصیدہ خوانی پر کاری ضرب لگادی۔ یہ دراڑیں فوج ہی پاٹ سکتی ہے۔ پاک فوج نے امریکہ کو جو آنکھیں

دکھانا شروع کی ہیں، اس سے دراڑوں کی خلیج کم ہونا شروع ہوگئی ہے۔

امریکہ ۲۰۱۵ء تک پاکستان کو توڑنے کا مقصد حاصل کرنے کے لیے بھارت، برطانیہ، اسرائیل کے علاوہ پاکستان کے مؤثر طبقات کو بھی استعمال کر رہا ہے جن میں علماء کے فرقہ وارانہ اور سیاست دانوں کے لسانی گروہ بھی شامل ہیں اور ان پر امریکہ کی گرفت بڑی مضبوط ہے۔ اس کی نمایاں مثال گورنر عشرت العباد کی واپسی اور علماء کی ایک فرقہ پرست جماعت ہے۔ افغانستان میں امریکہ بھارت کے ذریعے علیحدگی پسند بلوچوں اور پاکستان مخالف پختونوں کو تربیت دے رہا ہے۔ اس نیٹ ورک کو وسیع کرنے کے لیے امریکی ہدایت پر ہمارے میڈیا اینکرز اور کالم نگار حقانی نیٹ ورک کے خلاف آپریشن کے لیے دباؤ بڑھا رہے ہیں۔ یہی وہ طالبان کا بڑا گروپ ہے جو پاکستان سے دل و جان سے محبت رکھتا ہے، آپریشن کے نتیجے میں اگر یہ پاکستان مخالف ہوجاتا ہے تو خیبر پختونخوا میں امریکی عزائم پورے ہوجاتے ہیں۔

بلوچستان میں بلوچ لبریشن آرمی (BLA) کو کسووا لبریشن آرمی (KLA) کی طرز پر تشکیل دیا گیا ہے اور پرویز مشرف دور میں یہ معرض وجود میں آئی۔ نہ جانے اور کون کون سے گروپ امریکی ہدایت پر ملک میں انتشار و انارکی پھیلانے میں مصروف ہیں۔ کراچی کی ٹارگٹ کلنگ محض لسانی مسئلہ نہیں ہے، یہ پاکستان کو ۲۰۱۵ء تک توڑنے کی سازش ہے۔ جہادی گروپ صحیح ہیں یا غلط لیکن ان کی حب الوطنی پر شک نہیں کیا جاسکتا، ان کی تو وجہ تشکیل ہی اسلام اور پاکستان کے دشمنوں کے خلاف لڑنا ہے۔ امریکہ نے سازش کے تحت پرویز مشرف کے ذریعے انہیں پاک فوج کے خلاف کردیا تاکہ پاکستان کی دفاعی قوت کمزور ہوجائے۔

پاکستان کے استحکام اور بقاء کا انحصار ''جہاد'' پر ہے۔ اس جذبے کو ختم کرنے کے لیے گزشتہ گیارہ سال سے جہاد کے خلاف مہم جاری ہے۔ مجاہدین کو دہشت گرد قرار دے دیا گیا ہے اور ''جہادی'' کہہ کر ان کی تضحیک کی جاتی ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ پنجاب کا وزیر قانون رانا ثناء اللہ ''جہادی کلچر'' کے بارے میں فرماتا ہے: ''جہادی کلچر پیدا کرنے والے آمروں پر کروڑوں بار لعنت''۔ اگر جہاد کے بارے میں قرآنی آیات اور احادیث کو سامنے رکھیں تو جہادی کلچر پیدا کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ نے مدینے میں جہادی کلچر پیدا کیا۔ کوئی مسلمان جہادی کلچر پیدا کرنے والے پر لعنت نہیں بھیج سکتا، ایسا کام صرف ابوجہل اور ابولہب کے پیروکار ہی

کر سکتے ہیں۔ جہادی کلچر پر لعنت بھیجنے کا مطلب پاکستانیوں کے جذبۂ جہاد اور دفاع پر لعنت بھیجنا ہے۔ پاکستان کو دفاعی طور پر کمزور کرنے کے لیے یہ بھی امریکی ہتھکنڈا ہے۔

پاکستان کو بدترین انارکی میں دھکیلنے کے لیے موجودہ حکمران ٹولہ بہترین کارگزاری کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ عدالتی احکامات پر عمل پیرا نہ ہو کر حکمران طبقہ عوام کو انتشار اور فساد کی راہ دکھا رہا ہے۔ یہ فساد جو ابھی کراچی وبلوچستان میں ہے، دیگر علاقوں میں بھی پھیل گیا تو پھر فوج سے بھی نہیں روکا جاسکے گا اور ناقابل تصور خون ریزی ہوگی۔ امریکہ اسی موقع کی تاک میں ہے تاکہ اقوام متحدہ سے مینڈیٹ لے کر وہ پاکستان کی ایٹمی تنصیبات کو اپنی تحویل میں لے سکے۔ اس کے بعد امن کے قیام پر وہ پاکستان کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے بھارت کی سرپرستی میں دے دے گا۔

اس صورت حال سے بچنے کے لیے ایک بڑے قدم اور آپریشن کی ضرورت ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا آپریشن کون کرے؟ پاکستان کا آئین ناقص ہے اور وہ موجودہ صورت حال سے نکلنے کے لیے کوئی رہنمائی نہیں کرتا۔ دراصل مہذب اور قانون کے پابند ممالک میں ایسی صورت حال کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی۔

بعض کے خیال میں ''قومی حکومت'' مسئلے کا حل ہے۔ لیکن اس وقت عملاً قومی حکومت ہی ہے اور پارلیمنٹ کی سبھی جماعتیں کسی نہ کسی طرح حکومت میں شامل ہیں۔ کچھ مڈٹرم الیکشن کو مسئلے کا حل قرار دیتے ہیں مگر موجودہ الیکشن کمیشن اور انتظامیہ کے تحت عوام کے صحیح نمائندے منتخب نہیں ہو سکتے اور صورت حال پہلے سے بھی بدتر ہو سکتی ہے۔ اس کا بہترین حل عوام کے پاس ہے، اگر وہ انقلاب کا فیصلہ کریں۔ بدقسمتی سے عوام شخصیت پرستی میں بت پرستی سے بھی زیادہ غرق ہو چکے ہیں، اس لیے اچھے انقلاب کے امکانات کم ہیں۔ دوسرا حل چیف جسٹس کے پاس ہے کہ نظریۂ ضرورت کے تحت وہ ۶ تا ۹ ماہ کے لیے فوج کی مدد سے ایک آزاد اور نگران حکومت بنا دیں جو آزاد الیکشن کمیشن کی تشکیل اور انتظامیہ کی مکمل تطہیر کے بعد شفاف الیکشن کرادے۔ الیکشن کے قواعد وضوابط میں ہر قسم کے تعصب کو نااہلی کی شرط رکھا جائے لیکن خدشہ ہے کہ ڈاکوؤں اور لٹیروں کا قومی سیاسی اتحاد اس سے بھی اتفاق نہیں کرے گا اور نہ ہونے دے گا۔ اس لیے دعا ہی کی جاسکتی ہے کہ ''اے اللہ! تو قادر مطلق ہے۔ تو ہی اس ملک کو امریکہ کے مذموم عزائم سے محفوظ رکھ اور سیاسی قوتوں کو ہدایت اور عوام کو شعور دے۔ آمین'' (بشکریہ آفاق)۔

ڈاکٹر عبدالوھاب سوری

مسلم معاشرہ اور مغربی تہذیب کا چیلنج (۲)

ٹیکنالوجی کی بحث

ٹیکنالوجیکل ترقی کا یہ ماڈل جو کمیونسٹوں نے استعمال کیا اسے ترقی بذریعہ پلاننگ (Scientific Development by Virtue of Planning) کہا جاتا ہے۔ روسیوں نے اس کے لیے کام کرنا شروع کیا اور ۱۹۲۴ء سے لے کر ۱۹۷۴ء تک پچاس برسوں میں انہوں نے جو ترقی کی اسی منہج کے مطابق کی جس میں ان کی شرح ترقی ۹ فیصد سے لے کر ۱۳ فیصد تھی اور گریز رڈ نے جب نیویارک میں جا کر تقریر کی تو اس نے کہا کہ ہم جس رفتار سے ترقی کر رہے ہیں ہم امریکہ کو اس کے اندر دفن کر دیں گے۔ خلاء (Space) کو انہوں نے پہلے مسخر کیا یعنی وہاں وہ پہلے پہنچے، حیاتیاتی سائنسز (Biological Sciences) انہوں نے پہلے ڈویلپ کیں، theoratical sceincesانہوں نے پہلے ڈویلپ کیں اور اس میں بے تحاشہ کام کیا اور انہوں نے لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کی کوشش کی۔ دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کو اصل میں جس نے شکست دی وہ روس کی سرخ فوج تھی۔ یہ روسی تھے جنہوں نے مشرقی یورپ کے محاذ پر جرمنوں کو شکست دی، امریکیوں کو تو مار ہی نہیں پڑی جب کہ روسیوں کے جنگ میں بیس لاکھ لوگ مارے گئے۔ لیکن ۱۹۷۴ء میں گریز رٹ نے یہ دعویٰ کیا اور ۱۹۸۹ء میں روس ٹوٹ گیا، گویا ایک دم غبارے سے ہوا نکل گئی۔

شرح ترقی اپنی جگہ لیکن ۱۹۸۲ء میں مشرقی یورپ ان کے ہاتھ سے نکلنا شروع ہوا اور ۱۹۸۶ء میں ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ یہ میں کوئی الزام نہیں لگا رہا، آپ گوگل پر جا کر سرچ کر لیجیے 'Solidarity Movements' اگر آپ گوگل پر ڈالیں تو وہ آپ کو بتائے گا کہ مشرقی یورپ جو روس کے ہاتھ سے نکلا وہ Technological Transformation کی وجہ سے نکلا۔ اس کی کیا وجہ تھی؟ اس کی ابھی وضاحت کرتا ہوں۔ ابھی میں نے صرف یہ بتایا ہے کہ ٹیکنالوجی میں ترقی کے لیے انہوں نے یہ اصول اپنایا اور یہ طے کیا کہ وہ سائنسی ترقی کے لیے اپنے سائنس دانوں کو دنیا کی بہترین آسائشیں مہیا کریں گے۔ اس کے لیے اسٹالن نے ایسے شہر آباد کیے تھے اور ایسی جگہیں بنائی

تھیں جہاں وہ اپنے سائنس دانوں کو رکھتے تھے اور دنیا کی بہترین سہولتیں انہیں مہیا کرتے تھے تا کہ یہ سائنس اور ترقی کے میدان میں کام کرتے رہیں اور روس لوگوں کی ضروریات پوری کرتا رہے۔ اس کے باوجود امریکہ ترقی کی دوڑ میں ان سے آگے نکل گیا۔ اتنا آگے نکل گیا کہ جب روس ڈوب رہا تھا تو امریکیوں نے آ کے اسے بچایا۔ روسیوں کے پاس ٹیکنالوجی تھی، ان کے پاس کمٹ منٹ تھی، وہ پڑھے لکھے لوگ تھے بلکہ شرح تعلیم وہاں سوفیصد تھی اور ان کی کمٹ منٹ تھی کہ وہ لوگوں کی ضروریات پوری کریں گے، ترقی کریں گے اور ان کے پاس دنیا کی بہترین فوج تھی، ان کے پاس دنیا کا بہترین اسلحہ تھا لیکن اس کے باوجود روس ٹوٹ گیا۔

اب آئیں دوسرے ماڈل کی طرف! اس کا مرکزی نقطہ ہے مارکیٹ یعنی سائنٹفک ٹیکنالوجیکل ڈویلپمنٹ کو آپ انسان کی حرص اور حسد کے ساتھ جوڑ دیں۔ یعنی مارکیٹ کے اندر کون سا سائنٹفک لاء استعمال کرنا ہے اور کیوں استعمال کرنا ہے، اس کی واحد قوت محرکہ یہ ہے کہ آپ کس طرح پیسہ لگا کر زیادہ سے زیادہ منافع کما سکتے ہیں۔ اگر وہ ریاست کے مفاد کے خلاف نہیں ہے تو آپ جس سائنٹفک لاء کو استعمال کرنا چاہیں کریں اور جتنا زیادہ منافع کمانا چاہتے ہیں کمائیں اور جتنی ٹیکنالوجیکل ٹرانسفرمیشن کرنا چاہتے ہیں کریں آپ کو کوئی روکنے والا نہیں۔ اس اصول کے نتیجے میں امریکہ اور یورپ کے اندر ہر طرح کی ٹیکنالوجیکل ڈویلپمنٹ ہوئی۔ لوگوں نے پیسہ بھی کمایا اور ترقی بھی کی بلکہ اس نے ٹیکنالوجی کو گھر گھر پہنچا دیا مثلاً امریکہ میں لوگوں کے پاس گاڑی جلد پہنچ گئی بہ نسبت روس کے حالانکہ روس میں گاڑی پہنچانے کی ذمہ داری ریاست کی تھی اور اس کی آبادی بھی کم تھی لہٰذا وہاں گاڑی پہلے پہنچنی چاہیے تھی۔ اس کے برعکس امریکہ میں شہری کو خود جا کر گاڑی لانا ہوتی تھی لہٰذا وہاں تاخیر سے گاڑی لوگوں تک پہنچنا چاہیے تھی لیکن ایسا ہوا نہیں۔ بلکہ جو ہوا وہ یہ کہ امریکہ میں مارکیٹ نے اتنی زیادہ گاڑیاں بنائیں سستی اور اتنی انواع واقسام کی بنائیں کہ ہر آدمی کے پاس گاڑی پہنچ گئی۔

مشرقی یورپ کا حال یہ تھا کہ جب وہ مغربی یورپ کے آدمی کو دیکھتا تھا تو وہ کہتا تھا کہ ہمارے پاس ایسی مریل ٹائپ کی گاڑی اور تمہارے پاس بہترین گاڑی کیوں ہے؟ یہ اس وجہ سے تھا کہ روس میں جو گاڑی بنتی تھی وہ ضرورت پوری کرنے کے لیے بنائی جاتی تھی اور امریکہ اور مغربی یورپ کے اندر ان کی عیاشی کو satisfy کرنے کے لیے بنائی جاتی تھی۔ تو تاریخ نے یہ ثابت کیا کہ عیاشی کے لیے پیدا کی جانے والی ٹیکنالوجیکل گروتھ زیادہ تیز ہوتی ہے اور آسانی سے مہیا ہو جانے والی ہوتی

ہے۔مَیں کوئی الزام نہیں دے رہا بالکل بلکہ یہ ایک سائنسی اور عملی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور دنیا یہ مانتی ہے کہ امریکی ٹیکنالوجی روس کے مقابلے میں اتنی طاقتور تو نہیں تھی لیکن اس سے زیادہ آسائش بخش اور بہتر تھی، آسانی سے میسر تھی اور اس کی ہینڈلنگ آسان تر تھی۔

لہٰذا آپ کو کوئی ماڈل ٹیکنالوجیکل ترقی کے لیے احیائے اسلام کے لیے استعمال کرنا ہے تو وہ یا تو Ideological ہوگا یا A-Ideological ہوگا۔ اگر آپ مذہبی آدمی ہیں تو A-Ideological تو نہیں ہوسکتا بلکہ لازماً آپ کا میکانیزم Ideological ہونا چاہیے اور اگر آپ نے ٹیکنالوجی ترقی کے اوپر کوئی نظریہ impose کرنے کی کوشش کی جیسے کہ روس نے کی تھی تو شرح ترقی گر جائے گی اور وہ اس ٹیکنالوجیکل ترقی کا مقابلہ نہ کر سکے گی جو بغیر کسی نظریے کے ہوگی۔

چین کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ ماؤزے تنگ جب آیا، تو اس نے کہا کہ ہم نے تو ترقی کرنی ہے لیکن ان کی Ideological committment تھی سوشلزم کے ساتھ، لہٰذا انہوں نے کہا کہ سب metallergy پر کام کریں گے۔ غلط پلاننگ آپ نے کی Metallergy میں پیسہ ڈال دیا نتیجتاً قحط پڑ گیا اور لاکھوں لوگ مر گئے۔ ایک آدمی نے سوچ کر پلان بنایا، پولیٹ بیورو یا کمیونسٹ کونسل نے منظور کر کے اس کو نافذ کر دیا۔ اس کے نتیجے میں لاکھوں لوگ مر گئے۔ اب اس کا ذمہ دار کون ہے؟ ماؤزے تنگ کو تو خدا کی طرح پوجا جاتا تھا اس سے کون پوچھتا؟ پھر جلدی وہ آنجہانی بھی ہوگیا۔ اس کے بعد ڈنگ ژوچنگ آیا۔ اس نے عوام سے کہا کہ آپ جو بنانا چاہتے ہیں بنائیں اور اس نے معیشت کا رُخ موڑ دیا سوشلزم سے کیپٹل ازم کی طرف۔ دنیا میں اکثر کیپٹل ازم کے بعد سوشلزم آتا ہے لیکن یہاں سوشلزم کے بعد کیپٹل ازم آیا۔ جب چین نے سرمایہ دارانہ نظام کو اپنا لیا تو آپ دیکھ لیں کہ اس نے کس تیزی سے ترقی کی ہے۔ لیکن یہ ترقی سو فیصد سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار ہے اس میں ریاست کا کوئی کردار نہیں ہے۔ ریاست پلان نہیں کرتی کہ آپ کیا پروڈیوس کریں۔ آپ جو بھی پروڈیوس کریں ریاست کہتی ہے کہ اس میں کمیونٹی کی کانٹری بیوشن ہونی چاہیے۔ اگر کمیونٹی کی کانٹری بیوشن ہے تو آپ جتنا چاہیں اس پہ منافع لیں، چینیوں سے بھی لیں، باہر کے ملکوں سے بھی لیں لیکن انہوں نے اپنا سوشلزم اس میں نہیں ڈالا۔

اگر مذہب میں یقین رکھنے والا کوئی معاشرہ خصوصاً مسلمان جب ٹیکنالوجی میں ترقی کی بات کرے گا تو لازماً اسے اپنی اقدار کو قربان کرنا پڑے گا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ ٹیکنالوجی میں ترقی کرے

مارکیٹ کے ماڈل کے مطابق اور اس کی مذہبی اقدار ویسی کی ویسی رہیں۔ کیونکہ مارکیٹ میں ایک ویلیو چلتی ہے (Prime) MCM کے بقول Money, Commodity, Money Extended کہ آپ کی اکانومی ایسی اکانومی ہوتی ہے جس میں آپ پروڈکشن کے عمل میں شرکت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ آپ کو پیسہ بہت آنا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کپٹلسٹ اکانومی میں پروڈکشن کے عمل میں شرکت نہیں کی جاتی۔ اگر آپ ہماری اس بات کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو معاف کیجیے گا کیپٹل ازم کی تفہیم کے بارے میں آپ کا وژن مشکوک ہے۔

یہ بات یاد رکھیں کہ ٹیکنالوجیکل ترقی کے دونوں پیراڈائمز کی اپنی ویلیوز تھیں۔ کیمونسٹوں کی ویلیوز تھیں: انسانوں کی بنیادی ضروریات پوری کرنا، بورژوا اور ورکنگ کلاس کی ضروریات پوری کرنا اور سوشلسٹ انقلاب کو دنیا بھر میں برآمد کرنا۔ اس کے برعکس یورپ اور امریکہ کے اندر ٹیکنالوجیکل ترقی کے پیش نظر تھی آزادی (Freedom)۔ اور سرمایہ دارانہ نظام میں آزادی کا مطلب ہوتا ہے سرمائے کی آزادی کیونکہ سرمایہ دارانہ معاشرے میں سرمایے کے بغیر آزادی کا تصور بے معنی ہے۔ آپ کی جیب میں سکے نہ ہوں تو آپ کی آزادی چہ معنی دارد؟ آپ اکیلے بیٹھ کر خبطیوں کی طرح آزادی کے بارے میں سوچ سکتے ہیں لیکن آزادی کے حق کو استعمال کرنے کے لیے آپ کے پاس سرمایہ ہونا چاہیے اور سرمایہ آتا ہے مارکیٹ کے جبر کو قبول کرنے کے نتیجے میں، مارکیٹ کی اقدار کو قبول کرنے کے نتیجے میں اور مارکیٹ کی صرف ایک قدر ہوتی ہے اور وہ یہ کہ سرمایے کی شرح نمو تیز تر ہو مثلاً یہ جو آپ کے پاس موبائل ہے کمپنیوں نے وہ اس لیے نہیں بنایا کہ آپ اس ذریعے اپنے بچوں یا ماں باپ کے ساتھ بات کریں۔ اس سے میں یہ کام لے سکتا ہوں لیکن میں اگر اس سے صرف یہی کام لیتا رہا تو ایک دن یہ موبائل میرے پاس نہیں رہے گا۔ کیوں؟ کیونکہ موبائل پیسوں سے چلتا ہے فری میں نہیں چلتا۔ یہ اگر مجھے اپنے پاس رکھنا ہے تو اس کا سب سے effective استعمال یہ ہے کہ یہ موبائل کتنا زیادہ مجھے جوڑتا ہے سرمایہ دارانہ عمل سے۔ اگر اس موبائل سے میں بزنس روابط کو بڑھاتا ہوں تو میں ایسے دس موبائل خرید کر اپنے رشتے داروں میں بانٹ سکتا ہوں لیکن اگر اس سے مَیں صرف اپنے والد کی خیریت ہی معلوم کرتا رہا تو یہ موبائل میرے پاس سے چلا جائے گا کیونکہ اس سے میں اگر دھندہ نہیں کرتا تو اس میں روز کارڈ کہاں سے ڈلواؤں گا لہٰذا ایک نہ ایک دن مجھے یہ بیچنا پڑے گا۔

اس موبائل کا سب سے مؤثر استعمال یہ ہے کہ اس سے میں سٹاک مارکیٹ میں پیسے لگاؤں۔ میرا ایک دوست ہے جو ایک بینک میں کام کرتا ہے وہ اکنامکس پڑھا ہوا ہے۔ اس نے نوکری چھوڑ دی اور اب بینک کے ساتھ کام کرتا ہے۔ اس کی تنخواہ ہے ایک لاکھ اسی ہزار روپے۔ اس کے علاوہ بینک اس کو مختلف الاؤنسز میں دیتا ہے ایک لاکھ بیس ہزار روپے اضافی۔ گویا اس کی تنخواہ ہے تقریباً تین لاکھ روپے۔ اس کے پاس لیپ ٹاپ ہوتا ہے۔ وہ بچپن ہی سے سٹاک مارکیٹ میں پیسے لگانے کا ایکسپرٹ ہے، تو بینک اسے ایک بڑی رقم دیتا ہے جس سے وہ سٹہ لگاتا ہے اور اپنے کام کا اتنا ماہر ہے کہ وہ بینک کو ہر مہینے کروڑوں کما کے دیتا ہے کبھی اس کو نقصان نہیں ہوا وہ ہر ماہ بینک کو کروڑوں کما کے دیتا ہے۔ وہ اگر ایک خاص حد سے زیادہ بینک کو کما کر دے تو اس کو اضافی بونس بھی ملتا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ میاں یہ لیپ ٹاپ اس لیے نہیں ہوتا کہ اس پر بیٹھ کر تم لوگوں کی تصویریں دیکھتے رہو۔ اس سے یہ کام بھی لیا جا سکتا ہے کہ تمہارے سر کے اوپر تمہارے ماں باپ کا سایہ قائم ہے اور وہ تمہیں خرچ دیتے ہیں اس لیے تو تم فیس بک استعمال کرنے کی عیاشی کر سکتے ہو۔ لیکن جب باپ مرجائے گا اور تم ہر وقت face book پر تصویریں دیکھتے رہو گے تو بجلی کا بل کہاں سے ادا کرو گے؟ اور اس کے کریڈٹ کارڈ کی ادائیگی کہاں سے کرو گے؟ لیپ ٹاپ دراصل اس لیے ہوتا ہے کہ آپ انٹرنیشنل مارکیٹ کے ساتھ رابطے میں رہو۔ اگر وہ دیکھتا ہے کہ پاکستان کی مارکیٹ میں مندی ہے تو وہ کسی اور مارکیٹ میں پیسے لگا دیتا ہے۔ بینک نے اس کو آزادی دی ہوئی ہے کہ وہ کہیں بھی پیسے لگا سکتا ہے۔ وہ جہاں بھی جاتا ہے لیپ ٹاپ اس کے پاس ہوتا ہے لیکن وہ ۲۴ گھنٹے ایک اذیت میں رہتا ہے۔ وہ میری ہی عمر کا ہے لیکن وہ عمر میں مجھ سے بہت بڑا لگتا ہے۔ ٹینشن کی گولیاں ہر وقت کھاتا رہتا ہے۔ کیونکہ اس کے اوپر ہر وقت ایک پریشر رہتا ہے کہ اگر پیسہ ڈوب گیا تو کیا ہوگا؟ اور وہ کھلا خرچ کرتا ہے اور ایک اعلیٰ معیار زندگی اس نے اپنا لیا ہے اب اس کے گھر والے کم آمدنی پہ گزارا نہیں کر سکتے۔ اس کا ماہانہ خرچ دو ڈھائی لاکھ روپے ہے۔ اب اگر اس کی یہ ملازمت جاتی ہے تو ۴۰، ۵۰ ہزار کی نئی ملازمت میں اس کا گزارا نہیں ہوگا لہٰذا وہ ہر وقت ٹینشن میں رہتا ہے، اسے ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں بم تو نہیں پھٹا، کہیں حالات تو خراب نہیں ہو گئے؟

درحقیقت موبائل ٹیکنالوجی کا اصل مقصد یہ ہے کہ آپ انٹرنیشنل مارکیٹ سے رابطے میں رہیں۔ اس کے علاوہ کسی دوسرے مقصد سے بھی آپ اسے استعمال کر سکتے ہیں لیکن بنیادی طور پر یہ اس کے

لیے بنا نہیں۔ تو ٹیکنالوجی جو ہوتی ہے وہ اپنی ویلیوز کے اندر پھلتی پھولتی ہے۔ اگر آپ اس موبائل سے وہ کام لیتے ہیں جس کے لیے یہ بنا ہے تو آپ زیادہ effective ہوں گے، اس موبائل کے اسٹینڈرڈ کو اپنانے اور چلانے میں زیادہ کامیاب ہوں گے۔ اس سے بہتر موبائل خریدنے کے لیے اس موبائل کا وہ استعمال کرنا پڑے گا جو کہ اس کی ویلیو سے مطابقت رکھتا ہو۔ اس سے اگر آپ لوگوں کے گھروں کے اوپر اذانیں دیتے رہتے ہیں یا نماز کے لیے اٹھاتے رہتے ہیں تو یہ آپ کر سکتے ہیں لیکن اس کے لیے آپ کو کارڈ خریدتے رہنے کے لیے رقم کی ضرورت ہوگی۔ لیکن اگر اس سے آپ جائنٹ سٹاک مارکیٹ میں پیسے لگاتے ہیں تو پھر آپ کو کچھ اور سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔

تو یہ بات آپ یاد رکھیں کہ ٹیکنالوجیکل ترقی کے لیے مارکیٹ سب سے مؤثر میکانزم ہے اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ چارلس ٹلی (Charles Tilly) اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ٹیکنالوجی کیوں value Laiden ہوتی ہے، کہتا ہے کہ ماڈرن ٹیکنالوجی جو آپ کے سامنے ہے اس نے بدترین بربریت کو چھپا دیا ہے۔ اس کی مثال وہ یوں دیتا ہے کہ فرض کرو تمہارے پاس ایک تلوار ہے۔ جیسے ہمارے ہاں بڑے بوڑھے تلوار کی باتیں کرتے تھے کہ تلوار سے تم اپنا گلا بھی کاٹ سکتے ہو اور کسی دوسرے کا بھی۔ مطلب یہ کہ ٹیکنالوجی اپنی کوئی ویلیو نہیں رکھتی اس کا اچھا یا بُرا استعمال اسے بُرا بناتا ہے لیکن چارلس ٹلی کہتا ہے کہ ان کو پتا نہیں ہے کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ جب میں تلوار استعمال کرتا ہوں تو فرض کریں کہ میں تلوار سے انسانوں کے ایک جتھے کے اوپر حملہ آور ہوتا ہوں جو نہتے اور بے بس ہیں۔ وہ نہتے بھی ہیں اور وہ بے بس بھی ہیں اور مجبور بھی ہیں کہ بھاگ نہیں سکتے اور میں ان کو تلوار سے مارنا شروع کروں تو چارلس ٹلی کہتا ہے کہ اس ٹیکنالوجی سے براہ راست وہ شخص متاثر ہوگا جو یہ تلوار چلا رہا ہے۔

میرا ہاتھ کسی بزرگ پر پڑے گا، کسی عورت پر پڑے گا، کسی بچے پر پڑے گا، اور جب وہ چیخیں گے تو اس کا اثر میرے ذہن پر بھی پڑے گا، میری روح پر بھی پڑے گا، اور میرے وجود پر پڑے گا اور ہوسکتا ہے کہ میری پوری اخلاقی زندگی اس بہیمانہ عمل کے بعد تبدیل ہوجائے۔ کیوں؟ کیونکہ جو عمل میں کر رہا ہوں، جس ٹیکنالوجی کے ذریعے کر رہا ہوں اور میں جس میں براہ راست ملوث ہوں جو بربریت میں کر رہا ہوں کیا میں اس سے متاثر نہیں ہوں گا؟ جب وہ سارے مر جائیں گے اور ان کی لاشیں اور کھلی آنکھیں جو مجھے گھور رہی ہوں گی مجھ پر کیوں اثر انداز نہیں ہوں گی؟ ہوسکتا ہے یہ منظر دیکھنے کے بعد میں اپنے آپ کو چھرا مار لوں۔

کیوں؟ کیونکہ جو ٹیکنالوجی میں نے استعمال کی وہ مجھے زندگی اور اس کے حقائق سے الگ (detach) نہیں کرسکی، روایتی ٹیکنالوجی کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ آپ کو اٹیچ کرتی تھی۔ ماڈرن ٹیکنالوجی detach کرتی ہے۔ فرض کریں کہ یہاں کچھ آدمی بیٹھے ہوئے امریکہ کے بارے میں کچھ بُری باتیں سوچ رہے ہیں اور ان سے امریکہ کے مفادات کو کچھ نقصان پہنچنے کا احتمال ہے تو ایک امریکی فلاڈلفیا میں اپنے ائیر کنڈیشنڈ کمرے میں کافی پیتے ہوئے فیصلہ کرے کہ یہ کیا بدمعاشی ہو رہی ہے اور ایک کانٹی نینٹل میزائل کا بٹن دبا دے اور اس کے بعد ٹیلی ویژن کھول کے گانے سنتا رہے اور وہاں سے بیلسٹک میزائل آئے اور یہاں پر ایک لمحے میں بے شمار بچوں، بوڑھوں اور نوجوانوں کی دھجیاں اڑ جائیں۔ اس آدمی کی جو شعوری کیفیت ہوگی اور اس آدمی کی جس نے تلوار سے لوگوں کو مارا تھا دونوں کی شعوری کیفیت ایک جیسی ہوگی یا ہوسکتی ہے؟

آپ کے ہمسائے میں عراق کے اندر ۵ سال میں ۱۲ لاکھ انسان قتل ہوئے کسی کے کان پر جوں تک رینگی؟ پاکستان میں ۳۶ ہزار لوگ مرچکے ہیں، لوگ دیکھ رہے ہیں، لیکن digitally constructed world نے ہر چیز کو کیموفلیج کر دیا ہے۔ بظاہر آپ کو بتایا جاتا ہے کہ آپ connect ہوگئے ہیں لیکن درحقیقت آپ disconnect ہوتے ہیں۔ جب بالاکوٹ میں زلزلہ آیا اور ٹیلی ویژن پر ہم نے اس کے مناظر دیکھے تو مَیں اور میرا بھائی اور اس کے دوست ہم لوگ حسب استطاعت وہاں لوگوں کی مدد کے لیے پہنچے۔ تو ہمیں ایک فوجی پلاٹون کے ساتھ لگا دیا گیا۔ ہم ان کی مدد کرتے تھے اور جو وہ کہتے تھے وہ کرتے تھے۔ وہ اٹھا کر لے آؤ، یہاں سے کھودو، اس طرح کے چھوٹے چھوٹے کام۔ ہم اٹھارہ دن وہاں رہے۔ میں وہاں پر ابتدائی تین دن کھانا نہیں کھا سکا۔ جب میں وہاں پہنچا تھا تو زلزلہ آئے چھ یا سات دن گزر چکے تھے۔ وہاں پر انسانوں کے جسموں کی بدبو تھی جو میں نے زندگی میں کبھی نہیں سونگھی تھی۔

اب میں کوئی محلوں میں رہنے والا آدمی نہیں ہوں۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو ناظم آباد میں پیدا ہوکر پاپوش نگر کے قبرستان میں دفن ہوجاتے ہیں، تو کوئی high profile life نہیں ہے میری۔ لیکن مَیں کھانا نہیں کھا سکتا تھا اور مجھے الٹی ہوجاتی تھی۔ اتنی بدبو پھیلی ہوئی تھی پورے بالاکوٹ کے اندر۔ زلزلے کے بعد جو بھی بالاکوٹ گیا ہے وہ میری بات کی تصدیق کرے گا۔ وہاں میں نے ایک سپاہی سے پوچھا کہ بھائی یہ اس قدر بو کس چیز کی ہے؟ تو اس نے کہا کہ یہ انسانوں کے جسموں

میں سے آ رہی ہے جو اندر پھنسے ہوئے ہیں، مر گئے ہیں۔ تو میں کھانا کھانے کے لیے پہاڑ سے نیچے اتر تا تھا، کافی نیچے اتر تا تھا، تب بھی مجھ سے کھانا نہیں کھایا جاتا تھا۔ وہاں پر ایک پودا ہوتا تھا اس کا پتہ توڑ کر ہاتھوں پر ملنے سے اس میں سے تیز دھنیے جیسی خوشبو آتی تھی تو پھر میں کھانا کھاتا تھا۔ لیکن ٹی وی پر بیٹھ کر جو لوگ دیکھتے تھے کہ کچھ لوگ وہاں پر جاتے تھے غبارے اور کیک لے کر، بچوں کے کیمپوں میں۔ ایک بچے کی ماں مر گئی، اس کے باپ، بھائی سارے مر گئے۔ وہ بچہ کانپتا سسکتا وہاں بیٹھا ہے۔ یہ اس کی برتھ ڈے منانے کے لیے آ گئے کیک لے کر، بڑی بڑی ٹوپیاں اور غبارے لے کر، کیمرے پر ان کی تصویریں بن گئیں، دنیا دیکھ رہی ہے۔

بھئی! یہاں انسان سے روٹی نہیں کھائی جا رہی اور تم کیک لے کر آ گئے ہو؟ تم انسان کے بچے ہو، کون ہو تم؟ کوئی نہیں ہم ان کی خوشیوں میں شریک۔۔۔ اب خوشی کی کیا بات ہے۔ کون سی خوشی منانے کا وقت ہے یہ؟ اس کا پورا خاندان مر گیا، تم خوشی منانے آ گئے۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔ تصویریں کھنچوانے کے لیے میک اپ کر کے آ گئے ہو؟ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ٹی وی پر سنتے اور دیکھتے تھے یہ چیزیں ان کو بدبو تھوڑی آتی تھی؟ انہوں نے ٹھنڈے انسانی جسموں کی گانٹھیں اٹھائی ہیں؟ مرے ہوئے آدمی کو اٹھانے کا تجربہ کیا ہوتا ہے؟ ہاتھ کانپ جاتے ہیں بڑے بڑے مضبوط لوگوں کے! ایک بچہ تھا جس کا ایک ہاتھ باہر رہ گیا تھا، دھڑ دب گیا تھا، ہم نے نکالنا شروع کیا وہ پتا نہیں کس Structure میں دبا پڑا تھا۔ صبح سے میں نے کھودنا شروع کیا، شام تک کھودتا رہا اور میں وہ نہیں نکال سکا بچے کو کھینچنے کی کوشش کی تو اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آ گیا۔ میں جب یہ ہاتھ لے کر واپس آیا تو وہاں ایک آرٹسٹ تھی جو ٹوپی پہن کر بچوں کو لطیفے سنا رہی تھی۔ بتانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ ٹی وی پر دیکھتے تھے۔ اس طرح دیکھنے کا تجربہ اور ہوتا ہے اور محسوس کرنے کا تجربہ کچھ اور! خلاصہ یہ کہ جب آپ technological driven life گزارتے ہیں تو وہ آپ کو detach کرتی ہے۔

ٹیکنالوجی کے خلاف ہم جب بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ تمام پاکستانی پتھر کے زمانے میں چلے جائیں۔ کیونکہ جب آپ ٹیکنالوجی پر تنقید کرتے ہیں تو پاکستانیوں کو اونٹ کی پیٹھ نظر آ جاتی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ آپ خود جا کر اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھ جاؤ! تو آپ کو اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھنے کو کوئی نہیں کہہ رہا۔ لیکن آپ اس ٹیکنالوجی کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھیں گے۔ یہ قدر نہیں ہے کیونکہ ٹیکنالوجی کی قدر کا تعین مارکیٹ کرتی ہے، یہ آپ کو کس نے بتایا کہ یہ مہنگا ہے اور جو مہنگا ہوگا وہ زیادہ اچھا ہوگا۔

یہ جو'مہنگا ہوگا تو وہ اچھا ہوگا' کی قدر کا تعین کون کر رہا ہے؟ قدر کا تعین کر رہی ہے مارکیٹ۔

جب آپ technological driven life world میں جاتے ہیں تو آپ کی قدر بنتی ہے سرمایہ۔ معیارزندگی کی بہتری اور جمع سرمایہ باہمی لازم وملزوم ہیں۔ اسی لیے ہم یہ کہتے ہیں کہ فی زمانہ technologically driven life world اوراحیائے اسلام کو جو لوگ مربوط اور جمع کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ ایک دوسرے کو contradict کرتے ہیں اور جو ویلیوز اس کے نتیجے میں پروموٹ ہوتی ہیں وہ بنیادی طور پر سرمایہ دارانہ ویلیوز ہوتی ہیں۔ سرمائے کی بڑھوتری کو بنیادی ویلیو کے طور پر قبول کیے بغیر ٹیکنالوجیکل گروتھ ہو ہی نہیں سکتی۔

اور یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ ٹیکنالوجی انسانوں کی زندگیوں میں کوئی بہتری لاتی بھی ہے یا نہیں؟ کیونکہ ہوزے ماریہ سبرٹ یا سٹیلیس سٹیریو وغیرہ جیسے ٹیکنالوجی کے ماہرین یہ کہتے ہیں کہ تیسری دنیا کے ممالک تو ٹیکنالوجیکل ڈویلپمنٹ کے پروسیس میں پڑے ہی نہیں۔ وہ ٹیکنالوجی میں Development نہیں کرتے بلکہ redevelopment کرتے ہیں یعنی ایک ایسی چیز کو ڈویلپ کرتے ہیں جو مغربی دنیا میں تیس سال پہلے ڈویلپ ہوچکی تھی اور اب وہاں متروک ہوچکی ہے لیکن یہ اسے ڈویلپمنٹ کے نام سے اپنے لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ جب وہ کوئی ٹیکنالوجی اپنے لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں تو کہتے ہیں اعلیٰ، جدید اور طویل تحقیق کا نچوڑ حالانکہ وہ مغرب میں متروک ہوچکی ہوتی ہے۔ جب ایک کمپیوٹر تیسری دنیا میں مارکیٹ میں آرہا ہوتا ہے تو اس وقت مغرب میں اس کی ٹیکنالوجی متروک (obsolete) ہوچکی ہوتی ہے کیونکہ اس کے بعد کا جو ماڈل ہوتا ہے وہ technology consistant ہوتا ہے۔

کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ٹیکنالوجیکل گروتھ نے انسانوں کی زندگی کے مسائل کو حل کیا ہے۔ کوپن ہیگن میں دسمبر ۲۰۰۹ء میں ایک کانفرنس ہوئی۔ اس کے احوال پر میں بات ختم کروں گا۔ اس کانفرنس میں بہت سارے پوسٹ ماڈرن مفکرین نے مل کر یہ مسئلہ اٹھایا کہ ٹیکنالوجی پروڈیوس کرنے کی وجہ سے دنیا کا جو ٹمپریچر بڑھ رہا ہے اس کی وجہ سے فطرت کی تباہی اتنی تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ اگلے پچاس سال کے اندر دنیا انسانوں کے رہنے کے قابل نہیں رہے گی؟ لہٰذا ان لوگوں کا یہ خیال تھا کہ دنیا کی تمام ریاستوں کو مل کر over all Temprature کو چار ڈگری نیچے لانا چاہیے تاکہ انسانیت کو مزید پچاس سال مل جائیں جس میں وہ sustainable development کے کوئی

دوسرے متبادل میکانزم ڈویلپ کرسکیں۔اس کانفرنس میں امریکہ بھی تھا، یورپ بھی تھا۔ چین اور بھارت وغیرہ سب تھے۔اس معاہدے پر کسی نے بھی دستخط نہیں کیے۔انہوں نے کہا دنیا اگر تباہ ہوتی ہے تو ہوجائے۔ کیونکہ ٹمپریچر چار ڈگری نیچے لانے کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اپنی ٹیکنالوجیکل ترقی کے پراسس کو آہستہ (slow down) کرنا پڑے گا اور اگر ہم ایسا کریں تو ہم نے جو سرمایہ اس پر لگایا ہوا ہے وہ ہمیں کون دے گا؟ حقیقت یہ ہے کہ چین اور بھارت دونوں کے پاس انتہائی ردی قسم کی ٹیکنالوجی (obsoleted technology) ہے جو بہت آلودگی پیدا کرتی ہے۔ تو چین نے کہا ٹھیک ہے ہم اپنی ٹیکنالوجی بند کردیتے ہیں آپ ہمیں اتنے بلین ڈالر دیں جو ہم سرمایہ کاری کرچکے ہیں۔اس پر مغربی ممالک نے کہا ہم تو نہیں دیں گے۔انہوں نے جواب میں کہا تو ہم بند نہیں کریں گے، دنیا جائے بھاڑ میں ہمیں اس سے کیا سروکار؟۔ ویسے بھی اس ایوان کے اندر جتنے لوگ ہیں وہ پچاس سال تک زندہ نہیں رہیں گے لہٰذا اس کے بعد دنیا میں کیا ہوتا ہے اس کی ہمیں کوئی پرواہ نہیں۔

جو پوسٹ ماڈرن دانشور کوپن ہیگن کانفرنس کی صدارت کررہی تھی اس نے وہ مسودہ پھاڑا اور کانفرنس سے اٹھ کر چلی گئی اور اس نے کہا کہ لوگوں نے ترقی کو انسانیت کے مستقبل پر ترجیح دی ہے لہٰذا اس دنیا کا اللہ ہی حافظ ہے۔اور یہ بات اس نے ہی نہیں کہی ایک مشہور ملحد فلسفی تھا ہائیڈیگر اس نے ۱۹۲۶ء میں ایک کتاب لکھی تھی '*Essay Concerning Technology*'۔ اس سے کسی نے پوچھا تھا کہ یہ ٹیکنالوجی کا جو عفریت کھڑا ہوگیا ہے اس کا کوئی حل ہے یا نہیں ہے؟ تو اس نے کہا کہ اس ٹیکنالوجی کے عفریت سے دنیا کو صرف خدا بچا سکتا ہے حالانکہ وہ خود خدا کو نہیں مانتا تھا۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا کو کوئی نہیں بچا سکتا۔ کیونکہ یہ بُرائی کا ایسا چکر ہے جس میں پڑتا تو آسان ہے لیکن اس سے نکلا نہیں جاسکتا۔ یہ ایسا کمبل ہے جس کو اوڑھنا تو آسان ہے لیکن پھر یہ کمبل آپ کو چھوڑتا نہیں ہے۔

ہمارے ہاں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو ٹیکنالوجیکل ترقی میں شامل ہی نہیں یہ تو یورپ participate کررہا ہے لہٰذا ہمیں کیا؟ ہم تو ہمیشہ محکوم ہی رہیں گے۔کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ٹیکنالوجیکل ترقی کے پروسیس کو slow down کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ بُرے consumer بن جائیں اگر آپ ایک بُرے consumer بن جاتے ہیں تو انٹرنیشنل گلوبل اکانومی ڈوب جائے گی۔ایک بڑا مشہور اکانومسٹ کہتا ہے کہ اگر ایک مہینے تک ایک بڑی تعداد میں لوگ consumption کے پروسیس سے اپنے آپ کو detach کرلیں تو پروڈکشن کا عمل تو مستقل پروڈیوس کیے جارہا ہے ناں! یہ

مرغیاں جو آپ نے پال رکھی ہیں ایک خاص قسم کی ٹیکنالوجی کی وجہ سے وہ مسلسل انڈے دیتی رہتی ہیں۔ اگر آپ چاہیں کہ یہ انڈے دینا بند کر دیں تو یہ نہیں ہوسکتا وہ انڈے دیتی رہیں گی۔ جو بھی ٹیکنالوجی پروسیس کے اندر ہے اس کو اگر آپ نے slow down کرنے کی کوشش کی تو اس کے price mecanism ڈسٹرب ہوجائیں گے اور پوری انٹرنیشنل مارکیٹ بیٹھ جائے گی۔

تو جو لوگ غلط امریکی پالیسوں کی وجہ سے اس کی مخالفت کرتے ہیں اور اسے شکست دینا چاہتے ہیں انہیں سمجھنا چاہیے کہ اس کے لیے انہیں امریکہ پر میزائل اور بم مارنے کی ضرورت نہیں بلکہ اس پر اس پہلو سے حملہ کرنا چاہیے جس کا وہ دفاع بھی نہ کرسکے اور وہ یہ ہے کہ آپ اس کی سرمایہ دارانہ ویلیوز کی پیروی کرنا چھوڑ دیں اور اس کی ٹیکنالوجی مصنوعات کی خرید بند کردیں۔ دیکھیے! امریکہ آپ سے یہ نہیں کہتا کہ آپ pizza hut میں جاکر ہزار روپے کی روٹی کھاؤ جبکہ آپ کے ملک میں پانچ روپے کی روٹی مل رہی ہے اور وہ آپ سے یہ نہیں کہتا کہ ڈیڑھ کروڑ روپے کی گاڑی میں بیٹھو۔

جب آپ یا تیسری دنیا کے کسی ملک کا کوئی شہری 1600cc کی گاڑی خریدتا ہے تو چارلس ٹلی کہتا ہے کہ اس کی لوکل آبادی، اگر وہ زراعت پر مبنی معیشت رکھتی ہے جیسے کہ پاکستان کی ہے، تو سو گھرانے ڈھائی من کی گندم کی بوری سے محروم ہوجائیں گے۔ سو خاندانوں کو آٹے سے محروم کرنے کے بعد وہ گاڑی خریدتا ہے۔ اگر وہ کہے کہ میں نے ان پر ڈاکہ تھوڑی ڈالا ہے۔ تو بے شک آپ نے ڈاکہ نہیں ڈالا لیکن آپ ایک ٹیکنالوجی استعمال کررہے ہیں جو آپ نے نہیں بنائی تو آپ اس کی قیمت کہاں سے ادا کروگے؟ اپنے لوگوں کا گلہ کاٹ کر تو ہی ادا کروگے۔

اگر آپ کہیں کہ اس میں حرج ہی کیا ہے؟ تو سمجھیے کہ گاڑی کوئی آم کے پیڑ پر نہیں اُگتی کہ آپ جاکر توڑ لائیں گے۔ گاڑی بنانے کے لیے انسان کو ہزاروں طرح کی آلودگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر آپ کے لیڈر سے کوئی پوچھے کہ میاں جنت کا تصور کیا ہے تو وہ کہے گا جنت کا تصور یہ ہے کہ موٹر وے ہو بہت بڑی سی اور مَیں اس میں لیموزین چلاتے ہوئے جارہا ہوں۔ اگر اُس کا دماغ اِس طرح کام کررہا ہے تو ظاہر ہے کہ عام آدمی کا دماغ کس طرح سے کام کرے گا؟

خلاصہ یہ کہ مغرب کی ٹیکنالوجیکل ترقی کے میکانزم کو اگر آپ اسلحے کی بنیاد پر شکست دینا چاہتے ہیں اور اسلحے کے میدان میں ٹیکنالوجیکل پر کام کرنا چاہتے ہیں تو وہ بھی آپ کرسکتے ہیں لیکن بنیادی طور پر مغرب کو شکست دینے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ اس کی ویلیوز کی نقل کرنا چھوڑ دیں۔ اگر آپ کی ویلیوز وہی ہیں، اگر

آپ بھی وہی چاہتے ہیں جو وائٹ ہاؤس کے اندر بیٹھا ہوا آدمی چاہتا ہے تو پھر لڑائی کس بات کی ہے؟ پرابلم کیا ہے؟ لیکن اگر آپ فرعون کا طرزِ زندگی اور موسیٰ کی آخرت چاہتے ہیں تو یہ دونوں چیزیں ناممکن ہیں۔ دونوں ایک ساتھ نہیں ملیں گی۔ حضرت شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہو اور یوں بھی، یہ نہیں ہوسکتا۔

وقت کی کمی کی وجہ سے میں تفصیل میں نہیں جاسکتا۔ خالد جامعی صاحب نے اس موضوع پر ۱۸۰۰ صفحات لکھے ہیں اور جتنے ممکنہ اعتراضات ہوسکتے ہیں ان کے جوابات دیے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ موجودہ ٹیکنالوجی کا استعمال فوراً بند کردیں اور اسے توڑ کر پھینک دیں اور مجھے کہیں کہ سوری صاحب! آپ خود پنکھے کے نیچے بیٹھے ہوئے ہیں اور اس کے خلاف وہی پرانے اور گھسے پٹے دلائل دہرا رہے ہیں۔ بھائی! اگرچہ موسیٰ علیہ السلام نے اسی چکی کا آٹا کھایا تھا جو فرعونی تہذیب کی پیدوار تھی لیکن انہوں نے فرعون کی طرزِ زندگی کو آئیڈیلائز نہیں کیا تھا اور جب ان کو موقع ملا انہوں نے اس طرزِ زندگی کو الٹا کے رکھ دیا۔ انہوں نے اہرام مصر نہیں توڑا لیکن انہوں نے یہ بھی نہیں کہا کہ چلو ہم اسے لائبریری بنادیتے ہیں۔

مسلمان جب بحیرۂ روم کے پاس پہنچے ہیں تو انہوں نے کہا یہ کس طرح کے لوگ تھے جو پہاڑوں میں اس طرح کی محفوظ زندگی گزارنے کے باوجود مارے جارہے ہیں۔ تو اس سے وہ یہ سمجھے کہ تحفظ کے لیے پہاڑوں کے اندر رہنا بھی بیکار ہے اور یہ طے کیا کہ وہ میدانوں کے اندر رہ کر ہی اپنا تحفظ کریں گے اور دشمن کو شکست دیں گے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ ٹیکنالوجی کی بنیاد پر وہی طرزِ زندگی اختیار کرنا چاہتے ہیں جو امریکہ اور یورپ اختیار کیے ہوئے ہیں تو پھر آپ کو ان کے ساتھ پرابلم کیا ہے؟

ہم یہ کہتے ہیں کہ ٹیکنالوجی اپنے ساتھ اپنی ویلیوز لے کر آتی ہے۔ یہ دیکھیے کہ مشرقی اور مغربی یورپ میں اتحاد کی تحریک کیسے چلی! جب مشرقی یورپ کے لوگوں نے دیکھا کہ مغربی یورپ کے لوگوں نے خوب ترقی کرلی ہے تو انہوں نے سوچا کہ ہم بھی ان کی ٹیکنالوجی کو اپنا لیتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ہمارے ہاں بھی ایسی ہی ترقی ہوجائے گی۔ اس کے لیے انہوں نے انفارمیشن ٹیکنالوجی ان سے لی۔ انہوں نے جیسے ہی انفارمیشن ٹیکنالوجی مغربی یورپ سے لی تو انہوں نے کہا کہ آپ کے پاس ایسے مالی ادارے ہونے چاہئیں جو اس ٹیکنالوجی ٹرانسفر میں مدد دیں تو مشرقی یورپ والوں نے سوچا کہ چلو چند ایک مالی ادارے بنا لیتے ہیں جو مشرقی اور مغربی یورپ کے مابین ٹیکنالوجی ٹرانسفرمیشن کو ممکن کرسکیں۔ لیکن ان اداروں کے ذریعے بالآخر پوری سوسائٹی ٹرانسفر ہوگئی اور انہوں نے

کمیونسٹوں کو اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ مشرقی یورپ کی آبادی کا اوسط طرزِ زندگی ۱۹۲۴ء یعنی پہلی جنگ عظیم کے بعد سے لے کر ۱۹۸۲ء تک صرف چودہ فیصد بڑھا تھا۔ انہوں نے جب مغربی یورپ کو دیکھا تو سوچا کہ ہمیں بھی ایسی ترقی چاہیے۔ انہیں بتایا گیا کہ یہ ترقی تمہیں ملے گی competitive life world کی بنیاد پر چنانچہ وہ مان گئے کہ انہیں free competition چاہیے۔ میں کیوں لائن میں لگ کے انتظار کروں؟ بلکہ جس میں دم ہے وہ لے لے۔ یوں انہوں نے کہا کہ ہمیں اصول مساوات کی بنیاد پر ٹیکنالوجی نہیں چاہیے بلکہ efficiency کی بنیاد پر چاہیے۔ efficiancy تو سب کے اندر برابر نہیں ہوتی، جس کی جتنی efficiency ہو وہ اتنی ٹیکنالوجی مغربی یورپ والوں سے لے لے۔ اس کے نتیجے میں کیا ہوا؟ مشرقی یورپ اور مغربی یورپ ایک ہی نتیجے پر جمع ہو گئے۔ اگر آپ بھی وہی ٹیکنالوجی استعمال کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو بھی انہی ویلیوز پر جمع ہونا ہوگا (جاری ہے)۔

تزکیۂ نفس

امام ابن قیمؒ

روزہ۔تزکیۂ نفس کا مؤثر ذریعہ

روزہ سے مقصود یہ ہے کہ نفس کو اس حد تک قابو کیا جائے کہ وہ خواہشات کی تکمیل سے رکنے کی تربیت پائے اور لذت کی وہ بہت سی صورتیں جو اس کے منہ کو لگ چکی ہوں، ایک اعلیٰ مقصد کی لگن میں اس سے چھڑوا دی جائیں۔ اس کے حیوانی قویٰ کو قابو میں لایا جائے اور اس کی شہوانی توانائی کو اعتدال سکھایا جائے۔ نفس کی چاہت کو مادی مطالب سے پھیر کر ایک اعلیٰ و پاکیزہ رُخ دیا جائے۔ اس میں وہ سلیقہ پیدا کیا جائے کہ یہ کسی اور جہان کی جستجو کر سکے جہاں لطف کی کوئی انتہا نہیں اور جہاں نعمتوں اور آسائشوں کا کوئی اندازہ نہیں اور جہاں عیش کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ تاکہ یہ ان خوبیوں سے آراستہ ہو سکے جو دائمی زندگی پانے کا ایک مناسب ترین مقدمہ بن سکیں۔

چنانچہ روزے سے مقصود یہ ہے کہ دنیا کی بھوک پیاس کی نفس میں کچھ خاص وقعت نہ رہے اور نہ یہاں کا کھانا پینا ہی اس کا منتہائے سعی رہے۔۔۔ تاکہ یہ احساس کی وہ صلاحیت بھی پالے جس کی بدولت اس کو اندازہ رہنے لگے کہ ایک بھوکے مفلس کے کلیجے پہ کیا گزرتی ہے اور مسکین کے دل کی کیا حالت ہوا کرتی ہے۔

روزہ سے مقصود یہ ہے کہ جسم میں شیطان کی بھاگ دوڑ کے لیے راستے تنگ کر دیے جائیں اور کھانے پینے کی راہ سے شیطان کو یہاں جو گزرگاہیں میسر آتی ہیں وہاں اس کا گزر دشوار کر دیا جائے۔۔۔ قوائے جسم کی آزادی ذرا محدود کر کے، اور بدن کا جوش ذرا کم کر کے، روح کو معبود کے راستے میں تحریک دی جائے۔ پس یہ مفتیوں کے لیے ایک زور آور جہاد ہے اور مجاہدوں کے لیے ایک زبردست ڈھال۔ یہ نیکوکاروں کی ریاضت ہے اور خدا کا قرب پانے والوں کے لیے محنت کا ایک بڑا میدان۔

روزے کو سارے اعمال میں سے 'خدا کی خاطر' ہونے کی وجہ سے ایک خاص نسبت حاصل ہے کیونکہ روزہ دار اپنی خواہش اور اپنی شہوت کو اور اپنے کھانے پینے کو معبود کی خاطر چھوڑ دیتا ہے۔ پس یہ محبوباتِ نفس کو خدا کی محبت میں بھلا دینا ہے اور نفس کی لذتوں کو خدا کی خوشنودی پر وار دینا ہے۔ گویا یہ نفس کا ایک محبوب سے پھر کر ایک دوسرے محبوب کو اختیار کر لینا ہے۔ پس یہ روزہ محبوب کا ایک شعوری اور ہمہ وقتی تعین ہے۔ بندے اور خدا کے مابین ایک راز ہے۔ یہ ایک ایسا راز ہے جو بندے کو معلوم ہے یا پھر خدا کو! لوگ زیادہ سے زیادہ دیکھ سکتے ہیں تو یہ کہ یہ بندہ اپنا کھانا پینا اور دیگر مفطرات کو

چھوڑ کر بیٹھا ہے۔ مگر دل کی وہ حالت جو اس سے اس کا یہ کھانا پینا اور اس کی یہ شہوت وخواہش چھڑوائے بیٹھی ہے اور معبود کی طلب میں جائز خواہشِ نفس کو قربان کروارہی ہے، صرف خدا کو معلوم ہے۔ اس کی کوئی اور کیوں خبر پاسکتا ہے۔۔۔روزہ کی اصل حقیقت سمجھو بس یہی ہے!

انسان کے ظاہر و باطن کو بدل کر رکھ دینے میں روزے کی عجیب تاثیر دیکھی گئی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ جسم کے فاسد مادے اس ریاضت سے ڈھل جاتے ہیں بلکہ روح کے ناگوار پہلو بھی اس عبادت سے خوب صاف ہوتے ہیں۔ قلب اور جوارح کے صحت پانے میں روزہ کی تاثیر دیدنی ہے۔ نفس کے وہ حصے جو خواہشات وشہوات کے زیر آب آچکے ہوتے ہیں، وہ اس عمل کے نتیجے میں بخوبی واگزار کرالیے جاتے ہیں اور بندگی کو اس سرزمین پر پیر جما کر چلنے میں خوب مدد ملتی ہے۔ دل میں تقویٰ کی راہ ہموار کرنے میں 'روزہ' کو عبادات کے مابین ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ** [183:2]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم پر روزے فرض کیے جاتے ہیں جیسا کہ تم سے پہلوں پر فرض کیے گئے، شاید کہ تم تقویٰ پاؤ''۔

اور رسول کریم ﷺ نے فرمایا: '**الصوم جُنة**' یعنی روزہ ڈھال ہے۔

علاوہ ازیں جنسی خواہش کو قابو میں لانے کے لیے آپ ﷺ نے روزہ تجویز فرمایا۔ غرض عقل اور فطرت کو نفس کی اصلاح میں روزہ کی اس غیر معمولی تاثیر کا جو مشاہدہ کرنے کو ملتا ہے اس کے پیش نظر ہم دیکھتے ہیں کہ خدا نے اس عبادت کو انسانوں کے لیے مشروع ٹھہرادیا۔۔۔پس یہ اس کی رحمت ہے اور ان پر اس کا ایک احسان اور بُرائی سے ان کا ایک زبردست تحفظ۔

پس روزہ یہ ہے کہ وہ حلال لذتیں بھی جو نفس کے منہ کو لگ چکی ہوں اور وہ جائز آسائشیں بھی جن کا یہ نفس عادی ہو چکا ہو۔۔۔اس سے پرے کردی جائیں اور کچھ عرصہ اس پر یہ حالت گزرے اور اس کیفیت میں اس کو خدا کی جانب متوجہ کرایا جائے تاکہ یہ بندگی کے کچھ خاص پاکیزہ معانی از بر کرے اور پورا ایک ماہ یہ اسی حالت میں صبح سے شام کردیا کرے۔

منہ کو لگ چکی یہ لذتیں اور آسائشیں چھڑا دینا چونکہ آسان کام نہ تھا لہٰذا اس کی فرضیت نازل ہونے سے خاصی دیر تک رکی رہی۔ یہ فرض ہجرت کے بھی کچھ دیر بعد نازل ہوا۔ نفوس کے اندر جب توحید گہری اتر چکی اور پھر نماز نے ان موحد نفوس کو ایک بندگانہ صورت دے دی اور قرآن سے حکم لینے پر کچھ تربیت پالی تب بتدریج ان کو بندگی کی اس صورت کی جانب لایا گیا۔

ہماری سرگرمیاں

اسد محمود کاشمیری
سراج محمود ناصر

دوروزہ قومی تعلیمی کانفرنس

مختصر روداد

تحریک اصلاح تعلیم کے ادارے صفاء انسٹی ٹیوٹ نے ۲۴،۲۳ جولائی ۲۰۱۱ء کو دوروزہ قومی تعلیمی کانفرنس کا انعقاد ہمدرد کانفرنس سنٹر لٹن روڈ لاہور میں کیا۔ اس کانفرنس کا بنیادی تصور یہ تھا کہ دینی ضرورت اور عملی تقاضوں دونوں لحاظ سے ہمارے معاشرے کی اس وقت ضرورت یہ ہے کہ ہماری تعلیم اسلامی اصولوں اور تقاضوں کے مطابق ہو اور اس میں بچوں کی اسلامی تربیت کا خصوصی اہتمام ہو۔ اس غرض سے ایسے سکولوں کے پرنسپل/ ڈائریکٹر حضرات کو دعوت دی گئی تھی جو اپنے اداروں میں تعلیم و تربیت کے اسلامی اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہیں اور حتی المقدور ان پر عمل کی کوشش کرتے ہیں۔

کانفرنس کا اسلوب یہ رکھا گیا تھا کہ شریک ہونے والے تعلیمی اداروں کے سربراہان کو اسلامی تعلیم وتربیت کے حوالے سے اپنے اپنے وژن اور تجربات کے اظہار کا موقع ملے تا کہ لوگ ایک دوسرے کے عملی تجربات سے استفادہ کرسکیں۔ اسی طرح تقریریں اگرچہ مختصر رکھی گئی تھیں (ہر تقریر کا دورانیہ آدھا گھنٹہ تجویز کیا گیا تھا) لیکن ان پر سوال و جواب کے لیے زیادہ وقت دیا گیا تھا۔ لیکچرز کی ترتیب یہ تھی کہ پہلے موجودہ نظام تعلیم کا تنقیدی جائزہ لیا جائے، پھر اس کی اصلاح کی حکمت عملی پر گفتگو کی جائے اور پھر اصلاح کے اہم اصولوں یعنی نصاب، تربیت اساتذہ، تعلیمی انتظامیہ کی تربیت اور طلبہ کی کردار سازی پر شرکاء کو اطمینان سے سننے، سوچنے اور کہنے کا وافر موقع ملے۔ الحمدللہ! یہ سب کچھ ہوا اور شرکاء نے دو دنوں تک جم کر ان موضوعات پر غور کیا اور گفتگوئیں کیں۔

پہلے دن یعنی ۲۳ جولائی کے افتتاحی اجلاس کی صدارت لاہور ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس اور سپریم کورٹ کے جسٹس (ر) خلیل الرحمٰن خان صاحب نے کی جو بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے ریکٹر بھی رہ چکے ہیں۔ آپ سپریم کورٹ کے اس شریعت اپیلیٹ بنچ کے چیئرمین تھے جس نے سود کو خلاف شریعت قرار دیا تھا اور آپ ان چند ججوں میں سے ایک تھے جنہوں نے پی سی او کے تحت حلف اٹھانے سے انکار پر ریٹائرمنٹ قبول کرلی تھی۔ تلاوت قرآن حکیم کا اعزاز قاری عطاء

الرحمٰن صاحب نے حاصل کیا جنھوں نے خوبصورت انداز میں تعلیم کتاب وحکمت وتزکیہ والی آیات اور ان کا ترجمہ شرکاء کے سامنے پیش کیا۔ اس کے بعد تحریک اصلاح تعلیم کے صدر ڈاکٹر محمد امین صاحب نے کانفرنس اور ادارے کے مقاصد شرکاء کے سامنے رکھے اور بتایا کہ ان کا ادارہ پچھلی ربع صدی سے تعلیمی اصلاح کے لیے سوچ بچار اور مقدور بھر عملی جدوجہد کررہا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے پیش نظر شروع ہی سے دو مقاصد تھے: ایک یہ کہ موجودہ نظام تعلیم کی اسلامی تناظر میں اصلاح کی جائے اور دوسرے نئے رول ماڈل تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں۔ ان کے بعد پروفیسر عبدالصمد صاحب نے موجودہ نظام تعلیم کا تنقیدی جائزہ پیش کیا۔ پروفیسر صاحب عمر بھر تعلیم کے شعبے سے وابستہ رہے ہیں اور یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی کی فیکلٹی آف سوشل سائنسز کے ڈین اور شعبۂ تعلیم کے سربراہ کی حیثیت سے پچھلے سال (دوسری بار) ریٹائر ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا نظام تعلیم نظریاتی جہت سے عاری ہے اور ہمارے حکمرانوں، بیوروکریسی اور تعلیمی ماہرین نے مغربی تہذیب کی اندھی پیروی ہی کو تعلیم وتربیت کی معراج سمجھ لیا ہے۔ (خصوصاً انگریزی ذریعہ تعلیم، غیر ملکی امتحانات اور تربیت کے مغربی انداز اس کا طرۂ امتیاز ہیں) حالانکہ مغرب کا رویہ اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے سراسر دھوکے اور دشمنی پر مبنی ہے لہٰذا ہمیں عقل کے ناخن لینے چاہئیں اور اپنی زبان (اردو) اور اپنی ثقافت کو پس پشت نہیں ڈالنا چاہیے۔ سوال و جواب کی نشست کے بعد جسٹس (ر) خلیل الرحمٰن خان صاحب نے اپنے صدارتی خطبے میں ایک جاپانی ماہر تعلیم کے حوالے سے گفتگو کی اور اس کے بیان کردہ اصولوں کو اسلامی تعلیمات کے مطابق قرار دیتے ہوئے انہوں نے حسن خُلق (courtesy)، حسن انتظام (management)، تجزیاتی ذہن (analytical mind) جنس ومنشیات سے آگاہی (sex and drug education) اور معاشرتی حقوق و واجبات کی اہمیت پر زور دیا۔

اس کے بعد نماز ظہر اور کھانے کا وقفہ ہوا اور دوسرے سیشن میں بعض شرکاء کانفرنس نے 'اسلامی سکول: میرا وژن اور تجربات' کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر دوسروں سے شیئر کیا اور ان کے سوالات کے جوابات دیے۔ بعدازاں ڈاکٹر محمد امین صاحب نے 'موجودہ نظام تعلیم: اصلاح کی حکمت عملی' کے عنوان سے گفتگو کی۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے نظام تعلیم میں دو بنیادی خرابیاں ہیں: ایک تو وہ عصری اسلامی تقاضوں کو پورا نہیں کرتا اور دوسرے وہ مغربی تہذیب کی اندھی نقالی پر مبنی ہے جس کا ایک بڑا

مظہر تعلیمی ثنویت ہے یعنی دینی تعلیم الگ اور دنیاوی تعلیم الگ ہے حالانکہ اس سیکولرزم کی اسلام میں کوئی گنجائش ہے ہی نہیں اور مسلمانوں کا نظام تعلیم ہمیشہ موحد (Integrated) رہا ہے جو بیک وقت دین و دنیا کی ضرورتیں پوری کرتا تھا۔انہوں نے کہا دینی مدارس کو جدید علوم کا تعارفی مطالعہ کرانا چاہیے اور جدید تعلیم میں ضروری دینی تعلیم و تربیت شامل ہونی چاہیے اور مغربی تہذیب کے مظاہر(انگریزی ذریعۂ تعلیم، غیر مسلم اور غیر پاکستانی مصنفین کی نصابی کتب، او اور اے لیول کے امتحانات اور ہم نصابی سرگرمیوں میں مغرب پرستی) کی پیروی سے گریز کرنا چاہیے۔انہوں نے موجودہ درس نظامی اور مغرب زدہ جدید تعلیم کے مقابلے میں ایسے نئے رول ماڈل تعلیمی اداروں (سکول،کالج، یونیورسٹی اور دینی مدارس) کے قیام کو ضروری قرار دیا جو موجودہ تعلیمی دھاروں کی خامیوں سے پاک ہوں۔

ڈاکٹر محمد امین صاحب کی تقریر نے کئی بحثیں چھیڑ دیں جو تیسرے سیشن میں بھی جاری رہیں جس کے مہمان خصوصی مشہور صحافی اور کالم نگار عامر خاں خاکوانی تھے۔انہوں نے بھی اس بحث میں حصہ لیا اور انگریزی ذریعۂ تعلیم کو پنجاب میں ابتداء سے اور پانچویں اور آٹھویں کے امتحان میں لازمی قرار دینے کے حکومتی فیصلے پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو کو کم از کم متبادل ذریعہ تعلیم و امتحان تو باقی رہنے دینا چاہیے تھا۔ انہوں نے کہا کہ جب تک اسلامی سکول بہتر رزلٹ نہیں دیں گے اور عام سکولوں سے بہتر افراد پیدا کر کے نہیں دکھائیں گے جو دنیاوی لحاظ سے بھی کامیاب ہوں، محض اسلام اور اردو کے نعرے سے مقابلے کی یہ جنگ جیتی نہیں جاسکتی۔ انہوں نے کہا کہ اگر مقابلے کے امتحانات میں ذریعۂ اظہار اردو ہو جائے تو اس سے سول سروس میں آنے والوں کے ٹائپ اور مزاج کے لحاظ سے کافی فرق پڑے گا۔

چوتھی نشست تربیت طلبہ پر تھی۔ اس نشست کے مہمان خصوصی جناب احمد جاوید صاحب ناسازئ طبع کی بناء پر تشریف نہ لا سکے چنانچہ ڈاکٹر محمد امین صاحب نے تربیت کے حوالے سے پیدا ہونے والے اہم سوالات اور مباحث کا ذکر کرنے کے بعد شرکاء سے درخواست کی کہ وہ ان سوالات اور مباحث پر غور فرمائیں تاکہ ان کے بارے میں کل سیر حاصل گفتگو ہو سکے۔ نماز عشاء اور کھانے کے بعد پہلے دن کی سرگرمیوں کا اختتام ہوا۔

۲۴ جولائی اتوار کو پہلا سیشن صبح ۰۸:۳۰ بجے شروع ہوا۔ قاری عطاء الرحمٰن صاحب کی تلاوت کے

بعد مرزا عزیز احمد صاحب نے 'اسلامی سکول کا نصاب کیسا ہونا چاہیے؟' کے موضوع پر گفتگو کی۔ مرزا صاحب سکول سطح پر تدریس کا عمر بھر کا تجربہ رکھتے ہیں اور انہوں نے عرب امارات میں کئی اسلامی انٹر نیشنل سکول از ابتداء تا عروج چلائے ہیں۔ مرزا صاحب نے اچھے نصاب کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے کہا کہ نصابی کتب قومی زبان میں ہونی چاہئیں۔ انہوں نے کہا کہ اردو کو ذریعہ تعلیم و امتحان بنانا اتنا مشکل نہیں جتنا بظاہر نظر آتا ہے لیکن اس کے لیے محنت کرنا ہوگی۔ اگر آپ کا سکول اردو میڈیم ہو لیکن آپ کے طلبہ کو انگریزی بہت اچھی آتی ہو، اتنی اچھی کہ وہ معروف انگریزی میڈیم سکولوں کے طلبہ کو انگریزی مباحثوں اور تقریری مقابلوں میں ہرا سکیں اور آپ ایسا فرد تیار کرسکیں جو دنیاوی لحاظ سے بھی انگریزی سکولوں سے پیچھے نہ ہوتو ایسے اردو میڈیم سکولوں کے بارے میں معاشرے کا رجحان آہستہ آہستہ بدلنا شروع ہوجائے گا۔ مرزا صاحب سے سوال و جواب کی نشست کے بعد پروفیسر ملک محمد حسین صاحب نے 'تربیت طلبہ میں اساتذہ کا کردار' کے موضوع پر گفتگو کی۔ انہوں نے کہا کہ اگر استاد طلبہ کو اپنی اولاد کی طرح سمجھے تو پھر ہی ان کے اندر وہ من چاہی تبدیلی لاسکتا ہے لہٰذا استاد کا کام محض تدریس (teaching) نہیں بلکہ mentoring یعنی تعمیر سیرت یا شخصیت سازی بھی ہے۔ انہوں نے کینیا کے ایک گاؤں کی مثال دی کہ کس طرح ایک معمولی سے مضافاتی سکول کے غریب بچوں کو ان کی استاد نے معاشرے کے کامیاب ترین افراد بنا دیا صرف اس وجہ سے کہ وہ خاتون استاد بچوں سے محبت کرتی تھی اور ان کی حقیقی خیرخواہ تھی اور ان کا مستقبل بنانا چاہتی تھی۔ انہوں نے پرنسپل/ ہیڈ ماسٹر کے کردار کا بھی ذکر کیا کہ وہ کس طرح کامیاب اساتذہ کی گرومنگ میں اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔

سوال و جواب کی نشست کے بعد نماز اور کھانے کا وقفہ ہوا اور تیسرے سیشن میں ایف سی کالج یونیورسٹی میں سوشیالوجی کے سربراہ پروفیسر شاہد رشید صاحب نے تربیت طلبہ کے اسلامی منہج پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انہوں نے اس ضمن میں موزوں نصاب، استاد کے کردار، سکول انتظامیہ کے رویوں اور مناسب ہم نصابی سرگرمیوں کی اہمیت کا ذکر کیا۔ ان کے نزدیک جب تک سکول انتظامیہ اور اساتذہ مل کر سکول کا ماحول نہ بدلیں اور اسے تربیت فرینڈلی نہ بنائیں طلبہ میں تبدیلی لانا مشکل ہے۔ انہوں نے اس ضمن میں والدین کے کردار کو اہمیت دیتے ہوئے سکول پرنسپلز کو مشورہ دیا کہ وہ بچے کی تربیت کے حوالے سے والدین سے گہرا رابطہ رکھیں اور ان کے بچے کی اخلاقی تربیت کے معاملات ان سے شیئر کریں۔

اس کے بعد تربیت کے حوالے سے شرکاء نے بحث میں حصہ لیا اور اپنے اپنے تجربات لوگوں سے

شیئر کیے۔شان اسلام ارقم سکول لاہور کے ظفر جمال بلوچ صاحب ،مصعب سکول لاہور کے پرنسپل محمد اسحٰق صاحب، پائنیر ہائی سکول واہ سے محمد سلیم صاحب،منیب پبلک سکول نارووال کے محمد اطہر صاحب اور دیگر ساتھیوں نے اپنے اپنے ادارے کی تربیتی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ڈاکٹر محمد امین صاحب نے تربیت پر اپنی کتاب کے حوالے سے مختلف تربیتی سرگرمیوں کا ذکر کیا اور کہا کہ ہر تعلیمی ادارے میں تربیتی نیٹ ورک ہونا چاہیے تاکہ تربیتی سرگرمیوں کو منظّم کیا جاسکے۔ ہر طالب علم کی فائل بنائی جائے جس میں اس کی اخلاقی حالت کا اندراج کیا جائے اور تربیت کی سالانہ جانچ (evaluation) کا نظام وضع کیا جائے۔

پروفیسر رشید احمد انگوی صاحب، ڈاکٹر شبیر احمد منصوری صاحب، پروفیسر سید وقار علی صاحب اور پروفیسر ارشد جاوید صاحب نے بھی کانفرنس کے مختلف سیشنز میں اپنے ماہرانہ خیالات کا اظہار کیا۔

فیصلے

تربیتی نشست کے بعد کانفرنس کے صدر ڈاکٹر محمد امین صاحب نے تجویز پیش کی کہ اِس تعلیمی کانفرنس کو اسلامی سکولوں میں رابطے کا مستقل ذریعہ بننا چاہیے تاکہ بات محض نشستند وگفتند وبرخاستند تک ہی محدود نہ رہے۔اس پر شرکاء نے باہمی غور وخوض سے مندرجہ ذیل فیصلے کیے:

۔ اس طرح کی کانفرنس ہر چند ماہ بعد ہوتے رہنی چاہیے۔

۔ سب اداروں کو ماہنامہ البرہان بھیجا جائے اور اس کانفرنس کی روداد شائع کی جائے۔

۔ Network of Islamic Schools (NIS) یا اسی طرح کے کسی نام سے ابتداءً ایک ڈھیلا ڈھالا نظام وضع کیا جائے جس کا دائرہ کار ٹریڈ یونین سرگرمیاں نہ ہوں بلکہ اس کے پیش نظر رکن تعلیمی اداروں کی علمی وتعلیمی ترقی ہو۔صفاء انسٹی ٹیوٹ اس سلسلے میں مرکز اور رابطے کا کردار ادا کرے۔

۔ شریک اداروں کی ڈائریکٹری شائع کی جائے۔

۔ اکثر شرکاء نے پاکستانی تعلیم میں بڑھتی ہوئی مغربیت پر تشویش کا اظہار کیا لیکن اس خیال کا اظہار کیا کہ چونکہ تعلیمی اداروں سے لوگوں کا روز گار وابستہ ہے لہٰذا ایسی حکمت عملی وضع کرنے کی ضرورت ہے جس سے مغربی فکر وتہذیب کے سیلاب کو اس طرح روکا جائے کہ اس سے لوگوں کو مالی ابتلا کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

۔ شرکاء کانفرنس نے دو قراردادیں پاس کیں۔ایک میں کہا گیا تھا کہ تعلیم خصوصاً نصابیات کا شعبہ مرکز کے پاس رہنا چاہیے اور صوبائی خود مختاری کے نام پر صوبوں کے حوالے نہیں کیا جانا چاہیے

تا کہ قومی یک جہتی کو نقصان نہ پہنچے۔ دوسری قرارداد میں پنجاب حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ انگریزی ذریعہ تعلیم کو پہلی جماعت سے لازمی کرنے اور اسے پانچویں اور آٹھویں کے امتحان کے لیے واحد ذریعۂ اظہار قرار نہ دیا جائے اور قرآن حکیم وعربی زبان کو اختیاری نہ قرار دیا جائے۔

آخر میں شرکاء میں اسناد تقسیم کی گئیں اور دعاء پر کانفرنس کا خاتمہ ہوا۔

دو روزہ قومی تعلیمی کانفرنس کی قراردادیں

قرارداد 1 تعلیم کو صوبوں کے سپرد کرنا

قومی یک جہتی کے فروغ اور ہم آہنگی کے لیے ضروری ہے کہ تعلیم خصوصاً نصاب سازی کا شعبہ مرکز کے پاس رہے لیکن صوبوں کی خودمختاری کے نام پر اٹھارویں ترمیم کے تحت یہ کام صوبوں کے سپرد کر دیا گیا ہے جو خدشہ ہے کہ انتہائی ضرر رساں ثابت ہوگا اور اس سے قومی یک جہتی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ اس لیے دو روزہ قومی تعلیمی کانفرنس کے شرکاء ارکانِ پارلیمنٹ اور مرکزی حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اس فیصلے کو فی الفور منسوخ کیا جائے اور تعلیم خصوصاً نصاب سازی کا شعبہ مرکزی حکومت کے حوالے کیا جائے۔

قرارداد 2 پنجاب میں انگریزی ذریعہ تعلیم

کانفرنس کے شرکاء نے نوٹ کیا کہ پنجاب حکومت نے نہ صرف پہلی جماعت سے انگلش میڈیم کو لازمی قرار دیا ہے بلکہ پانچویں اور آٹھویں کے امتحانات بھی انگلش میڈیم میں لازمی کر دیے ہیں جب کہ قرآن حکیم اور عربی زبان کو آپشنل قرار دے دیا ہے۔

کانفرنس کے شرکاء نے حکومتِ پنجاب کے ان فیصلوں کو نامناسب قرار دیتے ہوئے مطالبہ کیا کہ ان فیصلوں کو فی الفور منسوخ کیا جائے۔ قرآن حکیم اور عربی کی لازمی حیثیت برقرار رکھی جائے۔ انگریزی زبان کی تدریس پہلے کی طرح چھٹی جماعت سے شروع کی جائے اور پانچویں اور آٹھویں کا امتحان انگریزی کے ساتھ اردو میڈیم میں دینے کی اجازت بھی دی جائے۔ پاکستانی بچوں کو انگریزی پڑھانے پر کسی کو اعتراض نہیں لیکن انگریزی کو پہلی جماعت سے ذریعہ تعلیم بنانا محض مغرب کی غلامی کو فروغ دینے کا سبب بنے گا۔ اس سے ڈراپ آؤٹ میں اضافہ ہوگا اور قوم جہالت میں مزید ترقی کرے گی۔

تعارفِ کتاب　　　انجینئر مختار فاروقی ☆

Slouching Towards Gomorrah

Modern Liberalism and American Decline

(عملِ قوم لوطؑ کی وجہ سے امریکی معاشرہ زوال کی راہ پر گامزن ہے)

آج کے ترقی یافتہ مغربی معاشرے کا سرخیل بجاطور پر امریکہ ہے جو ۱۷۷۶ء سے بعد کی مسلسل جدوجہد کے بعد آج اس مقام پر پہنچا ہے۔اس کا نعرہ پہلے دن سے ہی سیکولرزم "Ordo Novo Seclorum" یعنی استرداد مذہب تھا جو ایک ڈالر کے امریکی نوٹ پر مسلسل طبع ہورہا ہے۔ یہ معاشرہ آج حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے اعمال کا وارث ہے۔ کئی امریکی ریاستوں میں دو مردوں کی شادی کے قانون کے پھریرے اڑاتا، یورپ اور بھارت میں اپنی کامیابیوں پر اتراتا۔۔۔حالیہ دنوں میں امریکی سفارت خانہ اسلام آباد کے زیر انتظام اسلامی جمہوریہ پاکستان میں قومِ لوطؑ کے سے اعمال کے پرستاروں کا اجتماع منعقد کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔

آج کا امریکی معاشرہ جدید لبرل ازم کی جس شاہراہ پر گامزن ہے اسی کو ۱۹۹۸ء میں ایک امریکی سکالر فوکو یاما نے *"End of HIstory and the Last Man"* کا نام دیا تھا گویا جو آزادیاں عوام کو آج امریکہ میں حاصل ہیں اس سے زیادہ آزادی انسان کے لیے ممکن ہی نہیں ہے اور ۱۹۹۸ء ہی میں امریکی اعلیٰ عدالت کے ایک ریٹائرڈ جج رابرٹ ایچ بارک نے امریکی معاشرے کی ایک متضاد تصویر پیش کرتے ہوئے اسے زوال کی طرف گامزن قرار دیا تھا۔

تقریباً چارسوصفحات کی یہ کتاب نیو یارک ٹائمز نے شائع کی تھی اور یہ Best Seller کا اعزاز حاصل کرنے والی کتاب ہے۔اس کتاب میں مصنف نے امریکی معاشرے کی یہ کیفیت بیان کی ہے کہ یہ گزشتہ تین عشروں سے قوم لوطؑ کی راہ پر بگٹٹ دوڑا جارہا ہے اور اب قومِ لوطؑ کے انجام (یعنی عذاب الٰہی) کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔مصنف کا تجزیہ اس اسلامی اصول کی حقانیت کو بالواسطہ طور پر اجاگر اور ثابت کرتا ہے کہ قوموں کے عروج وزوال کا انحصار مادی وسائل سے زیادہ ان کے اخلاق پر ہوتا ہے۔

کتاب پڑھنے کے قابل ہے افسوس کہ امریکی یاترا کرنے والے اور امریکی معاشرے کے گن گانے والے اس معاشرہ کے بارے میں ایسی حقیقت پسندانہ اور چشم کشا باتیں۔۔۔ یا تو جانتے ہی نہیں۔۔۔یا جان بوجھ کر چھپاتے ہیں۔اگر پہلی صورت ہے تب بھی افسوس ناک اور اگر دوسری صورت ہے تب اس سے بھی زیادہ قابل افسوس اور قابلِ رحم۔اس کتاب کے بہت سے حصے انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہیں۔

☆ مدیر ماہنامہ حکمت بالغہ جھنگ و ناظم اعلیٰ تحریک خلافت پاکستان

مدیر کے نام

ہمیں موبائل فون کے ذریعے بھیجے جانے والے مختصر پیغامات (SMS) ناپسند ہیں کیونکہ یہ ہماری دینی اور لسانی اقدار کو تباہ کر رہے ہیں مثلاً: ۱۔ خط یا پیغام کا آغاز بسم اللہ سے کرنا، سلام کرنا، بڑے کی تکریم اور چھوٹے سے شفقت کا اظہار کرنا ہمارے دینی آداب میں سے ہے جن کا عموماً ان پیغامات میں لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ ۲۔ اردو کو رومن حروف میں لکھنا بہت غلط، باعث ضرر اور ناقابل قبول ہے اور راقم عموماً ایسے پیغامات نہیں پڑھتا جو رومن اردو میں لکھے گئے ہوں۔ ۳۔ پیغام بھیجنا لیکن اپنا نام نہ لکھنا یا تو بدسلیقگی ہے یا بزدلی اور اخلاقی لحاظ سے دونوں غیر مطلوب ہیں۔ ۴۔ اختصار میں مبالغہ اکثر مخل فہم اور غلط فہمیوں کا سبب بنتا ہے۔

اس تمہید کے بعد آیئے اس ماہ کے دو اہم SMS کی طرف جو ہمیں موصول ہوئے۔

مکی اور مدنی زندگی کی جدوجہد

''تمہیں یہ شکایت ہے کہ نوجوان تمہارے پروگراموں میں نہیں آتے، تمہاری بات نہیں سنتے! وجہ یہ ہے کہ تم مکہ کے نبی ﷺ کی شان کے وارث تو ہو لیکن اگر تم مدینہ کے نبی ﷺ کی شان کے بھی وارث بن جاؤ تو تم دیکھو گے کہ نوجوان تمہاری طرف جوق در جوق آئیں گے۔''

(موبائل 0315-6737577)

البرہان: بھائی! آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ ہم الحمدللہ نبی کریم ﷺ کی ساری زندگی کو اسوۂ حسنہ سمجھتے ہیں خواہ وہ مکی زندگی ہو یا مدنی۔ ہمارے نزدیک مکی زندگی کی دعوت و اصلاح اور تربیت و تزکیہ (انسان سازی) بھی ضروری ہے اور مدنی زندگی کا قیام اسلامی معاشرہ و ریاست بھی۔ البتہ اس معاملے کی تفہیم اور اس سے استنباط مسائل میں بعض لوگوں/گروہوں نے افراط و تفریط سے کام لیا ہے جس سے کئی غلطیاں اور غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں جن کی وضاحت ضروری ہے:

۱۔ بعض لوگ مکی زندگی (تعلیم و تربیت اور دعوت و اصلاح) کو بنیادی اہمیت دے کر مدنی زندگی (قیام اسلامی معاشرہ و ریاست) سے صَرفِ نظر کرتے ہیں جو بداہتاً غلط ہے۔

۲۔ اس کے برعکس بعض لوگ مدنی زندگی (قیام اسلامی معاشرہ و ریاست) کو اصل کام سمجھ کر مکی زندگی کے اصولوں سے صَرفِ نظر کرتے ہیں اور یہ بھی صراحتاً غلط ہے کیونکہ دوسرا مرحلہ زمانی، اصولی اور منطقی لحاظ سے مبنی ہے پہلے مرحلے کی جدوجہد پر۔

۳۔ بعض لوگ آج کے حالات کو عہد نبوی پر قیاس کرتے ہیں اور دعوت و اصلاح یا قیام اسلامی معاشرہ و ریاست کے بارے میں اپنے مؤقف کو نبوی منہاج کی پیروی قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ قیاس

مع الفاروق ہے۔غور فرمایئے کہ نبی کریمﷺ نے:
i۔ دعوت کا آغاز دعویٰ نبوت سے کیا۔ ii۔آپﷺ کے مخاطب کفار تھے۔ iii۔آپﷺ نے اسلامی معاشرہ اور ریاست قائم کرنے کے لیے دعوت واصلاح کے علاوہ جہاد وقتال سے بھی کام لیا۔

جب کہ آج کے معاشرے میں: i۔علماء اور مصلحین کسی دعویٰ سے کارِ دعوت واصلاح کا آغاز نہیں کرتے اورنہیں کرسکتے کیوں کہ ان میں سے کوئی مبعوث من اللہ نہیں ہے۔ ii۔نہ پاکستان میں ہمارے مخاطب کفار ہیں اور نہ ہمیں اسلامی معاشرہ وریاست عدم سے وجود میں لانا ہے بلکہ ہمارے مخاطب مسلمان ہیں اور مسلم معاشرہ وریاست پہلے سے موجود ہے۔ iii۔ہمیں پاکستان کو ایک معیاری ومثالی اسلامی معاشرہ وریاست بنانے کے لیے دعوت واصلاح سے کام لینا اور پُر امن جدوجہد کرنا ہے۔ جہاد بمعنی قتال و مسلح جدوجہد کفار کے خلاف ہوتا ہے اشاعت اسلام کے لیے یا دفاع دارالاسلام کے لیے نہ کہ ایک مسلم معاشرے میں نفاذ اسلام کے لیے۔ جہاں تک خروج کا تعلق ہے اس کی وہ شرطیں جو قرآن وسنت اور اجماع سے طے ہوئی ہیں (کفر بواح، صلاۃ جیسے بنیادی فریضے کا ترک اور کامیابی کا غالب امکان) ان کا اطلاق آج کی مسلم ریاست خصوصاً پاکستان پر نہیں ہوسکتا۔

اگر کسی کو ہمارے اس مؤقف پر کوئی اعتراض یا اشکال ہوتو ہم وضاحت کے لیے حاضر ہیں۔

آئی ٹی میں اہل مغرب کی تقلید

''مغرب کی طرف سے درپیش انتہائی غیر معمولی چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہماری موجودہ تیاریاں مضحکہ خیز حد تک ناکافی ہیں اور اس کے لیے ہمیں اپنے تمام اداروں کو نئے سرے سے ری سٹرکچر کرنا پڑے گا''۔۔۔آپ کے جولائی کے شمارے کے ٹائٹل پر لکھی گئی یہ بات مجھے پہلے سمجھ نہیں آرہی تھی مگر آپ کا ای میل ایڈریس دیکھ کر اندازہ ہوگیا کہ بات کتنی سچی ہے کہ مغرب کے خلاف اپنے دین کے غلبے کے لیے ہم مغرب ہی کے ایک انسٹیٹیوٹ (hotmail) کا سہارا لے رہے ہیں۔'' (موبائل 0333-5556482)

البرھان: برادر گرامی! آپ کا شکریہ۔آپ نے خواہ طنز کیا ہے یا محض توجہ دلائی ہے، آپ کے اعتراض میں بہرحال وزن ہے۔اور یہ صورت حال واقعتاً مضحکہ خیز ہے کہ ہم مغرب کے خلاف اور اس کی ٹیکنالوجی کے خلاف نعرے لگاتے ہیں اور اس کام میں بھی ٹیکنالوجی انہی کی استعمال کرتے ہیں۔ہم آئی ٹی میں مہارت نہیں رکھتے تاہم، ہم نے معلومات حاصل کرنا شروع کردی ہیں کہ ہمیں کم ازکم ای میل اور فیس بک تو ان کی نہ استعمال کرنا پڑے۔(اگرچہ ٹیکنالوجی پھر بھی انہی کی ہوگی)۔

ڈاکٹر محمد امین کی بعض اہم تالیفات

اردو
۱۔ ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل
۲۔ ہمارا دینی نظامِ تعلیم
۳۔ تعلیمی ادارے اور کردار سازی
۴۔ مسلم نشأۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل
۵۔ اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش
۶۔ اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی نفسیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ)
۷۔ حقیقتِ تزکیۂ نفس
۸۔ ترکِ رذائل (اصلاح اعمال واخلاق کا حصہ اول)
۹۔ اسلام اور پاکستان
۱۰۔ اسلامی انقلاب۔ مفہوم، تقاضے اور حکمت عملی
۱۱۔ عصر حاضر اور اسلام کا نظامِ قانون
۱۲۔ مقالاتِ امین (دو جلدیں)
۱۳۔ مطالعۂ قرآن وحدیث (برائے جماعت اول تا پنجم)

بروشرز
۱۴۔ پرائیویٹ سکولوں کے نام ایک اہم پیغام
۱۵۔ طلبہ کی اسلامی تربیت۔ کیوں اور کیسے؟
۱۶۔ انگلش میڈیم۔ فائدے اور نقصانات
۱۷۔ دینی مدارس کے نام۔ ایک اہم پیغام
۱۸۔ مسلمانوں کی ترقی کا واحد راستہ
۱۹۔ حقیقتِ تصوف

انگریزی
۲۰۔ Riyadh-us Saliheen (2 Vols)
۲۱۔ Noble Quran, Part 1
۲۲۔ Islamization of Laws in Pakistan

عربی
۲۳۔ السلطة التشريعية ۔ دراسة مقارنة

اثبات سے پہلے نفی

کبھی ہم نے اس بات پر غور کیا ہے کہ جو کلمہ پڑھ کر ہم مسلمان ہوتے ہیں یعنی'**لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ**' (نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں) اس میں نفی پہلے ہے اور اثبات بعد میں یعنی پہلے ان سارے خداؤں (اِلٰہ) کا انکار کیا جائے جو درحقیقت اِلٰہ نہیں ہیں، اس کے بعد اس ذات باری (اللہ) کے اِلٰہ ہونے کا اقرار کیا جائے جو اکیلا اِلٰہ ہے۔ اس بات پر آپ جتنا غور کریں گے اس کا فطری، منطقی اور مبنی برحکمت ہونا آپ پر واضح ہوتا چلا جائے گا کہ جب تک پہلے شرک یعنی ان سارے جھوٹے خداؤں کا انکار نہ کیا جائے جو درحقیقت اِلٰہ نہیں ہیں اُس وقت تک اُس ایک اِلٰہ کی الوہیت کا اثبات (یعنی توحید کا اقرار) کرنا جو درحقیقت اکیلا اِلٰہ ہے بے سود بلکہ لغو اور ناقابل قبول ہے۔

اسی طرح آج اسلام کو واحد اور مکمل دین اور طرز زندگی ماننا بے معنی اور بے سود بلکہ لغو اور ناقابل قبول ہے جب تک ان سارے ادیان/طرز ہائے زندگی کا انکار نہ کیا جائے جو اسلام جیسے واحد اور مکمل دین سے مختلف اور متضاد بلکہ اس کے مخالف اور دشمن ہیں جن میں آج سرفہرست مغربی فکر وتہذیب ہے جو آج دنیا کا غالب دین ہے جس کے اہم عقائد میں ہیومنزم ہے (یعنی خدا کے مقابلے میں انسان کی خدائی)، سیکولرزم ہے (یعنی خدا کے احکام ساری انسانی زندگی کے لیے نہیں)، لبرلزم ہے (یعنی انسان آزاد ہے خدا کا پابند نہیں) کیپٹل ازم ہے (یعنی زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے) اور ایمپیریسزم ہے (یعنی حق صرف وہ ہے جو عقل اور تجربہ ومشاہدہ پر مبنی ہو یعنی انسانی ہدایت کے لیے وحی کی حجیت کا انکار) گویا مغربی فکر وتہذیب کا مطلب ہے خدا، آخرت، قرآن اور رسول کا انکار۔

حاصل یہ کہ جو مسلمان آج اسلام کے واحد اور مکمل دین اور طرز حیات ہونے کا اثبات کرنے سے پہلے غیر اسلام (خصوصاً مغربی فکر وتہذیب) کے دین/طرز زندگی ہونے کا انکار نہیں کرتے ان کا اسلام کو واحد اور مکمل دین ماننا بے معنی اور بے سود ہے بلکہ لغو اور ناقابل قبول ہے۔

فکر و نظر ڈاکٹر محمد امین

دینی جدوجہد کے لیے نئی حکمت عملی کی ضرورت

علماء کرام اور دینی عناصر کی خدمت میں چند گزارشات

ہم نے البرہان کے پچھلے شمارے میں نئی طرز کے دینی مدارس قائم کرنے کی بات کی تھی وہ اتنی اہم بات ہے کہ کوئی نئی بحث چھیڑنے سے پہلے یا مضامینِ نو کے انبار لگانے کی بجائے اس پر برسوں بحث ہونی چاہیے لیکن اس خواہش کے پیش نظر کہ جو باتیں ہم برسوں سے سوچ رہے ہیں وہ کم از کم علماء کرام اور دینی عناصر کے سامنے ایک دفعہ آ تو جائیں یہ سطور پیش خدمت ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ علماء کرام اور دینی عناصر میں سے سوچنے سمجھنے والے اصحاب ہماری تجاویز پر ضرور غور فرمائیں گے۔ نئی باتیں اور نئی تجاویز ابتداء میں غیر مانوس لگتی ہیں لیکن جب تکرار سے ان کے بارے میں سوچا جائے اور انہیں زیر بحث لایا جائے تو پھر وہ سمجھ میں آنے لگتی ہیں اور ان پر عمل کا در وا ہو جاتا ہے۔ ہم اپنی تجاویز کے حق میں یا ان کے خلاف تحریروں کا خیر مقدم کریں گے۔ امین

قوموں کی زندگی میں مذہبی قیادت فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔ اس سے نہ صرف کسی معاشرے میں مذہبی قیادت کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ اس سے مذہبی قیادت کی ذمہ داریوں میں بھی اضافہ ہوجاتا ہے اور اس کا فرض بنتا ہے کہ وہ اپنے کردار پر نظر رکھے کہ وہ قائدانہ، رہنمایانہ (عامۃ الناس کو رہنمائی مہیا کرنے والا)، مثبت، تعمیری اور مؤثر ہے کہ نہیں؟

علماء کا کردار

پاکستان جیسے مسلم معاشرے میں علماء کرام کا کردار کیا ہونا چاہیے؟ اِس بات کو اُس وقت تک نہیں سمجھا جاسکتا جب تک اسلام کی رو سے ایک مسلمان کی ذمہ داریوں اور زندگی میں اس کے کردار کو نہ سمجھا جائے۔ چونکہ اس وقت تفصیل پیش نظر نہیں اس لیے تلخیصاً عرض ہے کہ اسلام کی رو سے زندگی کی سب سے بڑی حقیقت اللہ ہے (یعنی توحید)۔ انسان اس کا عبد ہے جو اس سے محبت کرتے ہوئے اور اس سے ڈرتے ہوئے اس کی پرستش اور اطاعت کرتا ہے (عبادت/ بندگی)۔ جو ایسا کرے وہ مسلم ہے۔ یہ پرستش اور اطاعت کیسے کرنی چاہیے؟ یہ بھی اللہ بتاتا ہے۔ دنیا میں ایک مسلمان کی آزمائش یہی ہے کہ وہ اللہ کی ہدایت کے مطابق اس کی پرستش اور اطاعت کرتا ہے یا نہیں؟ اگر ایک مسلمان فرد یہ رویہ اختیار کرے تو دنیا میں اسے اطمینان قلب کی دولت ملتی ہے — جو دنیا کی سب سے بڑی دولت ہے — اور آخرت میں اللہ کی خوشنودی اور اس کی نعمتیں اور جنت اسے ملے گی۔ جہاں تک دنیا میں کامیابی، عزت و وقار اور قوت وغلبہ کا تعلق ہے تو اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ

پورا معاشرہ عملاً مسلم بن جائے اور انفرادی اور اجتماعی زندگی اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق گزارے۔ یوں ہر مسلم داعی ہے اور معروف کا حکم دینے والا اور منکرات سے روکنے والا ہے خاص طور پر وہ افراد جو اللہ کی ہدایات کا تفصیلی علم رکھتے ہوں یعنی عالم ہوں ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ نہ صرف خود اس ہدایت پر عمل کریں بلکہ اس ہدایت کو لوگوں تک پہنچائیں اور انہیں اس پر عمل کی ترغیب دیں۔ جب مسلمانوں کی حکومت ہو تو حکمرانوں کا فرض ہے کہ وہ ریاستی قوت سے اللہ کی ہدایت یعنی اس کے دین پر عمل کا ماحول بنائیں اور ترغیب وترہیب سے مسلمانوں سے اس پر عمل کرائیں اور اگر مسلمان حکمران اپنی اس ذمہ داری سے پہلوتہی کریں تو علماء کرام کا فرض ہے کہ ان کی تذکیر کریں، ان تک دین کی دعوت پہنچائیں اور انہیں ان کے فرائض یاد دلائیں۔

دینی تعلیمات کا جو خلاصہ ہم نے سطور بالا میں پیش کیا ہے، اس پر عمل کے حوالے سے اگر ہم اپنے معاشرے پر نظر ڈالیں تو یہ نظر آتا ہے کہ علماء کرام پاکستانی معاشرے میں اپنے فرائض ادا کرنے کے لیے، الحمدللہ، فعال ہیں اور کئی محاذوں پر سرگرم عمل ہیں۔ ان میں سے کچھ سیاسی جدوجہد کررہے ہیں تاکہ برسر اقتدار آکر ریاستی قوت کو اسلام پر عمل کے لیے ترغیب وترہیب کے طور پر استعمال کریں، کچھ مدارس میں علماء دین تیار کرتے اور مساجد میں عوام کو تعلیم دیتے ہیں اور کچھ دعوت واصلاح کے میدان میں کام کررہے ہیں تاکہ عامۃ الناس تک دینی تعلیمات پہنچائیں تاکہ وہ ان پر عمل کریں۔ گویا پاکستانی علماء کرام ہمہ جہت کوشش کررہے ہیں کہ پاکستان کا ہر مسلمان اپنی انفرادی زندگی میں اچھا عملی مسلمان بن جائے اور اللہ کی عبادت اور اطاعت کا حق ادا کرنے لگے اور اسی طرح وہ اجتماعی زندگی میں تبدیلی لانے کی کوشش بھی کررہے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ پچھلے ۶۳ سال میں ان کی کوششوں کا حاصل کیا رہا ہے؟

اگر ہم معروضیت اور غیر جانبداری سے جائزہ لیں تو صورت حال بہت حوصلہ افزا نظر نہیں آتی۔ مسلمان عوام کی اخلاقی حالت بہت پتلی ہے (جھوٹ، غیبت، وعدہ خلافی، حبّ مال و جاہ، حرص، ہوس، حسد، جھگڑے عام ہیں) معاملات میں بھی وہ اسلامی تعلیمات سے بہت دور ہیں (رشوت، فراڈ، کرپشن، دھوکہ دہی، اپنے حقوق ادا نہ کرنا، محنت سے بچنا، منظّم نہ ہونا، ایثار سے کام نہ لینا، قانون کی پیروی نہ کرنا اور قیادت کی عدم اطاعت ہمارے عمومی معاشرتی رویے ہیں)، عبادات وغیرہ کی صورت حال بھی غیر تسلی بخش ہے (نماز بہت کم لوگ پڑھتے ہیں، قرآن بہت کم لوگ سمجھتے ہیں، زکوٰۃ بھی سب لوگ نہیں دیتے۔۔۔) آخر اس صورت حال کا سبب کیا ہے؟

دین کا ایک طالب ہونے کے ناطے جہاں تک ہم نے اس معاملے پر غور کیا ہے ہمیں اس کے

دو بڑے سبب نظر آتے ہیں: ایک یہ کہ علماء کرام کا کام غیر مؤثر ہے اور نتائج پیدا نہیں کر رہا۔ دوسرے بگاڑ کی قوتیں زیادہ طاقتور ہیں اور جو تھوڑا بہت اصلاحی کام ہوتا اسے بہالے جاتی ہیں۔ آیئے ذرا ان باتوں کی تفصیل میں جائیں۔

علماء کرام کے غیر مؤثر ہونے کے اسباب

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا کہ ہمارے علماء کرام کی زیادہ تر سرگرمیاں تین دائروں میں محیط ہیں: ۱۔سیاست ۲۔تعلیم و تعلّم؛ اور ۳۔دعوت و اصلاح۔ اب اگر ہم علماء کرام کے غیر مؤثر ہونے کے اسباب وعوامل کی بات کرتے ہیں تو ان تینوں شعبوں کا الگ الگ جائزہ لینا پڑے گا:

سیاست

علماء کرام اور دینی عناصر کے سیاسی میدان میں غیر مؤثر ہونے کے اسباب درج ذیل ہیں:

۱۔ فرقہ واریت یعنی ہر دینی مسلک کے علماء کرام نے اپنی اپنی سیاسی جماعت بنائی ہوئی ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ فرقہ واریت پھیلتی ہے بلکہ یہ سیاسی ناکامی کا بھی تیر بہدف نسخہ ہے کیونکہ سیاسی جماعتیں جب دینی مسلک کی بنیاد پر بنیں گی تو ایک مسلک کے لوگ کبھی دوسرے مسلک کے قائدین کو ووٹ نہیں دیں گے یوں مسلک پر بنی کوئی دینی سیاسی جماعت کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ ہماری تحقیق کے مطابق اسلام دشمن بین الاقوامی قوتوں اور ان کے گماشتہ مقامی حکمرانوں اور ان کی خفیہ ایجنسیوں نے مسلک پر بنی سیاسی جماعتوں کے قیام کا کام پلاننگ سے کیا ہے اور اسے جاری رکھنا بھی ان کی منصوبہ بندی کا حصہ ہے۔

۲۔ ہمارے عوام کا مزاج یہ ہے کہ ان کے نزدیک کامیاب سیاستدان وہ ہوتا ہے جو تھانے کچہری کے کاموں، سرکاری دفتروں میں تبادلے اور ملازمتوں کے حصول، گلیاں پختہ کروانے، سڑکیں بنوانے اور اسی طرح کے دیگر دینوی کاموں میں ان کی مدد کرے۔ دوسری طرف ہمارے علماء کرام تعلیم و تعلّم اور دعوت و اصلاح جیسے کاموں کے عادی ہیں اور ان کاموں میں عوامی چندے کے محتاج ہیں یعنی وہ عوام سے لینے کے عادی ہیں نہ کہ انہیں کچھ دینے اور ان پر خرچ کرنے کے۔ اس لیے عامۃ الناس کا رجحان یہ ہے کہ علماء کرام کا احترام اپنی جگہ لیکن سیاسی اقتدار کے لیے وہ موزوں نہیں ہیں چنانچہ وہ دینی سیاسی جماعتوں کو ووٹ نہیں دیتے۔

۳۔ ہمارے انتخابی نظام میں کامیابی کے لیے پیسے، برادری اور قبیلے جیسے عوامل کا بے دریغ استعمال عام ہے جب کہ ہمارے علماء کرام بالعموم دنیاوی وجاہت، دولت اور مادی وسائل سے محروم ہوتے ہیں۔

۴۔ ہمارے عوام کی اکثریت ان پڑھ اور غریب ہے اور وہ مندرجہ بالا منفی عوامل کے اثرات سے آزاد

ہوکر اپنے ووٹ کا آزادانہ استعمال نہیں کرسکتی۔

۵۔ پاکستان میں برسراقتدار کون آئے گا؟ ایسے اہم سیاسی فیصلے میں امریکہ و یورپ اہم کردار ادا کرتے ہیں اور ظاہر ہے وہ کیوں چاہیں گے کہ دینی عناصر اور علماء کرام برسراقتدار آئیں اور اسلام نافذ کریں؟

تعلیم وتعلّم

تعلیم اس لیے اہم ہوتی ہے کہ وہ ذہن سازی اور کردار سازی کرتی ہے۔ علماء کرام اگر تعلیم کا صحیح استعمال کریں تو معاشرے میں اسلامی تبدیلی واقع ہوسکتی ہے لیکن عملاً ایسا نہیں ہو رہا کیونکہ:

۱۔ ملک میں عمومی تعلیم کے نظام کے تحت جو کروڑوں بچے تعلیم حاصل کررہے ہیں ان کی تعلیم وتربیت میں علماء کرام کا کوئی کردار نہیں اور نہ کبھی انہوں نے اسے اپنا ہدف بنایا ہے۔

۲۔ دینی مدارس کے نام سے جو تعلیمی ادارے علماء کرام چلا رہے ہیں ان کا پروگرام اور نصاب ایسا ہے کہ ان اداروں کے فارغ التحصیل حضرات مساجد و مدارس میں کام کرنے کے سواء معاشرے میں نہ تو کوئی کردار ادا کرسکتے ہیں اور نہ معاشرے پر اثر انداز ہوسکتے ہیں۔ عام آدمی کی تعلیم وتربیت کے لیے دینی مدارس کے پاس کوئی پروگرام ہے ہی نہیں۔ وہ محدود دینی مقاصد کے لیے صرف متخصص علماء تیار کرتے ہیں اور وہ بھی صرف اپنے مسلک کے۔

۳۔ بدقسمتی سے بعض لوگوں نے دینی مدارس بنانے اور چلانے کو کاروبار بنا رکھا ہے۔

۴۔ علماء کرام کے پاس ہر محلے میں مسجد موجود ہے جو تعلیمی مرکز بن سکتی ہے لیکن وہ اس میں عموماً نماز کے علاوہ صرف ناظرہ قرآن پڑھاتے ہیں۔ عام تعلیم تو رہی ایک طرف وہ تو اس میں 'دینی تعلیم' بھی نہیں دیتے مثلاً قرآن حکیم کا ترجمہ بھی نہیں پڑھاتے کہ لوگوں کو سمجھ آجائے کہ اللہ کی کتاب میں لکھا کیا ہے؟

دعوت واصلاح

وعظ وتبلیغ، دعوت واصلاح اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر علماء کرام کا خصوصی دائرہ کار ہے لیکن ہمارے معاشرے میں یہ کام بھی مؤثر انداز میں نہیں ہو رہا کیونکہ:

۱۔ ہر جماعت اور گروہ نے دعوت وتبلیغ کا اپنا ایک مخصوص اسلوب اور ڈھب بنا رکھا ہے اور ہر کوئی صرف اپنے اسلوب اور طریق کار ہی کو صحیح سمجھتا ہے۔

۲۔ بعض لوگوں نے دین کا کوئی ایک جزو یا کوئی ایک ترجیح سامنے رکھ لی ہے اور اسے کامل دین کہہ کر پیش کرتے ہیں۔

۳۔ اکثر واعظین کی گفتار کے پیچھے عمل اور کردار کی قوت نہیں ہوتی لہٰذا جو بات دل سے نہ نکلے وہ اثر نہیں رکھتی۔

۴۔ علماء کرام میں سے اکثر اپنے مسلک کی تبلیغ کرتے ہیں لیکن اسے دین کی تبلیغ قرار دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں جمعہ کے اکثر خطبے فرقہ واریت اور مسلک پرستی پر مبنی ہوتے ہیں اور ہمارے اکثر دینی مدارس دین کے نہیں اپنے اپنے مسلک کے مبلغ اور داعی تیار کرتے ہیں۔

۵۔ اکثر و بیشتر دعوت و تبلیغ میں عصر حاضر کے تقاضوں اور جدید تعلیم حاصل کیے ہوئے لوگوں کی نفسیات اور طرز فکر کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا کیونکہ علماء کرام کی اکثریت نہ جدید تعلیمی اداروں میں حصول تعلیم کے لیے جاتی ہے اور نہ مغربی فکر و تہذیب پر مبنی نظام تعلیم کے اثرات کا گہرا ادراک رکھتی ہے۔

۶۔ فرد کی اصلاح کا کام تزکیے اور تصوف کے نام پر اکثر و بیشتر ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو اس کے اہل نہیں ہوتے۔سجادہ نشینی اکثر میرٹ کی بجائے وراثت پر مبنی ہوتی ہے جسے بعض لوگ کاروبار سمجھ کر چلاتے ہیں۔

یہ تھے وہ چند اہم عوامل جو علماء کرام کی دینی جدوجہد کو غیر مؤثر بناتے ہیں۔اب آیئے دوسرے پہلو کی طرف کہ بگاڑ کی بعض قوتیں علماء کے تھوڑے بہت اصلاحی اثرات کو کس طرح غیر مؤثر بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں:

بگاڑ کی قوتوں کا قوی تر ہونا

مذکورہ بالا کمزوریوں کے باوجود ہماری دینی قیادت اور علماء کرام چونکہ فعال اور متحرک ہیں اور دین کے لیے محنت کر رہے ہیں (اور اس کے لیے وہ مستحق ثنا ہیں اور مخلصین کا اجراللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے) اس لیے معاشرے پر ان کے مثبت اثرات موجود ہیں لیکن ایک بڑی قوت دنیا میں ایسی ہے جو اسلام دشمن ہے اور اسلامی اصول و اقدار اور اسلامی طرز حیات کا خاتمہ چاہتی ہے اور وہ اتنی طاقتور ہے اور اس کے وسائل اتنے زیادہ ہیں کہ وہ ہماری دینی قیادت ☆ اور علماء کرام کے اصلاحی و تعمیری اثرات کو زائل کر دیتی ہے۔بگاڑ کی اس ابلیسی قوت کا نام ہے مغربی فکر و تہذیب۔ چونکہ یہ تہذیب اِس وقت دنیا پر غالب ہے اور کئی صدیوں سے غالب ہے اور مسلمان اس سے شکست کھا چکے ہیں اور اب سنبھلنے اور اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہے ہیں اس لیے اس ابلیسی فکر و تہذیب کی علمبردار قوتوں (سپر پاور امریکہ و یورپ اور اس کے حلیف

☆ روایتی علماء کرام کے علاوہ ہمارے ہاں جماعت اسلامی، تنظیم اسلامی اور سول سوسائٹی کی قائم کردہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں ایسی چھوٹی بڑی تنظیمیں اور ادارے دین کے لیے کام کر رہے ہیں جن کے کرنے والے نہ روایتی علماء ہیں اور نہ دینی مدارس سے فارغ التحصیل ہیں، اس لیے ہم علماء کرام کے علاوہ 'دینی قیادت' کی اصطلاح بھی استعمال کر رہے ہیں۔

بھارت، اسرائیل اور روس وغیرہ) کی پوری کوشش ہے کہ مسلمان اسلام پر عمل نہ کریں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہی چیز مسلمانوں کی قوت کا منبع ہے۔ اس لیے یہ لوگ پوری کوشش کرتے ہیں کہ پاکستان کے علماء کرام اور دینی عناصر کو ناکام کریں اور معاشرے پر ان کے تعمیری اور صحت مند اثرات کو زائل کریں۔

اِن اسلام دشمن عالمی قوتوں کے پاس وسیع وسائل و ذرائع ہیں لیکن ان کی ہوشیاری اور چالاکی یہ ہے کہ اس کام کے لیے وہ ہمارے ہی وسائل و ذرائع ہمارے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ اس غرض سے انہوں نے ہماری سیاسی قیادت کو قابو کیا ہوا ہے اور یوں وہ مسلمان ریاست اور اس کے اداروں کی ساری قوت فساد اور بگاڑ کے فروغ اور اسلامی اصول و اقدار اور طرز حیات کی بیخ کنی کے لیے استعمال کر رہی ہیں۔ اس بگاڑ کا سب سے بڑا ذریعہ تعلیم اور میڈیا ہیں جو ذہن سازی کرتے اور تعمیر شخصیت میں اہم ترین کردار ادا کرتے ہیں لہٰذا یہ قوتیں سعی کرتی ہیں کہ تعلیم اور میڈیا کے ذریعے مسلمانوں خصوصاً ان کی نئی نسل اور نوجوانوں کے اخلاق بگڑ جائیں تاکہ وہ اپنے مستقبل کی تعمیر اسلامی اصولوں پر نہ کرسکیں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ ہماری معاشی پالیسیوں پر اثر انداز ہوتے ہیں تاکہ ہم مفلس و قلاش رہیں، دال روٹی کے چکر سے نہ نکل سکیں اور کبھی پیٹ سے آگے نہ سوچ سکیں۔ وہ ہمارے ہاں امن و امان بھی قائم نہیں ہونے دیتے اور عدل و انصاف بھی مہیا نہیں ہونے دیتے تاکہ ہماری زندگی عذاب بنی رہے اور مسلم معاشرے امن و سکون اور خیر و فلاح کی طرف نہ بڑھ سکیں۔ یہ ہیں وہ حالات جو اس وقت ہمارے معاشرے کو درپیش ہیں۔

دعوت و اصلاح کی حکمت عملی منصوص نہیں ہوتی

پاکستانی معاشرے کے حالات کا جو تجزیہ ہم نے سطور بالا میں کیا ہے اس کی روشنی میں اب سوال یہ ہے کہ اس صورت حال پر ہماری دینی قیادت اور علماء کرام کا ردعمل اور اصلاح کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے؟ ایک بات تو بالکل واضح ہے کہ ان کی موجودہ کوششیں غیر مؤثر اور ناکافی ثابت ہوئی ہیں۔ وہ جس اسلوب اور منہج سے کام کر رہے ہیں ان کا ناکافی اور غیر مؤثر ہونا ثابت ہو چکا ہے لہٰذا ہمیں دعوت و اصلاح کی نئی حکمت عملی درکار ہے، ایک نئے منہج کی ضرورت ہے اور علماء کرام سے زیادہ کون جانتا ہے کہ دعوتی حکمت عملی منصوص نہیں ہوتی۔ منصوص تو کار دعوت ہوتا ہے، حکمت عملی ہمیشہ اجتہادی ہوتی ہے کہ اس کا تعلق تدبیر سے ہوتا ہے لہٰذا یہ بدل سکتی ہے بلکہ حالات کے بدل جانے سے اسے لازماً بدل جانا چاہیے کہ اصول فقہ کا مشہور قاعدہ ہے کہ **الحکم یدور مع العلۃ**، یعنی حالات بدلیں گے تو حکم بدل جائے گا۔ اس لیے دین کے ابلاغ اور اس پر عمل کی جدوجہد کے موجودہ مناہج اگر مؤثر نہیں رہے تو کوئی نیا منہج اختیار کرنے میں کیا شرعی قباحت ہے؟

حل کیا ہے؟

ہماری طالب علمانہ رائے میں علماء کرام کی دعوت وتبلیغ اور اصلاح وتربیت کی نئی پالیسی مندرجہ ذیل اسالیب اور خصوصیات کی حامل ہونی چاہیے تاکہ فرد اور معاشرہ کی اصلاح، تعمیر اخلاق اور انسان سازی کا کام مؤثر انداز میں ہو سکے:

تعلیم وتربیت

تعلیم وتربیت اس مجوزہ اسکیم کی جان ہے اور بلاشبہ تعلیم کی کثرت بھی مطلوب ہے کہ زیادہ سے زیادہ تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں اور زیادہ سے زیادہ افراد کی تربیت کی جائے لیکن اس سے بھی زیادہ اہم اور ناگزیر ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے موجودہ نظام تعلیم کی اصلاح کی جائے کیونکہ ہمارے موجودہ نظام میں جدید تعلیم حقیقی اسلامی تعلیم وتربیت کے تقاضے پورے نہیں کرتی بلکہ مغربی فکر وتہذیب کو اپنانے کی وجہ سے اپنے غیر اسلامی سٹرکچر اور مزاج کی وجہ سے بگاڑ کا سبب بن رہی ہے؛ جبکہ دینی مدارس کا نظام تعلیم بھی اصلاح ونظر ثانی کا محتاج ہے کیونکہ یہ مسلم معاشرے اور ریاست کی عصری ضروریات پوری نہیں کرتا اور تعلیم دینی و دنیاوی دو حصوں میں بٹ کر رہ گئی ہے اور یہ امر خود خلاف اسلام ہے کیونکہ، جیسا کہ علماء کرام جانتے ہیں کہ، اسلام میں دین و دنیا کی کوئی تفریق وتقسیم نہیں ہے۔ اور یہ بات بھی علماء کرام کے علم میں ہے کہ پہلی بارہ صدیوں تک مسلمانوں کا نظام تعلیم موحد تھا یعنی ایک ہی نظام تعلیم تھا جو دین کے متخصص علماء تیار کرتا تھا تو اس کے ساتھ ایسے افراد بھی تیار کرتا تھا جو معاشرے کے مفید کارکن ہوتے تھے اور ریاست کا نظام بھی چلاتے تھے۔ یہ تو ہندوستان میں مسلمان حکومت ختم ہوجانے کے بعد ہوا کہ علماء کرام حالات کے جبر کے تحت ایسے مدارس قائم کرنے پر مجبور ہوگئے جن میں مسلمانوں کی دینوی تعلیم کا انتظام وہ نہ کر سکتے تھے۔ ظاہر ہے یہ مجبوری قیام پاکستان کے بعد ختم ہوگئی اور اب ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ تعلیمی ثنویت ختم کر دی جائے اور دینی و دنیاوی تعلیم کو باہم مربوط کر دیا جائے۔

اگر جذباتیت سے ہٹ کر اور ٹھنڈے دل سے سوچا جائے تو یہ بالکل ممکن ہے کیونکہ علماء کرام کے دینی مدارس اور اسلامی ذہن رکھنے والے لوگوں کے جدید تعلیم کے ہزاروں، سکول کالج اِس وقت پرائیویٹ سیکٹر میں کام کر رہے ہیں لہٰذا اگر حکومتِ پاکستان وحدت واصلاح تعلیم کا یہ کام نہ بھی کرے تو علماء کرام، دینی عناصر اور سول سوسائٹی کے صالح عناصر مل بیٹھ کر یہ طے کر سکتے ہیں کہ جدید اور عمومی تعلیم ایسی ہوگی کہ وہ اسلامی تقاضے پورے کرے اور مغربیت کو رد کر دے؛ اور دینی تعلیم ایسی ہو کہ وہ جدید علوم کا بھی احاطہ کرے۔ مثلاً پرائمری تک کی تعلیم سب کے لیے ایک جیسی ہو جس میں اسلام تو ہو

لیکن مغربیت نہ ہو۔ پھر چھٹی جماعت سے ۷۰،۸۰ فیصد تعلیم مشترکہ ہو اور ۳۰،۲۰ فیصد اختیاری ہو جس میں سائنس، آرٹس، کامرس کے ساتھ مذہبی تعلیم کا تخصص بھی ہو۔ میٹرک کے بعد مذہبی تعلیم کا تخصص مدارس کے پاس چلا جائے جس میں ۸۰،۷۰ فیصد مذہبی مضامین ہوں اور ۳۰،۲۰ فیصد عمرانی وسائنسی علوم ہوں۔ ڈگریاں دونوں کی حکومت سے منظور شدہ ہوں۔ نیا بورڈ بھی بنایا جاسکتا ہے اور حکومت سے منظور کرایا جاسکتا ہے(اگر اصلاح تعلیم کے پیچھے ایک مضبوط تحریک ہو تو یہ زیادہ مشکل نہیں) اور عارضی طور پر موجودہ بورڈوں اور یونیورسٹیوں سے بھی کام چلایا جاسکتا ہے۔ یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ مذہبی تخصص والے لوگ ایم اے کی سطح پر عمرانی علوم میں چلے جائیں۔ ہم اِس مضمون میں یہاں تفصیلات میں نہیں جانا چاہتے ورنہ ہم نے ان باتوں پر برسوں غور کیا ہے اور ان مشکلات کا حل پیش کیا ہے جو ہماری کتابوں اور ماہنامہ البرہان کی تحریروں میں دیکھا جاسکتا ہے☆

خلاصہ یہ کہ جدید تعلیم والے (سکول تا یونیورسٹی) یہ طے کرلیں کہ تعلیم میں اسلامی عنصر لانا ہے اور مغرب کی تقلید چھوڑنی ہے اور دینی مدارس یہ طے کرلیں کہ انہوں نے دینی تعلیم اس طرح دینی ہے کہ ان کے فضلاء جدید علوم سے بھی بخوبی واقف ہوں تاکہ اسلام معاشرے اور ریاست میں زندہ قوت بن سکے۔ دینی علوم پر نظر ثانی کی کس طرح ضرورت ہے اس کی ہم صرف ایک مثال دیتے ہیں کہ فقہ واصول فقہ میں جہاں ہدایہ اور مسلم الثبوت وغیرہ پڑھانا ضروری ہیں وہیں حنفی فقہ کے ساتھ دیگر مکاتب فکر کا تقابلی مطالعہ بھی اہم ہے اور جدید اصول قانون بھی پڑھانے چاہئیں۔ پاکستانی آئین وقوانین اور مغرب واقوام متحدہ کے قوانین سے واقفیت بھی ضروری ہے اور ظاہر ہے ان کے لیے انگریزی زبان پر عبور بھی ہونا چاہیے۔ اصول اجتہاد پڑھانے کے بعد معاشرے کے جدید مسائل پر ان کی تطبیق کی مشق بھی ناگزیر ہے۔۔۔وقِس علی ذلک۔

اور تعلیم سے زیادہ اس کا حاصل اور نتیجہ اہم تر ہے جسے تربیت وتزکیہ کہا جاتا ہے یعنی تعلیم کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ ایسی شخصیت پروان چڑھے جو اپنی عملی زندگی میں مسلمان ہو۔ اسی طرح نسل نو کے ساتھ ساتھ بڑوں (grown ups) کی تربیت وتزکیہ کے لیے بھی منظّم کام کرنے کی ضرورت ہے۔

میڈیا

الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا آج کی زندگی میں ذہن سازی اور شخصیت سازی میں اہم کردار ادا کرتا ہے لیکن علماء کرام اور دینی عناصر ابھی تک ان کو دعوت واصلاح کے لیے استعمال کرنے پر یکسو نہیں ہوسکے حالانکہ اشاعت اسلام کے لیے ثقافتی سرگرمیوں اور کھیلوں میں شرکت کی جذور

☆تفصیلات کے لیے مکتبہ البرہان سے رابطہ فرمائیں

آنحضرتﷺ کے اسوۂ حسنہ میں موجود ہیں☆ ہم نے اس غرض سے ۲۰۰۹ء میں لاہور میں ملی مجلس شرعی کے تحت سارے مسالک کے علماء کرام کا ایک اجلاس بلایا۔ سب علماء کرام نے دن بھر کے غور و خوض کے بعد اسلامی مقاصد کے لیے موجودہ الیکٹرانک میڈیا کے استعمال اور اس میں شمولیت کے حق میں رائے دی۔ سلفی حضرات میں سے مولانا عبدالعزیز علوی صاحب (جامعہ سلفیہ فیصل آباد) اور دارالسلام لاہور کے مولانا صلاح الدین یوسف صاحب مخالفت کرتے رہے لیکن بحث و مناقشے کے نتیجے میں بالآخر شام کے وقت انہوں نے بھی بکراہت دفاع اسلام کے لیے الیکٹرانک میڈیا کے استعمال کی اجازت دے دی۔ تصویر کی حرمت کے سب قائل تھے (اگرچہ بعض مفتی حضرات نے یہ مؤقف بھی اختیار کیا کہ ٹی وی اسکرین پر ظاہر ہونے والے عکس اور شبیہ پر اس 'تصویر' کا اطلاق نہیں ہوتا جو شرعاً ممنوع ہے) لیکن سدّ الذریعہ اور جلب المصلحہ کے پیش نظر انہوں نے الیکٹرانک میڈیا میں علماء کرام کی شرکت اور عام مسلمانوں کو اسے دیکھنے کی اجازت دی۔

اس کے باوجود علماء کرام اور دینی عناصر ابھی تک میڈیا کے میدان میں حقیقی معنوں میں نہیں اترے۔ اور جو اترے ہیں وہ فرقہ واریت اور مسلک پرستی کو شعار بنا کر مزید بگاڑ کا سبب بنے ہیں۔ حالانکہ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ میڈیا کو منکرات اور بُرائی کا علمبردار بننے کی مزاحمت کی جائے اور اس سے اشاعت معروف وخیر کا کام لیا جائے اور ان دونوں کاموں کے لیے سخت محنت اور منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا میڈیا مغرب کے کنٹرول میں ہے۔ امریکہ و یورپ (اور بھارت) ہمارے میڈیا کو خریدنے، لبھانے اور اپنی مرضی کے مطابق چلانے پر بہت وسائل خرچ کرتے ہیں۔ ہماری حکومتیں مغرب کا گماشتہ ہونے کی وجہ سے یہ سب ہوتے دیکھتی رہتی ہیں اور کوئی ایکشن نہیں لیتیں۔ دینی قوتوں کو چاہیے کہ وہ اسلام دوست اور محبت وطن عناصر کی حمایت سے اس صورت حال کو تبدیل کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوں اور حکومت پر دباؤ ڈالیں کہ وہ اسلام اور نظریۂ پاکستان کے مطابق ایک مضبوط ثقافتی پالیسی وضع کرنے اور اسے سختی سے نافذ کرنے کے لیے ضروری اقدامات کرے۔ علاوہ ازیں دینی عناصر کو چاہیے کہ صحافیوں کی اسلامی نقطۂ نظر رکھنے والی پیشہ ورانہ تنظیمیں بنوائیں۔ علماء اور پروفیشنلز کی تربیت کے لیے تعلیمی و تربیتی ادارے بنائے جائیں۔ اسلامی ثقافتی پالیسی اور ضابطہ اخلاق بنایا جانا چاہیے۔ میڈیا عدالت قائم کی جانی چاہیے۔ میڈیا پروگراموں کی نگرانی کے لیے عوامی کمیٹیاں بنی چاہئیں۔ اسلامی تناظر میں پروگرام تیار کرنے کے

☆ عکاظ کے میلے میں شرکت، شعر و ادب کے مقابلے میں سورہ الکوثر کو پیش کرنا اور حضرت حسانؓ کو میدان میں اتارنا، اور کشتی لڑ کر بلکہ اس میں ہرا کر ایک کافر کو مسلمان کرنا اس کی چند مثالیں ہیں)۔

لیے ادارے اور ٹی وی چینلز کھولنے چاہئیں۔ جو ٹی وی چینلز امریکی و بھارتی تقلید نہ چھوڑیں ان کے خلاف رائے عامہ ابھارنی چاہیے اور ان کے خلاف عوامی ریلیاں منظّم کرنی چاہئیں۔۔۔وغیرہ وغیرہ۔

تعمیر اخلاق

اہل دانش جانتے ہیں کہ افراد اور اقوام کی بقاء و استحکام اور عروج و زوال کا انحصار ان کے اخلاق پر ہوتا ہے۔ہمیں یاد ہے کہ ۱۹۹۴ء کا جو سال ہم نے (بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی) اسلام آباد میں گزارا تو وہاں ہماری ملاقات شیخ الحدیث مولانا عبدالغفار عمر پوریؒ سے بھی ہوئی۔ انہوں نے راقم میں جو کچھ تڑپ ملت کی اصلاح کے لیے دیکھی تو بار بار کہتے تھے کہ پاکستان میں اصلاح اخلاق کی تحریک چلانی چاہیے اور جب میں نے اس ضمن میں کچھ عملی پیش رفت کی کوشش کی تو وہ باوجود شدید بیماری اور ضعف کے اس میں پیش پیش تھے۔

تعمیر اخلاق کی ایک صورت یہ ہے کہ علماء کرام سول سوسائٹی کو متحرک کریں کہ وہ اپنی مدد آپ کے اصول کے تحت متحد و منظّم ہو اور اپنے اخلاقی حالات بہتر بنائے۔ اس غرض سے عوام کو محلے کی سطح پر منظّم کرنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان کے ہر محلے میں الحمدللہ مسجد ہوتی ہے اور اس میں مسلمان جماعت سے نماز پڑھنے کے لیے دن میں پانچ بار جمع ہوتے ہیں لہٰذا تنظیم کے لیے افراد بھی موجود ہیں، جگہ بھی اور امام صاحب کی صورت میں ایک لیڈر بھی لہٰذا منظّم ہونا اتنا مشکل بھی نہیں۔ بس یہ دیکھ لیا جائے کہ اس میں محلے کی سطح کے معززین اور ہر مکتب فکر اور طبقے کا آدمی موجود ہوتا کہ ہم آہنگی کی فضا پیدا کرنے میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ محلے کی سطح پر بننے والی اس کمیٹی کو جو کام کرنے چاہئیں ان میں سے اولین اہمیت کا کام تعمیر اخلاق کا ہے کیونکہ وہ معاشرہ زندہ نہیں رہ سکتا جس کی اخلاقی اقدار ختم ہو جائیں۔ اس کمیٹی کو چاہیے کہ محلے کی سطح پر عوام خصوصاً نوجوانوں اور بچوں کی تعمیر اخلاق کے پروگرام وضع کرے۔ مقامی سکول، کمیونٹی سنٹر، مسجد، سرکاری دفتر یا کسی بھی کھلے گھر کو اس کام کے لیے بطور مرکز استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بچوں کے کوئز پروگرام، نوجوانوں کے لیے کھیل، خصوصی ایام (جیسے یوم پاکستان، اقبال ڈے، شب معراج وغیرہ) پر تقاریب، اِن ڈور گیمز، فری ٹیوشن سنٹرز، شعری اور تقریری مقابلے، ترجمۂ قرآن کلاس۔۔۔کی طرح کے پروگرام منظّم کیے جا سکتے ہیں۔ کمیٹی دیکھے کہ محلے کے غیر مہذب نوجوان گلی کی نکڑ پر کھڑے ہو کر یا پارک وغیرہ میں جمع ہو کر غیر اخلاقی سرگرمیوں میں مشغول نہ ہوں۔ یہ کمیٹی اگر اپنی مدد آپ کے تحت تعلیمی اداروں میں داخلے، گلیوں کی صفائی، گٹر اُبلنے، روشنی کا انتظام، بیماروں کو ہسپتال لے جانے یتیموں، بیواؤں کی مدد جیسے کام بھی کرنے لگے تو معاشرتی زندگی بہت خوبصورت اور سکون بخش ہو سکتی ہے۔

خدمت خلق

دعوت و اصلاح کی نئی حکمت عملی کے تین پہلوؤں (تعلیم، میڈیا اور تعمیر اخلاق) پر گفتگو کے بعد اب ہم عرض کریں گے کہ ہمارے علماء کرام اور دینی عناصر کو ایک کام اور کرنا چاہیے اور وہ ہے خدمت خلق یعنی کسی وجہ سے معاشی اور معاشرتی زندگی میں پیچھے رہ جانے والوں کی دستگیری اور ان کے دکھوں اور مشکلات کو کم کرنے کی سعی کرنا۔ممکن ہے بعض علماء کرام کو ہماری یہ تجویز نامانوس یا غیر معقول لگے لہٰذا ہم عرض کرتے ہیں کہ:

۱۔ یہ کام جسے ہم نے خدمت خلق اور عوام کے دکھوں میں ہاتھ بٹانے کا نام دیا ہے عین حکم شرعی ہے۔ قرآن حکیم اس سے بھرا پڑا ہے: ''وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا '' (الدھر ۸:۷۶)۔ ''وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (الذاریات ۱۹:۵۱)۔ اَرَءَ يْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِO فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَO وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (الماعون ۱۰۷:۱۔۳) اور اس سے غفلت کی مذمت فرمائی: ''كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ O وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (الفجر ۸۹:۱۷،۱۸) اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''من كان في حاجة اخيه كان الله في حاجته، ومن فرّج عن مسلم كربة فرج الله عنه بها كربة من كرب يوم القيامة''۔(متفق علیہ)

اور اسوۂ حسنہ اس سے بھرا پڑا ہے۔پہلی وحی پر جب آپ ﷺ گھبرائے تو حضرت خدیجہؓ نے کیا کہا تھا؟ حلف الفضول میں آپ ﷺ نے شرکت کیوں فرمائی؟ ابوجہل سے مظلوم کو حق کیوں کر دلوایا تھا؟ آپ ﷺ سائل کو کیوں خالی ہاتھ نہ لوٹاتے تھے؟ یہاں تک کہ قرض لے کر ضرورت مندوں کی مدد کرتے تھے ـــــ وغیر ذلک کثیرا۔اور صحابہ کرامؓ کا طریقہ کیا تھا؟ حضرت عمرؓ ایک بیوہ کی بکری دوہنے جاتے تھے لیکن کوئی ان سے سبقت لے جاتا تھا۔ایک دن کوشش کر کے جلدی گئے کہ دیکھیں وہ کون ہے تو وہاں امیر المومنین حضرت ابوبکرؓ کو پایا۔کیا یہ محض قصے کہانیاں اور وعظ کی باتیں ہیں اور ان پر عمل کی ضرورت نہیں؟

۲۔ علماء کرام نے کیوں یہ قبول کر لیا ہے کہ وہ معاشرے سے محض 'لینے والے' ہیں 'دینے والے' نہیں۔ختم المرسلین ﷺ نے کیا فرمایا تھا کہ کون سا ہاتھ بہتر ہے، اوپر والا یا نیچے والا؟ معاف کیجیے گا۔ مسجد کے اماموں کو دیہات میں 'کمیں' سمجھا جاتا ہے اور زمیندار دوسرے کمیوں کے ساتھ ان کا بھی حصہ نکالتا ہے اور بعض جگہ تو بیچارے امام صاحب بال بچے کا پیٹ پالنے کے لیے گھر گھر سے روٹی اکٹھی کر کے لاتے ہیں اور شہروں میں بھی امام اور خطیب مسجد کمیٹی کے معمولی تنخواہ پانے والے ملازم ہوتے ہیں۔ اہل مدارس جب چندہ اکٹھے کرنے نکلتے ہیں اور صنعت کاروں اور تاجروں کے پاس

جاتے ہیں تو وہ انہیں کیا سمجھتے ہیں؟ یہ تلخ حقائق ہیں جن کا سامنا کرنے کی ضرورت ہے؟

۳۔ کیا مدرسے میں تدریس کا مطلب یہ ہے کہ عوامی زندگی نہ گزاری جائے؟ عوام کے دکھ درد میں شریک نہ ہوا جائے؟ لوگ نماز پڑھنے مسجد نہ آئیں تو امام صاحب تڑپ اٹھیں لیکن محلے میں ایک یتیم بچہ بھوک سے مر رہا ہو تو امام صاحب کو خبر ہی نہ ہو؟ محلے میں کوئی آدمی فوت ہو جائے تو امام صاحب پارک میں نماز پڑھاتے ہیں کہ یہ ان کی ذمہ داری ہے اور اس میں ثواب دارین ہے لیکن اسی پارک میں محلے کے لڑکے اکٹھے ہو کر چرس پیتے ہوں اور خرافات بکتے ہوں تو انہیں روکنا کیا مولوی صاحب کا درد سر نہیں؟ اور اس کا کوئی ثواب نہیں؟

۴۔ اشاعت اسلام میں علماء سے زیادہ صوفیاء کا کردار کیوں زیادہ کامیاب نظر آتا ہے؟ کیا اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے، محض 'لینے والے' نہیں 'دینے والے' بھی تھے۔ لوگ جب خانقاہ میں جاتے تو انہیں فری کھانا ملتا تھا، فری رہائش ملتی تھی۔ صوفیا عوامی زندگی گزارتے تھے۔ بادشاہ اور امراء ان کی خدمت کرنا چاہتے تھے لیکن وہ لینے سے انکار کرتے تھے۔ وہ غریبوں، مسکینوں کو سینے سے لگاتے تھے، ان کے کام آتے تھے۔ کیا اس میں علماء کرام کے لیے کوئی سبق نہیں؟

خدمت خلق اور عوام کے دکھ درد بانٹنے کی کئی صورتیں ممکن ہیں۔ ہم بطور مثال دینی عناصر اور علماء کرام کے لیے خدمت خلق کی مندرجہ ذیل تین سرگرمیاں تجویز کرتے ہیں:

غربت کا علاج

جو لوگ بھوک سے خودکشیاں کرتے ہیں آخر وہ کسی بستی، کسی محلے میں ہی رہتے ہوں گے اور کون سی بستی اور محلّہ ہے جہاں مسجد نہ ہو اور کون سی مسجد ہے جہاں امام نہ ہو۔ لہٰذا اگر امام صاحب متحرک ہو جائیں اور محلے کے نمازیوں پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دیں تو محلے کی سطح پر یہ جاننا قطعاً مشکل نہیں کہ کون بیوہ ہے، کون یتیم ہے، کون بے روزگار اور مالی مشکلات میں گرفتار ہے۔ ان مستحقین کی فہرست بن جائے اور پھر ایک فہرست محلے کے کھاتے پیتے لوگوں کی بن جائے۔ ہم کہتے ہیں کہ اتفاق میں بڑی برکت ہوتی ہے اگر ہر کھاتا پیتا گھرانہ زیادہ نہیں، تھوڑا سا ایثار بھی کرے اور مستقل کرے (مثلاً ۱۰۰ روپے ماہانہ) تو کافی رقم جمع ہو سکتی ہے اور محلے کے غرباء و مساکین کی مدد ہو سکتی ہے یہ بات بظاہر سادہ اور ہلکی محسوس ہوتی ہے لیکن اگر اس پر عمل ہو جائے تو معاشرہ جنت بن سکتا ہے۔ اس کے لیے کئی تجاویز اور بھی ہو سکتی ہیں خصوصاً یہ کہ ملک کے ٹاپ کے علماء کرام جمع ہو کر قومی سطح کی ایک مرکزی زکوٰۃ کونسل قائم کر دیں اور اس کی انتظامیہ میں ایسے لوگ شامل کریں جن کی دیانت و امانت پر عوام کو اعتماد ہو تو سارے لوگ اپنی زکوٰۃ و عطیات اس کونسل کو جمع کرائیں۔ اس طرح کروڑوں اور اربوں

روپیہ جمع ہوسکتا ہے جو معاشرے سے غربت ختم کرنے پر خرچ کیا سکتا ہے۔

قیام امن و امان

مسجد کے امام صاحب نمازیوں پر مشتمل محلے کی ایک امن کمیٹی تشکیل دے دیں جو نوجوانوں کو منظّم کرے اور نوجوان باری باری گھنٹے دو کے لیے رات کو جاگ کر پہرہ دیا کریں تو اہل محلّہ کو چوری ڈاکے سے نجات مل سکتی ہے۔ اگر اس امن کمیٹی کے ارکان دن میں بھی آنے جانے والوں پر نظر رکھیں تو لوگ سکون کی زندگی گزار سکتے ہیں۔ اہل محلّہ کو منظّم کر کے سیکورٹی گارڈز بھی رکھے جاسکتے ہیں جن کا زیادہ مالی بوجھ بھی نہیں پڑے گا کیونکہ اگر محلے کے سب لوگ حصہ ڈالیں تو معمولی حصہ ڈالنے سے بھی کافی رقم اکٹھی ہوجائے گی کیونکہ اتفاق میں بڑی برکت ہوتی ہے۔

فراہمیٔ عدل و انصاف

جس چیز نے ہمارے معاشرے کو بے سکون کر رکھا ہے اس کی ایک وجہ انصاف کا نہ ملنا بھی ہے۔ عدالتیں فیصلے تاخیر سے کرتی ہیں، وکیلوں کی فیسیں ہوش ربا ہیں اور عام آدمی عدالتوں میں جا کر رُل جاتا ہے۔ دیوانی عدالتیں تو آدمی کو دیوانہ بنا دیتی ہیں لیکن سائلین کو انصاف نہیں ملتا۔ سستا اور فوری انصاف ایک ایسا نعرہ ہے جسے ہر سیاسی جماعت اپنے منشور میں شامل کرتی ہے لیکن اس پر عمل نہیں ہو پاتا۔

ہم عرض کرتے ہیں کہ ہمارے آئین و قانون میں مصالحتی و ثالثی عدالتوں کا تصور موجود ہے۔ اگر یہ عدالتیں اسلامی تناظر میں کام کریں تو انہیں 'شرعی عدالتیں' بھی کہا جاسکتا ہے۔ اگر امام صاحب متحرک ہوجائیں تو محلے کی سطح پر ایک شرعی/مصالحتی عدالت قائم کی جاسکتی ہے جس میں امام یا خطیب صاحب کے ساتھ کوئی نیک نام وکیل اور ایک موزوں و متدین حاضر سروس یا ریٹائرڈ پروفیسر/ ٹیچر/ اعلیٰ سرکاری ملازم یا تاجر بھی شامل کیا جاسکتا ہے یہ تین آدمیوں کی مصالحتی عدالت بن جائے اور محلے کے چھوٹے موٹے جھگڑے اس کے پاس آنا شروع ہوجائیں تو بظاہر دیکھنے میں یہ چھوٹی سی بات لگتی ہے لیکن اس طرح کی عدالتیں اگر سارے ملک میں قائم ہوجائیں اور ان عدالتوں میں کوئی فیس، خرچہ اور غیر ضروری تاخیر نہ ہو تو تصور نہیں کیا جاسکتا کہ اس سے معاشرتی زندگی کتنی خوشگوار ہوجائے گی، عدالتوں پر بوجھ کم ہوگا اور لوگوں کو سستا اور فوری انصاف ان کی دہلیز پر ملنے لگے گا۔ شہر کی سطح پر ایک عدالت اپیل بھی بنائی جاسکتی ہے۔

علماء کرام اور دینی عناصر کا کردار

دعوت واصلاح اور خدمت خلق کے جن کاموں کی طرف ہم نے سطور بالا میں اشارہ کیا ہے انہیں کرنے کی تحریک اگر علماء کرام چلائیں تو ان ساری سرگرمیوں کا تناظر اسلامی رہے گا لہٰذا علماء کرام کو اس تحریک کی قیادت کرنی چاہیے۔ظاہر ہے اگر یہ مجوزہ کام ہونے لگیں تو آدھی سے زیادہ شریعت تو خود بخود نافذ ہو جائے گی۔ہم ان علماء کرام سے خصوصاً یہ کہنا چاہتے ہیں جو سیاست میں نہیں ہیں کہ کیا یہ ان کی خواہش نہیں ہے اور کیا یہ ان کی ذمہ داری نہیں ہے کہ لوگ اپنی زندگیوں میں اسلام پر عمل کریں؟ کیا وہ نہیں چاہتے کہ ملک میں شریعت نافذ ہو؟ تو اس کے لیے وہ کیا کر رہے ہیں؟ اگر وہ کہیں کہ ہم مدارس میں لوگوں کو دین سکھاتے ہیں یا مسجدوں میں وعظ کرتے ہیں اور نمازیں پڑھاتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ یہ کام تو وہ پاکستان میں پچھلے ۶۳ سال سے کر رہے ہیں اس کا نتیجہ کیا نکلا ہے؟ کیا وقت نہیں آ گیا کہ وہ سوچیں کہ مسلمانوں کو اچھا اور حقیقی مسلمان بنانے اور انہیں شریعت پر عمل کے قابل بنانے کے لیے کچھ مزید کرنے کی ضرورت ہے۔یہ جو کچھ مزید کرنے کی ضرورت ہے وہ کیا ہو؟ اسی سوال کا جواب دینے کی سطور بالا میں کوشش کی گئی ہے۔

ہم ان دینی عناصر اور علماء کرام سے بھی جو سیاسی جدوجہد کر رہے ہیں عرض کرتے ہیں کہ جس مجوزہ تحریک کی بات ہم کر رہے ہیں اگر چہ وہ غیر سیاسی ہے لیکن اس طرح کی سماجی تبدیلی لانے والی تحریک اگر دس بیس برس کامیابی سے چل جائے تو پاکستان میں سیاسی لحاظ سے بھی اسلام کے حق میں انقلاب آ جائے گا اور جو دینی سیاسی جماعت اس سماجی تحریک میں فعال ہو گی اسے لوگ ووٹ دے کر بھی کامیاب کر دیں گے جیسا کہ ترکی میں ہوا ہے۔کاش دینی سیاسی لوگ اس بات کو سمجھیں اور اس طرح کی تحریک باہم مل کر چلائیں، اتحاد واتفاق شرط ہے کہ اس کے بغیر چارہ نہیں۔

ہم علماء کرام سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہماری مذکورہ بالامعروضات اور تجاویز پر سنجیدگی سے غور فرمائیں اور مجوزہ غیر سیاسی تحریک چلانے کے لیے قیادت مہیا فرمائیں۔

پروفیسر رشید احمد انگوی ☆

تذکرہ چند دینی جرائد اور اکابر کا

نگاہ بستر کے ساتھ رکھی چھوٹی سی میز پر پڑی تو پانچ رسالے بکھرے پڑے تھے۔ سب کے ناموں میں ایک عجب مناسبت دکھائی دی۔ اس پر غور کیا تو اللہ کریم کا فرمان یاد آیا جو اپنے پیارے حبیب ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے سورہ والضحیٰ میں فرمایا کہ ''اپنے رب کی نعمتوں کو بیان کیا کیجیے''۔ معاً اللہ کا شکر ادا کیا کہ ان رسائل و جرائد کے مندرجات سے بڑھ کر ان کے ساتھ وابستہ دینی، علمی و فکری شخصیات کا سامنے رہنا بذات خود راہ نمائی کا ذریعہ ہے۔ جی چاہا کہ ان جرائد کے تاریخی پس منظر میں جو ہستیاں جلوہ فرما ہیں ان کا مختصر سا تذکرہ ہوجائے۔ مگر یہ جرائد ہیں کون سے اور ان میں خاص مماثلت کیا ہے؟ تو یہ دینی و علمی جرائد ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا نام ال سے شروع ہوتا اور ذہن پر ایک خاص تاثر قائم کرتا ہے۔ یوں یہ ایک ''گلدستۂ انوار'' ہے جس کا ہر پھول اپنے رنگ و بو کی مہک سے ماحول کو خوشگوار بنا رہا ہے۔۔۔ان جرائد کے نام ملاحظہ فرمائیں:

☆**الجامعه** ☆**الحسن** ☆**الحق** ☆**الامداد** ☆**البرھان**

الجامعه: جامعہ محمدی (ضلع جھنگ) کے بانی مولانا محمد ذاکرؒ کا جاری کردہ رسالہ جس کا نام سامنے آتے ہی مولانا مرحوم کی ذات اور سیرت و اعمال کا روشن باب نگاہوں کو خیرہ کرتا ہے۔ مولانا محمد ذاکرؒ کو اللہ تعالیٰ نے ظاہری و باطنی حسن و کمال اور انسانیت کی محبت، ہمدردی و غم گساری اور خیر خواہی کا مرقع بنا کر دنیا میں بھیجا تھا۔ ان کی ہستی کو دیکھ کر ایمان تازہ ہوتا اور رشک ملائکہ انسانی وجود کا نظارہ ہوتا تھا۔ چنیوٹ اور جھنگ کے درمیان کچی سڑک پر واقع بھوانہ کے گردونواح میں، دریائے چناب کے دلدلی ساحلی علاقے کے جغرافیہ میں جلوہ افروز مگر اسلامی دنیا کے شرق و غرب سے اس طرح مربوط کہ عالم اسلام کی برگزیدہ شخصیات سے ذاتی روابط۔ اگر کوئی محقق اس عنوان پر تحقیق کرے کہ مولانا ذاکرؒ کی حیات مبارکہ کے دوران کن کن شخصیات نے جامعہ کا دورہ کیا تو حیرت انگیز فہرست تیار ہوجائے گی اور ان مہمانانِ ذی وقار کو دعوت دینے والے مرد قلندر کی فکری بلندی کا اندازہ ہوسکے گا کہ وہ جامعہ کے طلبہ واساتذہ کو کن راہوں پر چلانا چاہتے تھے۔ مولانا ذاکرؒ کے دست راست اور چھوٹے بھائی مولانا محمد نافع

☆ ڈائریکٹر الخلیل ریسرچ سنٹر G-16 مرغزار لاہور

مدّظلہ نہ صرف بلند پایہ عالم بلکہ اعلیٰ ترین سطح کے محققین میں سے ہیں۔ ان کا تخصص دورِ صحابہؓ کے مطالعہ وتحقیق سے وابستہ ہے۔ راقم نے اپنے کسی مضمون میں انہیں سرزمین پنجاب کا ''ڈاکٹر حمید اللہ'' قرار دیا تھا جو دراصل ان کی شخصیت کے تعارف کے لیے تمثیل کا درجہ رکھتا ہے۔

مولانا محمد ذاکرؒ دستور ساز اسمبلی کے ممبر تھے اور بعد میں بھی ایک سے زائد بار قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ وہ روحانی طور پر سلسلہ چشتیہ سے منسلک اور خانقاہ سیال شریف سے وابستہ تھے۔ حصول علم کے دوران وہ کچھ عرصہ کے لیے دارالعلوم دیوبند بھی تشریف لے گئے تھے۔ ان کی ذات مذہبی و گروہی تعصّبات سے بلند تھی اور وہ امت مسلمہ کے اتحاد کے عظیم الشان علم بردار تھے۔۔۔ میرے والدمحترم شیخ الحدیث مولانا قاضی محمد خلیلؒ (شاگردعزیز علامہ انورشاہ کشمیریؒ) دو بار جامعہ محمدی میں بطور شیخ الجامعہ قیام پذیر رہے اور راقم نے جامعہ کے باقاعدہ طالب علم کے طور پر خود والدگرامی قدر سے صَرف ونحو کی مکمل تعلیم حاصل کی اور فقہ ومنطق اور علم الکلام کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔۔۔ میرا دورِ قیام میرے سکول کی کلاس ہفتم تا نہم (61-1958ء) کا تھا۔ جامعہ محمدی کے سرچشمہ علم وتربیت سے جو فیض پایا عمر گزرنے کے ساتھ اس کا شعور واحساس بڑھتا جارہا ہے اور مولانا محمد ذاکرؒ کی عظمت ہر گزرتے دن کے ساتھ دل میں گہرے نقوش ثبت کرتی جاتی ہے۔ زندگی میں بہت سے لوگ دیکھے مگر مولانا محمد ذاکرؒ جیسی جامع الصفات شخصیت کی مثل کسی اور کو نہ دیکھا۔۔۔ الجامعہ کا پرچہ سامنے آتا ہے تو جیسے مولانا کی زیارت ہورہی ہو۔ ہمارے دورِ قیام جامعہ محمدی میں پرچہ پرانی روایت کے نسبتاً چھوٹے صفحات پر مشتمل ہوتا اور اس کے ایڈیٹر جناب عبدالحق جامعی ہوا کرتے تھے۔

الحسن: جریدے کا نام جامعہ اشرفیہ کے بانی حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ امرتسری ثم لاہوری کے نام پر رکھا گیا۔ حضرت مفتی صاحب مولانا تھانویؒ کے خلیفہ راشد اور باکرامت ومحبوبِ خلائق علمی وروحانی ہستی تھے۔ نیلا گنبد کی مسجد بنوائی اور یہیں جامعہ اشرفیہ قائم ہوا۔ پھر اس کا جدید کیمپس مسلم ٹاؤن (فیروز پور روڈ) میں قائم ہوا تو اس میں شفٹ ہوگیا جہاں آج ایک عظیم دینی یونیورسٹی کا مقام حاصل کر چکا ہے اور اس کے قدیم وجدید طلبا اسے ''دیوبند ثانی'' بھی قرار دیتے ہیں۔ جامعہ اشرفیہ کا نام حضرت تھانویؒ کے نام پر رکھا گیا اور اس کی تاریخ مفتی محمد حسنؒ، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، مولانا محمد مالکؒ، مولانا رسول خانؒ، مولانا عبدالرحمٰن اشرفیؒ اور مولانا محمد موسیٰ خانؒ جیسی بلند پایہ دینی علمی شخصیات کے ناموں سے روشن ہے۔ آج اس قافلۂ رشد و ہدایت کی تعلیمی قیادت و رہبری شیخ

الحدیث مولانا فضل الرحیم اشرفی جیسی جلیل القدر اور محبوب خلائق شخصیت کے پاس ہے۔آپ کی حکیمانہ نبض عصر حاضر کے رجحانات کو عالمانہ گرفت میں لیے ہوئے ہے۔آپ رابطہ ادب اسلامی کی بین الاسلامی ادبی تحریک کے پاکستان چیپٹر کے صدر ہیں۔اپنے منصب جلیلہ اور جامعہ اشرفیہ کی بین الاقوامی شہرت واہمیت کی بناء پر دنیا بھر میں علمی وفکری سرگرمیوں میں شریک رہتے ہیں۔آج یورپ میں ہیں تو کل مشرقِ وسطیٰ، پرسوں کسی اور خطۂ ارض پر۔راقم کو دورۂ ترکی کے ایک علمی سفر میں ان کی معیت کا شرف حاصل رہا۔ یہ آپ کی ذمہ داریوں کا ایک حصہ ہے۔ ہماری دعا ہے کہ سلسلہ قاسمیہ تھانویہ کا یہ دبستانِ کتاب وسنت تاابد چمکتا دمکتا رہے۔

الحق: دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (ضلع نوشہرہ) کا ترجمان ماہنامہ ''الحق'' شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ کے نام سے منسوب ہے۔حضرت شیخ الحدیث نے دارالعلوم دیوبند میں کچھ عرصہ تدریسی فرائض ادا کرنے کے بعد اپنے علاقے میں علوم کتاب وسنت کی درس گاہ قائم کی اور تادم آخر شیخ الحدیث کی حیثیت میں علمی فرائض ادا کیے۔اللہ تعالیٰ نے آپ کو عوام میں اس قدر محبوبیت عطا کی کہ انہیں بار ہا پارلیمنٹ کا ممبر چنا۔ان کا لوگوں کے دلوں میں جو مقام تھا اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ پیپلز پارٹی کے بانی ذوالفقار علی بھٹو نے صوبہ سرحد سے اپنے سب سے مضبوط شخص نصراللہ خٹک کو آپ کے مقابلے میں قومی اسمبلی کا امیدوار بنایا تو اس کی ضمانت ضبط ہوگئی۔اس نے بھٹو سے کہا کہ آپ نے مجھے ایسے شخص کے مقابلے میں کھڑا کردیا ہے جس کا لوگ پیغمبر کی طرح احترام کرتے ہیں۔(علماء سرحد کی محبوبیت کے بے شمار واقعات ہیں۔مولانا مفتی محمودؒ نے ذوالفقار علی بھٹو کو ڈیرہ اسمٰعیل خان میں شکست سے دوچار کیا تھا)۔حضرت شیخ الحدیثؒ کے لیے ملک بھر میں بہت احترام پایا جاتا تھا۔ایک بار ملک کے سب سے بڑے قانون دان اے کے بروہی نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھا اور ادب سے کہا کہ اللہ نے آپ کو میرے دل پر مکمل اختیار دیا ہے۔ یہ سب کچھ اس فرمان کی ایک تعبیر ہے کہ من کان اللہ کان اللہ لہ (جو اللہ کا ہوجائے اللہ اس کا ہوجاتا ہے)۔آپ کے شاگردوں کا سلسلہ انڈوپاک،افغانستان،ایران وغیرہ دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ آپ کے شاگرد حقانی کہلاتے ہیں۔آپ کی جانشینی کی سعادت آپ کے لائق اور قابلِ فخر فرزند مولانا سمیع الحق کے حصے میں آئی جو بطریق احسن اپنا قائدانہ کردار ادا کررہے ہیں۔معروف سیاستدان مولانا فضل الرحمٰن بھی حضرت شیخ الحدیث کے شاگرد ہیں۔ ماہنامہ ''الحق'' کا اعزاز ہے کہ اردو ادب وفلسفہ کی

چوٹی کی شخصیت جناب محمد حسن عسکری (کراچی) نے زندگی کے آخری دور میں ایک سوال کے جواب میں ''آج کل کیا چیز زیر مطالعہ ہے'' کہا تھا کہ ایک گاؤں اکوڑہ خٹک سے رسالہ ''الحق'' آتا ہے بس وہی پڑھ لیتا ہوں۔ ہم دعا گو ہیں کہ ''الحق'' کی آب وتاب دن دوگنی رات چوگنی بڑھتی رہے۔ (آمین)

الامداد: نام برصغیر کی عظیم روحانی شخصیت سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے نام پر رکھا گیا اور اس کا مواد حکیم الامہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کسی ایک تقریر یا وعظ پر مشتمل ہوتا ہے۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کا روحانی مرتبہ اسی سے سوچا جاسکتا ہے کہ آپ قطب الاقطاب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسی شخصیات کے مرشد تھے۔ حضرت گنگوہیؒ کی تاریخ بتاتی ہے کہ اپنے روحانی رہبر کی محبت کے ایسے اسیر تھے کہ یاد آئی تو خانقاہ شیخ پر پہنچ کر ٹھکانہ کرتے اور ہفتوں عشروں تک قیام رہتا۔ یہاں تک کہ شیخ کے حکم پر واپسی ہوتی۔ حاجی امداد اللہؒ نے اس دور میں جب فرنگی سامراج کے برصغیر پر قبضے کے نتیجے میں برصغیر کو ''دارالحرب'' قرار دے دیا گیا تھا، ہندوستان چھوڑ کر مکۃ المکرّمہ کو اپنا مسکن بنایا اور دنیا نے انہیں مہاجر مکی قرار دیا۔ کتنے ہی لوگ جب حضرت حاجی صاحب سے روحانی راہ نمائی کے لیے مکہ میں حاضری دیتے تو انہیں حضرت گنگوہیؒ کی جانب رجوع کرنے کی ہدایت فرماتے۔ حضرت حاجی امداد اللہؒ کو بریلوی مکتب فکر سے وابستہ علماء کے ہاں بھی بہت عزت واحترام حاصل ہے۔ راقم نے مولانا عبدالستار خان نیازیؒ سے خود سنا کہ ہم حاجی امداد اللہ صاحب کا دلی احترام کرتے ہیں۔۔۔'الامداد' جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ (29 کامران بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور) سے جناب ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ ہر پرچے میں حضرت تھانویؒ کا ایک مفصل وعظ ہوتا ہے جس کے مضامین کو آغاز میں ایک تفصیلی انڈیکس کی صورت میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ ہر تقریر سے پہلے بتایا جاتا ہے کہ حضرت تھانویؒ نے یہ خطاب کس تاریخ (ہجری وعیسوی) کو کس جگہ فرمایا، کھڑے ہوکر یا بیٹھ کر، اور کتنے وقت میں بیان کیا۔ حاضرین کی تعداد کتنی تھی اور یہ وعظ کس شخص نے نوٹ کیا تھا۔ ان تفصیلات سے وعظ کا پورا منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ہر صفحے پر نیچے لکیر لگا کر چند مشکل الفاظ کے جدید وآسان زبان میں وضاحتی معنی دیے جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ اشرفیہ تھانویہ کے فیوض و برکات کا نہایت اعلیٰ نمونہ ہے۔ حضرت تھانویؒ امت مسلمہ کے سلسلۂ رشد و ہدایت کی تاریخ کا بہت محترم نام ہے اور یہ بھی ان کی کرامت کہی جاسکتی ہے کہ بعد از مرگ ان تفصیلات کے ساتھ ان کے ارشادات سے یوں

استفادہ کیا جاسکتا ہے جیسے ان کی محفل میں حاضر ہوں۔ حضرت تھانویؒ کو اللہ تعالیٰ نے علمائے امت میں خصوصی امتیازات سے نوازا۔ ان کا مربیانہ انداز ہر سائنسی معیار پر پورا اترتا ہے۔ بلاشبہ ان کا شمار ایسی ہستیوں میں کیا جاسکتا ہے جنہیں ''آیت من آیات اللہ'' کہا جاتا ہے۔ ایک مقام پر حضرت تھانویؒ نے حضرت گنگوہی سے کسی مسئلہ کا حل کرنے کی درخواست کرتے ہوئے لکھا کہ ''برصغیر کے طول وعرض پر نگاہ ڈالتا ہوں تو آپ سے بڑھ کر کوئی شخص دکھائی نہیں دیتا جس سے یہ دریافت کروں''۔ اسے پڑھ کر حضرت گنگوہی کے علمی مقام کا اندازہ ہوتا ہے اور حضرت گنگوہی کے مرشد محبوب کا نام حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ ہے اور اسی بے مثل ہستی کے نام پر جریدے کا نام ہے 'الامداد'۔ تو رسالہ 'الامداد' کا ٹائیٹل دیکھتے ہی ان اکابر کی نورانی ہستیوں کا گویا ایک ''روحانی دیدار'' ہوجاتا ہے۔

البرھان: یہ 71۔ اے فیصل ٹاؤن لاہور سے نکلنے والا ماہنامہ ہے جو ہمارے فاضل محقق جناب ڈاکٹر محمد امین کی برپا کردہ ''تحریک اصلاح تعلیم'' کا ترجمان ہے۔ ڈاکٹر محمد امین پنجاب یونیورسٹی کے اسلامی انسائیکلو پیڈیا ڈیپارٹمنٹ سے وابستہ تحقیقی شخصیت ہیں۔ ملک کی تعلیم دنیا میں اصلاحات کے لیے دل دردمند رکھتے اور سراپا جدوجہد رہتے ہیں۔ ان کے ذہن میں جدید دور کے تقاضوں اور معیارات کے مطابق ایک اسلامی یونیورسٹی کے قیام کا تصور موجزن ہے اور اس کے لیے ممکنہ جدوجہد اپنائے ہوئے ہیں۔ البرھان میں درج مجلس مشاورت کی اہم ترین شخصیت جناب احمد جاوید کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ پی ٹی وی اور جیو ٹی وی کے بہت سے علمی مذاکروں ومباحثوں میں ان کے رسوخ فی العلم کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ اللہ کریم نے انہیں اعلیٰ فلسفیانہ دماغ عطا فرمایا ہے، وہ ایک عملی صوفی ومربی اور عالم وادیب مفکر اور ماہر اقبالیات ہیں۔ ''البرہان'' کی ٹیم میدان عمل میں ہے اور اپنی تاریخ بنانے میں محو جدوجہد۔ راقم خود اس تحریک کا ایک حقیر سا ذرہ ومعاون اور اس کی کامیابیوں کا خواب دیکھنے والوں میں شامل ہے۔

الحمدللہ! ایک چھوٹی سی ٹیبل پر پڑے بیک وقت پانچ دینی رسالوں کی ایک جھلک سے ذہن میں تصورات کی جو لہر آئی اسے قلم کی مدد سے سپرد قرطاس کردیا گیا اور ان سطور کے قاری تک بات پہنچ گئی۔ الحمدللہ علیٰ ذلک۔ آئیں ہم رب کریم سے التجا کریں کہ ہمیں علم وعمل کی اس راہ پر آگے بڑھنے کی توفیق عطا فرمائے جو اسے قبول ومنظور ہو (آمین، ثم آمین)۔

ڈاکٹر محمد امین

علماء کرام کے درمیان پائیدار اور مؤثر اتحاد کے لیے بعض تجاویز

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ مختلف دینی مکاتب فکر کے علماء کرام کے درمیان جب اتحاد کی بات کی جائے اور اس مقصد کے لیے جب کوئی اجلاس بلایا جائے یا کانفرنس اور سیمینار منعقد کیا جائے تو شرکاء عام طور پر خیر سگالی کا اظہار کرتے ہیں اور اتحاد و یگانگت کی باتیں ہوتی ہیں لیکن یہی علماء کرام جب اپنی مجلسوں میں جاتے ہیں اور اپنے مسلک کے لوگوں کے درمیان بیٹھتے ہیں تو پھر لہجے بدل جاتے ہیں۔ اگرچہ اتحاد کے لیے وقتی حمایت بھی قابل ستائش اور حوصلہ افزاء ہے لیکن ملی مجلس شرعی چونکہ اتحاد بین العلماء کی مستقل علم بردار ہے اور مختلف دینی مکاتب فکر کے درمیان مفاہمت اور تقارب کو فروغ دینا اس کے بنیادی اہداف میں سے ہے، اس لیے ہم نے سوچا ہے کہ بعض اہم تجاویز پر غور کیا جائے جو علماء کرام کے درمیان ٹھوس اور پائیدار اتحاد کا موجب بنیں تا کہ بتدریج ایسی فضا قائم ہو جائے جو مختلف مکاتب فکر کو قریب لائے اور ان میں پائے جانے والے بُعد اور دوری کے خاتمے کا سبب بنے۔ چنانچہ یہ تجاویز اسی نیت سے پیش کی جارہی ہیں کہ علماء کرام ان پر غور فرمائیں اور ان پر عمل کی راہ ہموار ہو۔

اختلاف قابل مذمت نہیں

تاہم ایک بات شروع ہی میں واضح ہو جانی چاہیے کہ علماء کرام کے درمیان اختلافات بالکلیہ ختم کرانا نہ ہمارا ہدف ہے اور نہ ہی یہ ممکن ہے۔ علماء کرام یعنی اصحاب علم جو دین اسلام کا خصوصی مطالعہ اور ذوق رکھتے ہیں، دیگر شعبوں کے اہل علم کی طرح ہیں جن میں علمی اختلاف معمول کی بات سمجھا جاتا ہے۔ جب سوچنے سمجھنے والے لوگ اکٹھے ہوں گے، مسائل پر غور کریں گے تو ان میں بہت سی باتوں پر اتفاق ہوگا تو کئی باتوں میں اختلاف بھی ہوگا۔ اہل علم اور سوچنے سمجھنے والے لوگ مشینوں کی طرح نہیں ہوتے، اور نہیں ہو سکتے کہ بٹن دبایا اور ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے ایک جیسے پرزے بننے شروع ہو گئے۔ یہ معاملہ مشینوں کے ساتھ تو ہو سکتا ہے، اہل علم کے درمیان نہیں ہو سکتا بلکہ یہ غیر فطری ہے اور ایسا ہونا نہ تو ممکن ہے اور نہ اس کے لیے کوشش کی جانی چاہیے۔ بلکہ اس کے برعکس اہل علم کے درمیان اختلاف بعض اوقات مفید ہوتا ہے اور 'اختلاف امتی رحمۃ' اگر حدیث نہ بھی ہو تو ایک پر حکمت مقولہ ضرور ہے کہ اس میں لوگوں کے لیے وسعت اور سہولت ہے اور طبائع کا اختلاف اور تنوع

بسااوقات اس کا متقاضی ہوتا ہے جیسا کہ استاد ذوق نے کہا ہے کہ۔

گل ہائے رنگا رنگ سے ہے زینت چمن

اے ذوق اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے

اسی طرح کسی شخص کا دلائل یا اپنے ذوق، ترجیح اور پسند کی بنیاد پر کسی خاص علمی یا فقہی مسلک ومشرب کو اپنالینا بھی عین فطری ہے اور یہ ہرگز قابل اعتراض نہیں تاہم اگر علمی اختلاف یا کسی مسلک سے وابستگی اپنی حدود میں نہ رہے اور سبب تحزب وتعصب اور دشمنی بن جائے تو یہ رحمت کی بجائے زحمت بن جاتا ہے بلکہ باعث آزار ومصیبت ہوجاتا ہے اور فتنہ وفساد کو جنم دیتا ہے۔ اور ہمارے ہاں چونکہ اسی دوسری صورت حال کا غلبہ ہے اس لیے سوچ سمجھ کر ایسے اقدامات کی ضرورت ہے جن سے یہ اختلاف اپنی جائز اور مفید حدود میں سمٹ جائے۔ لیکن ایسی تجاویز پیش کرنے سے پہلے ضروری محسوس ہوتا ہے کہ پہلے ان عوامل وموثرات کا ایک تجزیہ کرلیا جائے جو اس بگاڑ کا سبب بنے ہیں تاکہ اس صورت حال کی اصلاح کے لیے جو تجاویز ہم پیش کریں ان کی افادیت وحکمت سمجھ میں آسکے اور ان پر عمل کی راہیں کشادہ ہوسکیں۔

فرقہ واریت کے اسباب وذرائع

وہ طرز فکر وعمل جو جائز علمی اختلاف اور کسی مسلک ومشرب سے نارمل وابستگی کو باعث آزار وفتنہ بنادیتا ہے اس کے کئی اسالیب اور طریقے ہیں جن میں سے چند اہم یہ ہیں:

۱۔ تحمل وبرداشت کی کمی اور اختلاف رائے برداشت نہ کرنا

۲۔ فروعی اختلاف کو اصولی اور بنیادی بنا کر پیش کرنا

۳۔ ایک عام شرعی حکم کو شعائر قرار دے لینا

۴۔ اپنے مسلک ومشرب کو پورا دین بنا کر پیش کرنا اور دین کو اس میں منحصر سمجھنا۔

۵۔ مسلک کو مدار تحزب وتعصب بنالینا

۶۔ جذباتی اور اشتعال انگیز انداز میں دوسرے مسالک کی مذمت کرنا

۷۔ معمولی اور فروعی اختلافات پر فریق مخالف کو کافر، فاسق اور گمراہ قرار دینا۔

۸۔ مناظرہ بازی اور اس کا انداز اور سپرٹ کہ فریق مخالف کو شکست دی جائے اور اس کا نقطۂ نظر غلط ثابت کیا جائے۔

ان اسالیب کو ہماری سوسائٹی میں زیر تعلیم علماء کرام اور عوام کے ذہنوں میں راسخ کرنے کے لیے اور انہیں فروغ دینے کے لیے مندرجہ ذیل ذرائع اختیار کیے جارہے ہیں:

ا۔ مساجد کے ذریعے

مسجدیں اللہ کا گھر ہوتی ہیں اوران میں اللہ کی عبادت کی جاتی ہے لیکن ہمارے معاشرے میں ہر مسجد کسی نہ کسی مسلک کی ہوتی ہے اور دوسرے مسالک کے علماء وعوام کا داخلہ بالعموم وہاں ممنوع ہوتا ہے۔ایک زمانہ تھا کہ کسی دوسرے مسلک کے معروف آدمی کے وہاں چلے آنے کی صورت میں مسجدیں باقاعدہ دھوئی جاتی تھیں گویا وہ ناپاک ہوگئی ہوں۔اب وہ بات تو نہیں لیکن اب بھی یہ بات ناپسندیدہ ضرور سمجھی جاتی ہے۔ ہر مسجد کا ایک نام رکھا جاتا ہے اور نام بالعموم ایسا رکھا جاتا ہے جس سے مسجد بنانے اور چلانے والوں کے مسلک کا اظہار ہوتا ہو اور بعض لوگ تو اس پر بھی اکتفا نہیں کرتے اور اپنے مسلک کو مسجد کے نام کا جزو بنادیتے ہیں۔اور یہی نہیں مسجدوں میں جمعہ کے جو خطبے دیے جاتے ہیں وہ بالعموم فرقہ وارانہ موضوعات پر دیے جاتے ہیں یا کسی دوسرے موضوع پر ہوں تو بھی خطیب صاحب کا اسلوب ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے مسلک کے اظہار اور اس کے واحد حق ہونے کے ابلاغ کو نہیں بھولتے۔اس غرض سے مسجد کا خطیب اور امام صرف اس شخص کو مقرر کیا جاتا ہے جو مسجد بنانے اور چلانے والوں کا ہم مسلک ہو۔ یوں مسجدیں اللہ کا گھر بننے کی بجائے مسلک کا گڑھ بن جاتی ہیں اوران سے ایک خاص مسلک کے فروغ کا کام لیا جاتا ہے۔اسی وجہ سے مسجدوں پر زبردستی قبضے بھی کیے جاتے ہیں اور بات بدزبانی اورگالیوں سے بڑھ کر ہاتھاپائی اور سر پھٹول تک، اور بعض اوقات پستولوں اور بندوقوں کے استعمال تک جا پہنچتی ہے۔عدالتوں میں مقدمے چلتے ہیں،مسجدیں سیل ہوتی ہیں۔۔۔وغیرہ وغیرہ۔

۲۔ دینی مدارس کا کردار

مسجدوں کی طرح دینی مدارس بھی ہمارے معاشرے میں لازماً کسی نہ کسی مسلک سے وابستہ ہوتے ہیں۔ ہر دینی مدرسے میں صرف اس مسلک کے طلبہ کو داخلہ دیا جاتا ہے اور صرف ان اساتذہ کا تقرر کیا جاتا ہے جو خاص اسی مسلک کے ہوں۔ مدرسوں میں جو کتابیں اور کتابوں کی شرحیں پڑھائی جاتی ہیں ان سے بھی مسلک کا اظہار ہوتا ہے۔طریق تدریس بھی اپنے مسلک کی حقانیت ثابت کرنے والا اور دوسرے مسالک کا ابطال کرنے والا ہوتا ہے مثلاً حدیث شریف پڑھاتے وقت اگر کوئی ایسی حدیث آجائے جس سے اپنے مسلک کی تائید ہوتی ہو تو اس پر طول بیان کئی گھنٹوں اور بسااوقات کئی دنوں تک پھیل جاتا ہے اور اگر کوئی حدیث اپنے مسلک کے خلاف ہو تو اس کی تاویل بلکہ تضعیف ثابت کرنے کے لیے اسماء الرجال اور جرح وتعدیل کے دفاتر کھنگالے جاتے ہیں اور روایت ودرایت کی رو سے باریک بینی کی انتہا کی جاتی ہے۔اسی طرح زیرتعلیم علماء کو فن تقریر سکھاتے

ہوئے ایسے موضوعات دیے جاتے ہیں اور ایسا اسلوب سکھایا جاتا ہے کہ مخالف مسلک کا تیاپانچہ کیسے کرتے ہیں۔ اور بعض دینی مدارس میں تو 'فن مناظرہ' ابھی تک باقاعدہ جزو نصاب ہے اور اس پر باقاعدہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اور ان کا امتحان لیا جاتا ہے۔

۳۔ دینی تعلیم کے وفاق

فرقہ واریت کی جڑیں گہری کرنے میں دینی تعلیم کے وفاقوں کا بھی ہاتھ ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ جب جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں دینی مدارس کے وفاقوں کی بطور ایک امتحانی ادارے کے منظوری دی جارہی تھی تو اس خواہش و کوشش کا محرک کون تھا کہ ہر مکتب فکر کا الگ دینی تعلیم کا وفاق بنایا جائے۔ اس کے پیچھے بعض تنگ نظر علماء تھے یا ہشیار اسٹیبلشمنٹ تھی بہرحال یہ بڑا ظلم ہوا کیونکہ جدید تعلیم کی طرز پر آسانی سے دینی تعلیم کا ایک وفاق بنایا جاسکتا تھا اور مختلف علاقوں میں اس کی شاخیں قائم کی جاسکتی تھیں اور وہ یوں کہ ایک وفاق بنادیا جاتا جس کے دو سیکشن ہوتے۔ ایک اہل سنت کے مدارس کے لیے اور دوسرا اہل تشیع کے لیے۔ دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور جماعت اسلامی کے مدارس کا نصاب اس وقت بھی تقریباً ایک جیسا ہی ہے۔ ان کا نصاب ایک مقرر کرکے ان کو اجازت دے دی جاتی کہ وہ اپنی مرضی کے مصنفین کی کتابیں لگوالیں۔ اس طرح یہ مسئلہ آسانی سے حل ہوسکتا تھا اور آج بھی حل ہوسکتا ہے لیکن جو لوگ فرقہ واریت کو مستحکم کرنا چاہتے ہیں وہ ایسا نہیں ہونے دیتے چنانچہ ہر مسلک کا الگ الگ وفاق بنادیا گیا ہے۔ اس طرح مستقبل کے علماء کی تعلیم اور روزگار ان وفاقوں کی ڈگریوں سے بندھ گیا ہے اور لوگ ان مسلکی وفاقوں کے محتاج ہوگئے ہیں۔ اس چیز نے بھی مسلک پرستی کے رویے کو مستحکم کیا ہے ان وفاقوں کا ایک نقصان یہ بھی ہوا ہے کہ یہ نصاب کی اصلاح میں رکاوٹ بن گئے ہیں۔ اور وفاق سے ملحق کوئی مدرسہ اپنے نصاب میں تبدیلی کرنا چاہے بھی تو نہیں کرسکتا۔

۴۔ دعوتی کام مسلک کی بنیاد پر

تبلیغی جماعت چلانے والے دیوبندی حضرات ہیں اور تبلیغی جماعت کی طرز پر یا اس کے مقابلے میں بننے والی حنفی بریلوی حضرات کی 'دعوت اسلامی' ہے۔ اہل حدیث حضرات کے واعظین اور مبلغین اور جماعت اسلامی کے مقررین بھی اپنی اپنی جماعت کی دعوت لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ یہ سب حضرات اپنی دعوت کو 'دین کی دعوت' کہہ کر پیش کرتے ہیں اور اسے قرآن وسنت کے عین مطابق قرار دیتے ہیں۔

۵۔ پرنٹ میڈیا

ہر دینی جماعت اور ہر مسلک کی جماعت خواہ وہ سیاسی ہو یا غیر سیاسی اپنے رسالے (ہفت روزہ، ماہانہ) نکالتی ہے، اپنی دعوت پر مبنی پمفلٹ اور کتابیں شائع کرتی ہے اور بعض بڑی جماعتیں اور مسالک اپنے اخبار (روزنامے) بھی نکالتے ہیں اور ہر جماعت/مسلک ان ذرائع سے پھیلانے والی دعوت اور فکر کو دینی دعوت اور دینی فکر کہہ کر پیش کرتا ہے جب کہ درحقیقت وہ ان کی جماعتی اور مسلکی فکر اور دعوت ہوتی ہے۔

۶۔ الیکٹرانک میڈیا

اس کی فکر تو بہت کم اہل دین کو ہے کہ ہمارے حکومتی اور پرائیویٹ ٹی وی چینلز امریکہ و یورپ اور بھارت کی نقالی کرتے ہوئے فحاشی اور عریانی پھیلا رہے ہیں اور ان کے اکثر پروگرام اسلام مخالف سپرٹ کے حامل ہوتے ہیں اور یوں وہ مسلم معاشرے کی بنیادوں کو کمزور کرتے ہیں اور یہ کہ ان کا توڑ کرنے کی ضرورت ہے اور ایسے پروگرام تیار کرنے کی ضرورت ہے اور ایسے ٹی وی چینلز قائم کرنے کی ضرورت ہے جو اسلام کو عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق اور غیر فرقہ وارانہ انداز میں پیش کر سکیں اور اسلام مخالف قوتوں کی سرگرمیوں کا توڑ کر سکیں البتہ کئی لوگوں نے ایسے دینی ٹی وی چینلز ضرور کھول رکھے ہیں جو رات دن فرقہ وارانہ پروگرام پیش کرتے ہیں اور دین اسلام کی بجائے اپنے اپنے مسلک کو فروغ دینے میں لگے رہتے ہیں۔

۷۔ مسلکی سیاسی جماعتیں

ہر مسلک کے لوگوں نے اپنی اپنی سیاسی جماعت بنائی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر لوگوں نے ووٹ مسلک کی بنیاد پر دینے ہوں تو ایک مسلک کا آدمی دوسرے مسلک کے قائد کو ووٹ نہیں دے گا۔ نیز یہ کہ مختلف مسالک کے لوگ ہمارے معاشرے میں بکھرے ہوئے ہیں اور کسی ایک علاقے، صوبے، ضلع یا حلقۂ نیابت میں جمع نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلک کی بنیاد پر بننے والی کوئی سیاسی جماعت کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہ اتنی سادہ سی بات ہے کہ اسے سمجھنے کے لیے افلاطون کی عقل درکار نہیں لیکن اس کے باوجود علماء کرام نے اپنے اپنے مسلک کی بنیاد پر سیاسی جماعتیں بنائی ہوئی ہیں۔ انتخابات میں دینی سیاسی جماعتوں کے امیدوار جب ایک دوسرے کے مقابلے پر اترتے ہیں تو ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشی ہوتی ہے اور ایک دوسرے میں کیڑے نکالے جاتے ہیں اور یوں دین اور علماء کرام کی ہوا خیزی ہوتی ہے۔ دینی حلقوں کے ووٹ بٹ جاتے ہیں اور سیکولر امیدوار کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس طرح مسلک کی بنیاد پر بننے والی یہ جماعتیں فرقہ واریت اور مسلک پرستی

کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

یہ تھے وہ چند بڑے داخلی وسائل اور ذرائع جو فرقہ واریت کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔اب ہم خارجی ذرائع کی طرف آتے ہیں۔

فرقہ واریت پھیلانے والے خارجی ذرائع اورعوامل

ان میں سے اہم دو ہیں۔ایک اسلام اور مسلم دشمن بین الاقوامی طاقتیں اور دوسرے ان کے گماشتہ مقامی حکمران اوران کی خفیہ ایجنسیاں۔

ا۔ بین الاقوامی طاقتیں

ان میں سرفہرست امریکہ ویورپ اوران کے حلیف بھارت، اسرائیل اور روس وغیرہ ہیں کہ **الکفر ملة واحدہ**۔امریکہ ویورپ اسلام کے اس لیےحریف ہیں کہ یہ وہ واحد طاقت ہے جومغربی فکر وتہذیب کے آگے سرنگوں ہوکر اپنی شناخت کھونے کے لیے تیارنہیں بلکہ اسلام ایک متبادل طرز فکر اورطرز زندگی ہے اس لیےمغربی ممالک مسلم دنیا میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً پوری کوشش سے ایسے حالات پیدا کرتے ہیں کہ یہاں لوگ اسلامی تعلیمات پرعمل نہ کریں بلکہ اسلام سے دور ہوں۔یہاں شریعت نافذ نہ ہو اور معاشرے اور ریاست کے حالات اسلام سے موافقت رکھنے والے نہ ہوں۔اس غرض سے مغرب اوران کے حلیفوں کی خفیہ ایجنسیاں ہر وقت سازشوں میں مصروف رہتی ہیں اوران کی سب سے بڑی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ علماء اوران کی جماعتوں میں پھوٹ ڈالیں اور انہیں آپس میں لڑائیں تاکہ دین کی ہواخیزی ہو۔ یوں وہ فرقہ واریت کوفروغ دینے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

۲۔ مقامی حکمران

داخلی عوامل میں سے دوسرا بڑا اوراہم عامل مغربی ممالک کے گماشتہ مقامی حکمران اوران کی خفیہ ایجنسیاں ہیں۔اسلام ومسلم مخالف امریکہ و یورپ کی ہشیاری اور چالاکی یہ ہے کہ وہ مسلم معاشرے میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً دینی اور اخلاقی بگاڑ پیدا کرنے کے لیے اپنے پاس سے وسائل خرچ نہیں کرتے (اگرچہ ان کے پاس وسائل کی کمی نہیں اور وہ جہاں چاہیں انہیں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کھلے دل سے خرچ کرتے ہیں جیسے مثلاً عراق اور افغانستان میں) بلکہ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ مسلمانوں ہی کے وسائل ان کے خلاف استعمال کریں۔اس کے لیے مغربی ممالک اوران کی خفیہ ایجنسیاں مستقل سازشیں کرتی رہتی ہیں اور مسلم ممالک خصوصاً پاکستان میں کنگ میکر کا کردار ادا کرتی ہیں۔ وہ ایسے فوجی اور سول حکمرانوں کو اقتدار میں لاتی ہیں جو دینی سیاسی قوتوں کے خلاف

سخت رویہ رکھتے ہوں بلکہ انہیں کچلنے اور ناکام بنانے میں پوری سرگرمی دکھائیں۔مغرب کے ایجنٹ پاکستانی حکمران اور ان کی خفیہ ایجنسیاں پاکستان کی دینی (سیاسی وغیرسیاسی) جماعتوں اور ان کے دھڑوں میں پوری طرح دخیل ہیں اور ان کے اندر پھوٹ ڈالنے اور انہیں ایک دوسرے کے خلاف لڑانے میں انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

ہم نے سطور بالا میں فرقہ واریت کوفروغ دینے والے جن متعدد داخلی عوامل کا ذکر کیا ہے ان کومتحرک کرنے میں بنیادی کردار پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ اوراس کی خفیہ ایجنسیوں کا ہے۔مرحوم ڈاکٹر غلام مرتضٰی ملک صاحب نے جو پنجاب کے ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل رہ چکے تھے ہمیں ذاتی طور پر بتایا اور علماء کرام کے ایک مجمع میں یہ بات علی الاعلان بھی کہی کہ ان کے پاس ایسے علماء کی ایک فہرست ہے جو پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں کے تنخواہ دار ہیں۔مساجد و مدارس اور وفاقوں کی رجسٹریشن،فرقہ وارانہ ٹی وی چینلز کے اجازت نامے، رسالوں کے ڈیکلریشن، مسلک کی بنیاد پر سیاسی جماعتوں کی رجسٹریشن۔۔۔ان سب کاموں کی اجازت اور منظوری حکومت پاکستان دیتی ہے بلکہ اس کی مرضی اور پلاننگ سے اس طرح کی فرقہ وارانہ رجسٹریشنوں کا سلسلہ جاری ہے۔اگر حکومت اخلاص اور سنجیدگی سے مسلک پرستی اور فرقہ واریت ختم کرنا چاہتی ہوتو وہ اس میں بہت مفید اور تعمیری کردار ادا کرسکتی ہے اور مسلک کی بنیاد پر ان رجسٹریشنوں کو منسوخ کرسکتی ہے لیکن شواہد بتاتے ہیں کہ وہ ہرگز ایسا نہیں چاہتی بلکہ الٹا پاکستان میں فرقہ واریت اور مسلک پرستی کوفروغ دینے میں پاکستانی اسٹیبلشمنٹ اور اس کی خفیہ ایجنسیاں اہم ترین کردار ادا کررہی ہیں۔

اتحاد کی تجاویز

علماء کرام اور دینی عناصر میں اتحاد کے حوالے سے حالات کے اس تجزیے، اتحاد کی راہ میں حائل مشکلات ومسائل اور افتراق وانتشار کا سبب بننے والے ذرائع اور عوامل کی نشان دہی کے بعد اب ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ اس صورت حال کے علاج اور اصلاح کے لیے کچھ تجاویز پیش کرسکیں:

I۔ قیادت

ہمارے خیال میں پہلی اور بنیادی ضرورت اس امر کی ہے کہ دینی عناصر اور علماء کرام اس پر غور فرمائیں کہ ان کی قیادت موزوں اور مناسب ہاتھوں میں ہو۔قرآن وسنت میں قیادت کی جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ علماء سے زیادہ کون جانتا ہے۔ہم محض تذکیر کے لیے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ کیے دیتے ہیں:

<u>مثبت صفات</u> جو قیادت میں ہونی چاہئیں: تقویٰ، امانت، قوت، اخلاص و بے نفسی، علم وحلم، تدبیر و

فراست، دینی و اجتماعی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دینا۔۔۔وغیرہ

منفی صفات اور کمزوریاں جو قیادت میں نہیں ہونی چاہئیں: حبّ جاہ و مال، قیادت کی خواہش وحرص، دنیا پرستی، رسوخ فی العلم نہ ہونا، انتظامی صلاحیتوں کا فقدان، آگے آنے کے لیے جوڑ توڑ اور سازشیں کرنا، انانیت اور سب کو ساتھ لے کر چلنے کی صلاحیت نہ ہونا۔۔۔وغیرہ

اصل چیز علم نہیں عمل ہے لہٰذا علماء کرام کا فرض ہے کہ وہ دیکھیں کہ آیا ان کی جماعتوں/تنظیموں/تحریکوں/اداروں/مدرسوں/مسجدوں۔۔۔میں وہ لوگ بیٹھے ہیں جو قیادت کی اہلیت رکھتے ہیں؟ اگر ایسا نہیں ہے تو انہیں فتنہ وفساد سے بچتے ہوئے اصلاح کی بھرپور کوششیں کرنی چاہئیں اور خیر کی اجتماعی قوتوں کو متحرک کر کے اس صورت حال کا ازالہ کرنا چاہیے کیونکہ اگر قیادت نااہل ہو اعلیٰ اخلاقی صفات سے محروم ہو، دنیا پرست ہو اور ذاتی مفادات کے لیے سیکولر حکمرانوں سے ساز باز کرنے میں اسے تامل نہ ہو اور علماء کے قائدین اگر نہ رسوخ فی العلم رکھے ہوں اور نہ متقی ہوں تو کون سی چوٹی سر کی جاسکتی ہے؟

II۔فراست

اتحاد کے لیے شیطان، نفس اور اسلام و مسلم دشمن بین الاقوامی طاقتوں اور ان کے گماشتہ مقامی حکمرانوں اور ان کی خفیہ ایجنسیوں کی چالوں اور سازشوں سے بچنا ضروری ہے۔اس کے لیے ایمان، اخلاص اور فراست کا زادِ راہ درکار ہے۔

III۔اداروں کی اصلاح

دینی قیادت کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ مذکورہ سات داخلی اسباب کے بارے میں مثبت رویوں کے فروغ کے لیے اقدامات کرے جن کا ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا ہے۔تفصیل سے قطع نظر ہم صرف اشارات پر اکتفا کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ:

۱۔ اعلان کر دیا جائے کہ مسجدیں اللہ کا گھر ہیں۔سب لوگ اس میں عبادت کر سکتے ہیں۔ان کا انتظام کسی ایک مسلک کے ہاتھ میں نہ ہو۔فرض کیجیے کسی ایک مسلک کے نمازیوں کی اکثریت ہو بھی تو انہیں چاہیے کہ اظہار خیر سگالی کے لیے دوسرے مسالک کے لوگوں کو بھی شریک انتظام وانصرام کر لیں۔

۲۔ دینی مدرسوں میں طلبہ کا داخلہ بلالحاظ مسلک ہو اور اسی طرح اساتذہ کی تقرری بھی بلالحاظ مسلک ہو۔سب مل جل کر کام کریں۔طریق تدریس معروضی ہو اور اختلافی امور میں مختلف مسالک کا نقطۂ نظر غیر جذباتی انداز میں بیان کر دیا جائے۔ان امور کی تربیت کے لیے مساجد کے آئمہ وخطباء اور دینی مدارس کے اساتذہ و مہتممین حضرات کی تربیت کی ضرورت ہے۔

۳۔ دینی تعلیم کا وفاق ایک ہونا چاہیے۔ اہل تشیع کو چھوڑ کر باقی لوگ ایک نصاب پر متفق ہوجائیں، کتابیں اور شروحات مختلف ہوسکتی ہیں۔

۴۔دعوتی کام میں قرآن وسنت کی نصوص اور ان کی متفقہ تعبیرات اور مشترکات بیان کیے جائیں جو کافی زیادہ ہیں۔مسلکی اور جماعتی نقطۂ نظر کو ایک اجتہادی کاوش کے طور پر پیش کیا جائے جس میں غلطی کا امکان ہوسکتا ہے اور جسے ماننا ہر مسلمان پر فرض نہیں۔ مناظرہ بازی اور ایک دوسرے کے خلاف جذباتی اور اشتعال انگیز تقریروں کا سلسلہ روک دیا جائے۔

۵۔تحریری مواد یعنی کتابوں، رسالوں، پمفلٹوں اور اشتہارات وغیرہ میں جذباتیت پر مبنی افتراق انگیز تحریروں سے اجتناب کیا جائے اور برداشت اور تحمل کا ثبوت دیا جائے۔

۶۔ٹی وی کسی ایک مسلک کا نہیں ہونا چاہیے اور ہو بھی تو اس کے پروگرام دینی ہونے چاہئیں نہ کہ مسلکی۔ ہمارے ہاں مشترکات بہت زیادہ ہیں جن پر سب مسالک کا اتفاق ہے، انہیں نمایاں کیا جائے اور اختلافی امور میں علمی اسلوب اور معروضی نقطۂ نظر اختیار کیا جائے۔

۷۔مسلک پر مبنی دینی سیاسی جماعتیں ختم کردی جائیں اور نفاذ شریعت کے متفقہ نکات پر جمع ہوجایا جائے جن کا تعین کرنا ہرگز مشکل نہیں۔ مقامی سیاسی ایشوز پر اختلافات اگر ہوں تو انہیں برداشت کیا جائے۔

IV۔ رویوں کی اصلاح

مذکورہ بالا اصلاحی پروگرام کے حامی علماء کرام اپنا ایک مشترکہ پلیٹ فارم بنالیں (جیسے مثلاً ملی مجلس شرعی ہے) جس میں سب مسالک کے علماء کرام شامل ہوں اور وہ مساجد کے آئمہ وخطبا، دینی مدارس کے اساتذہ ومہتممین اور دینی سیاسی جماعتوں کے قائدین وارکان کی تربیت کا وسیع پیمانے پر انتظام کریں جس میں انہیں بار بار بتایا جائے کہ:

۱۔امت اصولوں پر متحد ہے اور اس میں مشترکات بہت زیادہ ہیں۔ چھوٹے موٹے فروعی معاملات کو غیرضروری اہمیت دینے کی ضرورت نہیں۔

۲۔فقہی وکلامی مسالک اجتہاد پر مبنی ہیں جن میں غلطی کا امکان ہوسکتا ہے اور تعبیر وتاویل کے اختلافات ہوسکتے ہیں کیونکہ کسی مجتہد، امام اور فقیہ پر وحی نازل نہیں ہوتی تھی کہ اس کا فرمانا قرآن وسنت کی طرح حرف آخر ہو لہٰذا مسلک کو دین اور حجت بنا کر پیش نہیں کرنا چاہیے۔

۳۔اہل علم کے درمیان اختلافات ہوسکتے ہیں اور ہمیشہ سے ہوتے رہے ہیں لہٰذا نہ تو یہ قابل مذمت ہیں اور نہ انہیں بالکلیہ ختم کیا جاسکتا ہے۔ انہیں برداشت کرنا چاہیے اور اپنی بات دلائل سے اور غیر جذباتی

انداز میں کرنی چاہیے۔ اس اختلاف کو گروہ بندی، تعصب اور تحزب کی بنیاد نہیں بنانا چاہیے۔ آئمہ اربعہ کے درمیان اختلافات، اہل الفقہ اور اہل الحدیث کے اختلافات، اہل سنت و اہل تشیع کے اختلافات یہ سب صدیوں سے چلے آرہے ہیں لہٰذا سب فریقوں کو ایک دوسرے کو برداشت کرنا چاہیے اور انہیں فتنہ و فساد کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے۔

۴۔ بعض شرعی احکام شعائر کی حیثیت رکھتے ہیں جیسے اذان اور السلام علیکم کہنا لیکن اہل مسالک کا یہ طرزِ عمل غلط ہے کہ انہوں نے بعض شعائر اپنے پاس سے گھڑ لیے ہیں جیسے نصوص سے ثابت ہے کہ ذکر جہری بھی کیا جاسکتا ہے اور خفی بھی لیکن جہری ذکر کو بعض لوگوں نے ایک خاص مسلک کی پہچان اور شعائر قرار دے لیا ہے یہی حال ازار کو ٹخنوں سے اونچا باندھنے اور آمین بالجہر اور خفی کا ہے۔

۵۔ اختلاف کا اظہار سلیقے سے کرنا چاہیے اور ہمیشہ ٹھنڈے دل و دماغ سے دلیل کے ساتھ بات کرنی چاہیے۔ طنزیہ، جذباتی اور اشتعال انگیز تحریروں اور تقریروں سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا بلکہ نفرت پھیلتی ہے اور تعصّبات میں اضافہ ہوتا ہے۔ جزوی اور فروعی اختلافات میں فریق مخالف کی تفسیق و تکفیر کرنا یا اسے گمراہ قرار دے کر اس کی مذمت کرنا یا مناظرے کی سپرٹ کہ فریق مخالف کو ہر قیمت پر شکست دینا ہے، کوئی قابل قدر علمی رویہ نہیں ہے اور اس سے اجتناب برتنا چاہیے۔

۶۔ اس ضمن میں عملی پیش رفت کے لیے ہماری آخری تجویز یہ ہے کہ سارے مسالک مل کر ایک 'اتحاد کمیٹی' یا 'مفاہمت کمیٹی' بنالیں جس میں ہر مسلک اپنے دو تین ثقہ و معتدل مزاج علماء بھیجے۔ یہ کمیٹی بیٹھ کر سنجیدہ علمی کام کرے۔ جو امور سب مسالک میں مشترکہ اور متفقہ ہیں ان کی فہرست تیار کرے اور جو امور مختلف فیہ ہیں ان کا تعین کرے۔ پھر ان مختلف فیہ امور کا جائزہ لے کہ کتنے ان میں اہم یا اصولی ہیں اور کتنے محض فروعی نوعیت کے ہیں۔ پھر ان نکات میں بھی جتنا تفاہم و تقارب ممکن ہو اس کا جائزہ لیا جائے۔ ان شاء اللہ اس طرح کی کوشش سے واضح ہو جائے گا کہ امت میں بلکہ مسالک میں بھی مشترکات اور متفقہ امور بہت زیادہ ہیں اور اختلافات برائے نام ہیں اور بعض لوگوں نے خواہ مخواہ ان کو ہوّا بنایا ہوا ہے۔ جہاں تاویل و تشریح کی گنجائش ہو —— اور ایسا اکثر فروعات میں ہوتا ہے تو اسے جھگڑے کا سبب بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ جب یہ چیزیں مدار ایمان نہیں تو ان پر جھگڑا فضول ہے۔ اگر احادیث کی بنیاد پر ایک فریق نماز میں ہاتھ سینے پر باندھتا ہے اور دوسرا احادیث ہی کی بنیاد پر ذرا نیچے باندھتا ہے تو اس میں جھگڑے والی کیا بات ہے؟ دونوں فریق سنت ہی پر تو عمل کر رہے ہیں اور اتباع رسول ﷺ ہی تو ان کے پیش نظر ہے تو اسے کیوں مدارِ تحزب و تعصب بنایا جائے؟ **هذا من عندنا و العلم عندالله۔**

پاکستانیات

عبدالرشید ارشد☆

قومی یک جہتی کی تلاش

آج پاکستان کے شہریوں کی زبان پر ایک ہی جملہ ہے کہ قوم منتشر ہے، قوم میں اتحاد و یکجہتی مفقود ہے جس کے سبب ملک بحرانوں کے بھنور میں پھنسا بقاء کی جنگ لڑ رہا ہے۔ اخباری کالم ہوں یا ٹی وی چینل ہوں زیر بحث نقطہ یہی دیکھا جاتا ہے کہ ملک کے اندر کون سی ایسی شخصیت ہے جو قومی یکجہتی کی نعمت قوم کی جھولی میں ڈال سکتی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ہر کسی کی نظریں چار سو گھوم پھر کر ناکام لوٹتی ہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ قومی یک جہتی کا فقدان آج کا یا ماضی کے دس پندرہ سالوں کا قصہ نہیں ہے بلکہ:

یہ دو چار دن کی بات نہیں، نصف صدی کا قصہ ہے
اس گھر کی خاک اڑانے میں گھر والوں کا بھی حصہ ہے

تحریک پاکستان کی قیادت کرنے والے مخلص اور محبِ اسلام رہنما قائد اعظم محمد علی جناحؒ کی زندگی کے آخری ایام میں ہی سیاسی خودغرضی نے جنم لیتے پَر پُرزے نکالنے شروع کیے تھے۔ قائدؒ کے مخلص رفقاء کی موجودگی میں ان کی سعی و جہد کے باوجود اتحاد و یکجہتی کی رسی بتدریج ڈھیلی ہوتی چلی گئی اور پاکستان کی خالق کہلوانے والی سیاسی جماعت مسلم لیگ نے انڈے بچے دیتے اس ملک کو رنگارنگ مسلم لیگوں کا 'تحفہ' دیا جو مسلمہ حقیقت کے طور پر آج ہر کسی کے سامنے موجود ہے۔ یوں اتحادِ ملت، انتشارِ ملت میں بدلتا چلا گیا جس کی بدترین شکل آج ہم دیکھ رہے ہیں۔

یہ کیفیت پیدا کرنے میں جہاں بیوروکریسی کے مفادات کا حصہ تھا اور آج بھی ہے وہیں اس کے ذمہ دار سیاستدان اور علماء کرام بھی ہیں۔ خودغرض اور حبِ جاہ کے متوالے سیاست دانوں نے ماضی کے ۶۳ سالوں میں جو جو ''کارہائے نمایاں'' سرانجام دیے یا آج دے رہے ہیں ملکی تاریخ کا اَن مِٹ باب ہیں تو دوسری طرف وارثانِ محراب و منبر جو سیاست دانوں سے بڑھ کر اتحادِ امت کے ذمہ دار تھے اور ذمہ دار ہیں اپنے مسلکی جھگڑوں میں یوں الجھے کہ اتحادِ امت کے حوالے سے ان کی کارکردگی صفر رہی۔ یہ کسی پر تہمت نہیں ہے امر واقعہ ہے۔

اگر سیاستدانوں نے مسلم لیگ کی کوکھ سے بے شمار لیگیں نکالیں تو علماء کرام بھی ان سے پیچھے نہ

☆ جوہر آباد (خوشاب)

رہے کہ پہلے اگر صرف دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور فقہ جعفریہ ''مارکیٹ'' میں تھیں تو پھر ہر مکتبِ فکر نے 'ترقی' کرتے اپنے اپنے گروہ بنالیے کہ اسلام اور اتحادِ امت منہ دیکھتا رہ گیا۔ اگر دیوبندی مسلک دس بارہ گروپوں میں تقسیم ہوا تو بریلوی مکتب فکر بھی پیچھے نہ رہا اور رہے اہل حدیث تو وہ پیچھے کیوں رہتے وہ مرکزی، سلفی اور غربا میں تقسیم ہوئے تو فقہ جعفریہ نے بھی کسر نہ چھوڑی۔ یوں '' وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا '' کے وارثوں کا شیرازہ بکھرتا چلا گیا۔

نظام تعلیم یہ راہ روک سکتا تھا مگر مدارس اپنے اپنے مسلک کے قلعے بن گئے جہاں سے فریق مخالف پر کفر اور الحاد کے فتووں کی گولہ باری ہوتی رہی۔ سکول کالج اور یونیورسٹیاں لارڈ میکالے کی ذریت تیار کرتی رہیں بلکہ اس سے بھی چار قدم آگے بڑھیں اور مستقبل کی نسل کے لیے الحاد و فحاشی کو نصاب تعلیم کا حصہ بنانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ کہیں اردو میڈیم ہے تو کہیں انگلش میڈیم، نصابی کتب کی بھرمار کہ طالب علم کا اپنا وزن کم اور بستے کا وزن زیادہ، مخلوط تعلیمی ادارے۔ غرض تعلیم کو کسی بھی صورت میں نظریۂ حیات کی ہوا نہ لگنے دی گئی اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

نظام عدل ملی انتشار کا راستہ روک سکتا تھا مگر جہاں ایک طرف نظریۂ ضرورت ایجاد کرلیا گیا وہیں دوسری طرف اہلمد سے لے کر جج صاحبان انصاف فروخت کنندگان بن گئے، الاماشاء اللہ۔ ''فروخت'' کے اس دھندے سے بچنے والے ''عدالتی شیڈیول کاسٹ'' ٹھہرے۔ ماضی قریب کی عدلیہ بچاؤ تحریک کی کامیابی سے نیک نام عدلیہ وجود میں آئی تو حکمرانوں اور ان کی معاون بیوروکریسی کو اس کے فیصلے ناگوار گزرنے لگے اور قدم قدم پر عدلیہ کو زچ کرنے کی مہم شروع کردی گئی۔ یہ کشمکش جاری ہے اور بظاہر اس کے ختم ہونے کے امکانات بھی نہیں ہیں کہ اقتدار سر دھڑ کی بازی لگائے راستہ روک رہا ہے۔

گزرتے دنوں میں جب کوئی شخص بقائے پاکستان کے حوالے سے گردوپیش کا جائزہ لیتا ہے، حالات کا تجزیہ کرتا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان پر علامہ اقبالؒ کا یہ شعر آجاتا ہے کہ؎

وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ آج کے حکمران، اسٹیبلشمنٹ کے کارپردازان، سیاستدانوں کی اکثریت اور دینی طبقہ کی اکثریت مستیٔ کردار کے سرمایہ سے محروم ہے۔ کیا ان طبقات میں سے کوئی ہاتھ کھڑا کرکے یہ کہنے کی پوزیشن میں ہے کہ ہاں میں ہوں وہ شخص جس میں یہ صفت موجود ہے۔ ملک

یقیناً ایسے لوگوں سے خالی نہیں ہے مگر ان کے پیچھے چلنا کانٹوں کی راہ پر سفر ہے۔ گنتی کے یہ ''چند دانے'' کثیر عوامی تائید سے محروم ہیں۔

سوال یہ ہے کہ حالات کی اس گھمبیر تا میں کیا مایوسی کو سینے سے لگا کر نشتر کرنے والوں کی طرح ''میٹھی پُرسکون'' موت کو گلے لگا لیا جائے یا اس راستے کو تلاش کر کے اس پر ثابت قدمی سے قدم بڑھاتے منزل پالی جائے۔ اس راستے کی نشاندہی مشکل نہیں ہے۔ اخلاص نیت سے چلنے والوں کے لیے سفر سہل بھی ہے مگر کچھ قوتیں ہیں جو اس راستے کی راہ میں رکاوٹ ہیں یہ یہود ونصاریٰ کے پھیلائے جال ہیں۔

نبی کریم ﷺ کی بعثت سے قبل عرب معاشرہ نہ صرف یہ کہ منتشر تھا بلکہ وہ ہر قسم کے عیوب کی دلدل میں گلے گلے تک دھنسا ہوا تھا۔ انسانی معاشرت کے لیے مطلوب سکون مفقود تھا پھر بقول حضرت عمرؓ ''ہم سینۂ دھرتی پر ذلیل ترین قوم بن چکے تھے اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان فرمایا کہ ہم میں سے ہی ایک نبی مبعوث فرمایا، پھر دوسرا احسان خالق نے یہ فرمایا کہ نبی ﷺ پر قرآن حکیم نازل فرمایا اور تیسرا احسان یہ بھی فرمایا کہ ہمیں اس قرآن کو سینے سے لگانے کی توفیق بخشی۔ اس سعادت نے ہمیں سینۂ دھرتی کی معزز ومعتبر اور مستحکم قوم بنا دیا'' (مفہوم)

گویا قرآن کریم اور صاحبِ قرآن ﷺ کے فرامین مکمل اعتماد کے ساتھ یہ چیلنج قبول کرتے ہیں کہ ہمارے دامنِ رحمت میں آ جاؤ تمہیں عملی زندگی میں مطلوب ہر سکھ، ہر خوشحالی اور ہر طرح کا استحکام میسر آئے گا۔ چالیس سال کا عرصہ مختصر عرصہ نہیں کہلاتا۔ خلافتِ راشدہ کے دور میں جب مکمل شعور و آگہی کے ساتھ قرآن کا نظام حکمرانی نافذ تھا تو نہ صرف خطۂ عرب میں بلکہ خطہ سے باہر کم و بیش ۲۴ لاکھ مربع میل پر عامۃ الناس بلالحاظ مذہب، رنگ ونسل، سُکھ سکون، خوشحالی اور تحفظ سے فیض یاب تھے۔ اسے غیر مسلم مورخین تک نے بلا جھجک تسلیم کیا ہے۔

جس امر کی گواہی اپنے دیں اور اُن سے بڑھ کر پرائے بھی دیں تو عقل سلیم تسلیم کرتی ہے کہ اسی راہ پر چلتے منزل مل سکتی ہے اور اس راستے سے جو جس قدر انحراف کرے گا اسی قدر منزل سے دور ہوتا چلا جائے گا۔ تاریخ کے اوراق اس پر بھی گواہ ہیں۔ مسلمان حکمرانوں نے اپنے اپنے ادوار میں جس قدر اسلام کے زریں نظام حکمرانی کو اپنایا، حکمرانوں اور رعایا نے سُکھ پایا اور جہاں جس قدر انحراف کیا اسی قدر انتشار و بدنظمی اور عدم استحکام ان کا مقدر بنا۔ ماضی سے لے کر حال تک گرد و پیش گزرتے ایام میں مسلمان کہلوانے والی حکومتوں کے حالات کا تجزیہ کر لیجیے۔

کسی نے بڑی ہی خوبصورت بات کہی بلکہ ایک مسلمہ فارمولا ہر کسی کے سامنے رکھ دیا کہ:

"If there is sincerity in purposes, there is beauty in character;
If there is beauty in character, there is harmony in the home;
If there is harmony in the home, there is order in the nation;
If there is order in the nation, there is peace in the world.

یہ کیسا عمدہ فارمولہ ہے کہ اخلاص نیت ہو تو کردار میں نکھار، کردار میں نکھار ہو تو گھر سُکھی، گھر سُکھی ہوں تو قوم منظّم، قوم منظّم ہو تو امن عالم کی ضمانت ملتی ہے۔ اسلام مذکورہ فارمولہ کے پہلے ہی حصہ یعنی کردار میں نکھار کے ضمن میں جو اقدامات تجویز کرتا ہے وہ عبادات کا مؤثر نظام ہے۔ یعنی نماز، روزہ، انفاق فی سبیل اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کی ہر سطح پر ادائیگی یعنی بیوی بچوں، والدین، بہن بھائیوں، اعزہ و اقارب، ہمسائے اور محلّہ دار پھر ہر وہ شخص جس سے کسی بھی طرح کا تعلق ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے بھی معاشرتی پُرسکون زندگی کے لیے ایک نادر فارمولہ امت کو عطا فرمایا کہ" جو تم اپنے لیے پسند کرو وہی دوسروں کے لیے پسند کرو۔ جو تمہیں خود نا پسند ہو وہی دوسروں کے لیے بھی ناپسند کرو" (مفہوم)

ہادیٔ برحق ﷺ کے مذکورہ فرمان کو عدل کی بنیاد بھی کہا جاسکتا ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ یہیں سے عدل جنم لیتا ہے۔ معاشرتی اور ملی سُکھ، سکون، خوشحالی اور تحفظ کا ضامن یہی نظام عدل ہے۔ اسلامی تاریخ تو عدل و انصاف کی مثالوں کی امین ہے ہی، برطانیہ کی مثال لیتے ہیں جو ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں جب جرمنوں کی کارپٹ بمباری سے برطانیہ لہولہو تھا، شہر کھنڈر بن رہے تھے تو چرچل وزیر اعظم تھے۔ کسی صحافی نے چرچل سے کہا کہ آج کل آپ بہت پریشان اور رنجیدہ ہوں گے؟ جواب مختلف تھا! کیا برطانیہ کی عدالتیں انصاف نہیں کررہیں؟"

چرچل کا کہنا تھا کہ اگر برطانوی عدالتیں انصاف کررہی ہیں تو برطانیہ کا مستقبل تاریک نہیں ہوسکتا، مایوسی کی کوئی وجہ نہیں، پریشانی کے بادل چھٹ جائیں گے اور پھر تاریخ شاہد ہے کہ وہی تباہ حال برطانیہ کتنی جلد اپنے قدموں پر کھڑا ہوگیا۔ عدل انسانوں کے مابین معاشرتی اُونچ نیچ کو دیکھے بغیر اپنا فیصلہ سناتا ہے۔ تاریخ اسلام میں کتنی ہی مثالیں ملتی ہیں جب خلیفۂ وقت مدعی کے ساتھ بطور جوابدہ قاضی کے سامنے کھڑا ہوا یا دوسری مؤثر شخصیات عدالتی فیصلوں کے سامنے جھک گئیں۔ جس قوم نے، جس معاشرے نے عدل کو دل سے تسلیم کرلیا وہ ہمیشہ کامیاب و کامران رہا۔

یہ عدل ہی ہے جو معاشی عدم استحکام کا، جو معاشی استحصال کے سبب پیدا ہوتا ہے، قلع قمع کرتا ہے۔

آجر اور اجیر کے حقوق کا تحفظ، ملاوٹ اور ناجائز منافع خوری کا خاتمہ، رشوت اور دیگر حرام ذرائع سے لوٹ کھسوٹ کے آگے بند باندھنا یہ عدل وانصاف کے لیے قائم عدلیہ، ہر سطح کی عدلیہ، کی ذمہ داری ہے اور یہی عدلیہ جو دوسرے جرائم کے خاتمہ میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ قرآن حکیم نے عدلیہ کا کام بہت آسان کردیا کہ بعض گھناؤنے جرائم کی سزائیں تجویز ہی نہیں کیں بلکہ طریقہ تنفیذ تک طے کردیا مثلاً قتل کے بدلے قتل، کان کے بدلے کان، ناک کے بدلے ناک وغیرہ اور سزا عوام کے سامنے دی جائے۔

اسلام یا قرآن حکیم کی تجویز کردہ سزاؤں اور طریق تنفیذ کو ظالمانہ کہنے والے یہ حقیقت یکسر فراموش کرجاتے ہیں کہ قرآنی سزاؤں اور طریقہ تنفیذ کے سبب معاشرہ میں جرائم آٹے میں نمک کی سطح سے بھی نیچے آجاتے ہیں۔ سعودی عرب اس حقیقت کی زندہ مثال ہے۔ امریکہ جیسے مہذب کہلوانے والے ملک میں ایک آدھ گھنٹہ بجلی بند ہونے پر جو جرائم امریکی میڈیا میں رپورٹ ہوئے تھے وہ سعودیہ میں شاید دس بارہ سال میں نہیں ہوتے۔ پاکستان میں ایک ہفتہ میں ریکارڈ کیے جانے والے جرائم بھی سعودیہ کے ایک سال میں ہونے والے جرائم سے زیادہ ہیں صرف اس لیے کہ عدالت لمبی سماعت نہیں کرتی اور سزا عوام کے سامنے نافذ ہوتی ہے۔

ملی یک جہتی کا ضامن صرف اور صرف قرآن ہے جس کا پیغام ہے 'وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا' اور پھر یہ بھی فرمادیا بلکہ یاد دلادیا 'وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا'۔۔ اتحاد و بھائی چارے کا راستہ دکھا کر پھر نافرمانی کرنے والوں کے حشر سے بھی آگاہ فرمادیا 'وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَ اخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَیِّنٰتُ وَ اُولٰٓىٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ'۔ اس آیت کو توجہ سے پڑھ لیجیے۔ رک کر غور کیجیے اور اپنے موجودہ ذاتی، سماجی و معاشرتی اور حکومتی سطح کے معاملات کا تجزیہ کیجیے تو ہر دکھ، ہر غم اور ہر نقصان کا سبب کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہ رہے گی۔

حاصل کلام یہ کہ یہ صرف قرآن وسنت ہے جو قومی یکجہتی کی ضمانت فراہم کرسکتا ہے۔ قرآن و سنت کا پیغام عوام وخواص تک پہنچانے کے مکلّف انبیاء علیہم السلام کے وارث علماء کرام ہیں اور ان کے ذریعے یہ کام مؤثر انداز میں صرف اس وقت ہوسکتا ہے جب وہ خود اپنی صفوں میں اختلاف رائے کی رحمت کو تفرقہ سے بچاتے ہوئے اور اپنی صفوں میں اتحاد و یکجہتی کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے یہ اہم ترین خدمت سرانجام دیں گے۔

ڈاکٹر انعام اللہ☆

صُفّہ ۔ مسلم تعلیم کا رول ماڈل

تحریک اصلاح تعلیم نے جولائی ۲۰۱۱ء میں جو دو روزہ قومی تعلیمی کانفرنس منعقد کی اس کا ایک بہت اہم موضوع ایک اسلامی سکول کے رول ماڈل کا تصور (وژن) تھا۔ جاپانی، ترکی اور پاکستانی موجودہ ملغوبہ نظامِ تعلیم کے بارے میں سیر حاصل گفتگو سے حاضرین متاثر ہوئے لیکن کوئی ایک جامع اور واضح ماڈل سامنے نہ آسکا۔

راقم کی نظر میں اگر انسانوں کے لیے رول ماڈل (اسوۂ حسنہ) نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی ہے تو انہی کا باضابطہ تعلیمی ادارہ صُفّہ ہی اسلامی سکولوں کے لیے رول ماڈل ہونا چاہیے۔ نبی اکرم ﷺ کے اخلاق اور غزوات کا تذکرہ تقریروں اور تحریروں میں بہت ملتا ہے لیکن صُفّہ کے بارے میں معلومات خصوصاً آج کے تصورِ تعلیم کے تناظر میں، بہت محدود ہیں۔ جس شد و مد سے ترکی اور جاپانی ماڈل کا ذکر کیا گیا، یا آکسفورڈ کی پیروی یا نا پیروی کا رونا رویا گیا، اتنی قوتیں صُفّہ کو کھنگالنے میں صَرف ہو جائیں تو بہت ساری حقیقتیں آشکار ہو سکتی ہیں اور کوئی عملی صورت سامنے آسکتی ہے۔ آج اس دور میں معلومات کا سیلاب ہماری مٹھی میں ہے جس کے چند بٹن دبا کر قیمتی لائبریریوں سے استفادہ بھی کیا جا سکتا ہے اور دورِ رسول ﷺ میں جھانک کر دیکھا بھی جا سکتا ہے۔

ہم اپنے لوگوں میں جمود کا ذکر کرتے ہیں جبکہ صفّہ نے قرآن کو مرکز و محور بنا کر اس دور کے نوجوانوں میں روحِ انقلاب پھونک دی اور ایسی تحریک پیدا کی جس کے نتیجے میں فتوحات، ترقی اور تحقیق کے دروازے مسلمانوں پر کھل گئے۔ صُفّہ کے طالب علموں نے جہانگیری بھی کی اور جہانبانی بھی، جہاں بینی بھی اور جہاں آرائی بھی۔ ایک طرف وقت کے بہترین گوریلا دستے بھی وجود میں آئے اور عمدہ استخبارات بھی۔ وہ طبیب بھی تھے اور بغداد اور کوفہ کی بستیوں کے مہندس بھی۔ پھر انہی کے تربیت یافتہ لوگوں نے دنیا کو تجارت بھی سکھائی (ماسٹر آف بزنس ایڈمنسٹریشن)۔ یہ طاقتور تحریک اس وقت سست روی کا شکار ہوئی جب خلافت میرٹ کی بجائے موروثیت کا شکار ہوئی اور عجم کے بھاری بھرکم علوم (فلسفہ، منطق وغیرہ) کی آمیزش سے غیر نافع علوم وجود میں آنے لگے۔ تعلیمی ادارے درباری انداز اور اقربا پروری کا شکار ہوئے اور بادشاہوں کے درباروں میں ذہنی عیاشی کے لیے مناظروں اور الفاظ کے ہیر پھیر سے بحث مباحثوں کو رواج دیا گیا (اصحاب کہف کے کتے کے

☆ایم بی بی ایس۔ ایم آر سی پی (برطانیہ) نگران الکلیۃ الاسلامیہ، سوجنڈہ، اٹک

رنگ اور کوے کی حرمت یا حلّت)۔ فرعون کے قدیم طریقے پرعوام کوتقسیم کرنا اور اقتدار کوطول دینا ذہانت ٹھہرا۔ ایسی ذہانت نے مسلمانوں کو حاسد، بزدل اور کینہ پرور بنادیا۔ یوں طاقت کے نئے مراکز ایک ایک کر کے ہاتھوں سے جاتے رہے۔

اب اگرکوئی جماعت یہ علم لے کراٹھتی ہے کہ اس نے اصلاح کرنی ہےتو وہ پھر پہلوں ہی کے طریق پر ہوگی (قول امام مالکؒ) ہمارے پیش نظر نہ تو آکسفورڈ یا ورجینیا کی یونیورسٹیاں ہوں اور نہ ہی غرناطہ اور بغداد کی بھاری بھرکم جامعات جو تاتاری اور صلیبی یلغار کے سامنے مٹی کا ڈھیر ثابت ہوئیں۔ ہمارے لیے ہر دور میں صُفّہ ہی مشعل راہ ہوگا جس کی نفسیات یا ذہنیت کوجذب کر کے دور رسولﷺ کی نقل کی جائے۔ دور رسولﷺ کے بعد کے علمی اثاثے سے استفادہ ضرور کیا جائے لیکن اسے رول ماڈل کی جگہ نہ دی جائے۔

صُفّہ کے چند اوصاف

۱۔ مقصدیت: اللہ کی پہچان، بطور خلیفہ دنیا کا نظام چلانے کے لیے مہارتیں اور علوم اور ان سب کو استعمال میں لانے کا مقصد عبادت اور بندگی۔

۲۔نفسیات: خودی،فقراورعشق (تفصیل کلام اقبال میں ہے)

۳۔ علم غیر نافع سے اجتناب: خود نبی اکرمﷺ نے علم غیر نافع سے پناہ مانگی۔ ہمارے تعلیمی اداروں بشمول پیشہ وارانہ اداروں میں ۸۰ فیصد معلومات غیر مفید ہوتی ہیں (Non applicable/Meaningless Knowledge) اور چھوٹے بچوں کے لیے بھاری بھرکم بستے تو قابل سزا جرم ہونا چاہیے۔

۴۔ سماعت، بصارت اور فؤاد کی مسئولیت: سائنس اور حکمت بھی تو یہی ہے یعنی ایسا علم جو مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر حاصل کیا گیا ہو۔

۵۔ کائنات پرغور وفکر کی حوصلہ افزائی: جب نیوٹن اپنے سر پر سیب گرنے کی گتھیاں سلجھا رہا تھا تو ہماری ذہانتیں بادشاہوں کو خوش کرنے کے لیے 'اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی' پر صَرف ہورہی تھیں۔

۶۔ قدامت پرستی یا شخصیت پرستی کے بجائے حقیقت پسندی: کہ نبی اکرمﷺ نے کبھی اپنی ذات کومقصود نہیں بنایا بلکہ مخلوق کو خالق کے ساتھ جوڑنے کا ذریعہ بنایا۔ آباء واجداد کی روایتی باطل دانش کوچیلنج کیا اور کروایا۔

۷۔ طریقۂ تعلیم: جسے آج سقراطی طریقہ کہتے ہیں۔ طالب علم کی ذہنی ساخت اوراستعداد کے مطابق

شہری یا بدوی، بحث جیتنے کے لیے استدلال کی قوت۔

۸۔ معیار تعلیم: تعلیم مفت اور اس کے مواقع مساوی، امت کے چھوٹے سے لے کر بڑے آدمی کے بچے کے لیے۔ بعد میں بادشاہت نے مختلف معیارات کے تعلیمی اداروں کو جنم دیا۔

۹۔ یکساں عدل و احتساب

۱۰۔ دین و دنیا کی عدم تفریق

البرھان: بلاشک وشبہ و بلا اختلاف صُفّہ سب مسلمانوں کے لیے رول ماڈل ہے لیکن قرآن وسنت سے قطع نظر چونکہ علوم وفنون میں ترقی ہوتی رہتی ہے اور زمان ومکان کی تبدیلی بھی ان پر اثر انداز ہوتی ہے اور دین اس تبدیلی کا لحاظ کرتا ہے، انکار نہیں کرتا جیسا کہ اجتہاد کے ادارے سے واضح ہے لہٰذا آج عصری حوالے سے نئے تعلیمی رول ماڈل کی بات کچھ ایسی غلط بھی نہیں۔

مذکورہ کانفرنس میں بلاشبہ زیادہ تر گفتگو اصلاح تعلیم کے حوالے سے ہوئی اور رول ماڈل تعلیمی ادارے کا وژن زیادہ زیر بحث نہیں آیا۔اس کی کسر ان شاء اللہ اگلی کسی کانفرنس میں پوری کردی جائے گی۔ تاہم تحریک اصلاح تعلیم کے ہاں نئے تعلیمی رول ماڈل کا واضح تصور موجود ہے، دیکھیے تفصیل کے لیے راقم کی کتاب 'ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل' میں مضمون 'ایک نئے تعلیمی ماڈل کی ضرورت' اور دوسرے کئی مضامین۔ امین

وَ اعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوۡا

(آلعمران ۳:۱۰۳)

ملی مجلس شرعی کی طرف سے 'اتحاد امت کانفرنس'

مورخہ 24 ستمبر 2011ء کے مندوبین کو خوش آمدید

آج کا چیلنج یہ ہے کہ علماء کرام فروعی اختلافات سے صرف نظر کرتے ہوئے نہ صرف خود متحد ہو جائیں بلکہ مسلم معاشرے اور امت کو بھی متحد کریں۔

ڈاکٹر محمد امین

ناظم اعلیٰ، ملی مجلس شرعی

سید ابوالحسن علی ندویؒ

مغربی تعلیم کا زہر

اہل نظر جانتے ہیں کہ انسانی وجود کی طرح نظامِ تعلیم بھی اپنی ایک روح اور ضمیر رکھتا ہے۔ یہ روح اور ضمیر دراصل اس کے واضعین و مرتبین کے عقائد و نفسیات، زندگی کے متعلق ان کے نقطۂ نظر، مطالعۂ کائنات و علمِ اسماء کی اساس و مقصد اور ان کے اخلاق کا عکس اور پرتو ہوتا ہے، جو اس نظام کو ایک مستقل شخصیت، ایک مستقل روح اور ضمیر عطا کرتا ہے۔ یہ روح اس کے پورے ڈھانچہ، ادب و فلسفہ، تاریخ، فنونِ لطیفہ، علوم عمرانیہ، حتیٰ کہ معاشیات و سیاسیات میں اس طرح سرایت کر جاتی ہے کہ اس کو اس سے مجرد کرنا بڑا کٹھن کام ہے۔ یہ بہت بڑے صاحبِ اجتہاد اور اعلیٰ تنقیدی صلاحیت رکھنے والے کا کام ہے کہ اس کے مفید اجزا کو مضر اجزا سے الگ کر کے ''خذ ما صفا ودع ماکدر'' پر عمل کرے، اور اصل و زوائد میں فرق کر کے اس کا جوہر اور اس کی روح لے لے۔ طبعی و تجربی (سائنٹفک) علوم میں یہ کام بہت زیادہ مشکل نہیں، لیکن ادب و فلسفہ اور علوم عمرانیہ میں یہ کام بڑا مشکل اور نازک ہے، خاص طور پر جب کوئی ایسی قوم جو متعین و محکم عقائد، مستقل فلسفۂ حیات اور مسلکِ زندگی، اپنی ایک مستقل تاریخ (جو محض ماضی کا ایک ملبہ (Debris) نہیں بلکہ آئندہ نسلوں کے لیے نشانِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے اور جس کے لیے پیغمبر کی شخصیت اور اس کا زمانہ آئیڈیل کی حیثیت رکھتا ہے، جب کسی ایسی قوم یا دور کا نظامِ تعلیم قبول کرتی ہے، جو اساس و بنیاد اور مثال و معیار میں اس سے مختلف بلکہ اس کی ضد واقع ہوئی ہے، تو قدم قدم پر تصادم ہوتا ہے، اور ایک کی تعمیر دوسرے کی تخریب، اور ایک کی تصدیق دوسرے کی نفی و تردید، ایک کا احترام دوسرے کی تحقیر کے بغیر ممکن نہیں، ایسی حالت میں پہلے ذہنی کشمکش، پھر عقائد میں تزلزل، پھر اپنے دین سے انحراف اور قدیم افکار و اقدار کے بجائے جدید افکار و اقدار کا آنا ضروری ہے۔ کسی قسم کی خوش نیتی، ضمیر کی خلش، سرپرستوں کی خواہش، خارجی و جزائی انتظامات اس امر کے وقوع میں حارج نہیں ہو سکتے، اس کی رفتار کو سست اور اس کے وقوع کو مؤخر کر سکتے ہیں، ملتوی نہیں کر سکتے۔ درخت اگر اپنے طبعی نظام سے نشوونما پائے تو وہ اپنے برگ و بار ضرور پیدا کرے گا اور وقت پر پھل لائے گا۔ انسانوں کو اس کا اختیار ہے کہ درخت نہ لگائیں یا اس کو پانی نہ دیں یا جب تیار ہو تو اس کی ہستی کو ختم کر دیں مگر اس کا اختیار

نہیں کہ ایک توانا وتندرست، سرسبز وشاداب درخت کو اپنے نوعی وجود وشخصیت کے اظہار اور وقت پر پھول لانے سے روک سکیں۔

یہی معاملہ مغربی نظامِ تعلیم کا ہے وہ اپنی ایک روح اور اپنا ایک منفرد ضمیر رکھتا ہے جو اپنے منصفین ومرتبین کے عقیدہ و ذہنیت کا عکاس، ہزاروں سال کے طبعی ارتقاء کا نتیجہ، اہل مغرب کے مسلمہ افکار و اقدار کا مجموعہ اور ان کی تعبیر ہے۔ یہ نظامِ تعلیم جب کسی اسلامی ملک یا مسلمان سوسائٹی میں نافذ کیا جائے گا تو اس سے ابتداءً ذہنی کشمکش، پھر اعتقادی تزلزل، پھر ذہنی اور بعد میں (الا ما شاء اللہ) عینی ارتداد قدرتی ہے۔ ایک سلیم الطبع مغربی مبصر (محمد اسد، سابق Leopold Weiss) نے جس کو مغرب کے نظامِ تعلیم اور مشرق میں اس کے نتائج کا وسیع تجربہ ہے صحیح لکھا ہے:

''ہم نے گذشتہ صفحات میں اس بات کی تائید میں چند اسباب و دلائل پیش کیے ہیں کہ اسلام اور مغربی تمدن جو زندگی کے دو متضاد نظریوں پر قائم ہیں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے۔ جب واقعہ یہ ہے تو ہم کیسے اس بات کی توقع کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی نئی نسل کی مغربی بنیادوں پر ایسی تعلیم و تربیت (جو مجموعی طور پر یورپ کے علمی و ثقافتی تجربوں اور ان کے تقاضوں پر مبنی ہے) مخالفِ اسلام اثرات سے پاک ہوسکتی ہے''۔

ہماری اس توقع کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں اگر ہم بعض ایسے غیر معمولی حالات کا استثناء کر دیں جن میں کسی انتہا درجہ کے روشن اور فائق دماغ کے لیے ایسا ممکن ہوا کہ وہ اپنے درسی مضامین سے متاثر نہیں ہوسکا تو بھی عام اصول یہی رہے گا کہ مسلمانوں کی نئی نسلوں کی مغربی تعلیم و تربیت ان کو اس قابل نہیں رکھے گی کہ وہ اپنے کو اس مخصوص ربانی تمدن کا نمائندہ سمجھیں جس کو اسلام لے کر آیا۔ اس میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں کہ ان روشن خیالوں کے اندر دینی عقائد برابر مضمحل ہوتے جا رہے ہیں جنہوں نے مغربی بنیادوں پر نشوونما حاصل کیا ہے۔(*Islam at the Crossroads* P.83,84)۔

پھر وہ نصابِ تعلیم کے مختلف اجزاء کے متعلق علیحدہ علیحدہ گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مغربی ادبیات کی تعلیم کا انجام اس شکل میں جو اس وقت اکثر اسلامی اداروں میں رائج ہے اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اسلام مسلمان نوجوانوں کی نگاہ میں ایک اجنبی چیز بن جائے، یہی بات بلکہ اس سے بہت زیادہ یورپ کے فلسفۂ تاریخ پر صادق آتی ہے، اس لیے کہ یورپ کا قدیم نظریۂ تاریخ یہ ہے کہ دنیا میں دو ہی گروہ ہیں، رومی (Romans) اور وحشی (Barbarians) تاریخ کو اس طرح پیش کرنے کا ایک پوشیدہ مقصد ہے وہ یہ کہ یہ ثابت کیا جائے کہ مغربی اقوام اور ان کا تمدن ہر اس چیز سے زیادہ

ترقی یافتہ ہے جس کا اس وقت تک وجود ہوا یا آئندہ کبھی دنیا میں وجود ہوسکتا ہے اس سے اہلِ مغرب کے حصولِ اقتدار کی کوشش اور مادی طاقت کا اخلاقی جواز پیدا ہوتا ہے اور وہ حق بجانب ثابت ہوتی ہے۔(*Islam at the Crossroads* P 95)

آگے چل کر وہ کہتے ہیں:

''تاریخ کی اس طرح کی تعلیم نوجوانوں کے دماغ میں اس کے علاوہ کوئی اوراثر نہیں چھوڑسکتی کہ وہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہوں اور اپنی پوری ثقافت (کلچر) اور اپنے مخصوص تاریخی عہد کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگیں اور مستقبل میں ان کے لیے ترقی و خدمت کے جو وسیع اور روشن امکانات ہیں ان کا انکار کرنے لگیں۔ اس طرح وہ ایک ایسی منظّم تربیت حاصل کرتے ہیں جس میں اپنے ماضی اور اپنے مستقبل کی حقارت پورے طور پر کارفرما ہوتی ہے ان کے نزدیک ان کے مستقبل کی کامیابی صرف اس میں ہے کہ وہ مغربی معیار کے مطابق اور مغرب کے افکار و اقدار سے ہم آہنگ ہوں'' (*Islam at the Crossroads* P 97) آگے چل کر وہ بڑی جرأت کے ساتھ کہتے ہیں: ''اگر مسلمانوں نے زمانۂ ماضی میں علمی تحقیق وتفکر کے کام کونظر انداز کر کے غلطی کی تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس غلطی کی اصلاح کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ مغرب کا نظامِ تعلیم جوں کا توں قبول کرلیں ہماری پوری تعلیمی پسماندگی اور علمی بے بضاعتی اس مہلک اثر کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی جو مغرب کے نظامِ تعلیم کی اندھی تقلید، اسلام کی مخفی دینی طاقتوں پر ڈالے گی۔ اگر ہم اسلام کے جوہر کو یہ سمجھ کر محفوظ رکھنا چاہتے ہیں کہ وہ ایک مستقل علمی وتہذیبی عنصر ہے تو ہمارے لیے ضروری ہوگا کہ ہم مغربی تمدن کے ذہنی ماحول اور فضا سے دور دور رہیں، وہ فضا جو ہمارے معاشرہ اور ہمارے میلانات پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے تیار ہے۔ مغرب کے طور وطریق اور اس کے لباس ومظاہرِ زندگی کو قبول کر لینے سے مسلمان آہستہ آہستہ مغرب کے نقطۂ نظر کو قبول کرنے پر مجبور ہوجائیں گے کہ خارجی مظاہر کی تقلید اس ذہنی رجحان تک پہنچا دیتی ہے۔(*Islam at the Crossroads* P 100)۔

اس نتیجہ کی پیشین گوئی ان بعض مفکرین نے بھی کی ہے جوایشائی اورمشرقی ممالک میں اس نظامِ تعلیم کو رواج دینے والے تھے مشہورانگریز اہلِ قلم لارڈ میکالے نے جو۱۸۳۵ء میں اس تعلیمی کمیٹی کے صدر تھے جو یہ طے کرنے کے لیے بیٹھی تھی کہ ہندوستانیوں کومشرقی زبانوں کی جگہ انگریزی زبان میں تعلیم دی جایا کرے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا: ''ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں

رعایا کے درمیان ترجمان ہو۔ یہ ایسی جماعت ہونی چاہیے جوخون اوررنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہومگر مذاق اور رائے الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو'(تاریخ التعلیم از میجر باسو،صفحہ ۸۶)۔

یہ مغربی نظامِ تعلیم درحقیقت مشرق اور اسلامی ممالک میں ایک گہرے قسم کی لیکن خاموش نسل کشی(Genocide) کے مترادف تھا۔عقلاءِ مغرب نے ایک پوری نسل کو جسمانی طور پر ہلاک کرنے کے فرسودہ اور بدنام طریقہ کو چھوڑ کر اس کو اپنے سانچہ میں ڈھال لینے کا فیصلہ کیا اور اس کام کے لیے جابجا مراکز قائم کیے جن کو تعلیم گاہوں اور کالجوں کے نام سے موسوم کیا۔اکبرالہ آبادی مرحوم نے اس سنجیدہ تاریخی حقیقت کو اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں بڑی خوبی سے ادا کیا ہے،ان کا مشہور شعر ہے ۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

ایک دوسرے شعر میں انہوں نے مشرقی ومغربی حکمرانوں کا فرق اس طرح بیان کیا ہے:

مشرقی تو سرِ دشمن کو کُچل دیتے ہیں
مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

اس کے کئی برس بعد اقبال نے (جنہوں نے اس نظامِ تعلیم کا خود زخم کھایا تھا) اس حقیقت کو زیادہ سنجیدہ انداز میں اس طرح پیش کیا۔

مباش ایمن از اں علمے کہ خوانی
کہ از وے روحِ قومے می تواں کشت (ارمغان حجاز صفحہ۱۴۴)

تعلیم جو قلبِ ماہیت کرتی ہے اور جس طرح ایک سانچہ توڑ کر دوسرا سانچہ بناتی ہے،اس کو بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو ہوجائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر
(ضرب کلیم)

وہ مغرب کے اس نظامِ تعلیم کو دین واخلاق کے خلاف ایک سازش قرار دیتے ہیں ۔

اور یہ اہل کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین ومروت کے خلاف (ضرب کلیم)

پروفیسر شاہد رشید☆

ٹیکنالوجی اور اقدار

ڈاکٹر عبدالوہاب سوری صاحب کی گفتگو کا ایک جائزہ

ڈاکٹر عبدالوہاب سوری صاحب کی فاضلانہ گفتگو کے دو نکات خاص طور پر اہم ہیں: ایک تو یہ کہ ٹیکنالوجی value-neutral نہیں ہوتی بلکہ value-laiden ہوتی ہے اور دوسرے یہ کہ آئیڈیالوجی کی بنیاد پر ٹیکنالوجی کو develop نہیں کیا جاسکتا۔ آئیڈیالوجی بالآخر Technological Development کے راستے میں رکاوٹ بنتی ہے۔ یہاں سوری صاحب یہ نتیجہ اخذ کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ اسلام بھی چونکہ ایک آئیڈیالوجی ہے لہٰذا اسے Technological Development کے ساتھ ہم آہنگ نہیں کیا جاسکتا۔

پہلے نکتے کا نتیجہ بھی یہ نکلتا ہے کہ مغرب سے آنے والی ٹیکنالوجی مغربی اقدار سے لبریز ہے اور اسے Islamize کرنے کی ساری کوششیں نہایت سادہ بلکہ احمقانہ ہیں۔ ٹیکنالوجی کو مغربی اقدار سے جدا کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس سلسلے میں جو بات سوری صاحب کی گفتگو میں غیر واضح ہے وہ یہ ہے کہ ان اقدار کا سرچشمہ کیا ہے؟ ٹیکنالوجی کے ساتھ جو اقدار وابستہ ہیں کیا ٹیکنالوجی ان اقدار کا source ہوتی ہے؟ ٹیکنالوجی اور اقدار کے اس تعلق کو یوں ماڈل کیا جاسکتا ہے:

:tings\8822

میری رائے میں یہ بات درست نہیں ہے۔ کسی سماج میں پیدا ہونے والی ٹیکنالوجی اس سماج کی تہہ میں کارفرما فلسفۂ علم اور اس کے مخصوص ورلڈ ویو کی پیداوار ہوتی ہے اور یہی ورلڈ ویو اس معاشرے کی سماجی اقدار بھی تخلیق کرتا ہے۔ گویا اقدار اور ٹیکنالوجی میں تعلق کچھ یوں ہے:

ings\882

ٹیکنالوجی یقیناً Value-Laiden ہے لیکن اس لیے کہ یہ بھی اسی ورلڈ ویو کا نتیجہ ہے جو سماجی اقدار کے پس پردہ کارفرما ہے۔ اسلام اور مغرب کا اختلاف ورلڈ ویو کا اختلاف ہے۔ لہٰذا ایک اسلامی تہذیب میں پیدا ہونے والی ٹیکنالوجی پر اسلامی اقدار کی لازماً چھاپ ہوگی جیسے مغربی تہذیب میں

☆ صدر شعبۂ سوشیالوجی، ایف سی کالج یونیورسٹی لاہور

پیدا ہونے والی ٹیکنالوجی پر مغربی اقدار کی چھاپ ہے۔لیکن سوری صاحب کی بات اس سے کچھ زیادہ ہے۔ وہ بہت generalized اور sweeping statement دیتے دکھائی دیتے ہیں کہ "Technology as such" کسی بھی آئیڈیالوجی اور نتیجتاً اسلام کے ساتھ متصادم ہے۔ اس کے لیے وہ دلیل یہ دیتے ہیں کہ سائنس جب بھی ٹیکنالوجی میں Translate ہوتی ہے تو اس کا واحد مقصد سرمائے (capital) میں اضافہ ہوتا ہے اور اس طرح سرمایہ دارانہ نظام اور capital maximization ہی ٹیکنالوجی کی ترقی کا واحد محرک قرار پاتا ہے۔ ہر ایسا نظریہ اور نظام افکار جو انسانی سماج کی تشکیل وتعمیر کی کوئی منظم کوشش کرے گا اور سرمائے کی بے لگام بڑھوتری پر پابندی لگائے گا وہ ٹیکنالوجی کی ترقی میں رکاوٹ ثابت ہوگا۔ اپنے اس thesis کو ثابت کرنے کے لیے سوری صاحب سویت انقلاب کی مثال پیش کرتے ہیں۔

اس ساری گفتگو کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ صرف ''مغربی ٹیکنالوجی'' نہیں بلکہ ٹیکنالوجی بجائے خود (Technology per se) معتوب اور روحِ اسلام سے متصادم ٹھہرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محترم جامعی صاحب نے بھی اپنے تمہیدی کلمات میں اسلامی عہد میں پیدا ہونے والی سائنس اور ٹیکنالوجی کو ہدف تنقید بنایا تھا۔

سوری صاحب کا نقطۂ نظر جہاں ضرورت سے زیادہ قنوطیت لیے ہوئے ہے کہ ٹیکنالوجی کی ترقی کو کسی اصول اور ضابطے کا پابند نہیں بنایا جاسکتا وہاں ان کا مقدمہ بہت over-generalized ہے۔ ٹیکنالوجی کی ترقی کو لازمی طور پر سرمایہ دارانہ اقدار کے تابع اور ہر طرح کی آئیڈیالوجی سے آزاد قرار دینے کے لیے سوشلسٹ ماڈل کی مثال ناکافی ہے۔ راقم الحروف کی رائے میں ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اسلامی فکر وفلسفے کی بنیاد پر اسلام کا فلسفۂ سائنس مرتب کریں۔ اس فلسفۂ سائنس کی بنیاد پر تشکیل پانے والی سائنس ایسی ٹیکنالوجی کی اساس فراہم کرسکتی ہے جو اسلام کے مزاج سے مطابقت رکھتی ہو۔ **واللہ اعلم بالصواب۔**

ڈائیلاگ

اسلام، مسلمان اور سائنس وٹیکنالوجی

برادرم مکرم جناب ڈاکٹر محمد امین صاحب!

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے البرہان جولائی ۲۰۱۱ کے ص ۴۰ پر میری گفتگو میں ایک جملہ درج ہے حتیٰ کہ مولانا مودودیؒ جب یہ کہتے ہیں کہ اسلام کا عروج ہوگا تو جہاد اور اجتہاد کے ذریعے ہوگا'' یہ سہواً کلام ہے اصلاً یہاں نام مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کا آنا چاہیئے ۔یہ بات درست ہے کہ یہ تاریخی جملہ مولانا مودودیؒ نے ادا کیا لیکن اس جملے کی تشریح جناب مولانا علی میاںؒ کے قلم سے ان کی معروف کتاب ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کا عروج وزوال کا اثر'' کے ذریعے سامنے آئی ۔مجلسِ نشریاتِ اسلام کراچی کی اشاعت کے صفحہ ۱۹۱ پر سرخی ہے :

جہاد اور اجتہاد کا فقدان------ جہاد کی تشریح میں صفحہ ۱۹۴ پر علی میاں لکھتے ہیں'' ان کی تیاری پوری اور ان کی قوت مکمل ہو ان کے پاس لوہے کو کاٹنے کے لئے لوہا بلکہ فولاد ہو وہ کفر کا مقابلہ ان تمام وسائل اور سامان سے کریں جو ان کی دسترس میں ہو جس کا انسان انکشاف کرسکا ہو اور جہاں تک انسان کے علم کی رسائی ہو۔ص ۱۹۵ پر اجتہاد کی تشریح میں لکھتے ہیں: نیز وہ اتنی ذکاوت ومستعدی اور علم رکھتے ہوں اور محنت کرنے کو تیار ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات میں جو طبعی قوتیں پیدا کی ہیں اور زمین میں دولت اور قوت کے جو سرچشمے اور دفینے رکھ دیئے ہیں ان سے کام لے سکیں اور ان کو اسلام کے مقاصد کے لئے معتبر بنائیں بجائے اس کے کہ اہلِ باطل ان کو اپنی خواہشات کے حصول کے لئے استعمال کریں اور زمین میں سربلندی اور فساد کے لئے ان سے مدد لیں۔ص ۲۲۰ پر حضرت والا نے خالدہ ادیب خانم کی ایک تحریر کے حوالے سے ترکوں کے زوال کا تجزیہ کیا ہے تو اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ'' مگر یہ سادگی اور وسعتِ نظر جوئی علمی تحقیقات کے لئے اس قدر ساز گار تھی مسلمانوں میں زیادہ دن نہیں رہنے پائی۔علماء ومتکلمین نے نہ صرف فقہ بلکہ الٰہیات کو بھی اصول وضوابط کی زنجیروں میں جکڑ دیا یعنی تحقیق اجتہاد کا دروازہ بند ہوگیا۔عثمانیوں کے یہاں علماء نے علومِ جدیدہ کی تحصیل کی طرف توجہ نہ دی بلکہ نئے خیالات کو اپنی قلم رو میں داخل ہی نہیں ہونے دیا۔ جب تک ملّتِ اسلامی کی تعلیم کی باگ ان کے ہاتھ میں تھی کیا مجال کہ کوئی نئی چیز قریب آنے پائے۔نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے علم پر جمود طاری ہو کر رہ گیا''۔ان دلائل میں بہت سے قرآن کی نصوص، اسلامی تاریخ وتہذیب،

علمیت، قرآن کے بیان کردہ قانون عروج و زوال کے صریحاً منافی ہیں۔ اجتہاد کا جو مفہوم علی میاں نے بیان فرمایا ہے اسلامی علمیت کا ذخیرہ اس تشریح سے خالی ہے۔ کیا علم علوم عقلیہ کو کہتے ہیں؟ یہ بھی عجیب بات ہے۔ یہ تو محض فنون [Art & Craft] یا محض علوم آلیہ ہیں محض علم نہیں۔ ایک جگہ علی میاں نے ایمان اور علم کی بات کی ہے اور یہاں علم سے مراد صرف عقلی علوم لئے ہیں یعنی ایمان علم نہیں ہے علم ایمان سے الگ ہے اور ایمان اگر عقلی علوم کی قوت سے محروم ہے تو وہ کامل نہیں ہے۔ اس دلیل کی زد اصحاب الاخدود اور اصحاب کہف پر بھی پڑتی ہے۔ غزوۂ بدر، خندق میں مسلمانوں کو فتح ہوئی تو کیا اسباب کی وجہ سے ہوئی؟ غزوۂ حنین اور احد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تو کیا اسباب کی کمی کی وجہ سے ہوئی؟ قرآن دوٹوک انداز میں بتاتا ہے کہ فتح ہماری وجہ سے ہوئی اور شکست دنیا کی طرف التفات کے باعث جب کہ غزوۂ حنین میں مسلمانوں کی تعداد قوت کفار سے زیادہ تھی اور مسلمان فتح مکہ جیسی عظیم الشان فتح بھی حاصل کر چکے تھے لیکن ایک لمحے کے لئے صحابہ کرامؓ کو یہ خیال ہوا کہ آج ہم تعداد میں زیادہ ہیں یعنی مسبب الاسباب کے بجائے دنیاوی اسباب پر بھروسہ ہوا تو شکست دی گئی قرآن کہتا ہے 'لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِیْ مَوَاطِنَ كَثِیْرَةٍ وَّ یَوْمَ حُنَیْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَیْـًٔا وَّ ضَاقَتْ عَلَیْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّیْتُمْ مُّدْبِرِیْنَ' [۹:۲۵] غزوۂ احد میں بھی یہی ہوا مسلمانوں نے دنیا کی طرف نگاہ کی اور اسی لمحے انھیں شکست سے دوچار ہونا پڑا قرآن بتاتا ہے 'وَ لَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَ تَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَ عَصَیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الدُّنْیَا وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الْاٰخِرَةَ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِیَبْتَلِیَكُمْ وَ لَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ وَ اللّٰهُ ذُوْفَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ' [۳:۱۵۲] قرآن تو یہ بتاتا ہے کہ مسلمانوں کو کبھی اسباب کی کمی کے باعث شکست نہیں ہوتی شکست کی وجہ محض اسباب پر بھروسہ، تقویٰ میں کمی، ان کی اپنی اغلاط، دنیا کی طرف التفات یا پھر اللہ کی جانب سے آزمائش کے باعث ہی ممکن ہے۔ آخری غزوۂ تبوک کے موقع پر کئی صحابہ اس لئے شریک نہیں ہو سکے کہ ان کے پاس اونٹ یا سامان جہاد نہیں تھا انھیں میدانِ جنگ سے واپس بھیج دیا گیا۔ عرب کے صحرا میں رہنے والوں کے پاس اونٹ نہ ہوں اور تلوار اور نیزے نہ ہوں کیا اس کا تصور بھی کیا جاسکتا ہے؟ آخری غزوہ بھی میسر اسباب کی بنیاد پر لڑا گیا کفار کے اسباب پر انحصار کر کے نہیں لڑا گیا۔ کفار نے جن علوم کا انکشاف کرلیا، جو ایجادات کرلیں وہ آپ کو تقویت دینے کے لئے ایجاد نہیں کئے لہٰذا عہدِ حاضر میں فتح کو علوم کفار سے مشروط کرنا درست تجزیہ نہیں۔ قرآن نے اقدامی جہاد کے لئے تعداد کی نسبت متعین کی ہے دفاعی جہاد کے لئے کوئی نسبت متعین

نہیں کی ـــــ فتح اللہ کے لشکر سے ہوتی ہے ’ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ‘ [۹:۲۶] مومنوں کے پاس ہمیشہ اسباب بہت کم ہوتے ہیں ایمان زیادہ ہوتا ہے’’ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ‘ [۳:۱۷۳] جنگِ بدر میں بھی کامیابی اسباب سے نہیں ہوئی تھی اللہ کی طرف سے تھی’ وَ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ‘ [۳:۱۲۳] نیز دیکھیے ۳:۱۲۴، ۸:۹، ۸:۱۲۔ اگر اللہ مومنین کے ساتھ ہوتو کفار کی کثیر تعداد بھی مومنین کو شکست نہیں دے سکتی ’اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ وَ اِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَ اِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ وَ لَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَّ لَوْ كَثُرَتْ وَ اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ‘ [۸:۱۹] جہاد میں قتل مومنین نہیں کرتے تھے اللہ کی طرف سے ہوتا تھا’ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى وَ لِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ‘ [۸:۱۷] اللہ کی سنّت یہ ہے کہ وہ کفار کے دِلوں میں مومنین کا رعب ڈالتا ہے’ وَ اَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَ قَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَ تَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا‘ [۳۳:۲۶] یہ مضمون آلِ عمران، انفال اور الحشر میں بھی بیان ہوا ہے ۔دیکھیے ۳:۱۵۱، ۸:۱۲، ۵۹:۲۔ اندلس نے سائنس و ٹکنالوجی میں زبردست ترقی کی لیکن اندلس میں مسلمان اقلیت میں ہی رہے اور یورپ کو مسلمان نہ کر سکے بلکہ یہ سائنس وٹکنالوجی ان کو صفحۂ ہستی سے مٹنے سے روکنے میں بھی ناکام رہی حتیٰ کہ اُن کی عمارتیں عاد وثمود وفرعون کی طرح ضرور باقی رکھی گئیں مگر وہ عاد وثمود اور فرعون کی طرح مٹادیئے گئے۔مسجدِ قرطبہ میں کلیسا ہے اور مسجد، اذان، مصلّے اور مصلی سے محروم۔لوگ مادی ترقی سے نہیں روحانیت سے متاثر ہوتے ہیں۔ مادہ پرست مادی ترقی سے متاثر نہیں ہوتا۔اگر علم کا مطلب اسلامی علمیت میں علومِ عقلیہ ہی ہے تو عباسیوں اور اندلسیوں کو اس میں عروج کے باوجود تاتاری جیسے جاہلوں اور ان پڑھ عیسائیوں سے کیسے شکست ہوگئی جو سائنس وٹکنالوجی میں عباسی اور اندلسی خلافت سے بہت کم تر تھے؟ محترم علی میاں کے خیالات کا موازنہ مولانا مودودیؒ کے بعض نثری اقتباسات سے کیا جا سکتا ہے جو علیؒ میاں کی کتاب سے پہلے تحریر کئے گئے تھے۔مولانا محترم زوال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ’’بنیادی نقص اس مسخ شدہ مذہبیت میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کے بجائے محض عہد گذشتہ کی ایک تاریخی یادگار بن کر رہ گیا ہے اور اسلام کی تعلیم دینے

والی درسگاہیں آثارِ قدیمہ کے محافظ خانوں میں تبدیل ہوگئی ہیں ۔ ظاہر ہے کہ اجنبی لوگ اس چیز کو دیکھ کر زیادہ سے زیادہ تاریخی ذوق کی بناء پر اظہارِ قدر شناسی تو کر سکتے ہیں مگر یہ توقع ان سے نہیں کی جاسکتی کہ وہ حال کی تدبیر اور مستقبل کی تعمیر کے لئے اس سے ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کریں گے''۔ (تحریکِ آزادی ہند اور مسلمان' دوم' ص ۱۴۹)

'' جب تک علمائے اسلام اس ماخذ ومنبع [قرآن و سنّت] سے اکتساب علم کرتے رہے اور صحیح غور وفکر سے کام لے کر اپنے اجتہاد سے علمی وعملی مسائل حل کرتے رہے، اس وقت تک اسلام زمانے کے ساتھ حرکت کرتا رہا۔ مگر جب قرآن میں غور وفکر کرنا چھوڑ دیا گیا' جب احادیث کی تحقیق اور چھان بین بند ہوگئی' جب آنکھیں بند کر کے پچھلے محدثین اور مفسرین کی تقلید کی جانے لگی' جب پچھلے فقہا اور متکلمین کے اجتہادات کو اٹل اور دائمی قانون بنالیا گیا' جب کتاب وسنّت سے براہِ راست اکتساب علم ترک کر دیا گیا اور جب کتاب وسنت کے اصول چھوڑ کر بزرگوں کے نکالے ہوئے فروع ہی اصل بنالیے گئے تو اسلام کی ترقی دفعتاً رک گئی ۔ اس کا قدم آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹنے لگا۔ اس کے حامل اور وارثِ علم وعمل کے نئے میدانوں میں دنیا کی رہنمائی کرنے کے بجائے پرانے مسائل اور علوم کی شرح وتفسیر میں منہمک ہوگئے ۔ جزئیات اور فروع میں جھگڑنے لگے' نئے نئے مذاہب نکالنے اور دوراز کار مباحث میں فرقہ بندی کرنے لگے۔ (ایضاً' ص ۱۵۸)

'' فطری قانون یہی ہے کہ جو قوم عقل وفکر سے کام لیتی اور تحقیق واکتشاف کی راہ میں پیش قدمی کرتی ہے' اس کو ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ مادی ترقی بھی نصیب ہوتی ہے' اور جو قوم تفکر وتدبر کے میدان میں مسابقت کرنا چھوڑ دیتی ہے وہ ذہنی انحطاط کے ساتھ مادی تنزل میں بھی مبتلا ہوجاتی ہے۔ پھر چونکہ غلبہ نتیجہ ہے قوت کا اور مظلومیت نتیجہ ہے کمزوری کا، اس لیے ذہنی و مادی حیثیت سے درماندہ اور ضعیف قومیں اپنی درماندگی اور ضعف میں جس قدر ترقی کرتی جاتی ہیں' اسی قدر غلامی اور محکومیت کے لئے مستعد ہوتی چلی جاتی ہیں اور طاقت ور (ذہنی' مادی دونوں حیثیتوں سے طاقت ور) قومیں' ان کے دماغ اور ان کے جسم دونوں پر حکمران ہوجاتی ہیں''۔ (تنقیحات' ص ۹۔۱۰)

وہ اور کوئی تہذیبی وتمدنی حرکت جمود کی چٹانوں سے نہیں روکی جاسکتی۔ اس کو اگر روک سکتی ہے تو ایک مقابل کی تہذیبی وتمدنی حرکت ہی روک سکتی ہے''۔ (جماعتِ اسلامی کا مقصد' تاریخ اور لائحہ عمل ص ۹۰۔۹۱) عادِ ثمود فرعون کے انبیاء ان قوموں کے مقابل تہذیبی وتمدنی معیار کے حامل نہیں تھے بے سروسامانی ہی ان کا سامان تھا۔

قرآن سے تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی مسلمان اسباب پر بھروسہ کرتے ہیں اور مسبب

الاسباب کو ایک لمحے کے لئے نظر انداز کردیتے ہیں تو شکست، پسپائی، ہزیمت، ان کا مقدر ہوتی ہے مثلاً غزوۂ حنین غزوۂ احد ــــ قرآن نے عروج و زوال کا قانون بہت مختصراً یہ بتایا ہے کہ ہم نے ہر امّت کو صرف اور صرف اُس کے گناہوں کی وجہ سے تباہ کیا اور خلافت ارضی امّتوں کو ان کے اعمالِ صالحہ کے انعام کے طور پر دی جاتی ہے یہ کسبی نہیں ہے کہ جب دل چاہے ہم خلافت کے امیدوار بن جائیں اور تختِ خلافت پر قبضہ کرلیں۔ استخلاف فی الارض کوشش، جدوجہد اور سائنس وٹکنالوجی سے مشروط نہیں ہے --- اللہ تعالیٰ رماتے ہیں کہ یہ اس کا انعام ہے 'وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِىْ ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِى لاَ يُشْرِكُوْنَ بِىْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُوْلٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ' [۲۴:۵۵] اور خلافت اس لئے دی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ دیکھے کہ اب تم دنیا میں کیسے کام کرتے ہوُ قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَ يَسْتَخْلِفَكُمْ فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ' [۷:۱۲۹] --- اللہ تعالیٰ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کفروشرک کی حکومت اور اللہ کے بندوں کی حکومت میں کیا فرق ہے؟ یہ فرق نہ ہو تو اقتدار مسلمانوں سے چھین لیا جاتا ہے اگر مسلمانوں کو وہی کام کرنے ہیں جو کفار کررہے ہیں تو پھر اسلام کی کیا ضرورت ہے؟ قرآن نے استخلاف فی الارض کے صرف چار مقاصد بتائے ہیں: امر بالمعروف، نہی عن المنکر، صلوٰۃ و زکوٰۃ 'اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ' [۲۲:۴۱] اس نے ترقی، مادی صلاح و فلاح، اور سائنس وٹکنالوجی کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ امتِ مسلمہ کا اصل کام معروف کا حکم اور منکر کا فروغ ہے ' كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ اَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ' [110:3] انبیاء کرام کی عظیم الشان تہذیبوں کی کوئی مادی علامت محفوظ نہیں لیکن ان کے نام آج بھی زندہ ہیں۔ جن تہذیبوں کو مٹادیا گیا ان کی آیات، علامات، عمارات عاد وثمود وسباء وفرعون کے آثار کی صورت میں قیامت تک محفوظ ہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کی ٹکنالوجی میں اضافہ کر کے بنی اسرائیل کی عمارتوں سے بہتر عمارتیں تیار نہیں کیں۔ روئے زمین پر انبیاء کی تہذیبی وتمدنی فتوحات کی صرف دو عمارتیں باقی ہیں خانہ کعبہ اور حجرۂ نبویؐ۔ انبیاء کی تہذیب ان کا تمدن، ان کی فتوحات روحانی ہوتی ہیں مادی نہیں وہ آخرت کو دنیا پر مقدم کرنے آتے ہیں لہٰذا روحانی فتوحات اور روحانی برتری اور آخرت طلبی کے مظاہر ان کی تہذیب

میں عام ہوتے ہیں۔ یہ نکتہ ابھی تک بہت سے مسلمانوں کے فہم سے ماوراء ہے کہ دنیا اور اس کے اسباب محض ضرورت ہیں اور ضرورت کے درجے میں رہیں گے ان اسباب کا حصول ان پر فرض ہے جو ان کی دسترس میں ہیں وہ اسباب جو کفار کے قبضے میں ہیں ان کو چوری اور ڈکیتی کے ذریعے حاصل کرنے کا حکم مسلمانوں کو نہیں دیا گیا۔ مسلمانوں کے لئے آخرت اہم تر و اصل ہدف مقصود ہے لہٰذا وہی علوم ترقی کریں گے جو آخرت طلبی کو ممکن بنادیں مگر جب توجہ کا رخ دنیا پر ہوگا تو لازماً دنیاوی علوم ترقی کریں گے اور اس میں اضافہ ہوگا لہٰذا مغرب اگر دنیا میں ہم سے آگے نکل گیا تو اس میں شرم کی بات نہیں۔ اس نے اپنی توجہ کا تمام رخ تمام صلاحیتیں صرف مادیت پر مرکوز کردی ہیں آخرت کو ترک کردیا ہے آپ بھی یہی کام کریں تو آپ کے یہاں بھی یہی نتیجہ نکلے گا سائنس سے ہماری مرعوبیت بلا وجہ ہے۔ اس کی افادیت اپنی جگہ یہ کہنا کہ اسلام سائنس کا خالق ہے جیسا کہ بہت سے جدید مفکرین کہتے ہیں وہ یہ بتائیں کہ اگر قرآن سے ہی تجربی علوم نکلے تو ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء نے قرآن کی آمد سے پہلے دنیا کو ان تجربی علوم سے کیوں محروم رکھا؟ اگر یہ علوم قرآن میں تھے تو قرآن کا سب سے بہترین فہم صحابہؓ رکھتے تھے تو صحابہؓ تابعین میں سے کسی ایک سائنسدان کا نام بتادیا جائے؟ اگر صحابہؓ جو خیر القرون میں تھے سائنس قرآن سے برآمد نہیں کرسکے تو یا تو ان کا فہم دین ناقص تھا نعوذ باللہ! یا انھیں جہاد کے باعث فرصت نہ ملی یا ان کے علوم ہم تک منتقل نہیں ہوئے۔ لہٰذا عقلی علوم کے لئے قرآن سے استدلال ایک غیر عقلی رویہ ہے عقلی علوم کی دریافت اور تردید کے لئے قرآن کی نہیں عقل کی ضرورت ہے۔ یہاں عقل استعمال کی جائے اور یہ تابع ہو وحی الٰہی کے۔ ایسی عقلی سرگرمی جو اپنے وسائل و ذرائع سے کی جائے مسلمانوں کے لئے فرض کفایہ ہے اس کے ساتھ ساتھ تمام تر توقعات اللہ ربُّ العزت سے وابستہ کی جائیں کثیر اسباب میسر ہونے پر بھی بھروسہ اسباب پر نہ کیا جائے یہ ہے قرآن کا اصل پیغام۔

علی میاں کی مذکورہ کتاب ۱۹۴۶ء میں نوعمری میں لکھی گئی اس کے بعد ان کی تمام تصانیف اور ان کی پوری زندگی ان کے مذکورہ بالا موقف کی تردید کرتی ہے لیکن اپنی دینی ملی علمی مصروفیات کے باعث انھیں کبھی ماضی کی طرف پلٹ کر اس کتاب کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا ورنہ وہ یقیناً اس سے رجوع کرتے ☆ افسوس یہ ہے کہ حال ہی میں پرنسٹن یونیورسٹی نے عالمِ اسلام کے جو نمائندہ متون شائع کئے ہیں اس میں علی میاں کی اس کتاب سے منتخب کردہ تحریر کو اسلام کی نمائندہ تحریر کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

☆ مکتوب نگار اگر مولانا علی میاںؒ کو یہ الاؤنس دینا چاہتے ہیں تو ان کی مرضی ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی دوسری کتاب 'مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش' بھی اسی موضوع پر ہے جس میں مولانا نے اپنے اسی مؤقف کو بار بار پُر زور طریقے سے پیش کیا ہے اور اس کتاب پر ۱۹۶۴ء سے لے کر ۱۹۸۰ء تک تین مرتبہ نظر ثانی بھی کی ہے۔ امین

مشہور مستشرق RoxanneL. Euben کی کتاب Princeton Reading in Islamic Thought Text & Contexts From Al- Banna to Bin Laden, Muslim Decadence & Revival میں ایک متن علی میاں کی مذکورہ بالا کتاب کے انگریزی ترجمے سے مستعار لیا گیا ہے افسوس ہے کہ علی میاں کی کتاب انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر سعودی عرب کے کالجز کے نصاب کا حصہ ہے۔ کتاب کے اکثر مباحث جدیدیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کی تقاریر کا مجموعہ مغرب سے کچھ صاف باتیں ، بھی جدیدیت کا ترجمان ہے لیکن کئی جگہ جدیدیت کا رد بھی ہے۔ یہ رد علی میاں کے ایمان کا کرشمہ ہے لیکن علی میاں کی شخصیت اور بعد کی تمام کتابیں نہ صرف جدیدیت کا مکمل رد کرتی ہیں بلکہ ان کی تحریریں امت کو ایک نئے علمی روحانی جذبے سے سرشار کرتی ہیں علی میاں اپنے تمام تر احترام، خدمات عظمت کے باعث سب کے لئے قابلِ قدر ہیں مگر وہ ایک انسان ہیں ان کی غلطیوں سے ان کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا ان کا جب بھی ہم جائزہ لیں گے تو ان کے کُل کو پیشِ نظر رکھیں گے ان کی چند خامیوں کے باعث ان کے عظیم کام کا انکار نہیں کریں گے۔ یہی رویہ اسلامی تہذیب، علمیت، تاریخ میں تمام لوگوں کے افکار کا جائزہ لیتے ہوئے پیشِ نظر رہنا چاہیے ـــــ سائنس اور انسانی حقوق کے حوالے سے عالمِ اسلام میں اکثر و بیشتر تحریریں حقیقت کی مکمل ترجمانی نہیں کرتی ہیں حتیٰ کہ مولانا مودودیؒ جیسے عظیم مفکر بھی بنیادی انسانی حقوق کے بارے میں لکھتے ہوئے اس کی مابعد الطبیعیاتی اساسات کو نظر انداز کر کے اسے غیر اقداری تصور کر کے اس کا اسلامی جواز پیش کر دیتے ہیں یہ غلطی ہے لیکن اس غلطی سے ان کے مقام و مرتبے میں کوئی فرق نہیں آتا۔ جب تک ہم علمی معاملات میں اس رویے، اس توازن اور اس اصول کے تحت نقد و نظر نہیں کریں گے ہمارے زوال کی رات مزید طویل ہوتی جائے گی۔ قرآن نے امتوں کے زوال کا سبب کثرتِ گناہ، نفس پرستی، خوفِ خدا سے محرومی بتایا ہے کسی ایک آیت میں بھی زوال کا سبب علوم عقلیہ، سائنس و ٹکنالوجی سے محرومی نہیں بتایا گیا 'وَ اِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا' [16:17] نیز دیکھیے 117:11، 59:28، 11:3، 52:8، 13:10، 69:27، 40:29، 8:65، 9:69، 10:69، 2:71۔ یہ سب آیتیں زوال کا سبب سائنس و ٹکنالوجی نہیں بتاتیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ کسی کالج کے استاد وہاب سوری صاحب کے سائنس و ٹکنالوجی کے موقف پر کچھ کہنا چاہتے ہیں انشاء اللہ اسے پڑھیں گے لیکن سائنس و ٹکنالوجی کا مسئلہ اتنا سادہ نہیں ہے کہ ایک

گھنٹے کی تقریر اور چند صفحات کے اعتراضات سے یہ مسئلہ حل ہو جائے یہ ایک نہایت سنجیدہ گھمبیر علمی مسئلہ ہے جس کے لئے ہمیں عمیق مطالعے اور طویل مباحث کی ضرورت ہے۔ البرہان میں یہ سلسلہ شروع ہو رہا ہے تو میری رائے میں اسے جاری رکھیے بلکہ اسے مستقل تحریری مباحثے کی شکل دیجیے جو لوگ سوالات اٹھا رہے ہیں ان کے سوالات آنے دیجیے تاکہ ہم تفصیل سے یہ بتا سکیں کہ اصل مسئلہ کیا ہے؟ گزشتہ چھ ماہ میں بہاول پور، پنجاب، ملتان، ساہیوال، چیچہ وطنی، لاہور، اوکاڑہ وغیرہ جانے کا موقع ملا اور سیکولر یونیورسٹی کے اساتذہ اور وہاں سے فارغ التحصیل دانشور حضرات اور اہلِ علم سے تبادلۂ خیالات کی سہولت بھی میسر آئی نہایت افسوس کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ جب ان حضرات سے سائنس و ٹکنالوجی کے معاملات پر بحث و گفتگو ہوئی تو ان میں سے ننانوے فی صد نے اس موضوع پر کسی بنیادی کتاب کا مطالعہ تک نہیں کیا تھا۔ ۱۹۲۴ء میں عالمی فلسفہ کانگریس کا صدر اور ہائیڈیگر کا استاد ہزرل اور یورپین سائنس کی آفاقیت کو رد کر کے اس پر تنقید Critique on Euroupean Sciences کے نام سے مغرب میں لکھ رہا تھا ۱۹۳۶ء میں اس کا شاگرد اور کنگ فلاسفر ہائڈیگر Question Concerning Technology میں ٹکنالوجی کو خدا کی جگہ لیتے ہوئے دیکھ رہا تھا مگر عالمِ اسلام میں آج بھی اگر سائنس کے حوالے سے علمی تنقید کی جائے تو سب اس کے دفاع کے لئے بغیر کسی مطالعے کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس سفر میں یہ معلوم ہوا کہ سیکولر جامعات سے وابستہ اہلِ علم میں سے کسی ایک نے بھی کارل پاپر، فیرا بینڈ، لے کاٹوس، کوہن وغیرہ کو سرے سے نہیں پڑھا یا اس کے نام تک نہیں جانتے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان حضرات کو فلسفے اور فلسفۂ سائنس سے بھی واقفیت نہیں ہے یہ سائنس کی مابعد الطبیعیات سے واقف ہی نہیں ہیں، انھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ سترہویں صدی سے پہلے سائنسداں کی اصلاح استعمال نہیں ہوتی تھی اس وقت سائنس فلسفے کی شاخ تھی اور طبعی علوم میں رسوخ رکھنے والے کو نیچرل فلاسفر کہا جاتا تھا--- یہ حضرات سائنس و ٹکنالوجی کا فرق تک نہیں جانتے انھیں ٹیکنو سائنس کا بھی علم نہیں۔ یہ سائنٹس ازم کی اصطلاح سے بھی واقف نہیں ان حضرات نے Ted Peter, Muzaffar Iqbal, Lord North bourne Smith huston, Ziauddin Sardar, Dr. Nasar جیسے مصنفین اور روایت کے مکتبۂ فکر کی جدید سائنس پر تنقید کے بارے میں ایک لفظ تک نہیں سنا---اب اس طرح کے لوگ اگر کسی مکالمے میں شرکت فرمائیں تو اس سے کیا نتیجہ نکل سکتا ہے بالکل اسی طرح سفر کے دوران انسانی حقوق کے حوالے سے بھی گفتگو ہوئی تو اس کا حال بھی یہی تھا کسی کو یہ نہیں معلوم ہے کہ بنیادی انسانی حقوق کے منشور میں انسان کی تعریف کیا ہے؟ اس منشور میں خیر کیا ہے؟ شر کیا ہے؟

گناہ ثواب کیا ہے؟ منفی آزادی اور مثبت آزادی کسے کہتے ہیں؟ کانٹ اور فوکالٹ کے تاریخی مضامین What is Enlightenment جس میں روشن خیال انسان کی تعریف پیش کی گئی ہے یہ حضرات ان مضامین سے سرے سے ناواقف ہیں جو حضرات حقوقِ انسانی کے منشور کی مابعد الطبعیات سے واقف نہیں وہ اس موضوع پر جو گفتگو کریں گے تو وہ صرف وقت کا زیاں ہوگا۔

ان حضرات کو آزادی مساوات ترقی کی مغربی اصطلاحات کا حقیقی مطلب تک نہیں معلوم۔ اصطلاحات کا کبھی ترجمہ نہیں ہوسکتا تشریح ہوسکتی ہے یہ عربی اصطلاح حریت کو مغربی اصطلاح Freedom کا مترادف سمجھتے ہیں جب کہ آزادی کا لفظ فریڈم کی کافرانہ جامعیت کو بیان کرنے سے قاصر ہے جب آپ کو منشور انسانی حقوق کی اصطلاحات جو خالص فلسفیانہ اصطلاحات ہیں ان کا بھی نہیں معلوم تو آپ سے کیا مکالمہ کیا جائے؟ بے چارے Human اور عبد کا فرق تک نہیں جانتے انھیں Wealth اور Capital کا فرق تک معلوم نہیں۔ یہ بازار اور مارکیٹ میں فرق کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ سول سوسائٹی کی اصطلاح کے مضمرات اور فلسفیانہ اساسات سے تک ناواقف ہیں۔ ان حالات میں مکالمہ کیا ہو؟ بہر حال آپ کوشش جاری رکھیں اور ان مباحث پر اگر تحریری مباحثوں کا سلسلہ شروع کریں تو بہت فائدہ ہوگا۔ زبانی گفتگو، تقریروں میں وقت بہت ضائع ہوتا ہے، تحریری مباحثے زیادہ سود مند ہیں۔ بہتر یہ ہو کہ سوالات کرنے والے اعتراضات اٹھانے والے ہر دلیل کے ساتھ کوئی حوالہ پیش کریں صرف تقریر نہ کریں۔ برھان میں اب تک جو خطوط اور مضامین سائنس وٹکنالوجی کی ترقی کے حق میں شائع ہوئے ہیں ان میں کوئی علمی دلیل نظر نہیں آتی صرف ایمان و یقین کی بنیاد پر اعتراض کئے گئے ہیں۔ ایک علمی پرچے میں ہر سطر دلیل اور حوالے سے آراستہ ہونی چاہیے۔ عبدالوہاب سوری صاحب پر نقد اگر ان اصولوں کے تحت ہو تو اسے شائع کیجیے ورنہ ان سے کہیے کچھ پڑھنے کے بعد حوالے پیش فرمائیں۔ سائنس پر تنقید کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سائنس کے فوائد کو یک لخت ترک کر دیا جائے، اسے حرام قرار دے دیں، کار چھوڑ دیں اور گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ جائیں۔ جدید زندگی میں سرمایہ دارانہ نظام نے گھوڑا اور بکری رکھنا محال بنا دیا ہے ایک ایسا نظامِ زندگی مسلط کر دیا گیا ہے کہ فطری زندگی کی طرف لوٹنا ناممکن ہے۔ آپ سال بھر میں جس مالیت کا بھی دودھ خریدتے ہیں اتنے رپوں میں کئی بکریاں اور کئی گائیں خرید سکتے ہیں لیکن شہروں میں ان جانوروں کو کہاں رکھیں؟ چراگاہ کہاں سے لائیں؟ جس نظامِ زندگی نے ہم سے اصلی دودھ چھین لیا ہے اس کے قصیدے پڑھتے ہوئے ہم کو شرم تک نہیں آتی۔ ڈیری فارم کی صنعت آنے کے بعد پوری دنیا میں کسی کو آلودگی سے پاک اصلی دودھ مکھن دہی پنیر میسر نہیں۔ یہ کمپنیاں ہمیں کیا

پلا رہی ہیں ہمیں نہیں معلوم، ہم تو ان کی مصنوعات پر ایمان لا چکے ہیں ان کمپنیوں کی اخلاقیات *The Corporation* نامی کتاب میں پڑھی جاسکتی ہیں۔ سائنس پر تنقید کا مقصد یہ ہے کہ اس کی ایسی تقدیس، تکریم، تحریم نہ کی جائے جیسا کہ یہ کوئی الہامی کتاب اور مقدس علم ہے یہ علم نہیں فن ہے Art & Craft ہے۔ یہ کام چلاتا ہے، فائدے پہنچاتا ہے، یہ مادی طبعی، حسی، عقلی دنیا کا علم ہے اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ اسے تمام علوم کو پرکھنے کا پیمانہ بنانا اسے الحق اور الخیر کی تلاش کا منہاج سمجھنا اسے سب سے برتر بہتر علم سمجھنا جہالت ہے۔ یہ حضرات Feryarberd کی کتاب *Against Method* یا اس صدی کے آئن اسٹائن فائن مین کی کتاب *Six Easy Pieces* پڑھ لیں تو سائنس سے ان کی مرعوبیت چند لمحوں میں ختم ہو جائے گی۔ سیکولر جامعات سے وابستہ اہلِ علم سے متعلق جو کچھ اوپر تحریر کیا گیا ہے اس معاملے میں صرف ایک استثناء ہے☆ وہ لاہور کے ممتاز دانشور عطاء اللہ صدیقی مرحوم کا ہے۔

لاہور میں ماہنامہ محدث کے محترم مدیر جناب حسن مدنی کی دعوت پر جامعہ اسلامیہ لاہور میں طلباء، اساتذہ اور محترم علماء کرام سے گفتگو کا موقع ملا۔ اس تقریب میں محترم عطاء اللہ صدیقی صاحب بھی شریک تھے۔ راقم نے عہدِ حاضر، جدید مغربی ترقی سائنس وٹکنالوجی، ہیومن رائٹس کے حوالے سے معروضات پیش کیں جنھیں نہایت توجہ سے سنا گیا تقریر کے اختتام پر محترم عطاء اللہ صدیقی صاحب نے سوالات کے بجائے راقم کی گفتگو کے بارے میں چند معروضات پیش کرنے کی اجازت صدرِ مجلس سے طلب کی اور نہایت اخلاص اور دردمندی کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے ہیومن رائٹس پر کام کیا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اسلام اور ہیومین رائٹس میں کوئی تضاد نہیں ہے ان میں ہم آہنگی ہے سائنس کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے میں اس سے اتفاق نہیں رکھتا۔۔۔ راقم نے جواب الجواب کے موقع پر ان کی خدمت میں عرض کیا کہ ہیومن رائٹس پر ہم گزشتہ دس سال سے کام کررہے ہیں اس کی تاریخی، تہذیبی، فلسفیانہ اساسات پر مصادر و ماخذات کی روشنی میں مختلف

☆ اس میں شک نہیں کہ عالم اسلام اور پاکستان کی جامعات میں مغربی فکر و فلسفے کا تنقیدی مطالعہ عموماً شامل نصاب نہیں، جو ہونا چاہیے لیکن جامعی صاحب کا یہ عمومی تبصرہ بہرحال مبالغے پر مبنی ہے کہ پنجاب کی جامعات اور علمی اداروں میں مغربی فکر و فلسفے کو سمجھنے والا کوئی نہیں مثلاً یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور میں، جہاں ہم پڑھاتے ہیں، مغربی فکر و فلسفے کا تنقیدی مطالعہ شامل نصاب ہے۔ صفاء انسٹی ٹیوٹ میں اس پہ کام ہو رہا ہے، بعض دیگر ادارے اور افراد بھی اس ضمن میں کام کررہے ہیں۔ جیسا کہ البرہان ہی میں ان شاء اللہ وہ دیکھیں گے۔ ہماری دیرینہ درخواست اور مطالبہ کے باوجود جامعی صاحب اور ان کے حلقۂ احباب کی جانب سے مغربی فکر و فلسفے کے اسلامی تناظر میں تنقیدی مطالعے پر بھی کوئی مربوط و مرتب اور ٹھوس علمی کام (خصوصاً اردو میں) ابھی تک سامنے نہیں آیا، جس کے ہم منتظر ہیں۔ امین

رفقاء نے ایک ہزار صفحات تحریر کئے ہیں کراچی پہنچتے ہی وہ صفحات آپ کی خدمت میں ارسال کروں گا ان کے مطالعے کے بعد آپ اپنی رائے سے مطلع فرمائیے گا اگر ہم غلطی پر ہوئے تو ہم بلا تکلف اپنے موقف سے رجوع کرلیں گے جہاں تک سائنس کے حوالے سے آپ کے تحفظات ہیں وہ درست ہیں کہ تین سو سال پر محیط سائنس وٹکنالوجی ترقی کے حوالے چند لمحوں میں کی گئی تنقید فہم وفکر سے بالا ہوتی ہے اس ضمن میں ہم تین سال سے کام کررہے ہیں اور ہم نے تین ہزار صفحات تحریر کئے ہیں وہ بھی آپ کی خدمت میں ارسال کئے جائیں گے ان کے مطالعے کے بعد آپ جو کچھ رائے دیں گے وہ ہمارے لئے نہایت قابلِ قدر ہوگی اور ہم آپ کی تنقیدات کی روشنی میں اس وقت یقیناً استفادہ کریں گے۔جن چیزوں میں اصلاح کی، ترمیم کی، رجوع کی، ارتقاء کی ضرورت ہوگی ہمیں اس میں کوئی تامل نہ ہوگا فی الحال آپ کی محتاط رائے قبل از وقت ہے آپ توقف فرمائیں۔اگلے دن کراچی پہنچتے ہی ایک ہزار صفحات جو ہیومن رائٹس کی تاریخ اور فلسفے سے متعلق تھے جناب حسن مدنی صاحب اور کامران طاہر صاحب کے ذریعے ان تک پہنچادیئے گئے چند ہفتوں بعد ایک مشترکہ دوست کے ذریعے انھوں نے خود رابطہ کیا اور اعتراف کیا کہ انسانی حقوق کے منشور کو ہم نے یورپ کے تاریخی اور فلسفیانہ تناظر میں اس طرح نہیں دیکھا ڈاکٹر وہاب سوری کے پی ایچ ڈی کے مقالے نے انھیں بہت متاثر کیا جو اس صدی کے سب سے بڑے سیاسی فلسفی John Rawls پر تھا اور جس میں انسانی حقوق، لبرل ازم اور جدید لبرل ریاست کے خدوخال کی حقیقت نہایت عالمانہ وفلسفیانہ انداز میں بیان کی گئی ہے انھوں نے بہت سی کتابیں طلب فرمائیں، بے شمار حوالوں کے لئے بار بار رجوع کیا۔ سائنس وٹکنالوجی سے متعلق راقم نے اپنی معروضات کے ضمن میں انھیں دو ہزار صفحات بھیجے انھوں نے سب سے پہلے کتاب میں درج تمام حوالوں کی اصل کتابیں طلب فرمائیں اور براہِ راست مصادر کا مطالعہ شروع کیا تو ان پر حیرت کا جہان کھل گیا خاص طور پر فیرابینڈ کی کتاب Aganist Method پڑھ کر وہ حیرت زدہ رہ گئے جب پاپر کے فلسفہ Falsification کی تفصیلات ان کی نظر سے گزریں تو ان کی حیرت عروج پر تھی۔اس صدی کے آئن اسٹائن فائن مین جو کوانٹم فزکس کا سب سے بڑا سائنسداں اور نوبل انعام یافتہ ہے اور جس کا کمال یہ ہے کہ طبیعات کی دنیا میں یہ پہلا آدمی ہے جس نے طبیعات کے بے شمار عقدے ریاضی کی مساواتوں [Equations] کی بجائے صرف تصاویر سے حل کردیے جب کہ علمِ طبیعیات کی تاریخ میں کوئی سائنسداں طبیعات کے کسی مسئلے کو آج تک ریاضی کی مساوات کے بغیر حل نہیں کرسکا۔ اس کی کتاب *Six Easy Peices* جو سائنس کی حقیقت سے متعلق ہے ان کو پیش کی گئی تو وہ حیران رہ گئے۔ان کا ردعمل یہ تھا کہ عالمِ اسلام

میں تو سائنس کے بارے میں حد درجہ تقدیس کی فضاء غالب ہے لیکن یہ مصادر و منابع تو سائنس کے بارے میں بھی کچھ اور ہی بتاتے ہیں۔کاش وہ زندہ رہتے تو اپنے سدا بہار قلم سے ان مباحث و مسائل پر نہایت پر اثر تحریریں لکھتے اور امت کی رہبری فرماتے۔

پنجاب کے سفر کا حاصل جناب عطاء اللہ صدیقی سے اتفاقی ملاقات تھی میں نے پاکستان کے سیکولر اداراں سے فارغ التحصیل مذہبی مزاج رکھنے والے اہلِ علم میں انھیں واحد فرد پایا جنھوں نے ان مشکل فلسفیانہ مباحث، سائنس پر نقد ونظر جیسے نازک موضوعات میں اس قدر دلچسپی ظاہر کی اور ان عنوانات پر مطالعے کے لئے کتابوں کو منتخب کیا۔ چند کتابیں جو انھوں نے طلب کیں اس کی فہرست درج ذیل ہے کیونکہ یہ تمام اہلِ علم کے لئے فائدہ مند ہے لہٰذا اس کا حوالہ علمی حلقوں کے لئے کارآمد ہوگا:

Hugh Lauder, Phillip Brown, Jo-Anne Dillabough and A.H. Halsey: *Education, Globalization and Social Change,* 2006, Oxford University Press.

Theodor Adorno and Max Horkheimer: *Dialectic of Enlightment*. 1986, Thetford Press.

Jurgen Habermas: *On the Logic of the Social Science.* 1988, MIT Press Cambridge.

Peter Singer: *Applied Ethics* 1986, Oxford University Press.

Richard Rorty: *Objectivity, Relativism, and Truth Philosophical Papers*. 1991, Cambridge University Press.

Ernest Gellner: *Nations and Nationalism.* 2006 Blackwell Publishing.

Tony Evans: *The Politics of Human Rights A Global Perspective.* 2005 Pluto Press London.

R.P.Feynman: *Six Easy Pieces Essential of Physics Explained by Its Most Brilliant Teacher* 1995 Helix Books Addison-Wesley Publishing Company.

Richard Bellamy: *Rethinking Liberalism* 2000, Pinter London and New York.

A.D. Smith: *Nationalism and Modernism* 1998 Routledge London and New York.
Jared Diamond: *Guns, Germs And Steel A Short History of Everybody For the Last 13,000 Years* 2005 Vintage Books London.
Paul Feyerabend: *Against Method,* 2010, Verso London New York.
A.F. Chalmers: *What is This Thing Called Science.* 1982, Open University Press.
Wolfgang Sachs: *The Development Dictionary A Guide to Knowledge as Power.* 1992, Zed Books London and New Jersey.
Milton Friedman: *Capitalism and Freedom,* 2002, University of Chicgo Press
Max Weber: *The Protestant Ethic and the Spirit of Capitalism* ,1930, Routledge London
Naomi Wolf: *The Beauty Myth How Images of Beauty Are Used Against Woman,* 2002, Harper Perennial
Wolfgang Smith: *Cosmos and Transcendence Breaking Through the Barrier of Scientistic Belief,* 2005, Suhail Academy Lahore Pakistan
Amy Chua: *World on Fire How Exporting free Market? Democracy Breads Ethnic Hatred and Global Instability,* 2004, Anchor Books

جناب صدیقی صاحب نے مغرب کے گہرے مطالعے کے سلسلے میں منتخب کتب کی فہرست بھی طلب کی تھی انشاءاللہ وہ فہرست دوسرے مضمون میں پیش کی جائے گی۔

محتاج دعا

خاکسار

خالد جامعی

یادرفتگان ڈاکٹر محمد امین

إلى رحمة الله

ڈاکٹر عبدالقیوم سعادت

یہ غالباً ۱۹۸۳ء کی بات ہے جب ہم نے پہلی دفعہ ریاض (سعودی عرب) میں جماعت اسلامی کے ایک اجتماع میں ڈاکٹر عبدالقیوم سعادت صاحب کو دیکھا۔ گورا رنگ، لمبا قد، سر پہ سادہ سی ٹوپی، پاؤں میں سادہ سی چپل، ہاتھ میں تسبیح جس کے دانے اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، باتیں کرتے، ہر وقت گرتے رہتے۔ یہ 'انداز' جماعت اسلامی کے حلقے میں نامانوس تھا چنانچہ کچھ لوگوں نے سوالات اوراعتراضات بھی کیے جنہیں انہوں نے خوبصورتی سے جواب دے کر ٹال دیا۔ وہ اس وقت جماعت اسلامی سعودی عرب کے نظم کے امیر تھے۔ ہم اُس وقت بھی حیران ہوئے تھے اور آج بھی حیران ہیں کہ انہوں نے کس طرح جماعت اسلامی اور تصوف کے اجتماعِ ضدین کو عمر بھر نبھایا اور نہ صرف نبھایا بلکہ ان کا حق ادا کر دیا یہاں تک کہ ان دونوں گروہوں کے بزرگ آخر وقت تک ان سے راضی تھے اور وہ خود بھی مطمئن اور خوش تھے۔

انہوں نے ایسی پاکیزہ اور مطابقِ شریعت زندگی گزاری اور چند واقعات ایسے ہوئے کہ ان کے جاننے والوں کے حلقے میں یہ معروف ہو گیا کہ وہ مستجاب الدعوۃ ہیں۔ جماعت اسلامی کی کسی انتخابی شکست کے موقع پر برادرِ عزیز صلاح الدین صاحبؒ (ایڈیٹر تکبیر کراچی) نے تنقیدی شذرات لکھے اور کچھ یوں ہوا کہ ڈاکٹر عبدالقیوم سعادت صاحب اور صلاح الدین صاحب میں ٹھن گئی۔ اس مناظرہ بازی کا اختتام یوں ہوا کہ ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب نے صلاح الدین صاحب کو مباہلہ کا چیلنج دے دیا۔ ہم گھبرائے کہ صلاح الدین صاحب کہیں یہ دعوت قبول نہ کرلیں کہ لنگوٹے کے وہ بھی سُچے تھے☆ اور ہم ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ صلاح الدین صاحب کو خبردار کریں کہ تازہ تکبیر آ گیا (کہ ہفت روزہ تھا — اور آج کل ہفتہ اتنی تیزی سے گزرتا ہے کہ پتہ ہی نہیں چلتا) تو ہم نے جلدی سے رسالہ کھولا اور یہ دیکھ کر مطمئن ہوئے کہ انہوں نے مباہلہ سے گریز کرتے ہوئے اپنی بات کہی اور بحث سمیٹ لی۔ ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ بعض واقفان حال نے انہیں ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب کے مستجاب الدعوۃ ہونے کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا چنانچہ انہوں نے مباہلہ سے اعراض کیا۔

اب ہماری بپتا سنیے کہ ہم نے اپنے قد سے بڑے تعلیمی اور اصلاحی منصوبے شروع کر رکھے ہیں اور مسلکی و جماعتی تحزب اور مادی وسائل سے بھی محروم ہیں لہٰذا مشکلات اتنی زیادہ ہیں کہ انہوں نے ہماری کمر توڑ رکھی ہے لہٰذا ہم اس ہستی کی پناہ اور مدد بھی طلب کرتے رہتے ہیں جو مسبب الاسباب

☆مطلب یہ کہ وہ بھی عفیف اور صاحب کردار تھے

اور قوی و قیوم ہے اور جس کی نصرت بغیر وسائل کے بھی معجزے رونما کرسکتی ہے؟ اور کوئی حقیقی بزرگ ملے تو اس سے دعا کی درخواست بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک تربیتی و اصلاحی نشست میں، جس کے آخر میں دعا اکثر ڈاکٹر عبدالقیوم سعادت صاحب کرواتے تھے، ہم نے ان سے دعا کی خصوصی درخواست کی۔ اتفاق سے اسی وقت یہ فیصلہ ہوا کہ پہلے نماز پڑھ لی جائے اور ڈاکٹر صاحب سے جماعت کرانے کے لیے کہا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے عشاء کی نماز میں سورہ بقرۃ کی آخری آیات تلاوت کیں جن میں یہ بھی آتا ہے کہ: ''لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا'' گویا انہوں نے ہماری درخواست کا جواب بالواسطہ طور پر دے دیا۔ لیکن مایوس ہونے والوں میں سے ہم بھی نہیں، چنانچہ پچھلے سال ہم نے سوچا کہ ڈاکٹر صاحب سے باقاعدہ استفادہ کرنا چاہیے کہ اس سے ہماری اصلاح بھی ہوگی، ایمان و یقین بھی پختہ ہوگا اور ان سے دعا کرانے کا موقع بھی ملے گا۔ ڈاکٹر صاحب سے وقت کی درخواست کی تو الحمدللہ وہ مان گئے۔ چنانچہ ہر منگل کو عصر اور مغرب کے درمیان ان کے گھر پہ میری ان سے نشست رہتی اور یہ سلسلہ تقریباً چھ ماہ تک جاری رہا تا آنکہ وہ اپنے بیٹے کے پاس امریکہ چلے گئے۔ چونکہ ان نشستوں میں صرف ہم دونوں ہوتے تھے لہٰذا ان سے استفادے کا اچھا موقع ملا۔ کبھی وہ جو مناسب سمجھتے ارشاد فرماتے اور کبھی میں جو چاہتا عرض کرتا اور وہ میری رہنمائی اور تسلی وتشفی فرماتے۔ ایک دن مَیں کچھ اس مفہوم میں کہہ رہا تھا کہ بعض اوقات آدمی عرصہ تک دعا مانگتا رہتا ہے اور وہ قبول نہیں ہوتی یا برسوں ایک اچھا کام کرتا رہتا ہے اور اس کا نتیجہ نہیں نکلتا۔ وہ بیٹھے سنتے رہے اور پھر ایک دم جلال میں آ گئے (کہ آخر پٹھان تھے) کہنے لگے ''کیا تم خدا ہو؟ نہیں تم خدا نہیں ہو، تم بندے ہو، تو خدا کے کام کی فکر کیوں کرتے ہو، اپنے کام کی فکر کرو۔ بندے کا کام ہے عبادت و اطاعت میں محنت کرنا۔ اس کا نتیجہ نکالنا اللہ کا کام ہے۔ میاں تم اپنا کام کرو۔ اس کے کام کی فکر نہ کرو۔ وہ نہ اندھا ہے نہ بہرہ اور نہ ناانصاف۔ اپنے کام سے کام رکھو! کیا تم نے اس کا حق ادا کر دیا ہے؟'' وہ بغیر رُکے بولتے رہے اور میں دم بخود سنتا رہا۔

انہوں نے ہمارے لیے کئی بار دعا کی اور ہمیں یقین ہے کہ ان کی دعا ہمارے لیے، ان شاء اللہ ،قبول ہوگی ـــــ لیکن دعا تو وہ پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے بھی کرتے تھے اور کشمیر، فلسطین اور چیچنیا کی آزادی کے لیے بھی ہمیشہ کرتے تھے۔ تو دعائیں قبول کرنے کا اللہ کا ایک اپنا نظام ہے اور ہماری کوتاہ بین نظریں بسا اوقات ان دورس فیصلوں کی حکمتوں کو سمجھ نہیں پا رہی ہوتیں جو **احکم الحاکمین** کے پیش نظر ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کو اپنی اصلاح اور تزکیے کی بہت فکر تھی۔ نوجوانی ہی میں مولانا عبدالغفور مدنیؒ کی بیعت

کرلی۔ وہ شیخ الحدیث مولانا محمد ذکریاؒ، مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اور دیگر بزرگوں کے ساتھ ملاقاتوں کے احوال سناتے رہتے تھے۔ عمر بھر سعودی عرب میں ملازمت کی اور زیادہ عرصہ طائف میں رہے۔ پاکستان آنے کے بعد اور مولانا مدنیؒ کی رحلت کے بعد اپنی اصلاح کی فکر میں غلطاں رہتے اور موزوں مربی کی تلاش میں رہے اور بالآخر حضرت احمد جاوید صاحب کی شخصیت پہ مطمئن ہوکر ان سے وابستہ ہوگئے۔

ڈاکٹر صاحب کا جسد خاکی پی بلاک ماڈل ٹاؤن لاہور کی مسجد کے ساتھ پارک میں رکھا ہوا تھا۔ نماز جنازہ کے لیے لوگ صفیں بنارہے تھے کہ ان کے ایک قریبی دوست اور ساتھی (ڈاکٹر منصور علی صاحب) نے اٹھ کر ان کی نیکی، تقویٰ اور پاکیزہ زندگی کی شہادت دی اور کہا کہ میرے یہ ذاتی علم میں ہے کہ جب وہ طائف میں تھے اور ان کی تنخواہ 7ہزار اور کچھ ریال ماہانہ تھی تو وہ اپنے ذاتی اخراجات کے لیے 2ہزار ریال نکال کر باقی تنخواہ ہر ماہ باقاعدگی سے اللہ کی راہ میں دے دیا کرتے تھے اور یہ ان کا مستقل معمول تھا۔۔۔ یہ کہنا آسان لگتا ہے لیکن عمل میں اتنا آسان نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کی مغفرت فرمائے، ان کی حسنات قبول فرمائے اور ان کی خامیوں، کوتاہیوں سے درگزر فرمائے۔ انہیں جنت الفردوس اور اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور ہمیں ان جیسا اخلاص، تقویٰ اور آخرت کی فکر عطا فرمائے۔ حق مغفرت کرے، عجب اطاعت گزار عبد تھا۔

حافظ نذر احمد

۴ستمبر ۲۰۱۱ء کی صبح ڈاکٹر مزمل احسن شیخ صاحب نے فون پر اطلاع دی کہ حافظ نذر احمد صاحب اللہ کے پاس چلے گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ حافظ صاحب نے جس طرح خاموشی سے دین کی خدمت کی اور نام ونمود کی بجائے گم نامی کو پسند کیا، اس پر ہمیں توقع نہ تھی کہ ان کے جنازے پر جامعہ نعیمیہ اندر باہر سے بھری ہوگی تاہم شہر کے اکثر دینی حلقوں کے لوگ وہاں موجود تھے جنہوں نے ان کی مغفرت کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ چلئے یہ بھی ان کی سعادت ہے۔۔۔ کہ لوگ زندوں کی قدر نہیں کرتے تو مرجانے کے بعد ہی دعائے خیر سے یاد کرلیتے ہیں۔

حافظ صاحب نے نوجوانی ہی میں کسی وجہ سے اسلامیہ کالج کی اسلامیات کی لیکچرر شپ چھوڑ دی اور پھر کیریئر کی فکر چھوڑ کر دین کی فکر میں لگ گئے اور پھر خاموشی سے عمر بھر اسی کام میں لگے رہے۔ انہوں نے شبلی کالج بھی چلایا جو اگرچہ وسائل کی کمی اور حافظ صاحب کے دنیاداری کے داؤ پیچ نہ جاننے کی وجہ سے کوئی بڑا ادارہ تو نہ بن سکا تاہم اصلاح تعلیم میں حافظ صاحب کا منہج بھی وہی تھا جو اب ہمارا ہے اور گوانہوں نے اس کے لیے کوئی تحریک نہیں چلائی لیکن تعمیر ملت سکول ملتان کے میجر مسرت بیگ صاحب، اسلامیہ سکول سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی کے مولانا عبدالجبار غازی صاحب اور ماہر تعلیم سید

شبیر بخاری صاحب (مدظلہ العالی — شاہ صاحب بڑھاپے، بیماری اور ضعف کے دن جہانزیب بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور میں اپنے بیٹوں کے پاس گزار رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت و عافیت سے نوازے) سے مل کر اصلاحِ نصاب اور تربیت اساتذہ کا کام کرتے رہے۔ انہوں نے شبلی کالج میں کئی عمدہ تجربے کیے اور ان کے بارے میں بتاتے رہتے تھے مثلاً فرمایا کہ میں نے کبھی فیس کے پیسے طلبہ سے گن کر نہیں لیے لیکن وہ کبھی کم نہیں نکلے۔ طلبہ کو بتاتے کہ ۱۵ شعبان دراصل استقبال رمضان کا موقع ہے لہٰذا پٹاخے اور حلوے اس کا موزوں پیرایۂ اظہار نہیں ہیں، تو شب برأت کے دوسرے دن طلبہ سے پوچھتے کہ کس کس نے آتش بازی کی؟ تو جواب سے پتہ چلتا کہ اکثر طلبہ نے نہ صرف خود ان کی ہدایت پر عمل کیا بلکہ گھر کے دوسرے بچوں سے بھی اس پر عمل کرایا۔ ٹک بنک کا تجربہ بھی انہوں نے کیا۔

خدمت قرآن ان کا ایک بڑا موضوع اور ہدف تھا۔ باکس بنا کر لفظی ترجمے کا کام سب سے پہلے انہوں نے ہی کیا۔ بعد میں کئی لوگوں نے اس خدمت میں حصہ لیا۔ ایک دفعہ میں نے ذکر کیا کہ میں نے اس طرح کے سارے کام کو جمع کیا ہے اور ان کا تقابلی مطالعہ کر رہا ہوں تو کسرنفسی سے فرمایا کہ میرا کام کوئی ایسا وقیع اور علمی نہیں ہے بس خدمت کے نقطۂ نظر سے کر دیا تھا۔ ان کی یہی بےنفسی اور بےلوثی ان کا طرۂ امتیاز تھی۔ انہوں نے اپنا ترجمۂ قرآن ہر مسلک کے ایک بڑے عالم کو دکھایا اور اس کی ابتداء میں لکھا کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں ہے اور یہ سب کی طرف سے منظور شدہ ہے۔ وہ اتحاد امت کے داعی تھے اور فرقہ وارانہ اختلافات کو کم اور ختم کرنا ان کا ایک ہدف تھا۔ قرآن حکیم کے خط و کتابت کورسز انہوں نے جاری کیے، جیلوں میں قیدیوں کو قرآن پڑھانے کی جدوجہد انہوں نے کی۔ عمومی اسلامی دعوت کے علاوہ، جس کے لیے انہوں نے کئی طرح کے خط و کتابت کورسز جاری کر رکھے تھے، عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا اور مسلمانوں کو عیسائی ہونے سے بچانے کے لیے جدوجہد کرنا ان کی دینی سرگرمیوں کا ایک پہلو تھا۔ اس کے لیے انہوں نے 'اسلامی مشن' کے قیام اور تنظیم میں حصہ لیا اور اس کی سرگرمیوں کو منظم کیا۔ دینی مدارس کے بارے میں ان کی جائزہ رپورٹیں بھی انتہائی اہمیت کی حامل تھیں اور یہ کام انہوں نے اُس وقت کیا جب کوئی دینی مدارس اور ان کی اہمیت سے اس طرح واقف نہیں تھا جیسے کہ اب لوگ مغرب کی مخالفت کی وجہ سے ہیں۔

حافظ صاحب کی ایک خوبی پابندئ وقت تھی۔ ایک صاحب نے ان سے حدیث کے حوالے سے کوئی کام کروانا چاہا۔ حافظ صاحب نے وقت نہ ہونے کی وجہ سے معذرت کر لی۔ اس نے اصرار کیا تو کہنے لگے کہ چھوڑ جائیں چار مہینے میں یہ کام ہو جائے گا۔ اس نے کہا اتنے تھوڑے سے کام کے لیے چار مہینے۔ حافظ صاحب نے کہا: آپ کے اصرار پر میں نے اپنے نظام الاوقات کا جائزہ لیا ہے۔ میں

اس میں سے صرف دس منٹ روزانہ دے سکتا ہوں۔ آپ یہ کام چھوڑ جایئے اور چار مہینے سے پہلے نہ آیئے۔ وہ چار مہینے بعد آئے تو کام تیار تھا۔

تین چار سال پہلے حافظ صاحب کی بینائی کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہوگئی تو ان کی ساری دینی و دعوتی سرگرمیاں آہستہ آہستہ ختم ہوتی گئیں۔ ایک دفعہ راقم ملنے گیا تو ان کے بیٹے نے کہا کہ وہ تو دیکھ نہیں سکتے آپ کو کیسے پہچانیں گے؟ میں نے اصرار کیا کہ مجھے ملوائیں تو سہی۔ جب ملے اور میں نے کہا''حافظ صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ، آپ کی صحت اب کیسی ہے؟'' تو فوراً پہچان لیا۔ بڑی شفقت سے ملے اور کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ان پر رقت کا غلبہ ہو رہا تھا اور بار بار کہتے تھے کہ میرے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے نبی کریم ﷺ کی شفاعت نصیب فرمائے۔

یہاں ایک بات کہنے کو جی چاہتا ہے ان لوگوں کی اولاد اور لواحقین سے جنہوں نے اپنی زندگی دینی جدوجہد کی متنوع سرگرمیوں میں گزار دی کہ جب وہ بوڑھے اور کمزور ہو جائیں اور خود حرکت کرنا اور چلنا پھرنا ان کے لیے دوبھر ہو جائے تو ان لواحقین کا اتنا ہی فرض نہیں ہے کہ وہ ان کے کھانے پینے اور ان کے لباس کا خیال رکھیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ان کی پبلک لائف کا بھی خیال کریں مثلاً ان کے حلقۂ احباب کو بتا دیا جائے کہ وہ ہفتے میں ایک یا دو دن فلاں وقت ملاقات کے لیے میسر ہوں گے۔ یہ لوگ جنہوں نے ساری زندگی دینی سرگرمیوں میں حصہ لیا ہوتا ہے، جسمانی طور پر کمزور ضرور ہوتے ہیں لیکن اکثر ذہنی طور پر مستعد ہوتے ہیں۔ لوگ ان سے اور ان کے عمر بھر کے تجربات سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ پھر یہ کہ ایسی سرگرمیوں سے متعلق سوچنا اور کچھ کہنا خود ان کے لیے بہت فرحت انگیز تجربہ ہوتا ہے اور وہ اپنے تجربات نئی نسل سے شیئر کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے یہ ان کے ساتھ ظلم ہے کہ انہیں کمرے میں بند کر دیا جائے اور انہیں کسی سے ملنے جلنے کے مواقع نہ دیے جائیں۔ بلکہ اولاد کی سعادت مندی کا یہ بھی تقاضا ہے کہ وہ ہفتے میں کم از کم ایک یا دو دن انہیں لوگوں سے ملنے کا موقع ضرور دیں تا کہ ان کے لیے زندگی کا ایک روزن ضرور کھلا رہے اور وہ جیتے جی زندہ درگور نہ ہو جائیں اور جب ان کی موت کا اعلان ہو تو اکثر لوگ یہ کہتے نہ پائے جائیں کہ اچھا یہ بزرگ ابھی زندہ تھے ہم تو سمجھے تھے کہ فوت ہو چکے ہیں۔

حافظ صاحب نے ایک بھرپور دینی زندگی گزاری لیکن کبھی کوئی جماعت یا ادارہ نہیں بنایا۔ ان کی ساری جدوجہد اخلاص، سادگی، بے نفسی اور بے لوثی پر مبنی تھی۔ نہ نام و نمود کی خواہش نہ نام وری کی تمنا۔ قرآن کی خدمت، اسلام کی دعوت، تعلیم کی اصلاح، مسلک پرستی سے دوری اور اتحاد امت کی خواہش۔ یہ تھے ان کے بنیادی اوصاف۔ حق مغفرت کرے عجب اطاعت گزار بندہ تھا۔

تعارف کتب مبارک حیدر

'تہذیبی نرگسیت' اور 'مغالطے مبالغے'

ہمیں ایک فاضل دوست نے توجہ دلائی کہ مبارک حیدر صاحب کی یہ دو کتابیں دیکھیں (مطبوعہ سانجھ، ٹیمپل روڈ، لاہور) اور ان پر البرہان میں تفصیلی تبصرہ کریں کہ یہ کتابیں نہایت زہریلی ہیں اور ان کا تفصیلی پوسٹمارٹم ہونا چاہیے۔ البرہان کے ایک ادارتی مشیر نے کتابیں دیکھ کر رائے دی کہ انہیں گمنام ہی رہنے دیا جائے اور ان کا تعارف کرا کے خواہ مخواہ ان کی 'مشہوری' نہ کی جائے۔

مبارک حیدر صاحب نے 'مغالطے مبالغے' میں چھ مغالطوں اور چار مبالغوں پر قلم اٹھایا ہے اور ان چھ مغالطوں کا رد کرتے ہوئے انہوں نے اندازاً چھ ہزار مغالطے مزید پیدا کر دیے ہیں اور چار مبالغوں کا رد کرتے ہوئے ان میں کم از کم چار ہزار مبالغوں کا اضافہ کر دیا ہے۔ یہی حال 'تہذیبی نرگسیت' کا ہے کہ اس میں وہ علماء، اسلامی تحریکوں، غلبۂ اسلام، نفاذِ شریعت، نظریۂ پاکستان، اسلامی حکومت، اتحاد امت اور بحالی خلافت جیسے نظریات کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔

اگرچہ بعض جگہ انہوں نے قرآن و حدیث کے حوالے بھی دیے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ ان کا پوائنٹ آف ریفرنس اور ان کی فکر کا منبع نہ اسلام ہے اور نہ قرآن بلکہ وہ ان چند 'دانشوروں' کی باقیات میں سے ہیں جنہیں کمیونزم و سوشلزم نے مسحور کیا تھا لیکن ان نظریات اور ان کے علمبردار روس کی شکست و ریخت کے بعد وہ مشرف بہ امریکہ و تہذیب مغرب ہو گئے ہیں گویا ان کی فکر کمیونسٹ زندیقیت اور مغربی تہذیب کے الحاد کا جہل مرکب ہے۔ یوں مبارک حیدر صاحب کی یہ دونوں کتابیں اسلامی حوالے سے فکری یولیدگی اور نظریاتی خلفشار کا اعلیٰ نمونہ ہیں اور اپنے قاری میں یہی بیماریاں پیدا کرتی ہے۔

اتنی سخت تنقید کے بعد ناانصافی ہو گی اگر ہم مصنف اور ان کی کتابوں کی بعض خوبیوں کا ذکر نہ کریں۔ مصنف نے ہمارے معاشرے اور اس کے مختلف طبقات میں پائے جانے والے تضادات کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور انہیں ابھارا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر تضادات موجود ہیں لیکن ہم نے ان پر آنکھیں بند کر رکھی ہیں اور اگر کوئی ان پر بولے تو وہ گردن زدنی قرار پاتا ہے۔ اگر ہمیں اپنے معاشرے کی بقاء، استحکام اور حسن سے دلچسپی ہے تو ہمیں خود احتسابی کو اپنانا ہوگا اور اپنی بدصورتیوں کے اظہار کو برداشت کر کے ان کا علاج کرنا ہوگا ــــ لیکن یہ کام مین اسٹریم کے اندر رہ کر ہونا چاہیے نہ کہ مبارک حیدر صاحب کی فکر کے مطابق۔

مصنِف اور مصنَف کی دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی بات ٹھنڈے دل و دماغ سے کرتے ہیں۔ وہ نہ جذباتی ہوتے ہیں اور نہ پھکڑ بازی پہ اترتے ہیں۔ تھوڑی بہت تلخی کا تو نفسیاتی جواز بھی ہے اور وہ گوارا بھی ہونی چاہیے گو جدید اسلامی تحریکوں کے نوجوان کارکنوں کے لیے ان کی تحریریں اشتعال انگیز ثابت ہو سکتی ہیں۔

نان ایشوز

پچھلے دنوں تحریک حرمتِ رسول کے مطالبے پر ہڑتال ہوئی تو ایک صاحب کہنے لگے کہ ہمارے علماء بھی عجیب ہیں کہ بھوک، افلاس اور جہالت جیسے معاشرے کے زندہ مسائل پر تو کوئی تحریک نہیں چلاتے لیکن توہین رسالت، ختم نبوت اور اسلامی آئین جیسے نان ایشوز پر تحریکیں چلانے میں شیر ہیں۔ ہم نے کہا کہ ان ایشوز کو نان ایشوز کہنا تو شاید صحیح نہ ہو کہ ایشوز تو بہر حال یہ ہیں تاہم انہیں آپ نظری یا نظریاتی ایشوز کہہ سکتے ہیں اور ان کی اہمیت سے انکار بھی شاید ممکن نہ ہو۔ وہ صاحب کہنے لگے کہ یہ مسائل بہر حال ہمارے معاشرے کے زندہ مسائل نہیں ہیں۔ وہ مسائل جنہوں نے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے مثلاً لوگوں کو کھانے کو میسر نہیں ہے، لوگوں کے پاس پہننے کو کپڑے نہیں ہیں اور علاج و تعلیم کے لیے پیسے نہیں ہیں لیکن علماء ان باتوں پر کوئی تحریک نہیں چلاتے۔ کیا ان باتوں اور مسائل کا ہمارے دین سے کوئی تعلق نہیں؟ یا کیا ان مسائل کو حل کرنا ہمارے دین میں مطلوب نہیں ہے؟

[اگر علماء و سکالرز میں سے کوئی صاحب ان سوالات کا جواب دینا چاہیں
تو البرہان کے صفحات حاضر ہیں]

ہلال عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے

یہ شالامار میں اک برگِ زرد کہتا تھا
گیا وہ موسمِ گُل جس کا رازدار ہوں مَیں

نہ پائمال کریں مجھ کو زائرانِ چمن
انہی کی شاخِ نشیمن کی یادگار ہوں مَیں

ذرا سے پتّے نے بے تاب کر دیا دل کو
چمن میں آ کے سراپا غمِ بہار ہوں مَیں

خزاں میں مجھ کو رُلاتی ہے یادِ فصلِ بہار
خوشی ہو عید کی کیونکر کہ سوگوار ہوں مَیں

اُجاڑ ہو گئے عہدِ کہُن کے مے خانے
گزشتہ بادہ پرستوں کی یادگار ہوں مَیں

پیامِ عیش و مسرت ہمیں سناتا ہے
ہلالِ عید ہماری ہنسی اُڑاتا ہے

اقبالؔ

قانون توہین رسالت پر اختلاف

جاوید احمد غامدی، عمار ناصر اور مولانا زاہد الراشدی کا مؤقف

البرہان کا طرز عمل

البرہان کے قارئین کو پچھلے ایک سال میں اندازہ ہوگیا ہوگا کہ البرہان کے پیش نظر کیا ہے اور اس کے اہداف کیا ہیں؟ ہم چاہتے ہیں کہ مسلم فرد اور معاشرے کی اصلاح ہو، اس کا نظام تعلیم و تربیت بدلے، معاشرے میں اتحاد و یکجہتی ہو، دینی وسیاسی قیادت اور سول سوسائٹی کے صالح عناصر معاشرے کی اصلاح اور مسائل کے حل کے لیے متحرک ہوں تا کہ فرد اور معاشرہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق زندگی گزارے ــــ اور یہ اتنے بڑے مقاصد ہیں کہ ان کے لیے کام کرتے ہوئے اور ان کا حق ادا کرنے کے لیے نہ ہمارے پاس کافی وقت ہے اور نہ وسائل چہ جائیکہ ہم اختلافی امور میں پڑیں اور ان لوگوں سے مشاجرت کرتے پھریں جنہیں ہمارے مؤقف سے اختلاف ہو یا جن سے ہمیں اختلاف ہو لیکن اس کے باوجود البرہان کے تازہ شمارہ میں جاوید احمد غامدی صاحب، عمار ناصر صاحب اور مولانا زاہد الراشدی صاحب کے حوالے سے طویل تحریریں موجود ہیں۔ آخر کیوں؟

بنیادی مسئلہ کچھ اور ہے

ظاہر ہے افراد سے الجھنا بے وقوفی ہے اور نہ ہمیں کسی سے ذاتی پرخاش ہے کہ الجھیں۔ اصل چیز ایشوز ہوتے ہیں اور ہم نے قلم اٹھایا ہے تو ایک اہم ایشو پر اور وہ ایشو یہ ہے کہ عصر حاضر میں مغربی فکر وتہذیب کے بارے میں مسلم اہل علم کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ ظاہر ہے دینی حوالے سے سوچنے والا کوئی فرد آج اس سوال پر سوچے بغیر اور اس سوال کا جواب دیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا کیونکہ یہ آج کے مسلم فرد اور معاشرے کا بہت بڑا ــــ اور ایک لحاظ سے سب سے بڑا ــــ مسئلہ ہے لہٰذا کوئی مسلم سکالر، عالم، مفتی، محقق اور کوئی اسلامی تحریک، جماعت، تنظیم اور ادارہ اس سوال کا جواب دیے بغیر اور اس بارے میں کوئی مؤقف قائم کیے بغیر نہیں رہ سکتا (اور جو لوگ بظاہر اس سوال سے صرف نظر کرتے ہیں وہ بھی اس کے بارے میں عملاً کوئی نہ کوئی رائے قائم کیے ہوئے ہوتے ہیں)۔

اس بارے میں ہمارا مؤقف یہ ہے کہ مغربی تہذیب اپنی فکری اساسات اور عملی مظاہر کے لحاظ سے الحاد پر مبنی ہے اور اس تہذیب کے علم بردار اسلام اور مسلم دشمن ہیں لہٰذا ہمیں مغربی فکر وتہذیب کو رد کر دینا چاہیے اور اس امر کے باوجود کہ وہ آج کی غالب فکر اور تہذیب ہے، نہ اس سے مرعوب ہونا چاہیے اور نہ اس کی پیروی کرنی چاہیے بلکہ اسلامی احکام کی تشریح اور اسلامی منہج کی تشکیل اسلامی

اصولوں اور اسلامی مفاد کے مطابق کرنی چاہیے۔ تاہم فروعات میں اس تہذیب کے ایسے پہلوؤں سے محتاط اخذ و استفادہ کیا جاسکتا ہے جو اسلامی تعلیمات و مقاصد کے خلاف نہ ہوں کہ وہ ایک انسانی تجربہ تو بہرحال ہیں ہی۔

ہمارے اس مؤقف کے برعکس جناب جاوید احمد غامدی صاحب (اور ان کے تلامذہ) کا رویہ یہ ہے کہ وہ اسلام اور مغربی فکر وتہذیب میں مغائرت نہیں سمجھتے چنانچہ اسلامی احکام کی تشریح وہ اس طرح کرتے ہیں کہ مغربی تہذیب کے اصول و مظاہر کو وہ مطابق اسلام قرار دے کر جائز قرار دیتے ہیں☆ ہم اس رویے کو متجددانہ اور ناقابل قبول سمجھتے ہیں اور کچھ عرصہ پہلے ہم نے اس موضوع پر ایک مقالہ لکھا تھا جو اب ہم البرہان میں دے رہے ہیں۔

قانون توہین رسالت

مسئلہ توہین رسالت پر جاوید غامدی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اور ان کے تلمیذ خاص جناب عمار ناصر صاحب نے مہارت سے اسے آگے بڑھایا ہے وہ بھی یہی پس منظر رکھتا ہے کہ اہل مغرب خود بھی توہین رسالت کرتے ہیں (ڈنمارک کے کارٹون، ہالینڈ کی فلم وغیرہ) اور مسلمانوں میں سے جو دریدہ دہن ہوں ان کی بھی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور انہیں پناہ اور حمایت مہیا کرتے ہیں (سلمان رشدی، تسلیمہ نسرین وغیرہ)۔ اس پس منظر میں جب پاکستان کی ملت اسلامیہ نے قانون سازی کرلی اور شاتم رسول کے لیے سخت سزا (سزائے موت) مقرر کردی تو اب امریکہ اور یورپ اس قانون کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ یہ ظالمانہ اور کالا قانون ہے اسے ختم کردیا جائے یا کسی طرح اسے غیر مؤثر بنادیا جائے یا اس کی سزا کم کردی جائے تاکہ اس امر کی شناعت میں کمی آئے اور اسے کرنے والوں کی حوصلہ افزائی ہو۔ ان کے مقامی چیلے چانٹے بھی اپنے آقایانِ ولی نعمت کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے انہی باتوں کا یہاں مطالبہ کررہے ہیں۔ اس پس منظر میں جاوید غامدی صاحب کے تلمیذ خاص عمار ناصر صاحب کا یہ مطالبہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس قانون پر نظر ثانی ہونی چاہیے اور اس کی سزا کم کی جانی چاہیے بلکہ مجرم کو معافی کا حق ملنا چاہیے۔

اس مؤقف کے حق میں جاوید غامدی صاحب نے جو علمی نکتہ پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ احناف میں سے بعض نے گستاخیٔ رسول کو رِدّۃ (ارتداد) قرار دیا ہے کہ ایسا کرنے والا مسلمان نہیں رہتا، اہل ایمان سے خارج ہوجاتا ہے اور چونکہ ارتداد کے بارے میں معروف ہے کہ اس کے مرتکب کو توبہ کا موقعہ دیا جاتا اور اس کی توبہ قبول کی جاتی ہے لہٰذا آج کے شاتم رسول کو بھی توبہ کا موقع دیا جانا چاہیے

☆ اور یہ رویہ بھی کوئی نیا نہیں۔ امت مسلمہ ماضی بعید میں معتزلہ کو اور ماضی قریب میں سرسید، امیر علی، قادیانی، چکڑالوی اور پرویز صاحب وغیرہ کو بھگت چکی ہے۔

اور اس کی معافی بھی قبول ہونی چاہیے۔ اپنے استاد امام کی بات کو جناب عمار ناصر صاحب نے اپنی علمی تحریر میں یوں پیش کیا ہے کہ احناف کا اکثریتی اور حقیقی مؤقف تو توہین رسالت کو ارتداد سمجھنے اور توبہ کے قبول کرنے کا ہے لہٰذا جو لوگ پاکستان کے قانون توہین رسالت (جس میں شاتم کی سزا سزائے موت ہے) کی حمایت کرتے ہیں وہ گویا احناف کے اکثریتی مؤقف کو نظر انداز کررہے ہیں۔☆ اس پر بعض اہل علم نے ان کو جواب دیا کہ احناف کا اکثریتی مؤقف یہ نہیں ہے البتہ بعض احناف کا یہ مؤقف ضرور رہا ہے اور یہ کہ احناف میں بھی مفتیٰ بہ قول جمہور کی موافقت ہی کا ہے۔

اس بحث پر تبصرہ کرتے ہوئے انتہائی خوبصورت بات مولانا زاہد الراشدی صاحب نے ماہنامہ الشریعہ کے اکتوبر کے اداریے میں کہی ہے کہ ''فقہائے کرام کے علمی وفقہی اختلافات میں حسن وکمال کا ایک خوبصورت پہلو یہ بھی ہوتا ہے کہ وقت کے تقاضوں اور حالات کی ضروریات کے مطابق آپ کے پاس گنجائش موجود رہتی ہے کہ آپ مصلحت عامہ اور ملی مفاد کی خاطر ان میں سے کوئی مؤقف بھی اختیار کرسکتے ہیں۔ اس لیے اپنے ہی بزرگوں اور اسلاف میں سے کسی کے اختیار کردہ مؤقف کو باطل ثابت کرنے کی بے محل بحثوں میں الجھے رہنے کی بجائے اپنی علمی صلاحیتیں اور توانائیاں یہ واضح کرنے پر صَرف کریں کہ آج جس انداز میں مغرب کی ثقافتی یلغار ہماری دینی اقدار اور ملی روایات کو پامال کرنے میں مصروف ہے، توہین رسالت کا مسئلہ نارمل صورت حال میں رہنے کی بجائے مسلمانوں کے مذہبی جذبات سے کھیلنے کی عالمی مہم کی صورت اختیار کرگیا ہے اور جناب نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی کے ساتھ مسلمانوں کی بے لچک جذباتی وابستگی کو جس شرم ناک طریقے سے چیلنج کیا جارہا ہے، اس کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ گستاخ رسول کی سزا کو سخت سے سخت کیا جائے اور اس معاملہ میں کوئی لچک روا نہ رکھی جائے، جبکہ بہت سے فقہا کے ہاں حکومت وقت کو سیاستاً حد سے بھی زیادہ سخت اور سنگین سزا مقرر کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس سادہ اور واضح استدلال کے ہوتے ہوئے توہین رسالت پر سزائے موت کے حوالے سے غیر ضروری فقہی اور فنی مباحث میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے؟'' اس کا مطلب اس کے سوا کیا لیا جاسکتا ہے کہ جاوید غامدی صاحب اور عمار ناصر صاحب نے احناف کے مؤقف کے حوالے سے شاتم رسولؐ کی سزا پر نظر ثانی اور تخفیف کا جو مطالبہ کیا ہے وہ بلا جواز اور ناقابل قبول ہے۔

ماہنامہ الشریعہ کی پالیسی

ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ کے رئیس التحریر جناب مولانا زاہد الراشدی صاحب ہمارے دوست اور ملی مجلس شرعی میں ہمارے رفیق کار ہیں۔ الشریعہ کی پالیسی کے حوالے سے ان کے دوسرے بہت

☆ مطلب یہ کہ لوگ توہین رسالت کریں اور پھر معافی مانگ کر گھر آ جائیں اور یوں توہین رسالت کھیل تماشا بن جائے

سے دوستوں اور اہل علم کی طرح ہمیں بھی ان سے اختلاف اور گلہ تھا اور ہے۔آج سے کچھ عرصہ پیشتر (جون ۲۰۰۹ء میں) انہوں نے الشریعہ میں اس پر بحث چھیڑی اور اپنے طرز عمل کا دفاع کیا ہم نے بھی اس بحث میں شریک ہونے کے لیے کچھ لکھا لیکن ان کے والد گرامیؒ کی وفات کی وجہ سے وہ بحث آگے نہ بڑھ سکی۔ وہ تحریر بھی ہم البرہان میں دے رہے ہیں۔

اس بارے میں مولانا کا مؤقف یہ ہے کہ ہمارے ہاں عموماً کھلی بحث کا رواج نہیں ہے اور لوگ عموماً اپنے مسلک، اجتہاد اور تدبیر پر مبنی رائے کو قرآن حکیم کی طرح حرف آخر سمجھنے پر اصرار کرتے ہیں لہٰذا وہ اپنے جریدے میں کھلے بحث مباحثہ کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں تا کہ مسئلہ زیر بحث کے مختلف پہلو سامنے آسکیں۔ہمیں اصولاً ان کے مؤقف سے اختلاف نہیں ہے اور کچھ حدود و قیود کے ساتھ اس پالیسی پر عمل کیا جاسکتا ہے لیکن گڑبڑ یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنے جریدے کی کرسئ ادارت پر ایک ایسے شخص کو بٹھایا ہوا ہے جو جاوید غامدی صاحب کا دستِ راست اور تلمیذ خاص ہے اور علماء کرام کی بہت بڑی اکثریت جاوید غامدی صاحب کو سنت کا استخفاف، انکار اجماع اور قرآن کی من مانی تشریح کرنے والے کی حیثیت سے پہچانتی اور گمراہ سمجھتی ہے۔ مدیر کی حیثیت سے ان کے بیٹے عمار ناصر صاحب کو اپنے مخدوش دینی مؤقف کو پھیلانے اور اسے شرح و سبط سے پیش کرنے کا موقع ملتا ہے اور وہ بعض اوقات مخالفین کے ساتھ توازن بھی برقرار نہیں رکھ سکتے لہٰذا علماء کرام اور دوستوں کا مولانا زاہد الراشدی صاحب سے مطالبہ یہ رہا ہے کہ وہ اپنے جریدے کی ادارت سے اپنے مذکورہ بیٹے کو ہٹادیں، خود اس کی ادارت سنبھالیں یا کسی صحیح اور معتدل دینی مؤقف رکھنے والے شخص کو اس کا مدیر مقرر کریں۔مولانا اپنے فیصلے کی مدافعت کرتے ہیں لہٰذا خود ان کے بارے میں چہ میگوئیوں کو راہ ملتی ہے اور لوگوں کو بدگمانی کا موقع ہاتھ آتا ہے اور بعض لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ جاوید غامدی صاحب نے عمار ناصر صاحب کو آگے رکھا ہی اس لیے ہے کہ وہ اس علمی خانوادے کو استعمال کر کے علماء دیوبند کے حلقے میں نفوذ کریں اور مولانا زاہد الراشدی صاحب اس کام میں بیٹے کی سرپرستی کررہے ہیں ورنہ اگر وہ غامدی صاحب کے درپردہ حامی نہ ہوتے تو اپنا رسالہ بیٹے کے حوالے نہ کرتے ۔ لہٰذا ان کے دیگر دوستوں کی طرح ہم بھی مولانا سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو مواقع تہمت سے بچائیں، اپنے خیر خواہوں کی بات پر سنجیدگی سے غور فرمائیں اور عمار ناصر صاحب کی بجائے کسی اور موزوں شخص کو الشریعہ کا مدیر مقرر کریں۔

تجدد - ایک غلط فکری منہج

جاوید احمد غامدی صاحب کے افکار پر ایک نظر

ہمیں عرصہ تک اس موضوع پر قلم اٹھانے میں تامل رہا کہ اپنی ٹوٹی پھوٹی (اور اپنے تئیں مثبت اور تعمیری) سرگرمیوں کو چھوڑ کر کسی ایسے شخص کی آراء کے بارے میں، جس سے آپ کو اختلاف ہو، قلم اٹھانا ہمیں مناسب نہ لگتا تھا لیکن اب احباب کے اصرار اور توجہ دلانے پر کہ محترم غامدی صاحب اور ان کے تلامذہ[1] کے بکثرت میڈیا میں آنے، دینی بحثوں میں حصہ لینے اور شعبۂ تعلیم میں مورچہ بندی[2] کی وجہ سے ان کی فکر معاشرے میں پھیل رہی ہے لہٰذا اہل علم اور عوام کی توجہ ان کے موقف کی خامیوں کی طرف دلانا ضروری ہے تاکہ وہ اس حوالے سے متوازن رائے قائم کر سکیں، اس لیے یہ سطور قلم بند کی جا رہی ہیں۔[3]

مضمون چونکہ طویل ہو گیا ہے اس لیے ہم نے اس کے مندرجات کی فہرست مرتب کر دی ہے۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ مضمون کے مندرجات ایک نظر میں سامنے آ جاتے ہیں اور پتہ چل جاتا ہے کہ مضمون کے اندر ہے کیا۔ دوسرے اگر کوئی قاری مضمون کا کوئی خاص جزو دیکھنا چاہے تو صفحہ نمبر کی موجودگی میں اسے تلاش کرنے میں آسانی رہے گی۔

۱۔ جاوید صاحب نے بڑی محنت سے اپنے شاگردوں کی ایک ٹیم تیار کی ہے جن میں سے نمایاں جناب خورشید احمد ندیم صاحب، عمار ناصر صاحب، ڈاکٹر خالد ظہیر صاحب، رفیع مفتی صاحب، طالب محسن صاحب اور ڈاکٹر شہزاد سلیم صاحب وغیرہ ہیں۔

۲۔ المورد کے تجربے کے بعد میاں عامر محمود صاحب نے اپنی یونیورسٹی (یونیورسٹی آف سنٹرل پنجاب/UCP) کا شعبۂ اسلامیات ان کے سپرد کر دیا ہے جہاں وہ ڈاکٹر خالد ظہیر صاحب کی سربراہی میں جاوید غامدی صاحب کی فکر کے مطابق اسلامی علوم کے ماہرین تیار کر رہے ہیں اور چونکہ انہوں نے فیس برائے نام رکھی ہے لہٰذا ملازمت کے لیے ڈگری کے خواہش مند طلبہ (خصوصاً دینی مدارس سے آنے والے طلبہ) وہاں دھڑا دھڑ داخلہ لے رہے ہیں اور توقع ہے کہ مستقبل میں ان میں سے بہت سے لوگ جاوید صاحب کی فکر کے علمبردار ہوں گے۔

۳۔ یہ تحریر اندازاً دو سال قبل کی ہے اور اب اشاعت کے لیے دیتے وقت اس پر معمولی نظر ثانی کی گئی ہے۔

مضمون کے مندرجات — ایک نظر میں

معاشرت

متفرق

دوسری دلیل: غامدی صاحب کا منہج فکر اور طریق استنباط جمہور امت سے الگ اور شاذ ہے

تجدد - ایک غلط فکری منہج

جاوید احمد غامدی صاحب کے افکار پر ایک نظر

ہماری دانست میں، اگر ہم مسئلے کا تعین کرنا چاہیں تو وہ ہے عصر حاضر میں اسلام کی تفہیم وتشریح اور اجتہاد۔ مغربی فکر وتہذیب کے تناظر میں۔

اسلام

اصولاً تو اسلام ہی سارے انبیاء کا دین رہا ہے اور اسے ماننے والے مسلمان ہی تھے لیکن آج کل دوسرے ادیان و مذاہب سے الگ تشخص کے اظہار کے طور پر اسلام اس دین (اور شریعت) کو کہتے ہیں جس کی دعوت حضرت محمد ﷺ نے دی اور صرف ان کے پیروکار ہی مسلمان کہلاتے ہیں۔ اصولی اور نظری طور پر اسلام کے بنیادی مآخذ قرآن وسنت ہیں جو مسلمانوں کے ہاں پچھلے چودہ سو سال سے محفوظ چلے آ رہے ہیں لیکن اسلام نے جب ایک معاشرے اور تہذیب کی صورت اختیار کی تو عملی زندگی میں ان مآخذ کے ساتھ ان کی تفہیم وتشریح اور اس تفہیم وتشریح کے مطابق عمل بھی اہمیت اختیار کر گیا اور اسلام کا ایک جزو اور مظہر بنتا چلا گیا۔

اسلام اور عصر حاضر

پیغمبر ﷺ نے اسلامی تعلیمات کے مطابق جو معاشرہ قائم کیا وہ الحمد للہ پچھلے چودہ سو سال سے بلا انقطاع قائم چلا آ رہا ہے اور اس میں توسیع ہی ہوئی ہے تخفیف نہیں (سوائے اندلس جیسی ایک آدھ استثنائی مثال کے)۔ لہٰذا اس دوران امت کے بہترین دماغوں نے اسلام کی تفہیم وتشریح اور اس پر عمل کے حوالے سے جو عظیم علمی وتحقیقی کام کیا ہے وہ آج ہمارے پاس موجود بھی ہے اور محفوظ و مامون بھی۔ لہٰذا عصر حاضر کے حوالے سے اسلام کی Relevance پر غور کرتے ہوئے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ چودہ سو سال کا تاریخی سفر طے کر کے آج اسلام کس کیفیت و حالت میں ہے خصوصاً اس کی تفہیم وتشریح اور اس پر عمل کے حوالے سے ☆

اس پس منظر میں ہم اسلام اور عصر حاضر کی Relevance کے بارے میں سوچیں تو دو اہم نکات ہمارے سامنے آتے ہیں:

اولاً: یہ کہ مسلمان جب تک اپنے دین سے وابستہ رہے اور اس کے **مقتضیات** پر عمل کرتے رہے ان

☆ اگرچہ بعض لوگ ایسے مواقع پر 'اسلام' کی بجائے 'مسلم' کا لفظ استعمال کرنا قابل ترجیح سمجھتے ہیں جیسے 'اسلامی تاریخ' کی بجائے 'مسلم تاریخ' کہنا --- تاہم ہمارے نزدیک یہ محض لفظی اور تسمیہ کا اختلاف ہے لہٰذا غیر اہم ہے۔

میں وہ اوصاف بھی باقی رہے جو اس عالم اسباب میں دنیا میں ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کے لیے ضروری ہیں۔ چنانچہ مسلمان ایک ہزار سال تک علم و تحقیق میں، تمدن و تہذیب میں، سائنس و ٹیکنالوجی میں، کاروبار اور تجارت میں، آلات ضرب و حرب میں۔۔۔ دنیا کے امام رہے لیکن جب اپنے نظریۂ حیات سے ان کی وابستگی کمزور ہوگئی اور انہوں نے اس کے مقتضیات پر عمل کرنا چھوڑ دیا تو منطقی طور پر ان میں وہ اوصاف بھی ناپید ہوتے چلے گئے جن کے بغیر اس عالم اسباب میں ترقی واستحکام ممکن نہیں چنانچہ وہ بتدریج زوال پذیر ہوتے چلے گئے۔

ثانیاً: اسلام اور مسلمانوں کے حریف عیسائی اہل مغرب نے، جو ماضی میں مسلمانوں سے علمی، نظریاتی اور دفاعی لحاظ سے شکست کھا چکے تھے — اور انتقام، نفرت اور ردعمل کی نفسیات کے تحت اب قوت پکڑ چکے تھے — انہوں نے جب مسلمانوں کو روبہ زوال دیکھا تو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کر کے ان کی کمزور اور ہلتی ہوئی دیوار کو دھکا دے کر زمیں بوس کر دیا۔

انہوں نے نہ صرف مسلم علاقوں پر قبضہ کیا، انہیں خوب کچلا، ان کے وسائل لوٹے اور ان کو غلام بنا لیا بلکہ انہوں نے مسلمانوں کے سارے اجتماعی ادارے بھی تباہ و برباد کر دیئے اور ان کی جگہ اپنی فکر ونظر کے مطابق مسلم معاشرے میں نئے اجتماعی ادارے تشکیل دیئے تاکہ مسلمان ہمیشہ ان کے غلام رہیں اور کبھی سر اٹھا کر ان کے مدمقابل نہ آسکیں۔ یہاں یہ ذکر کرنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ برصغیر میں پہلے مرحلے میں انہوں نے کوشش کی کہ مسلمان اسلام کو چھوڑ دیں اور ان کا مذہب (عیسائیت) اختیار کر لیں لیکن شکست خوردگی کی حالت اور درماندگی کے باوجود مسلمان امت اس پر راضی نہ ہوئی اور نہ عیسائی علماء اور مناظر مسلمانوں کو مذہبی حوالے سے شکست دے سکے۔ چنانچہ استعمار نے اب پینترا بدلا اور نظام تعلیم و تربیت اور ذہن سازی و شخصیت سازی پر اثر انداز ہونے والے دیگر عوامل کے ذریعے یہ انتظام کیا کہ وہ مسلمانوں کے دل و دماغ کو فتح کرے اور انہیں اپنی فکر و تہذیب کا شائق بنا دے خواہ وہ نام کے مسلمان ہی رہیں [1]۔

اس منصوبے میں انہیں خاصی کامیابی ہوئی اور جلد ہی وہ مسلمانوں میں سے ایسے لوگ کھڑے کرنے میں کامیاب ہو گئے جنہوں نے اس منصوبے میں ان کا ساتھ دینے کی ابتداء کر دی۔ برصغیر کے تناظر میں اس موقع پر دو افراد کا ذکر کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ ایک غلام احمد قادیانی جس نے نبوت کا دعوی کیا اور مسلمانوں میں سے جذبۂ جہاد ختم کر کے انہیں انگریز کی غلامی کا درس دیا اور دوسرے سرسید احمد خان جنہوں نے اہل مغرب کے نظام تعلیم کو مسلمانوں میں مقبول بنانے اور مسلمانوں کو مغرب پرستی سکھانے میں اہم کردار ادا کیا۔

دوسری جانب چونکہ اہل مغرب کا نظریۂ حیات فاسد بنیادوں پر قائم تھا لہٰذا ان کی باہمی لڑائیوں (جنگ عظیم اول اور دوم) نے انہیں کمزور کر دیا اور بیسویں صدی عیسوی کے وسط میں اکثر مسلمان ممالک ان کے شکنجے سے نکل گئے۔ تاہم عیار استعمار نے اب بھیس بدل لیا اور ایک نئے روپ میں مسلمانوں کے سروں پر مسلط رہنے کی کامیاب منصوبہ بندی کر لی۔ اس منصوبہ بندی کے اہم اجزاء یہ تھے:

۔ اس نے مسلم ممالک سے نکلنے کے بعد اقتدار ان لوگوں کے سپرد کیا جو اس کے تعلیمی اداروں کے فارغ التحصیل تھے، اس کے تربیت یافتہ اور اس کی فکر وتہذیب سے مرعوب اور اس کے شائق تھے اور اسے ہی بہترین طرز زندگی سمجھتے تھے۔ اس طرح اُس نے مسلم قیادت اور عوام کے درمیان بعُد اور کشمکش کی بنیاد رکھ دی اور سیاسی عدم استحکام کا پودا کاشت کر دیا۔ اس نے اپنے ان کاسہ لیس مسلم حکمرانوں کو اقتدار میں رکھنے اور اسلامی عناصر کو کچلنے اور ناکام بنانے میں ان کی بھرپور مدد کی۔ اس کے ساتھ ہی انہیں انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ (IMF) اور ورلڈ بنک جیسے یہودی مالیاتی اداروں سے سودی قرضے دے کر انہیں موقع دیا کہ وہ انہیں اللوں تللوں میں اڑا دیں۔ یوں انہوں نے مسلم معاشروں کو معاشی طور پر کمزور کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے مسلم معاشروں میں ذہن سازی اور شخصیت سازی کرنے والے اداروں (نظام تعلیم اور میڈیا۔۔۔وغیرہ) کو ترغیب اور دباؤ سے اور اپنے گماشتہ حکمرانوں کی مدد سے اپنے رنگ میں ڈھال لیا تاکہ یکسو اور صاحب کردار مسلم شخصیت جنم ہی نہ لے سکے۔ یوں مغربی استعمار نے مسلمان ممالک کو بظاہر آزادی دینے کے باوجود انہیں ان کے نظریۂ حیات سے دور رکھنے اور انہیں اپنی فکر وتہذیب کا شائق اور متبع بنانے میں کافی حد تک کامیابی حاصل کر لی۔

۔ تاہم اس کے باوجود بعض مسلم ممالک نظریاتی اور مادی حوالے سے کچھ ترقی کرنے اور سر اٹھانے کے قابل ہو گئے جس پر مغرب خصوصاً اس کے حالیہ سرخیل امریکہ نے پھر صلیبی جنگوں کی یاد تازہ کردی۔ چنانچہ پچھلی دہائی میں مغرب کی استعماری اور اسلام مسلم کش طاقتوں نے پہلے عراق کو تہس نہس کیا، پھر افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور آج کل پاکستان کی باری ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے ان کے شر اور سازشوں سے بچائے (آمین)۔

۔ امریکہ اور یورپ صرف طاقتور مسلم ممالک ہی کو کچلنا نہیں چاہتے بلکہ ان کا اصل ہدف اسلام ہے۔ ان کے سکالرز اور تھنک ٹینک اسلام کو ہوّا بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ کمیونزم کی شکست کے بعد انہیں نفسیاتی اور تزویراتی لحاظ سے ایک ''دشمن'' کی تلاش تھی جو انہوں نے 'اسلام' اور'

اسلامی تہذیب' کی صورت میں دریافت کرلیا ہے کیونکہ اسلام اپنی داخلی قوت کی بناء پر نہ صرف امریکہ و یورپ میں سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا مذہب ہے اور اکثر جگہوں پر عیسائیت کے بعد دوسرا بڑا مذہب بن چکا ہے بلکہ یہ دنیا کا واحد دین ہے جو مسلمانوں کی موجودہ ساری کمزوریوں کے باوجود مغربی فکر و تہذیب کی بالادستی کو تسلیم نہیں کرتا اور اس کی یونیورسلائیزیشن کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ چنانچہ مغربی حکومتوں خصوصاً امریکہ نے نہ صرف اسلام اور مسلمانوں کے خلاف میڈیا وار شروع کر رکھی ہے، مسلمانوں کو بنیاد پرست، انتہا پسند اور دہشت گرد مشہور کرنا اور پرامن ذرائع سے تعلیمی و نصابی تبدیلی اور الیکٹرانک میڈیا میں نفوذ کے ذریعے مسلمانوں کے دل و دماغ جیتنا اور اگر پھر بھی وہ قابو نہ آئیں تو انہیں حیلے بہانے سے کچل ڈالنا، اس پر تو عمل ہو ہی رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام کے قلع قمع کے لیے مستقبل میں جو پالیسی بنتی نظر آرہی ہے وہ ہے اسلام کے ایک امریکی ایڈیشن کی تیاری۔ اس کے لیے ایک جعلی قرآن طبع کر کے دنیا بھر میں تقسیم کیا جا رہا ہے۔ احادیث کی ''تدوین نو'' کا ایک بڑا منصوبہ ترکی میں زیر عمل ہے اور ہر مسلم ملک میں سے ایسے علماء و سکالرز چنے اور چھانٹے جا رہے ہیں اور ان کی سرپرستی کی جارہی ہے جو جدیدیت اور روشن خیالی کے نام پر مسلمانوں کو ان کی دینی روایات سے بیگانہ کرسکیں۔

عصر حاضر میں اسلام کی تفہیم وتشریح

یہ تھے اسلام اور مسلمانوں کے وہ حالات جن میں اسلام اور عصر حاضر کی Relevance ہمیں اپنے سامنے رکھنا ہوگی خصوصاً جب ہم عصر حاضر میں اسلام کی تفہیم و تشریح کی بات کریں گے۔ لیکن اس موضوع پر براہ راست گفتگو سے پہلے مناسب محسوس ہوتا ہے کہ ہم اسلام میں تفہیم و تشریح کی حدود پر کچھ گفتگو کر لیں اور اس ضمن میں زیر بحث آنے والی جدید، تجدید اور تجدد جیسی اصطلاحات کی کچھ وضاحت کر دیں۔

☆ اللہ تعالیٰ نے چونکہ حضرت محمد ﷺ کو آخری نبی قرار دیا تھا لہٰذا اس نے بعد میں آنے والے لوگوں کی ہدایت کے لیے یہ انتظام فرمایا کیا کہ:

اولاً: کتاب (قرآن حکیم) کی حفاظت کی ذمہ داری خود لی (۲)۔

ثانیاً: نبی کریم ﷺ کی دعوت کا دائرہ کار ساری انسانیت کو قرار دیا (۳)۔

ثالثاً: امت مسلمہ کو مشنری امت قرار دیا اور رہتی دنیا تک لوگوں تک دین پہنچانا اس کی ذمہ داری قرار دیا (۴)۔

رابعاً: قرآن کا اسلوب یہ رکھا کہ وہ امور جن کے بغیر معاشرہ صحیح بنیادوں پر قائم نہیں رہ سکتا تھا، ان کا ذکر تفصیل سے کر دیا اور بتا دیا کہ یہ اصول نا قابل تغیر ہیں۔ اور جن امور میں لچک اور تغیر کی ضرورت تھی، جیسے اجتماعی زندگی کے مختلف سانچے اور ادارے (جیسے سیاسی نظام، معاشی نظام۔۔۔وغیرہ) تو وہاں صرف پالیسی اصول دینے پر اکتفا کیا اور تفصیلات کا تعین امت (کے اہل علم) پر چھوڑ دیا کہ وہ قرآن وسنت کی نصوص کی روشنی میں اور مقاصد شریعت کو سامنے رکھتے ہوئے اجتماعی اداروں کی تفصیلات عصری ضرورتوں کے مطابق خود طے کر لیں۔ یہ منہاج 'اجتہاد' کہلاتا ہے۔ اور چونکہ انسانی تمدن ترقی کرتا رہتا ہے، انسانی ضرورتیں لامحدود اور قرآن وسنت کی نصوص محدود ہیں اور اسلام ہمیشہ کے لیے، سارے زمانوں، سارے معاشروں اور سارے انسانوں کا دین ہے لہٰذا اجتہاد کا اصول اور اس پر عمل اسلام میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

☆ نو پیش آمدہ امور، نئی ضرورتوں اور جدید تقاضوں کا لحاظ رکھنے کے لیے اگرچہ اجتہاد کا اصول کافی ہے (نصوص قرآن وسنت کی تشریح جس کا ایک جزو ہے) تاہم اس سلسلے میں بعض مزید تفصیلات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے:

- نبی کریم ﷺ نے، جن کا فرمان عالی شان ہر مسلمان کے لیے حجت ہے، فرمایا کہ ہر نئی بات قبول نہیں کر لی جائے گی بلکہ صرف وہ بات قبول کی جائے گی جو اسلام کی نصوص اور ان کی روح اور شریعت کے مزاج اور اس کے مقاصد سے مطابقت رکھتی ہو اور ان کے خلاف نہ ہو۔ جو بات ان اصولوں پر پوری اترے وہ جائز مصلحت ہے اور اس کا لحاظ رکھا جائے گا اور جو اس پر پوری نہ اترے وہ بدعت ہے اور اسے رد کر دیا جائے گا(۵)۔

- دین چونکہ اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے اور اس کی نصوص نا قابل تغیر ہیں لہٰذا اجتہاد کے مذکورہ بالا منہج کے علاوہ اسے کسی تغیر کی ضرورت نہیں۔ تاہم تجدید کا لفظ اس مفہوم میں مسلم روایت میں ضرور بولا جاتا ہے کہ دین کو نکھار کر پیش کرنا، اسے غیر صالح رسوم ورواج اور بدعات سے پاک صاف کرنا تا کہ دین اسلام کا اصل چہرہ اور روپ نکھر کر اور واضح ہو کر سامنے آ جائے اور لوگوں کے لیے اس پر عمل آسان ہو جائے (۶)۔ اس تجدید میں یہ بات بھی شامل ہے کہ دین کی تعلیمات ایسے اسلوب میں پیش کی جائیں جو اس عہد کے لوگوں کی ذہنی ساخت اور فکری ضرورتوں کے مطابق ہوں تا کہ لوگوں کو دین کی تفہیم اور اس پر عمل میں آسانی رہے۔

- تاہم اسلام میں 'تجدد' کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور نہ یہ قابل قبول ہے۔ تجدد، جیسا کہ باب تفعل کی خصوصیت ہے، یہ ہے کہ کسی ایسے امر کو جو اصلاً اسلام کی نصوص، اس کے مزاج، اس کی روح اور

اس کے مقاصد سے میل نہ کھاتا ہو اسے بوجوہ کھینچ تان کر اسلام کی تشریح وتاویل تبکلف اس طرح کی جائے کہ وہ اسلام کی نصوص، اس کے مزاج، اس کی روح اور اس کے مقاصد کے مطابق نظر آنے لگے۔ تجدد پر مبنی نصوص کی اس طرح کی تفہیم وتشریح اور اجتہاد کا سبب اگر غیر اسلامی اور اسلام مخالف نظریات سے مرعوب و متاثر ہو کر ان کی تائید و اثبات ہو اور ان کی طرف دعوت و اشاعت کا مقصد انہیں مسلمانوں کے لیے قابل قبول ٹھہرانا ہو تو بلاشبہ یہ ضلالت و گمراہی ہے اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس عمل کا محرک اگر ذاتی حب جاہ ومنصب و مال ہو تو یہ اسلام اور مسلمانوں سے غداری ہے۔

- تجدید وتجدد کے حوالے سے یہاں ایک دو اہم باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اجتہاد اور چیز ہے اور اسلام کی تفہیم وتشریح نو اور چیز۔ ان کا کہنا ہے کہ اجتہاد نئے پیش آمدہ امور پر اسلامی حوالے سے غور وفکر اور ان میں حکم شرعی کی دریافت اور اس کا وضع و اطلاق ہے اور یوں یہ ایک فقہی مسئلہ ہے جب کہ دین کی تجدید اور تفہیم وتشریح عمومی حیثیت رکھتی ہے اور ضروری نہیں ہے کہ اجتہاد اس کا ایک لازمی جزو ہو۔ ہم کہتے ہیں کہ بلاشبہ یہ فرق موجود ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ فرق محض اصطلاحی ہے ورنہ غایت اور منہج کے لحاظ سے دونوں میں اشتراک ہے۔

دیکھیے! اجتہاد کا بنیادی آلہ اور ذریعہ بھی نصوص اور ان کی وسیع تر تفہیم اور ایک سے زیادہ ممکنہ تشریح وتاویل ہی ہے، اگر چہ اس میں نصوص سے قیاس و استنباط اور ان کے مقاصد اور روح کا لحاظ بھی رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح اسلام کی تجدید کا انحصار بھی نصوص کی صحیح تفہیم وتشریح کے اثبات اور غلط تفہیم وتشریح کے رد پر ہوتا ہے۔ اسی طرح دین کو نئے ماحول، نئے اسلوب، نئے انداز اور نئے دلائل کے ساتھ پیش کرنا بھی مجتہدانہ فکر و تعامل کا مقتضی ہوتا ہے لہٰذا ہر مجدد اصلاً مجتہد بھی ہوتا ہے گو اسے اصطلاحاً مجتہد نہ بھی کہا اور سمجھا جائے۔

☆ تجدید اس لیے قابل قبول اور قابل مدح ہے کہ وہ اسلام کے اصل رخ اور روپ کی بحالی ہے اور تجدد اس لیے قابل مذمت اور قابل رد ہے کہ وہ غیر اسلام کو اسلام بنانے کی سعی نامشکور ہے۔ اگر چہ اصحاب تجدید وتجدد دونوں اپنے استدلال کی عمارت نصوص ہی کی تفہیم وتشریح پر اٹھاتے ہیں تاہم دونوں میں فرق یہ ہوتا ہے کہ مجدد دین کو حشو و زوائد اور بدعات سے پاک کر کے اسے اسلام کی اس تفہیم و تشریح کی طرف لوٹاتا ہے جسے ہم سہولت بیان کی خاطر اسلام کا مرکزی دھارا (Mainstream Islam) یا علم کلام کی اصطلاح کے قریب رہتے ہوئے 'جمہور کا اسلام' کہہ سکتے ہیں (جیسے اہل تشیع کے مقابلے میں اہل السنہ والجماعہ کی اصلاح) جب کہ متجدد نصوص دین کی تفہیم وتشریح اس طرح کرتا ہے کہ وہ اسے مین سٹریم اسلام سے کاٹ دینے کی سعی کرتا ہے کیونکہ

جب تک وہ ماضی کی متفق علیہ علمی روایات ومسلمات کو (جسے دینی روایت میں 'اجماع' کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے) رد نہ کرے اس کے تجدد کا پائے چوبیں کھڑا نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا ہر متجدد کا اسلوب یہ ہوتا ہے کہ وہ حیلے بہانے سنت کو مشکوک ٹھہراتا اور اس کے دائرہ کار کو محدود کرنے کی کوشش کرتا ہے اور صدیوں کے تعامل سے قائم شدہ علمی مسلمات کی عمارت کو گرانے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے ان دونوں مقاصد کو پورا کرنے کے لیے قرآن سے براہ راست استنباط اور لغت وعقل سے استدلال کرتے ہوئے حریت فکر کا نقیب بن کر سامنے آتا ہے۔ ایسے ہر متجدد کو مین اسٹریم اسلام یا جمہور اہل علم کا جواب یہی ہوتا ہے کہ اگر قرآن آج نازل ہوا ہوتا اور بغیر کسی پیغمبر کے نازل ہوا ہوتا تو ہم آپ کے دعاوی پر ضرور غور کرتے کہ فلاں معاملے میں قرآن کا یہ اور یہ منشا بھی ہوسکتا ہے لیکن جب قرآن ایک پیغمبر پر نازل ہوا تھا جس کی منصبی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ اس کی تبیین وتشریح کرے اور اس پر عمل کر کے دکھائے تو عقل ومنطق کا تقاضا ہے کہ قرآن کی ہر اس تفہیم وتشریح کو رد کر دیا جائے جو اس پیغمبر کی سنت کے خلاف ہو۔ اور یہ دین چونکہ چودہ سو سال پہلے نازل ہوا تھا اور امت کے بہترین، متقی اور ذہین ترین افراد تب سے اس کو سمجھنے سمجھانے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں تو آج ہم آپ کی اس لن ترانی کو کیسے مان لیں کہ اس دین کو آج تک آپ کے سوا ٹھیک طرح سے کوئی سمجھا ہی نہیں! لہٰذا عقل ومنطق کا تقاضا یہ ہے کہ امت کے چودہ سو سالہ تعامل پر مبنی متفقہ علمی مسلمات کو رد کرنے کی بجائے ان متجددین کے افکار موہومہ ومستوردہ کو رد کر دیا جائے۔

غامدی صاحب کے افکار مبنی بر تجدد ہیں

اسلام، عصر حاضر اور تجدید وتجدد کے مباحث پر ابتدائی گفتگو کے بعد آیئے اب اس مقالے کے عنوان کے دوسرے جزو کی طرف کہ آج کل جناب جاوید احمد غامدی صاحب جن افکار وخیالات کا اظہار فرما رہے ہیں اور دین کی جو تشریح وتاویل کر رہے ہیں کیا وہ جائز اجتہاد اور تجدید ہے یا تجدد؟ ہماری دیانت دارانہ رائے یہ ہے کہ جناب غامدی صاحب کے افکار تجدد پر مبنی ہیں اور ہماری یہ رائے یا دعویٰ دو دلائل پر مبنی ہے: ایک یہ کہ غامدی صاحب دین کی تفہیم وتشریح اس طرح کرتے ہیں کہ اس سے مغربی تہذیب کی ان اقدار ومظاہر ومقاصد کی تائید ہوتی ہے جو ملحدانہ، کافرانہ اور خلاف اسلام نظریات پر مبنی ہیں اور دوسرے یہ کہ ان کا منہج فکر اور طریق استنباط جمہور امت سے الگ اور شاذ و منفرد ہے۔ اور اب ان دونوں باتوں کی کچھ تفصیل:

پہلی دلیل:

غامدی صاحب دین کی تفہیم وتشریح اس طرح کرتے ہیں جس سے مغربی تہذیب کی ان اقدار،

مظاہر اور مقاصد کی تائید ہوتی ہے جو خلاف اسلام نظریات پر مبنی ہیں۔

یہ دلیل یا رائے دو مقدمات پر مبنی ہے :ایک یہ کہ مغربی فکر و تہذیب خلاف اسلام ہے اور دوسرے یہ کہ غامدی صاحب اسلام کی تشریح و تعبیر نو کر کے جن افکار و نظریات کا اظہار و پرچار کر رہے ہیں وہ اس غیر اسلامی مغربی فکر و تہذیب کے نظریات و اقدار کے مطابق ہیں۔ اگر ہم یہ دونوں مقدمات ثابت کر دیتے ہیں تو ہمارا یہ موقف ثابت ہو جائے گا کہ جناب غامدی صاحب کے نظریات اجتہاد و تجدید کی بجائے تجدد کہلانے کے زیادہ مستحق ہیں اور نا قابل قبول اور قابل رد ہیں۔

مقدمہ اولیٰ: مغربی تہذیب کی فکری بنیادیں خلاف اسلام ہیں

یہ محض ایک حقیقت کا اظہار ہے کہ مغربی تہذیب جن فکری بنیادوں پر کھڑی ہے وہ ملحدانہ اور خلاف اسلام ہیں۔ مغربی تہذیب کی اساس ان فکری تحریکوں پر ہے جو وہاں قرون وسطی یا قرون مظلمہ کے بعد ابھریں اور جنہوں نے مغربی نظریات کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا جیسے تحریک احیائے علوم (Renaissance)، تحریک اصلاح مذہب (Reformation)، تحریک روشن خیالی (Enlightenment)، تحریک جدیدیت (Modernity) اور تحریک پس جدیدیت (Post-Modernity)۔ ان فکری تحریکوں کے نتیجے میں جو افکار و نظریات سامنے آئے، وہ اگرچہ بہت سے ہیں لیکن ہم اختصار کی خاطر ان میں سے چار بنیادی نظریات ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹیل ازم اور ایمپیریسزم کا ذکر کریں گے۔ لیکن اس سے بھی پیشتر ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے اور وہ یہ کہ مغربی تہذیب کی موجودہ تشکیل میں ان کے مذہب (عیسائیت) کا کردار برائے نام ہے۔

مغربی تہذیب میں عیسائیت کا برائے نام کردار

مسلمانوں کے افکار اور ان کی تہذیب کا منبع چونکہ ان کا دین ہے لہٰذا وہ آسانی سے اس غلط فہمی اور مغالطے کا شکار ہو جاتے ہیں کہ مغربی تہذیب کا منبع بھی عیسائیت ہے اور عیسائیت بہر حال ایک منزّل من اللہ دین ہے، عیسائی اہل کتاب ہیں اور شریعت نے مسلمانوں کو اہل کتاب سے معاشرت (شادی بیاہ، کھانا پینا) کی اجازت دے رکھی ہے۔۔۔وغیرہ ۔ یہ ساری غلط فہمیاں اس وقت دور ہو جاتی ہیں جب آدمی مغربی فکر کی تاریخ اور عیسائیت کا مطالعہ کرے اور اس کے علم میں دو بنیادی باتیں آئیں:

ایک: یہ کہ موجودہ مغربی تہذیب کی تشکیل میں عیسائیت کا کوئی بنیادی کردار نہیں ہے کیونکہ حضرت عیسیٰؑ پر کوئی نئی شریعت نازل نہ ہوئی تھی وہ شریعت موسوی ہی کے پابند تھے لیکن بنی اسرائیل (یہودیوں) نے انہیں قبول کرنے کی بجائے ان کی مخالفت و مزاحمت کی اور انہیں شریعت موسوی کے مطابق معاشرے اور ریاست کی تشکیل کا کوئی موقعہ نہ ملا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی تعلیمات اخلاقی پند و نصائح کا ایک مجموعہ بن

کر رہ گئیں۔ رومنوں نے عیسائیت ضرور قبول کر لی لیکن رومن معاشرے کی نظری بنیادیں یونانی فکر پر مبنی تھیں اور یہ فکر بھی وحی کی ہدایت سے محروم بلکہ اس کی نقیض تھی اور توحید، رسالت اور آخرت کے بالمقابل عقل اور مادہ پرستی ہی اس کا شعار و منہج تھی۔ چنانچہ ۱۴۵۳ھ میں فتح قسطنطنیہ اور مسلمانوں کے غلبے کے ردعمل میں عیسائی دنیا میں مسلمانوں سے نفرت اور انتقام کی جو تند و تیز لہر ابھری اور جس نے انہیں ترقی وعروج کی راہ دکھائی اور جس کے نتیجے میں وہاں نشأۃ ثانیہ کی تحریک اٹھی وہ اسی یونانی فکر کے تسلسل اور احیاء کی تحریک تھی جس کی عقل اور مادہ پرستی کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔

دوسرے: قرآن گواہی دیتا ہے کہ عیسائیت کے نام سے جو دین یا مذہب مروج ہوا وہ ان منزّل من اللہ تعلیمات سے انحراف پر مبنی تھا جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمائی تھیں اور اصل حالت میں باقی نہ رہ سکیں اور ان میں خلاف وحی نظریات شامل ہو گئے (۷)۔ اس مبنی برانحرافات عیسائی مذہب میں چونکہ ایسی باتیں شامل تھیں جو غیر فطری تھیں اور اُس وقت کی سائنسی فکر پر مبنی تھیں جو بعد میں عقلی اور سائنسی ترقی سے غلط ثابت ہوئیں اور مزید یہ کہ عیسائی مذہبی قیادت اس غیر سائنسی اور غیر فطری مذہب کو مقدس آسمانی مذہب قرار دے کر اس کی محافظ بن کر کھڑی ہو گئی، چرچ نے ایک مستحکم ادارے کی شکل اختیار کر لی اور حکمرانوں اور جاگیرداروں سے مل کر اس نے اپنے روحانی تقدس کو دنیاوی اقتدار کی شکل دے لی۔ چنانچہ مغرب میں جب روشن خیالی، عقلیت، انفس و آفاق میں تدبر اور سائنس کی لہر ابھری تو اس کا شدید تصادم عیسائیت کی علمبردار قیادت سے ہوا اور یورپ کی تاریخ سے واقف لوگ جانتے ہیں کہ عیسائی قیادت نے کس بے دردی سے اس لہر کو کچلا، ہزاروں دانشوروں کو مذہبی عدالتوں سے سزا دلوائی، انہیں زندہ جلا دیا گیا اور طرح طرح کی تعذیبوں سے گزارا گیا۔ اس کے ردعمل میں مارٹن لوتھر اور دوسرے مفکرین نے اصلاح مذہب (Reformation) کی تحریک چلائی اور مروجہ عیسائیت کا سحر اور ڈھانچہ توڑ کر رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی ہیومنزم، سیکولرزم، لبرلزم، ایمپریسزم وغیرہ جیسے نظریات ابھرے جنہوں نے عیسائیت کو رد کر کے اسے کونوں کھدروں میں دھکیل دیا اور مغربی تہذیب الحاد و مادہ پرستی کے منہج پر آگے بڑھتی چلی گئی۔

مطلب یہ کہ موجودہ مغربی تہذیب کی صورت گری میں عیسائیت کا کوئی بڑا کردار نہیں بلکہ یہ تہذیب تو ابھری ہی مذہب (عیسائیت) کے رد پر ہے اور ہیومنزم و سیکولرزم وغیرہ کی شاندار عمارت کی تعمیر عیسائیت کے جسد خاکی پر ہی تو ہوئی ہے لہٰذا عیسائیت کو اسلام کی طرح وہاں کی تہذیب کا صورت گر سمجھنا محض لاعلمی اور غلط فہمی ہے۔ مغربی تہذیب کی صورت گری جن افکار نے کی ہے اب ان کا ذکر اختصار سے کیا جاتا ہے (۸)۔

ہیومنزم (Humanism)

قرون مظلمہ کے بعد اور نشأۃ ثانیہ کے وقت ہیومنزم کی ابتداء اس سے ہوئی کہ کائنات میں مرکزی حیثیت اور اہمیت انسان کو حاصل ہے لیکن بعد میں اس نے جو رنگ اختیار کیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان آزاد اور خود مختار ہے کہ زندگی کے بارے میں جو فیصلہ چاہے کرے اور یہ طے کرے کہ اسے زندگی کن اصولوں کے مطابق گزارنا ہے۔ وہ 'اللہ' جیسی کسی بالاتر ہستی کا 'عبد' نہیں ہے جس کے احکام کی اطاعت اس پر لازم ہو بلکہ وہ خود مختار اور مختار مطلق ہے اور اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی ،حق و باطل، خیر وشر، جائز و ناجائز اور حلال وحرام کے بارے میں جو فیصلے چاہے کرسکتا ہے۔

سیکولرزم (Secularism)

انحرافات کے باوجود عیسائیت بہر حال ایک منزل من اللہ دین تھی جس میں خدا کا تصور موجود تھا،(خواہ ناقص ہی سہی)لہٰذا ہیومنزم کی مخالفت ہوئی اور اس کے ردعمل میں سیکولرزم کا نظریہ ابھرا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ بالفرض اگر کسی کو خدا کو ماننا ہی ہے تو وہ اپنی ذاتی زندگی میں اور انفرادی حیثیت سے اسے مان لے لیکن اس خدا کو انسانوں کے اجتماعی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق بہر حال تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ مطلب یہ کہ سول سوسائٹی اور ریاست کے معاشی، معاشرتی، قانونی، تعلیمی، سماجی۔۔۔ ڈھانچے اور نظام میں اللہ کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں بلکہ انسان آزاد ہے کہ ان معاملات میں اپنی مرضی اور اپنی عقل سے جو فیصلے چاہے کرے۔

کیپٹل ازم (Capitalism)

سرمایہ دارانہ نظام اگر چہ ابتداءً ایک معاشی نظام تھا اور ہے لیکن اس کے وسیع اثرات نے اسے عملاً ایک متبادل دین اور طرز حیات بنا دیا ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ انسان کی ساری کوششوں کا محور دنیا اور افزائش دولت ہونی چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں سرمایہ دارانہ ذہنیت کا حاصل ہے حب دنیا اور حبِّ مال۔ مطلب یہ کہ انسان کی ساری تگ و دو اس غرض سے ہونی چاہیے کہ اسے دنیا میں زیادہ سے زیادہ آسائشیں اور سہولتیں ملیں۔ اس کا مقصد زندگی یہ ہو کہ ہر قیمت پر بنک بیلنس بڑھے، کار ہو، بنگلہ ہو اور معیار زندگی بلند سے بلند تر ہو۔ حبّ دنیا اور حبّ مال بلکہ حرص و ہوس اور دنیا ہی کو سب کچھ سمجھنے، اسی کی بہتری اور کامیابی کے لیے اپنی ساری تگ و دو کو وقف کرنے اور اسی کو حاصل زندگی سمجھنے اور ہدف زندگی بنانے کا لازمی نتیجہ ہے آخرت سے اغماض اور اس کی عدم اہمیت اور عدم ترجیح۔

ایمپیریسزم (Empiricism)

ایمپیریسزم کا مطلب یہ ہے کہ علم حقیقی کا منبع صرف حواس اور عقل ہیں۔ یعنی حق صرف وہ ہے

ہمارے مشاہدے اور تجربے میں آسکے اور عقل واستدلال کے معیار پر پورا اترے۔ جو ان معیارات پر پورا نہ اترے وہ علم نہیں، اس کے حق اور حتمی طور پر صحیح ہونے کی کوئی گارنٹی نہیں بلکہ ایسے نظریات عموماً غیر سائنٹفک اور توہمات پر مبنی ہوتے ہیں۔

مغرب میں اس کے علاوہ بھی بہت سے ازم ہیں جیسے لبرلزم، یوٹیلیٹیرزم (Utilitarianism)، ری ڈکشنزم (Reductionism)۔۔۔ وغیرہ لیکن جن چار اہم تصورات کا ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا ہے، اگر ہم صرف انہی کو سامنے رکھیں تو مغرب کا جو ورلڈ ویو (تصور انسان، تصور اِلٰہ اور تصور کائنات) ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے تصور انسان کی رو سے انسان خود اپنی مرضی کا مالک ہے، خودمختار ہے اور کسی کا عبد نہیں ہے۔ اس کا تصور الٰہ یہ ہے کہ کوئی بالاتر ہستی ایسی نہیں جس کی اطاعت اس پر لازم ہو۔ دوسرے لفظوں میں وہ اپنا خدا خود ہے (ہیومنزم)۔ اور اگر کوئی خدا ہے بھی تو اسے انسان کے اجتماعی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ گویا یہ انسانوں کی مرضی اور اختیار ہے کہ وہ خدا کے دائرہ کار کا تعین کریں (سیکولرزم)۔ کیپٹل ازم کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی زندگی ہی سب کچھ ہے اور ہماری ساری تگ ودو کا محور یہی زندگی ہونی چاہیے گویا عملاً آخرت کی نفی۔ اسی طرح ایمپریسزم کا حاصل ہے وحی کی سیادت کا انکار اور عقل وحواس ہی کو منبع علم وحقائق سمجھنا۔

اس مختصر تجزیے سے واضح ہے کہ مغرب کا ورلڈ ویو اسلام کے ورلڈ ویو کے برعکس ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ انسان عبد ہے اور ایک اللہ ہی معبود اور مطاع ہے جب کہ ہیومنزم اور سیکولرزم کی رو سے اللہ کی بجائے خود انسان مختار کل اور مختار مطلق ہے۔ کیپٹل ازم کی رو سے دنیا ہی سب کچھ ہے جب کہ اسلام کی رو سے آخرت ہی سب کچھ ہے اور اسے دنیا پر ترجیح حاصل ہے۔ ایمپریسزم کی رو سے صرف عقل وحواس ہی منبع علم ہیں جب کہ اسلام کی رو سے اللہ کی طرف سے آئی ہوئی وحی (قرآن حکیم) ہی حقیقی اور حتمی علم ہے۔

ان امور سے واضح ہے کہ مغرب کے وہ افکار ونظریات جن پر اس کی تہذیب کی عمارت کھڑی ہے، صریحاً خلاف اسلام ہیں اور اسلامی عقائد سے متصادم ہیں۔ اسلام نام (لغت واصطلاح میں) ہے اللہ کی غیر مشروط اطاعت کا اور مغرب کے مذکورہ بالا افکار کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کی غیر مشروط اطاعت کا انکار۔ یہی کفر ہے (لغت واصطلاح دونوں میں) یعنی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کا انکار اور انسان کا اپنی مرضی پر اصرار۔ لہٰذا یہ کہنا محض ایک حقیقت کا اظہار ہے اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ مغربی تہذیب کی فکری اساسات کفر والحاد پر مبنی ہیں۔

غامدی مکتبِ فکر کے بعض افراد کی تائید

یہی وجہ ہے کہ جب سے علماء اسلام کا اس مغربی فکر وتہذیب سے پالا بڑا ہے، انہوں نے اس کی گمراہی اور دجل وفریب کا برملا اظہار و اعلان کیا ہے۔ جمال الدین افغانی اور امیر شکیب ارسلان سے لے کر ماضی قریب کے امام حسن البنا، سید قطب (جو اسے 'جاہلیت جدیدہ' کہا کرتے تھے) اور برصغیر کے اکبرالہ آبادی، علامہ محمد اقبال، مولانا مودودی اور روایتی علماء میں سے جمعیت علماء اسلام اور احرار کی تحریکیں تو انگریز اور انگریزی استعمار کے فکر ونظر سے شدید نفور کرتی تھیں۔ اس کے برعکس دوسرا گروہ جو سرسید، امیر علی، قادیانی، پرویز وغیرہ کا ہے وہ مغربی فکر وتہذیب کی براہ راست یا بالواسطہ طور پر تائید کرتا ہے۔ غامدی صاحب بھی اسی دوسرے فکری گروپ کے گل سرسبد ہیں لہٰذا عموماً مغربی فکر وتہذیب کی تنکیر نہیں کرتے البتہ ان کے مکتب فکر کے بعض دوسرے لوگ غالباً اس بات کی باریکی کو نہ سمجھنے کی وجہ سے مغربی فکر وتہذیب کے بعض پہلوؤں کی تنقید وتنقیص کر بیٹھتے ہیں۔ فی الحال اس کی دو مثالیں پیش خدمت ہیں۔

۱۔ عظیم فریب پر مبنی فکر وفلسفہ

غامدی صاحب کے پرچے اشراق میں سوال و جواب کے کالم میں ان کے ایک تلمیذ رشید نے دجال کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مغربی اقوام کو دجال اور یاجوج ماجوج قرار دیا اور ان کے فکر وفلسفہ کو عظیم فریب پر مبنی قرار دیتے ہوئے لکھا:[۹]

''ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ نبیﷺ نے قیامت کے قریب 'یاجوج ماجوج' ہی کے خروج کو دجال سے تعبیر کیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یاجوج ماجوج کی اولاد یہ مغربی اقوام، عظیم فریب پر مبنی فکر و فلسفہ کی علم بردار ہیں اور اسی سبب سے نبیﷺ نے انہیں دجال (عظیم فریب کار) قرار دیا ہے۔ روایات میں دجال کی ایک صفت یہ بھی بیان ہوئی ہے کہ اس کی ایک آنکھ خراب ہوگی ۔ یہ بھی درحقیقت مغربی اقوام کی انسان کے روحانی پہلو سے پہلو تہی اور صرف مادی پہلو کی جانب جھکاؤ کی طرف اشارہ ہے۔ اسی طرح مغرب سے سورج کا طلوع ہونا بھی غالباً مغربی اقوام کے سیاسی عروج ہی کے لیے کنایہ ہے۔''

۲۔ مغربی اثرات کی بیخ کنی

اسی طرح غامدی صاحب کے 'استاذ امام' مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے ماہنامہ 'چراغ راہ' کراچی میں پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کے حوالے سے لکھا کہ اس کے لیے مغربی تہذیب کے بُرے اثرات سے چھٹکارا پانا ضروری ہے۔ ان کے الفاظ میں:[۱۰]

''ہمارے ملک میں انگریز اپنے طویل دور اقتدار کے جو اثرات ہمارے ذہنوں کے اندر اور ہماری تہذیب و معاشرت کے اوپر چھوڑ گئے ہیں وہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد بھی بدستور قائم ہیں بلکہ ملکی حکمرانوں کے دور میں وہ مزید مستحکم ہوئے ہیں۔ یہ اثرات اگر اس طرح باقی رہیں تو ان میں اور اسلامی قانون میں قدم قدم پر تصادم ہوگا۔ اور اس تصادم میں اسلامی قانون ایک طرف ہوگا اور وہ قوم جس کو ہم اسلامی قانون کا مطالبہ کرنے والی سمجھتے ہیں دوسری طرف ہوگی۔ انگریزی اقتدار کے زیر اثر شراب، جوا، رقص و سرود، بے حیائی و بے پردگی، ریڈیو، سینما، اور زنا کاری کی جو چاٹ لگ چکی ہے اس کو موجودہ قانون سے نہیں روکا جا سکتا، بلکہ ان چیزوں کے مقابلہ میں اگر تنہا قانون آئے گا تو میں نہایت افسوس کے ساتھ یہ پیشین گوئی کرتا ہوں کہ وہ شکست کھا جائے گا۔ اور یہ شکست نہایت بری شکست ہوگی۔ ان چیزوں کے مقابلہ میں قانون سے پہلے پروپیگنڈے کی طاقت کو آنا چاہیے اور یہ طاقت اتنی زبردست ہونی چاہیے کہ ان چیزوں کے خلاف لوگوں کے دلوں میں اتنی شدید نفرت پیدا ہوجائے کہ لوگ ان کے خلاف قانون بنانے کے لیے قانون سازوں کو مجبور کردیں اور جب ان کے خلاف قانون بن کے آئے تو اس کا اسی طرح خیر مقدم کریں جس طرح مسلمانوں نے کسی زمانے میں ان برائیوں کے خلاف قوانین کا خیر مقدم کیا تھا''۔

مقدمہ ثانیہ: غامدی صاحب کے نظریات مغربی فکر وتہذیب کے مطابق ہیں

یہ واضح کرنے کے بعد کہ مغربی تہذیب کی فکری بنیادیں ان نظریات پر استوار ہیں جو اپنی کنہ میں غیر اسلامی اور خلاف اسلام ہیں، اب ہم یہ عرض کریں گے کہ غامدی صاحب جن افکار ونظریات کے داعی اور مبلغ ہیں وہ مغربی افکار نظریات کا چربہ ہیں اور ان کے مقاصد کی آبیاری کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر غامدی صاحب قرآن وسنت کی نصوص کی تشریح وتاویل اس طرح کرتے ہیں کہ وہ مغربی نظریات و مقاصد کی تائید کرتی نظر آتی ہیں۔ اس حوالے سے اب ہم غامدی صاحب اور ان کے تلامذہ کے افکار کا ایک جائزہ لیں گے:

جہاد کا انکار

جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ اہل مغرب نے طاقت پکڑنے کے بعد روبہ زوال امت مسلمہ کے خلاف سازشیں کیں، ان کے سیاسی نظام (خلافت) کو تاراج کیا اور مسلمان ملکوں پر قبضہ کرلیا۔ ان کے وسائل کو لوٹا، ان کے اجتماعی نظام اور اداروں کو تباہ و برباد کیا اور نئے اجتماعی ادارے اپنی فکر و تہذیب کے مطابق تشکیل دیئے اور بھرپور سعی کی کہ مسلمان ہمیشہ ان کے غلام اور پیروکار رہیں اور مزاحمت نہ کریں بلکہ صحیح تر لفظوں میں مزاحمت کر سکنے کے قابل نہ رہیں۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں

میں سے روح جہاد ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور مسلمان علماء میں ہمیشہ ایسے افراد پیدا کرنے کی سعی کی اور ان کی خوب حمایت وسر پرستی کی جو مسلمانوں کے اندر سے روح جہاد ختم کریں اور انہیں حیلے بہانے مغرب کے اقتدار کو قبول کرنے کی ترغیب دیں۔ مسلم روایت اور خصوصاً برصغیر میں اس کی ایک پوری تاریخ ہے جس کے گل سر سبد غلام احمد قادیانی ہیں جن کی نبوت کا مرکزی نقطہ ہی یہ تھا کہ جہاد بالسیف اب منسوخ ہو چکا ہے۔ آج کل غامدی صاحب مغرب کی اس ضرورت کو پورا کر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ اور ان کے تلامذہ جہاد کے مختلف پہلوؤں کی جو تشریح وتاویل کرتے ہیں وہ کچھ یوں ہے:

☆ مسلم حکومت کی شکست کی صورت میں مسلمان عوام اور ان کے گروہوں کو جہاد کی اجازت نہیں(۱۱) (افغانستان میں مسلم حکومت کے خاتمے اور جارح کی حلیف گماشتہ حکومت قائم ہونے کے بعد وہاں مسلمان عوام اور ان کی جماعتوں نے جہاد شروع کر دیا اور پاکستان بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں نے ان کا ساتھ دیا لیکن غامدی صاحب کے نزدیک وہ غلط تھا)(۱۲)۔

☆ جارح کفار کو مسلم ملک سے نکالنے کے لیے فدائی حملے جائز نہیں(۱۳) (جنہیں اسلام دشمن اور ان کے ایجنٹ' خودکش حملے' قرار دیتے ہیں)۔

☆ افغانستان پر امریکہ و یورپ کا حملہ کرنا اور وہاں لاکھوں مسلمانوں کو قتل کرنا، ان کی بستیاں تاراج کرنا، ان کے گھر جلانا، ان کی خواتین کی عزتیں لوٹنا اور ان کے ملک پر قبضہ کر کے بیٹھ جانا جائز تھا کیونکہ اس نے ایک ایسے شخص کو پناہ دی تھی جو امریکہ و یورپ کا ''مجرم'' تھا (حالانکہ وہ محض ''ملزم'' تھا اور کروڑوں مسلمانوں کے علاوہ لاکھوں یورپی اور سینکڑوں امریکی و یورپی محقق اور دانشور امریکہ کے اس دعوے کو غلط قرار دیتے ہیں لیکن غامدی صاحب مسلم امت کے موقف کی نفی کرنا اور یہودیوں اور ان کے زیر اثر مغربی حکمرانوں کی تائید کرنا عین اسلام سمجھتے ہیں)۔

☆ رسول کریم ﷺ نے کفار کے خلاف جو جہاد کیا تھا وہ حکم شرعی نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کا قانون اتمام حجت تھا۔(۱۴)

☆ منکرین حق کے خلاف جنگ کرنا اور انہیں مفتوح اور ذمی بنانے کا حکم اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔(۱۵)

فقہ و قانون

بعض اہم فقہی اور قانونی معاملات میں غامدی صاحب کا موقف یہ ہے:

۱۔ زنا بالرضا کی شناعت کم کرنا

اسلام میں قانون اللہ تعالیٰ کے وہ احکام ہیں جو اس نے اپنی کتاب میں نازل فرمائے یا اس کے

پیغمبر نے ہم پر واضح کیے۔ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ کا اسلوب یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے وہ پہلو جن پر انسان کی معاشرتی زندگی کے صحیح بنیادوں پر قیام کا انحصار ہے وہ ان کے بارے میں نا قابلِ تغیر احکام دیتا ہے اور اجتماعی زندگی کی تفصیلات اور ممکنہ تغیرات کے لیے اجتہاد کی اجازت دیتا ہے۔ جن امور میں اس نے تفصیلی اور نا قابلِ تغیر احکام دیئے ہیں ان کی بناء شریعت کے مقاصد خمسہ پر ہے جن میں سے ایک حفاظت نسل ہے۔ اس کے لیے شریعت نے عورت اور مرد کے تعلقات کو منضبط کرنے کے لیے نکاح و طلاق اور وراثت وغیرہ کے تفصیلی احکام دیئے اور ناجائز جنسی تعلق (زنا) کے لیے انتہائی سخت سزائیں تجویز کیں یعنی رجم اور کوڑے مارنا۔ اس کے برعکس مغرب نے ہیومنزم کی رو سے فرد کو خود مختار بلکہ مختار مطلق بنا دیا جس کے نتیجے میں فرد کی لامحدود آزادی کا تصور ابھرا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مرد اور عورت مغرب میں آزاد ہیں کہ جب چاہیں اور جس سے چاہیں آزادانہ جنسی تعلق قائم کر لیں۔ چونکہ قانون وہاں انسان نے بنانا ہے اور انسانوں کی خواہشات اور امنگوں کے مطابق بنانا ہے لہٰذا مغربی ممالک کی پارلیمانوں میں عوام کے نمائندوں نے عوام کی امنگوں کے مطابق جو قانون سازی کی ہے اس کی رو سے مرد اور عورت بغیر نکاح کئے عائلی زندگی گزار سکتے ہیں اور بچے پیدا کر سکتے ہیں یعنی زنا بالرضا وہاں جائز اور قانونی ہے البتہ زنا بالجبر کو وہاں برا سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ اس سے نسل اور عزت کی حفاظت مقصود ہے بلکہ اس لیے کہ ہیومنزم کی رو سے وہ فرد کی حریت، تقدیس اور حرمت کے خلاف ہے۔

اب مغربی تہذیب چونکہ غالب ہے اور مغرب اسے مسلمان معاشرے میں بھی مروج کرنا چاہتا ہے تو اس کی خواہش ہے کہ مسلمان ممالک اہل مغرب کے طرز معاشرت کو قبول کر لیں اور خصوصاً زنا کے بارے میں جو سخت قوانین اور رویہ مسلمانوں میں موجود ہے، اسے کمزور اور ختم کیا جائے۔ اس ضمن میں اسلام کے قوانین انتہائی جامد اور سخت ہیں اور مسلمان ان پر صدیوں سے عمل کرتے آ رہے ہیں اور ان کے اندر اس بارے میں کوئی اختلاف بھی نہیں لہٰذا اس حوالے سے مسلم قانون اور روایت میں ڈنٹ ڈالنا آسان نہیں۔ اس لیے اس معاملے پر بالواسطہ طور پر اثر انداز ہونے کے لیے غامدی صاحب اور ان کے مکتبِ فکر نے جو راستے اختیار کئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر زنا بالرضا کی شناعت کم کی جائے۔ اس شناعت کو کم کرنے کے لیے غامدی صاحب اور ان کے حلقۂ فکر نے اپنی تاویل کی زنجبیل سے دو نسخے نکالے ہیں:

ایک: یہ کہ رجم کی سخت سزا صرف زنا بالجبر کے لیے (بطور حرابہ اور فساد فی الارض) ہے جب کہ شادی شدہ (محصن) افراد کی زنا بالرضا کی سزا وہی ہے جو غیر شادی شدہ (غیر محصن) افراد کے زنا بالرضا کی

ہے یعنی سو کوڑے۔ (۱۶)

اہم نوٹ: ہمارے اس مقالے کا اسلوب یہ نہیں کہ ہم غامدی صاحب کا نقطۂ نظر ان کی کتابوں سے تفصیل کے ساتھ نکالیں اور اسے ثابت کریں یا اس کے مقابلے میں جو صحیح اسلامی نقطۂ نظر ہے، اس کے لیے دلائل لائیں اور اسے ثابت کریں۔ یہ کام کئی اہل علم نے پہلے بھی کیا ہے اور اب بھی کر رہے ہیں۔ ہمارا اسلوب یہاں، اختصار کی خاطر، یہ ہے کہ ہم غامدی صاحب اور ان کے حلقۂ فکر کی مغربی تہذیب سے مرعوبیت اور اس سے مطابقت کی کاوشوں کو نمایاں کریں لہٰذا ہم غامدی صاحب کے موقف کو تفصیل سے بیان کرنے اور ثابت کرنے کی بجائے محض اس کے حوالہ جات کی طرف اشارہ کرنا کافی سمجھتے ہیں اور صحیح اسلامی موقف اتنا معروف و معلوم ہے کہ اس کے لیے ہم نے یہ بھی ضروری نہیں سمجھا کہ اس کے لیے حوالہ جات درج کریں۔ اگر ہم یہ اسلوب اختیار نہ کرتے تو یہ مضمون ایک کتاب بن جاتا، جو فی الحال ہمارے پیش نظر نہیں ہے۔

دوسرے: یہ کہ زنا بالرضاء کی تعزیزی سزا کو کم کیا جائے اور اس کا نفاذ مشکل بنا دیا جائے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ غامدی صاحب اور ان کے ساتھیوں نے پاکستان کے قانون میں امریکہ کے گماشتہ فوجی آمر (جنرل مشرف) کے دور حکومت میں پاکستان کے حدود قوانین کو تبدیل کرنے اور 'تحفظ حقوق نسواں' کے نام پر مسلمانوں کے روایتی قانون میں زنا بالرضاء کی سزا کم کرنے کے لیے 2007ء میں چلائی جانے والی مہم کی پرزور حمایت کی (اس کے لیے ذرائع ابلاغ میں ایک بڑی مہم چلائی گئی جس کی مغربی ذرائع ابلاغ اور حکومتوں نے علانیہ حمایت کی اور جس کے بارے میں یہ خبر عام تھی کہ وہ امریکی سرپرستی اور فنڈز سے چلائی گئی) جس کے اسلامی حوالے سے نفس ناطقہ غامدی صاحب اور ان کے تلامذہ تھے۔

قانون توہین رسالت کو غیر مؤثر بنانا

مسلمان نبی کریم ﷺ کی ذات مبارک سے غایت درجے کی جذباتی محبت رکھتے ہیں اور یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ امت مسلمہ کی موجودہ صورت میں بقاء اور استحکام کا دار و مدار جن امور پر ہے ان میں سرفہرست حب رسول ﷺ ہے۔ مغربی ممالک کے یہود و نصاریٰ کو، جو بقول قرآن، مسلمانوں کو نامسلمان بنانا چاہتے ہیں (۱۷)، مسلمانوں کی یہ ادا ایک آنکھ نہیں بھاتی اور وہ حیلے بہانے نبی کریم ﷺ کی توہین کرتے رہتے ہیں کبھی کارٹون بنا کر، کبھی کتابیں لکھ کر، کبھی فلمیں بنا کر اور وہ مسلمانوں کے اندر سے حبّ رسول ﷺ کا جذبہ نکالنا چاہتے اور اسے کم کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ پاکستان میں جب سے توہین رسالت کا قانون بنا ہے، مغربی ممالک اسے ختم کرانے یا کم از کم اسے غیر موثر اور ناقابل نفاذ بنانے کے لیے سر توڑ کوششیں کر رہے ہیں اور ان کی یہ کوششیں علانیہ ہیں خفیہ

نہیں۔مغربی دباؤ کے پیش نظر پاکستان کا فوجی آمر اس قانون کو بھی غیر موثر بنانا چاہتا تھا چنانچہ غامدی صاحب نے مذکورہ بالا مہم میں اسلام کی ایسی تشریحات پیش کیں کہ گویا مذکورہ قوانین میں تبدیلیاں ناگزیر اور وقت کی ضرورت ہیں چنانچہ عوام اور علماء کے احتجاج کے باوجود فوجی قوت سے قانون توہین رسالت کو تبدیل کر دیا گیا[۱۸]۔ اسلامی حوالے سے اس مہم کے روح رواں اور نفس ناطقہ جناب غامدی صاحب ہی تھے۔

ایک شاتمہ رسول (آسیہ مسیح) کو سزا ہوئی تو اس وقت کے گورنر پنجاب سلیمان تاثیر صاحب نے اس کی علانیہ حمایت کی، قانون توہین رسالت کو ظالمانہ اور کالا قانون کہا اور شاتمہ کو بچانے کی کوششیں کیں تو مسلمانوں میں اشتعال پھیل گیا اور گورنر صاحب کے ایک گارڈ نے اسے قتل کر دیا۔اس پر اہل مغرب نے اس قانون کے خلاف طوفان کھڑا کر دیا اور پاکستان کے سیکولر حلقوں نے بھی مغربی مطالبات کی حمایت شروع کر دی۔ جاوید غامدی صاحب اور ان کے تتبع میں ان کے شاگرد رشید جناب عمار ناصر صاحب نے اس موقع پر ان حلقوں کی حمایت کی اور یہ علمی نکتہ نکالا کہ احناف کا مؤقف تو یہ ہے کہ توہین رسالت اتداد کے مثل ہے اور مرتد کو توبہ اور معافی کا موقع دیا جاتا ہے لہٰذا قانون توہین رسالت کو جس میں توہین رسالت کی سزا صرف موت ہے، تبدیل کیا جائے اور اس میں کم سزا اور معافی کی گنجائش پیدا کی جائے۔

جاوید غامدی صاحب کی طرف سے توہین رسالت

جاوید غامدی صاحب نے اپنی کتاب 'برہان' میں رجم پر بحث کرتے ہوئے متعدد صحیح احادیث سے ثابت ہونے والے اور مسلمان اہل علم کے اس اجماعی مؤقف کی کہ زانی محصن کی سزا رجم اور غیر محصن کی سزا سو کوڑے ہے اور جہاں سورہ نور کی آیت ۲ کی وضاحت میں نبی کریم ﷺ نے یہ فرمایا کہ یہاں زانی سے مراد زانیٔ غیر محصن ہے، پر سخت تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''ہم پورے اطمینان سے کہہ سکتے ہیں کہ عربی زبان کے اسالیب بیان میں اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔لغت قرآن سے واقف کوئی شخص اس بات کا تصور نہیں کر سکتا کہ 'اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي' کے الفاظ سے محض کنوارا زانی اور کنواری زانیہ بھی مراد لیے جاسکتے ہیں۔آیت کے الفاظ اپنے لغوی مفہوم کے اعتبار سے اس کی نفی کرتے ہیں۔ جملے کی ترکیب وتالیف اس سے ابا کرتی ہے۔کلام کے سیاق وسباق کو اسے قبول کرنے سے انکار ہے۔ عرف و عادت کی دلالت کی بنا پر اسے متکلم کا منشا قرار نہیں دیا جاسکتا۔قاضیٔ عقل بالصراحت اس کے عدم جواز کا فتویٰ دیتا ہے۔غرض کسی لحاظ سے اسے قرآن مجید کے مدعا کی شرح و تبیین قرار دینا ممکن نہیں ہے۔ یہ اگر شرح ہے تو پھر بیل سے گھوڑا مراد لیا جاسکتا ہے۔ زمین کا لفظ آسمان کے معنی میں بولا

جاسکتا ہے۔ثریا سے ثریٰ کا مفہوم اخذ کیا جاسکتا ہے۔آفتاب ماہ کا ہم معنی ہوسکتا ہے اور نور کو ظلمت کے محل میں استعمال کر سکتے ہیں''۔ یہ مقام اشتعال انگیز ہے اور کئی لوگ اسے توہین رسالت کے مترادف سمجھتے ہیں۔ یہ جاوید صاحب کی خوش قسمتی ہے کہ ان کے مخالفین میں سے کسی نے آج تک اس بات کو نہیں اچھالا اور انہیں توہین رسالت کے جرم میں عدالت میں نہیں گھسیٹا۔

سزائے موت کا خاتمہ

مغربی فکر میں ہیومنزم وغیرہ کی رو سے چونکہ تقدیس فرد کو حاصل ہے اس لیے وہاں کے فلسفۂ قانون کے تحت ہمدردی کا مستحق مجرم (فرد) ہے نہ کہ سوسائٹی۔اس کے برعکس اسلام کے فلسفۂ جرم وسزا کے مطابق فرد اگر معاشرے کے امن کو غارت کرتا ہے تو اسے کوئی تقدیس حاصل نہیں بلکہ اسے سخت سزا ملنی چاہیے تا کہ معاشرے کا امن و امان غارت نہ ہولیکن غامدی صاحب اور ان کا مکتب فکر محض مغرب سے فکری مرعوبیت کی وجہ سے ہر اس تصور کی حمایت کرتا ہے جو مغرب سے آئے۔ چنانچہ غامدی صاحب اسلام کے فلسفۂ جرم وسزا کی نئی تاویل کرتے ہیں اور موت کی سزا کو محدود کرنے کی غرض سے سورۃ مائدہ کی آیت 32 کی ایسی تشریح کرتے ہیں جو جمہور امت اور علماء کے خلاف ہے اور سزائے موت کو قتل اور فساد فی الارض تک محدود کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ''اللہ تعالیٰ نے پوری صراحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ ان دو جرائم کو چھوڑ کر، فرد ہو یا حکومت، یہ حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی شخص کی جان کے درپے ہو اور اسے قتل کر ڈالے''[۱۹]

یہی وجہ ہے کہ پیپلز پارٹی کی موجودہ سیکولر اور کرپٹ حکومت (جو کرپشن ہضم کرنے والے قانون NRO کے نتیجے میں وجود میں آئی اور جس کی ڈیل امریکہ نے پیپلز پارٹی اور فوجی آمر میں کروائی) اور جو مغربی حکومتوں کے دباؤ پر سزائے موت کا قانون ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہے،اسے اس معاملے میں غامدی صاحب اور ان کے حلقۂ فکر کی تائید حاصل ہے۔ بلکہ اسلامی نظریاتی کونسل نے تو اس کی حمایت کر بھی دی ہے جس کے غامدی صاحب نہ صرف رکن ہیں بلکہ ان کا حلقۂ فکر ہی وہاں بارسوخ اور مقتدر ہے۔

معاشرت

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ ہیومنزم اور سیکولرزم نے مغرب میں فرد کی خودمختاری، تقدیس، فردمحوری اور فرد غایتی (Individualism) کا جو تصور ابھارا اس نے فرد کی لامحدود آزادی کو جنم دیا کہ فرد جو چاہے سوچے اور جو چاہے کرے۔اور جو بھی وہ سوچے اور جو بھی وہ کرے وہ صحیح ہے، اس کی سوچ اور عمل ہی معیار حق ہے۔ معاشرہ، ریاست اور اجتماعی ادارے چونکہ اس فرد کے پیدا کردہ ہیں لہٰذا وہ

بھی اس کے خادم ہیں اور ان کا کام فرد کی خدمت کرنا اور اس کی سوچ اور عمل کو بروئے کار لانے میں اس کی مدد کرنا ہے۔ سطور بالا میں ہم نے ملاحظہ کیا کہ قانون کے شعبے میں اس (Individualism) کا اظہار کن تصورات کی صورت میں ہوا۔ یہاں ہم یہ دیکھیں گے کہ معاشرت کے شعبے میں ان اصولوں نے کن مزید تصورات کو جنم دیا:

۱۔ حقوق و واجبات میں عورت اور مرد کی مساوات اور عورت کو مرد کے برابر لانے کی سعی، Women Empowerment کے خوبصورت عنوان سے۔

۲۔ عورت اور مرد کے دائرہ کار میں فرق نہ کرنا

۳۔ عورت کی لامحدود جنسی آزادی

ہر مسلمان سمجھ سکتا ہے کہ انسانی معاشرت سے متعلق یہ مغربی افکار اسلامی تعلیمات کے بالکل متضاد اور الٹ ہیں۔ اللہ تعالیٰ چونکہ انسان کا خالق ہے لہٰذا اس سے بڑھ کر انسان کی فطرت اور اس کی ضروریات اور تقاضوں کو سمجھنے والا کون ہوگا؟ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت کے تقاضوں کے مطابق عورت اور مرد کے دائرہ کار میں فرق رکھا۔ لامحدود جنسی آزادی اگرچہ اس نے مرد کو بھی نہیں دی لیکن عورت کا معاملہ مزید نازک تر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے تولید کا ذریعہ بنایا ہے لہٰذا مرد کو ایک سے زیادہ نکاح کرنے کی اجازت کسی ضرورت و مجبوری میں تو شارع دیتا ہے لیکن نسب کی حفاظت کی خاطر عورت کو بیک وقت ایک سے زیادہ مردوں سے نکاح کی اجازت کسی منزّل من اللہ شریعت نے نہیں دی۔ اسی طرح اسلام عورت کے حقوق کا علمبردار اور نگہبان ہے لیکن وہ حقوق و واجبات میں عورت اور مرد کی مساوات کا قائل نہیں بلکہ فیملی یونٹ میں مرد کو انتظامی سربراہ اور بالادست قرار دیتا ہے۔ معاشرت سے متعلق اسلام کی یہ تعلیمات اور یہ نقطۂ نظر معروف و مشہور ہے، قرآن وسنت کی واضح نصوص پر مبنی ہے اور اسلامی معاشرت پچھلے چودہ سو سال سے انہی اصولوں پر قائم چلی آ رہی ہے لیکن غامدی صاحب چونکہ مغربی فکر و تہذیب سے مرعوب و متاثر ہیں اور اسے ہی معیارِ حق اور قابلِ عمل سمجھتے ہیں لہٰذا وہ معاشرت کے باب میں اسلامی احکام کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ وہ مذکورہ بالا مغربی افکار کے مطابق ہو جائیں۔ اس باب میں ان کے اور ان کے تلامذہ کے بعض اجتہادات، جو نصوص قرآن وسنت کی نئی تفہیم و تشریح پر مبنی ہیں، یہ ہیں:

دوپٹہ کی کوئی شرعی حیثیت نہیں

اسلام پردے اور حیاء کا حکم دیتا ہے اور گھر میں، گھر سے باہر اور محرم و غیر محرم کے سامنے سب حالتوں میں عورت کے لباس کے بارے میں قرآن وسنت نے واضح اور متعین ہدایات دی ہیں جن کے

مطابق عورت کا سارا جسم ستر ہے اور جسم میں ظاہر ہے کہ سر اور بال بھی شامل ہیں لہٰذا پچھلے چودہ سو سال سے مسلم معاشرتی روایت یہ ہے کہ خواتین سر اور سینہ ڈھانپنے کے لیے دوپٹہ استعمال کرتی ہیں لیکن چونکہ یہ اسلوب مغربی فکر اور فیشن کے خلاف ہے اور مغرب اس ''دقیانوسیت'' کو ختم کرنا چاہتا ہے لہٰذا غامدی صاحب فرماتے ہیں'' دوپٹہ ہمارے ہاں مسلمانوں کی تہذیبی روایت ہے، اس بارے میں کوئی شرعی حکم نہیں ہے۔ دوپٹے کو اس لحاظ سے پیش کرنا کہ یہ شرعی حکم ہے، اس کا کوئی جواز نہیں''(۲۰)

ظاہر ہے کہ مسلمان عورت کو یہ کہنا کہ دوپٹہ لینا شرعی حکم نہیں ہے اس کو یہ پیغام دینا ہے کہ دوپٹہ غیر ضروری ہے، اگر نہ بھی لیا جائے تو کوئی ہرج نہیں کیونکہ یہ کوئی شرعی حکم نہیں۔ اہل مغرب کی خواہش کے مطابق مسلم عورت کو بے حیائی سکھانے کا یہ کارگرنسخہ ہے جو غامدی صاحب کے مکتب فکر نے ایجاد کیا ہے۔

عورت کی دیت مرد کے برابر ہے

اسلام نے عورت پر چونکہ معاشی ذمہ داری نہیں ڈالی بلکہ خود اس کی کفالت بھی مرد کے ذمہ ہے۔ عورت جب بیٹی ہوتی ہے تو باپ کی کفالت میں ہوتی ہے، بیوی ہو تو خاوند اس کا کفیل ہوتا ہے اور ماں ہو تو بیٹے اس کی خدمت کرنا سعادت سمجھتے ہیں۔ لہٰذا قرآن وسنت نے تقسیم دولت کے مختلف مواقع پر اس کا حصہ مرد کے برابر نہیں رکھا جیسے مثلاً وراثت میں۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ نے عورت کی دیت (Blood Money یعنی وہ رقم جو قاتل (اور اس کے حمایتی) مقتول کے ورثاء کو صلح کی صورت میں دیتے ہیں) بھی مرد سے آدھی قرار دی لیکن مغرب کے نظریۂ مساوات مرد و زن سے متاثر ہو کر غامدی صاحب کا اجتہاد یہ ہے کہ عورت اور مرد کی دیت برابر ہونی چاہیے۔(۲۱)

گواہی میں عورت و مرد کی مساوات

اسلام نے چونکہ عورتوں اور مردوں کا دائرہ کار الگ الگ رکھا اور مردوں کو معاش اور باہر کی دوڑ دھوپ اور عورت کو گھر داری اور پرورش اولاد کی ذمہ داری دی اس لیے اس نے عورت کو تھانے کچہری کے مسائل سے دور رکھنے کی کوشش کی اور اسے مردوں کی طرح گواہ بنانے سے بھی احتراز کیا لیکن غامدی صاحب مغرب کے مساوات مرد و زن کے اصول کی پاسداری کے لیے عورتوں کی گواہی کے اس نظام کی تاویل کرتے اور اسے مردوں کے برابر لانے کا اجتہاد فرماتے ہیں۔(۲۲)

عورت نکاح خواں ہو سکتی ہے

معاشرت میں انتظامی سربراہی اسلام نے چونکہ مرد کو دی ہے لہٰذا نکاح وطلاق کا اختیار بھی مرد کو دیا کہ وہی ولی بن سکتا ہے اور نکاح پڑھ اور پڑھوا سکتا ہے لیکن غامدی صاحب مغرب کے نظریۂ مساوات مرد و زن کے تحت اجتہاد فرماتے ہیں کہ عورت بھی نکاح پڑھا سکتی ہے۔(۲۳)

انٹرنیٹ پر مسلم لڑکی لڑکے کی دوستی جائز ہے

اسلام عفت وعصمت اور پاکیزگیٔ کردار کا علمبردار ہے لہٰذا وہ لوگوں کے ذہن وقلب کو پاکیزہ رکھنے کی خاطر فرماتا ہے کہ میں تمہاری آنکھ کی خیانت سے بھی واقف ہوں (۲۴) اور دل میں گزرنے والے خیالات سے بھی (۲۵) لیکن مغرب میں چونکہ لڑکیوں لڑکوں کو شادی سے پہلے دوستیوں کی بلکہ سب کچھ کرنے کی اجازت ہے اور جدید اسلام میں مغرب کی فکر و منہج سے مطابقت ضروری ہے لہٰذا غامدی صاحب فرماتے ہیں کہ مسلمان کنواری لڑکیوں کو لڑکوں سے انٹرنیٹ پر دوستی کی اجازت ہے، حدود کے اندر رہ کر۔ مطلب یہ کہ شارع نے (اور مقاصد شریعت کے تحفظ کے لیے علماء وفقہاء نے) سدّ ذریعہ کے طور پر اس ضمن میں جتنے بھی احکام دیئے ہیں وہ محض حماقت پر مبنی تھے لہٰذا آج ان احکام پر عمل کرنے کی بجائے مغربی تہذیب کے مقاصد پورے کرنے کے لیے اجتہاداً کنواری مسلمان لڑکیوں کو لڑکوں سے انٹرنیٹ پر دوستی کی اجازت ہونی چاہیے تاکہ مغرب کی فری سیکس سوسائٹی کی شاہراہ کی طرف بڑھنے کے لیے ایک روزن تو کھلے۔

عورت باجماعت نماز کی امام ہوسکتی ہے

اسلام نے اپنے مذکورہ بالا معاشرتی مقاصد کے لیے عورت کو عبادت کی سربراہی سے بھی دور رکھا چنانچہ نبی کریم ﷺ نے جو معاشرت قائم کی اس میں عورتوں کو باجماعت نماز کا امام نہیں بنایا، انہیں دن کے وقت مسجدوں میں آنے سے مستثنٰی رکھا، مسجد میں ان کو مردوں کی صفوں کے پیچھے الگ صفیں بنانے کے لیے کہا، مسجد آتے جاتے راستے کے کنارے پر چلنے کے لیے کہا، امام کے غلطی کرنے پر انہیں اونچی آواز میں بول کر اصلاح کرنے سے منع کیا۔۔۔لیکن مغرب چونکہ مساوات مرد و زن کا قائل ہے لہٰذا غامدی صاحب اور ان کے حلقۂ فکر کی ترجمانیٔ اسلام یہ ہے کہ عورت بھی نماز باجماعت کی امام ہوسکتی ہے۔ (۲۶)

مسلمان خاتون غیر مسلم سے نکاح کرسکتی ہے

قرآن حکیم نے مسلمان مردوں اور عورتوں کو مشرکین سے نکاح کرنے سے منع کیا ہے (۲۷) اسی لیے مسلم معاشرہ پچھلے چودہ سو سال سے اس اصول پر کاربند ہے کہ مسلمان مرد کسی مشرکہ عورت سے نکاح نہیں کرتے جب تک وہ ایمان نہ لائے اور مسلمان عورت کسی مشرک مرد سے نکاح نہیں کرتی جب تک وہ ایمان نہ لائے۔ اس کی حکمت واضح ہے کہ بے دین اور مشرک مرد / عورت سے شادی مسلمان مرد / عورت کے لیے غارت گر ایمان وعمل ہوسکتی ہے اور ان کی آخرت برباد کرسکتی ہے۔

قرآن حکیم نے اگرچہ مسلمان مردوں کو ایسی اہل کتاب عورتوں سے شادی کی اجازت دی ہے جو

پاکیزہ کردار کی حامل ہوں (۲۸) لیکن مسلم خواتین کے لیے ایسی اجازت کا ذکر قرآن وسنت میں موجود نہیں۔ اس کی حکمت بھی واضح ہے کہ مرد عورت پر قوام ہوتا ہے اور اپنے دین وایمان کی حفاظت کر سکتا ہے جب کہ عورت کمزور ہوتی ہے، مرد کے زیر اثر ہوتی ہے اور اس کے لیے مرد کے مقابلے میں اپنے دین و ایمان کی حفاظت اور اولاد کی بحیثیت مسلمان تربیت مشکل ہوتی ہے اس لیے مسلم معاشرت میں پچھلے چودہ سو سال سے عمل اس پر ہے کہ مسلمان عورتوں کا نکاح اہل کتاب مردوں سے نہیں کیا جاتا۔ بلکہ حضرت عمرؓ نے صحابہ کرام کو بطور سدّ الذریعہ اہل کتاب عورتوں سے نکاح سے منع کر دیا تھا۔ آج کے بہت سے اہل علم بھی کتابیہ سے نکاح کو جائز نہیں سمجھتے کیونکہ آج کل کی اہل کتاب خواتین فساد عقیدہ وعمل (خصوصاً جنسی بگاڑ کے ماحول) کی وجہ سے 'محصنات' کی قرآنی شرط پر پوری نہیں اترتیں۔

لیکن اس سب کے باوجود غامدی صاحب کا مکتب فکر مسلم خواتین کے مشرک مرد سے نکاح کو جائز قرار دیتا ہے چنانچہ ایک مسلم لڑکی کے استفتا دیر کہ کیا وہ ہندو لڑکے سے شادی کر سکتی ہے، غامدی صاحب کے ایک تلمیذ رشید نے جواب دیا ''ہماری رائے میں غیر مسلم کے ساتھ شادی کو ممنوع یا حرام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ قرآن مجید کی واضح ممانعت نہ ہونے کی بناء پر ایسی شادی غیر پسندیدہ قرار دی جا سکتی ہے۔ اس معاملے میں بہر حال آخری فیصلہ آپ ہی کو کرنا ہے کہ شادی کی جائے یا نہ'' (۲۹)

عورت اور مرد اکٹھے کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتے ہیں

عورت اور مرد کا دائرہ کار الگ رکھنا اور عورتوں اور مردوں کو مخلوط ہونے سے بچانا مسلمان معاشرت کا وہ اصول ہے جس کی بنیاد قرآن وسنت کے محکم اصولوں پر ہے چنانچہ باجماعت نماز میں نبی کریم ﷺ کا طریقۂ مبارک یہی تھا کہ خواتین مسجد میں مردوں اور بچوں کے پیچھے آخری صف میں کھڑی ہوتی تھیں۔ ایک دفعہ آپ ﷺ نے حضرت انسؓ اور ان کے اہل خانہ کو جماعت سے نماز پڑھائی تو حضرت انسؓ کو اپنی دائیں طرف اور ان کی ماں کو اپنے پیچھے کھڑے کیا۔ چنانچہ اسی پر امت پچھلے چودہ سو سال سے عمل کرتی آ رہی ہے کہ خواتین صف میں مردوں کے ساتھ کھڑی نہیں ہوتیں۔ لیکن مغرب کا موقف اسلام کے برعکس یہ ہے کہ عورت مرد ہر لحاظ سے برابر ہیں اور انہیں ساری دینی و معاشرتی سرگرمیوں میں مل کر حصہ لینا چاہیے۔ مغرب کے اس اصول کی رعایت کرتے ہوئے غامدی صاحب کے مکتب فکر نے یہ فتوی دیا ہے کہ عورت اور مرد اکٹھے کھڑے ہو کر نماز ادا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ایک استفتاء کے جواب میں غامدی صاحب کے ایک تلمیذ رشید نے لکھا ''مرد وعورت برابر کھڑے ہو کر باجماعت یا انفرادی دونوں طرح سے نماز ادا کر سکتے ہیں۔ اس سے دونوں کی نماز میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا''۔ (۳۰)

متفرق

۱۔منکرین اسلام کو کافر ومشرک کہنا جائز نہیں

'اسلام' لغت کی رو سے نام ہے کسی کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینے کا اور بحیثیت اصطلاح اس سے مراد ہے اللہ اور اس کی ہدایت اور اس کے نازل کردہ دین کے آگے بلا شرط سرِ تسلیم خم کر دینا۔ جو آدمی اللہ اور اس کی ہدایت کو بلا شرط قبول کرتا ہے وہ 'مسلم' ہے اور جو اس کا انکار کرتا ہے وہ 'کافر' ہے (لغت میں بھی اور اصطلاحاً بھی) چنانچہ الٰہی ہدایت اور حق کا انکار کرنے والے کو خدا اور رسول نے قرآن وسنت میں کافر ہی کہا ہے اور امت بھی چودہ سو سال سے انہیں کافر (یعنی منکر حق و ہدایت) ہی کہتی چلی آ رہی ہے لیکن غامدی صاحب چونکہ اہل مغرب اور ان کی فکر وتہذیب کو بھی حق سمجھتے ہیں (اور اس میں اہل مغرب کے نظریات کے حامی ہندو بھی شامل ہیں کیونکہ انہیں بھی اسلام اور مسلمانوں سے نفرت ہے یعنی الکفر ملۃ واحدۃ) لہٰذا غامدی صاحب اور ان کا مکتب فکر اہل کتاب (یہود ونصاری) اور بت پرست ومشرکین (ہنود) کو بھی کافر کہنے پر تیار نہیں۔اس ضمن میں ان کا مسلک یہ ہے کہ:

''ہمارے نزدیک مشرک وہ شخص ہے جس نے شرک کی حقیقت واضح ہو جانے کے بعد بھی شرک ہی کو بطور دین اپنا رکھا ہو۔ چونکہ اب کسی ہندو کے بارے میں یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے شرک کی حقیقت واضح ہو جانے کے بعد بھی شرک ہی کو بطور دین اپنا رکھا ہے لہٰذا اسے منکر قرار نہیں دیا جا سکتا ہے اور نہ قرآن کے اس حکم کا اطلاق اس پر کیا جا سکتا ہے''(۳۱)

اسی طرح وہ اہل کتاب کو بھی کافر قرار نہیں دیتے جو نبی کریم ﷺ کی رسالت کے منکر (کافر) ہیں۔ان کا کہنا یہ ہے کہ ''کسی کو کافر قرار دینا ایک قانونی معاملہ ہے۔پیغمبر اپنے الہامی علم کی بنیاد پر کسی گروہ کی تکفیر کرتا ہے۔ یہ حیثیت اب کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی۔اب ہمارا کام یہی ہے کہ ہم مختلف گروہوں کے عمل وعقیدہ کی غلطی واضح کریں اور جو لوگ نبی کریم ﷺ کی نبوت کو نہیں مانتے، انہیں بس غیر مسلم سمجھیں اور ان کے کفر کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں)''۔(۳۲)

۲۔داڑھی رکھنا دین کی رو سے ضروری نہیں

نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ داڑھی رکھیں کیونکہ یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور اس میں یہود ونصار کی مخالفت بھی ہے (جو داڑھی منڈواتے ہیں) اور مسلمانوں کی بحیثیت ایک الگ ملت پہچان وانفرادیت بھی ہے۔ نیز یہ نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ بلکہ جمیع انبیاء کی سنت بھی ہے اور اسی پر امت کا پچھلے چودہ سو سال سے اجماع اور عمل ہے لیکن غامدی صاحب کو چونکہ اسلام کی ایسی

تشریح درکار ہے جس سے اہل مغرب اور ان کی تہذیب کی تائید ہوتی ہولہٰذا انہوں نے داڑھی کو دین ہی سے خارج کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے 27 سنن کی جو فہرست تیار کی ہے (۳۳) اس میں داڑھی شامل نہیں ہے۔ اور ایک مستفتی کو جس نے داڑھی رکھنے کے بارے میں سوال پوچھا تھا، جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں ''عام طور پر اہل علم داڑھی رکھنا دینی لحاظ سے ضروری قرار دیتے ہیں، تاہم ہمارے نزدیک داڑھی رکھنے کا حکم دین میں کہیں بیان نہیں ہوا، لہٰذا دین کی رو سے داڑھی رکھنا ضروری نہیں ہے''۔ (۳۴)

۳۔ موسیقی، تصویر اور مجسمہ سازی جائز ہے

اسلام دین فطرت ہے لہٰذا وہ انسان کے فطری میلانات پر روک نہیں لگاتا البتہ ان کی تہذیب ضرور کرتا ہے تاکہ وہ غلط اور مضر رخ اختیار نہ کریں چنانچہ ہمیں نبی کریم ﷺ کی سنت سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ ایسا گانا جائز نہیں ہے جس کا مواد (content) مناسب نہ ہو اور نبی کریم ﷺ نے آلات موسیقی کے استعمال سے بھی منع فرمایا کیونکہ یہ انسان کے حیوانی جذبات کو انگیخت کرتے ہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ نے انسانوں اور جانداروں کی تصویر سازی سے بھی منع کیا کہ اس سے ان کی تقدیس کے جذبات ابھرتے اور اس کے مواقع پیدا ہوتے ہیں اور اسلام کے تصور توحید کو زک پہنچنے کا احتمال بڑھتا ہے۔ ان احکام کے پیش نظر اور مذکورہ حکمتوں کی بناء پر اور بطور سد الذریعہ جمہور علماء نے ہمیشہ موسیقی اور تصویر سازی کی حوصلہ شکنی کی ہے اور اسی پر امت کے صالح عناصر کا صدیوں سے عمل ہے۔ مسلم تاریخ میں بلا شبہ بعض مسلمان بادشاہوں، امراء اور اہل ہوس کے ہاں رقص و سرود اور ناؤ و نوش کی محفلیں جمتی رہی ہیں لیکن اہل علم وصلاح نے کبھی ان کی تصویب نہیں کی بلکہ اسے منکرات میں شمار کر کے ہمیشہ اس کی مذمت ہی کی ہے۔

اس کے برعکس مغربی تہذیب موسیقی کو روح کی غذا قرار دیتی ہے اور تصویر تو اس تہذیب کی جان ہے اور ان کی تجارت کو آگے بڑھانے کا بنیادی ذریعہ ہے بلکہ سارے شعبہ ہائے زندگی میں تصویر کا کردار اہم ہے۔ لہٰذا غامدی صاحب اور ان کا مکتب فکر مجبور ہے کہ کسی طرح موسیقی اور تصویر سازی کو عین اسلامی ثابت کرے تاکہ لوگ مغربی تہذیب کی پیروی کرتے ہوئے کسی احساس گناہ میں مبتلا نہ ہوں بلکہ اس سے لطف اندوز ہوں چنانچہ غامدی صاحب کے ایک تلمیذ رشید فرماتے ہیں: (۳۵)

> ''تاہم اس کے باوجود اس (یعنی بائبل) کے اندر پروردگار کی رشد و ہدایت کے بے بہا خزانے موجود ہیں۔ اس کے مندرجات کو اگر اللہ کی آخری اور محفوظ کتاب قرآن مجید کی روشنی میں سمجھا جائے تو فلاح انسانی کے لیے اس سے بہت کچھ اخذ و استفادہ کیا جا سکتا ہے

اس کتاب مقدس میں موسیقی اور آلات موسیقی کا ذکر متعدد مقامات پر موجود ہے۔ ان سے بصراحت یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ پیغمبروں کے دین میں موسیقی یا آلات موسیقی کو کبھی ممنوع قرار نہیں دیا گیا''۔

غامدی صاحب کے ایک دوسرے شاگرد نے تصویر کے موضوع پر تحقیق کی اور تصویر و مجسمہ سازی کو جائز قرار دیتے ہوئے لکھا:

''لیکن فی نفسہ تصاویر کے بارے میں کسی اعتراض کی کیونکر گنجائش ہوسکتی ہے جبکہ خدا اور اس کے رسول ﷺ نے انہیں جائز رکھا ہو''(۳۶)

۴۔ مسجد اقصیٰ پر مسلمانوں کے مقابلے میں یہودیوں کا حق فائق ہے

جب اہل یورپ نے مسلمانوں کو شکست دے کر مسلم ممالک پر قبضہ کرلیا تو فسلطین و شام پر قبضے کے وقت اس کے مسیحی کمانڈر نے صلاح الدین کی قبر پر ٹھڈے مارتے ہوئے کہا تھا کہ ''اٹھو صلاح الدین! ہم آ گئے ہیں''۔ پھر استعمار نے دنیا بھر سے یہودیوں کو فسلطین میں لاکر بسانا شروع کیا اور فلسطینیوں کو ان کے ملک سے نکال باہر کیا جو آج بھی دنیا میں در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ ان میں سے بہت سے آج کل غزہ میں محصور ہیں اور اسرائیل وہاں غذائی امداد بھی نہیں پہنچنے دے رہا تاکہ وہ بھوکوں مر جائیں۔ اس سے پہلے صبرہ اور شاتیلہ کے کیمپوں میں جس وحشت اور درندگی سے اسرائیل نے فلسطینیوں کو ذبح کیا اس پر غیر مسلم دنیا بھی چیخ اُٹھی تھی۔ ساری مہذب دنیا اور ساری مسلمان امت مظلوم فلسطینیوں کے ساتھ ہے لیکن غامدی مکتب فکر کے ممتاز محقق اور الشریعہ کے ایڈیٹر عمار ناصر صاحب نے طویل مضامین لکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں کے مقابلے میں مسجد اقصیٰ اور صخرہ پر یہودیوں کا حق فائق ہے گویا بیت المقدس یہودیوں ہی کے پاس رہنا چاہیے۔ مظلوم فلسطینی مسلمانوں کے مقابلے میں غاصب اور ظالم یہودیوں کی حمایت پر مبنی یہ ٹھنڈی اور شائستہ تحریر اسی طرح اشتعال انگیز ہے جس طرح غلام احمد قادیانی کی وہ ہدایت جب اس نے اپنے متبعین کو اس وقت قادیان میں چراغاں کرنے کا حکم دیا تھا جب برطانوی فوجوں نے ترکی کے بعض اہم شہروں پر قبضہ کیا تھا کہ ان کی سرپرست اور مہربان حکومت کو فتح حاصل ہوئی تھی۔

حاصل بحث

سطور بالا میں ہم نے غامدی صاحب اور ان کے رفقاء کے نصوص کی تعبیر و تشریح اور اجتہادات کے نمونے دیکھ لیے۔ ان 'اجتہادات' اور نصوص کی تشریح و تاویل سے جو چیز ایک تسلسل اور اشتراک کے ساتھ متبادر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ کسی طرح مغربی تہذیب اور اس کے مظاہر کو عین اسلامی ثابت کر

دیا جائے جب کہ اس سے پہلے ہم تفصیل سے یہ بتا چکے ہیں کہ مغربی تہذیب جن بنیادی افکار و نظریات پر کھڑی ہے وہ اپنی اساس اور کنہ میں خلاف اسلام اور مبنی بر کفر و الحاد ہیں، لہٰذا غامدی صاحب اور ان کے تلامذہ کی یہ ساری تشریحات اور یہ سارے 'اجتہادات' نا قابل قبول ہیں۔ یہ اجتہاد نہیں تجدد ہے جو شرعاً مردود ہے۔۔ لیکن اس پر مزید بحث کرنے سے پہلے یہ مناسب محسوس ہوتا ہے کہ یہ دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ اسلام کو مغربی تہذیب کے مطابق ڈھالنے یا اس کے مطابق ثابت کرنے کا کام غامدی صاحب کرتے کیسے ہیں یعنی ان کا منہج اور طریق کار کیا ہے؟

دوسری دلیل

غامدی صاحب کا منہج فکر اور طریق استنباط جمہور امت سے الگ اور شاذ ہے

ظاہر ہے اگر غامدی صاحب دین کے مآخذ کو اسی طرح مانیں جس طرح کہ ساری امت اور جمہور مسلمان مانتے ہیں تو وہ یہ ہنر نہیں دکھا سکتے کہ غیر اسلامی مغربی تہذیب کے مظاہر کو عین اسلامی ثابت کر سکیں، لہٰذا انہوں نے ان مآخذ کی تشریح و تعبیر اس طرح کی ہے جو خاص ان کی اپنی ہے، شاذ اور منفرد ہے اور جمہور امت سے مختلف ہے۔ اس کے بعد ظاہر ہے وہ جس چیز کو چاہیں عین اسلامی ثابت کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ ہم اس سے پہلے ذکر کر چکے ہیں اسلام لغت و اصطلاح میں نام ہے اللہ کی غیر شروط اطاعت کا۔ گویا جو اسلام قبول کرتا اور خود کو مسلم کہتا ہے اس کے لیے ہدایت اور زندگی گزارنے کا راستہ صرف وہ ہے جو اللہ نے اپنی کتاب اور رسول کے ذریعے بھیجا ہے۔ گویا دین کے بنیادی مآخذ ہیں کتاب و سنت۔ پھر چونکہ حضرت محمد ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے آخری رسول قرار دے دیا لہٰذا اللہ نے دین کو ہمیشہ کے لیے قابل عمل رکھنے کی خاطر اپنے پیغمبر کے ذریعے امت کو اجتہاد کی اجازت دے دی تا کہ جن امور میں حکم شرعی صراحتاً موجود نہ ہو وہاں نصوص کی روشنی میں اور شریعت کے مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے اہل علم کوئی رائے قائم کر لیں۔ قرآن و سنت کی نصوص کی جن تشریحات اور اجتہادات پر امت کے سارے اہل علم متفق ہو جائیں انہیں اجماع کہا جاتا ہے۔ غامدی صاحب کا منہج اور طریق استنباط یہ ہے کہ وہ دین و شریعت کے ان تینوں مآخذ یعنی کتاب و سنت اور اجماع کی ایسی تشریح و تاویل کرتے ہیں جو ساری امت اور جمہور علماء سے مختلف ہے لہٰذا ان کے لیے رستہ نکل آتا ہے کہ وہ مغربی تہذیب کے افکار و مظاہر کو عین اسلامی ثابت کر سکیں۔

اس کی کچھ تفصیل یہ ہے:

غامدی صاحب کا 'کتاب وسنت' کا نیا مفہوم

جمہور علماء اور امت 'الکتاب' سے قرآن مجید مراد لیتے ہیں جبکہ غامدی صاحب اس میں سابقہ انبیاء کے صحائف کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ (۳۷) اس موضوع پر غامدی صاحب نے اپنی کتاب 'میزان' میں 'دین کی آخری کتاب' کے حوالے سے جو تحریر لکھی ہے اس کا خلاصہ ان کے تلمیذ خاص مناب منظور الحسن صاحب نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

''قرآن مجید دین کی آخری کتاب ہے۔ دین کی ابتدا اس کتاب سے نہیں' بلکہ ان بنیادی حقائق سے ہوتی ہے جو اللہ نے روزِ اوّل سے انسان کی فطرت میں ودیعت کر رکھے ہیں۔ اس کے بعد وہ شرعی احکام ہیں جو وقتاً فوقتاً انبیاء کی سنت کی حیثیت سے جاری ہوئے اور بالآخر سنت ابراہیمی کے عنوان سے بالکل متعین ہو گئے۔ پھر تورات' زبور اور انجیل کی صورت میں آسمانی کتابیں ہیں جن میں ضرورت کے لحاظ سے شریعت اور حکمت کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اس کے بعد نبی کریم ﷺ کی بعثت ہوئی اور قرآن مجید نازل ہوا۔ چنانچہ قرآن دین کی پہلی نہیں بلکہ آخری کتاب ہے اور دین کے مصادر قرآن کے علاوہ فطرت کے حقائق، سنت ابراہیمی کی روایت اور قدیم صحائف بھی ہیں۔ اس موضوع پر مفصل بحث استاذ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کی تالیف ''میزان'' کے صفحہ ۴۷ پر ''دین کی آخری کتاب'' کے زیر عنوان ملاحظہ کی جا سکتی ہے''۔ (۳۹)

قرآن کے ساتھ پہلی کتب سماویہ سے استدلال کے حوالے سے غامدی صاحب کے ایک دوسرے شاگرد جناب طالب محسن صاحب نے لکھا ہے کہ:

''بائبل، تورات، زبور، انجیل اور دیگر صحف سماوی کا مجموعہ ہے۔ اپنی اصل کے لحاظ سے یہ اللہ ہی کی شریعت اور حکمت کا بیان ہے۔ اس کے مختلف حاملین نے اپنے اپنے مذہبی تعصّبات کی بنا پر اگر چہ اس کے بعض اجزاء کو ضائع کر دیا اور بعض میں تحریف کر دی، تاہم اس کے باوجود اس کے اندر پروردگار کی رشد و ہدایت کے بے بہا خزانے موجود ہیں۔ اس کے مندرجات کو اگر اللہ کی آخری اور محفوظ کتاب قرآن مجید کی روشنی میں سمجھا جائے تو فلاح انسانی کے لیے اس سے بہت کچھ اخذ و استفادہ کیا جا سکتا ہے اس کتاب مقدس میں موسیقی اور آلات موسیقی کا ذکر متعدد مقامات پر موجود ہے۔ ان سے بصراحت یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ پیغمبروں کے دین میں موسیقی یا آلات موسیقی کو کبھی ممنوع قرار نہیں دیا گیا''۔ (۴۰)

یہی حال 'سنت' رسول ﷺ کا ہے۔ امت اور جمہور علماء سنت سے مراد لیتے ہیں نبی کریم ﷺ

کے اقوال و افعال اور تقاریر۔ غامدی صاحب اس سے اختلاف کرتے ہوئے سنت کو نہ صرف نبی کریم ﷺ کے ان اعمال تک محدود کر دیتے ہیں جو ان کے نزدیک صحابہ کرام کے تواتر اور تعامل سے ثابت ہوں (یوں وہ سنت کو 27 اعمال تک محدود کر دیتے ہیں) بلکہ اس میں وہ سابقہ انبیاء کی سنت کو بھی شامل کر دیتے ہیں اور اس شرط پر پوری نہ اترنے والی آنحضرت ﷺ کی ہزاروں سنتوں، اقوال اور تقاریر کو خبر واحد قرار دے کر رد کرتے ہوئے یہ فیصلہ سنا دیتے ہیں کہ ان سے دین ثابت نہیں ہوتا چنانچہ وہ کہتے ہیں:

''سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی کریم ﷺ نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔ قرآن مجید میں اس کا حکم آپ ﷺ کے لیے اس طرح بیان ہوا ہے: ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (النحل ۱۶:۱۲۳) ''پھر ہم نے تمہیں وحی کی کہ ملت ابراہیم کی پیروی کرو جو بالکل یک سو تھا اور مشرکوں میں سے نہیں تھا''۔ اس ذریعے سے جو دین ہمیں ملا ہے وہ یہ ہے: (۱) اللہ کا نام لے کر اور دائیں ہاتھ سے کھانا پینا (۲) ملاقات کے موقع پر 'السلام علیکم' اور اس کا جواب (۳) چھینک آنے پر 'الحمد للہ' اور اس کے جواب میں 'یرحمک اللہ' (۴) نومولود کے دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت (۵) مونچھیں پست رکھنا (۶) زیر ناف کے بال مونڈنا (۷) بغل کے بال صاف کرنا (۸) لڑکوں کا ختنہ کرنا (۹) بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا (۱۰) ناک، منہ اور دانتوں کی صفائی (۱۱) استنجا (۱۲) حیض و نفاس میں زن و شو کے تعلق سے اجتناب (۱۳) حیض و نفاس کے بعد غسل (۱۴) غسل جنابت (۵) میت کا غسل (۱۶) تجہیز و تکفین (۱۷) تدفین (۱۸) عید الفطر (۱۹) عید الاضحیٰ (۲۰) اللہ کا نام لے کر جانوروں کا تزکیہ (۲۱) نکاح و طلاق اور ان کے متعلقات (۲۲) زکوٰۃ اور اس کے متعلقات (۲۳) نماز اور اس کے متعلقات (۲۴) روزہ اور صدقۂ فطر (۲۵) اعتکاف (۲۶) قربانی (۲۷) حج و عمرہ اور ان کے متعلقات۔ سنت یہی ہے اور اس کے بارے میں یہ بالکل قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ جس طرح صحابہ کے اجماع اور قولی تواتر سے ملا ہے یہ اسی طرح ان کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے اور قرآن ہی کی طرح ہر دور میں امت کے اجماع سے ثابت قرار پائی ہے' لہٰذا اس کے بارے میں اب کسی بحث و نزاع کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دین لا ریب انہی دو صورتوں میں ہے (یعنی قرآن اور سنت) ان کے علاوہ کوئی چیز نہ دین ہے اور نہ اسے دین قرار دیا جا سکتا ہے۔''[۴۱]

''دوسرا اصول یہ ہے کہ سنت کا تعلق تمام تر عملی زندگی سے ہے' یعنی وہ چیزیں جو کرنے کی ہیں''[۴۲]

''میرے نزدیک صرف وہی چیزیں سنت کی حیثیت رکھتی ہیں جو صحابہ کرامؓ کے اجماع سے ہم تک منتقل ہوئی ہوں۔ ہم انہی چیزوں پر اصرار کر سکتے ہیں اور ان کی خلاف ورزی پر لوگوں کو توجہ بھی دلا سکتے ہیں۔ جن امور میں صحابہ کرامؓ کا اجماع نہیں ہے انہیں نہ سنت کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے اور نہ ان پر عمل کے لیے اصرار کیا جا سکتا ہے۔ میری تحقیق کے مطابق رفع یدین بھی ان چیزوں میں شامل ہے جن پر صحابہ کرامؓ کا اجماع نہ ہو سکا' اس وجہ سے میں اسے سنت نہیں سمجھتا۔ اس کے بعد چاہے ساری دنیا متفق ہو کر اسے سنت قرار دینے لگے تو میرے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں۔'' (۴۳)

جب کہ امت اور جمہور علماء کرام دین کی ساری تفصیلات اور زندگی کے سارے شعبوں کے ہزاروں اعمال کی سند اس سنت سے لیتے ہیں جو ان کے نزدیک آنحضرت ﷺ کے اقوال و افعال و تقاریر پر مشتمل ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب غامدی صاحب 'کتاب وسنت' کا وہ مفہوم قبول ہی نہیں کرتے جو امت کرتی ہے اور ان کا 'کتاب وسنت' کا اپنا ایک مخصوص، شاذ، منفرد اور امت سے الگ مفہوم ہے (اور اس مفہوم کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے ساتھ بائیبل بھی ماخذ احکام ہے، قرآن کی تشریح میں سنت کا کردار محدود ہے۔ سنت میں وہ ہزاروں احکام شامل ہی نہیں جنہیں امت چودہ سو سال سے سنت سمجھتی آئی ہے) تو ظاہر ہے 'کتاب وسنت' کے اپنے اس مفہوم سے وہ جو چاہیں عین اسلامی ثابت کر سکتے ہیں۔

اجماع اور تعامل امت کا انکار

اسی طرح امت اور جمہور علماء کرام نصوص کی ان تشریحات اور اجتہادات پر عمل ضروری سمجھتے ہیں جن پر جمہور اہل علم اور مجتہدین کا اتفاق ہو اور جن پر امت کا توافق و تعامل ہو لیکن غامدی صاحب اس طرح کے اجماع کے خلاف رائے قائم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ ظاہر ہے اجماع منزّل من اللہ نہیں ہوتا (اگرچہ بعض اہل علم نصوص پر مبنی احکام پر مجتہدین کے اتفاق کو بھی اجماع قرار دیتے ہیں) بلکہ اہل علم کا کسی اجتہاد یا نص کی کسی خاص تشریح پر اتفاق اور امت کا اس اتفاق کو قبول کر لینا ہے۔ یوں اصولی طور پر اگر اجماع کا تعلق کسی تمدنی یا عرفی معاملے سے ہو تو تغیر زمان و مکان و حالات سے فتویٰ بدل سکتا ہے اور یوں ایک اجماع کے انعقاد کے بعد زمان و مکان اور حالات کے تغیر کے نتیجے میں امت اور اس کے اہل علم کسی دوسری رائے پر بھی اجماع کر سکتے ہیں اور اس دوسرے اجماع پر پہنچنے کے لیے ظاہر ہے اہل علم کو پہلے اجماع کے برعکس اجتہادی رائے قائم کرنے کا حق حاصل ہے لیکن یہاں یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ:

۔ جب تک ایک اجماع موجود ہو وہ حجت ہوتا ہے یعنی عمل اسی پر ہوگا اور قانون اسی کے مطابق بنے گا نہ کہ کسی انفرادی رائے پر۔

۔ کسی اجماع کے خلاف نئی رائے کو امت اور اس کے اہل علم صرف اسی وقت قابل غور و اعتناء سمجھیں گے جب وہ امت اور جمہور علماء کے تصور دین، علمی مسلمات اور اصول استنباط کے مطابق ہو۔
۔ اگر امت اور جمہور علماء کرام کسی عالم/ سکالر کی اجتہادی رائے کو اس بناء پر رد کردیں کہ وہ ان کے تصور دین، علمی مسلمات اور اصول استنباط کے خلاف ہے اور کسی غیر اسلامی فکر وتہذیب پر مبنی ہے تو اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی اور نہ اس پر عمل ہوگا۔

آج امت اور جمہور علماء کرام غامدی صاحب کی آراء کو اس لیے بالاتفاق رد کررہے ہیں کہ وہ ان کے تصور دین، علمی مسلمات اور اصول استنباط کے خلاف ہیں اور ملحدانہ مغربی فکر وتہذیب کے اصول و اقدار کی موافقت پر مبنی ہیں۔

اجماع کی یہ اہمیت اس لیے ہے کہ۔ اجماع درحقیقت کسی قوم کے علمی، فکری اور تہذیبی تسلسل کی ضمانت ہوتا ہے۔ الحمد للہ! مسلم معاشرہ پچھلے چودہ سو سال سے بلا انقطاع قائم ہے اور دنیا کے ذہین ترین لاکھوں افراد نے اس کی علمی، فکری اور تہذیبی روایت کی آبیاری کی ہے جس پر امت صدیوں سے عمل پیرا ہے۔ جمہور اہل علم قرآن وسنت اور ان سے اخذ و استنباط کے جن اصولوں پر صدیوں سے عمل پیرا ہیں اور جن نتائج پر پہنچے ہیں ان کی حیثیت اس پہاڑ یا مضبوط قلعے کی ہے جو پانی کے کنارے قائم ہو۔ پانی کی کوئی لہر کبھی بلند ہوکر اس پہاڑ یا قلعے کی دیوار کی طرف جا لپکتی ہے لیکن وہ فوراً ہی ناکام پلٹ آتی ہے۔

کوئی نیا اجتہاد یا نصوص کی کوئی نئی تشریح جو سابقہ اجماع سے مختلف ہو لیکن وقت کی ضرورت ہو اسے اہل علم خود بخود جلد یا بدیر قبول کرلیں گے بشرطیکہ وہ میرٹ پر پوری اترتی ہو یعنی قرآن وسنت اور اس کی تشریح واستنباط کے مسلمہ اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے قائم کی گئی ہو۔ لیکن اگر کوئی عالم یا سکالر اس پیراڈائم ہی کو قبول نہ کرے اور قرآن وسنت اور ان کی تشریح واستنباط کے مسلمہ اصولوں کی پاسداری نہ کرے تو جمہور اہل علم اور جمہور امت اسے رد کرنے پر مجبور ہوگی۔ ایسے عالم یا سکالر کو یاد رکھنا چاہیے کہ یہ دین آج نازل نہیں ہوا اور نہ اس پر وحی اترتی ہے کہ امت اس کی کسی نئی تشریح کو قبول کرلے۔ صاف بات یہ ہے کہ علمی اصولوں اور روایات کا تسلسل کسی قوم کی فکری زندگی کی حیات کا ضامن ہوتا ہے اور اس کا اس تسلسل کی حفاظت کے لیے مرغی کی طرح پَر پھیلا کر چوزوں کو سمیٹ کر پناہ میں لے لینا اور اسے بیرونی حملہ آور سے بچانے کی کوشش کرنا ایک فطری عمل ہے جو امت کی اجتماعی زندگی کی بقا کا ضامن ہے۔ لہٰذا جمہور علماء اور جمہور امت اگر آج سرسید، قادیانی، پرویز اور غامدی کو رد کرتی ہے (جیسے ماضی میں جمہور علماء اور جمہور امت نے خوارج، معتزلہ، قدریہ،

جہمیہ۔۔۔وغیرہ کو رد کیا اور ان کا ذکر آج ہم صرف تاریخ کی کتابوں میں پڑھتے ہیں) تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں۔۔ یہ قوموں کی حفاظت خود اختیاری کا وہ نظام ہے جو ہمیشہ روبہ عمل رہتا ہے اور رہنا چاہیے ــــ جس طرح آنکھ خود بخود فی الفور اور تیزی سے بند ہو جاتی ہے جب کوئی چیز اس کی طرف بڑھتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ غامدی صاحب نے اپنے عمل سے اجماع کی حجیت کا تو گویا انکار ہی کر دیا ہے اور ان کے تلامذہ اس کا علی الاعلان تحریری انکار کرتے ہیں جیسے ان کے تلمیذ رشید جناب عمار ناصر صاحب کا مؤقف ہے: (۴۴)

یہ تجدد اور احداث فی الدین ہے اور قابل رد ہے

مندرجہ بالا تفصیلات سے واضح ہو گیا کہ:

۱۔ جاوید غامدی صاحب کا تصور کتاب وسنت وہ نہیں جو جمہور امت اور جمہور علماء کا ہے

۲۔ وہ مسلمانوں کے چودہ سو سالہ علمی مسلمات اور تعامل (اجماع) کو اہمیت دینے کو تیار نہیں

یوں جب ان کا تصور دین، علمی مسلمات اور منہج استنباط یا یوں کہیے کہ پورا پیراڈائم ہی اس سے مختلف ہو گیا تو اب وہ جس چیز کو چاہیں دین قرار دے سکتے ہیں اور جسے چاہیں دین سے خارج کر سکتے ہیں اور خصوصاً مغربی تہذیب کی جس چیز کو چاہیں عین اسلامی ثابت کر سکتے ہیں اور اسلامی اصول و احکام کو مغربی فکر وتہذیب کے عین مطابق ثابت کر سکتے ہیں۔

لیکن ظاہر ہے ان کی آراء کو قابل قبول اجتہاد قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ ہم مجبور ہیں کہ ان کی آراء کو تجدد کہیں کہ تجدد کہتے ہی اس کو ہیں کہ کسی غیر اسلامی فکر، تصور اور مظہر کو مصنوعی طور پر اور بتکلف اسلام کے مطابق ثابت کیا جائے یعنی غیر اسلام کو عین اسلام ثابت کیا جائے۔ شرعی اصطلاح میں اسی کو احداث فی الدین اور بدعت کہا جاتا ہے جن کے بارے میں شرعی حکم واضح ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

- ''من احدث فی امرنا ھذا لیس منه فھو رد''(۴۵)

جس نے ہمارے دین میں کوئی ایسی نئی بات نکالی جو اصلاً اس میں نہ ہو تو وہ مردود ہے یعنی وہ رد کر دی جائے گی۔

- ''کل محدثه بدعة و کل بدعة ضلالة''(۴۶)

دین میں ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت کا نتیجہ گمراہی ہے۔

- ''و کل ضلالة فی النار''(۴۷)

اور ہر گمراہی کا نتیجہ جہنم ہے۔

نبی کریم ﷺ کے ارشادات سے یہ بھی واضح ہے کہ احداث فی الدین کا مرتکب روز قیامت آپ ﷺ کی شفاعت سے محروم رہے گا اور آپ ﷺ حوض کوثر پر اسے خود سے دور کر دیں گے اور فرشتے اسے کھینچ کر جہنم میں لے جائیں گے۔ (۴۸) اسی لیے صالح علماء ہمیشہ احداث فی الدین سے بچنے کی دعا اور کوشش کرتے رہتے ہیں۔

کتابیات

اس تفصیل سے غامدی صاحب کے افکار اور ان کا منہج واضح ہو جاتا ہے۔ ہمارے پیش نظر کتاب لکھنا نہیں محض ایک مضمون لکھنا تھا لہٰذا ہم تفصیلات میں نہیں گئے۔ جو اصحاب اس موضوع کا تفصیلی مطالعہ کرنا چاہیں انہیں چاہیے کہ مندرجہ ذیل کتب دیکھ لیں:

۱۔ حافظ محمد زبیر و حافظ طاہر اسلام عسکری، فکر غامدی، مکتبہ انجمن خدام القرآن لاہور ۲۰۰۷ء

۲۔ مولانا پروفیسر محمد رفیق چودھری، غامدی مذہب کیا ہے؟ مکتبہ قرآنیات لاہور ۲۰۰۷ء

۳۔ مولانا مفتی ڈاکٹر عبدالواحد (جامعہ مدنیہ، لاہور)، تحفہ غامدی، لاہور ۲۰۰۷ء

۴۔ مولانا عبدالرحیم، غامدیت کیا ہے؟ جامعہ حنفیہ، امداد ٹاؤن شیخوپورہ، ۲۰۱۱ء (اس کتاب پر ملک بھر کے جید علماء بالخصوص مولانا مفتی زرولی خان (کراچی)، مولانا عبدالقدوس ترمذی (ساہیوال)، مولانا محمد ازہر (ملتان)، مولانا مفتی محمد عیسی (گوجرانوالہ)، مولانا عبدالرحیم (جھنگ)، مولانا یوسف الحسینی (بہاولپور)، مولانا عبدالرؤف چشتی (اوکاڑہ)، مولانا قاضی ظہور حسین اطہر اور مولانا سعید احمد جلالپوری کی تائیدی تقاریظ موجود ہیں)۔

۵۔ مولانا پروفیسر محمد رفیق چودھری، جاوید غامدی اور انکار حدیث، مکتبہ قرآنیات، لاہور

۶۔ مولانا پروفیسر محمد رفیق چودھری، فتنہ غامدیت کا علمی محاسبہ، مکتبہ قرآنیات، لاہور

۷۔ حافظ محمد زبیر، غامدی صاحب کے اصول دین کا علمی و تحقیقی مطالعہ، ادارہ تحفظ حدیث فاؤنڈیشن، کراچی

نیز دیکھیے جرائد میں سے ماہنامہ محدث (لاہور)، ماہنامہ بیداری (حیدرآباد)، ماہنامہ صفدر (گجرات)، ماہنامہ القاسم (خالق آباد، نوشہرہ) اور ماہنامہ الشریعہ (گوجرانوالہ)۔ ویب سائٹس کے لیے دیکھیے: www.endofprophethood.com, www.kitabosunnat.com, www.difaehadees.com اور www.al-mawrid.org

اس مؤقف پر ممکنہ اعتراضات کا جواب

غامدی صاحب کے نظریات کے بارے میں جمہور علماء کرام کے مؤقف کے حوالے سے ہمارے اس

اظہارِ خیال پر غامدی صاحب، ان کے پیروکاروں اور بعض قارئین کے جو ممکنہ اعتراضات ہو سکتے ہیں ان میں سے چند ایک کا ذکر کر کے ہم یہاں ان کا جواب دیں گے تاکہ مسئلہ قارئین پر مزید واضح ہو جائے:

۱۔ علماء علمی اختلاف رائے برداشت نہیں کرتے

غامدی صاحب اپنی تقریر و تحریر میں عموماً اپنی بات سنجیدگی، متانت اور شائستگی سے کرتے ہیں اور عقلی استدلال کے ساتھ کرتے ہیں۔ ساتھ ہر بات میں قرآن و سنت کے حوالے بھی دیتے ہیں لہٰذا ان کے قارئین و سامعین ان سے متاثر ہوتے ہیں اور انہیں سمجھ نہیں آتی کہ علماء کرام غامدی صاحب کی مخالفت کیوں کرتے ہیں؟ غامدی صاحب اور ان کے تلامذہ یہ تاثر دیتے ہیں کہ وہ تو محض بعض معاملات میں پہلے لوگوں سے علمی اختلاف کرتے ہیں اور ظاہر ہے زمانہ اور حالات بدل جانے کی وجہ سے یہ چیز قابل مذمت نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دراصل علماء میں اختلاف رائے برداشت کرنے کی عادت نہیں اور صدیوں کے تقلید و جمود نے انہیں متجدد بنا دیا ہے۔

اس اعتراض کے جواب میں ہم عرض کریں گے کہ بلاشبہ یہ امر جائز ہے کہ آج کوئی عالم ماضی کے اہل علم سے اختلاف کرے یا تفہیم نصوص میں ان کی آراء سے مختلف کوئی رائے ظاہر کرے بلکہ ہم بطور اصول اس امکان کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ماضی کے اجماع کے برعکس آج کوئی نیا اجماع بھی ہو سکتا ہے اس لیے کہ 'الحکم یدور مع العلۃ' اور یہ عین ممکن ہے کہ اگر علت کی بنیاد فقہ واقعی پر ہو یعنی کسی مخصوص عہد یا مخصوص حالات و واقعات سے ہو تو بعد میں اجتہادی حکم بدل جائے گا جس کی مثال نویں صدی ہجری کے حنبلی فقیہ امام جزری کی ہے کہ انہوں نے فتویٰ دیا کہ گھر میں کتا رکھنا جائز ہے۔ سائل نے اعتراض کیا کہ امام احمد کا فتویٰ تو یہ ہے کہ گھر میں کتا رکھنا جائز نہیں۔ انہوں نے کہا میاں! اس وقت حالات اور تھے۔ آج امن و امان کی جو حالت ہے اور چوریوں ڈاکوں کی جو کثرت ہے، اگر امام احمد بن حنبلؒ آج زندہ ہوتے تو کتا چھوڑ گھر میں شیر پالنے کی اجازت دیتے۔ (۴۹)

اجتہادی احکام میں اس طرح کی تبدیلی مسلمان اہل علم کے ہاں کبھی مردود نہیں رہی اور یہی حریت فکر اسلام میں توسع اور اس کے ہمیشہ قابل عمل رہنے کی ضمانت ہے۔ لیکن معاف کیجئے گا اس آزادی کا حق دار وہ ہے جو پیراڈائم کے اندر رہے، جو گیم کے اصولوں کو تسلیم کرے اور اس کے بعد کھیل میں مزید بہتری لانے کے لیے، اور اس کے قواعد و ضوابط میں کمی بیشی کے لیے تجاویز دے تو اس کھیل سے متعلق لوگ اس کی باتوں کو غور سے سنیں گے اور ان میں سے بعض کو وہ قبول بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص کھیل میں ایسی بنیادی تبدیلیاں تجویز کرے جس سے اس کھیل کی شکل ہی بدل

جائے تو اس کی تجاویز کو منطقی طور پر سب لوگ رد کر دیں گے۔ مثلاً اگر کوئی صاحب کرکٹ کی منتظم ایسوسی ایشن کو تجویز دے کہ کرکٹ کی گیند کا رنگ سفید نہیں سرخ ہونا چاہیے اور اس کا یہ اور یہ فائدہ ہے تو اغلب ہے کہ منتظمین اس کی بات پر غور کریں اور تجویز انہیں مفید و مناسب لگے تو مان بھی لیں۔ لیکن اگر کوئی کرکٹ ایسوسی ایشن کو یہ تجویز دے کہ کرکٹ کی بال چھوٹی اور ٹھوس نہیں بلکہ بڑی ہونی چاہیے اور اس میں ہوا بھری ہونی چاہیے تو منطقی طور پر اہل کرکٹ اسے تسلیم نہیں کریں گے اور اسے کہیں گے جاؤ میاں! یہ کرکٹ ہے فٹ بال نہیں۔ جب آپ کرکٹ کھیلنے والوں کو فٹ بال والی تجویز دیتے ہیں تو گویا آپ کرکٹ کی پیراڈائم سے نکل جاتے ہیں اور کرکٹ کے بنیادی اصولوں کی مخالفت کرتے ہیں تو لازماً اہل کرکٹ آپ کی بات نہیں مانیں گے۔

غامدی صاحب کے ساتھ مسئلہ یہی ہے کہ اگر وہ پیراڈائم کے اندر رہتے ہوئے اور کھیل کے بنیادی اصولوں کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی بات کرتے تو لوگ ان کی آراء پر غور کرتے اور مفید ہوتیں تو مان بھی لیتے لیکن جب وہ بنیادی اصولوں سے اختلاف کرتے ہیں تو علماء مجبوراً ان کی مخالفت کرتے ہیں۔ دیکھیے! امت پچھلے چودہ سو سال سے قرآن وسنت کو دین کا بنیادی مآخذ مانتی آئی ہے۔ غامدی صاحب کہتے ہیں نہیں کچھ مآخذ اور بھی ہیں۔ امت کہتی ہے کہ کتاب سے مراد قرآن حکیم ہے وہ کہتے ہیں نہیں اس میں پچھلی کتابیں بھی شامل ہیں۔ امت کہتی ہے سنت نام ہے نبی کریم ﷺ کے قول وفعل وتقریر کا۔ وہ کہتے ہیں نہیں سنت نام ہے صرف ان افعال رسول ﷺ کا جو اجماع صحابہ سے ثابت ہیں، باقی رہیں احادیث تو وہ محض خبر واحد ہیں ان سے تو دین ثابت ہی نہیں ہوتا۔ امت نے چودہ سو سال کے فہم دین اور تعامل سے کچھ اصول واقدار بنا رکھی ہیں، لیکن غامدی صاحب ان سے اختلاف کرتے ہوئے کرکٹ کھیلنے والوں سے کہتے ہیں کہ فٹ بال سے کرکٹ کھیلو۔ امت ان کی یہ بات کیسے مانے اور کیوں مانے؟ وہ تو ان کے پیراڈائم سے ہی نکل گئے، انہوں نے تو کھیل کی بنیادیں ہی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا لہٰذا ان کی بات اب کوئی نہیں سنے گا اور عقل ومنطق کا تقاضا ہے کہ نہ سنی جائے۔

جمہور علماء اگر غامدی صاحب کو گمراہ سمجھتے ہیں (اور بعض مفتی صاحبان تو ان کے ارتداد کا فتویٰ بھی دے رہے ہیں) تو ان کی بات سمجھ میں آتی ہے کہ غامدی صاحب ان کے پیراڈائم سے باہر نکل کر بات کر رہے ہیں اور کھیل کے بنیادی اصولوں کی نفی کر رہے ہیں لہٰذا جمہور امت ان کے نئے نئے اجتہادات اور قرآن وسنت کی اجنبی تشریحات کو قبول کرنے پر تیار نہیں۔ وہ بجا طور پر انہیں سرسید، قادیانی اور پرویز کی قبیل کا فرد سمجھنے پر مجبور ہیں اور یہ منطقی نتیجہ ہے غامدی صاحب کے منہج وموقف کا۔

ہمیں افسوس ہے کہ جاوید غامدی صاحب آج کل جلاوطن ہیں لیکن ان کی جلاوطنی میں عام علماء کرام کے اختلاف رائے برداشت نہ کرنے کا کوئی ہاتھ نہیں بلکہ یہ ہے کہ وہ افغانیوں کے امریکہ کے خلاف جہاد کو جہاد نہیں سمجھتے بلکہ اسے فساد کہتے ہیں۔اس لیے افغان مجاہدین اور ان کے حامی پاکستانی مجاہدین انہیں امریکہ کا حامی اور ایجنٹ سمجھ کر برداشت نہیں کرتے جب کہ ہماری رائے میں یہ بھی صحیح نہیں ہے اور اختلافی نقطۂ نظر کو برداشت کرنا چاہیے۔

۲۔دوسری تہذیبوں سے اخذ واستفادہ گناہ تو نہیں

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا غامدی صاحب کو متجدد کہنے کی اساس دو باتوں پر ہے ایک یہ کہ وہ اسلامی نصوص کی ایسی تشریح کرتے ہیں جو مغربی تہذیب کے مظاہر کو قبول کرے اور دوسرے یہ کہ مغربی تہذیب کی فکری بنیادیں کفر والحاد پر استوار ہیں۔اس کے جواب میں غامدی صاحب کا مکتب فکر یہ کہہ سکتا ہے کہ ایک زندہ تہذیب بسا اوقات دوسری تہذیبوں سے تعامل کے نتیجے میں ان کی کوئی چیز قبول کر لیتی ہے تو اسے برا کیونکر کہا جا سکتا ہے؟ یہ تو انسانی فطرت ہے اور معاشرے ایک دوسرے سے کٹ کر بند ڈبوں کی طرح تو نہیں رہ سکتے؟

ہم ان کی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ انسانی معاشرے ہوا بند ڈبوں میں قید نہیں ہوتے کہ دوسروں سے ان کا میل جول نہ ہو اور وہ ایک دوسرے سے متاثر نہ ہوں لیکن ہر تہذیب اپنی ایک انفرادیت رکھتی ہے اور یہ انفرادیت اسے اس کا مخصوص نظریۂ حیات فراہم کرتا ہے۔ایک تہذیب اپنے فکری پیراڈائم پر قائم رہتے ہوئے دوسری تہذیبوں سے تعامل کے نتیجے میں اگر ان کی کوئی مفید چیز لینا چاہتی ہے تو وہ پہلے اسے اپنے فکری سانچے میں ڈھال کر اس کی تہذیب اور کتر بیونت کر کے اسے اپنے لیے قابل قبول بناتی ہے۔پھر ہی اس کا معدہ اسے قبول کرنے پر آمادہ ہوتا ہے ورنہ اسے باہر اُگل دیتا ہے۔مغربی تہذیب بلاشبہ ایک انسانی تہذیب ہے اور اس میں کچھ خوبیاں بھی ہیں اور اسلامی تہذیب اپنی فکری اساسات پر قائم رہتے ہوئے اس کی کچھ مفید باتیں لے بھی سکتی ہے لیکن یہاں دو باتوں میں فرق کرنا چاہیے:

- ایک یہ کہ اسلامی تہذیب کے علمبردار اپنے تہذیبی پیراڈائم پر قائم رہتے ہوئے کسی دوسری تہذیب کے انسانی تجربات سے فائدہ اٹھا لیں اور اس تہذیب کے کسی ادارے (Institution) یا مظہر کو اس طرح قبول کریں کہ پہلے اسے اپنے فکری مزاج اور ضروریات کے مطابق ڈھال لیں اور پھر اپنی تہذیب کا حصہ بنا لیں ---یہ چیز قابل قبول ہے جیسے مثلاً حضرت عمرؓ نے دیوان کا تصور یا

ادارہ ایرانی تہذیب سے لیا اور اسے اپنے رنگ میں ڈھال لیا۔

- دوسرے یہ کہ آپ کی اپنی تہذیب مغلوب ہو اور کوئی دوسری ایسی تہذیب غالب ہو جس کی فکری اساسات آپ کی تہذیب سے مختلف و متضاد ہوں اور آپ اس دوسری تہذیب سے مرعوب و متاثر ہو کر اس کے بعض اداروں اور تصورات کو اپنانے کے لیے اپنی تہذیب کی فکری اساسات کی ایسی تشریح و تعبیر کریں کہ وہ اس غیر اور متضاد تہذیب کے اداروں کو قبول کر لے۔ ظاہر ہے کہ یہ اسلوب نا قابل قبول ہے۔

لہٰذا واضح ہو گیا کہ ہم مغربی تہذیب سے محتاط استفادے سے انکار نہیں کر رہے بلکہ جس وجہ سے غامدی صاحب کے اسلوب کو تجدد کہہ کر رد کر رہے ہیں وہ مذکورہ بالا دوسرے منہج و اسلوب کی بناء پر کر رہے ہیں اور اس لیے کر رہے ہیں کہ اگر ہم یہ نہ کریں تو گویا ہم اپنی تہذیب کو خراب اور برباد ہوتے ہوئے دیکھیں اور خاموش رہیں جو کہ کسی بھی زندہ تہذیب کا سچا پیروکار نہیں کرے گا۔

۳۔نیت پر حملہ

غامدی صاحب اور ان کے تلامذہ کو اکثر شکایت رہتی ہے کہ لوگ دلیل اور شائستگی کے ساتھ ان کے ساتھ مناقشہ نہیں کرتے بلکہ اکثر لوگ فوراً جذباتی ہو جاتے ہیں، الزامات پر اتر آتے ہیں اور نیت پر حملے شروع کر دیتے ہیں حالانکہ نیت ایک ایسا معاملہ ہے جو بندے اور اللہ کے درمیان ہوتا ہے اور کوئی کسی کا سینہ چیر کر اسے دیکھ نہیں سکتا۔

اگرچہ یہ ایک معروضی حقیقت ہے کہ دین ہر فرد کے لیے ایک جذباتی معاملہ ہوتا ہے اور ہر فرد صرف اپنی رائے اور عقیدے ہی کو صحیح سمجھتا ہے اور اس کے خلاف کچھ سننے پر آمادہ نہیں ہوتا تاہم غامدی صاحب اور ان کے مکتب فکر کا یہ اصرار بجا ہے کہ بحث ٹھنڈے دل و دماغ اور استدلال کے ساتھ ہونی چاہیے اور اس میں جذباتیت سے پرہیز کرنا چاہیے۔

جہاں تک ان کی اس بات کا تعلق ہے کہ نیت پر حملہ نہیں ہونا چاہیے تو ہم عرض کریں گے کہ بلاشبہ کسی کی نیت سے صرف اللہ ہی واقف ہوتا ہے لیکن اہل علم کے نزدیک یہ بھی ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ کسی شخص کے افعال و اعمال اس کی نیت کا مظہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک شخص جب اذان سن کر وضو کرتا اور نماز باجماعت میں شریک ہونے کے لیے مسجد میں پہنچ جاتا ہے اور تکبیر تحریمہ سن کر نماز باجماعت کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے تو اس وقت وہ نماز کی نیت کے الفاظ نہ بھی زبان سے دہرائے تو علماء اس میں کچھ مضائقہ نہیں سمجھتے کیونکہ اس کے افعال گواہی دے رہے ہوتے ہیں کہ وہ اس وقت کی نماز باجماعت ادا کرنے کھڑا ہوا ہے۔ اسی طرح ہم نے غامدی صاحب کے اجتہادات میں سے ایک

ایک کا تجزیہ کر کے یہ دکھا دیا ہے کہ وہ ہر معاملے میں مغربی تہذیب کی پیروی کرنا چاہتے ہیں اور اسلامی نصوص کی ایسی تشریح کرتے ہیں جس سے مغربی تہذیب کی تائید وتوثیق ہو۔ اسی طرح ہم نے یہ بھی دکھا دیا ہے کہ دین کی بنیادی اصطلاحات وافکار کے غامدی صاحب وہ معنی لیتے ہیں جو جمہور امت نہیں لیتی تو اب ان دلائل سے یہ بالکل واضح ہے کہ غامدی صاحب کا رویہ تجدد پر مبنی ہے اور احداث فی الدین کے مترادف ہے لہٰذا انہیں متجدد کہنا نہ تو ان پر کوئی جذباتی الزام تراشی ہے اور نہ ان کی نیت پر حملہ کرنا ہے بلکہ ہمارے نزدیک یہ محض ایک امر واقعہ کا اظہار ہے۔

ہم نے اس موضوع پر قلم کیوں اٹھایا ہے؟

ا۔ بعض لوگوں کے لیے ہماری یہ تحریر خلاف توقع ہوسکتی ہے۔ جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں سے بعض سمجھتے ہیں کہ ہمارے علماء کرام کا رویہ سخت ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے کے خلاف تکفیر اور گمراہی کے فتوے لگاتے رہتے ہیں اور وہ ہماری اس تحریر کو بھی اسی رویے کا شاخسانہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ نیم خواندہ جذباتی مولویوں کا طریق کار ہے۔ ہم اس کے جواب میں وہی بات کہیں گے جو اقبال نے کہی تھی جب اسے قادیانیت کے خلاف بیان دینے پر نہرو نے طنزاً کہا تھا کہ ہم تو اقبال کو مغرب کا تعلیم یافتہ اور لبرل سمجھتے تھے۔ یہ تو مولویوں کی طرح انتہا پسند اور کٹھ ملا نکلا کہ ہاں! میں اس معاملے میں سخت ہوں اور لچک کا مظاہرہ نہیں کرسکتا کیوں کہ یہ میری امت کی بقاء کا مسئلہ ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ امت پر یہ وقت بہت نازک ہے۔ ہم نے یونان کا فکری حملہ جھیل لیا تھا بلکہ یہاں تک کہ ہم نے وحشی منگولوں کا حملہ بھی جھیل لیا تھا کہ اس وقت ہماری تہذیب غالب تھی لہٰذا ہم نے ان حملوں کو پسپا کردیا لیکن آج ہماری تہذیب مغلوب ہے، ہم زوال کے گڑھے سے نکلنے کی کوشش کررہے ہیں ۔آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں کو اپنی تہذیب پر فخر کرنا سکھائیں، اپنی فکر پر ان کا اعتماد بحال کریں۔ پچھلی دو تین صدیوں کی غلامی اور مغرب کی چکاچوند نے ان کی آنکھوں کو جوخیرہ کررکھا ہے اور ان کے اذہان کو مرعوب اور قلوب کو مردہ کررکھا ہے، اس کیفیت سے انہیں نکالیں۔آج ہمیں ایسے اہل علم کی ضرورت نہیں جو ہمیں مغربی فکر وتہذیب سے مرعوبیت سکھائیں اور اسلام کی ایسی تشریح وتاویل اور کتر بیونت کریں جس سے مغرب کی فکر وتہذیب کا چولہ اسلام کے جسم پر فٹ آجائے۔

معاف کیجیے گا۔ یہ دشمن بہت خطرناک اور عیار ہے یہ اپنی مہیب جنگی مشینری سے صرف علاقے فتح نہیں کرتا بلکہ اس کے پاس اذہان وقلوب کو مسخر کرنے کے جدید، پُرامن اور وسیع ترین ذرائع ہیں اور وہ بڑی حکمت اور عیاری سے اپنے کارڈ کھیل رہا ہے۔قرآن کا نیا اور جعلی ایڈیشن تیار کرکے ساری دنیا

میں پھیلا رہا ہے۔ مسلمانوں کے دلوں سے رسول کی محبت مٹانے کے لیے کارٹون، فلمیں، کتابیں، رسالے اور اخبار شائع کر رہا ہے۔ وہ مسلمان ممالک کے حکمرانوں کو اپنا ایجنٹ بنا کر ان کے نظام تعلیم، پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا، ادب اور ذہن سازی کے دیگر ذرائع میں سرنگ لگا کر اسلام کے خلاف شکوک وشبہات کی فضاء پیدا کرتا، اسے ناقابل عمل بتاتا، اسے انسانی وقار کے منافی قرار دیتا اور اسے انتہاپسندی اور دہشت گردی باور کرا رہا ہے۔ وہ امت مسلمہ کو جہالت اور افلاس کے گڑھوں سے نہ نکلنے دینے پر پورا زور صرف کر رہا ہے۔ جس ریاست میں اسلام جڑ پکڑنے لگتا ہے وہ زبردستی اس کی تخریب پر اتر آتا ہے (افغانوں کا اصل قصور یہی تھا) غرض وہ اسلام کا ایک ایسا ایڈیشن سامنے لانا چاہتا ہے جو مغربی فکر وتہذیب کی بالادستی کو قبول کرے، جو مغرب کی فکری غلامی پر قانع رہے لہٰذا اسے ایسے علماء اور سکالرز درکار ہیں جو اس کی یہ ضرورت پوری کریں۔ ان حالات میں ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ آج دین کا جو عالم ہمیں حیلے بہانے مغربی فکر وتہذیب کو اپنانے پر اکساتا ہے، اسے اسلامی قرار دیتا ہے، وہ اگر مخلص ہے تو نادان دوست ہے اور اگر اپنے ذاتی مفاد کے لیے کر رہا ہے تو میر جعفر و صادق کے قبیلے کا فرد ہے۔ ہم اس کی حمایت نہیں کر سکتے اور ہماری بقاء کا تقاضا ہے کہ ہم اس کا پول کھولیں اور اس کی اصلیت لوگوں کو بتائیں۔

۲۔ ہمارے بعض دوست کہیں گے کہ ہم نے ملی مجلس شرعی کا ڈول ڈالا ہوا ہے۔ ہم اتحاد امت اور اتحاد بین العلماء کے داعی ہیں۔ تکفیر و تضلیل کے رویے کے مخالف ہیں اور علماء کرام میں تحمل اور اختلاف رائے برداشت کرنے کے جذبات پیدا کرنے کے لیے کوشاں ہیں تو خود غامدی صاحب کے ساتھ اختلاف رائے پر خاموش کیوں نہیں رہے؟ ہم عرض کریں گے کہ واقعی ہم ان باتوں کے لیے کوشاں ہیں لیکن اس کا یہ مطلب کب ہے کہ ہم صحیح اور غلط میں امتیاز کھو بیٹھیں اور غلط کو صحیح کہنا شروع کر دیں یا غلط اور صحیح میں مساوات قائم کر دیں۔ ہم دیانت داری سے یہ سمجھتے ہیں کہ غامدی صاحب کا رویہ علمی لحاظ سے غلط اور مخدوش ہے اور وہ امت کے لیے نقصان دہ ہے اور اپنے اس مؤقف کے لیے ہم نے دلائل دیے ہیں اور اپنی بات شائستگی سے کہنے کی کوشش کی ہے۔ امید ہے غامدی صاحب اور ان کے رفقاء ہماری باتوں پر ہمدردی سے غور فرمائیں گے۔ باقی، ہم اس بات کو کوئی مہم نہیں بنا رہے کہ اسی پر لکھتے رہیں اور البرہان اسی کام میں لگا رہے۔ ہم نے اپنی رائے اہل علم اور قارئین کے سامنے رکھنا تھی وہ رکھ دی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں شیطان اور نفس کے شر سے بچائے اور ہم سے وہ کام لے جو اسے پسند ہو اور اس کے دین اور اس کے رسول (ﷺ) کی امت کے لیے مفید ہو۔ آمین یارب العالمین۔

حوالہ جات

1۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے ہندوستان میں پادریوں کی ناکامی کے بعد لارڈ میکالے کی تعلیمی رپورٹ: علامہ شبیر بخاری، میکالے اور برصغیر کا نظام تعلیم، صفحہ ۴۷، آئینہ ادب، لاہور ۱۹۸۶ء

2۔ الحجر ۱۵: ۹

3۔ سبا ۳۴: ۲۸

4۔ البقرہ ۲: ۱۴۳

5۔ صحیح مسلم، کتاب الجمعہ، باب تخفیف الصلوۃ والخطبہ

6۔ **سنن ابی داؤد، کتاب الملاحم ، باب مایذ کر فی قرن المائۃو شمس الحق عظیم** آبادی، عون المعبود، جلد ۴ صفحہ ۱۸۰، نشر السنۃ ملتان، ۱۳۹۹ھ

7۔ البقرہ ۲: ۷۵

8۔ یہاں ہم نے ان نظریات کے خلاصے پر اکتفا کیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ہماری کتاب 'اسلام اور تزکیہ نفس' (مطبوعہ اردو سائنس بورڈ لاہور) صفحہ ۲۴۳ تا ۲۷۹۔ ان ازموں کے براہ راست تفصیلی مطالعے کے لیے دیکھیے:

Ralph Barton Perry, *The Humanity of Man* (New York; George Braziller, 1956), 5-6

D.R. Bhandari, *History of European Political Philosophy* (Banglore: Bangalore Press, 1956)

J. Brodouuski, *The Western Intellectual Tradition* (New York, Harper & Brothers Publishers, 1960)

Laurice Carlin, *The Empiricism: A Guide for the Perplexed* (London: Continum International Publishing Group, 2009), 20-56

John Herman Randall, *Making of the Modern Mind: A Survey of the Intellectual Background of the Present* New York: Columbia University Press 1976)

J. A.Schumpeter, *The Theory of Economic Development* (Cambridge: Harward University Press, 1959), 122

Max Weber, *The Protestant Ethic and the Spirit of Capitalism* (London: Univen University Brooks, 1974)

Syed Muhammad Naquib al-Attas, *Islam, Secularism and the Philosophy of Future* (London: Mansell Publishing Limited, 1985), 14

Nikkie R. Keddie, *"Secularism and its Discontents" Daedalus* 132, no.3 (Summer, 2003): 14

Owen Shadwick, *The Secularization of the European Mind in the Nineteenth Century* (Cambridge: Cambridge University Press, 1975), 18

Harry Elmer Barness, *An Intellectual and Cultural History of the Western World*, Vol. 2

9۔ ماہنامہ 'اشراق' لاہور، شمارہ جنوری ۱۹۹۶ء ص ۶۱

10۔ ماہنامہ چراغ راہ کراچی، شمارہ جون ۱۹۵۸ء ص ۵۰۷، ۵۱۷

11۔ www.al-mawrid.org/pages/questions_urdu_detail.php?qid=540&cid=313, July 26, 2009

12۔ www.al-mawrid.org/pages/articles_urdu_detail.php?rid=1715&cid=295, March 26, 2011

13۔ www.al-mawrid.org/pages/questions_urdu_detail.php?qid=1355&cid=313
September 6, 2010 نیز دیکھیے ماہنامہ اشراق، اپریل ۲۰۰۳، صفحہ ۴۱۔۴۲

14۔ جاوید احمد غامدی، میزان، ص ۹۷، طبع سوم، مئی ۲۰۰۸ء

15۔ جاوید احمد غامدی، میزان، ص ۶۰۱ طبع سوم مئی ۲۰۰۸ء

16۔ جاوید احمد غامدی، برہان، ص ۳۴ و مابعد

17۔ البقرہ ۲: ۱۲۰

18۔ جاوید احمد غامدی، برہان طبع ہفتم، صفحہ ۵۵، المورد، لاہور

19۔ جاوید احمد غامدی، برہان طبع چہارم، صفحہ ۱۴۳، المورد، لاہور

20۔ جاوید احمد غامدی، ماہنامہ اشراق، شمارہ مئی ۲۰۰۲ء، ص ۴۷

21۔ جاوید احمد غامدی، میزان، حصہ اوّل، ص ۲۱۳، طبع ۱۹۸۵ء

22۔ www.al-mawrid.org/pages/questions_urdu_detail.php?qid=586&cid=522
November 6, 2009

23۔ www.al-mawrid.org/pages/questions_urdu_detail.php?qid=1036&cid=150
October 30, 2009

24۔ غافر ۴۰: ۱۹

25۔ العادیات ۱۰۰: ۱۰

26۔ ماہنامہ اشراق، شمارہ مئی ۲۰۰۵ء ص ۴۶:۳۵

27۔ البقرہ ۲: ۲۲۱

28۔ المائدہ ۵:۵

29۔ www.urdu.understanding_Islam.org

30۔ www.urdu.understanding_Islam.org

31۔ www.urdu.understanding_Islam.org

32۔ ماہنامہ اشراق، شمارہ دسمبر ۲۰۰۰ء، ص ۵۴، ۵۵

33۔ جاوید احمد غامدی، میزان، ص ۱۰

34۔ www.urdu.understanding_Islam.org، نیز دیکھیے محمد عمار خان ناصر، براہین ص ۲۰۷، دار الکتاب، لاہور، ۲۰۱۱ء

35۔ ماہنامہ اشراق، شمارہ مارچ ۲۰۰۶ء ص ۱۶

36۔ محمد رفیع مفتی، تصویر کا مسئلہ، ص ۳۰

37۔ عمار خان ناصر، براہین ص ۲۳۳ و مابعد دار الکتاب، لاہور، ۲۰۱۱ء

38۔ جاوید احمد غامدی، میزان طبع پنجم، ص ۴۶۔۴۷

41۔ ماہنامہ اشراق، شمارہ مارچ ۲۰۰۴ء، ص ۱۱

40۔ ماہنامہ اشراق، شمارہ مارچ ۲۰۰۴ء ص ۱۶

41۔ جاوید احمد غامدی، میزان ص ۱۰

42۔ جاوید احمد غامدی، میزان ص ۶۵

43۔ ماہنامہ اشراق، شمارہ جون ۲۰۰۲ء ص ۲۹

44۔ عمار خان ناصر، براہین ص ۱۱۵ و مابعد دار الکتاب، لاہور، ۲۰۱۱ء

45۔ صحیح مسلم، کتاب الجمعہ، باب تخفیف الصلوۃ والخطبہ

46۔ صحیح مسلم، کتاب الاقضیہ، باب نقض الاحکام الباطلہ

47۔ سنن نسائی، کتاب صلوۃ العیدین، باب کیف الخطبہ

48۔ صحیح مسلم کتاب الفضائل، باب اذا اراد الله تعالی رحمته امة قبض نبیها قبلها، حدیث نمبر ۲۹

49۔ مولانا محمد تقی امینی، احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت، اسلامک بک کارپوریشن اسلام آباد، ۱۹۹۲ء

ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ 'الشریعۃ' کی پالیسی ☆

وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے ترجمان ماہنامہ 'وفاق المدارس' نے پچھلے دنوں ماہنامہ 'الشریعۃ' گوجرانوالہ کی پالیسیوں پر کچھ تنقید کی تھی۔ اس کے جواب میں 'الشریعۃ' کے رئیس التحریر مولانا زاہد الراشدی صاحب نے مئی جون ۲۰۰۹ء کے مشترکہ شمارے میں اپنے جریدے کی پالیسی کا دفاع کیا ہے لیکن اسے 'وفاق المدارس' کی تنقید کا جواب قرار دینے کی بجائے اپنا مقدمہ ارباب علم و دانش کی عدالت میں پیش کر دیا ہے۔ لہٰذا اب میرے جیسے ایک طالب علم کو بھی یہ جسارت ہوئی ہے اور موقع ملا ہے کہ وہ بھی اپنا موقف اس ضمن میں پیش کرے اور یہ کہ اسے دخل در معقولات نہیں سمجھا جائے گا کیونکہ عام طور پر جو شخص یا ادارہ کسی جریدے کا اجراء کرتا ہے تو ظاہر ہے یہ محض اس کی اپنی صوابدید ہوتی ہے کہ وہ اس جریدے کی پالیسی جو چاہے طے کرے، کسی دوسرے کو اس میں دخل دینے کا حق نہیں ہوتا لیکن اب مولانا نے الشریعہ کی پالیسی کے حوالے سے اپنا مقدمہ چونکہ خود ارباب علم و دانش کی عدالت میں پیش کر دیا ہے لہٰذا امید ہے کہ وہ ہماری گزارشات پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے اور اختلاف رائے کو وسعت قلبی اور خندہ پیشانی سے گوارا فرمائیں گے۔

ہمیں اصولی طور پر 'الشریعۃ' کی بحث و مناقشہ اور حریت فکر کی پالیسی سے اختلاف نہیں ہے۔ مولانا نے اپنے جواب میں ''آزادانہ بحث و مباحثہ'' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ ''آزادی'' کا مطلب لامحدود اور (اردو محاورے کے مطابق) مادر پدر آزادی نہیں ہوتا بلکہ یہ آزادی ہمیشہ کچھ مقاصد اور پابندیوں سے محدود ہوتی ہے۔ مولانا نے 'آزادانہ بحث و مباحثہ' کی جو تشریح کی ہے اور اس کے جو مقاصد گنوائے ہیں ہمیں ان سے اتفاق ہے گو بعض منصوص مقاصد کی طرف ان کی نظر نہیں گئی جن کی طرف ہم ابھی اشارہ کریں گے۔ لیکن 'الشریعۃ' کی ''آزادانہ'' بحث و مباحثہ کی پالیسی میں سے ''آزادی'' کی حدود کے حوالے سے وفاق المدارس کی طرح ہمیں بھی اختلاف ہے۔ وفاق المدارس کے مسلکی حوالے سے اعتراض سے قطع نظر جاوید غامدی صاحب اور عمار ناصر صاحب کے افکار کے حوالے سے 'وفاق المدارس' کے مؤقف کی ہم تائید کرتے ہیں۔

میرے خیال میں اگر ہم قرآن و سنت کی اصطلاحات میں بات کریں تو بات زیادہ واضح ہو کر سامنے آئے گی۔ قرآن حکیم نے اس مفہوم میں 'مجادلہ حسنہ' (وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ) کی اصطلاح استعمال کی ہے (''آزادانہ'' بحث و مباحثے کی اصطلاح مخدوش ہے۔ جن لوگوں نے مغربی

☆ یہ تحریر جولائی ۲۰۰۹ء کی ہے جسے معمولی نظر ثانی کے بعد شائع کیا جا رہا ہے

فکر و فلسفے کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ آزادی (Freedom) مغربی فکر کی ایک بنیادی اصطلاح ہے اور وہاں اس کا مفہوم لامحدود اور مادر پدر آزادی ہی کا ہے جو اسلام میں آزادی کے تصور سے مختلف بلکہ اس سے متضاد ہے۔ بدقسمتی سے دینی حلقوں کی طرف سے مغربی تہذیب کے غلبے کی بروقت مزاحمت نہ کرنے کی وجہ سے مغرب کی ملحدانہ فکر پر مبنی بہت سی اصطلاحات ہمارے معاشرے میں عام ہوگئی ہیں اور خلاف اسلام ہونے کی وجہ سے فکری انتشار کو جنم دے رہی ہیں جیسے جمہوریت، آزادی، رواداری، ترقی، آئیڈیالوجی، انسانی حقوق وغیرہ۔۔۔مولانا زاہد الراشدی صاحب نے بھی رواروی میں وہی اصطلاح استعمال کر دی ہے اور وہ مناقشے کا سبب بن گئی ہے) اور دعوت وتبلیغ میں مجادلہ حسنہ کے جو مقاصد بیان کئے ہیں: وہ ہیں احقاق حق، ابطال باطل، رفع التباس الحق بالباطل، اصلاح، حصول اطمینان قلب و ذہن وغیرہ۔یعنی مجادلہ حسنہ اگر کفار ومشرکین اور اہل کتاب سے ہوتو اس کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ان پر ان کے نقطۂ نظر کی غلطی حکمت وسلیقے سے اور مناسب الفاظ و اسلوب میں واضح کر دی جائے تاکہ وہ کفر اور انکارحق کے رویے سے باز آ جائیں اور حق کو قبول کر لیں۔بعض اوقات حق قبول کرنے کے بعد بھی لوگ فکری کج روی یا معصیت کا شکار ہو جاتے ہیں ایسے لوگوں کے ساتھ مجادلہ حسنہ کا مقصد ان کی اصلاح کرنا ہوتا ہے تاکہ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اور وہ اس سے باز آ جائیں جیسے مثلاً صحابہ کرام نے خوارج کے ساتھ مباحثہ کیا۔ اسی طرح ہمارے اسلاف معتزلہ، قدریہ، جہمیہ وغیرہ گمراہ گروہوں سے مجادلہ حسنہ کرتے رہے ہیں تاکہ ان پر جمہور اسلام کی راہ اعتدال واضح کر سکیں۔

اس حوالے سے مولانا زاہدالراشدی صاحب نے حق اور جادۂ اعتدال کے تعین کے لئے جو موقف اختیار کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے چنانچہ جب وہ کہتے ہیں کہ ''راقم الحروف کے نزدیک اسلامی قوانین و احکام کی تعبیر وتشریح کے لئے صحیح، قابل عمل اور متوازن راستہ یہ ہے کہ امت مسلمہ کے اجماعی تعامل اور اہل السنۃ والجماعۃ کے علمی مسلمات کے دائرہ کی بہر حال پابندی کی جائے'' (شمارہ مئی جون کا اداریہ،صفحہ ۹) اور اسی صفحے پر دوسری جگہ لکھتے ہیں'' (میں ان نوجوان اہل علم) کی حوصلہ افزائی کو اپنی دینی ذمہ داری سمجھتا ہوں صرف ایک شرط کے ساتھ کہ امت کے اجماعی تامل اور اہل السنۃ والجماعۃ کے علمی مسلمات کا دائرہ کراس نہ ہو کیونکہ اس دائرے سے آگے بہر حال گمراہی کی سلطنت شروع ہو جاتی ہے'' تو ہم ان سے اتفاق کئے بغیر نہیں رہ سکتے لیکن جب اس اصول پر عمل وانطباق کا مرحلہ آتا ہے تو ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مولانا پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور اپنے ہی قائم کردہ اصول کے تقاضوں پر عمل نہیں کرتے۔اس کی تازہ ترین مثال یہ ہے کہ انہوں نے الشریعہ اکتوبر ۲۰۱۱ء کے اداریے میں یہ ذکر کرتے ہوئے کہا کہ احناف میں شاتم رسول کی سزا میں اختلاف کے علی الرغم

چونکہ آج کے معروضی حالات کا تقاضا یہ ہے کہ شاتم کو سخت سزا دی جائے یہ لکھا ہے کہ ''اس سادہ اور واضح استدلال کے ہوتے ہوئے توہین رسالت پر سزائے موت کے حوالے سے غیر ضروری فقہی اور فنی مباحث میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے؟'' لیکن اس کے باوجود الشریعہ میں مسلسل ایسے مضامین شائع کیے جارہے ہیں جو جاوید غامدی صاحب اور ان کے تتبع میں عمار ناصر صاحب کے مؤقف کو آگے بڑھاتے ہیں بلکہ دینی حلقوں میں یہ اختلافی بحث چھیڑی ہی عمار ناصر صاحب نے الشریعہ کے ذریعے ہے اور خود اکتوبر کے شمارے میں بھی اس کے بارے میں مضامین شامل ہیں۔

دیکھیے جناب! جاوید غامدی صاحب کے عقائد و افکار کے بارے میں خود 'الشریعہ' میں اس وقت تک جو کچھ چھپ چکا ہے اس کی رو سے اور خود راشدی صاحب کے اپنے قائم کردہ اور اعلان کردہ معیار حق (اہل السنۃ والجماعۃ کے علمی مسلمات اور امت کے اجماعی تعامل کے دائرے کے اندر رہنا کہ اس کے باہر گمراہی ہے) کی رو سے جاوید احمد غامدی صاحب اور ان کے پیروکار گمراہ ہیں کیونکہ امت اور جمہور اہل علم کے نزدیک دین اسلام کے بنیادی ماخذ قرآن وسنت ہیں لیکن غامدی صاحب کہتے ہیں کہ کچھ اور بھی ہیں۔ امت اور جمہور علماء کے نزدیک 'الکتاب' سے مراد قرآن حکیم ہے جبکہ غامدی صاحب فرماتے ہیں کہ اس میں پچھلے انبیاء کے (مبنی برانحراف) صحائف بھی شامل ہیں۔ امت اور جمہور علماء کے نزدیک نبی کریم ﷺ کی سنت سے مراد آپ ﷺ کے اقوال، اعمال اور تقاریر ہیں جبکہ غامدی صاحب کے نزدیک سنت صرف وہ ہے جو صحابہ کرام کے اجماع سے ثابت ہوتی ہو باقی ساری احادیث کو وہ خبر واحد قرار دے کر رد کر دیتے ہیں کہ ان سے دین ثابت نہیں ہوتا چنانچہ انہوں نے گن کر بتادیا ہے کہ ثابت شدہ سنتیں صرف 27 ہیں۔ اسی طرح وہ امت کے اجماعی تعامل کا بھی انکار کرتے ہیں اور کسی ایک آدھ مسئلے میں نہیں بیسوں مسائل میں وہ مجتہدین امت، ائمہ اربعہ اور جمہور امت کی مخالفت کرتے ہیں اور کرتے کیوں ہیں؟ تا کہ ملحدانہ افکار پر مبنی مغربی تہذیب کی مختلف اقدار و مظاہر کو اسلام کے مطابق ثابت کیا جا سکے جو صریحاً تجدد اور احداث فی الدین ہے۔ ظاہر ہے یہ فروعی اختلاف نہیں بنیادی اختلاف ہے۔ اور یہ فروعات واستنباط یا کسی ایک نص کی تشریح وتاویل کا اختلاف نہیں کہ اسے تفرد اور محض علمی اختلاف کہہ کر گوارا کر لیا جائے اور قبول کر لیا جائے بلکہ یہ واضح تجدد اور گمراہی ہے اور خود مولانا راشدی صاحب کے اپنے قائم کردہ معیار کے مطابق گمراہی ہے بلکہ خود مولانا اپنی تحریر میں غامدی صاحب کے مؤقف کو پرویز کی طرح انکار سنت کے مترادف[1] اور ان کے دین کی بنیادی اصطلاحات کی تشکیل نو کے کام کو گمراہی[2] قرار دے چکے ہیں۔ یہ ساری بحثیں معروف ومعلوم ہیں

۱۔ ایک علمی وفکری مکالمہ، اشاعت اوّل ص ۳۷

۲۔ ''ایسی کوششوں کا عملی نتیجہ گمراہی کا ماحول پیدا کرنے کے سوا کچھ برآمد نہیں ہوگا'' (ایک علمی وفکری مکالمہ ص ۸)

اوران میں سے اکثر خود الشریعہ میں طبع ہو چکی ہیں لہٰذا حوالے دینے اور تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔

ہم نے مختلف مکاتبِ فکر کے ثقہ اور جید علماء سے استفسار کیا ہے اور بہت سوں کی تحریریں بھی موجود ہیں کہ وہ جمہور امت کے علمی مسلمات اور امت کے اجماعی تعامل کے انکار کی وجہ سے جاوید غامدی صاحب کو گمراہ سمجھتے ہیں۔ اوران کے قرآن حکیم کی من مانی تشریح، انکار واستخفاف سنت، انکار جہاد، انکار دجال ونزول مسیح، انکار رجم اور اکثر و بیشتر مسائل میں ملحدانہ مغربی فکر وتہذیب کے مطابق فیصلے دینے کی وجہ سے ان کو سرسید، قادیانی اور پرویز کا جانشین سمجھتے ہیں بلکہ ایک موقر دارالافتاء کا فتوی ہماری نظر سے ایسا بھی گزرا ہے جس میں غامدی صاحب کو مرتد قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا محترم راشدی صاحب کو چاہیے تھا کہ وہ الشریعہ میں یہ اعلان کرتے کہ جاوید غامدی صاحب گمراہ اور متجدد ہیں اور جو ان کی فکر کو صحیح سمجھتا ہے وہ بھی گمراہ ہے اوران کے ساتھ بحث ومباحثے سے مقصود یہ ہے کہ ان کی غلطی ان پر واضح کر دی جائے تاکہ وہ جمہور کے مسلک اعتدال پر واپس آ سکیں۔ لیکن محترم راشدی صاحب نے آج تک ایسا نہیں کیا؟ کیوں نہیں کیا؟ اس کا جواب تو مولانا راشدی خود ہی دے سکتے ہیں لیکن ان کی تحریر سے جو اشارہ ملتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ بحث ومباحثہ کے ذریعے ان کے لئے واپسی کا راستہ کھلا رکھنا چاہتے ہیں۔ مولانا راشدی صاحب کی یہ خواہش بلاشبہ ایک نیک خواہش ہے اور اس کے لئے بحث واستدلال اور مجادلہ حسنہ کا راستہ اختیار کرنا بھی احسن ہے لیکن کیا یہ کام کتمان حق کی قیمت پر ہونا چاہئے؟ دیکھیے جناب! صحابہ کرامؓ نے خارجیوں کے ساتھ بحث ومباحثہ کیا، امام احمد بن حنبل سے لے کر امام غزالی تک ہمارے اسلاف نے معتزلہ سے مجادلۂ حسنہ کیا اور خود برصغیر میں مجدد الف ثانیؒ نے دین اکبری کے خلاف اور پیر مہر علی شاہ صاحب اور مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری وغیرہم نے غلام احمد قادیانی سے بحث ومباحثہ کیا لیکن کتمان حق کا یہ اسلوب کبھی اختیار نہیں کیا کہ پتہ ہی نہ چلے کہ سچا کون ہے اور جھوٹا کون؟ اصلاح تو اسی کی کی جاتی ہے جو غلطی پر ہو لیکن اگر آپ سچ اور جھوٹ کا اعلان کئے بغیر اور غلط اور صحیح کے درمیان امتیاز کیے بغیر محض ''آزادانہ بحث ومباحثہ'' کا پلیٹ فارم بنے رہیں گے تو فکری انتشار تو پیدا ہوگا اور لوگ مداہنت اور گمراہی کی حمایت کا الزام تو لگائیں گے!

جس چیز نے 'الشریعۃ' اور مولانا راشدی صاحب کی پوزیشن کو مزید کمزور کیا ہے وہ ان کا اپنے بیٹے (عمار ناصر) کو رسالے کا ایڈیٹر بنانا اور اس کی فکری کاوشوں کو سراہنے کا رویہ ہے جبکہ وہ جاوید غامدی صاحب کا تلمیذ اور پیروکار بلکہ ان کی فکر کا مبلغ ہے اوران کے ادارے کا تنخواہ یافتہ ملازم ہے جبکہ سطور بالا میں ہم تفصیل سے بتا چکے ہیں کہ جاوید غامدی صاحب سارے مسالک کے ثقہ علماء کے

مطابق اور خود مولانا زاہد الراشدی صاحب کے اپنے معیار کے مطابق گمراہ ہیں اور مولانا راشدی صاحب کا بیٹا جب غامدی صاحب کی فکر کا پیروکار اور مبلغ ہے تو وہ بھی گمراہ ہے۔ لہٰذا ایک ایسے شخص کو اپنے رسالے کا ایڈیٹر بنانا شکوک وشبہات اور مشکلات کو دعوت دینا ہے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ ہماری عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ ایک رسالے کا چیف ایڈیٹر ایک ایسے شخص کو اپنے رسالے کا ایڈیٹر کیسے مقرر کرسکتا ہے اور اس کے ساتھ کیسے نباہ کرسکتا ہے جس کے ساتھ اس کی فکری ہم آہنگی نہ ہو؟ پھر اغلب امکان یہ بھی ہے کہ ایڈیٹر اگر ایک خاص فکر کا حامل ہو تو وہ اپنے فکری مخالفین کو رسالے میں جگہ دیتے ہوئے ہر وقت اور سو فیصد انصاف کے ترازو کے پلڑوں کو برابر نہ رکھ سکے۔ چنانچہ ہمارے علم میں ہے کہ ایڈیٹر صاحب کی فکر سے اختلاف رکھنے والے الشریعہ کے کئی مقالہ نویسوں کو ایڈیٹر صاحب کی مبینہ جانبداری کی وجہ سے کئی شکایتیں ہیں لیکن ایڈیٹر ہونے کی وجہ سے وہ بہر حال رسالے کو مدون کرنے کا، جیسے وہ چاہیں، اختیار رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ الشریعہ کے پچھلے برسوں کے شمارے سامنے رکھ لیجیے اور ان کا موازنہ ملک کے دوسرے جرائد سے کر لیجیے تو آپ دیکھیں گے کہ ہمارے ملک کے کسی رسالے میں جاوید غامدی صاحب کی فکر کے بارے میں اتنا مواد شائع نہیں ہوا جتنا الشریعہ میں شائع ہوا ہے (سوائے غامدی صاحب کے اپنے رسالے کے) اور اس میں کثرت سے وہ مباحث شائع ہوئے ہیں جو جمہور امت اور اہل السنۃ والجماعۃ کے مسلمہ علمی معیارات اور اجماعی تعامل کے دائرے کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو پھر الشریعہ پر یہ الزام کیوں نہ لگے کہ وہ فکری انتشار اور گمراہی پھیلا رہا ہے؟ اس لئے ہم عرض کرتے ہیں کہ مولانا راشدی صاحب کو اگر غامدی صاحب اور ان کے شاگرد و پیروکار عمار ناصر صاحب کی فکر سے سچ مچ اختلاف ہے تو احتیاط اور معروضیت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ انہیں اپنے رسالے کا ایڈیٹر نہ رکھیں۔ صلہ رحمی اور حسن معاشرت نبھانے کے سو دوسرے طریقے ممکن ہیں۔ عمار ناصر صاحب کی صلاحیت اور بعض خوبیوں کے ہم بھی معترف ہیں لیکن فکری راست روی سے محرومی ان سب پر پانی پھیر دیتی ہے۔ گستاخی نہ ہو تو مولانا راشدی صاحب وہ مکالمہ بھی ذہن میں تازہ کر لیں جو اللہ تعالیٰ اور ان کے پیغمبر حضرت نوحؑ کے درمیان ان کے بیٹے کے بارے میں ہوا تھا۔

اس ضمن میں مولانا زاہد الراشدی صاحب اگر یہ عذر پیش کریں کہ وہ فتوے کی زبان استعمال نہیں کرتے لہٰذا وہ غامدی صاحب اور ان کے پیروکاروں کو گمراہ اور متجدد قرار نہیں دے سکتے کہ یہ مفتیوں کا کام ہے تو ان کی اس بات سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس میں کوئی وزن محسوس ہوتا ہے کیونکہ آپ بار بار تسلیم کر رہے ہیں کہ آپ کے رسالے کی بنیادی پالیسی یہ ہے کہ بحث کو اہل السنۃ والجماعۃ کے مسلمات اور امت کے اجماعی تعامل کے دائرے کے اندر رہنا چاہئے اور اس کے باہر گمراہی ہے

اور آپ کے اس رسالے میں برسوں سے لگا تار بیسیوں مضامین غامدی صاحب اور ان کے شاگردوں کے (اور ان سے اختلاف کرنے والوں کے) شائع ہو رہے ہیں جن سے صاف ظاہر ہے کہ غامدی صاحب اور ان کا مکتب فکر علی الاعلان ان عقائد وافکار کا حامل ہے جو اہل السنۃ والجماعۃ کے مسلمات کے دائرے اور امت کے اجماعی تعامل سے باہر کی چیز ہیں، لوگ آپ کو توجہ بھی دلا رہے ہیں لیکن آپ کہتے ہیں کہ میں فتوے کی زبان نہیں بولتا۔ کیا حق کو حق اور گمراہی کو گمراہی کہنا فتوی بازی ہے؟ چلیے آپ اصرار کرتے ہیں تو ہم آپ کی یہ شرط بھی پوری کرنے کو تیار ہیں اور ہم مفتی حضرات سے یہ فتویٰ بھی لا دیں گے کہ غامدی صاحب اپنے افکار کی رو سے گمراہ ہیں تو کیا راشدی صاحب ان کی گمراہی کا اعلان کریں گے؟ یا مفتیوں کے 'اتوار بازار' کی پھبتی کس کر اس سے بری الذمہ ہو جائیں گے؟ ہم مولانا راشدی صاحب کے بارے میں حسن ظن رکھتے ہیں اور ہمیں ان لوگوں سے اتفاق نہیں ہے جو یہ کہتے ہیں کہ مولانا راشدی صاحب اندر سے غامدی صاحب سے ملے ہوئے ہیں اور ان کی فکر کے ہم نوا ہیں بس ظاہراً اس کو تسلیم نہیں کرتے تا کہ اہل سنت کے حلقوں میں ان کی پوزیشن خراب نہ ہو لیکن بات جہاں تک جا پہنچی ہے اس کے بعد یہ ضروری ہو گیا ہے کہ مولانا راشدی صاحب غامدی صاحب کی فکر کے حوالے سے اپنا موقف مزید واضح کریں اور دوٹوک الفاظ میں بتائیں کہ وہ غامدی صاحب کو متجدد اور گمراہ سمجھتے ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں سمجھتے تو اس کے دلائل کیا ہیں؟ اور اگر سمجھتے ہیں تو اس کا اعلان کیوں نہیں کرتے؟ اور ان کی فکر کے آدمی کو اپنے رسالے کی ایڈیٹر شپ سے ہٹا کیوں نہیں دیتے؟

خلاصہ

ہماری ان معروضات کا خلاصہ یہ ہے کہ الشریعہ کے لئے وضع کردہ مولانا زاہد الراشدی صاحب کی توسع اور بحث ومناقشہ کی پالیسی صحیح ہے اور اس کے لئے جو دائرۂ کار انہوں نے متعین کیا ہے وہ بھی صحیح ہے لیکن بدقسمتی سے اس فکری دائرہ کار کی خلاف ورزی کرنے والوں کے بارے میں مولانا کے طرز عمل سے ہمیں اور ان کے دوسرے محبین کو ان سے شکایت ہے جس کا ازالہ ضروری ہے اور یہ اتنا مشکل بھی نہیں۔ وہ بس یہ اعلان فرما دیں کہ غامدی صاحب اور ان کے پیروکار گمراہ ہیں اور وہ ان کی اصلاح کی کوشش کر رہے ہیں نیز وہ غامدی صاحب کی فکر کے آدمی کو اپنے رسالے کی ایڈیٹر شپ سے ہٹا دیں اور اس کی فکری حوصلہ افزائی کی پالیسی ترک فرما دیں تو میرے خیال میں ان کے خلاف شکوک وشبہات کا ازالہ ہو جائے گا اور ان کی اور ان کے خاندان کی علمی وجاہت ودیانت پر جو حرف آ رہا ہے، اس کا سلسلہ بھی رک جائے گا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو اپنے دین کے سیدھے اور سچے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

ڈاکٹر محمد امین

تجمد کا طرزِ عمل بھی صحیح نہیں

اگر ہم تجدد کو غلط کہہ رہے ہیں تو احقاق حق کا تقاضا ہے کہ ہم تجمد کو بھی غلط کہیں اور مغربی فکر و تہذیب کے تناظر میں دین کی تفہیم وتشریح کے حوالے سے راہ اعتدال کی نشان دہی کریں اور اس کی تصویب کریں۔ اس وقت کیفیت یہ ہے کہ علماء کرام مغربی فکر وتہذیب کو پڑھتے ہیں نہ پڑھاتے ہیں اور نہ اسے سمجھتے ہیں لہٰذا انہیں اس چیلنج کا احساس ہی نہیں جو ہم عصر مسلم معاشرے کو مغربی فکر وتہذیب کے تعامل کے نتیجے میں درپیش ہے۔ چونکہ علماء کرام جدید تعلیم نہ خود حاصل کرتے ہیں اور نہ اس کی فکر وفلسفہ کو سمجھنے کا موقع انہیں ملتا ہے لہٰذا انہیں ان لاکھوں کروڑوں پاکستانیوں کا جو جدید تعلیم یافتہ ہیں، ہمارے معاشرے کو چلا رہے ہیں اور اس کی بنیادی قوت ہیں، نہ ان کی نفسیات اور ذہنی سطح کا پورا ادراک ہے اور نہ وہ ان کے ذہنی مسائل کو سمجھتے ہیں لہٰذا دینی حوالے سے وہ ان کو مطمئن بھی نہیں کر سکتے۔

علماء کرام یہ بھی غور نہیں فرماتے کہ آج مغربی تہذیب اگر فاتح، غالب اور قوی ہے تو اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ مضبوط علمی وفکری بنیادوں پر کھڑی ہے لہٰذا مسلم معاشرے کے لیے اس کا چیلنج حربی اور سیاسی ہی نہیں علمی اور فکری بھی ہے۔ لیکن معاف کیجیے گا! علماء کرام اس چیلنج کا جواب کیا دیں گے وہ تو اسے سمجھنے کے لیے تیار نہیں۔ انہیں تو 'مقاصد الفلاسفہ' کا ادراک نہیں 'تہافۃ الفلاسفہ' کا اہتمام وہ کیسے کریں گے؟ محض یہ کہہ دینا کہ ہمارا مؤقف مبنی برحق ہے اور ان کا مؤقف غلط ہے، کافی نہیں جب تک ہم مروجہ علمی اسالیب میں اپنے مؤقف کا صحیح ہونا اور ان کے مؤقف کا خام، ناقص اور غلط ہونا دلائل کے ساتھ ثابت نہیں کر دیتے۔

اس کے مقابلے میں جاوید غامدی صاحب (اور ان کے عمار ناصر صاحب جیسے بعض تلامذہ) ذہین اور محنتی ہیں، وسیع المطالعہ ہیں، جدید تعلیم یافتہ ہیں، مغربی ذہن اور نفسیات کو سمجھتے ہیں، بات متانت، شائستگی اور دلیل کے ساتھ کرتے ہیں اور مؤثر انداز میں کرتے ہیں، لوگوں کے سوالوں کے جواب صحیح فریکوئنسی میں دیتے ہیں تو لوگ ان کی بات کیوں نہ سنیں اور ان سے متاثر کیوں نہ ہوں؟

علماء کرام غور فرمائیں کہ دینی مدارس، مساجد کے آئمہ وخطباء، ان کی دعوتی تنظیموں (تبلیغی جماعت، دعوت اسلامی وغیرہ) اور اصلاحی اداروں (صوفیاء اور ان کی خانقاہوں) کو کیا مغربی فکر و تہذیب اور مسلم معاشرے میں اس کے تعامل و اثرات سے پیدا ہونے والے مسائل اور چیلنجز کا ادراک ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ مغرب کے پیدا کردہ علوم اور فکر نے مسلم معاشرے کے لوگوں کا جنہوں نے مغربی فکر پر مبنی تعلیمی اداروں سے تعلیم حاصل کی ہے، ایک خاص ذہن (mind set) بنا یا ہے جس سے ہماری روایتی دینی فکر نہ آگاہ ہے اور نہ اس سے مطابقت رکھتی ہے۔ اس چیز نے ایک خلاء پیدا کر دیا ہے۔ جاوید غامدی صاحب اور ان کے رفقاء کار اس خلاء سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور اسے پُر کر رہے ہیں۔ لہٰذا غامدی صاحب پر کفر اور گمراہی کے فتوے لگانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا جب تک علماء کرام اس تجمد کے ماحول اور اپنی فرقہ واریت سے باہر نہیں نکلیں گے اور اپنے آپ کو عصر حاضر کے علمی وفکری چیلنج کا جواب دینے کا اہل نہیں بنائیں گے۔

بحث کی تکمیل کی خاطر ہم اس طرف بھی اشارہ کر دیں کہ علماء کرام کے تجمد کے میلانات اور کچھ مرعوب ذہنوں کی جدیدیت اور مغرب پرستی کے درمیان بیچ کی راس کے کچھ معتدل اہل علم بھی ابھرنا شروع ہوئے تھے لیکن بدقسمتی سے وہ کوئی مستحکم علمی دھارہ نہیں بن سکے۔ ہمارے کالجوں، یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے علوم اسلامیہ کے لوگ بھی فکری طور پر بانجھ ثابت ہوئے ہیں جو محض اگلے گریڈ میں ترقی کی خاطر بے مغز اور بے معنی قسم کے 'تحقیقی مقالے' (؟) لکھتے رہتے ہیں اور بس۔

ہم اس تلخ نوائی کے لیے معذرت خواہ ہیں لیکن ؎ درد آج کچھ میرے دل میں سوا ہوتا ہے

ہماری سرگرمیاں

ملی مجلس شرعی کی طرف سے منعقد کردہ اتحاد امت کانفرنس

ملی مجلس شرعی سارے مکاتب فکر کے ثقہ علماء کرام کا ایک ایسا غیر سیاسی علمی پلیٹ فارم ہے جس کے پیش نظر یہ ہے کہ مسلم معاشرے کو درپیش جدید عصری مسائل میں سارے مکاتب فکر کے علماء کرام کی طرف سے ایک متفقہ مؤقف سامنے لایا جاسکے جس سے اتحاد امت اور اتحاد بین العلماء کو بھی فروغ ملے۔

مجلس نے ۲۴ ستمبر ۲۰۱۱ء کو لاہور کے ایمبسیڈر ہوٹل میں ایک اتحاد امت کانفرنس منعقد کی جس میں ملک بھر سے سارے مکاتب فکر کے ۵۵ ثقہ علماء نے شرکت کی اور مل کر اسلامی مقاصد کے لیے مل کر کام کرنے کے عزم کو دہرایا۔اس کانفرنس نے تین قراردادیں منظور کیں۔ ایک قرارداد میں پاکستان میں نفاذ شریعت کے لیے ۱۵ متفقہ نکات کی منظوری دی گئی تاکہ ان لوگوں کا اعتراض ختم ہوجائے جو یہ سوال کرتے ہیں کہ پاکستان میں کون سی شریعت نافذ کی جائے؟ دوسری قرارداد میں پاکستان کی قومی خودمختاری کے تحفظ پر زور دیا گیا تاکہ پاکستان کی امت اسلامیہ پاکستان کے اسلامی مستقبل پر یکسو ہوسکے اور غیر ملکی مداخلت کو رد کردیا جائے۔ تیسری قرارداد اتحاد بین العلماء کے موضوع پر تھی جس میں علماء کرام نے عہد کیا کہ وہ باہمی اختلافات کو حدود کے اندر رکھیں گے اور اسے انتشار اور فرقہ واریت کی صورت اختیار نہیں کرنے دیں گے۔اس کانفرنس کے اختتام پر ایک مشترکہ اعلامیہ بھی جاری کیا گیا۔ ان قراردادوں، مشترکہ اعلامیہ اور کانفرنس میں شریک ہونے والے علماء کرام کی ایک فہرست ان صفحات میں دی جارہی ہے۔

مشترکہ اعلامیہ

1۔ ہم پاکستان کے مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے علماء اور دینی جماعتوں کے سربراہان اس امر کا اعلان اور اظہار کرتے ہیں کہ ہم سب ایک امت اور بھائی بھائی ہیں ۔ہم ایسے سب اقدامات کی تائید اور حمایت کرتے ہیں جن سے امت اور علماء میں اتحاد و اتفاق بڑھے اور ایسے اقدامات اور عوامل سے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہیں جن سے امت اور علماء میں انتشار و افتراق پیدا ہو اور خلفشار بڑھے۔

2۔ آج ہم سب اعلان کرتے ہیں کہ ہم بحیثیت مسلمان متحد ہیں اور مسلکی تشخصات کو قائم رکھتے ہوئے ہر قسم کی فرقہ پرستی اور فرقہ وارنہ عصبیت کو مسترد کرتے ہیں اور عزم کرتے ہیں کہ آئندہ مل کر دین حنیف کی

عظمت و سر بلندی، پاکستان میں نفاذ شریعت اور مسلمانوں کے انفرادی اور اجتماعی زندگی میں احکام شریعت پر عمل کے لیے کوشاں رہیں گے اور علماء میں انتشار پیدا کرنے والوں کی کوششوں کو باہم مل کر اخلاص اور فراست سے ناکام بنائیں گے۔ ان شاءاللہ

3۔ ہم تمام مسالک کے جید علماء پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دیتے ہیں جو اتحاد امت کے عظیم مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ٹھوس تجاویز سامنے لائے گی اور مؤثر کردار ادا کریگی۔

4۔ ہم پاکستان کے تمام مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے علماء اور دینی جماعتوں کے سربراہان اس امر پر تشویش کا اظہار کرتے ہیں کہ پاکستان اس وقت بحرانی کیفیت میں ہے عوام الناس قتل و غارت گری ،دہشت گردی اور مصائب ومشکلات کا شکار ہیں پاکستان کی قومی سلامتی خطرے میں ہے جس کا بڑا سبب امریکہ اوراس کے اتحادیوں کی افغانستان میں مسلح مداخلت ہے اوراب افغانستان میں وہ اپنی ہاری ہوئی جنگ پاکستان پر مسلط کرنا چاہ رہا ہے جس نے صورتحال کومزید گھمبیر بنا دیا ہے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے حکمران بھی اس صورتحال کے ذمہ دار ہیں جنہوں نے اپنے اقتدار اور مفادات کے لیے امریکی آلہ کار بننا قبول کرلیا اور اب رفتہ رفتہ پوری قوم کو امریکی مفادات اور ان کے مکروہ عزائم کی بھینٹ چڑھانے کے درپے ہیں۔حکومت وعوام اور علماء وحکمران نفاذ اسلام اور وطن عزیز کے دفاع کے لیے مؤثر کردار ادا کریں۔

5۔ آج کا یہ اجلاس حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ امریکی مفادات کے تحفظ کی پالیسی یکسر ختم کر دی جائے اورامریکہ کی طرف سے وقتاً فوقتاً کیے جانے والے بے جا مطالبات بالخصوص شمالی وزیرستان میں فوجی آپریشن کے مطالبے کو یکسر مسترد کر دیا جائے۔ڈرون حملے فوری طور پر بند کرائے جائیں ۔ بلیک واٹر اورصہیونی اور بھارتی ایجنسیوں کی دہشت گردانہ کاروائیوں کا نیٹ ورک توڑ دیا جائے ،فوجی تربیت اور خفیہ معلومات کے تبادلے کی آڑ میں بلائے گئے امریکی فوجیوں کو واپس بھیجا جائے ،پاکستان سے نیٹو فورسز کی سپلائی بند کی جائے ،امریکہ کو دیے گئے فضائی اڈے عملاً خالی کرائے جائیں اور میڈیا کو ان تک رسائی دی جائے نیز پاکستان دہشت گردی کے خلاف اس نام نہاد امریکی جنگ سے فی الفور الگ ہوجائے اور ملک کے ناراض عناصر سے باہمی مذاکرات اورمفاہمت کے ذریعے مسائل حل کرنے کی کوشش کی جائے۔امریکہ کی طرف سے زمینی اور فضائی حملوں کی دھمکیوں کا منہ توڑ جواب دیا جائے۔

6۔ ہم نفاذ شریعت کے لیے دینی اصولوں پر مبنی ملی مجلس شرعی کی قرار داد کی مکمل حمایت کرتے ہیں جو پندرہ نکات پر مشتمل ہے اوراس عزم کا اظہار کرتے ہیں کہ ان راہنما اصولوں کے مطابق پاکستان میں شریعت کے نفاذ کیلئے مخلصانہ جدوجہد کریں گے۔

قرارداد

اتحاد بین العلماء

ہم پاکستان کے مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے علماء اور دینی جماعتوں کے سربراہان اس امر کا اعلان اور اظہار کرتے ہیں کہ ہم سب ایک امت ہیں اور بھائی بھائی ہیں۔ ہم ایسے سب اقدامات کی تائید اور حمایت کرتے ہیں جن سے امت اور علماء میں اتحاد و اتفاق بڑھے اور ایسے سب اقدامات اور عوامل سے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہیں جن سے امت اور علماء میں انتشار وافتراق پیدا ہو اور خلفشار بڑھے۔

بلاشبہ ہمارے درمیان فقہی و کلامی اختلافات موجود ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارے درمیان مشترکات بہت زیادہ ہیں اور اختلافات کم ہیں اور جو ہیں انہیں گفت وشنید اور سنجیدہ و پُرامن علمی ماحول میں زیر بحث لایا جاسکتا ہے اور انہیں قاطع اخوت اسلامی اور موجب فساد نہیں بننے دینا چاہیے نیز ہم اتحاد بین العلماء کی پرزور حمایت کرتے ہیں تاکہ اس اتحاد کے مثبت اثرات عوام الناس تک بھی پہنچیں۔

لہٰذا آج ہم سب اعلان کرتے ہیں کہ ہم بحیثیت مسلمان متحد ہیں، آپس میں بھائی بھائی ہیں اور کسی خاص فقہی یا کلامی مسلک سے ہماری وابستگی اسلامی اخوت اور بھائی چارے کی نفی نہیں کرتی۔لہٰذا ہم مسلکی تشخصات کو قائم رکھتے ہوئے ہر قسم کی فرقہ پرستی اور فرقہ وارانہ عصبیت کو مسترد کرتے ہیں اور آئندہ مل کر دینِ حنیف کی عظمت و سربلندی، پاکستان میں نفاذ شریعت اور مسلمانوں کے انفرادی و اجتماعی زندگی میں احکام شریعت پر عمل کے لیے کوشاں رہیں گے اور علماء میں انتشار پیدا کرنے والوں کی کوششوں کو باہم مل کر اخلاص اور فراست سے ناکام بنائیں گے، ان شاءاللہ۔

ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کا احترام کریں گے، اشتعال انگیز اور توہین آمیز تقریر و تحریر سے اجتناب کریں گے اور ایسے اقدامات سے گریز کریں گے جن سے باہمی اتحاد و اتفاق کو ٹھیس پہنچے اور اپنی تمام علمی و فکری صلاحیتیں اصلاح معاشرہ، اعلاء کلمۃ اللہ اور اتحاد امت کے لیے صَرف کریں گے۔ ہم تمام علماء کرام سے بھی یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ بھی امت کے وسیع تر مفاد میں یہی روش اختیار فرمائیں۔

ہم ملی مجلس شرعی کو اختیار دیتے ہیں کہ وہ تمام مسالک کے جید علمائے کرام پر مشتمل ایک کمیٹی جلد از جلد تشکیل دے جو اتحاد امت کے اس عظیم مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ٹھوس اور مؤثر تجاویز مرتب کرے اور ان پر عملدرآمد کے حوالے سے مؤثر لائحہ عمل بھی تجویز کرے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس عزم و ارادے میں کامیاب فرمائے اور اپنے اس فرمان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے کہ ''وَ اعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوۡا'' (۳:۱۰۳)

قرارداد

قومی خودمختاری کا تحفظ

ہم پاکستان کے تمام مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے علماء اور دینی جماعتوں کے سربراہان اس امر پر تشویش کا اظہار کرتے ہیں کہ پاکستان اس وقت بحرانی کیفیت میں ہے۔ عوام الناس قتل و غارتگری، دہشت گردی اور مصائب و مشکلات کا شکار ہیں بالخصوص کراچی اور بلوچستان میں بے گناہوں کا قتل عام اور بیرونی سازشیں اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہیں۔ پاکستان کی قومی سلامتی خطرے میں ہے جس کا بڑا سبب امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی افغانستان میں مسلح مداخلت ہے اور اب افغانستان میں وہ اپنی ہاری ہوئی جنگ پاکستان پر مسلط کرنا چاہ رہا ہے جس نے صورتحال کو مزید گھمبیر بنادیا ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے حکمران بھی اس صورت حال کے ذمہ دار ہیں جنہوں نے اپنے اقتدار اور مفادات کے لیے امریکی آلہ کار بننا قبول کرلیا اور اب رفتہ رفتہ پوری قوم کو امریکی مفادات اور ان کے مکروہ عزائم کی بھینٹ چڑھانے کے درپے ہیں۔

چنانچہ آج کا یہ اجلاس حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ امریکی مفادات کے تحفظ کی پالیسی یکسر ختم کردی جائے اور امریکہ کی طرف سے وقتاً فوقتاً کیے جانے والے بے جا مطالبات کو مسترد کردیا جائے۔ پارلیمنٹ کی متفقہ قراردادوں کے مطابق ڈرون حملے فوری طور پر بند کرائے جائیں۔ بلیک واٹر اور صہیونی اور بھارتی ایجنسیوں کی دہشت گردانہ کارروائیوں کا نیٹ ورک توڑ دیا جائے، فوجی تربیت اور خفیہ معلومات کے تبادلے کی آڑ میں بلائے گئے امریکی فوجیوں کو واپس بھیجا جائے، امریکی دباؤ پر پاکستان کے مختلف علاقوں میں فوجی آپریشنوں کا سلسلہ بند کیا جائے اور شمالی وزیرستان میں فوجی آپریشن کے امریکی مطالبے کو یکسر مسترد کر دیا جائے اور اندرون ملک ناراض عناصر سے باہمی مذاکرات اور مفاہمت کے ذریعے مسائل حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ پاکستان سے نیٹو فورسز کی سپلائی بند کی جائے، امریکہ کو دیے گئے فضائی اڈے عملاً خالی کرائے جائیں اور میڈیا کو ان تک رسائی دی جائے۔ ہمارے حکمران دہشت گردی کے خلاف اس نام نہاد امریکی جنگ سے فی الفور الگ ہوجائیں اور امریکہ کی طرف سے زمینی اور فضائی حملوں کی دھمکیوں کا منہ توڑ جواب دیں۔

قرارداد

نفاذِ شریعت کے رہنما اصولوں کے حوالے سے

55 علماء کرام کے متفقہ 15 نکات

چونکہ اسلامی تعلیمات کا یہ تقاضا ہے کہ مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی قرآن وسنت کے مطابق گزاریں اور پاکستان اسی لئے بنایا گیا تھا کہ یہ اسلام کا قلعہ اور تجربہ گاہ بنے لہٰذا 1951ء میں سارے دینی مکاتب فکر کے معتمد علیہ 31 علماء کرام نے عصر حاضر میں ریاست وحکومت کے اسلامی کردار کے حوالے سے جو 22 نکات تیار کیے تھے انہوں نے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کو ٹھوس بنیادیں فراہم کیں اور ان کی روشنی میں پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانے کے حوالے سے کئی دستوری انتظامات بھی کر دیے گئے لیکن ان میں سے اکثر زینت قرطاس بنے ہوئے ہیں اور ان پر کوئی عمل درآمد نہیں ہو سکا۔ مزید برآں کچھ اور دستوری خلا بھی سامنے آئے ہیں جو پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانے کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں چنانچہ نفاذ شریعت کے حوالے سے حکومتی تساہل پسندی کا نتیجہ یہ سامنے آیا ہے کہ پاکستان کے شمال مغربی سرحدی قبائلی علاقوں کے بعض عناصر نے بزورِ قوت شریعت کی من مانی تعبیرات کو نافذ کرنے کے لیے مسلح جدوجہد کا آغاز کیا۔ اس مسلح جدوجہد کے شرکاء نے ایک طرح سے حکومتی رٹ کو چیلنج کر دیا جب کہ اس صورت حال کو امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے دہشتگردی کے ساتھ نتھی کر کے افواج پاکستان کو اس مسلح جدوجہد کے شرکاء کے سامنے لا کھڑا کیا اور یوں دونوں طرف سے ایک دوسرے کے ہاتھوں مسلمانوں کا ہی خون بہہ رہا ہے حالانکہ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ان سرگرمیوں کی پشت پناہی بھی خود امریکہ، بھارت اور اسرائیل ہی کر رہے ہیں۔ پاکستان کے دیگر پُر امن علاقے بھی اس جنگ کے اثرات سے محفوظ نہیں ہیں تقریباً تمام بڑے شہروں میں آئے دن دہشتگردی اور خودکش حملوں کی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں جن میں اب تک ہزاروں معصوم شہری اپنی جانیں گنوا بیٹھے ہیں۔ یہ صورت حال تقاضا کرتی ہے کہ تمام مکاتب فکر کے نمائندہ علماء کرام ایک مرتبہ پھر مل بیٹھیں اور باہمی غور وفکر اور اتفاق رائے سے ان اُمور کی نشاندہی کر دیں جن کی وجہ سے پاکستان ابھی تک ایک مکمل اسلامی ریاست نہیں بن سکا اور نہ ہی یہاں نفاذ شریعت کا کام پایۂ تکمیل تک پہنچ سکا ہے۔ تمام مکاتب فکر کے نمائندہ علماء کرام کی یہ کوشش اس مرحلہ پر اس لیے ناگزیر ہے کہ ان کی اس کوشش سے ہی نہ صرف ان اسباب کی نشاندہی

ہو گی جو نفاذ شریعت کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں بلکہ نفاذ شریعت کے لیے متفقہ رہنما اصولوں کے ذریعے وہ سمت اور راستہ بھی متعین ہو جائے گا جس پر چل کر یہ منزل حاصل کی جا سکتی ہے۔ دراصل نفاذ شریعت کی منزل کا حصول ہی اس بات کی ضمانت فراہم کر سکتا ہے کہ آئندہ پاکستان کے کسی علاقے سے نفاذ شریعت کے نام پر مسلح جارحیت کا ارتکاب اور حکومتی رٹ کو چیلنج نہ کیا جا سکے چنانچہ اس حوالے سے تجویز کیے گئے اقدامات پیش خدمت ہیں:

ا۔ شریعت پر عمل سب کی ذمہ داری ہے

ہمارے حکمرانوں کی یہ شرعی ذمہ داری ہے کہ وہ فرد کو بھی شریعت پر عمل کے قابل بنائیں اور معاشرے اور ریاست کو بھی شریعت کے مطابق چلائیں۔ دینی عناصر کا بھی فرض ہے کہ وہ دعوت و اصلاح اور تبلیغ و تذکیر کے ذریعے فرد کی بھی تربیت کریں، حکمرانوں پر بھی دباؤ ڈالیں کہ وہ اپنی دینی ذمہ داریاں پوری کریں اور جہاں تک قانون اجازت دے خود بھی نفاذِ شریعت کے لئے ضروری اقدامات کریں۔ اسی طرح ہر مسلمان کی یہ ذاتی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرے۔

۲۔ ۲۲ نکات کی مرکزی حیثیت

یہ کہ پاکستان میں نفاذِ شریعت کی بنیاد ۱۹۵۱ء میں سارے مکاتب فکر کے علماء کرام کی طرف سے متفقہ طور پر منظور کردہ ۲۲ نکات ہیں اور موجودہ دستاویز کے ۱۵ نکات کی حیثیت بھی ان کی تفریع اور تشریح کی ہے۔

۳۔ نفاذ شریعت بذریعہ پُرامن جدوجہد اور بمطابق متفقہ راہنما نکات

یہ کہ پاکستان میں شریعت کا نفاذ پرامن جدوجہد کے ذریعے ہونا چاہیے کیونکہ یہی اسلامی تعلیمات اور دستور پاکستان کا مشترکہ تقاضا ہے اور عملاً بھی اس کے امکانات موجود ہیں۔ نیز شریعت کا نفاذ سارے دینی مکاتب فکر کی طرف سے منظور شدہ متفقہ راہنما اصولوں کے مطابق ہونا چاہیے (یہ ۱۵ نکات اس قرارداد کا حصہ ہیں) اور کسی گروہ یا جماعت کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی مرضی کا اسلام سارے معاشرے پر قوت سے ٹھونس دے۔

۴۔ دستوری اصلاحات

دستور پاکستان کے قابل نفاذ حصے میں بصراحت یہ لکھا جائے کہ قرآن وسنت مسلمانوں کا سپریم

لاء ہے اوراس تصریح سے متصادم قوانین کومنسوخ کر دیا جائے۔ یہ دستوری انتظام بھی کیا جائے کہ عدلیہ کی طرف سے دستور کی کوئی ایسی تعبیر معتبر نہ ہوگی جو کتاب وسنت کے خلاف ہواور دستور کی کسی بھی شق اور مقنّنہ، عدلیہ اور انتظامیہ کے کسی بھی فیصلے کو کتاب وسنت کے خلاف ہونے کی صورت میں اعلیٰ عدالتوں میں چیلنج کیا جا سکے۔ نیز ان دستوری دفعات کو دستور میں بنیادی اور نا قابل تنسیخ دفعات قرار دیا جائے۔ آئین توڑنے سے متعلق دفعہ 6A اور عوامی نمائندوں کی اہلیت سے متعلق دفعات 63,62 کو مؤثر اور ان پر عمل درآمد کو یقینی بنایا جائے۔ کسی بھی ریاستی یا حکومتی عہدیدار کی قانون سے بالاتر حیثیت اور استثنٰی پر مبنی دستوری شقوں کا خاتمہ کیا جائے۔

وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ کے شریعت اپیلنٹ بنچ کے جج صاحبان کو دیگر اعلیٰ عدالتوں کے جج صاحبان کی طرح باقاعدہ جج کی حیثیت دی جائے اور ان کے سٹیٹس اور شرائط تقرری وملازمت کو دوسری اعلیٰ عدالتوں کے جج صاحبان کے سٹیٹس اور شرائط تقرری و ملازمت کے برابر لایا جائے۔ بعض قوانین کو وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ اختیار سے مستثنٰی قرار دینے کے فیصلوں پر نظر ثانی کی جائے اور وفاقی شرعی عدالت کو ملک کے کسی بھی قانون پر نظر ثانی کا اختیار دیا جائے۔ وفاقی شرعی عدالت اور شریعت اپیلنٹ بنچ کو آئینی طور پر پابند کیا جائے کہ وہ مناسب وقت (Time frame) کے اندر شریعت پٹیشنوں اور شریعت اپیلوں کا فیصلہ کر دیں۔ وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ کی طرح صوبائی، ضلعی اور تحصیل سطح کی عدالتوں میں بھی علماء ججوں کا تقرر کیا جائے اور آئین میں جہاں قرآن وسنت کے بالاتر قانون ہونے کا ذکر ہے وہاں نبی کریم ﷺ کے شارع ہونے کا ذکر بھی کیا جائے۔ حکومت اسلامی نظریاتی کونسل میں تمام مکاتب فکر کے جید علماء بطور رکن نامزد کرے۔ ہر مکتبہ فکر اپنا نمائندہ اپنے حلقوں سے مشاورت کے بعد تجویز کرے۔ نفاذِ شریعت کے حوالے سے جن نکات پر ارکان کی اکثریت کا اتفاق ہو جائے حکومت چھ ماہ کے اندر اسے قانون بنا کر پاس کرنے کی پابند ہو۔

۵۔ موجودہ اسلامی قوانین پر مؤثر عمل دارآمد

پاکستان کے قانونی ڈھانچے میں پہلے سے موجود اسلامی قوانین پر مؤثر طریقے سے عمل درآمد کیا جائے اور اسلامی عقوبات کے نفاذ کے ساتھ ساتھ مؤثر اصلاحی کوششیں بھی کی جائیں۔

۶۔ بنیادی ضروریات زندگی کی فراہمی

اسلامی اصول واقدار کے مطابق عوام کو بنیادی ضروریات وسہولیات زندگی مثلاً روٹی، کپڑا، مکان، علاج

معالجہ اور تعلیم فراہم کرنے، غربت و جہالت کے خاتمے اور عوامی مشکلات و مصائب دور کرنے اور پاکستانی عوام کو دنیا میں عزت اور وقار کی زندگی گزارنے کے قابل بنانے کو اولین ریاستی ترجیح بنایا جائے۔

۷۔ سیاسی اصلاحات

موجودہ سیاسی نظام کی اسلامی تعلیمات کے مطابق اصلاح کی جائے مثلاً عوامی نمائندگی میں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی حوصلہ شکنی اور غریب اور متوسط طبقے کی نمائندگی کی حوصلہ افزائی کے لیے ٹھوس عملی اقدامات کیے جائیں نمائندگی کے لیے شرعی شہادت کی اہلیت کو لازمی شرط قرار دیا جائے۔ متناسب نمائندگی کا طریقہ اپنایا جائے۔ علاقائی، نسلی، لسانی اور مسلکی تعصّبات کی بنیاد پر قائم ہونے والی سیاسی جماعتوں پر پابندی لگائی جائے اور قومی یکجہتی کے فروغ کے لیے مناسب پالیسیاں اور ادارے بنائے جائیں

۸۔ نظام تعلیم کی اصلاح

تعلیمی نظام کی اسلامی تناظر میں اصلاح کے لیے قومی تعلیمی پالیسی اور نصابات کو اسلامی اور قومی سوچ کے فروغ کے لیے تشکیل دیا جائے جس سے یکساں نظام تعلیم کی حوصلہ افزائی اور طبقاتی نظام تعلیم کا خاتمہ ہو، اساتذہ کی نظریاتی تربیت کی جائے اور تعلیمی اداروں کا ماحول بہتر بنایا جائے۔ مخلوط تعلیم ختم کی جائے اور مغربی لباس کی پابندی اور امور تعلیم میں مغرب کی اندھی نقالی کی روش ختم کی جائے۔ تعلیم کا معیار بلند کیا جائے۔ پرائیویٹ تعلیمی اداروں کو قومی نصاب اپنانے کا پابند بنانے اور ان کی نگرانی کا مؤثر نظام وضع کرنے کے لیے قانون سازی کی جائے۔ تعمیر سیرت اور کردار سازی کو بنیادی اہمیت دی جائے۔ تعلیم سے ثنویت کا خاتمہ کیا جائے۔ دینی مدارس کے نظام کو مزید مؤثر و مفید بنانے اور اسے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ضروری قدامات کیے جائیں تاکہ بین المسالک ہم آہنگی کو فروغ ملے اور فرقہ واریت میں کمی واقع ہو دینی مدارس کی ڈگریوں کو تسلیم کیا جائے۔ تعلیم کے لئے وافر فنڈز مہیا کئے جائیں۔ ملک میں کم از کم میٹرک تک لازمی مفت تعلیم رائج کی جائے اور چائلڈ لیبر کا خاتمہ کیا جائے۔

۹۔ ذرائع ابلاغ کی اصلاح

ذرائع ابلاغ کی اصلاح کی جائے۔ اسلامی تناظر میں نئی ثقافتی پالیسی وضع کی جائے جس میں فحاشی وعریانی کو فروغ دینے والے مغربی و بھارتی ملحدانہ فکر و تہذیب کے اثرات و رجحانات کو رد کر دیا جائے۔ صحافیوں کے لئے ضابطۂ اخلاق تیار کیا جائے اور ان کی نظریاتی تربیت کی جائے۔ پرائیویٹ چینلز اور کیبل آپریٹرز کی مؤثر نگرانی کی جائے۔ اسلام اور پاکستان کے نظریاتی تشخص کے خلاف پروگراموں پر

پابندی ہونی چاہیئے بلکہ تعمیری انداز میں عوام کے اخلاق سدھارنے اور انہیں اسلامی تعلیمات پرعمل کی ترغیب دینے والے پروگرام پیش کیے جائیں اور صاف ستھری تفریح مہیا کی جائے۔

۱۰۔ معیشت

پاکستان کی معیشت کو مضبوط بنانے اور افلاس اور مہنگائی کے خاتمے کے لیے ٹھوس عملی اقدامات کیے جائیں جیسے جاگیرداری اور سرمایہ دارانہ رجحانات کی حوصلہ شکنی کرنا، شعبہ زراعت میں ضروری اصلاحات کو اولین حکومتی ترجیح بنانا، تقسیم دولت کے نظام کو منصفانہ بنانا اور اس کا بہاؤ امیروں سے غریبوں کی طرف موڑنا۔ بیرونی قرضوں اور درآمدات کی حوصلہ شکنی کرنا اور زرمبادلہ کے ذخائر کو بڑھانے کے لیے مؤثر منصوبہ بندی کرنا۔ معاشی خود کفالت کے لئے جدوجہد کرنا اور عالمی معاشی اداروں کی گرفت سے معیشت کو نکالنا۔ سود اور اسراف پر پابندی اور سادگی کو رواج دینا۔ ٹیکسز اور محاصل کے نظام کو مؤثر بنایا جائے اور بینکوں کو پابند کیا جائے کہ وہ بڑے قرضوں کے اجراء کے ساتھ ساتھ مائیکرو کریڈٹ کا بھی اجراء کریں تاکہ غریب اور ضرورت مند لوگ ان بلاسود قرضوں کے ذریعے اپنی معاشی حالت بہتر کرسکیں نیز قرضوں کو بطور سیاسی رشوت دینے پر قانونی پابندی عائد کی جائے۔ زکوۃ اور عشر کی وصولی اور تقسیم کے نظام کو بہتر بنایا جائے۔ دستور پاکستان کے آرٹیکل 38 میں درج عوام کی معاشی اور معاشرتی فلاح و بہبود کے متعلقہ اُمور کی تکمیل کے لیے حکومت خود اور نجی شعبے کے اشتراک سے فوری طور پر ٹھوس قدامات کرے۔ لوٹ مار سے حاصل کردہ اور بیرون ملک بینکوں میں جمع خطیر رقوم کی وطن واپسی کو یقینی بنایا جائے۔

۱۱۔ عدلیہ

عدلیہ کی بالفعل آزادی کو یقینی بنایا جائے اور اسے انتظامیہ سے الگ کیا جائے۔ اسلامی تناظر میں نظام عدل کی اصلاح کے لئے قانون کی تعلیم، ججوں، وکیلوں، پولیس اور جیل سٹاف کے کردار کو اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے ضروری اقدامات کیے جائیں۔ انصاف سستا اور فوری ہونا چاہیے۔

۱۲۔ امن وامان

امن وامان کی بحالی اور لوگوں کے جان و مال کا تحفظ ریاست کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ حکومت کو ان مقاصد کے حصول کے لئے ہر ممکن قدم اٹھانا چاہیئے۔

۱۳۔ خارجہ پالیسی

خارجہ پالیسی کو متوازن بنایا جائے۔ تمام عالمی طاقتوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھے جائیں اور اپنی

قومی خودمختاری کا تحفظ کیا جائے۔اپنے ایٹمی اثاثوں کے تحفظ پر کوئی سمجھوتہ نہ کیا جائے۔مسلمانان عالم کے رشتہ اخوت واتحاد کوقوی تر کرنے کے لیےاوآئی سی کو فعال بنانے میں پاکستان اپنا کردار ادا کرے۔

۱۴۔ افواج پاکستان

افواج میں روح جہاد پیدا کرنے کے لئے سپاہیوں اور افسروں کی دینی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہونا چاہیے۔ بنیادی فوجی تربیت ہر مسلم نوجوان کے لئے لازمی ہونی چاہیے۔فوجی افسروں کی اس غرض سے خصوصی تربیت کی جائے کہ ان کا فرض ملک کا دفاع ہے نہ کہ حکومت چلانا۔ بیوروکریسی کی تربیت بھی اسلامی تناظر میں ہونی چاہیے تا کہ ان کے ذہنوں میں یہ راسخ ہوجائے کہ وہ عوام کے خادم ہیں حکمران نہیں۔

۱۵۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لئے ایک آزاد اور طاقتور ریاستی ادارہ قائم کیا جائے جو ملک میں اسلامی معروفات اور نیکیوں کے فروغ اور منکرات و برائیوں کے خاتمے کے لئے کام کرے اور معاشرے میں ایسا ماحول پیدا کرے جس میں نیکی پر عمل آسان اور برائی پر عمل مشکل ہوجائے اور شعائر اسلامی کا احیاء و اعلاء ہو اور دستور کے آرٹیکل 31 میں جن امور کا ذکر کیا گیا ہے ان پر مؤثر عمل درآمد ہو سکے۔ دفاع اسلام خصوصاً اسلام کے بارے میں شکوک وشبہات کے ازالے اور مسلمانوں و غیر مسلموں تک مؤثر انداز میں دین پہنچانے کے لئے بھی حکومت پاکستان کو فنڈز مختص کرنے چاہئیں اور وسیع الاطراف کوششیں بروئے کار لانی چاہئیں۔

فہرست علماء کرام

جو اتحاد امت کانفرنس میں شریک ہوئے اور جنہوں نے قرار دادوں کی منظوری دی

1۔ مولانا مفتی محمد خان قادری (مہتمم جامعہ اسلامیہ وصدر ملی مجلس شرعی، لاہور)
2۔ پیر عبدالخالق قادری (صدر مرکزی جماعت اہل سنت پاکستان)
3۔ علامہ احمد علی قصوری (صدر مرکز اہل سنت، لاہور)
4۔ صاحبزادہ علامہ محبّ اللہ نوری (مہتمم جامعہ حنفیہ فریدیہ بصیر پور، اوکاڑہ)
5۔ علامہ قاری محمد زوار بہادر (ناظم اعلیٰ، جمعیت علماء پاکستان، لاہور)
6۔ مولانا حافظ غلام حیدر خادمی (مہتم جامعہ رحمانیہ رضویہ، سیالکوٹ)
7۔ مولانا مفتی شیر محمد خان (صدر دارالافتاء دارالعلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ [ضلع سرگودھا])

8۔ علامہ حسان الحیدری (حیدرآباد، سندھ)
9۔ مولانا راغب حسین نعیمی (مہتمم جامعہ نعیمیہ، لاہور)
10۔ مولانا خان محمد قادری (مہتمم جامعہ محمدیہ غوثیہ، داتا نگر، لاہور)
11۔ مولانا محمد خلیل الرحمٰن قادری (ناظم اعلیٰ جامعہ اسلامیہ، لاہور)
12۔ علامہ محمد شہزاد مجددی (سربراہ دارالاخلاص ۔ مرکز تحقیق، لاہور)
13۔ علامہ محمد بوستان قادری (شیخ الحدیث دارالعلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ [ضلع سرگودھا])
14۔ سید منور حسن (امیر جماعت اسلامی پاکستان، منصورہ، لاہور)
15۔ مولانا عبدالمالک (صدر رابطہ المدارس الاسلامیہ، منصورہ لاہور)
16۔ ڈاکٹر فرید احمد پراچہ (ڈپٹی سیکرٹری جنرل جماعت اسلامی، منصورہ لاہور)
17۔ ڈاکٹر سید وسیم اختر (امیر جماعت اسلامی پنجاب، لاہور)
18۔ مولانا سید محمود الفاروقی (ناظم تعلیمات رابطہ المدارس الاسلامیہ، لاہور)
19۔ مولانا محمد ایوب بیگ (ناظم نشر و اشاعت تنظیم اسلامی پاکستان، لاہور)
20۔ مولانا ڈاکٹر محمد امین (ڈین صفاء اسلامک سنٹر و ناظم اعلیٰ ملی مجلس شرعی، لاہور)
21۔ مولانا محمد حنیف جالندھری (ناظم اعلیٰ، وفاق المدارس العربیہ، ملتان)
22۔ مولانا مفتی رفیق احمد (دارالافتاء جامعۃ العلوم الاسلامیہ، علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی)
23۔ مولانا حافظ فضل الرحیم (نائب مہتمم جامعہ اشرفیہ، لاہور)
24۔ مولانا زاہد الراشدی (ڈائریکٹر الشریعہ اکیڈمی، گوجرانوالہ)
25۔ مولانا عبدالرؤف فاروقی (ناظم اعلیٰ جمعیت علماء اسلام، لاہور)
26۔ مولانا محمد امجد خان (ناظم اطلاعات جمعیت علماء اسلام ۔ لاہور)
27۔ مولانا مفتی محمد طاہر مسعود (مہتمم جامعہ مفتاح العلوم، سرگودھا)
28۔ مولانا مفتی محمد طیب (مہتمم جامعہ اسلامیہ امدادیہ، فیصل آباد)
29۔ مولانا ڈاکٹر قاری احمد میاں تھانوی (نائب مہتمم جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ، لاہور)
30۔ مولانا اللہ وسایا (عالمی مجلس تحفظِ ختمِ نبوت، ملتان)
31۔ مولانا مفتی محمد گلزار احمد قاسمی (مہتمم جامعہ قاسمیہ، گوجرانوالہ)
32۔ مولانا قاری محمد طیب (مہتمم جامعہ حنفیہ بورے والا، وہاڑی)

33۔ مولانا رشید میاں (مہتمم جامعہ مدنیہ، کریم پارک، لاہور)
34۔ مولانا محمد یوسف خان (مہتمم مدرسۃ الفیصل للبنات، ماڈل ٹاؤن، لاہور)
35۔ مولانا عزیز الرحمٰن ثانی (مبلغ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت، لاہور)
36۔ مولانا رضوان نفیس (خانقاہ سید احمد شہید، لاہور)
37۔ مولانا قاری جمیل الرحمٰن اختر (مہتمم جامعہ حنفیہ قادریہ، لاہور)
38۔ مولانا حافظ محمد نعمان (مہتمم جامعہ الخیر، جوہر ٹاؤن، لاہور)
39۔ مولانا قاری ثناء اللہ (امیر جمعیت علماء اسلام لاہور)
40۔ پروفیسر مولانا ساجد میر (امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان، لاہور)
41۔ پروفیسر حافظ محمد سعید (امیر جماعت الدعوۃ پاکستان، لاہور)
42۔ مولانا حافظ عبدالغفار روپڑی (امیر جماعت اہل حدیث پاکستان، لاہور)
43۔ مولانا عبیداللہ عفیف (امیر جمعیت اہلحدیث پاکستان، لاہور)
44۔ مولانا سید ضیاء اللہ شاہ بخاری (ناظم اعلیٰ متحدہ جمعیت اہلحدیث پاکستان)
45۔ مولانا حافظ عبدالوہاب روپڑی (نائب امیر جماعت اہلحدیث پاکستان)
46۔ مولانا محمد شریف خان چنگوانی (نائب امیر مرکزی جمعیت اہلحدیث پاکستان)
47۔مولانا ڈاکٹر محمد حماد لکھوی (پروفیسر پنجاب یونیورسٹی وخطیب جامع مسجد مبارک اہلحدیث، لاہور)
48۔ مولانا ڈاکٹر حافظ حسن مدنی (نائب مدیر جامعہ لاہور الاسلامیہ [رحمانیہ] لاہور)
49۔ مولانا امیر حمزہ (کنوینر تحریکِ حرمتِ رسول [جماعۃ الدعوۃ]، لاہور)
50۔ مولانا قاری شیخ محمد یعقوب (جماعۃ الدعوۃ، لاہور)
51۔ مولانا رانا نصر اللہ (امیر مرکزی جمعیت اہلحدیث لاہور)
52۔ مولانا محمد زاہد ہاشمی الازہری (ناظم اعلیٰ جماعت غرباء اہلحدیث، پنجاب)
53۔ علامہ ڈاکٹر محمد حسین اکبر (مہتمم ادارہ منہاج الحسین، لاہور)
54۔ علامہ حافظ کاظم رضا نقوی (تحریک اسلامی، اسلام آباد)
55۔ مولانا محمد مہدی (جامعہ المنتظر، لاہور)

ڈاکٹر محمد امین کی بعض اہم تالیفات

اردو

۱۔ ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل
۲۔ ہمارا دینی نظامِ تعلیم
۳۔ تعلیمی ادارے اور کردار سازی
۴۔ مسلم نشأۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل
۵۔ اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش
۶۔ اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی نفسیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ)
۷۔ حقیقتِ تزکیۂ نفس
۸۔ ترکِ رذائل (اصلاح اعمال و اخلاق کا حصہ اول)
۹۔ اسلام اور پاکستان
۱۰۔ اسلامی انقلاب۔ مفہوم، تقاضے اور حکمت عملی
۱۱۔ عصر حاضر اور اسلام کا نظامِ قانون
۱۲۔ مقالاتِ امین (دو جلدیں)
۱۳۔ مطالعۂ قرآن و حدیث (برائے جماعت اول تا پنجم)

بروشرز

۱۴۔ پرائیویٹ سکولوں کے نام ایک اہم پیغام
۱۵۔ طلبہ کی اسلامی تربیت۔ کیوں اور کیسے؟
۱۶۔ انگلش میڈیم۔ فائدے اور نقصانات
۱۷۔ دینی مدارس کے نام۔ ایک اہم پیغام
۱۸۔ مسلمانوں کی ترقی کا واحد راستہ
۱۹۔ حقیقتِ تصوف

انگریزی

۲۰۔ Riyadh-us Saliheen (2 Vols)
۲۱۔ Noble Quran, Part 1
۲۲۔ Islamization of Laws in Pakistan

عربی

۲۳۔ السلطة التشريعية ۔ دراسة مقارنة

آدھا سچ

جس عہد میں ہم زندہ ہیں اس میں (پورا) حق کہنا دہکتا انگارا ہاتھ میں پکڑنا ہے۔

اگر آپ اپنے ملک کی عسکری پالیسی پر تنقید کریں تو آپ دن دہاڑے اٹھا لیے جائیں گے۔ اگر مجاہدین کے بارے میں لب کشائی کریں تو 'شہادت' آپ کا نصیب ہوسکتی ہے یا پھر 'کالا پانی'۔ مسلک پرستوں پر نقد کریں تو توہین رسالت کے ناکردہ جرم میں ساری عمر جیل میں سڑ سکتے ہیں اور اگر 'اناالحق' کا نعرہ لگائیں تو بھی 'اہل توحید' آپ کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اور اگر آپ کسی مافیا اور گینگ کی نقاب کشائی کریں گے تو آپ کے بچے سکول سے غائب ہوسکتے ہیں اور بوری بند نعش بھی سڑک پر پڑی مل سکتی ہے۔

جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کرنا یا جزوی اور آدھے سچ کو پورا سچ کہہ کر پیش کرنا آج ایک 'ہنر' بن گیا ہے۔ پہلے زمانے میں اسے منافقت، مداہنت اور دوچہرگی کہتے تھے۔ آج یہ ایک پروفیشنل صلاحیت اور خصوصی تکنیکی مہارت سے عبارت ہے۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہم اس ہنر سے عاری ہیں لہٰذا ہماری تحریروں میں صرف آدھا سچ ہوتا ہے۔

تعلیم و تربیت　　مولانا ابوالحسن ندوی

مغربی تعلیم کا زہر (۲)

اقبال ان معدودے چند خوش قسمت افراد میں سے ہیں، جو مغربی نظام تعلیم کے سمندر میں غوطہ لگا کر ابھر آئے اور نہ صرف یہ کہ صحیح سلامت ساحل پر پہنچے بلکہ اپنے ساتھ بہت سے موتی بھی نکال کر لائے اور ان کی خود اعتمادی، اسلام کی ابدیت اور اس کے وسیع مضمرات پر ان کا یقین اور زیادہ مستحکم ہوگیا۔ اگر چہ یہ کہنا مشکل ہے کہ انہوں نے مغربی تعلیم اور مغربی فلسفہ کا مطلق اثر قبول نہیں کیا اور ان کا دینی فہم کتاب و سنت اور سلفِ امت کے بالکل مطابق ہے(☆) لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس 'آتشِ نمرود' نے ان کے ہزاروں معاصرین کی طرح ان کی خودی اور شخصیت کو جلا کر خاک نہیں کیا اور بڑی حد تک ان کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ:

طلسمِ علمِ حاضر را شکستم　　ربودم دانہ و دامش گسستم
خدا داند کہ مانندِ براہیم　　بنارِ او چہ بے پرواہ نشستم　　(ارمغان حجاز صفحہ ۷۰)

اس جدید تعلیم اور اس کے اثرات کے متعلق مولانا محمد علی جوہر کی شہادت بھی بڑی وقعت رکھتی ہے، جنہوں نے ایک راسخ العقیدہ دینی ماحول میں تربیت پائی تھی پھر مغربی تعلیم کے بہترین ہندوستانی مرکزوں میں اپنی تعلیم کا آغاز کیا۔ وہ اپنی خودنوشت سوانح میں لکھتے ہیں:

''حکومت برطانیہ مکمل مذہبی غیر جانبداری کی قائل اور علمبردار تھی، اور مذہبی حتیٰ کہ اخلاقی تعلیمات کو بھی بالکلیہ بے دخل کر کے اس نے (اس پالیسی) کو عملی جامہ پہنایا، صرف وہ معلومات، جن کو لڑکے از خود انگریزی اور مشرقی زبانوں کی درسی کتابوں میں پائے جانے والے لٹریچر سے اخذ کر لیں، رہ گئیں''۔

دوسری طرف وہ تعلیمی نظریہ جو حکومت نے ہندوستانی نوجوانوں کے لیے بہم پہنچایا تھا، 'جدید' تھا لیکن اپنی تمام تخریبی صلاحیت کے ساتھ ان کا سارا زور اس طرف تھا کہ طالب علم کے اندر ایک بیجا ہمہ

☆ اس کا اندازہ ان کے ان خطبات سے ہوسکتا ہے، جو انہوں نے مدراس میں دیے تھے، اور جن کا مجموعہ Reconstruction of Religious Thought in Islam کے نام سے شائع ہوا ہے، اور جس میں کہیں کہیں حقائق غیبی کی فلسفیانہ تعبیر اور تاویل کا شدید رنگ صاف جھلکتا ہے۔

دانی کا احساس پرورش پائے اور صدیوں پرانے توہمات کے ساتھ ساتھ روایت اور حجت وسند کی ساری عظمت کو ختم کردے۔ اس میں شبہ نہیں کہ رفتارِ زمانہ کے ساتھ یہ تعلیم حقیقت کی تلاش وجستجو کے ایک مخلصانہ جذبہ کو بیدار کرنے کا سبب بنی، لیکن اپنی پہلی یورش میں یہ خاص طور پر تخریبی ہی رہی ہے، اور ختم کیے ہوئے توہمات کے بدلہ میں جو تھوڑا بہت اس نے دیا وہ بذات خود بے بنیاد عقائد اور توہمات پر مبنی تھا، ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ تھوڑا بہت 'جدید' تھا☆۔

Islam in Modern History کا مصنف W.C. Smith جو اسلامی ممالک میں کام کرنے والے مختلف رجحانات اور وہاں کے مختلف طبقوں سے متعلق تازہ معلومات رکھتا ہے، اسلامی ممالک میں جدید مغربی تعلیم اور اس کے مرکزوں کے گہرے ذہنی اثر کا اعتراف کرتا ہے، وہ ممالک اسلامیہ کی حریت پسند تحریک (Liberalism) کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''ممالک اسلامیہ میں آزاد خیالی اور حریت پسندی کی جو تحریک چل رہی ہے، اس کا ایک اہم سبب اور عامل (Factor) مغرب کا نفوذ بھی ہے۔ یورپ میں حریت پسندی کی تحریک انیسویں صدی کے اواخر سے لے کر پہلی جنگِ عظیم تک اپنے نقطۂ عروج پر رہی ہے۔ یہی معاملہ یورپ کے تفوق اور ترقی کا ہے۔ بہت سے مسلمان نوجوانوں نے مغرب کا سفر کیا اور یورپ کی اسپرٹ اور اس کے اقدار سے انہوں نے واقفیت حاصل کی اور ایک حد تک وہ ان کے گرویدہ ہوئے۔ یہ بات ان طلباء پر خصوصیت کے ساتھ صادق آتی ہے جو روز افزوں تعداد کے ساتھ یورپ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم وتربیت حاصل کرتے رہے ہیں۔ ان کے ذریعہ مغرب کی بہت سی چیزیں دنیائے اسلام میں آئیں اور اس کام میں پیش پیش وہ تعلیمی ادارے تھے جنہوں نے ایک پوری نسل کی تربیت کی اور اس کو مغرب کے جدید طرز کے حوالہ کردیا۔ مغرب سے آنے والی چیزوں میں سے وہ متعدد نئے خیالات اور کم از کم اتنے ہی زیادہ اہم، نازک اور باریک خام ذہنی اندازے اور نئے میلانات تھے جن کو یہ مختلف تعلیمی اسٹائل پھیلانے کے ذمہ دار ہیں۔ مزید برآں مغرب کے دوسرے قانونی، سیاسی، اجتماعی اور دوسری قسم کے جدید اداروں کا بڑھتا ہوا اثر ونفوذ ان میں سے بعض تو زبردستی مسلط کیے جاتے ہیں اور بعض کے لیے کوشش کی جاتی ہے۔ بعض مسلمانوں نے اس کا مقابلہ کیا، بعض نے اس کا خیر مقدم کیا، بعض کو ایسی تربیت دی گئی یا انہوں نے خود تدریجی طور پر ان کو خوش آمدید کہا انجام کار بہت سے مسلمان

☆ My life, A Fragment p.23,24

ان نظریات اور اداروں کو مسلمہ حقائق سمجھنے لگے۔ اس طرح سے مغربیت کی کاروائی تیزی اور طاقت کے ساتھ جاری رہی''☆

لیکن ان چند مستثنیٰ شخصیتوں (اقبال و محمد علی وغیرہ) کو چھوڑ کر، جن کی 'فطرت ابراہیمی' یا خارجی مؤثرات و واقعات نے ان کے نورِ ایمان اور فہم اسلام کی حفاظت کی یا ان کے اندر مغرب کی تہذیب و فکر کے خلاف کوئی شدید ردعمل پیدا ہوا عام طور پر عرب اور عجمی ممالک کے ذہین مسلم نوجوانوں کو (جو اپنی قوم کا جوہر اور سرمایہ تھے) اس نظام تعلیم کے تیزاب نے اتنا بدل دیا کہ نہ اسلام (اپنی صحیح شکل وصورت میں) ان کے جدید ذہن میں فٹ ہوسکتا ہے، اور نہ وہ عام اسلامی معاشرہ میں فٹ ہوتے ہیں، اور بقول اقبال ؎

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہوگئے پانی

مذہب کے ایک پرائیویٹ معاملہ ہونے پر اصرار جس کو سیاست و ریاست میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں، دین اسلام کے ساتھ مسیحی کلیسا کا سا معاملہ، مذہب و سیاست کی تفریق کا نظریہ، مذہب کو ترقی، اکتشاف و تحقیق کی راہ میں حارج اور مخل سمجھنے کا خیال، علماء اسلام کو مسیحی کلیسا کے ان نمائندوں کی صف میں کھڑا کرنا جو قرون وسطیٰ میں مطلق العنان اقتدار کے مالک تھے، عورت کو بالکل مرد کے مساوی سمجھ کر اس کو زندگی کے تمام میدانوں میں دوڑنے اور حصہ لینے کا اہل اور مستحق سمجھنا، پردہ کو (خواہ وہ کسی شکل میں ہو) مشرق کے قدیم حرم کے نظام کی یادگار اور مردوں کے صنفی استبداد کا نشان سمجھنا اور اس کے ختم کرنے کو اصلاح و ترقی کا پہلا قدم تصور کرنا، اسلام کے قانون میراث اور ضابطۂ نکاح وطلاق کو قرونِ وسطیٰ کے مسلمان فقیہوں کا اجتہاد اور اس محدود اور ابتدائی معاشرہ کا طبعی نتیجہ سمجھنا جو ساتویں آٹھویں صدی مسیحی میں قائم تھا اور اس میں تبدیلی و ترمیم اور مغربی اصولوں اور معیاروں کے مطابق بنانے کے کام کو وقت کا ایک ضروری فریضہ قرار دینا، سود، شراب، قمار، جنسی تعلقات میں آزادی و بے قیدی کو زیادہ معیوب نہ سمجھ کر نظر انداز کرنا، قوم پرستی، قدیم (ماقبل اسلام) تہذیبوں اور زبانوں کے احیاء کا جذبہ اور لاطینی رسم الخط کی افادیت واہمیت پر یقین۔۔۔ یہ اور اس طرح کے بہت سے رجحانات (جو اس جدید تعلیم یافتہ نسل کے نزدیک) حقائق ومسلمات کا درجہ رکھتے ہیں، اور روشن خیالی اور ترقی پسندی کی علامت ہیں، مغربی نظام تعلیم اور (محمد اسد صاحب کے الفاظ میں) اس کے ذہنی و فکری ماحول اور فضا اور اس کے تاریخی ورثہ کا نتیجہ ہیں۔

☆ My Life, A Fragment p.64

آپ کو ترکی سے انڈونیشیا تک مسلمان ممالک کے جتنے سربراہ اور رہنما نظر آئیں گے وہ سب اسی مغربی نظامِ تعلیم کی پیداوار ہیں، ان میں سے جن کو براہ راست کسی مغربی ملک یا یورپ کے کسی مشہور تعلیمی مرکز میں پڑھنے اور پروان چڑھنے کا موقع نہیں ملا، انہوں نے اپنے ملک میں رہ کر اس نظام تعلیم سے (اس کے مخلص نمائندوں کی نگرانی و سرپرستی میں) پورا فائدہ اٹھایا ان میں سے متعدد اشخاص نے ملٹری کالجوں میں تعلیم پائی جہاں مغربی طرز کی تعلیم وتربیت کا خصوصی انتظام ہوتا ہے۔

اس بناء پر آج عالمِ اسلام میں دو ذہنوں، دو فلسفوں، دومعیاروں اور دو رُخوں کے درمیان جو کشمکش برپا ہے اور جو عام طور پر منتج ہوتی ہے، زیادہ طاقتور، مسلح، صاحبِ اختیار و اقتدار گروہ کی کامیابی پر، وہ بالکل قدرتی ہے۔ وہ اگر ہے تو خواہ کتنے تأسف کی بات ہو، تعجب کی بات نہیں، تعجب اس وقت ہوتا ہے جب کشمکش اور تجدد و مغربیت کا یہ رجحان پایا نہ جاتا۔

زہر کا تریاق

اس کا علاج (خواہ کتنا ہی مشکل اور کتنا ہی دیر طلب ہو) اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نظام تعلیم کو ازسر نو ڈھالا جائے۔ اس کو مسلمان اقوام کے عقائد و مسلمات اور مقاصد اور ضروریات کے مطابق بنایا جائے۔ اس کے تمام علوم ومضامین سے مادہ پرستی، خدا بیزاری، اخلاقی و روحانی اقدار سے بغاوت اور جسم پرستی کی روح نکال کر اس میں خدا پرستی، خداطلبی، آخرت کوشی، تقویٰ شعاری اور انسانیت کی روح پیدا کی جائے۔ زبان وادب سے لے کر فلسفہ ونفسیات تک اور علوم عمرانیہ سے لے کر معاشیات و سیاسیات تک سب کو ایک نئے سانچہ میں ڈھالا جائے۔ مغرب کے ذہنی تسلط کو دور کیا جائے، اس کی معصومیت و امامت کا انکار کیا جائے، اس کے علوم ونظریات کو آزادانہ تنقید اور جرأت مندانہ تشریح (پوسٹ مارٹم) کا موضوع قرار دیا جائے، (☆) مغرب کی سیادت و بالاتری سے عالمِ انسانی کو جو عظیم الشان نقصانات پہنچے ان کی نشان دہی کی جائے غرض مغرب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے علوم وفنون کو پڑھایا جائے اور اس کے علوم وتجارب کو مواد خام (Raw Material) فرض کر کے اپنی ضرورت اور اپنے قد وقامت اور اپنے عقیدہ ومعاشرت کے مطابق سامان تیار کیا جائے۔

☆ ڈاکٹر رفیع الدین صاحبؒ کی فاضلانہ کتاب 'قرآن اور علم جدید' اس کا اچھا نمونہ ہے، محمد اسد صاحب کی Islam at the Cross Roads، مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی 'تنقیحات' اور 'پردہ' اور سید قطب کی 'العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام' میں بھی مغربی فکر اور افکار و اقدار پر تنقیدی مواد ملتا ہے۔

اس عظیم کام میں خواہ کتنی ہی مشکلات ہوں اور اس میں خواہ کتنی دیر لگے عالمِ اسلام میں تجدد و مغربیت کی اس عالمگیر رَو کا اس کے سوا کوئی علاج نہیں جو اسلام کے وجودِ ملی اور اس کے اجتماعی ڈھانچہ کو چیلنج کر رہی ہے اور اس کے لیے شدید خطرہ بلکہ موت و حیات کا مسئلہ بن گئی ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان عوام کا خلوص، ان کی قربانیاں ان کا جذبہ اور ان کی قوت عمل (جس کے سر ان ملکوں کی آزادی اور سلطنتوں کے قیام کا سہرا ہے) اس روشن خیالی و تجدد کی آگ کا ایندھن بن کر رہ گئی ہے اور یہ سادہ دل، بے زبان، گرم جوش اور مخلص عوام ان قائدین اور حکمرانوں کے ہاتھ میں بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ بن کر رہ گئے ہیں جن کو جس منزل کی طرف چاہا جاتا ہے خاموشی کے ساتھ ہنکایا جاتا ہے۔

ہندوستان میں انگریزی حکومت کی کامیابی اور استحکام کا راز سول سروس کے طبقہ اور حکام کی مغربی تربیت، سلیقہ مندی اور اطاعت شعاری میں تھا انہوں نے اس ملک کا سانچہ بنایا اور سو برس تک کامیابی کے ساتھ اس ملک کو اس کے غیر ملکی حکمرانوں کے منشا اور مزاج کے مطابق چلاتے رہے، اب بھی اسلامی ممالک کے رُخ کی تبدیلی اور اسلامی فکر اور اسلامی زندگی کی طرف ان کو لے چلنے کی تدبیر یہی ہے کہ اس طبقہ کی اسلامی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جائے جس کے ہاتھ میں ملک کی رہنمائی اور اس کے زمام کار آنے والی ہے اور اس نظام تعلیم کو درست کیا جائے جو اس طبقہ کو تیار کرتا ہے۔

نظام تعلیم کی یہ بنیادی تبدیلی اور اس کی اسلامی تشکیل اگرچہ نہایت ضروری ہے مگر دیر طلب اور طویل کام ہے، اور اس کے لیے وسیع و عظیم صلاحیتوں اور وسائل کی ضرورت ہے، جدید اسلامی نسل کا معاملہ ایک دن کی تاخیر اور التواء کا روادار نہیں، مندرجہ بالا کام کی تکمیل تک (اور حقیقتاً اس کی موجودگی میں بھی) یہ کام ان اسلامی اقامت خانوں (Muslim Hostels) سے لیا جاسکتا ہے جن میں یونیورسٹیوں اور کالجوں کے مسلم طلبہ قیام کریں اور وہاں اسلامی تربیت اسلامی زندگی اور ماحول کے قیام اور صالح ذہنی و روحانی غذا کے مہیا کرنے کا خاص اہتمام کیا جائے (ختم شد)۔

اویس قریشی

پاکستان میں تعلیم کی بربادی

پاکستان میں طبقاتی نظام تعلیم مختلف حکومتوں کے بلند بانگ دعوؤں کے باوجود دم توڑنے کی بجائے وقت کے ساتھ ساتھ مزید پنپ رہا ہے۔ پنجاب سمیت چاروں صوبوں کے سرکاری سکول صرف کلرک پیدا کر رہے ہیں اور چند بڑے پرائیویٹ سیکٹر کے سکول بھاری بھرکم فیسیں لے کر ایک مخصوص ایلیٹ کلاس کو پروموٹ کر رہے ہیں۔ ملک کی دو بڑی جماعتوں نے ہر مرتبہ برسراقتدار آنے پر ملک میں یکساں پرائیویٹ اور پبلک سیکٹر میں ایک ہی قومی نصاب کو لازمی قرار دینے کے لیے قانون سازی کے نعرے لگائے مگر بدقسمتی سے 63 برس گزرنے پر بھی پرائیویٹ سکولوں میں ہی طرح طرح کے نصاب پڑھائے جاتے ہیں اور حکومتی کنٹرول نہ ہونے اور وفاقی وصوبائی سطح پر کوئی مؤثر چیک اینڈ بیلنس کی پالیسی عدم دستیابی کے باعث پرائیویٹ سیکٹر میں سکولوں اور ہائر ایجوکیشن جن میں کالجز اور یونیورسٹیاں شامل ہیں جنگل کا قانون نافذ ہے اور شتر بے مہار کی طرح ہر ادارے نے اپنے اپنے سٹیٹس کے حساب سے اپنا نصاب اور اپنی فیس مقرر کر رکھی ہے۔

بڑھتی ہوئی مہنگائی کے باعث 40 فیصد سے زائد متوسط طبقے کے والدین نے اوسط پرائیویٹ سکولوں کی بھی فیسیں ادا نہ کر سکنے کے باعث اپنے بچوں کو سرکاری سکولوں میں داخل کروایا ہوا ہے اور یونیورسٹیاں سالانہ لاکھوں روپے وصول کر رہی ہیں۔ وفاقی وصوبائی حکومت کے متعلقہ ذمہ داران سمیت کوئی نوٹس بھی نہیں لے رہا۔ مندرجہ ذیل اعداد وشمار سے گھمبیر ہوتی ہوئی تعلیمی صورت حال کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے:

اہم اعداد وشمار ــــ ایک نظر میں

پاکستان میں سرکاری سکولوں کی تعداد	1,54,000
لاہور میں پرائیویٹ سکولز	18,000
رجسٹرڈ پرائیویٹ سکولز	6,500
لاہور میں سرکاری سکول	1,020

پنجاب میں سرکاری سکولز	63,000
پنجاب میں پرائیویٹ سکولز	86,000

لاہور میں خصوصی امراء کے سکولوں کی فیس	4,000 ڈالر سالانہ
لاہور میں امراء کے سکولوں کی فیس	25,000 - 20,000 روپے ماہانہ
اعلیٰ متوسط طبقے کے سکولوں کی فیس	10,000 - 6,500 روپے ماہانہ
پرائیویٹ میڈیکل کالجوں کی فیس	8,00,000 - 5,00,000 روپے سالانہ
اوورسیز طالب علموں کی فیس	17,000 - 12,000 ڈالر سالانہ

(بشکریہ نوائے وقت)

ڈاکٹر محمد امین

صحافت یا بکاؤ مال

اس میں کوئی شک نہیں کہ اہل مغرب (امریکہ و یورپ) اور ان کے حلیفوں (اسرائیل و بھارت وغیرہ) کی اسلام اور مسلم دشمنی مسلمہ ہے اور پاکستان دشمنی بھی اسی کا ایک شاخسانہ ہے کیونکہ پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا اور (اپنی ساری کمزوریوں کے باوجود بہرحال) اپنے اسلامی تشخص سے دستبردار ہونے پر تیار نہیں اور ہم محض 'سازش تھیوری'☆ کے طعنے سے بچنے کی خاطر اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ اہل مغرب اور ان کے حلیف اسلام اور مسلمانوں کو زک پہنچانے کی خاطر ہر قسم کی سازشوں میں مصروف رہتے ہیں جن میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ رشوت دے کر ہمارے اندر پھوٹ ڈالتے ہیں، ہم میں سے کچھ مسخ فطرت کے حامل لوگوں کو خرید کر اپنا آلۂ کار بنا لیتے ہیں اور یوں ہمیں کمزور کر کے اور بعض اوقات ننگی جارحیت سے کام لے کر ہم پر غلبہ پانے میں کامیاب رہتے ہیں ـــ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم اس حماقت میں مبتلا ہونے پر بھی تیار نہیں کہ اس صورت حال کا ذمہ دار ہم صرف بیرونی عوامل اور عناصر کو قرار دیں اور اپنی داخلی کمزوریوں کا اعتراف کرتے ہوئے یہ نہ تسلیم کریں کہ اس کی بنیادی اور حقیقی وجہ ہماری داخلی یعنی اخلاقی اور ایمانی کمزوری ہے اور اگر ہمارے بعض عناصر جاہ و مال کی خاطر بے حمیتی، دین فروشی، اخلاقی زوال کی انتہا اور ملت وقوم فروشی پر نہ اتر آئیں تو بیرونی عناصر کی سازشیں اور ان کی جارحیت شائد اتنی آسانی سے کامیاب نہ ہو سکے۔ لہٰذا ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہماری شکست اور ہمارے زوال میں بڑا ہاتھ ان میر جعفروں اور میر صادقوں کا ہے جو اپنے ذاتی اور حقیر مفاد اور اقتدار کی خاطر ملک دشمنی اور ملت فروشی پر اتر آتے ہیں اور دنیا و آخرت کی رسوائی مول لینے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

ہماری اس تحریر کا محرک معروف ادیب و دانشور جناب عطاء الحق قاسمی صاحب کا وہ کالم بنا ہے جو انہوں نے ''ماتھے پر برائے فروخت کا ٹیگ'' کے عنوان سے لکھا ہے اور جس میں قاسمی صاحب نے اس تلخ حقیقت کی بعض تفصیلات کا انکشاف کیا ہے کہ کس طرح ہماری خفیہ ایجنسیاں صحافیوں کو خریدتی ہیں اور ان کے ضمیر کی قیمت لگاتی ہیں اور کس طرح بعض بے کردار صحافی اپنے قلم کی عصمت فروخت

☆ یہ رجحان کہ ہر بات کے ڈانڈے کسی نہ کسی بیرونی سازش سے ملائے جائیں اور داخلی وجوہات کی بجائے خارجی عناصر کو مورد الزام ٹھہرایا جائے۔

کر کے محض چند ٹکوں کی خاطر بے ضمیری پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ محض پیسوں کی خاطر اپنی فکر اور اپنی دیانت دارانہ رائے چھوڑ کر الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے ادارے کے کسی مالک کا کسی دوسری رائے کے اظہار کی پالیسی قبول کرنا اور اسی طرح کسی صحافی کا اس طرح کی رائے کا اظہار کرنا بلاشبہ ضمیر فروشی اور قلم و زبان کی عصمت کو فروخت کرنا ہے، یہ دنیا کا گھٹیا ترین کام ہے، جرم ہے اور ایسا کرنے والا اگر دنیا کے کسی قانون و ضابطے کی زد میں نہ بھی آئے یا ان سے بچ بھی جائے تو نہ صرف اپنے ضمیر کا مجرم ہوتا ہے بلکہ اس احکم الحاکمین کی اس عدالت سے بھی کل بچ نہ پائے گا۔ جس دن ہاتھ اور پاؤں بولیں گے اور جس کے بارے میں ہمارا ایمان ہے کہ وہ دن ضرور آئے گا۔ ہم یہ عرض کررہے ہیں کہ یہ کام اگر اسلامی جمہوریہ پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں کے لیے کیا جائے تو بھی ناقابل قبول ہے، شنیع ہے، قابل مذمت ہے لیکن اگر یہ ان بیرونی ایجنسیوں کے لیے کیا جائے جن کا ایجنڈا اسلام اور مسلم دشمنی اور پاکستان دشمنی ہے تو اس امر کی شناعت اور بُرائی میں ہزاروں گنا اضافہ ہوتا ہے۔ یہ دین اور ملت فروشی کی بدترین قسم ہے جو کسی بھی شریف اور بھلے مانس مسلمان تو کیا کسی انسان کے لیے بھی قابل قبول نہیں ہوسکتی خواہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔ ایسا کام صرف وہی شخص کرسکتا ہے جو بے ضمیر ہو، اخلاقی حس سے عاری ہو، بے حمیت ہو اور ننگِ انسانیت ہو جس کا پیسے کے سوا کوئی دین و مذہب نہ ہو، اسلام تو بڑی اونچی اور بڑی دور کی چیز ہے۔

ان ٹی وی چینلز اور اخبارات کے مالکان، صحافیوں اور کارکنان کا مسلمان ہونا اور اسلام کا دعویٰ کرنا کتنا بامعنی اور باوزن ہوسکتا ہے جو عریانی اور فحاشی پھیلاتے ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں فرماتے ہیں کہ ''جو لوگ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں بے حیائی کا چرچا ہو ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک سزا ہے'' (النور۲۴: ۱۹)۔ اور وہ ان یہود و نصاریٰ و کفار کی پالیسیوں کو درپردہ مسلمانوں کے لیے قابل قبول بنا کر پیش کرتے ہیں اور ان کے اصل عزائم کو چھپاتے اور انہیں مسلمانوں کا خیر خواہ اور دوست باور کراتے ہیں جب کہ اللہ کہتا ہے کہ ''یہودی اور عیسائی اس وقت تک تم سے راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کا مذہب نہ اختیار کرلو۔۔۔ اور اگر تم اللہ کی طرف سے صحیح علم آجانے کے بعد بھی ان کی خواہشوں کے پیچھے چلو گے تو اللہ کے مقابلے میں تمہارا نہ کوئی حمایتی ہوگا اور نہ کوئی مددگار'' (البقرۃ ۲۰: ۱۲۰)۔ اور یہ کہ ''تم اہل کتاب سے دوستی رکھتے ہو مگر وہ تم سے دوستی نہیں رکھتے۔۔۔ جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم صاحبِ ایمان ہیں مگر جب آپس میں ملتے ہیں تو تمہارے

خلاف غصے سے اپنی انگلیاں چباتے ہیں'' (آلعمران ۳:۱۱۹)۔ وہ دن رات ان کے اس نظام سرمایہ داری کے مختلف نظریات و مظاہر کے حق میں پروپیگنڈا کرتے ہیں جن کی بنیاد حبّ دنیا پر ہے جب کہ اللہ کہتا ہے کہ ''جس نے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی کو (آخرت پر) مقدم سمجھا تو اس کا ٹھکانا دوزخ ہے'' اور یہ کہ ''دنیا کی زندگی محض کھیل تماشا ہے اور آخرت بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔ کیا تم عقل نہیں کرتے؟'' (الانعام ۶:۳۲)۔

کیا اس صورت حال کا کوئی حل نہیں؟ حل کیوں نہیں؟ اگر حکومت چاہے تو اسلام اور نظریۂ پاکستان کے مطابق ایک ثقافتی پالیسی وضع کر سکتی ہے، اخبارات و جرائد اور ٹی وی چینلز کی سخت نگرانی کر سکتی ہے، اور خلاف ورزی کرنے والوں کے معاملات عدالت میں لا کر انہیں سزا دلوا سکتی ہے لیکن اس کام کی سیاست دانوں اور حکمرانوں سے کیا توقع کی جائے کہ وہاں تو پہلے ہی میر جعفروں اور میر صادقوں کی بھرمار ہے جو اپنی کرسی کے لیے ملک توڑ دیتے ہوں اسے بیچ دیتے ہوں اور جو ڈالروں کے لیے اپنی بہو بیٹیاں تک فروخت کر دیتے ہوں اور جن کے بیرون ملک حسابات اور جائیداد کے چرچے ساری دنیا میں ہوں اور جو اپنے اقتدار کے لیے ووٹوں اور نشستوں کی خرید و فروخت کو شیر مادر کی طرح اپنا حق سمجھتے ہوں، جن کی آنکھیں مغربی فکر و تہذیب کی چکا چوند سے خیرہ ہو چکی ہوں اور جنہیں اسلامی اصول و نظریات کی حفاظت کی ذرا فکر نہ ہو وہ دوسروں کا احتساب کیا کریں گے؟ اس کے لیے اب سوسائٹی کے محبّ اسلام اور محبّ وطن عناصر کو متحد اور متحرک ہونا پڑے گا اور رائے عامہ کو بیدار کر کے ادارے بنانے ہوں گے، میڈیا کی سرگرمیوں کی نگرانی کرنا ہوگی، ان کے دفتروں کے آگے احتجاج کرنا ہوگا اور عوامی دباؤ کے ذریعے ان کی اصلاح کرنا ہوگی اور صحافیوں کے بھیس میں چھپے غیر ملکی ایجنٹوں اور ایجنسیوں کے مہروں کو پکڑنا ہوگا ورنہ یہ ملک و ملت اور اس کے نظریات و اقدار کو بیچ کھائیں گے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ معاشرہ اگر متحد و متحرک ہو جائے تو وہ سارے کام پرائیویٹ سیکٹر میں بھی کیے جا سکتے ہیں جن کی توقع ہم حکومت سے کرتے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ معاشرہ کے دین دار عناصر متحد و متحرک ہو جائیں اور یہ کام کر گزریں۔

مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی

اتحاد بین العلماء کے لیے سعی و جہد

۱۹۸۶ء میں ناچیز کراچی سے سفر کر کے مولانا سرفراز خاں صفدرؒ کی خدمت میں گکھڑ منڈی خاص اس مقصد کے لیے حاضر ہوا کہ دیوبندی اور بریلوی مکاتبِ فکر کے درمیان جو خلیج بڑھتی جارہی ہے اسے کم بلکہ ختم کرنے کی راہ تلاش کی جائے۔ اس مقصد کے لیے پہلے بھی ہماری کئی ملاقاتیں مولانا مفتی محمد حسین نعیمی صاحب سابق مہتمم دارالعلوم نعیمیہ لاہور، مفتی ظفر علی نعمانی صاحب سابق مہتمم دارالعلوم امجدیہ کراچی، علامہ عبدالمصطفیٰ الأزہری صاحب سابق شیخ الحدیث دارالعلوم امجدیہ کراچی اور مولانا محمد شفیع اوکاڑوی صاحب وغیرھم۔ رحمهم الله۔ سے ہوچکی تھیں، ان سب حضرات کا تعلق بریلوی مکتبۂ فکر سے ہے، ان ملاقاتوں سے میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ عقائد کے باب میں دونوں مکاتبِ فکر کا اختلاف بڑی حد تک صرف تعبیر اور الفاظ کا اختلاف ہے، حقیقت میں ایسا کوئی اختلاف عقائد کے باب میں نہیں ہے کہ جس کی بناء پر ایک دوسرے کو گمراہ اور فاسق قرار دیا جائے۔ ہاں! بہت سے اعمال میں یہ اختلاف ضرور ہے کہ ہم انہیں بدعت کہتے ہیں، اور ان کے نزدیک وہ بدعت میں داخل نہیں۔

مولانا مفتی محمد حسین نعیمی رحمۃ اللہ علیہ نے تو مجھ سے اور برادر عزیز مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب سے پوری وضاحت سے یہ کہا تھا کہ ہمارے اور آپ کے درمیان اختلاف کا باعث حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب 'حفظ الایمان' کی چند سطری عبارت ہے۔ اس عبارت کو بیچ سے نکال دیا جائے تو پھر ہمارے اور آپ کے درمیان عقائد کا کوئی اختلاف نہیں۔ اس پر ہم نے ان سے کہا تھا کہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ہمارے سرتاج ہیں، اور ان کی اُس عبارت کے جو معنیٰ بہت سے حضرات نے بیان کیے ہیں، ہمیں یقین ہے کہ حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اُس باطل معنیٰ کے مراد لینے سے بالکل بری ہیں، اور حضرت حکیم الامت جیسی حُبِّ رسول سے سرشار شخصیت کے بارے میں دور دور امکان نہیں کہ انہوں نے ایسے غلط معنیٰ مراد لیے ہوں۔ اس عبارت کے جو صحیح معنیٰ ذرا سی توجہ سے سمجھ میں آجاتے ہیں، وہی حضرت کی بھی مراد ہے، چنانچہ انہوں نے بعد میں اس کی وضاحت بھی فرمادی تھی اور اُس غلط معنیٰ سے مکمل

برأت کا بھی دوٹوک اعلان فرمادیا تھا، لیکن اگر ان کی اس عبارت کو شائع کرنے سے روک دینا، امت کو پھوٹ سے بچانے، اور ان دونوں مکاتبِ فکر کو متحد کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے تو یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔ اس کی عملی شکل کیا ہوگی؟ اس کے لیے مشورے کی ضرورت ہے۔ ہمیں اور آپ کو مل کر اس کے لیے پیش رفت کرنی چاہیے، اور طے ہوا تھا کہ دونوں طرف کے علماء کرام کا اجتماع اس غرض کے لیے بلایا جائے گا۔ لیکن ملک میں اچانک ایسے حالات پیش آئے اور آتے گئے کہ یہ کام آگے نہ بڑھ سکا۔

پھر صدر ضیاء الحق صاحب مرحوم کے دور میں بریلوی مکتبۂ فکر کے مشہور عالم دین مولانا محمد شفیع اوکاڑوی صاحبؒ نے مجھ سے اسلام آباد میں علماء کنونشن کے موقع پر ملاقات فرمائی، جو ہماری پہلی اور آخری ملاقات ثابت ہوئی، کیونکہ اس کے تقریباً ڈیڑھ دو مہینے بعد ان کا کراچی میں انتقال ہوگیا۔ اس ملاقات میں مولانا اوکاڑوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ سے واضح الفاظ میں فرمایا تھا کہ امت میں پھوٹ پڑی ہوئی ہے، مجھے خطرہ ہے کہ اس بارے میں آخرت میں پوچھ ہوگی۔ مَیں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں اپنی تقریروں میں بار بار سخت کلامی کی ہے، لیکن جب میں نے ان کی کتابوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا تو میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہمارے اور ان کے عقائد میں کوئی فرق نہیں۔ اور ان کی کتاب 'حفظ الایمان' کی جو چند سطری عبارت اب تک کشیدگی کا باعث بنی رہی ہے، اُس کے بارے میں مولانا اوکاڑوی صاحب نے فرمایا کہ اب تو خود حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ہی کے قلم سے اس کی ایسی توضیح اور توجیہ شائع ہوگئی ہے اس کے بعد یہ عبارت بھی نزاعی نہیں رہی، اس لیے مجھے آپ دونوں بھائیوں سے توقع ہے کہ اگر ہم مل جل کر کام کریں تو امت کو پھوٹ سے بچایا جاسکتا ہے، ورنہ اللہ کے یہاں ہم سے پوچھ ہوگی۔

میں نے ان سے کہا تھا کہ یہ تو آپ میرے دل کی بات کہہ رہے ہیں، ہمارے والد ماجد مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی زندگی کے آخری کئی سال اس کوشش میں صَرف فرمائے ہیں، اور میں بھی کئی سال سے اس کاوش میں لگا ہوا ہوں، چنانچہ میرے اور مولانا اوکاڑوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درمیان طے ہوا کہ وہ اور ہم اپنے اپنے رفقاء اور اہل علم سے رابطہ کر کے اس میں پیش رفت کریں گے، پھر دونوں طرف کے خاص خاص علماء کرام کا مشترکہ اجلاس ہوگا، پھر نسبتاً بڑے پیمانے پر دونوں طرف کے حضرات کا دوسرا اجلاس ہوگا، ان اجلاسوں میں اتفاق ہوجانے کے بعد ملک گیر پیمانے پر دونوں طرف کے علماء و مشائخ کا کنونشن بلا کر اس میں

اعلان کر دیا جائے گا کہ عقائد میں اب ہمارا کوئی اختلاف نہیں۔لیکن کراچی واپس آ کر ناچیز کا اہل علم سے مشوروں کا سلسلہ جاری ہی تھا، اور اس کا طریقۂ کار بڑے پیمانے پر طے کیا جا رہا تھا کہ مولانا محمد شفیع اوکاڑوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اچانک وفات ہوگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ ان کی کامل مغفرت فرمائے۔

بعدازاں ان کے صاحب زادے مولانا کوکب نورانی صاحب سے کئی ملاقاتیں ہوئیں، وہ بھی کئی بار دارالعلوم کراچی تشریف لائے اور ہر بار مولانا محمد شفیع اوکاڑوی صاحب کی اس ملاقات کا ذکر آیا لیکن افسوس ہے کہ اس کے بعد کوئی عملی پیش رفت نہ ہوسکی اور دشمنانِ اسلام کی سازشوں اور مسلمانوں کی سادہ لوحی یا جذباتیت کے باعث یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہم خواتین کی تعلیم کے مخالف نہیں

کالعدم تنظیم تحریک طالبان پاکستان نے کہا ہے کہ وہ کبھی بھی خواتین کی تعلیم کے مخالف نہیں رہے بلکہ وہ صرف سیکولر اور مغربی تعلیم کے خلاف ہیں جس میں ساری توجہ صرف دنیاوی تعلیم پر دی جاتی ہے۔ یہ بات ترجمان احسان اللہ احسان نے سوات کی طالبہ ملالہ یوسف زئی کو عالمی امن ایوارڈ کے لیے نامزدگی کے تناظر میں کہی۔ (بی بی سی/نوائے وقت لاہور، ۲۰ نومبر ۲۰۱۱ء)

ڈاکٹر محمد امین

علماء کرام خبردار رہیں

امریکی اشیر باد سے کام کرنے والی این جی اوز علماء اور دینی مدارس پہ کام کر رہی ہیں

سنٹر فار امریکن پروگریس (Center for American Progress) نامی ایک امریکی تھنک ٹینک نے پچھلے دنوں اُن امریکی تھنک ٹینکس کی 'تحقیق' سرگرمیوں کا بھانڈا پھوڑ دیا جو اسلام اور مسلم دشمنی کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اور کسی دن اُن تھنک ٹینکس کی سرگرمیوں کی تفصیلات بھی ان شاء اللہ کوئی امریکی ادارہ ہی مہیا کر دے گا جو امریکی ادارے مسلم ممالک خصوصاً پاکستان میں جاری رکھے ہوئے ہیں۔

امریکہ و یورپ کے بعض پاکستانی موالیوں نے ان کی مالی معاونت سے ایسے ادارے اور این جی اوز بنا رکھی ہیں جو ان مغربی تھنک ٹینکس اور اداروں کے لیے کام کرتی ہیں۔ یہ لوگ پاکستان میں ہر شعبے میں کام کرتے ہیں اور ان میں سے بعض علماء اور دینی مدارس پہ بھی کام کر رہے ہیں۔ علماء کرام کو پتہ بھی نہیں چلتا اور وہ اسے ایک نیک دینی کام سمجھ کر ان سے تعاون کرتے ہیں اور ان کے پروگراموں میں شریک ہوتے ہیں۔ یہ خاصا لمبا کھکھیڑ ہے اور اس کی تفصیلات میں جانے کے لیے خاصی محنت اور وسائل کی ضرورت ہے۔ فوری طور پر جو چند چیزیں ہمارے علم میں آئی ہیں وہ ہم علماء کرام کے علم میں لا رہے ہیں تا کہ وہ خبردار رہیں۔

ڈیڑھ دو سال پہلے ایک امریکی ادارے نے ایک دینی جماعت کے اسلام آباد کے ایک ادارے سے مل کر پی سی بھور بن میں دینی جرائد کے ایڈیٹرز کی تین روزہ کانفرنس رکھی تھی۔ اس کا دوسرا اجلاس نیپال میں ہوا تھا۔ گوجرانوالہ سے شائع ہونے والے ایک دینی جریدے کے ایڈیٹر صاحب نے نہ صرف ان پروگراموں میں شرکت کی بلکہ ان کی رودادیں، ان کے 'تعمیری' اور 'اچھے' پہلوؤں کو ابھارتے ہوئے شائع کی تھیں۔ اسلام آباد کے اسی ادارے کی ایک ٹیم نے امریکیوں کے لیے کام کرتے ہوئے اسلامی یونیورسٹی میں کئی ورکشاپس منعقد کیں، دینی مدارس کے دورے کیے اور وہاں تربیتی اجلاس رکھے۔ لاہور کا اجلاس جامعہ لاہور الاسلامیہ (رحمانیہ) کی لائبریری میں ہوا تھا۔ پھر اسی یونیورسٹی کے ایک تحقیقی شعبے نے ایک امریکی تھنک ٹینک کے کہنے پر لاہور اور وسطی پنجاب کے دیوبندی مدارس کا

ایک سروے کرایا تا کہ یہ دیکھا جائے کہ طالبان کے کتنے اثرات یہاں تک پہنچے ہیں؟ ایک اسکیم کے تحت اس 'اسلامی' یونیورسٹی میں ایسے لوگ امریکہ سے یا امریکہ ٹرینڈ اعلیٰ انتظامی عہدوں پر لائے گئے ہیں جو اسے ایک 'سیکولر' اور 'ماڈرن' یونیورسٹی بنا رہے ہیں اور اس میں وہ تقریباً کامیاب ہو چکے ہیں۔

اسی طرح کا ایک اسلام آبادی ادارہ آج کل فروغ امن کے نام پر تکفیر کے خلاف کام کر رہا ہے اور امریکی و حکومتی مؤقف کی حمایت کرنے والے علماء کے ساتھ ساتھ عام علماء کو بھی ہوٹلوں میں رکھے جانے والے شاندار پروگراموں میں بلا رہا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ سارے مسالک کے علماء کرام کو طالبان کے خلاف جمع کیا جائے جو علاقے میں امریکی غلبے کے خلاف لڑ رہے ہیں اور ان کے مقامی سیاسی اور عسکری حلیفوں کے خلاف کفر و جہاد کا فتویٰ دیتے ہیں۔

ہم یہ باتیں علماء کرام کے علم میں اس لیے لا رہے ہیں تا کہ وہ ان لوگوں کی چالوں سے ہوشیار رہیں اور یا تو ان کے اجلاسوں کا بائیکاٹ کریں یا مل کر ان کے مؤقف کو جھٹلائیں اور ان کے منصوبوں کو ناکام بنائیں۔

Settings\8822\My Documents\Dr.Amin Sb\Safa Islamic Center\Arabic final Add.jpg not found.

پاکستانیات / مکالمہ

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

کیا جمہوریت کے ذریعے اسلامی انقلاب ممکن ہے؟

یہ ایک اہم اور زندہ موضوع ہے جس پر سنجیدہ غور وفکر کی ضرورت ہے۔ جو مکالمہ ہم یہاں دے رہے ہیں وہ جماعت اسلامی سے ہمدردی رکھنے والے دو دانشوروں کے درمیان ہے اور انہوں نے جماعت ہی کے حوالے سے گفتگو کی ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ایک وسیع الاطراف موضوع ہے۔ یہ پاکستان کی ساری دینی سیاسی جماعتوں کا مسئلہ ہے بلکہ ایک لحاظ سے سارے عالم اسلام کا مسئلہ ہے کہ ترکی میں ایک اسلامی جماعت برسراقتدار ہے، تیونس میں ایک اسلامی جماعت اکثریت حاصل کر چکی ہے اور مصر اور دوسری جگہوں پر اسلامی تحریکوں کی جدوجہد جاری ہے بلکہ خود پاکستان کے ایک صوبے میں دینی جماعتیں برسراقتدار رہ چکی ہیں۔ لہٰذا اس سوال پر غور وفکر ضروری ہے کہ کیا مغربی جمہوریت کے ذریعے (جس میں چند لفظی آئینی تبدیلیاں کر کے اسے 'اسلامی جمہوریت' قرار دے دیا گیا ہے) اسلامی انقلاب (یا غلبۂ اسلام/ نفاذ شریعت/ نظام مصطفیٰ وغیرہ) کی منزل حاصل کی جا سکتی ہے؟ اس حوالے سے ایک مکالمہ تو آپ ابھی ملاحظہ فرمائیے ہم اپنی رائے کا اظہار، ان شاء اللہ، البرہان کے اگلے شمارے میں کریں گے۔ امین

فرائیڈے سپیشل مورخہ ۹ تا ۱۵ ستمبر میں جناب شاہ نواز فاروقی صاحب نے اپنے مضمون 'جماعت اسلامی کی بے مثال نظریاتی، تاریخی اور سیاسی جدوجہد' کے عنوان سے جس بحث کا آغاز کیا ہے وہ نہایت اہم ہے۔ انہوں نے جماعت کی طاقت کے جو مظاہر گنوائے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ مولانا مودودیؒ کا تصور اسلام بحیثیت ایک نظام حیات جو عالم پہ غلبہ کا متقاضی ہے۔ جو عملاً ممکن ہے اور اب ایک عالمگیر عمل بن گیا ہے، بقول جناب فاروقی ''جماعت اسلامی کی رسائی دنیا کی کسی بھی دوسری پارٹی سے بڑھ کر ہے'' (صفحہ ۱۱)۔

۲۔ ''پاکستان کے اسلام کے نام پر وجود میں آنے کی بات جو جماعت اسلامی کے زبردست پروپیگنڈا کا حاصل ہے۔ صحیح نہیں ہے تاہم پاکستان کے نظریاتی تشخص، دفاع اور فروغ کے حوالے سے جماعت اسلامی کو اہم مقام حاصل ہے'' اور لبرل و کمیونسٹ حضرات جماعت اسلامی کو اپنا اصل حریف گردانتے ہیں (صفحہ ۱۱)۔

۳۔ جماعت اسلامی نے طلبہ اور مزدور یونینوں میں کمیونسٹ اور لبرل عناصر کو شکست دی ہے (صفحہ ۱۱)۔

۴۔ جماعت اسلامی نے دستوری اور جمہوری جدوجہد اور مہمات میں کلیدی کردار ادا کیا ہے اور جماعت اسلامی کے تعاون کے بغیر جمہوری اور اسلامی اتحاد کو فعال کرنا ناممکن رہا ہے (صفحہ ۱۲)۔

۵۔ جماعت اسلامی اتحاد امت کی علامت ہے اور تمام انسانیت کو متحد کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے (صفحہ ۱۲)۔

۶۔ جماعت اسلامی میں پیہم انتخابی شکستوں کو جذب کرنے کی غیر معمولی صلاحیت ہے (صفحہ ۱۲)۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ طاقت ایک کثیر الجہتی تصور ہے۔ طاقت کے لغوی معنی 'مقصد کو حاصل کرنے کی صلاحیت ہے' جماعت اسلامی کا مقصد وجود 'حصول رضائے الٰہی' ہے ان معنوں میں جماعت اسلامی یقیناً طاقتور ہے کہ اس کے مخلص متوسلین جماعت کا ساتھ دے کر اللہ کی رضا کے حصول کے لیے جدوجہد کرتے ہیں اور ان شاء اللہ اس مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں لیکن جماعت اسلامی ان معنوں میں طاقتور نہیں ہے کہ حصول رضائے الٰہی کو بحیثیت مقصد فروغ دینے کے لیے اس نے جو طریقہ کار وضع کیا ہے وہ معاشرتی اور ریاستی غلبہ حاصل کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر آنے والے دن کے ساتھ یہ طریقہ زیادہ غیر مؤثر ہوتا جا رہا ہے۔

میری یہ رائے بھی ہے کہ جماعت اسلامی نے جو طاقت جدوجہد سے حاصل کی ہے وہ دن بہ دن محدود ہوتی جا رہی ہے اور اگر ہم نے اپنے نظریات اور رائج شدہ حکمت عملی پہ نظر ثانی نہ کی تو عنقریب ہم معاشرتی اور ریاستی سطح پر قطعاً مفلوج ہو کر رہ جائیں گے۔

محترم فاروقی صاحب نے جماعت اسلامی کی جن طاقتوں کا تذکرہ فرمایا ہے اگر ہم ان کا تجزیہ کریں تو جماعت اسلامی کے طریق کار کی بڑھتی ہوئی فرسودگی (obsolence) واضح ہو جاتی ہے۔ طریق کار کی اس فرسودگی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ گو کہ مولانا مودودیؒ نے مغرب کو جاہلیت خالصہ قرار دیا لیکن مغربی فکر اور عمل کی جو تنقید مولانا مودودیؒ نے پیش کی ہے وہ ایک نامکمل اور جزوی تنقید تھی۔ مولانا مودودیؒ کی اس جزوی تنقید کی سب سے اہم مثال آپ کی سیاسی فکر میں موجود ہے۔ آپ اسلام کو ایک مکمل ضابطۂ حیات کے طور پر پیش کرتے ہیں لیکن اس نظام حیات کی تنفیذ کے لیے ایک جمہوری ریاستی عمل کو کافی سمجھتے ہیں۔ آپ کا تصور انقلاب ان معنی میں محدود ہے کہ آپ سرمایہ دارانہ جمہوری ریاستی نظام کے انہدام کو ضروری نہیں سمجھتے بلکہ اسی ریاستی نظام کے کلیدی اداروں (انتظامیہ، عدلیہ اور مقنّنہ) کو غلبۂ دین کا آلہ بنانے پر زور دیتے ہیں۔ چونکہ مولانا مودودیؒ کی فکر میں تنویری طریقہ علمیت پر کوئی تنقید موجود نہیں لہٰذا آپ جمہوری ریاست کو سرمایہ دارانہ حاکمیت کو بروئے کار لانے والی ادارتی صف بندی کے طور پر نہیں پہچانتے بلکہ جب آپ اسلامی ریاست کے خدوخال بیان فرماتے ہیں تو وہاں سلطنت کی تردید تو ملتی ہے جمہوریت کی نہیں۔ آپ کی رائے میں خلافت

راشدہ شرع کے پابند ایک جمہوری نظام کے سوا اور کچھ نہیں۔ مولانا مودودیؒ کی فکر کو اپنا کر جماعت اسلامی نے جو جدوجہد کی (خواہ وہ پاکستان میں ہو بنگلہ دیش میں یا ہندوستان میں) وہ جمہوری انہی معنوں میں ہے کہ اس جدوجہد کے نتیجے میں اسلامی ریاست جیسا کہ نبی کریم ﷺ کے دور سے لے کر سلطان عبدالحمید ثانیؒ کے دور تک قائم تھی، کبھی وجود میں نہ آسکے گی بلکہ جمہوری نظام کو اسلامی جواز فراہم کیا جائے گا۔ جمہوری عمل ارادۂ عمومی (general will) کی حاکمیت کا اظہار ہے۔ اور ارادۂ عمومی کی حاکمیت آزادی کو فروغ دیتی ہے بندگیٔ رب اور رضائے الٰہی کے حصول کو فروغ نہیں دیتی۔

دستوری اور جمہوری جدوجہد کی کامیابی، خواہ اس کی توجیہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی، حصول رضائے الٰہی کی جدوجہد کو فروغ نہیں دیتی۔ ان تحاریک کی کامیابی سے اسلامی انقلابی جدوجہد سوشل ڈیموکریٹ اور لبرل آدرشوں میں تحلیل ہوجاتی ہے۔ یہ بات لیاقت علی خان نے ۱۹۴۹ء میں خوب اچھی طرح سمجھ لی تھی۔ پاکستان کی جمہوری ریاست کو اسلامی جواز دینا پاکستان میں ایک اسلامی ریاست تعمیر کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

جیسا کہ ترکی کے تجربے سے ثابت ہوا ہے جمہوری عمل میں شمولیت سے پارٹی ریاست پر قبضہ حاصل نہیں کرتی بلکہ جمہوری ریاستی نظام اسلامی پارٹی پر قبضہ حاصل کرلیتا ہے۔ یہ عمل پاکستان میں تو نامکمل ہے کیوں کہ ہم انتخابات ہارتے رہے ہیں (اور یہ اللہ کا ہم پر بڑا احسان ہے) لیکن عرب دنیا میں حالیہ جدوجہد کا یہی نتیجہ متوقع ہے اور اگر یہ بات درست ہے کہ عرب اسلامی تحاریک مولانا مودودیؒ کی فکر کی غماز ہیں تو پھر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس فکر نے پوری مسلم دنیا میں جمہوری نظام کو اسلامی جواز فراہم کرنے میں اور اسلامی ریاستی نظام کے قیام کو ناممکن بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ بات اس سے واضح ہے کہ اسلامی جماعتوں اور طلبہ اور مزدور یونینوں اور قوم پرست اور سوشل ڈیموکریٹ پارٹیوں اور یونینوں کے منشوروں اور پروگراموں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

جمہوری عمل معاشرے میں سیکولرائیزیشن (secularization) کو فروغ دینے کا اہم ترین ذریعہ ہے۔ جیسے جیسے جمہوری عمل کو قبولیت عامہ حاصل ہوتی ہے ویسے ویسے دینی عصبیت معدوم ہوتی جاتی ہے اور غیر سیکولر جماعتوں کے لیے کارکنوں سے قربانیاں مانگنا مشکل ہوتا جاتا ہے۔ اس وجہ سے اسلامی جماعتوں کی گفتگو تو غیر مذہبی رہتی ہے لیکن وہ اپنے عمل کو بتدریج سیکولر بنانے پر مجبور ہوجاتی ہیں کیوں کہ سیکولر معاشروں میں کسی سیاسی عمل کی مقبولیت صرف عوام کے حقوق اور اغراض (interests) کے فروغ میں ہی متعین ہوسکتی ہے۔ ان حالات میں اسلامی جماعتیں اپنی

بقاء کی خاطر نظام سے ٹکراؤ سے گریز کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ یہ خطرہ مولانا امین احسن اصلاحی نے ۱۹۵۷ء کے تاریخ ساز ماچھی گوٹھ کے اجتماع میں پہچان لیا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ ''جماعتیں قائم تو ہوتی ہیں کسی اعلیٰ اور برتر نصب العین کے لیے لیکن قائم ہو جانے کے بعد رفتہ رفتہ ازخود مقصد اور نصب العین بن جاتی ہیں اور اصل نصب العین غائب ہو جاتا ہے''۔

آج جماعت اسلامی (بالخصوص کراچی میں) اپنی بقاء کو محفوظ رکھنے کے لیے سیکولر قوتوں سے تصادم سے گریز کر رہی ہے اور جمہوری عمل میں پناہ حاصل کر رہی ہے۔ یہ بات اس کی واضح دلیل ہے کہ کارکنوں میں اسلامی عصبیت اور شوق شہادت معدوم ہوتا جارہا ہے اور جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا معاشرتی سیکولرائزیشن کا عمل جماعت اسلامی کو ایک عام جمہوری تنظیم بناتا چلا جائے گا۔ اس صورت میں جماعت اسلامی کی طاقت بڑھ بھی سکتی ہے ان معنوں میں کہ جمہوری عمل کو اسلامی جواز فراہم کرنا مقبول عام ہو جائے لیکن ان معنوں میں نہیں کہ حکومت الہیہ قائم ہو کیوں کہ ارادۂ عمومی کی حاکمیت لازماً بندگئ رب کی نفی کرتی ہے۔ اگر اسلامی انقلاب برپا کرنا ہے تاکہ ہماری طاقت حکومت الہیہ کے لیے صَرف ہو تو ہمیں لازماً مولانا مودودیؒ کی فکر کی تکمیل کی طرف توجہ دینا ہوگی۔ اگر اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے تو اس کی تنفیذ کے لیے ایک اسلامی ریاست کا قیام لازمی ہے۔ اسلامی ریاست خلافت ہے، امارت ہے، سلطنت ہے لیکن جمہوریت نہیں ہے۔ جمہوری انتظامیہ، مقنّنہ اور عدلیہ میں شمولیت کے ذریعہ اسلامی اقتدار قائم نہیں کیا جاسکتا۔

جماعت اسلامی کو ایسی جدوجہد کا آغاز کرنا چاہیے جو سیکولر ریاستی اداروں کو اسلامی اقتدار کے ماتحت لانے کی اہلیت رکھتی ہو۔ اسلامی ریاستی صف بندی کسی دستوری شکنجہ کی پابند نہیں ہوسکتی نہ اس صف بندی کا آغاز کرنے کے لیے ایک اسلامی حکومت کا قیام اور وجود ضروری ہے۔ اس ادارتی ریاستی صف بندی کی بنیاد بین المساجد اتحاد فراہم کرسکتا ہے۔ جماعت اسلامی کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اس کے بنیادی مخاطب عوام نہیں بلکہ ملک بھر کی اسلامی تنظیموں اور گروہوں کے کارکن ہیں۔ اسلامی انقلابی عمل اس بات کا متقاضی ہے کہ ان کے کارکنوں کو ملک کی طول وعرض میں پھیلی ہوئی لاکھوں مساجد میں مجتمع کیا جائے اور محلے بازار کی سطح پر یہ اقتدار سیکولر ریاستی اداروں سے ان مساجد میں منتقل کیا جائے۔ یہ اسلامی انقلابی عمل کی بنیاد فراہم کرسکتا ہے اور قوت کی اس نئی ترتیب کی بنیاد پر ہم جمہوری ریاست کو مؤثر طریقے سے چیلنج کر سکتے ہیں۔

پاکستانیات

ڈاکٹر محمد امین

پاکستان کی دینی سیاسی جماعتیں

ناکامی کے اسباب ـــــ کامیابی کا لائحہ عمل

ایسا عام طور پرنہیں ہوتا کہ کوئی فرد/ ادارہ یا تنظیم جو کام کرنے اٹھے اس میں وہ یکسر ناکام ہوجائے اور بالعموم یہی دیکھا گیا ہے کہ خواہ افرد ہوں خواہ اجتماعی ادارے وہ اپنے طے کردہ اہداف کے حصول میں کچھ نہ کچھ کامیابی ضرور حاصل کرتے ہیں اور بعض کے حصول میں ناکام ہوجاتے ہیں۔ کامیابی اور ناکامی کی نسبت (Ratio) کم وبیش ہوسکتی ہے لیکن بالعموم موجود ہوتی ہے لہٰذا پاکستان کی دینی سیاسی جماعتوں کے بارے میں یہ کہنا شائد قرین انصاف نہ ہو کہ وہ کلی طور پر ناکام ہوگئی ہیں۔ بلاشبہ انہوں نے کچھ کامیابیاں بھی حاصل کی ہیں لہٰذا ان کی ناکامیوں کے ذکر سے پہلے مناسب محسوس ہوتا ہے کہ ان کی کامیابیوں کا بھی کچھ ذکر کردیا جائے۔

کامیابیاں

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی دینی سیاسی جماعتوں نے پاکستان کی سیاسی اور اجتماعی زندگی کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے کے لیے سخت جدوجہد کی ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور عوام کے تعاون سے اس میں قابل ذکر کامیابیاں بھی حاصل کی ہیں خصوصاً ان کی یہ حکمت عملی کامیاب رہی کہ پہلے جدوجہد کرکے کچھ بنیادی اسلامی اصول منوا لیے جائیں اور انہیں آئین پاکستان کا حصہ بنا دیا جائے اور پھر آئندہ اس آئین کے تحت معاشرے اور ریاست کی مزید اسلامائزیشن کے لیے جدوجہد جاری رکھی جائے۔ چنانچہ دینی قوتوں نے قیام پاکستان کے آغاز ہی میں دباؤ ڈال کر آئین ساز اسمبلی سے قرارداد مقاصد پاس کرالی اور اسے آئین کا حصہ بنواکر گویا ہمیشہ کے لیے یہ طے کردیا کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہوگی جو مسلم عوام کو اسلام کے مطابق زندگی گزارنے میں مدد دینے کے لیے اقدامات کرے گی۔ ریاست کے کردار کو عملاً اسلامی بنانے کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل، وفاقی شرعی عدالت اور ادارہ تحقیقات اسلامی جیسے آئینی ادارے کسی حد تک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں بہت سے اسلامی قوانین جیسے حدود لاز، قصاص و دیت، قانون شہادت، زکوٰۃ وعشر، احترام رمضان، امتناع سود و قادیانیت، ارکان اسمبلی میں مطلوب اخلاقی صفات سے متعلق آئین کے آرٹیکلز ۶۲، ۶۳ وغیرہ ریاست

کے اسلامی چہرے کو اجاگر کرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ سارے حاصلات اور یہ کامیابیاں ہماری دینی سیاسی جماعتوں کی مسلسل کوششوں اور جدوجہد کا نتیجہ ہیں جس کے لیے وہ بجاطور پر مستحق ستائش وتبریک ہیں۔

ناکامیاں

تاہم اگر اس ہدف ومقصد کو سامنے رکھا جائے جو ہماری دینی سیاسی جماعتوں کے پیش نظر تھا اور وہ اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا کہ صحیح اسلامی معاشرہ اور مثالی اسلامی ریاست قائم کریں اور اقتدار میں آکر اسلامی تعلیمات کو معاشرے میں عملاً نافذ کردیں تاکہ لوگ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہوکر دنیا وآخرت کی حسنات سمیٹ سکیں، تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جہاں دینی سیاسی جماعتیں کافی کچھ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں وہاں بہت کچھ ایسا بھی ہے جو وہ حاصل نہیں کرپائیں۔ ایک بنیادی بات یہ ہے کہ عوام نے انہیں ووٹ نہیں دیے اور وہ آج تک برسراقتدار نہیں آسکیں (ماسوائے صوبائی سطح کی ایک آدھ کامیابی کے) کہ وہ معاشرے اور ریاست کے اسلامی کردار کے حوالے سے اپنے طے کردہ بڑے بڑے اسلامی مقاصد حاصل کرسکتیں۔ آیئے یہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی اس ناکامی کے پیچھے کون سے عوامل پنہاں ہیں کیونکہ جب تک ہم ناکامی کے اسباب کا تعین نہیں کریں گے ان کا علاج نہیں کرسکیں گے۔

ناکامیوں کے اسباب

ہماری طالب علمانہ رائے میں دینی سیاسی جماعتوں کی ناکامیوں کے اسباب کے دو بڑے پہلو ہیں: ایک خارجی اور دوسرا داخلی۔

خارجی اسباب

مغربی طاقتوں کا کردار: خارجی لحاظ سے جن دوعوامل نے پاکستان کی دینی سیاسی جماعتوں کو ناکام بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے ان میں سرفہرست اسلام اور مسلم دشمن مغربی طاقتوں کا کردار ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی ممالک خصوصاً امریکہ و یورپ (بشمول ان کے حلیف بھارت، اسرائیل اور روس وغیرہ کہ الکفر ملة واحدة) کا کردار اسلام اور مسلم دشمنی پر مبنی ہے۔ یہ وہ ممالک ہیں جنہوں نے ماضی میں مسلم ممالک کو غلام بنائے رکھا اور ان کا بھرپور معاشی اور سیاسی استحصال کیا اور اب ان کی بھرپور کوشش ہے کہ وہ عالم اسلام خصوصاً پاکستان میں (جو اسلام کے نعرے پر وجود میں آیا تھا) اسلام

نافذ نہ ہونے دیں کیونکہ دین پر عمل ہی مسلمانوں کی ترقی، خوشحالی اور قوت کا منبع ہے۔ اس لیے یہ ممالک اپنی علی الاعلان پالیسیوں کے ذریعے ترقی، خوشحالی، امن، جمہوریت، تعلیم، تجارت اور میڈیا جیسے خوبصورت عناوین کے تحت اور اپنی خفیہ ایجنسیوں کے ذریعے سازشیں کر کے اپنی لے پالک مقامی حکومتوں کی مدد سے اسلامی قوتوں کو آپس میں لڑانے، انہیں الیکشن میں ہرانے اور انہیں سوسائٹی میں غیر مؤثر بنانے کے لیے شروع دن سے ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتی آئی ہیں اور اب بھی کر رہی ہیں۔

۲۔ مقامی گماشتہ حکومتیں

اس سلسلے میں مغربی طاقتوں کی اولیں کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے لے پالک، تنخواہ دار اور گماشتہ عناصر کو اقتدار میں لائیں اور ان کے ذریعے ریاست کی پوری طاقت اور وسائل اسلامی قوتوں کے خلاف استعمال کریں۔ بدقسمتی سے یہ کھیل وہ پاکستان میں اول روز سے کامیابی سے کھیل رہی ہیں اور انہوں نے پاکستان میں اپنی مرضی کی سول اور فوجی حکومتیں قائم کی ہیں اور ان کے ذریعے، قرض اور امداد کے نام پر، پاکستانی معیشت کو تباہ کیا ہے، تعلیم اور میڈیا میں دراندازی کر کے غیر اسلامی رجحانات واقدار کی آبیاری کی ہے اور ان سیکولر مقامی حکومتوں نے اقتدار میں آنے، اسلامی عناصر کو دبانے، ہرانے، باہم لڑانے اور غیر مؤثر کرنے کے لیے ہر حربہ اختیار کیا ہے اور کر رہی ہیں۔ نیز وہ ریاستی وسائل دینی عناصر کو غیر مؤثر کرنے اور ناکام بنانے میں، خفیہ اور اعلانیہ، صَرف کرتی آ رہی ہیں اور آج بھی کر رہی ہیں۔

یہ تو تھے خارجی اسباب۔ اب آیئے داخلی اسباب کی طرف:

داخلی اسباب

پاکستان کی دینی سیاسی جماعتوں کی ناکامی کے داخلی اسباب تو کئی ایک ہیں لیکن ہماری رائے میں ان میں سے تین زیادہ اہم ہیں: ایک خارجی منفی عوامل کا توڑ نہ کر سکنا، دوسرے ان کا باہمی انتشار و افتراق اور تیسرے کامیابی کے لیے صرف سیاسی سرگرمیوں پر انحصار۔ اور اب ان عوامل کی کچھ تفصیل:

ا۔ خارجی منفی عوامل کا توڑ نہ کر سکنا

دینی سیاسی جماعتوں کے رویے سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے خلاف بین الاقوامی اسلام و مسلم دشمن طاقتوں کے ارادوں اور سازشوں کا صحیح ادراک نہیں کر سکیں اور نہ انہوں نے ان کی چالوں سے بچنے اور ان کے منصوبوں کو ناکام بنانے کے لیے مؤثر اقدامات کیے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے اسلام و

مسلم دشمن عالمی قوتوں کے مقامی مہروں اور گماشتوں کے زہر سے خود کو بچانے کا بھی کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں کیا اور نہ عالمی و مقامی خفیہ ایجنسیوں کی سازشوں کے توڑ کے لیے کچھ کیا ہے۔نتیجہ یہ ہے کہ بین الاقوامی اور مقامی خفیہ ایجنسیاں انہیں آپس میں لڑانے، کمزور کرنے اور غیر مؤثر بنانے میں اب تک کامیاب رہی ہیں۔

۲۔ باہمی انتشار و افتراق

ہمارے تجزیے کے مطابق بین الاقوامی اور مقامی خفیہ ایجنسیوں نے پاکستان کے ہر دینی مسلک اور مکتب فکر کو اکسایا کہ وہ اپنے اپنے مسلک کی الگ سیاسی جماعت بنائے، پھر انتخابات میں ان کو آپس میں لڑایا، ان کی ہوا خیزی کی اور یوں ان کی شکست کا بندوبست کیا تا کہ سیکولر جماعتیں کامیاب ہوجائیں۔ بدقسمتی سے ہماری دینی سیاسی جماعتیں اس کھیل کو سمجھ نہیں سکیں، اسے ناکام نہیں بنا سکیں اور خفیہ ایجنسیوں کو حبِّ مال اور حبِّ جاہ کے ایسے مریض دینی عناصر میں سے بالعموم ملتے رہے ہیں جو ان کا کھیل کھیلنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں ورنہ اس بات کو سمجھنے کے لیے کتنی فراست درکار ہے کہ اپنے اپنے مسلک کی سیاسی جماعت بنانا خود ناکامی کو دعوت دینے کے مترادف ہے کیونکہ ایک سیاسی جماعت اگر کلامی و فقہی مسلک پر مبنی ہوگی تو منطقی طور پر دوسرے مسلک کا فرد اسے ووٹ نہیں دے گا۔نیز اس سے دینی عناصر اور عوام میں فرقہ واریت کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔

۳۔ صرف سیاسی سرگرمیوں پر انحصار

ہماری دینی سیاسی جماعتوں نے انتخابات میں کامیابی کے لیے صرف دینی اور سیاسی سرگرمیوں پر انحصار کیا ہے اور تعلیمی، اصلاحی، سماجی، ثقافتی اور خدمت خلق کی سرگرمیوں پر بھرپور توجہ نہیں دی جبکہ ہمارا سیاسی کلچر یہ ہے کہ صرف اس سیاست دان کو کامیاب سمجھا جاتا ہے جو لوگوں کے تھانے کچہری کے کام کرائے، ان کو ملازمتیں دلوائے، ان کے تبادلے کرائے، گلی محلے کی صفائی میں مدد دے، سڑکیں بنوائے اور ان کاموں پر اپنا مال اور وقت صرف کرے۔سوء اتفاق سے ہمارے علماء کرام اس اسٹائل سے کام کرنے کے عادی نہیں ہیں اور نہ ان کی اکثریت اس طرح کی زندگی گزارتی ہے لہٰذا عوام علماء کرام کی دینی سرگرمیوں کی وجہ سے ان کا احترام تو کرتے ہیں لیکن انہیں ووٹ دے کر کرسیٔ اقتدار تک پہنچانے کے لیے موزوں نہیں سمجھتے اور یوں علماء کرام سیاست میں عوام کی تائید حاصل نہیں کر پاتے۔

پس چہ بائد کرد

پاکستان کی دینی سیاسی جماعتیں کیسے کامیاب ہوسکتی ہیں؟ ایسی کیا حکمت عملی ہوسکتی ہے جس پر وہ عمل کریں تو انہیں عوام کی حمایت حاصل ہوجائے اور وہ برسر اقتدار آ کر ریاستی قوت کو اسلامی تعلیمات پر عمل کے لیے استعمال کرسکیں؟ اس کے لیے ہم تین نکاتی لائحہ عمل تجویز کرتے ہیں: ۱۔ باہمی اتحاد ۲۔عوام کی ذہن سازی؛ اور ۳۔خدمت خلق۔

۱۔ باہمی اتحاد

اصول کی بات تو یہ ہے کہ سارے دینی عناصر کو مل کر ایک سیاسی جماعت بنانی چاہیے کیونکہ ہدف سب کا ایک ہے کہ ریاستی امور کو اسلام کے مطابق چلانا ہے اور فرد اور معاشرے کو اسلامی تعلیمات پر عمل کے قابل بنانا ہے۔ یہی نفاذ شریعت ہے اور اس پر کسی کا اختلاف نہیں۔ جہاں تک نفاذ شریعت کی تفصیلات اور دیگر سیاسی و اجتماعی امور کا تعلق ہے ان میں بھی دینی سیاسی عناصر میں مشترکات اتنے زیادہ ہیں کہ ان پر متفق ہونا کچھ مشکل نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ اخلاص اور فراست عطا فرمائیں اور حبّ جاہ و مال اور خفیہ ایجنسیوں کی سازشوں سے بچنے کی توفیق عطا فرمائیں اور 'میں سب سے بڑا لیڈر ہوں' اور 'مجھے سب کا لیڈر ہونا چاہیے' کا سودا اگر سر پر سوار نہ ہو تو اسلامی حوالے سے مشترکات اور ترجیحات پر اتفاق کوئی مشکل بات نہیں۔

دیکھیے! بڑی سیاسی جماعتوں کے اندر مختلف فکری دائرے اور نظریاتی دھارے ہوتے ہیں (جیسے کہ برصغیر میں کانگرس اور مسلم لیگ میں تھے) اور ان کے درمیان آپس میں اختلاف رائے بھی ہوتا رہتا ہے لیکن اگر اخلاص اور فراست ہو اور بنیادی امور پر اتفاق ہو تو اس کے باوجود جماعت نہیں ٹوٹتی کہ وہ اصل مقصد جس کے لیے جماعت بنی تھی، وہ اختلاف کے باوجود، سب کو عزیز ہوتا ہے۔ یہ وسعت نظری اور اکثرتیت (Pluralism) سیاسی جماعتوں کا حسن ہوتا ہے اور ان کی کامیابی کی ضمانت بھی کیونکہ اس رواداری، اختلاف رائے کو برداشت کرنے اور وسعت فکر ونظر کی وجہ سے قوم کے اکثر طبقے ایک جماعت میں جمع ہو کر اس کی قوت اور کامیابی کا سبب بنتے ہیں۔ اردو کے محسن وقائد اور پنجاب یونیورسٹی کے مایہ ناز استاد ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کہا کرتے تھے کہ اگر مجھے کسی سے ۹۹ فیصد اختلاف ہو اور ایک فیصد اتفاق ہو تو اس ایک فیصد اتفاق کی بناء پر میں اس آدمی کے ساتھ مل کر کام کرسکتا ہوں لیکن ہمارے بعض علماء کرام کا

عمومی اسلوب یہ ہے کہ اگر انہیں کسی سے ۹۹ فیصد اتفاق ہو تو وہ اس کے ساتھ مل کر کام نہیں کر سکتے کیونکہ وہ ایک فیصد اختلاف رائے کو بھی برداشت نہیں کرتے۔ دراصل جماعت اس وقت ٹوٹتی ہے اور نئی جماعت اس وقت بنتی ہے جب ہر آدمی لیڈر بننا چاہے اور شیطان و نفس کی اکساہٹ سے جماعت کے اجتماعی مفاد کو چھوڑ کر اور ایثار و اطاعتِ امیر کا راستہ ترک کر کے خود غرض بن جائے اور حبّ جاہ اس پر غالب آجائے۔ اور اگر خفیہ ایجنسیاں بھی پشت پناہی کر رہی ہوں تو نور علی نور۔

ہم یقین سے کہتے ہیں کہ پاکستان میں سارے مکاتب فکر کے علماء کرام کا مل کر ایک سیاسی جماعت بنانا اور چلانا ممکن ہے اور اس میں بنیادی رکاوٹ اختلاف فکر و نظر نہیں (بلکہ یہ محض بہانہ ہے اور اسے بطور حیلہ فرنٹ پر رکھا جاتا ہے) اور اصل رکاوٹ عدم اخلاص اور عدم فراست ہے اور اس کے پیچھے حبّ جاہ و مال اور خفیہ ایجنسیاں ہیں۔

لیکن چلیے جب تک ایسی سیاسی جماعت نہیں بنتی اُس وقت تک اتنا تو ہوسکتا ہے کہ اپنی اپنی جماعت کو باقی رکھتے ہوئے ایک 'متحدہ محاذ' دینی مقاصد کے لیے بنالیا جائے اور مشترکات پر جمع ہوجایا جائے تاکہ اسلام مخالف اور سیکولر قوتوں کے خلاف دینی لوگوں کا ایک ہی پلیٹ فارم ہو۔ اگر ایسا ہوجائے تو اس دینی محاذ کو (جس کا نام کچھ بھی ہوسکتا ہے) عوام کی حمایت حاصل کرنے کے امکانات روشن ہوجائیں گے۔

چلیے ! اس سے بھی آگے چلیے ! اگر علماء کرام اور دینی عناصر ایک سیاسی جماعت نہیں بناسکتے، مل کر ایک متحدہ سیاسی محاذ بھی نہیں بناسکتے تو خدا کے لیے کچھ غیر سیاسی دینی کاموں کے لیے ہی متحد ہوجایئے۔ تعلیم و تربیت، میڈیا اور لوگوں کی اخلاقی تربیت کے لیے متحد ہوجایئے، شرعی عدالتیں قائم کرنے، مسلمانوں کو خودکشیوں سے بچانے اور امن و امان کے لیے ہی متحد ہوجایئے۔ بتایئے ! آخر اس میں کیا مانع ہے؟ جب کہ ان غیر سیاسی کاموں کا بالواسطہ فائدہ بھی آپ کی سیاست ہی کو ہوگا۔ ان غیر سیاسی کاموں کی تفصیل ہم نے ذیل میں عوام کی ذہن سازی اور خدمت خلق کے عناوین کے تحت دی ہے

۲۔ عوام کی ذہن سازی کریں

سیاسی کامیابی کے لیے صرف سیاسی سرگرمیاں کافی نہیں بلکہ اس کے لیے وسیع پیمانے پر ذہن سازی اور انسان سازی کی ضرورت ہے کیونکہ دینی سیاسی جماعتوں کی ضرورت صرف اتنی نہیں کہ لوگ انہیں ووٹ دیں بلکہ انہیں ایسے افراد کی ضرورت ہے جو اسلام کی حقانیت کے قائل ہوں، اسلامی

تعلیمات پر عمل کرنا چاہتے ہوں بلکہ پوری زندگی اسلام کے مطابق گزارنا چاہتے ہوں۔ جو نہ صرف خود دین پر عمل کریں بلکہ ان کی خواہش و کوشش ہو کہ دوسرے بھی دین پر عمل کریں۔ ایسے لوگ وسیع پیمانے پر تیار کرنے کی ضرورت ہے بلکہ کوشش ہونی چاہیے کہ سارے مسلمان ایسے ہوں۔ اس کام کے تین بڑے ذرائع ہوسکتے ہیں: ا۔تعلیم وتربیت ۲۔میڈیا؛اور ۳۔تعمیر اخلاق

تعلیم وتربیت

پاکستان میں تعلیم وتربیت کا موجودہ ڈھانچہ ناقص اور فرسودہ ہے۔عمومی تعلیم (جنرل ایجوکیشن) انہی خطوط پر چل رہی ہے جو انگریز نے طے کیے تھے۔اس کے ردعمل میں دینی مدارس صرف 'مذہبی تعلیم' دیتے ہیں اور وہ بھی عصری تناظر کے بغیر۔ان حالات میں تعلیم عام کرنے سے پہلے اس کی اصلاح کی ضرورت ہے۔اور یہ بالکل ناگزیر ہے کہ عمومی تعلیم کے نصاب، اساتذہ، تعلیمی انتظامیہ اور طلبہ کی تربیت اور ہم نصابی سرگرمیوں سب کی اسلامی اورعصری تناظر میں تشکیل نو کی جائے اور ان شعبوں میں مغربی فکر وتہذیب کی اندھی تقلید کو رد کردیا جائے۔اسی طرح مذہبی تعلیم پر بھی نظر ثانی کی جائے اور مسلک پرستی سے نکل کر اسے مسلم معاشرے اور ریاست کی عصری ضرورتوں کو پورا کرنے کے قابل بنایا جائے۔ثنویت کوختم کردیا جائے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تعلیم و تدریس کو تربیت اور کردار سازی کا ذریعہ بنایا جائے۔

اس اصلاح کے بعد تعلیم کو پھیلایا جائے۔موجودہ نظام تعلیم کی مذکورہ خطوط پر اصلاح کیسے کی جائے اور نئے تعلیمی ادارے کس اسلوب سے کام کریں گے؟ اس پرتحریک اصلاح تعلیم نے تفصیلی کام کیا ہوا ہے جوطبع شدہ موجود ہے، اسے دیکھا جاسکتا ہے۔

میڈیا

اِس وقت پاکستانی میڈیا کی اکثریت مسلم عامۃ الناس اورخصوصاً نوجوانوں کو دین اور دینی تعلیمات و اقدار سے دور کرنے، ان میں فحاشی وعریانی پھیلانے اور رقص و سرود عام کرنے میں مصروف ہے اور یہی امریکہ و یورپ اور بھارت کا ایجنڈا ہے۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے دو طریقے ہیں: ایک تو یہ کہ موجودہ میڈیا کی اصلاح کی کوشش کی جائے۔حکومت کواس کے فرائض منصبی یاد کرائے جائیں کہ وہ میڈیا کی کڑی نگرانی کرے اور اس کا قبلہ ٹیڑھا نہ ہونے دے۔ علاوہ ازیں رائے عامہ بیدار کی جائے، میڈیا مالکان اورمینجر سے ملاجائے اورغلط پروگراموں پر احتجاج کیاجائے

دوسرے یہ کہ درد رکھنے والے اسلامی عناصر میڈیا میں صحیح خطوط پر کام کرنے کے لیے خود ایسے ٹی وی چینل اور متبادل پروگرام تیار کریں جو صحیح رُخ میں عوام کی ذہن سازی کریں اور انہیں اسلامی اصول و اقدار پر عمل کے لیے اکسائیں۔

تعمیر اخلاق

فرد اور معاشرے کی بقاء، ترقی اور وقار کا انحصار اس کے اخلاق پر ہوتا ہے اور اخلاقی زبوں حالی لازماً زوال پر منتج ہوتی ہے۔ لہٰذا تعلیم اور میڈیا کے علاوہ سماجی اور عوامی سطح پر بھی تعمیر اخلاق کے لیے کوششوں کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر محلے کی سطح پر ایک تعمیر اخلاق کمیٹی بنائی جائے جو محلے کے معززین اور نمازیوں پر مشتمل ہو۔ یہ کمیٹی عام لوگوں خصوصاً نوجوانوں کے لیے تعمیری مصروفیات پیدا کرے اور پارکوں میں کھیل کود، اِن ڈور گیمز، لائبریری، درس قرآن کے حلقے، تقریروں اور نعتوں کے مقابلے جیسی سرگرمیوں کا اہتمام کرے۔ نیز محلے میں غیر اخلاقی سرگرمیوں کا سد باب کرے جیسے پارکوں میں منشیات کا استعمال، نیٹ کیفے میں غیر تعمیری سرگرمیاں، گلی کی نکڑ پر نوجوانوں کا اجتماع، ون وہیلنگ وغیرہ۔

۳۔ خدمت خلق

بگڑے ہوئے سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی ماحول میں لوگوں کی مشکلات ومسائل میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اِن حالات میں ناگزیر ہے کہ لوگوں کے دکھ اور تکلیف کم کرنے کی کوشش کی جائے۔ علماء کرام اور دینی عناصر چونکہ عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں کہ اس کام کی دینی اہمیت کیا ہے لہٰذا انہیں تو ضرور ہی خدمت خلق کے یہ کام کرنے چاہئیں۔ ہم نے بطور مثال تین شعبوں کا انتخاب کیا ہے: غربت میں کمی، فراہمیٔ انصاف اور بحالیٔ امن وامان۔

غربت کا خاتمہ

ہمارے معاشرے کے افلاس کا سبب یہ نہیں ہے کہ اللہ نے ہمیں وسائل سے نہیں نوازا۔ نہیں! اللہ تعالیٰ نے ہمیں بہت وسائل سے نوازا ہے لیکن ہماری نالائقی یہ ہے کہ ہم ایسی قیادت سامنے نہیں لا سکے جو ان وسائل کا صحیح استعمال کرتی۔ اس کے برعکس ہماری قیادت ایسی ہے جو اسلام دشمن مغربی طاقتوں اور یہودیوں کی معاشی چالوں کو نہیں سمجھتی اور ان کا توڑ نہیں کرتی بلکہ ان کے مہرے کے طور پر کام کرتی ہے، ان کے مقاصد پورے کرنے میں ان کی معاونت کرتی ہے اور قومی خزانے کو ذاتی

خزانہ سمجھ کر استعمال کرتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ امت افلاس کا شکار ہے، لوگ نانِ جویں کے محتاج ہیں اور خودکشیاں کررہے ہیں۔ اس کا دیرپا حل تو یہ ہے کہ اسلامی تناظر میں صحیح معاشی پالیسیاں وضع کر کے ان پر عمل کیا جائے لیکن اس کے ساتھ ساتھ غربت کی چکی میں پستے ہوئے عوام کی اتنی دستگیری بہرحال ضروری ہے کہ جس سے وہ خودکشیوں سے بچ سکیں۔ ہم ابتداء میں اس کے لیے عوامی سطح کے دو ایسے اقدامات تجویز کرتے ہیں جن پر حکومتی اعانت کے بغیر پرائیویٹ سیکٹر اور معاشرہ کے افراد عمل کرسکتے ہیں۔ اس تجربے کی کامیابی کے بعد مزید اقدامات پر عمل کا سوچا جاسکتا ہے۔

ان میں سے ایک ہے: قومی سطح کی ایک ایسی مرکزی زکوٰۃ کونسل کا قیام جس کے ارکان میں ایسے لوگ شامل ہوں جن کی امانت و دیانت پر قوم کو اعتماد ہو۔ سارے ملک سے زکوٰۃ وصدقات کے پیسے اس کونسل میں جمع ہوں اور وہ اسے غربت کے خاتمے کے لیے استعمال کرے۔ دوسرے ہر محلّہ کی سطح پر ایسی کمیٹی کا قیام جو محلے کے یتیموں، بیواؤں اور مساکین کی فہرست تیار کرے اور ان کی اتنی مالی مدد کرے جس سے ان کے رزق کفاف کا انتظام ہوجائے اور وہ عزت سے گزر بسر کرسکیں۔ محلے کے کھاتے پیتے لوگ مل کر اس کمیٹی کو اتنے وسائل فراہم کریں جن سے یہ ضرورت پوری ہوجائے اور اکثر و بیشتر معاملات میں ایسا ہوسکتا ہے۔ استثنائی حالات میں مذکورہ مرکزی زکوٰۃ کونسل سے بھی مدد لی جاسکتی ہے۔

فراہمیٔ انصاف

مغرب کی نقالی اور اس کے نظام قانون کو مسلم معاشرے میں نافذ کرنے کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ لوگ انصاف سے محروم ہوگئے ہیں۔ انصاف مہنگا ہوگیا ہے اور یہ بکتا ہے جسے ہر آدمی خرید نہیں سکتا۔ نیز یہ جلدی نہیں ملتا خصوصاً ہماری دیوانی عدالتیں تو آدمی کو دیوانہ اور دیوالیہ بنا دیتی ہیں اور ایک نسل کے مقدمہ کا فیصلہ بعض اوقات دوسری نسل سنتی ہے۔ اس کے اسباب بہت سے ہیں کورٹ فیس، وکیلوں کے خرچے، مغرب کے عدالتی نظام سے مستنبط عدالتی پروسیجرز، عدالتی عملے کی کمی، رشوت ستانی۔۔۔وغیرہ۔ اصل ضرورت تو اس بات کی ہے کہ ان مسائل کا حل اسلامی تناظر میں سوچا جائے اور اس پر عمل کیا جائے اور یہ تبھی ہوگا جب ایسی سیاسی قیادت برسراقتدار آئے جو یہ کام کرنا چاہے۔ لیکن جب تک ایسا نہیں ہوتا پرائیویٹ سیکٹر اور عام سوسائٹی خصوصاً علماء کرام یہ تو کرسکتے ہیں کہ پاکستانی آئین وقانون عدالت سے باہر جن مصالحتی وثالثی اقدامات کی اجازت دیتے ہیں، انہیں منظّم کرلیا جائے اور گاؤں وشہر کی سطح پر ایسی مصالحتی وثالثی عدالتیں بنائی جائیں جن میں ایک عالم دین، ایک متدین وکیل اور ایک معزز تجربہ کار شہری شامل ہو۔ اس عدالت کو شرعی عدالت یا قاضی کورٹس بھی

کہا جا سکتا ہے اور ان کے لیے اصول وضوابط بھی وضع کیے جا سکتے ہیں۔

بحالیٔ امن وامان

ہمارے معاشرے میں امن وسکون نہ ہونے کی وجہ اسلامی تعلیمات پر عمل نہ کرنا ہے خصوصاً ظلم و زیادتی، بد دیانتی، انصاف کا نہ ملنا، بھوک اور غربت، کرپشن ۔۔۔وغیرہ اس کے بڑے اسباب ہیں۔ ان سب کا بھی سدّ باب ہونا چاہیے اور اس کے لیے سیاسی و اجتماعی تبدیلی کے لیے جدوجہد بھی ضروری ہے تاہم اس کے ساتھ ساتھ کچھ براہ راست کوششیں بھی حالات سدھارنے یا امن وامان کی بگڑتی ہوئی صورت حال پر قابو پانے کے لیے کی جا سکتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہوسکتی ہے کہ محلے کی سطح پر ایک 'امن کمیٹی' بنالی جائے جو نوجوانوں کو متحرک کرے اور ہر گلی سے کچھ نوجوان ایسے نکل آئیں جو اپنی گلی میں باری باری رات کو پہرہ دیں اور دن میں بھی امن وسلامتی کا خیال رکھیں۔ اجتماعیت میں بڑی برکت ہوتی ہے اور اگر اس کام کو منظم کرلیا جائے تو اس پر کوئی خرچ آئے گا اور نہ کسی کا زیادہ وقت لگے گا۔ چوریوں اور سٹریٹ کرائمز پر اس طرح قابو پانے میں بہت مدد ملے گی۔ اہل محلّہ وگلی میں تعاون کی فضا ہو تو مل کر تھوڑے تھوڑے پیسے جمع کر کے چوکیدار بھی رکھا جا سکتا ہے۔

یہ کام کیسے ہو سکتے ہیں؟

ہم نے ابتداء میں عرض کیا تھا کہ پاکستان میں نہ تو صحیح اسلامی معاشرہ قائم ہوسکتا ہے اور نہ اسے مثالی اسلامی ریاست بنایا جا سکتا ہے جب تک علماء کرام اور دینی سیاسی عناصر متحد نہ ہوں اور اگر اخلاص اور فراست دونوں موجود ہوں تو یہ اتحاد آسانی سے معرض وجود میں آ سکتا ہے۔ اب ہم اس سے آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ چلیے پہلے مرحلے پر اگر آپ کا 'سیاسی اتحاد' آسانی سے نہیں بن سکتا تو اِن غیر سیاسی لیکن اہم دینی کاموں کو مل کر کرنے ہی پر اتفاق و اتحاد کر لیجیے۔ یہ بھی بہت باعث برکت ہوگا۔ اور بدرجۂ آخر اگر آپ یہ دینی کام بھی مل کر نہیں کر سکتے تو کم از کم اتنا ہی کیجیے کہ آپ خود یعنی اپنی جماعت کی پوری قوت سے یہ کام کرنا شروع کر دیجیے۔

اس منہاج کی افادیت

موجودہ دینی سیاسی جماعتوں کے افراد یہ سوال اٹھا سکتے ہیں کہ اِس نئے منہاج کو آخر کیوں اختیار کیا جائے اور اپنی قوت ان غیر سیاسی کاموں میں کیوں لگائی جائے اور ان کی افادیت کیا ہے؟

ہم عرض کرتے ہیں کہ:

۱۔ آپ غور فرمائیں کہ آپ اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست کیوں قائم کرنا چاہتے ہیں؟ اِس کا جواب اِس کے علاوہ اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ آپ چاہتے ہیں کہ لوگ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں دین پر عمل کرنے لگیں۔ اب اگر مسلمان حکومت عوام کو ایسا کرنے میں مدد نہیں دیتی تو سوال یہ ہے کہ اتنا اہم کام صرف حکومت پر کیوں چھوڑا جائے کہ اگر وہ صحیح سمت میں متحرک نہ ہو تو یہ کام ہی فوت ہو جائے۔حکومت کو یہ کام کرنے چاہئیں لیکن اگر وہ نہیں کرتی تو کیا دینی قیادت کو بھی یہ کام نہیں کرنے چاہئیں؟ آخر اس میں مانع کیا ہے؟

۲۔ اگر آپ یہ کام کرتے ہیں تو آدھی سے زیادہ شریعت تو بلاشبہ نافذ ہو جائے گی اور باقی آدھی کی آپ بنیاد رکھ دیں گے اور اقتدار ملنے پر اس میں رنگ بھر سکیں گے۔

۳۔ عوام میں آپ کی قیادت پر اعتماد پیدا ہوگا اور وہ سوچیں گے کہ جو لوگ بغیر اقتدار میں آئے ان کی خدمت کر رہے ہیں اور ان کے مسائل حل کرنے کی تگ و دو کر رہے ہیں، وہ کل اقتدار میں آ کر ان کے مسائل کیوں حل نہ کریں گے؟

۴۔ تجربے نے یہ بتایا ہے کہ محض قانون بنا دینے سے کام نہیں بنتا اور نہ لوگ صرف قانون بن جانے کی وجہ سے دینی احکام پر عمل کرنے لگتے ہیں تو لامحالہ آپ کو اس کا کوئی متبادل سوچنا چاہیے کہ لوگ کیسے دین کے احکام پر عمل کریں؟ اور متبادل یہی ہے کہ آپ لوگوں کی صحیح تعلیم و تربیت سے ان کے اندر یہ سپرٹ اور جذبہ پیدا کریں کہ وہ خود اپنے اندر کی تحریک سے اور اپنی ایمانی قوت سے دینی احکام پر عمل کریں۔

۵۔ اسلامی قوانین بنا دینے کے باوجود ان پر عمل کیوں نہیں ہوتا؟ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ حکومت کی انتظامی مشینری یعنی پولیس، عدلیہ، جج، وکیل، اور انتظامی عملہ خود اسلامی احکام پر عمل نہیں کرنا چاہتا کیونکہ انہیں 'دنیاوی' ترجیحات و مقاصد نے ورغلا رکھا ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس انتظامی مشینری کی، جو مسلمانوں ہی پر مشتمل ہے، اصلاح کیسے ہوگی؟ آپ کہیں گے ان کی اصلاح حکومت کرے۔سوال یہ ہے کہ اگر حکومت نہ کرے تو پھر؟ آپ اس بات کو جتنا چاہے کھینچتے اور گھماتے چلے جائیں آپ بالآخر اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ جب تک آدمی کی اصلاح نہ کی جائے اور فرد کو نہ بدلا جائے، کوئی نتیجہ خیز اجتماعی تبدیلی نہیں آ سکتی۔اور فرد کی اصلاح کا نسخہ وہی ہے جو ہمارا مجوزہ منہاج

مہیا کرتا ہے یعنی صحیح تعلیم و تربیت، میڈیا کا درست استعمال اور اخلاقی تربیت۔ ہم کہتے ہیں کہ قانون کی طاقت اور ڈنڈے کے زور سے انسانوں کے دل و دماغ نہیں بدلے جا سکتے۔ قانون کی طاقت تو محض اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی روکنے کا آلہ ہوتی ہے یہ تو محض علاجیاتی اقدام (Remedial measure) ہوتی ہے، یہ انسانوں میں وہ بنیادی تحریک پیدا ہی نہیں کرتی، کر ہی نہیں سکتی جو انسان کو عمل پر اکساتی اور ابھارتی ہے۔

۶۔ انسانی تجربہ یہ بھی بتاتا ہے کہ 'ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد'۔ یعنی مخدوم بننا ہے تو لوگوں کی خدمت کرو۔ اور خدمت کے لیے حکومت اور اقتدار شرط نہیں۔ کس نے آپ کا ہاتھ پکڑ رکھا ہے کہ آپ لوگوں کے دکھ درد دور کرنے کی کوشش نہ کریں؟ بلکہ لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ آج ان سیاسی قائدین کے پاس اقتدار نہیں اور یہ پھر بھی لوگوں کے دکھ درد میں کام نہیں آتے تو کل اقتدار میں آ کر کیا کریں گے جب ان کا دماغ حکومت و اقتدار کی وجہ سے مزید اونچا اڑنے لگے گا اور یہ فخر و غرور کی وجہ سے لوگوں کی خدمت کو عار سمجھنے لگیں گے؟ اس اصول پر عمل کی بہترین مثال مسلم صوفیا ہیں جن کے منہج کا لازمی حصہ خدمت خلق تھا۔ اس کے نتیجے میں وہ عوام میں اتنے مقبول ہوتے تھے کہ نیک حکمران ان پر رشک کرتے اور ان کی اطاعت کرتے تھے اور دنیادار حکمران تبھی ان کا ادب اور تکریم کرتے تھے۔

۷۔ ہمارے دیکھتے الجزائر اور ترکی بلکہ ملائشیا میں جو تبدیلی آئی ہے وہ اصلاح فرد اور خدمت کے اسی منہج کی بنیاد پر آئی ہے کیونکہ حقیقی اور پائیدار تبدیلی وہی ہوتی ہے جو افراد معاشرہ کی مرضی سے آئے اور افراد معاشرہ کو جیتنے کے دو ہی تیر بہدف طریقے ہیں: ایک ان کے دل و دماغ کو اپنی موافقت میں بدلنا اور دوسرے خدمت خلق۔

۸۔ یہ منہاج یعنی اسلامی معاشرے و ریاست کا قیام بذریعہ سماجی تبدیلی محض ایک سیاسی حکمت عملی اور ووٹروں کے دل جیتنے کا طریقہ نہیں بلکہ ذرا غور کریں گے تو آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہ شرعی تقاضا ہے۔ قرآن حکیم بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو کام کا جو طریقہ بتایا تھا وہ دعوت و اصلاح بذریعہ تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیے کا تھا۔ اصلاح اخلاق کے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا۔ قرآن کہتا ہے کہ تمہارے مال میں غریبوں کا حق ہے۔ رسول رحمت ﷺ نے فرمایا تم مومن نہیں ہو اگر تمہارا ہمسایہ بھوکا ہو اور تم پیٹ بھر کر سوؤ۔ یہ بھی فرمایا کہ راستے سے کانٹا ہٹانا بھی صدقہ ہے یہ بھی فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ کے شر سے

دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ تو گویا اصلاح و خدمت کا منہاج ایک شرعی تقاضا ہے جس پر عمل کرنے کے سارے مسلمان مکلّف ہیں۔ ہم نے اسے صرف منظّم صورت میں پیش کیا ہے۔

۹۔ ان غیر سیاسی کاموں کے ذریعے آنے والی سماجی تبدیلی کے اثرات پائیدار ہوں گے جبکہ سیاسی تبدیلی کے اثرات بعض اوقات پائیدار نہیں ہوتے اور نہ ان میں تسلسل ہوتا ہے کیونکہ ممکن ہے کہ عوام کسی دینی سیاسی جماعت کو ایک دفعہ ووٹ دے کر اقتدار میں لائیں اور کسی وجہ سے اگلی دفعہ اسے ووٹ نہ دیں تو اس دینی سیاسی جماعت کے کاموں کا تسلسل باقی نہ رہ سکے گا۔

۱۰۔ ان غیر سیاسی دینی کاموں کا آخری فائدہ دینی سیاسی جماعتوں کو ہوگا کیونکہ جو علماء کرام دعوت و تبلیغ، اصلاح و تربیت اور خدمت خلق کے کاموں میں مصروف ہوں گے، انہوں نے لوگوں سے نہ ووٹ لینے ہیں نہ کوئی اجر مانگنا ہے لہٰذا یہ کام اگرچہ غیر سیاسی ہیں لیکن ان کا سیاسی فائدہ بہرحال دینی سیاسی جماعتوں کو ہوگا جیسا کہ ترکی میں ہوا ہے کہ فتح اللہ گولن کی تعلیمی تحریک کا فائدہ موجودہ حکمران جسٹس پارٹی کو ہوا ہے اور اس کا ووٹ بنک بڑھا ہے۔

۱۱۔ اس سے دین کے اس تجریدی تصور کی نفی ہوگی جس میں sofistication تو نظر آتی ہے لیکن عملی زندگی کے مسائل سے اس کا تعلق نمایاں ہو کر سامنے نہیں آتا اور عوام کو اسے سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے جیسے آئین کو اسلامی بنانے کی جدوجہد، اسلامی نظریاتی کونسل کا قیام، نفاذ حدود کا اعلان وغیرہ۔ حالانکہ شریعت تو لوگوں کے عملی مسائل کے حل ہی کے لیے اللہ نے نازل فرمائی تھی۔ ہمارے اس مجوزہ منہاج میں تعلیم، میڈیا، تعمیر اخلاق، فراہمیٔ عدل و انصاف، بحالیٔ امن و امان اور غربت میں کمی کے اقدامات ایسے ہیں جن سے لوگوں کے مسائل حل ہوں گے اور انہیں شریعت اپنی زندگی میں عملی کردار ادا کرتی اور مسائل حل کرتی نظر آئے گی۔

۱۲۔ تعمیر اخلاق کمیٹی، امن و امان کمیٹی، فراہمیٔ عدل کمیٹی، غریبوں کی مدد کرنے والی مالیاتی کمیٹیاں اگر گلی محلّہ کی سطح پر بنانی ہوں تو اس کا بہترین فورم مسجد ہے جہاں محلّہ کے شرفاء پانچ وقت نماز کے لیے باجماعت جمع ہوتے ہیں۔ یہی نمازی ان کمیٹیوں کے موزوں ممبر ہو سکتے ہیں اور ان کے اجلاس مسجد ہی میں رکھے جا سکتے ہیں۔ اس سے نہ صرف مسجد کے اس کردار کا احیاء ہوگا جو عہد نبوی میں تھا بلکہ اس سے مسجد کی مرکزیت معاشرتی ڈھانچے کو اسلامی بنانے میں اہم کردار ادا کرنے لگے گی۔

تزکیۂ نفس　　احمد جاوید

عبادت، اطاعت سے اہم تر ہے

بعض جدید اسلامی مفکرین بندگی اور فرائض دینی کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ دین کا مطلوب حقیقی اطاعت رب ہے جہاں تک نماز روزہ جیسی عبادات کا تعلق ہے تو یہ اس اصل کام میں معاونت کرتی ہیں۔اس کے برعکس اہل تزکیہ کہتے ہیں کہ اصل چیز عبادت (بمعنی پرستش) ہے اور اطاعت محض اس کا ایک ثمر۔
قرآن وسنت میں اس کے لیے 'عبودیت' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے مفہوم میں عبادت (پرستش) اور اطاعت دونوں بیک وقت شامل ہوتے ہیں اور دونوں ہی اہم ہیں۔ بہرحال اس تحریر میں احمد جاوید صاحب نے عبادت (بمعنی پرستش) کی اہمیت بیان کی ہے اور اس کے اہم تر ہونے پر اصرار کیا ہے۔ امین

س: دین میں عبادات کا کیا مقام ہے؟

ج: ہماری حقیقت، جو ہمیں کسی اور نے نہیں بلکہ ہمارے خالق نے بتائی ہے، عبدیت ہے۔ ایمان اس حقیقت کا شعور ہے اور عبادت اس کا عملی اظہار۔ پوری انسانیت یعنی انسان ہونے کے تمام معانی ان قطبین کے بیچ میں ہیں۔ ہمارا انسان ہونا جو بھی حقیقت رکھتا ہے وہ اپنے تصور اور احساس سمیت ہماری عبودیت میں مندرج ہے۔ ایمان اس حقیقت کو بتام وکمال ہمارے شعور اور شعور سے پیدا ہونے والے ارادے میں لے آتا ہے اور عبادت حقیقت کے اس کمال سے اپنے آپ کو ہم آہنگ اور موافق رکھنے کا وہ نظام ہے جسے نظر انداز کر کے شعور میں موجود کسی یقین یا تصور کا کوئی اعتبار نہیں۔ یہاں ایک نزاکت ضرور ملحوظ رہنی چاہیے کہ ہمارے جلیل القدر اسلاف کے ہاں ایمان وعمل کی عینیت یا غیریت کے جو مباحث پیدا ہوئے تھے ان کا ایمان اور عبودیت کی نسبت سے کوئی تعلق نہیں۔ ایمان عمل سے چاہے عینیت نہ رکھے لیکن نفس عبودیت کے ساتھ اس کا یکجان ہونا اتنا ضروری ہے کہ اس کے بغیر ایمان کے کوئی معنی نہیں رہتے لہٰذا عبودیت کے اولیں عملی اظہار یعنی عبادت کو اس معنی میں محض عمل نہیں سمجھنا چاہیے جس کو مراد لے کر بعض ائمہ ایمان کے ثبوت کے لیے اسے لازمی حیثیت نہیں دیتے۔ اس نکتہ کو یوں سمجھیں کہ ایمان ہو یا عمل دونوں فرعیں ہیں، ان کی اصل عبودیت ہے یعنی حقیقت انسانی۔ عبودیت کا عرفان واقرار شعور میں ہو تو ایمان ہے اور عمل میں آجائے تو عبادت ہے۔ اس لئے ہمارا اصرار ہے کہ بےعملی کے باوجود ایمان کا ثابت ہو جانا اس بات کو لازم نہیں کرتا کہ عبودیت بھی مرتبۂ ثبوت کو پہنچ گئی۔

عبادت شرعی اصطلاحی مفہوم میں محض عمل نہیں ہے یہ ایمان کا لازمی اظہار اور بندگی کا ویسا ہی ضروری تقاضا ہے جیسا کہ خود ایمان۔ عبادت میں نقص ایمان میں بھی وارد ہوتا ہے یا ایمان ہی کی خرابی کا ظہور ہوتا ہے۔ ایمان وعمل کی بحثیں جس زمانے میں پیدا ہوئی تھیں اس وقت اور اس ماحول میں عمل کو عبادت پر محیط جاننے کا کوئی مضبوط قرینہ نہیں پایا جاتا تھا۔ ہمارے حالات یکسر مختلف ہیں۔ ہمارے یہاں نقص

عمل سب سے پہلے نقص عبادت میں ظہور کرتا ہے جبکہ پچھلے مسلم معاشروں میں یہ بات نہیں تھی۔ ہماری رائے میں مسلمانوں کی موجودہ حالت اس بات کی متقاضی ہے کہ اس چیز کو بالکل واضح کر دیا جائے کہ ترک عبادت گویا انکارِ اسلام ہے۔ ممکن ہے کہ دیگر عملی کوتاہیاں دین کہ ناقابل تلافی نقصان نہ پہنچائیں مگر انتظام عبادات کے بغیر کسی فرد اور کسی معاشرے کا مسلمان کہلانا بے معنی ہے بلکہ بدترین فریب دہی ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ عمل کی خرابیوں یعنی گناہوں کی باعتبار اصل دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جس سے اللہ کی ذات کا انکار متبادر ہوتا ہے چاہے اس کا اعلان نہ کیا جائے اور دوسری نوع میں اللہ کے احکام پر عمل نہ کر سکنا ظاہر ہوتا ہے۔ پہلی قسم منافیٔ اسلام و ایمان ہے اور ترک عبادت کا تعلق اسی قسم سے ہے۔ دوسری قسم کی خرابیاں البتہ مسلمان اور مومن ہونے کے دعوے کو باطل نہیں کرتیں۔ یہ بے عملی یا بدعملی کی وہ قبیل ہے جو نفس ایمان کے ساتھ لازمی عینیت نہیں رکھتی۔

کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ معروف عبادات اللہ کے احکام ہی تو ہیں لہٰذا ان عبادات سے غفلت کو گناہ کی دوسری قسم یعنی حکم کی تعمیل سے قاصر رہ جانے پر کیوں معمول نہیں کیا جا سکتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خود احکام الٰہیہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حکم خود ذات باری تعالیٰ کے حقوق کو ادا کرنے کے لئے اور دوسرا اپنے نفس یا دیگر حقوق کی پاسداری کے لئے۔ اس طرح سے دیکھیں تو ترک عبادت اللہ کے ذاتی حقوق میں سے سرفہرست حق یعنی معبودیت کی ادائی سے روگردانی ہے۔ اس میں انسانی نفسیات کی تمام مسلمات کی تائید کے ساتھ خدا کے انکار کا پہلو غالب ہے۔

اس مسئلے پر غور کرنے سے ایک بات اور سامنے آتی ہے کہ عبادت دو مفاہیم رکھتی ہے: پرستش اور اطاعت۔ ہم نے اوپر پرستش کو موضوع بنایا ہے ورنہ اللہ کے ہر حکم کی تعمیل عبادت ہی ہے۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ پرستش میں کوتاہی ایمان کی خرابی ہے اور اطاعت میں نقص مسلمانی کا نقص ہے۔ ہر آدمی فطری طور پر یہ محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے کہ ایمان اور پرستش نفس عبودیت میں ہم معنی ہیں لہٰذا پرستش کو یعنی معروف عبادات کو بندگی کے ان مظاہر سے جو اطاعت پر دلالت کرتے ہیں، ممتاز رکھنا چاہئے ورنہ بعض ضروری مسائل لانحل رہ جائیں گے۔

س: پرستش اور اطاعت میں کیا فرق ہے؟

ج: اگر اللہ کی جہت سے دیکھیں گے تو دونوں میں مرتبے کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ اللہ کا معبود ہونا وہی شان رکھتا ہے جو اللہ کے حاکم ہونے میں موجود ہے۔ البتہ انسانی پہلو سے دیکھیں گے تو انسان کے باطنی تجزیے کے مطابق ان میں خاصا فرق ہے۔ یہ فرق درجات کا نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ایک بنیادی انسانی استعداد سے ہے۔ وہ استعداد تعلق کی استعداد ہے۔ انسان کی تمام صلاحیتوں

کو منہا کرتے چلے جائیں تو آخر میں جو صلاحیت باقی بچے گی وہی تعلق کی صلاحیت ہو گی۔علم ہو یا اختیار ہر وصف اسی جوہر تعلق کے اقتضاء کی تکمیل کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر انسان جو ہر تعلق کا نام ہے اور اس کا عالم، خودمختار، ناطق۔۔۔وغیرہ ہونا اسی جوہر کی نمود ہے۔ یہ اولیں استعداد جو کسی اور صلاحیت کا نتیجہ نہیں ہے، پرستش پر قائم ہے کیونکہ پرستش کی مناسبت اس سے زیادہ ہے۔

اس کی ضروری تفصیل یہ ہے کہ انسان کے باطنی حقائق پر غور کرنے والا کوئی بھی شخص نہایت آسانی اور تقریباً قطعیت کے ساتھ دریافت کر سکتا ہے کہ اپنی اصلی ماہیت میں نفس انسان کا اولین مطالبہ حصول تسکین یا حصول اطمینان ہے اور اس کے متوازی ثانوی تقاضا بقائے دوام ہے یعنی نفس انسانی کے بنیادی تقاضوں کو ایک تاریخی ترتیب سے دیکھا جائے تو یوں کہا جائے گا کہ یہ پہلے تسکین چاہتا ہے اور پھر دوام۔حصول تسکین کی بنیاد ظاہر ہے کہ براہ راست اس تعلق سے ہے جو انسان کی حقیقت ہے جب کہ خواہش بقا کو یہ نسبت بالواسطہ حاصل ہے۔سادہ لفظوں میں یوں سمجھیے کہ بندہ اللہ سے تعلق کو پہلے سرچشمۂ اطمینان بناتا ہے اور پھر اپنی جانثاری اور اخلاص دکھا کر اس سے کچھ امیدیں باندھتا ہے۔اطمینان پیدا کرنے والے ذرائع بھی اللہ عطا فرماتا ہے اور امیدیں باندھنے والا مواد بھی وہی عنایت کرتا ہے۔ دین کا پورا نظام عبادت پہلی قبیل سے ہے اور نظام اطاعت دوسری سے۔ عابد مطمئن ہوتا ہے اور مطیع پر امید۔ گویا عبادت بندگی کے جوہر کو تسکین کے منتہیٰ تک پہنچاتی ہے اور اطاعت اس جوہر کو امید کے منتہیٰ تک۔عبادت سے تسکین پانا تو واضح ہے کہ اس میں اللہ کی ذات کا سامنا یکسوئی کے ساتھ اور واسطوں کی کثرت کے بغیر میسر آتا ہے جبکہ اطاعت میں عبادت والی یکسوئی اور واسطوں کی کثرت کے نہ ہونے کی کیفیت نہیں پائی جاتی۔ یہ معاذ اللہ اطاعت کا کوئی نقص نہیں بیان کیا جا رہا بلکہ انسان کی حقیقی بناوٹ کے اندر رہتے ہوئے عبادت اور اطاعت کی اس حد رسائی کو دیکھنے کی کوشش کی جارہی ہے جو یہ دونوں نفس انسان میں رکھتے ہیں۔

تو خیر ذکر یہ ہو رہا تھا کہ بندگی جس اخلاص سے عبارت ہے باعتبار ترتیب اس کی تشکیل کا عمل عبادت میں ہوتا ہے۔اس کے بعد تکمیل کے مراحل اطاعت سے طے ہوتے ہیں۔اس لئے ذوق بندگی جو دراصل کمال بندگی پر دلالت کرتا ہے تسکین عبادت سے پاتا ہے اور تکمیل اطاعت سے۔غرض جس طرح بھی دیکھیں فطرت انسانی کا اولیں داعیہ عبادت ہے اور خود عبادت کے قیام کی واحد بنیاد اطاعت ہے۔تو یہ کہنا کہ اطاعت کل ہے اور پرستش اس کا جزو، الٹی بات ہے۔صحیح صورت تو یہ ہے کہ پرستش کل ہے اور اطاعت اس کا جزو کیونکہ پرستش روح تعلق ہے اور اطاعت صورت تعلق۔اسی لئے ہم باصرار کہتے ہیں کہ ذوق عبادت کے بغیر اطاعت کا ظاہری نظام ایک مکمل اور خوبصورت جسد ہے مگر بے روح۔اس

میں اخلاص تو موجود ہوسکتا ہے مگر کمال اخلاص کا حصول اس وقت تک محال ہے جب تک ذوق عبادت ہر دوسری چیز پر غلبہ نہ رکھتا ہو۔ ہاں! یہ ٹھیک ہے کہ مقتضائے اطاعت سے اس ذوق عبادت پر عمل کو کم کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک دوسرا موضوع ہے لیکن بہتر ہے کہ یہیں واضح کر دیا جائے کہ انسان کی دینی ذمہ داریوں کا تعین بنیادی طور پر اطاعت سے ہوتا ہے ذوق عبادت سے نہیں۔ ہمیں کن حالات میں کیا کرنا چاہیے اس کا فیصلہ ذوق پرستش پر نہیں چھوڑا جا سکتا ورنہ شریعت کے تمام مقاصد درہم برہم ہو سکتے ہیں۔ اس فیصلے کا دار ومدار فرائض کے اس نظام پر ہے جو شریعت یعنی ظاہر احکام کی دین ہے اور اس سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے جو قوت درکار ہے، وہ قوت اطاعت ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اب پوری بات کسی افراط وتفریط کے بغیر متوازن انداز میں سامنے آ گئی ہو گی اور اصولاً یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ ذوق پرستش کا نقص ایمانی نقص ہے جب کہ جذبۂ اطاعت کی خرابی عملی خرابی ہے۔ لیکن یہ ملحوظ رہے کہ یہاں بات خرابی کی ہو رہی ہے فقدان کی نہیں۔ خرابی کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو بہر حال جزوی ہوتی ہے۔

ان باتوں پر قرآن وسنت سے متعدد اسناد لائی جا سکتی ہیں۔ وہ ان شاء اللہ آئیں گی بھی لیکن تمہید کے طور پر سر دست مندرجہ ذیل نکات کو موضوع فکر بنائیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ انسان کے جتنے مطلوبہ خصائص بیان کرتا ہے ان میں بیک وقت دو پہلو موجود ہوتے ہیں۔ گفتگو میں سہولت کے لئے ایک کو داخلی یا اصولی پہلو کہہ لیں اور دوسرے کو خارجی یا عملی۔ ان میں سے کوئی ایک بھی منہا نہیں ہوسکتا تاہم قاعدے کے مطابق تقدم اور کلیت اصولی یا داخلی پہلو کو حاصل ہو گی۔ مثال کے طور پر کچھ ضروری اوصاف کا تجزیہ کیجیے جیسے تقویٰ، اخلاص، خشیت، محبت، توکل، ذکر، حمد، صبر، تسلیم ورضا۔۔۔وغیرہ۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی کھنگال کر دیکھ لیں۔ اس کا قیام جس بنیاد پر ہو گا وہ پرستش ہی ہے، اظہار البتہ اطاعت پر مبنی ہے۔ اگر ضرورت پڑی تو ہم اس طرح کا تجزیہ بھی موقع بہ موقع کریں گے۔ فی الوقت دو باتیں سمجھ لینی ضروری ہیں: پہلی یہ کہ اطاعت میں جبر کا عنصر مکمل طور پر ختم نہیں کیا جا سکتا تاوقتیکہ ذوق پرستش اس کی پشت پر نہ ہو۔ دوسری یہ کہ اللہ کے ساتھ تعلق میں اخلاص اس آمادگی کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتا جو جبر کی ضد ہے اور جذبۂ پرستش کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ بالکل عملی انداز سے دیکھا جائے تو ایک معمولی استعداد والا ذہن بھی اس نکتے کو گرفت میں لے سکتا ہے کہ اللہ کے لئے کیا جانے والا کوئی بھی عمل داعیۂ پرستش کے بغیر محض ایک تکلف ہے بلکہ ایک دھوکہ ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ ایک شخص دین کو ساری دنیا پر غالب کرنا چاہتا ہے مگر خود اس کا یہ حال ہے کہ نماز میں دل نہیں لگتا، اللہ کی یاد سے بھاگتا ہے، ذکر وتلاوت کی طرف کوئی رغبت نہیں رکھتا۔ اس شخص کے جذبات خواہ کتنے ہی شدید کیوں نہ ہوں، دینی معیار سے

بے بنیاد ہیں۔ غلبۂ دین کی جدوجہد وغیرہ اس کا کوئی نفسیاتی مسئلہ تو ہوگا مگر اس کی کوئی دینی وقعت نہیں ہے۔ جو بندہ پوری آمادگی کے ساتھ دین کو اپنے اوپر غالب آنے کا موقعہ نہیں دیتا یعنی ذوق پرستش کو پروان نہیں چڑھاتا وہ دین میں درکار ہر کامیابی حاصل کرسکتا ہے مگر بندگی کی اس کسوٹی پر پورا نہیں اتر سکتا جس پر آخرت کا دارومدار ہے۔ تعجب ہے کہ آدمی اتنی واضح بات کو قبول کرنے سے ہچکچائے کہ بندگی اللہ سے سچے تعلق کا نام ہے اور یہ تعلق پرستش سے اولیں فطری مناسبت رکھتا ہے۔

بات محض یکطرفہ ہوکر نہ رہ جائے اس لئے یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ وہ شخص بھی دین کا صحیح نمائندہ نہیں ہے جو نوافل و اذکار میں تو پوری قوت اور رغبت سے مشغول رہتا ہے لیکن اخلاق و معاملات اور دین کی طرف سے عائد کردہ دنیاوی ذمہ داری سے غافل ہے۔ اس کی عبادت گزاری بھی محض ایک دھوکہ ہے کیونکہ اس نے تعلق باللہ کے تمام تقاضوں کو نہیں نبھایا اور اپنی طبیعت اور خواہش کی رہنمائی میں کچھ کو قبول کرلیا اور باقی کو چھوڑ دیا۔ ڈر ہے کہ یہ آدمی پہلے شخص کے مقابلے میں زیادہ بڑے خطرے میں مبتلا ہے کیونکہ اس نے اللہ کے آگے اپنی مرضی چلائی ہے۔ پہلا آدمی تو اصولاً ایک نقص پر کھڑا ہے جبکہ یہ مجرمانہ غفلت اور سرکشی کا مرتکب ہورہا ہے۔ ہاں! اگر اطاعت پہ زور دینے والا ترک عبادت کی طرف مائل ہوتو پھر یہ گویا دین ہی کا انکار ہے لیکن ظاہر ہے ایسا ہے نہیں۔

دین کی مراد پر ڈھلنے کے لئے تین مراتب یکے بعد دیگرے حاصل کرنے پڑتے ہیں:

۱۔ پرستش میں کمال　۲۔ اطاعت میں رسوخ　۳۔ اللہ کی مکمل غلامی

پہلے دو مراتب راستے کی طرح ہیں اور تیسرا مرتبہ منزل کی طرح۔ دوسرے لفظوں میں مطلوب یہ ہے کہ بندہ اللہ کی مکمل غلامی میں چلا جائے اور یہ غلامی اس کے لئے محبوب ترین اعزاز ہو جس پر وہ فخر کرسکے۔ یہاں سے دیکھیں تو بات بالکل صاف ہو جاتی ہے۔ بندہ بمعنی غلام اپنی بندگی کو اس وقت تک محکم اور کامل نہیں کرسکتا جب تک اس کا مالک اس کے لئے محبت اور خشیت دونوں کا منتہیٰ نہ ہو۔ محبت اور خشیت کا اجتماع پہلے قدم پر جذبۂ پرستش پیدا کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں اطاعت کی تفصیل عمل میں آتی ہے۔ کمال بندگی کی سطح پر پہنچ کر احکام پر عمل کرنے کی حالت اور سجدے کی حالت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اسی لئے ہم پھر اصرار کررہے ہیں کہ پرستش و اطاعت میں فی الاصل کوئی مغائرت نہیں ہے لیکن ہمارے دور میں بدقسمتی سے یہ مغائرت پیدا کر دی گئی ہے اور اس کا نقصان زیادہ تر ذوقِ پرستش کو پہنچ رہا ہے۔ اس لئے ہم نے ضروری سمجھا کہ ان دونوں کی واقعی ترتیب کو زور دے کر بیان کر دیا جائے ورنہ مقصود یہی ہے کہ اطاعت جذبۂ پرستش کا اظہار بن جائے اور پرستش قوت اطاعت میں ڈھل جائے۔ ہمارا دین ہم سے یہی چاہتا ہے۔

سیّد خالد جامعی

ٹیکنالوجی اور ٹیکنو سائنس

جدید سائنس اور سرمایہ داری کا باہمی تعلق

جناب پروفیسر شاہد رشید صاحب نے ''البرہان'' جولائی ، اگست ۲۰۱۱ء کے شماروں میں راقم الحروف اور جناب ڈاکٹر وہاب سوری صاحب کی گفتگو پر اپنے شبہات کا اظہار ستمبر ۲۰۱۱ء کے'' البرہان'' میں کیا ہے — اس سے پہلے کہ محترم شاہد صاحب کے سوالات، شبہات اور اعتراضات کا (جن میں سے بیشتر غلط فہمی کی بنیاد پر قائم کئے گئے ہیں) جواب دیا جائے چند بنیادی مباحث واضح کیے جارہے ہیں تاکہ یہ مکالمہ ایک طے شدہ منہاج میں کیا جائے اور اپنے منطقی انجام تک پہنچے نہ کہ محض غلط فہمیوں اور الزام درالزام قسم کی کوئی چیز بن جائے۔

ا۔مغربی سائنس کی حقیقت

جب ہم سائنس کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد یونانی سائنس، قدیم سائنس [Classical Science]، سکالسٹک سائنس [Scholastic Science] ارسطو کی سائنس [Aristotal Science]، اسلامی سائنس [Islamic Science] نہیں ہوتی بلکہ اس سے مراد جدید سائنس [Modren Science] ہوتی ہے جس کا ایک خاص تعلق اس مابعد الطبیعیاتی انقلاب سے ہے جسے ہم فلسفے اور سائنس کی زبان میں کوپرنیکی انقلاب [Copernecian Revolution] کے نام سے جانتے ہیں جس نے علمیت (تصور و فلسفۂ علم یعنی Epistemology) کے پیمانے تبدیل کردیے۔ اس انقلاب کی فلسفیانہ تشریح کانٹ کے فلسفیانہ کام کے ذریعے منظر عام پر آئی۔ کانٹ کے فلسفے نے ۱۷ویں صدی سے پہلے کے تمام فلسفوں اور مابعد الطبیعیاتی اساسات کو منہدم کر کے نئی مابعد الطبیعیات کی بنیاد رکھی جسے ہم ہائیڈیگر کے الفاظ میں 'حاضر وموجود کی مابعد الطبیعیات' [Metaphysics of Presence] کہتے ہیں۔ کانٹ نے کہا کہ ماورائے طبیعیات کا علم ہم میسر ذرائع علم [عقل، وجدان، حواس، تجربات] کے ذریعے حاصل نہیں کرسکتے۔ حقیقت مطلق کیا ہے؟ اس کا ادراک میسر وموجود ذرائعِ علم سے ممکن نہیں۔ گویا ہم حقیقت کی حقیقت نہیں جان سکتے کیونکہ علم مظاہر [Phenomenon] تک محدود ہے، مشاہدے اور حسی تجربے سے ہی ممکن ہے اور مستور و مخفی

اشیاء کا علم [Nomenon] انسان کے لیے ممکن نہیں۔ ہم حقیقت کی کنہہ نہیں جان سکتے لیکن ہم حقیقت تخلیق کر سکتے ہیں اور اس تخلیق شدہ حقیقت کو کائنات پر مسلط بھی کر سکتے ہیں۔ یہی آزادی [Freedom] کے فلسفے کا حاصل ہے لہذا تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ انسان نے تلاش وجستجوئے حقیقت کے بجائے تخلیق حقیقت [Creation of Reality] کا فلسفہ ایجاد کیا جس کے نتیجے میں حقیقت مطلق اور مابعد الطبیعیاتی سوالات غیر عقلی قرار پائے۔ انسان کے لیے حقیقت الحقائق اور ماورائے طبیعیات کا علم ناممکن الحصول قرار پایا اور یہ طبعی، مادی، تجربی، حسی دنیا اور اس کے حصول کے جملہ مادی طبیعی تجربی علوم ہی اصل علوم قرار پائے۔

اس فلسفے کے نتیجے میں طبعی علوم اور سائنسی ترقی کی غیر معمولی رفتار نے دنیا کو حیران کر دیا۔ جب علم کا مطلب محض مادی رہ گیا اور علم کا مقصد صرف مادی ترقی ہی قرار پایا تو جدید انسان نے اپنی توانائیاں، حکومتوں نے اپنا تمام سرمایہ اور قوتیں اسی شعبے میں صرف کیں لہٰذا زبردست مادی ترقی نے روحانیت کو بے معنی کر دیا اور مابعد الطبیعیاتی مباحث، معاملات اور سوالات علم کے دائرے سے خارج ہوگئے۔ اٹھارہویں صدی سے پہلے تمام تہذیبوں میں خصوصاً مادیت اور روحانیت ایک کلیت کا حصہ تھے۔ نقلی، عقلی اور مادی علوم ایک کُل سے وابستہ تھے اور اسی کلیت میں ان کو دیکھا اور جانچا پرکھا جاتا اور اسی کلیت میں ان کی تخلیق اور نشو ونما کا عمل ہوتا تھا مغرب کی طرح ذہن اور جسم کی دوئی [Dualism] کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ اس وقت مابعد الطبیعیات پہلے ہوتی تھی اور اس مابعد الطبیعیات کے مطابق علمیت وجود پذیر ہوتی تھی یعنی علمیت کا ماخذ مابعد الطبعیات تھی۔ خود علمیت علمیت کا منبع اور سرچشمہ نہیں تھی۔ ڈیکارٹ، جو جدید فلسفے کا بانی ہے، اس نے 'I think therefore I am' کا فلسفہ پیش کر کے اُس ترتیب کو بدل دیا ـــــ ڈیکارٹ کے فلسفے کے نتیجے میں علمیت پہلے آگئی اور اس علمیت سے مابعد الطبیعیات اخذ کی گئی ـــ ڈیکارٹ نے یہ بتایا کہ ہم علمیت کے ذریعے کیا جان سکتے ہیں اور کیا نہیں جان سکتے لہٰذا مابعد الطبیعیات غیر اہم ہوگئی۔ جدید سائنس کا بنیادی المیہ یہی ہے کہ یہاں علمیت سے مابعد الطبیعیات اخذ ہوتی ہے لہٰذا جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے دائرے میں صرف مادیت ہی باقی رہ گئی اس کا تعلق صرف مادہ پرستی کی اقدار سے وابستہ ہوگیا اور دیگر تمام اقدار سے منقطع ہوگیا لہٰذا جدید سائنس میں روحانیت، اسلامیت اور مذہبیت داخل کرنے کی کوشش اس سائنس کی حقیقت، حیثیت، کیفیت اور تاریخ سے ہماری عدم واقفیت ہے۔

۲۔ ٹیکنالوجی سے کیا مراد ہے؟

جب ہم ٹیکنالوجی کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد سترہویں صدی سے پہلے کے معاشروں اور تہذیبوں میں موجود ٹیکنالوجی نہیں ہے بلکہ وہ ٹیکنالوجی جو جدید سائنس کے نظریات کے تابع تخلیق کے مراحل سے گزری اور اس جدید سائنس میں موجود جدید انسان جو ہر خارجی ذریعۂ علم کا انکار کر کے تخلیق حقیقت کے دعوے کے ساتھ نئی مابعد الطبیعیات کو مادی سانچوں میں سرمایہ [Capital] کے ذریعے ڈھال کر ٹیکنالوجی ایجاد کر رہا تھا جسے فلسفہ سائنس اور فلسفے کی زبان میں اب عموماً ٹیکنالوجی نہیں بلکہ Techno Science کہا جاتا ہے جس کی توام اصطلاح Scientism بھی ہے لہٰذا جدید مابعد الطبیعیاتی مسلمات، جدید سائنس اور سرمایہ داری کی تثلیث کے ذریعے جو ٹیکنو سائنس جود میں آئی اسے ہم مثلث کے ذریعے یوں ظاہر کر سکتے ہیں۔
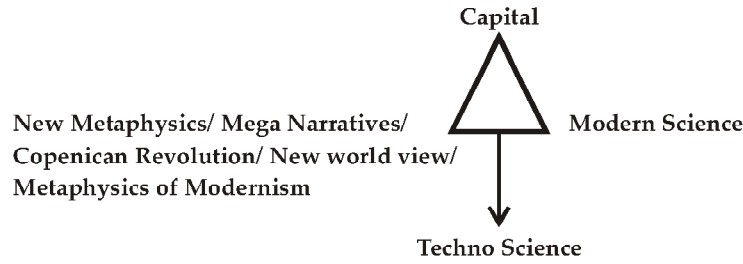
ان معنوں میں ہم یہ کہتے ہیں کہ جب جدید مابعد الطبیعیات جو اس دنیا کو ارسطو کی زبان میں ابدی [Eternal] سمجھ کر اس دنیا کو جنت میں تبدیل کرنے کے لیے آزادی کے آدرش کے دوش بہ دوش جدید سائنس اور سرمایے کے ذریعے ٹیکنالوجی کا قالب اختیار کرتی ہے تو وہ اقداری Value laden ہوتی ہے۔ اس کی یہ اقدار جدید فلسفے میں موجود تصور انسان، تصور کائنات، تصور آخرت اور تصور حقیقت سے اخذ ہوتی ہیں جہاں انسان ایک مطلق آزاد فرد ہے کسی کو جواب دہ نہیں۔ اس کی زندگی کا مقصد محض آزادی میں اضافہ ہے، وہ خود علم کا ماخذ، منبع و سرچشمہ ہے اور وہ خود پیمانۂ علم بھی ہے۔ آزادی میں اضافے کی بے شمار شکلیں ہیں لیکن موثر ترین شکلیں سرمایہ، مارکیٹ اور ترقی ہے۔ عہد حاضر میں آزادی دو سطح پر اپنا اظہار کرتی ہے۔ آزادی کا تجریدی اظہار یا شکل [Abstract form] ووٹ ہے اور آزادی کا حقیقی مادی پیکر [Concrete form] سرمایہ [Capital] ہے۔

عصر حاضر کی ٹیکنو سائنس کی ترقی سرمایہ سے شروع ہوتی ہے، سرمایہ میں ارتکاز کے لیے ہوتی ہے اور اس ارتکاز سرمایہ کی کوئی آخری حد نہیں ہے۔ جو شے سرمایہ سے پیدا ہوئی اور سرمایے کے ذریعے وجود میں آئی اس کا مقصد سرمایہ اور صرف سرمایہ میں اضافہ کے سوا کیا ہوسکتا ہے؟ ارتکاز سرمایہ کا یہ عمل اور خواہش لا متناہی (∞) ہے لہٰذا ٹیکنو سائنس کی ترقی کی رفتار بھی لا متناہی ہے۔ اس کا کوئی آخری کنارہ نہیں اس کی وسعتیں سمندروں اور آسمانوں سے بھی زیادہ ہیں۔

۳۔ نظام سرمایہ داری کیا ہے؟

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ دولت [Wealth] اور سرمایہ [Capital] میں بنیادی فرق ہے۔ یہ دونوں مترادف یا ہم معنی اصطلاحات نہیں ہیں۔ اٹھارہویں صدی سے پہلے دنیا میں کہیں سرمایہ نہیں تھا۔ دولت پہلے بھی تھی اور دولت آج بھی ہے لیکن سرمایہ پہلے کبھی نہیں تھا مگر آج سرمایہ کا دور ہے۔ اسی طرح بازار اور مارکیٹ توام اصطلاحات نہیں ہیں۔ اٹھارہویں صدی سے پہلے دنیا کی ہر تہذیب میں بازار ہوتا تھا مارکیٹ نہیں ہوتی تھی۔ بازار روایتی، غیر سرمایہ دارانہ اور نیم سرمایہ دارانہ معاشروں میں آج بھی موجود ہیں مگر یہ رفتہ رفتہ ختم ہو رہے ہیں ان کی جگہ مارکیٹ لے رہی ہے۔ مارکیٹ خاص جدید مغربی فلسفے اور جدید مغربی آدرشوں کے آمیختے سے نکلنے والا پھل ہے۔ مارکیٹ اور سرمایہ [Market & Capital] کی اصطلاحات سمجھے بغیر آپ ''ٹیکنو سائنس'' کی اصطلاح کی حقیقت سمجھ نہیں پائیں گے اور خلط مبحث کا شکار رہیں گے لہٰذا مکالمے کے پہلے مرحلے میں ہم ان دونوں اصطلاحات کی حقیقت بھی واضح کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ ٹیکنالوجی کی تخلیق کے ضمن میں سائنس اور سرمایہ کے تعلق کو فلسفیانہ گہرائی کے ساتھ سمجھ لیا جائے اور سرمایہ کو عام کرنے اور اسے ایک نظام زندگی کے طور پر مسلط کرنے کے ضمن میں مارکیٹ کے کردار کو بھی طشت از بام کر دیا جائے۔

۴۔ جدید ٹیکنالوجی کا تعلق سرمایہ داری سے

جب ہم جدید ٹیکنالوجی کی بات کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اس کا واحد مقصد سرمائے میں اضافہ اور ارتکاز ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ارتکاز سرمایہ کا عمل خراچ معاشرے [consumer society]، مسلسل صَرف کی حکمت عملی [Constant consumption]، لذت پرستی [Hedonism] اور افادہ پرستی [Utilitarianism] کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ لوگ لذت طلبی، افادہ

پرستی اور خراج معیشت کو جیسے جیسے قدر کے طور پر اختیار کرتے چلے جائیں گے ٹیکنالوجی کی ترقی تنوع اور رفتار میں لا محدود اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔جس قدر [Value] ،آزادی [Freedom]اور سرمایہ [Capital] نے اس ٹیکنو سائنس کو جنم دیا ہے اس کے استعمال کے نتیجے میں اس تہذیب اور معاشرت میں آزادی اور سرمایہ سے متعلق اقدار و روایات ہی عام ہوں گی وہاں اسلامی اخلاق واقدار عام نہیں ہوسکتیں۔ گزشتہ ایک سو برس کی تاریخ ہماری دلیل کی توثیق، تائید اور تصدیق کرتی ہے۔ دنیا کے تمام روایتی اور مذہبی معاشروں میں بھی ان کی اقدار ختم ہوگئیں اور آزادی و سرمایہ کی اقدار نے ان کی جگہ لے لی۔ اصل سوال یہی ہے کہ اگر ٹیکنو سائنس غیر اقداری ہے تو یہ ہر مذہب، تہذیب اور معاشرت کی اقدار کیوں بدل دیتی ہے؟ اس لیے کہ جدید ٹیکنالوجی کا مقصد محض سرمایہ دارانہ نظام اور سرمایہ کی ترسیل اور ارتکاز میں مسلسل، مستقل اور لا متناہی اضافہ ہی ہے۔ تو یہ بیان واضح کرتا ہے کہ جس شے کا آغاز سرمایہ کے بغیر ممکن نہیں ہے اس کا اختتام سرمایہ کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا لہٰذا ٹیکنو سائنس جب نظام سرمایہ داری کے بطن سے ظہور کرتی ہے تو صرف سرمایہ کی قدر ہی اس کے باطن میں پیوست ہوتی ہے۔ اسے سرمایہ داری کے مقاصد سے مختلف یا اس سے متصادم مقاصد کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ یہ متعین قدر [Guided Value] کے ساتھ اپنے سفر اور مرحلہ تخلیق کا آغاز کرتی ہے لہٰذا یہ ترقی کے سفر کے کسی لمحے میں بھی سرمایہ داری اور اس کی متعین اقدار سے الگ نہیں ہوسکتی۔

۵۔ جدید ٹیکنو سائنس کی اقدار

لہٰذا یہ مفروضہ کہ ہم صرف جدید مغربی ٹیکنالوجی یا ٹیکنو سائنس کے ہی مخالف نہیں ہیں بلکہ سترہویں صدی سے پہلے روایتی الہامی تہذیبوں میں موجود ٹیکنالوجی کے بھی خلاف ہیں ایک غلط خیال ہے اور ہم اس کی مکمل تردید کرتے ہیں۔ ہماری گفتگو کا ہدف صرف جدید ٹیکنالوجی یا ٹیکنو سائنس ہے جو اپنے آغاز سے ہی سرمایہ دارانہ علمیت ، سرمایہ دارانہ شخصیت ،سرمایہ دارانہ ما بعد الطبیعیات، سرمایہ دارانہ مقاصد ،اہداف، ارادوں اور سرمایہ دارانہ اداروں کے ذریعے صرف اور صرف حرص، ہوس، حسد، لذت پرستی، افادہ پرستی اور معیار زندگی میں مسلسل اضافے کے ذریعے آزادی کی بے کراں وسعتوں کو فروغ دینے اور دنیا بھر کو معیار زندگی کے مذہب ''آزادی'' [Religion of Freedom] کے تسلط کے لیے ایجاد کی گئی ہے۔ چونکہ جدید ٹیکنو سائنس غیر اقداری [Value

[neutral] نہیں ہے بلکہ Value Lidden ہے لہذا خاص متعین مقاصد [Guided Values] کے لیے ایجاد کردہ اس ٹیکنو سائنس کو کسی دوسری قدر [Value]، کسی دوسرے نظریہ حیات یا کسی اور مابعد الطبعیات کے ذریعے تبدیل کر کے سرمایہ دارانہ مابعد الطبعیات کے سوا کسی دوسرے ما بعد الطبیعیاتی مقاصد کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ اسلام الہامی نظریۂ حیات ہے اور اس کی ما بعد الطبیعیاتی اساسات جدید مغربی فلسفے اور جدید سائنس وٹیکنالوجی کی مابعد الطبیعیاتی اساسات سے یکسر مختلف ہیں لہٰذا اسلامی الہیات وعقائد کی روشنی میں اسلامی تہذیب کے اندر ٹیکنالوجیکل ترقی کی وہ رفتار ممکن ہی نہیں جو سرمایہ داری کی اساس اور قدر پر قائم ٹیکنو سائنس کے منہاج میں ہر لحہ ممکن نظر آتی ہے۔ اٹھارہویں صدی سے پہلے کی تہذیبوں میں ٹیکنالوجی انسانی ضروریات پوری کرنے کے لیے ایجاد ہوتی تھی لیکن ٹیکنو سائنس کا مقصد ضروریات کو پورا کرنا نہیں ضروریات کو تخلیق کرنا بلکہ لا محدود پیمانے پر تخلیق کرتے چلے جانا ہے تاکہ خراج معاشرہ [Consumer Society] بڑھتا اور پھیلتا رہے۔ اس طرح سرمایے کے چکر [Capital Circle] کے چلتے رہنے اور سہولتوں اور ٹیکنالوجی میں مسلسل ترقی کے نام پر لوگوں کو اربوں کھربوں ٹن کوڑا پیدا ہو گیا ہے اور جو کوڑا پیدا ہو رہا ہے اس کو ٹھکانے لگانے کے مسائل سنگین رخ اختیار کر چکے ہیں۔ ضرورت کے لیے کسی ایجاد کا ظہور پذیر ہونا اور ضروریات کی تخلیق کرنا دو مختلف کام ہیں مثلاً قلعے کی فصیلوں کو توڑنے کی ضرورت پیش آئی تو منجنیق ایجاد کر لی گئی مگر فصیل توڑنے کے فوراً بعد فصیلوں کو آناً فاناً تعمیر کرنے کی مشین ایجاد کرنے کا خیال لوگوں کو نہیں آیا۔ اہرام مصر تعمیر ہوئے مگر اہرام کی ٹیکنالوجی فروخت کر کے اس سے نفع کمانے اور اسے برآمد کرنے [Export] کا خیال کسی قلب میں نہیں پیدا ہوا۔ اس کا سبب ان تہذیبوں کا ما بعد الطبیعیاتی تناظر تھا جہاں مادی زندگی کل زندگی کا ایک حصہ تھی صرف مادی زندگی کو مکمل زندگی نہیں تصور کیا جاتا تھا۔

۶۔ جدید ٹیکنالوجی مغربی علمیت کا منطقی نتیجہ ہے

پروفیسر شاہد رشید صاحب کی اس رائے سے راقم کو اختلاف ہے نہ ڈاکٹر عبدالوہاب سوری صاحب کو کہ کسی معاشرے اور تہذیب میں پیدا ہونے والی ٹیکنالوجی اس تہذیب کی تہہ میں کارفرما فلسفۂ علم اور اس کے مخصوص تصور کائنات یعنی ما بعد الطبیعیاتی تصورات کی حامل ہوتی ہے اور یہی تصورات نہ صرف اس معاشرے کی بلکہ اس معاشرے کی تخلیقی سرگرمیوں کی صورت گری بھی کرتے

ہیں کیونکہ ٹیکنو سائنس اٹھارہویں صدی میں مغرب کے جدید فلسفے اور جدید تعقل کے غلبے کے زیر اثر وجود پذیر ہوتی ہے لہٰذا اس ٹیکنو سائنس میں مغرب کی مسلمہ اقدار آزادی اور ترقی کے سوا کوئی اور قدر داخل ہی نہیں کی جاسکتی اور اگر آزادی اور ترقی کے سوا کسی الہامی تہذیب کی کوئی قدر اس ٹیکنو سائنس میں داخل کرنے کی کوشش کی جائے گی تو ٹیکنالوجی کے غبارے سے ہوا ایک لمحے میں نکل جائے گی کیونکہ یہ ترقی صرف سرمایہ کے ساتھ ممکن ہے۔ سرمایہ اور سائنس کو الگ کرتے ہی جدید ٹیکنالوجی کا پھولتا ہوا غبارہ پھٹ کر سمٹ جائے گا لہٰذا اس امر میں کوئی اختلاف نہیں کہ اسلامی تہذیب میں پیدا ہونے والی سائنس وٹیکنالوجی اور اس ٹیکنالوجی کا طریقہ اور اس کے مقاصد و اہداف مغربی فلسفے کے تحت پیدا ہونے والی سائنس وٹیکنالوجی سے یکسر مختلف ہوں گے۔ اسلامی تہذیب کی ٹیکنالوجی اسلامی مابعد الطبیعیات کے اصل مقصد [فکر آخرت اور معرفت رب] سے لازما ہم آہنگ ہوگی اور جدید مغربی ٹیکنالوجی مغربی فلسفے کے مقاصد [آزادی اور ترقی کے اصولوں] سے ہم آہنگ ہوگی۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی مسلم مفکر یہ دعویٰ کردے کہ انبیاء کی آمد کا مقصد بھی مادی ترقی اور آزادی میں مسلسل اضافہ تھا اور وہ معیار زندگی بلند کرانے کے لئے تشریف لائے تھے۔ لہٰذا اگر ٹیکنو سائنس میں الہامی ما بعد الطبیعیات داخل کردی جائے تو اس کی ترقی ٹھٹھر کر رہ جائے گی اور ممکن ہے کہ ترقی کا عمل ہی منجمد ہو جائے۔ مثلاً جدید تباہ کن عسکری ہتھیار، نیوکلیئر ٹیکنالوجی، فلم، جمالیات، فیشن اور فوڈ کی صنعتیں، تفریح اور لذت پرستی کی صنعت [Entertainment Industry] ، اشتہاری صنعت، [Advertisment]، سیاحت کی صنعت [Tourism Industry]، پلاسٹک سرجری، اسقاط حمل کی ادویات کی صنعت، نفسیاتی امراض اور امراض قلب سے متعلق مختلف صنعتیں اسلامی نظریہ حیات کے موثر اطلاق کے ساتھ ہی لمحوں میں ختم ہو جائیں گی۔

۷۔ مغربی ٹیکنالوجیکل ترقی کسی دوسری علمیت میں ممکن ہی نہیں

اگر مغرب میں آج سرمایہ کی لا متناہی بڑھوتری پر حدود نافذ کردی جائیں تو یقیناً یہ پابندی ٹیکنو سائنس کی ترقی کی رفتار میں زبردست رکاوٹ پیدا کرے گی اور ایسی پابندی مغرب کے فلسفہ آزادی [Philosophy of Freedom] کے منافی ہوگی کیونکہ آزادی کے اظہار کے لامحدود طریقے ہیں لہٰذا آزادی کو کسی خاص طریقے سے اظہار کا پابند کرنا آزادی کے اصول اور قدر کے منافی رویہ ہے۔ اس فلسفے کی تشریح سمجھنے کے لیے اس صدی کے ایک بڑے سیاسی فلسفی John Rawls کی کتاب

Theory of Justice کا مطالعہ مفید رہے گا۔

روس میں ریاستی مداخلت کے بغیر آزادانہ مسابقت [Free Market] کے لبرل فلسفے کے بجائے جب سرکاری منصوبہ بندی [Planning] کے ذریعے ٹیکنالوجیکل ترقی کی بھرپور کوشش کی گئی تو کئی جہتوں میں یہ کوشش کامیاب ہونے کے باوجود فری مارکیٹ کے ذریعے وباء کی طرح پھیلنے والی ٹیکنالوجی کا مقابلہ کرنے میں مکمل ناکام رہی حالانکہ مغرب اور روس دونوں سرمایہ کے ذریعے آزادی، مساوات، ترقی اور معیار زندگی میں ٹیکنالوجی کے ذریعے مسلسل اضافے کی اقدار پر یکساں یقین رکھتے تھے لیکن لبرل سرمایہ دارانہ نظام ہر شخص کو اس کی صلاحیت یعنی قوت خرید کے مطابق مساوی طور پر [Each according to his effeciency] ٹیکنالوجی مہیا کرنے پر یقین رکھتا تھا جبکہ روس ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق [Each according to his needs] ٹیکنالوجی مہیا کرنے کے فلسفے پر عامل تھا لہٰذا لبرل سرمایہ داری میں جس تنوع، برق رفتاری، کمال فن اور جمالیاتی کشش کے ساتھ ٹیکنالوجیکل ترقی ممکن ہوئی غیر لبرل روس میں وہ ترقی نہ ہوسکی کیونکہ وہاں ٹیکنالوجی کی ترقی پر حکومتی تحدیدات عائد تھیں وہ مساوات کے اصول کے تحت ہر ایک کو ٹیکنالوجی مہیا کرتے تھے جس کے لیے لوگوں کو انتظار کرنا پڑتا تھا اور قطار میں کھڑا ہونا ضروری تھا جس سے ان کی آزادی متاثر ہورہی تھی۔ آزادی پر مساوات اور ضرورت کا اصول حد بندیاں عائد کررہا تھا۔ لبرل سرمایہ دارانہ نظام یعنی امریکہ و یوروپ میں جس کے پاس سرمایہ ہے وہ انتظار کے بغیر ٹیکنالوجی جب چاہے خرید سکتا تھا اور ریاست کا محتاج نہ تھا کیونکہ مارکیٹ آزادانہ عمل کے ذریعے ریاست سے بہتر انداز میں اسے ٹیکنالوجی مہیا کررہی تھی۔

۸۔ مغربی ٹیکنالوجیکل ترقی کا انحصار نظام سرمایہ داری پر ہے

لبرل سرمایہ دارانہ نظریۂ حیات کے سوا ٹیکنو سائنس کو کسی اور نظریۂ حیات [Ideology] اور مابعد الطبیعیات کی بنیاد پر مسلسل فروغ نہیں دیا جاسکتا حتیٰ کہ سرمایہ داری ہی کی شکل سوشلزم اور کمیونزم میں بھی غیر لبرل سرمایہ داری کے ذریعے ٹیکنالوجی کی محیر العقول ترقی کا خواب ناکام ہوگیا اور چین و روس کو آخر کار لبرل سرمایہ دارانہ نظام و نظم معیشت کے دامن میں پناہ لینا پڑی۔ دنیا کی کسی الہامی، روایتی اور دینی تہذیب میں مادی ترقی اور مسلسل ترقی کو کبھی ہدف، مقصد اور اصول کے طور پر اختیار نہیں کیا گیا۔ ان تہذیبوں میں یہ دنیاوی زندگی فانی تھی، مختصر تھی اور آخرت کی زندگی طویل اور ابدی ـــــ لہٰذا

جس زندگی کا سفر طویل تھا اس سفر کی تیاری بھی زیادہ تھی اور جس مادی زندگی کا سفر مختصر تھا اس زندگی کا سروسامان بھی بہت مختصر تھا اور اس سامان کی تیاری کے سلسلے میں کوششیں بھی نہایت مختصر اور ضرورت کے مطابق رہیں۔ لہٰذا دنیا پرستی، عیش پرستی اور افادہ پرستی کی ٹیکنالوجی کا فروغ مسلسل ان تہذیبوں کے نظریۂ حیات کے باعث ممکن ہی نہیں تھا۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظریۂ حیات کے سوا کسی اور نظریے کے ذریعے ٹیکنو سائنس کو فروغ دینا ممکن نہیں۔ چونکہ اسلام ایک الہامی دین ہے جس میں آخرت کی زندگی کو دنیا کی زندگی پر ہر حال میں ترجیح دی گئی ہے اور معرفت رب عبادت رب کے ذریعے ہی ممکن ہے اور اللہ نے انسانوں اور جنوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے لہٰذا اس تہذیبی، مذہبی، دینی، الہامی اور علمی تناظر کے ساتھ ٹیکنو سائنس کی شیطانی ترقی اسلام کے ساتھ کبھی ہم آہنگ نہیں ہوسکتی کیونکہ اسلامی علمیت آزادی، ترقی، سرمایہ داری اور معیار زندگی میں مسلسل اضافے کے مغربی مقاصد و اہداف پر مشتمل علمیت کا رد ہے لہٰذا اسلام کے تصور سائنس و ٹیکنالوجی کے تناظر میں عہد حاضر کی اندھا دھند فنی ترقی [Technological Development] کا امکان معدوم ہو جاتا ہے۔

۹۔ ترقی کا مفہوم کیا ہے؟

یہاں اس نکتے پر غور کی ضرورت ہے کہ Development & Progress کی اصطلاحات کیا اٹھارہویں صدی سے پہلے دنیا کی مختلف تہذیبوں کی علمیت اور لغت میں اصطلاحات کے طور پر مستعمل تھیں یا نہیں؟ Development Dictionary اس سلسلے میں حیرت انگیز معلومات مہیا کرتی ہے یعنی یہ لغت دلائل کے ساتھ جواب نفی میں دے گی۔ ان دونوں اصطلاحات کی تاریخی حقیقت کا مطالعہ کیا جائے تو حیرت کے کئی دریچے کھلتے نظر آتے ہیں۔

''ترقی'' ایک حساس موضوع ہے جس کا مطلب صرف ''مادی ترقی'' ہے اور اس پر ایمان کے باعث ''ٹیکنالوجیکل ترقی'' کا سوال ہر مخلص مسلم ذہن میں لازماً پیدا ہوتا ہے لیکن صرف چند مباحث ترقی کی ماہیت، حقیقت، حیثیت اور اصلیت کا تعین کر دیتے ہیں مثلاً حضرت اسماعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ کی پیدائش کسی ہسپتال میں نہیں ہوئی حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کسی میٹرنٹی ہوم میں نہیں بلکہ صحراء میں ہوئی۔ رسالت مآب ﷺ کی پیدائش بھی گھر میں ہی ہوئی۔ آپ ﷺ کے تمام بچے بھی گھر میں پیدا ہوئے۔ اٹھارہویں صدی کے آخر تک اس امت کے اکابرین گھروں میں ہی پیدا ہوتے رہے

تو حضرت ابراہیمؑ سے رسالت مآب ﷺ تک تین انبیاء کی امتوں کے عہد میں ترقی کیوں نہ ہوسکی میٹرنٹی ہوم کیوں نہ بن سکے؟ یہ ترقی مغرب میں کیسے ممکن ہوگئی جب کہ وہاں عورت نہ گھر میں رہنے پر تیار ہے نہ شادی کرنے پر ــــ نہ شادی کے بعد بچے پیدا کرنے پر ــ تو اس تہذیب کو میٹرنٹی ہوم کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ انبیاء کی تہذیبوں میں آغا خان یونیورسٹی جیسا ہسپتال کیوں نہ بن سکا؟ حضرت موسیٰؑ کے عہد میں فرعون کی تہذیب میں بھی بچے کو دودھ عورت پلاتی تھی۔ اسلام آیا تو رضاعت کی ذمہ داری عورت کے سپرد کی گئی اور اٹھارہویں صدی سے پہلے ملت اسلامیہ بلکہ کل عالم ڈبے کے جعلی دودھ سے بے خبر تھا۔ انبیاء کی امتیں بچوں کے لیے مصنوعی دودھ کیوں تیار نہ کرسکیں؟ انبیاء کی تہذیبو ں میں ایٹم بم اور تباہ کن ہتھیار کیوں تیار نہ ہوسکے؟ روایتی تہذیبیں بھی مہلک ہتھیاروں سے خالی رہیں اس لیے کہ ان کی مابعد الطبیعیات عہد جدید کے مغرب سے مختلف تھی۔ انبیاء کے مدمقابل تہذیبوں کی عظیم الشان عمارات اور شاہکار تعمیرات کے آثار وباقیات آج بھی محفوظ ہیں لیکن ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کے مادی آثار میں سے صرف دو عمارتیں محفوظ ہیں

ایک خانہ کعبہ کی چوکور پتھریلی عمارت اور دوسری حجرۂ نبوی جہاں تاریخ کے تین عظیم انسان ابدی نیند سورہے ہیں لیکن ان انبیاء کا ذکر مشرق ومغرب میں صبح وشام جاری ہے۔ وہ قومیں جو انبیاء کے مدمقابل تھیں ان کے عظیم الشان مادی آثار اور سائنس وٹیکنالوجی کے شاہکار آج بھی محفوظ ہیں مگر ان منکرین حق کا نام لیوا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ اگر 'ترقی' انبیاء کے مقاصد واہداف میں ادنی درجے کا بھی ہدف ہوتا تو یقیناً عاد، ثمود، سباء اور فرعون کی قوموں کے مدمقابل انبیاء ان قوموں جیسی سائنس و ٹیکنالوجی اختیار کرتے یا اس میں اضافہ کرتے مگر اضافہ تو کجا ان انبیاء نے تباہ شدہ قوموں کی سائنس وٹیکنالوجی کو سرے سے اختیار ہی نہیں کیا۔ اگر وہ ایسا کرتے اور ترقی کے پہیے کو آگے بڑھاتے تو حضرت موسیٰؑ کی قوم بنی اسرائیل کے اہرام بھی روئے زمین پر محفوظ ہوتے۔ تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ انبیاء تاریخ کے پہیے کو ہمیشہ پیچھے کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ اسی لیے امت مسلمہ آج بھی آگے دیکھنے کے بجائے ہمیشہ پندرہ سو سال پیچھے کے عہد 'خیر القرون' کی طرف دیکھتی ہے اور جمعہ کے خطبے میں اسی عہد کو بہترین زمانہ کہتی ہے یہ بات یقینی ہے کہ مسافر اگر بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا رہے تو اس کی رفتار سفر بہت کم ہو جاتی ہے اسی لیے انبیاء کی امتیں مادی فتوحات میں ہمیشہ اپنے مدمقابل کفار ومشرکین سے کمتر رہیں مگر ایمان کے معاملے میں نہایت برتر اور زرخیز۔

۱۰۔ مغربی ٹیکنالوجی اقدار کش ہے

ٹیکنو سائنس میں آزادی، ترقی اور مسلسل ترقی اور سرمایہ دارانہ اقدار کے سوا دوسری اقدار کو داخل کرنا ممکن نہیں ہے۔ٹیکنو سائنس آفاقی اور عالمگیر علم نہیں۔ یہ خاص تاریخ، تہذیب اور خاص زماں و مکاں میں محصور علم ہے جو اپنے مقاصد، اہداف اور تحدیدات سے ماوراء نہیں ہوسکتا۔ یہ معروضی نہیں موضوعی ٹیکنالوجی ہے۔ عالمی فلسفہ کانگریس کے صدر ہزرل نے ۱۹۲۴ء میں اس سائنس کو یورپی سائنس قرار دے کر اس پر نقد کیا تھا۔اس کی کتاب "Crises of European sciences" کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کے شاگرد ہائیڈیگر نے ۱۹۲۶ء میں اپنی کتاب "An Essay Concerning Technology" میں اس ٹیکنالوجی کے ہاتھوں دنیا کی مسخ ہونے والی تصویر کی نشان دہی کردی تھی۔آج بھی مغرب میں بے شمار فلسفی مفکرین ٹیکنو سائنس کو غیر اقداری تصور نہیں کرتے اس ضمن میں درج ذیل مصادر کا مطالعہ مفید رہے گا:

۔ *Looking back towards Progress,* Perwaiz Manzoor.
۔ *The Limits of Technology,* Charles Tilly.
۔ *Ten Astonishing facts about Technology.*
۔ *Technology and its Problems,* Illule.
۔ *The Constitution of liberty*, Hiac
۔ *Philosophy - An Introduction,* Berry Vincint
۔ *Post Modern Conditions,* Leyotard
۔ *One Dimensional Man,* Marcuze
۔ *Insane Society,* Mozzalis
۔ *Risk Society,* Arec Fromm
۔ *Habits of the Heart,* Danial Bell
۔ *The Logic of Social Sciences,* Hebermass
۔ *The Order of things: The Archeology of Knowledge,* Focualt
۔ *Cotegency Irony and Solidrity,* Rorty
۔ *False Dawn,* John Gray

۱۱۔ ٹیکنو سائنس اور سرمایہ داری کا مطالعہ

ٹیکنو سائنس اور سرمایہ داریت کے تعلق خصوصی کے سلسلے میں درج ذیل کتب کا مطالعہ فائدہ مند رہے گا:

- *Cultural Contradictions of Capitalism,* Richard Bela
- *The Confessions of an Economic Hit man,*
- *The Corporation*
- *The Beauty Myth*
- *History of Economic Thought,* Shoumpter
- *The Revival of Market Society,* Hershman
- *Capitalism - A Schezofranic Life Style,* Deluze
- *Thousands plautos* Vol. I
- *Anti Edipus* Vol. II
- *The Rise of Islamic Capitalism,* Dr. Wali Raza Nasar

۱۲۔ عالم اسلام اور مغربی ٹیکنالوجی

عالم اسلام میں ایک مغالطہ بہت عام ہے کہ 'اگر ہمارے پاس مغرب کی ایجاد کردہ ٹیکنالوجی نہیں ہوگی تو ہم مغرب کا عسکری مقابلہ کیسے کریں گے؟' گویا عالم اسلام کا ہر فرد حالت جہاد میں ہے، ہر حکومت جہاد کے لیے بے تاب ہے، لوگ جہاد کے لیے مچل رہے ہیں اور لشکر راستے میں بزن کے منتظر ہیں مگر اس جہاد میں اصل رکاوٹ ٹیکنالوجی سے محرومی ہے لہٰذا ٹیکنالوجی سے عشق اسلام کے دفاع کے لیے شروع ہوتا ہے اور ہم دفاعی اور اقدامی عسکری ٹیکنالوجی کی بجائے صرف بڑھتی ہوئی ضروریات زندگی اور تعیّشات زندگی میں اضافے کی ٹیکنالوجی کا دفاع اس اصول کی بنیاد پر کرنے لگتے ہیں کہ اس میں کیا ہرج ہے؟ حرام تو نہیں ہے؟ منع تو نہیں کیا گیا ہے؟ خوش حال پُر تکلف اور آرام دہ زندگی بسر کرنے میں کیا ہرج ہے؟ سوال یہ ہے کہ یہ ٹیکنالوجی کس قیمت پر حاصل ہوتی ہے؟ اس کی قیمت Algor کی کتاب *An Inconvenient Truth* میں پڑھی جاسکتی ہے۔ اس کی مزید تفصیل Penguin کی کتاب *The Waste* میں پڑھی جاسکتی ہے ماحولیات پر کوپن ہیگن کانفرنس ۲۰۱۰ء کی روداد انٹرنیٹ پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے جو حیرت کے کئی جہانوں کے دریچے کھول دے گی۔

مشہور امریکی مورخ Jared Diamond کی کتاب *How Socities Chose to Fail or Survive?* کا باب بارہ جو چین کی بظاہر عظیم الشان ترقی سے متعلق ہے اور اس ترقی کی جو بھیانک قیمت چین نے ادا کی ہے اور صرف چین نہیں بلکہ چین کے ساتھ تقریباً پوری دنیا اور ایشیا خصوصی طور پر اس کی قیمت ادا کر رہا ہے، اس کا مطالعہ کافی ہے۔

عالم اسلام کی وہ حکومتیں جو بنیادی حقوق کے منشور پر دستخط کرچکی ہیں، ان ریاستوں کا غالب قانون اصولاً اور عملاً اب اسلام نہیں آزادی اور نظام سرمایہ داری ہے اور سرمایہ دارانہ ریاست سرمایے میں اضافہ کے لیے تو جہاد کرسکتی ہے اللہ کے لیے جہاد اس ریاست میں ممکن ہی نہیں ہے۔ حقوق انسانی کے منشور پر دستخط کرنے والی دنیا میں کوئی ایسی مسلم ریاست نہیں جو مغرب یا امریکہ سے اقدامی جنگ کرنا چاہتی ہو لیکن ٹیکنالوجی کے باعث جنگ نہ کرنے پر مجبور ہوگئی ہو۔ زیادہ سے زیادہ ایک آدھ مسلم ملک مغرب کی جانب سے حملے کے پیش نظر اپنے دفاع کے لئے فکر مند ہوسکتا ہے لہٰذا اسے دفاعی ٹیکنالوجی کی ضرورت رہے گی لیکن مغرب نے جو عسکری ٹیکنالوجی ایجاد کی ہے وہ دفاعی سے زیادہ اقدامی ہے۔ وہ فتح کے لئے ایجاد نہیں کی گئی تباہی و بربادی (Mass Destruction) کے لئے ایجاد ہوئی ہے۔ عسکری صنعتوں کی پیداوار [Armed Industries Production] اقدامی جنگ کے لئے تخلیق ہو رہی ہے اور عالم اسلام کسی اقدامی جنگ کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ اسلامی ممالک کی فوجیں عموماً اپنے ہی شہریوں کے خلاف اقدام کرتی ہیں۔ ان کی تمام عظیم انسانی فتوحات کا دائرہ اپنے ہی ہم وطنوں کے خلاف اور اپنی سرحدوں پر محیط ہے۔ تو مسئلہ ہے دفاع کا اور دلیل دی جارہی ہے اقدامی جنگ کے ہتھیاروں کے حصول کی۔ گزشتہ سو سال کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جن ممالک نے ٹیکنالوجی پر زیادہ انحصار کیا وہ کسی بڑی جنگ لڑنے کے قابل نہیں رہے لیکن نہایت پست اور کمتر ٹیکنالوجی کے حامل ممالک نے اپنے سے بہتر اور برتر ٹیکنالوجی والے ممالک کو شکست دی ہے۔ لاطینی امریکہ، کمبوڈیا، صومالیہ، عراق، ویت نام، افغانستان، فلسطین میں کمتر ٹیکنالوجی والوں کو عالمی طاقتیں شکست نہیں دے سکیں۔ ماضی میں بھی یونان کی ایک چھوٹی ریاست کے سپہ سالار مقدونیہ کے سکندر نے اکیس سال کی عمر میں ایران جیسی عظیم الشان سلطنت پر حملہ کیا اور اسے عبرتناک شکست دی، بادشاہ کو قتل کردیا اور ایرانی فوج کو تہس نہس کردیا لیکن ایران کو شکست دینے والے سپہ سالار کو جہلم کی چھوٹی سی ریاست کے راجہ پورس کی شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ سکندر کی فوج

نے دریائے جہلم پار کرنے سے انکار کردیا وہ سندھ اور عراق کے راستے بابل پہنچا اور وہاں پہنچتے ہی مرگیا۔ عباسی سلطنت 'بیت الحکمت' اور تمدنی ترقیات کے باعث تاتاریوں کے مقابلے میں نہایت متمدن ترقی یافتہ ریاست تھی لیکن ٹیکنالوجیکل برتری کے باوجود تاتاریوں جیسی جاہل قوم نے انھیں شکست دے دی۔ اندلس میں سائنسی ترقی کے باوجود سائنس مسلمانوں کے زوال کو نہیں روک سکی اور عیسائیوں نے ہسپانیہ کے حصے بخرے کردیے، مسلمانوں کا قتل عام کیا اور انھیں بے دخل کردیا۔ سرزمین اندلس آج اذان کی آواز سے بھی محروم ہے۔ روس کے پاس مغرب سے بہتر ٹیکنالوجی تھی۔ اس نے سائنس کے مختلف میدانوں میں مغرب سے پہلے اقدامات کیے۔ خلائی ٹیکنالوجی میں وہ امریکہ سے آگے تھا لیکن اس کی ٹیکنالوجیکل ترقی اسے زوال سے نہیں بچاسکی۔ اسے امریکہ نے میدان جنگ میں شکست نہیں دی بلکہ اسے اپنی تہذیب، ثقافت، معیار زندگی، فری مارکیٹ اور اپنے لبرل نظریے کی قوت سے اسے شکست دی۔ روس کے لوگ امریکی ڈبل روٹی اور چپس کے انتظار میں رہنے لگے تھے۔ مشرقی یورپ کو مغرب نے تلوار، یلغار اور خون خرابے سے نہیں نظریاتی محاذ پر شکست دی اور دیوار برلن گرادی۔

امتوں، تہذیبوں اور قوموں کا اصل مقابلہ عسکری میدان میں نہیں نظریاتی میدان میں ہوتا ہے۔ نظریہ اگر زندہ ہے طاقت ور ہے تو دو چار عسکری شکستوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جس طرح عباسی سلطنت تاتاریوں اور باطنیوں سے شکست کھانے کے باوجود دوبارہ زندہ ہوگئی کیونکہ تاتاری اور مصر کے فاطمی ایمان، عقلیت اور علمیت کی سطح پر عباسیوں کی دینی علمیت کو شکست نہیں دے سکے لہٰذا عباسیوں کی دونوں شکستیں آخر کار فتح میں تبدیل ہوگئیں۔ خوارزم شاہ اور عباسی سلطنتیں تہذیبی، تمدنی، عسکری سائنسی اور ٹیکنالوجی کی سطح پر تاتاریوں سے بہتر تھیں مگر ان کی ٹیکنالوجی انھیں بچا نہیں سکی۔ تاتاریوں نے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر اپنی تلواروں سے اسلامی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ تاتاری سادہ اور جنگ جو تھے جبکہ مسلمان عیاش تھے اور تاتاری سیل رواں کے سامنے تنکوں کی طرح بہہ گئے۔ برعظیم پاک و ہند میں انگریز، فرانسیسی اور ولندیزی وارد ہوئے تو ہندوستان کے مسلمان انھیں بے دخل نہیں کر سکے کیونکہ وہ عیش وعشرت کی زندگی میں مبتلا تھے اور لڑنے کی صلاحیت ہی کھو چکے تھے۔ ٹیکنالوجیکل سطح پر انگریزی فوج ان سے بہتر اور برتر نہیں تھی۔ وہ سات سمندر پار سے گرم علاقوں میں آئے تھے۔ ان کے لیے کمک کا موثر انتظام بھی نہیں تھا اور وہ تعداد میں بھی بہت کم تھے۔

اجنبی ملک، نا قابل برداشت موسم اور اجنبی زبان کے باوجود وہ یہاں آئے۔ انہوں نے ٹیکنالوجی کی بنیاد پر مسلمانوں کو شکست نہیں دی۔ سراج الدولہ کے لشکر میں ایک لاکھ سپاہی تھے مگر لشکر نے انگریز فوج سے جنگ ہی نہیں کی۔ صرف سراج الدولہ کے ایک وفادار ہندو سپہ سالار کے مختصر لشکر نے انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ ترکی کی مثال سامنے ہے۔ برطانیہ ترکی کے مقابلے میں عالمی طاقت تھا، ایک ایسی سلطنت جس کی حدود میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا، ترکی پر اسے ٹیکنالوجیکل برتری بھی حاصل تھی لیکن مصطفےٰ کمال اتاترک کی قیادت میں ترک قوم نے برطانوی فوج کو عبرت ناک شکست دی اور سمندر انگریزی فوج کے خون سے رنگین کر دیا۔ حالیہ سالوں میں بوسنیا کی جنگ اس کا تازہ ثبوت ہے۔ سربوں کو یورپی ممالک کی جانب سے مکمل مالی، عسکری اور ٹیکنالوجیکل امداد مل رہی تھی۔ بوسنیا والے مسلسل شکست کھا رہے تھے اور امریکہ، NATO اور UNO بوسنیا کی مدد پر آمادہ نہیں تھے۔ اس موقع پر پوری دنیا سے مسلم مجاہدین بوسنیا میں جمع ہوئے اور تھرڈ بریگیڈ کی صورت میں انھوں نے جدید ٹیکنالوجی کی حامل سرب فوج کا صفایا شروع کیا۔ وہ اقدام کرتے ہوئے سربوں کو شکست سے دوچار کرنے والے تھے لہٰذا سربوں کو شکست سے بچانے کے لیے نیٹو نے اپنی فوجیں اتار دیں اور امریکہ نے فضائی حملے شروع کر دیے۔ لہٰذا یہ خیال کہ ٹیکنالوجی کی کمی یا کم زور ٹیکنالوجی ہمیں دفاع یا اقدام کے قابل نہیں رہنے دیتی غلط خیال ہے۔ گوریلا جنگ کے ماہرین اور اس موضوع پر تحریر کی گئی کتابوں سے سے معلوم ہوتا ہے کہ دس ہزار گوریلا سپاہی سو سال تک جنگ لڑ سکتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ عالم اسلام کسی جہاد کے لیے تیار بھی ہے؟ افغانستان میں جنگ کا آغاز کرتے ہوئے بش نے کہا تھا ہم ایک تاریک غار میں بھی جمہوریت کی شمع روشن کریں گے، طالبان دہشت گرد ہیں، ان سے آخری آدمی، آخری گولی آخری قطرہ خون تک جنگ ہوگی لیکن ۲۰۱۱ء میں امریکی صحافی کی معرکہ آراء کتاب *Obama Wars* کے ذریعے دنیا کو بتایا جا رہا ہے کہ ہمیں طالبان اور القاعدہ میں فرق کرنا چاہیے۔ طالبان سے مذاکرات کی میز پر معاملات طے کیے جائیں۔ طالبان سے سیاسی مفاہمت کے لیے امریکہ مسلسل خاموش سفارت کاری کے محاذ پر مستقل کام کر رہا ہے۔ طالبان کو امریکہ عسکری میدان میں زبردست ترقی کے باوجود شکست نہیں دے سکا لہٰذا ٹیکنالوجی سے محرومی کے خوف میں مبتلا ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔ نہ ہی اس خوف کی تاریخی وجوہات تلاش کی جا سکتی ہیں۔ یہ خود ساختہ اور خود مسلط کردہ خوف ہے جو مغلوبیت کے باعث پیدا ہو رہا ہے۔

۱۳۔ ٹیکنالوجی پر تنقید کا مقصد

جب ہم سائنس اور ٹیکنالوجی پر تنقید کرتے ہیں تو لوگوں کو پتھر کا زمانہ یاد آنے لگتا ہے۔ کسی کو اونٹ کی پیٹھ نظر آتی ہے کہ یہ لوگ ہمیں دور ظلمات میں واپس لے جانا چاہتے ہیں حالانکہ سائنس اور ٹیکنو سائنس پر تنقید کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ لوگ تنقید پڑھتے ہی تمام اشیاء کا استعمال ترک کردیں اور ایک نئی زندگی کا آغاز کریں بلکہ سائنس پر تنقید کا مقصد یہ ہے کہ لوگ سائنس کو ایک مقدس گائے نہ سمجھیں، سائنسی علم کو محترم، عظیم الشان، ناقابل تنقید اور معصوم علم وفن کا درجہ نہ دیا جائے، اس کی وہ عزت، تکریم، تحریم اور اکرام و احترام نہ کیا جائے جیسے یہ کوئی صحیفہ آسمانی ہے۔ اسے علم کے بجائے فن Art & Craft کے درجے میں رکھا جائے یہ کام چلانے کا علم ہے اسے صرف کام چلانے کے قابل ہی سمجھا جائے۔ اسے دوسرے علوم خصوصاً علوم نقلیہ کو پرکھنے کا پیمانہ نہ بنایا جائے۔ سائنس کے آگے سجدہ کرنے سے انکار کردیا جائے۔ اس کا اس شدت وحدت سے ناقدانہ جائزہ لیا جائے جس طرح کفار ومشرکین انبیاء کرام کے پیغام اور دعووں کا جائزہ لیتے تھے اور بہت کچھ سمجھ میں آجانے کے باوجود انبیاء کو قبول کرنے سے انکار کردیتے تھے۔ ان کا ایمان ہم سے بہتر تھا کہ وہ اپنے پرانے غلط سلط ایمان کی خاطر انبیاء کے منکر تھے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ علوم نقلیہ اور علوم عقلیہ میں سے کسی ایک کے انتخاب کی آزادی ہو تو ہم علوم نقلیہ کو حقیر سمجھ کر رد کردیتے ہیں اور علوم عقلیہ کو بخوشی اختیار کرتے ہیں کہ یہ ہماری مادی بہتری کے لیے کارآمد ہے سائنس پر نقد اس ذہنیت کا قلع قمع کرنے کے لیے اہم ہے (جاری ہے)۔

راشد شاذ

مسلم سائنس: اسلامی تعلیمات کا منطقی نتیجہ

مغربی سائنس کے حوالے سے البرہان کا نقطۂ نظر واضح ہے کہ یہ مغرب کے ورلڈ ویو کا منطقی نتیجہ ہے اور چونکہ مغرب کے ورلڈ ویو کی اساسات ملحدانہ ہیں لہٰذا مغربی فلسفۂ علم نے جن علوم وفنون کو جنم دیا ہے وہ بھی مذہب و اخلاق دشمن اور اقدار کش رجحانات رکھتے ہیں۔ ہمارے علمی حلقوں میں سب سے پہلے ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے اس حقیقت کا ادراک کیا اور سائنس کی اسلامی تشکیل نو کا نعرہ بلند کیا۔ انہوں نے اس پر کام بھی شروع کیا لیکن ان کی زندگی نے وفا نہ کی۔ بعد میں انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ، امریکہ (IIIT) نے جب علوم کی اسلامائزیشن کا کام شروع کیا تو انہوں نے سائنسی علوم کی بجائے عمرانی علوم پر زیادہ توجہ مرکوز کی جن کی اہمیت بھی اس ضمن میں مسلمہ ہے۔

البرہان موجودہ سلسلۂ مضامین کے ذریعے یہ حقیقت سامنے لانا چاہتا ہے کہ ماضی میں جب مسلمانوں نے سائنس میں پیش رفت کی تو یہ اسلامی تعلیمات کا منطقی اور لازمی نتیجہ تھا۔ انہی تعلیمات کا لازمی تقاضا ہے کہ مسلمان آج بھی سائنس میں ترقی کریں اور جس طرح ماضی میں سائنسی ترقی اسلامی تعلیمات، مقاصد اور مزاج کے مطابق تھی اب بھی جو سائنسی ترقی ہوگی وہ اسلامی تعلیمات، مقاصد اور مزاج کے مطابق ہوگی۔ لہٰذا مسلمانوں اور خصوصاً ان کی حکومتوں کا فرض ہے کہ مسلم تصور علم کی روشنی میں سائنسی ترقی کی طرف پیش رفت کریں تا کہ ان کی مذہبی و اخلاقی اقدار محفوظ رہ سکیں۔

یہ بھی واضح رہے کہ مسلمانوں کا 'ترقی' کا اپنا ایک مخصوص ماڈل ہے جو مغرب سے بالکل مختلف ہے یہ آخرت سے مربوط ہے اور اس کی بنیاد اخلاقی ترقی پر ہے لیکن سائنسی ترقی اس کی نقیض نہیں ہے کیونکہ اسلامی تصور علم، تعلیم کتاب و تزکیہ کے ساتھ تعلیم حکمت کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ امین

وحی ربانی نے کتاب فطرت پر غور وفکر کی جو ریت قائم کی اس نے بہت جلد مسلم ذہن کو تحلیل و تجزیے اور تسخیر و اکتشاف کی راہ پر ڈال دیا۔ اب تک استخراجی منہج (duductive) کو انسانی علوم کی معراج سمجھا جاتا تھا۔ قرآن مجید نے تجربے اور مشاہدے کو بنیادی اہمیت دی اور اس طرح علم کا منہج بڑی حد تک استقرائی (inductive) ہوگیا۔ غور وفکر کے سانچے میں یہ فی نفسہٖ اتنی بڑی تبدیلی تھی جس نے بہت جلد انسانی تہذیب کی ہیئت بدل کر رکھ دی۔ دین مبین کی فطری اُٹھان جن خطوط پر ہوئی تھی اس کے سبب نبی کریم ﷺ کے متبعین کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ کتاب فطرت سے آنکھیں بند کر پاتے۔ روزِ اوّل سے مسلمان اس بات سے آگاہ تھے کہ کعبۂ مشرفہ صرف ان کا قبلۂ نماز ہی نہیں بلکہ وحدت ملی کا علامیہ بھی ہے۔ سو یہ سوال اہمیت اختیار کر گیا کہ مختلف بلاد امصار میں تعین قبلہ کے لیے صحیح طریقۂ کار کیا ہو؟ فلکیات کا گہرا علم بالکل اولین مرحلے میں مسلمانوں کی دینی ضرورت بن گیا۔ پھر

یہ کہ مختلف بلاد وامصار میں نمازوں کے نظام الاوقات کا تعین جغرافیہ کی وسیع معلومات اورفن نقشہ نگاری میں مہارت کے بغیر ممکن نہ تھا۔قرآن مجید میں شمس وقمر کی گردش جن مقاصد کے تابع بنائی گئی ان میں ایک مقصد لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ بھی تھا (یونس:5)۔گویا مسلمان مذہبی طور پر اس بات کے مکلّف بنائے گئے کہ وہ شمس وقمر کی اس گردش سے اپنے تقویم عمل کی ترتیب میں مدد لیں۔اس پس منظر میں نماز پنجگانہ کے اوقات کی تحدید،سمت قبلہ کا تعین اورصوم رمضان کے لیے قمری کلینڈر کی ترتیب ، یہ ایسے عملی اورفوری مسائل تھے جنہوں نے مسلمانوں کو فی الفور مشاہدۂ کائنات کی طرف متوجہ کیا۔

وحدت قبلہ کا تقاضا تھا کہ تمام دنیا کے مسلمان خواہ کسی بھی خطۂ ارضی میں رہتے ہوں پنج وقتہ نمازوں میں اپنا رُخ کعبۂ مشرفہ کی طرف کریں لیکن مسئلہ یہ تھا کہ دور دراز علاقوں سے تعین قبلہ کی گتھی کیسے سلجھائی جائے؟ ابتدائی ایام میں کبھی ستاروں کی مدد سے سمت قبلہ کے تعین کی کوشش کی گئی تو کبھی طلوع آفتاب سے اس کا اندازہ لگانے کی کوشش ہوئی۔بعض علمائے فلکیات بڑے دقیق مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ کعبہ کو مرکز مان کر مختلف بلاد وامصار کو بارہ جغرافیائی خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔لیکن یہ سارے تخمینے قطعیت کے احساس سے خالی تھے۔مسلمان جب فقہی اختلاف کے گرداب میں پھنس گئے تو اختلاف قبلہ نے ایک مسلسل نزاع کی حیثیت اختیار کرلی۔کوئی کہتا کہ رسول اللہ ﷺ جب مکہ سے مدینہ آئے تو انہوں نے جنوب کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھی تھی اسی سنت پر اسپین اور وسط ایشیا کے ابتدائی مسلمانوں نے بھی عمل کیا تھا سو ہمیں چاہیے کہ تعین قبلہ کی موشگافیوں میں پڑنے کے بجائے دور دراز علاقوں میں ہم جنوب کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھا کریں۔کوئی اس مؤقف کو خلاف عقل بتاتا کہ جب رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں جنوب کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھی تھی تب مکہ واقعتاً جنوب میں واقع تھا سو اس سنت کو تعین قبلہ کے لیے دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔کوئی کہتا کہ حج کے لیے کارواں جس سمت کو جاتے ہیں اسے ہی سمت قبلہ سمجھا جانا چاہیے،تو کوئی کہتا کہ ان علاقوں کی پرانی مسجدیں جس رُخ پر بنی ہیں وہی ہمارے لیے کافی ہیں،تو بعض اس خیال کی پُر زور حمایت کرتے ہیں کہ علوم فلکیات کے ماہرین نے جو تحقیقات کی ہیں ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ روایتی اورغیر روایتی فہم کے ٹکراؤ نے ایک ہی مسجد میں دو قبلوں کی طرح ڈال دی۔صورت حال کی اس نزاکت نے علمائے فلکیات کو اس مسئلہ کا قطعی حل نکالنے پر مجبور کیا۔تحقیق وتالیف کا سلسلہ مسلسل جاری رہا یہاں تک کہ البیرونی کی شہرہ آفاق کتاب ’تحدید الاماکن‘ نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس مسئلہ کو

فیصل کردیا۔ اس نے Spherical Trigonometry کی مدد سے افغانستان کے ایک شہر سے تعین قبلہ کی کامیاب کوشش کی اور پھر ان اصولوں پر کسی بھی جگہ سے سمت قبلہ کا تعین دشوار نہ رہا۔

عہد رسول ﷺ میں جب حضرت بلالؓ کو اذان کی ذمہ داری تفویض کی گئی تھی تو اس کی وجہ ان کی آواز کی بلند آہنگی اور لہجہ کی وجد آفرینی تھی۔ بعد کے دنوں میں بالخصوص دور دراز کے بلاد وامصار میں مؤذن کے تقرر کے لیے یہ بھی دیکھا جانے لگا کہ وہ اوقات نماز کا صحیح فہم رکھتا ہو، اسے گردش قمر کی مختلف منازل کا علم ہو تاکہ وہ رات کی تاریکی میں بھی وقت کا صحیح اندازہ لگا سکے۔ رفتہ رفتہ یہ مؤذن اپنے کارِ منصبی میں اس حد تک ترقی کرگئے کہ انہوں نے اوقات کے تعین کے لیے Astronomical instruments ایجاد کرڈالے۔ علم التقویم پر کتابیں تصنیف کیں اور مختلف شہروں کے الگ الگ اوقات صلوٰۃ کی جدولیں تیار کر ڈالیں۔ سمت قبلہ کے تعین اور تحدید اوقات صلوٰۃ کی ضرورتوں نے علم المیقات کے نام سے ایک نئ فلکیاتی سائنس کو جنم دیا۔ آج ہماری مسجدوں میں اوقاتِ صلوٰۃ کا جو چارٹ ماضی کی علامت کے طور پر لٹکا دکھائی دیتا ہے اس کی جڑیں اسی علم المیقات میں پائی جاتی ہیں۔ تب خودکار گھڑیوں کا رواج نہ تھا اور تحدید وقت انتہائی پیچیدہ علم تھا جس میں ذرا سی بے احتیاطی حساب کتاب کے سارے گوشوارے الٹ کر رکھ دیتی تھی۔ اگر فلکیات بنیادی دینی ضرورت نہ ہوتی اور مسلمان اس کام کو فرض عین کی حیثیت سے انجام نہ دیتے تو شاید جدید دنیا جیسی کہ وہ آج ہے وجود میں نہ آتی۔

الخوارزمی نے جب اپنی مشہور کتاب 'الجبر والمقابلۃ' تصنیف کی تو اس کے پیش نظر بھی ایک فرض عین کی ادائیگی تھی۔ آیت وراثت کے اطلاقی پہلو بعض اوقات بڑی دقیق پیچیدگیوں کو جنم دیتے جن کے حل کی مروجہ ریاضی میں تاب نہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ خود خلیفۂ وقت نے اس سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ تقسیم وراثت کی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے ایک ایسی کتاب مرتب کرے جس سے اس پیچیدہ مسئلہ کو منصفانہ انداز سے حل کیا جاسکے۔ خوارزمی نے اپنی اس کتاب کے ابتدائیے میں اس امید کا اظہار کیا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف سے وراثت کی تقسیم حتیٰ کہ زمینوں کی پیمائش، نہروں کی کھدائی اور اس قسم کے دیگر امور میں جیومیٹرائی تقویم کا کام آسان ہوجائے گا اور خدا اس سے اس محنت کے عوض بہترین صلہ عطا کرے گا۔ کچھ اسی جذبے کا اظہار البتانی نے کتاب 'الذیج الصابی' کے ابتدائیہ میں کیا ہے۔ بقول البتانی: فلکیات کا علم تمام علوم میں ممتاز ہے جس سے روح کو بالیدگی، دل کو خوشی

اور عقل کو جلا ملتی ہے، غور وفکر کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ روز و شب کی گردش، شمس و قمر کے بدلتے مقامات اور ان کا گہن اور اپنے اپنے مدار میں ان کا مستقل محوِ سفر رہنا انسانی ذہن کو خدا کی وحدانیت، اس کی عظمت، حکمت اور جلال و جبروت کا احساس دلاتا ہے۔

ظہور اسلام کے بعد جو لوگ تسخیر و اکتشاف کی ایک نئی دنیا کے قیام کے لیے سرگرداں رہے وہ سب کے سب اس احساس سے سرشار تھے کہ وہ دراصل ایک مذہبی فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ ان میں سے بعض تو با قاعدہ مذہبی عہدوں پر فائز تھے اور معاشرے میں تقویٰ شعاری کے حوالے سے جانے جاتے تھے۔ یہ صورت حال آخر آخر تک قائم رہی۔ مثال کے طور پر ابن نفیس (متوفی ۱۲۸۸ء) جس نے ابن سینا کے 'القانون فی الطب' کا تنقیدی محاکمہ لکھا اور جس کے دوران خون کی بعض دریافتوں نے دنیائے طب کو انقلاب انگیز تبدیلی سے دو چار کیا، وہ فقۂ شافعی کے اساطین میں سے تھے۔ اسی طرح نصیر الدین طوسی (متوفی ۱۲۷۴ء) جن کا Tusi Couple (الصغیرہ والکبیرہ) بطلیموسی نظریات کے رد میں سنگ میل سمجھا جاتا ہے اور جس نے آنے والے دنوں میں ایک متبادل نظام کائنات کے تخیل کا راستہ ہموار کیا، ان کا شمار اپنے عہد کے کبار اسمٰعیلی علماء میں ہوتا تھا۔ یہی حال ان کے شاگرد رشید قطب الدین شیرازی (متوفی ۱۳۱۱ء) کا ہے، جو مراغہ کی رصد گاہ سے وابستہ رہے، جنہوں نے نہ صرف یہ کہ طوسی کے تذکرہ پر شرحیں لکھیں بلکہ اس فن پر بعض طبع زاد کتابوں کا اضافہ بھی کیا۔ شیرازی ان تمام تر علمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ مقامی عدالتوں میں قاضی کے منصب پر بھی فائز رہے۔

یہاں تک کہ ان کے قلم سے 'جامع اصول الحدیث'، 'شرح السنۃ' اور 'فتح المنان فی تفسیر القرآن' جیسی وقیع کتابیں بھی نکلیں۔ نظام الدین نیشا پوری (متوفی ۱۳۲۸ء) جو اپنی سائنسی تالیف 'شرح التذکرہ' اور 'شرح المجسطی' کے حوالے سے شہرت رکھتے ہیں وہ بیک وقت 'غرائب القرآن و رغائب الفرقان' کے مصنف بھی ہیں۔ ابن شاطر جن کی تحریروں سے مغرب میں نئے نظام کائنات کی بحث شروع ہوئی اور جس کے سرقے سے کوپرنکس کو مغرب میں جدید دنیا کا بانی مبانی سمجھا گیا ان کی بابت تو ہر شخص کو معلوم ہے کہ وہ دمشق کی مسجد اموی میں موقیت کے عہدے پر مامور تھے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جن کے التباس فکری اور آزاد خیالی کا چرچا ہوتا رہا ہے جس میں ابن رشد کا نام سرفہرست ہے وہ بھی اشبیلیہ اور قرطبہ میں عہدۂ قضاۃ سے وابستہ تھے۔ گویا ظہور اسلام سے سولہویں صدی عیسوی تک تحریک تسخیر و اکتشاف بنیادی طور پر ایک مذہبی تحریک تھی جس کی کمان اہل مذہب کے ہاتھوں میں

تھی۔ اپنے تمام تر التباس فکری کے باوجود جس سے مسلم فکر کے دھارے ابتدائی صدیوں میں مختلف سمتوں میں بہنے لگے تھے اکتشافی علوم کی دینی حیثیت مشکوک نہیں ہوئی تھی۔ البتہ سولھویں صدی عیسوی کے آخر تک ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قلب ونظر میں کسی نامحسوس، تقلیب انگیز تبدیلی کے لیے فضا ہموار ہورہی ہو۔ ان عوامل کا تفصیلی محاکمہ تو ہم آئندہ کبھی کریں گے البتہ یہاں چند ضروری اشارات پر اکتفا کرنا مناسب ہوگا۔

عبدالملک کی سیاسی اصلاحات

عبدالملک کے عہد میں جب اسلامی ریاست عرب امپائر کی صورت میں متشکل ہورہی تھی بعض ایسے واقعات پیش آئے جس نے آنے والے دنوں میں ہمارے تہذیبی سفر پر فکری التباسات کی ایک دھند قائم کردی۔ عبدالملک خود اپنے عہد میں گوکہ نزاعی حکمراں رہے اور ایک طویل عرصہ تک سرزمین حجاز میں ان کی حکمرانی قائم نہ ہوسکی جہاں ابن زبیر منصب خلافت پر متمکن تھے۔ لیکن بعد کے دنوں میں تاریخ کتابوں میں انہیں قبولیت عامہ مل گئی۔ عبدالملک نے اپنی حکومت کے استحکام کے لیے جو مختلف اقدامات کیے ان میں ایک اہم قدم یہ تھا کہ انہوں نے پہلی بار اپنے انتظامی دفاتر اور حساب کتاب کے گوشواروں کو عربی میں منتقل کرنے کے احکامات صادر کیے۔ اس طرح گویا آنے والے دنوں میں عرب بیوروکریسی کی راہ ہموار ہوئی۔ اس عہد میں ایک دوسرا بڑا واقعہ یہ ہوا کہ بازنطینی حکمراں جسٹینین ثانی، جو تثلیث کا پرزور مبلغ تھا اور جسے یہ بات گراں گزرتی تھی کہ مسلم ریاست اپنے سرکاری خطوط کی پیشانی پر قل ھو اللہ لکھے اس نے عبدالملک کو یہ دھمکی دی کہ اگر اس نے اپنے مؤقف پر اصرار جاری رکھا تو وہ سکوں پر رسول اللہ ﷺ کے سلسلے میں ایسے الفاظ کندہ کرادے گا جس سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوں گے۔

کہا جاتا ہے کہ عہد عبدالملک تک سونے اور چاندی کے سکے یا تو بازنطینی ٹکسال کے ڈھلے ہوتے تھے یا پھر ساسانی ریاست کی باقیات کے طور پر ان کی تصدیق شدہ مہروں کے سبب معتبر سمجھے جاتے تھے۔ روزمرہ کا لین دین ان ہی سکوں کے ذریعے انجام پاتا تھا۔ بازنطینی دھمکی نے عبدالملک کو فوری اقدام پر آمادہ کیا اور یہ بات طے پائی کہ مسلم ریاست اب اپنی ٹکسال کا اہتمام خود کرے گی۔ عربوں کے لیے یہ میدان خاصا نیا تھا۔ خالد بن یزید جو الکیمی سے دلچسپی کے لیے معروف تھے، مشاورت کے لیے طلب کیے گئے اور پھر اس فن پر باقاعدہ مہارت کے لیے جدوجہد شروع ہوگئی۔ یہ دو عوامل ایسے تھے جنہوں نے اجنبی مآخذ سے فنی کتب کے ترجموں کی راہ ہموار کردی (جاری ہے)۔

مدیر کے نام

محترمی ومکرمی

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ،

مندرجہ ذیل رپورٹیں اس عریضہ کے ساتھ ارسال خدمت ہیں:

۔ ۲۴ ستمبر کو لاہور میں منعقد ہونے والی ملی مجلس شرعی کی ''اتحاد امت کانفرنس''

۔ ۵ اکتوبر کو لاہور میں جمعیت علماء پاکستان (نورانی گروپ) کے زیراہتمام منعقد ہونے والی ''آل پارٹیز تحفظ ناموسِ رسالت کانفرنس'' اور

۔ پاکستان شریعت کونسل کے ایک اہم مشاورتی اجلاس کی رپورٹ

آنجناب سے استدعا ہے کہ ازراہِ کرم ان کا بغور مطالعہ فرما کر اس سلسلہ میں اپنی گراں قدر رائے سے مستفید فرمائیں اور خاص طور پر اس حوالہ سے ہماری راہ نمائی فرمائیں کہ ان دینی وقومی معاملات میں مزید پیش رفت کے لیے ہمیں عملی طور پر اب اور کیا کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے آنجناب کی سرپرستی ہمیں کس طرح حاصل ہوسکتی ہے؟

امید ہے کہ آپ اپنی گوناگوں مصروفیات میں سے اس کارِ خیر کے لیے کچھ وقت ضرور نکال سکیں گے۔

(مولانا) ابوعمار زاہدالراشدی
سیکرٹری جنرل پاکستان شریعت کونسل
سینئر نائب صدر ملی مجلس شرعی پاکستان

گرامی قدر مولانا زاہد الراشدی صاحب
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

جناب کا گرامی نامہ ملا۔ خط کے اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے پاکستان کے دینی مستقبل کے حوالے سے سوچنے والے دیگر احباب کو بھی یہ خط بھیجا ہے۔ اگر آپ کو کچھ جوابات موصول ہوئے ہوں تو از راہ کرم ان سے مجھے بھی آگاہ فرمائیں۔ اس بارے میں میری طالبعلمانہ گزارشات درج ذیل ہیں:

☆ پاکستان میں شریعت نافذ ہونی چاہیے اور اس کے احکام پر عمل ہونا چاہیے۔ اس بات پر سوائے کچھ سیکولر لوگوں کے، علماء کرام اور مسلمان عامۃ الناس متفق ہیں۔ گو شریعت پر عمل کے حوالے سے ان کے اندر کوتاہیاں موجود ہیں۔ جہاں تک ہمارے حکمرانوں کا تعلق ہے تو وہ اسلام دشمن عالمی طاقتوں کے دباؤ، ذاتی مفادات اور بعض ذہنی تحفظات کے وجہ سے ملک میں شریعت نافذ نہیں کرتے۔

☆ لیکن نفاذ شریعت کا مفہوم کیا ہے اور اس سے مقصود کیا ہے؟ اور یہ کس کی ذمہ داری ہے؟ اس والے سے ہمارے ہاں خاصا کنفیوژن موجود ہے جسے دور کرنے کی ضرورت ہے۔ میری رائے میں اس کا یہ مفہوم ناقص ہے کہ پاکستان میں نفاذ شریعت صرف حکومت کی ذمہ داری ہے اور دینی عناصر کو حکومت سے مطالبہ کرنا چاہیے کہ وہ ملک میں شریعت نافذ کرے اور اس ضمن میں ضروری قانون سازی کرے ـــــ اور بس۔ میرے خیال میں اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ احکام شریعت پر عمل کرنا ہم سب (عوام، علماء، حکام) کی ذمہ داری ہے اور سب کو اس میں اپنا اپنا کردار ادا کرنا چاہیے اور موجودہ حالات کی اصلاح کر کے ایسا ماحول اور حالات پیدا کرنے چاہئیں جن میں ہم سب احکام شریعت پر عمل کر سکیں۔ گویا اس کام کے عملاً تین فریق ہیں:

۱۔ عامۃ الناس: جن کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی انفرادی زندگی میں احکام شریعت پر عمل کریں [اور ان میں سے جو علم و عمل کی اچھی صلاحیت رکھتے ہوں وہ دوسروں کو بھی توجہ دلائیں]۔

۲۔ علماء کرام: جن کا کام یہ ہے کہ وہ خود دین پر عمل کرنے کے ساتھ عوام کو بھی اسلامی احکام پر عمل کی ترغیب دیں اور حکمرانوں کو بھی اس فریضے کی طرف توجہ دلائیں۔

۳۔ حکمران: جن کا کام یہ ہے کہ وہ ذاتی زندگی میں دین پر عمل کرنے کے ساتھ ریاستی قوت اور ذرائع سے ملک میں شریعت نافذ کریں اور معاشرے اور ریاست میں ایسا ماحول پیدا کریں جس میں احکام شریعت پر عمل آسان ہو جائے۔

اِس وقت تک اِن مذکورہ تینوں فریقوں نے نفاذ شریعت کا کام جس طرح کیا ہے اور جو نتائج ان کے کام کے نکلے ہیں وہ غیر تسلی بخش ہیں، نظر ثانی کے محتاج ہیں اور اس کام کے لیے نئی حکمت عملی

اور کام کے نئے اسالیب وضع کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

کام کی نئی حکمت عملی اور نئے اسالیب کیا ہوسکتے ہیں؟ اس ضمن میں میری تجویز یہ ہے کہ کام کو سماجی اور سیاسی دو شعبوں میں تقسیم کردینا چاہیے اور ان میں کام کی ترتیب یہ ہونی چاہیے:

سماجی شعبہ: فریق اول یعنی عامۃ الناس یا سوسائٹی کے اہم طبقات (مثلاً دانشور، ادیب، صحافی، پروفیسرز، اساتذہ، طلبہ، ڈاکٹرز، انجینئرز، تاجر، صنعتکار۔۔۔وغیرہ) کے دین دار عناصر اور فریق دوم یعنی علماء کرام مل کر منظّم و متحد ہوجائیں اور مقاصد شریعت کے حصول کے لیے حکومت پر انحصار کرنے کی بجائے آئین و قانون جس حد تک اجازت دیتا ہے خود ادارے بنا کر شریعت پر عمل درآمد شروع کردیں۔ اس طرح تعلیم، میڈیا، تعمیر اخلاق، معیشت، معاشرت، انصاف، امن و امان کے شعبوں میں اتنا کام کیا جاسکتا ہے کہ آج حکومت سے نفاذ شریعت کے لیے جن امور کا مطالبہ کیا جاتا ہے اس کا ۷۰، ۸۰ فیصد کام پرائیویٹ سیکٹر میں ہوسکتا ہے۔

سیاسی شعبہ: نفاذ شریعت کے لیے ریاستی قوت اور وسائل کیسے استعمال کیے جائیں؟ اس کے لیے جن نئے طریقوں سے کام کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہیں:

ا۔ موجودہ دینی سیاسی جماعتوں کو نفاذ شریعت اور دینی تناظر میں سیاسی حکمت عملی کے متفقہ نکات پر متحد کرنے کی کوشش کی جائے۔

ب۔ ان سے مل کر نفاذ شریعت کے لیے ہوم ورک کیا جائے تا کہ اگر انہیں اقتدار ملے تو وہ نفاذ شریعت کے حوالے سے مؤثر نتائج دے سکیں اور حزب اختلاف میں ہوں تو بھی نفاذ شریعت کے لیے متفقہ حکمت عملی سے حکومت سے کام کرواسکیں۔ اس کے لیے قانون سازی پر اصرار کی بجائے سماجی شعبے کی اصلاح کو ترجیح دی جائے۔

ج۔ جزو ا اور ب میں مذکور یہ کام فریق اوّل و دوم پر مشتمل وہ متحدہ تنظیم کرے جس کا ذکر اوپر سماجی شعبہ میں ہوا۔ جب یہ طے، واضح، نمایاں اور عملاً ثابت ہوجائے اور لوگوں کو یہ یقین آجائے کہ یہ تنظیم سیاست میں حصہ نہیں لے گی، الیکشن نہیں لڑے گی اور اقتدار کی دوڑ میں شامل نہیں ہوگی تو اس کے لیے یہ بھی ممکن ہوگا کہ وہ پاکستان کی دوسری (سیکولر) سیاسی جماعتوں کے افراد کی دینی تناظر میں اصلاح کرسکے یا نفاذ شریعت کے کسی مسئلے پر ان پر اخلاقی دباؤ ڈال سکے، بلکہ بالواسطہ طور پر دینی سیاسی جماعتوں کی اصلاح کے لیے بھی کام کرسکے۔

یہ خط مَیں ذاتی حیثیت سے لکھ رہا ہوں۔ ملی مجلس شرعی کے احباب اس پر غور کرسکتے ہیں کہ آیا مجلس کو اس سلسلے میں کوئی کردار ادا کرنا چاہیے یا نہیں؟

محمد امین

ڈاکٹر محمد امین کی بعض اہم تالیفات

اردو

۱۔ ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل
۲۔ ہمارا دینی نظامِ تعلیم
۳۔ تعلیمی ادارے اور کردار سازی
۴۔ مسلم نشأۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل
۵۔ اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش
۶۔ اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی نفسیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ)
۷۔ حقیقتِ تزکیۂ نفس
۸۔ ترکِ رذائل (اصلاح اعمال واخلاق کا حصہ اول)
۹۔ اسلام اور پاکستان
۱۰۔ اسلامی انقلاب۔ مفہوم، تقاضے اور حکمت عملی
۱۱۔ عصر حاضر اور اسلام کا نظامِ قانون
۱۲۔ مقالاتِ امین (دو جلدیں)
۱۳۔ مطالعۂ قرآن وحدیث (برائے جماعت اول تا پنجم)

بروشرز

۱۴۔ پرائیویٹ سکولوں کے نام ایک اہم پیغام
۱۵۔ طلبہ کی اسلامی تربیت۔ کیوں اور کیسے؟
۱۶۔ انگلش میڈیم۔ فائدے اور نقصانات
۱۷۔ دینی مدارس کے نام۔ ایک اہم پیغام
۱۸۔ مسلمانوں کی ترقی کا واحد راستہ
۱۹۔ حقیقتِ تصوف

انگریزی

۲۰۔ Riyadh-us Saliheen (2 Vols)
۲۱۔ Noble Quran, Part 1
۲۲۔ Islamization of Laws in Pakistan

عربی

۲۳۔ السلطة التشريعية ۔ دراسة مقارنة

جمہوریت کا پریشر ککر

احباب کی ایک مجلس میں ہم نے کہا:
ہماری سیاسی قیادت کا کام کیا ہے؟ امریکی غلامی پہ قانع رہنا اور اس کی تہذیب اور مطالبات کو سپورٹ اور پروموٹ کرنا — گویا نظریاتی سرحدوں کی عدم حفاظت

اور

فوجی قیادت کا کام کیا ہے؟ امریکی حملوں کی مزاحمت نہ کرنا اور انہیں سپورٹ کرنا — گویا زمینی سرحدوں کی عدم حفاظت
تو — ان حالات میں — ہماری بقاء کا جواز کیا ہے؟

ایک صاحب بولے: نہیں! وہ ایک کام اور بھی کرتے ہیں — کہ آپ جیسوں کی تنقید برداشت کرتے ہیں
ہم نے کہا: واقعی! یہ تو بڑی بات ہے۔

اس پر ایک تیسرے صاحب بولے: بھئی! یہ تو ایک نفسیاتی ٹیکنیک ہے کہ جو بولتا ہے اسے بولنے دو کہ اِس طرح جذبات کی نکاسی ہوتی رہتی ہے اور عملاً کوئی تبدیلی بھی نہیں آتی۔ اگر یہ بھی نہ ہو اور جذبات جمع ہوتے رہیں تو معاشرہ ایک دن پریشر ککر کی طرح پھٹ پڑے اور تبدیلی آ جائے جیسے مسلم عرب اور افریقی ممالک میں آ رہی ہے۔ تو یہ نسخہ، جسے سیاسی لغت میں 'جمہوریت' کہتے ہیں، دراصل حقیقی تبدیلی روکنے کا ایک مؤثر نسخہ ہے۔

لہٰذا موجودہ حالات میں پاکستان میں اسلامی تبدیلی یا کسی بھی حقیقی تبدیلی کے آنے کا بظاہر کوئی امکان نہیں۔

مولانا حسین احمد مدنی

دینی مدارس: نصاب میں تبدیلی کی ضرورت

یہ اس نصاب کا مقدمہ ہے جو مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے ہندوستان کے دینی مدارس، خصوصاً مدارس بنگال و سہلٹ، کے لیے تیار کیا تھا۔ اس پر کوئی تاریخ موجود نہیں تاہم اندازہ ہے کہ یہ مولانا کے دیوبند میں تدریس سے پہلے کا تیار کردہ ہے۔ ہم اس نصاب کے اہم اجزاء البرہان میں شائع کریں گے، ان شاء اللہ۔ مضمون کا عنوان ہمارا ہے۔ امین

الحمدلله رب العلمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين واله وصحبه وتابعيه اجمعين

مواسم کی تبدیلی اگر پوشاک اور خوراک کے ردوبدل کی خواہاں ہے اور ممالک واقطار علم کی مزاجی کیفیتوں کا اختلاف سکان کے احوال وعادت پر اثر رساں ہے۔ اور اگر مفید خزائن علمیہ کا تجدد الانفع فالانفع کو اختیار کرنے کا قانون بناتا ہے اور مختصرات و جوامع شروح جدید اور حواشی مفیدہ کا روز افزوں ذخیرہ متقدمین کی مسلمہ کتابوں کی جگہ لینے کی سنت زمانہ سلف سے دکھاتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ زمانۂ موجودہ اور دیار ہندیہ میں ہم زمان اور مکان کی مختلف حادثہ اور قدیمہ ضرورتوں سے چشم پوشی کریں اور ان مفید اور انفع کتابوں کو فنون ضروریہ رائجہ میں قابل فروگزاشت سمجھیں جو کہ قدیم نصاب کی کتابوں سے نفع رسانی میں نہایت اعلیٰ شان رکھتی ہیں۔

ہم کسی طرح اس امر کو قابل عمل نہیں قرار دے سکتے کہ پرانی کتابیں صرف اس وجہ سے ہی ضروری ہیں کہ اسلاف کی تصنیف کردہ یا اسلاف کے زیر تدریس رہا کی ہیں۔ اور جدید تصنیف کردہ کتب صرف اس وجہ سے قابل ترک قرار دی جائیں کہ وہ زمانہ حال یا قریب کی تصنیف کی ہوئی ہیں یا اسلاف نے ان سے نفع نہیں اٹھایا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ امام محمد بن الحسن رحمتہ اللہ علیہ کی مشہور اور غیر مشہور کتابوں پر صدر شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف نے جالے کھینچ دیے۔ صاحب ہدایہ اور صدر الشریعہ وغیرہ کی تصانیف نے اپنے سے پہلوں کی تصانیف کو زوایا خمول میں نسیاً منسیاً کر دیا۔ کتاب سیبویہ اور مبرد وغیرہ کی تصانیف پر ابن حاجب اور مالک کی تصانیف قضاء بالموت کا حکم نافذ کرتی رہیں اور فارابی اور ابن سینا کی تالیفات پر تصانیف میر زاہد ومحبّ اللہ بہاری وغیرہ پردہ ڈالتی ہیں۔

اگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلقات تحریر یہ قرار دیتے ہیں کہ زید بن ثابتؓ کو زبان عبرانی سیکھنے کا حکم فرمائیں اور اگر ملوک عجم کا کسی خط کو بلا مہر قابل اعتبار نہ سمجھنا آنحضرت ﷺ کو آمادہ کرتا ہے کہ انگشتری اور مہر تیار کرائیں تو ہم کو زمانۂ موجودہ پر نظر ڈالتے ہوئے اجنبی زبانوں اور فنون وغیرہ کے سیکھنے اور سکھانے کو یک قلم پس انداز کر دینا کسی طرح مناسب نہ ہوگا۔ مذہبی حیثیت بھی مثل معاشی ضرورتوں کے تقاضا کرتی ہے کہ اقوام عالم کی زبان ان کے رسم و رواج اور ان کے علوم وفنون وغیرہ سے واقفیت حاصل کی جائے۔

مذکورہ بالا امور اور اس قسم کے مختلف اور متعدد وقائع عرصہ دراز سے مجھ کو پریشان کر رہے تھے کہ موجودہ اور رائجہ نصاب زمانۂ حال میں قابلِ اصلاح و ترمیم ضرور ہے مگر زمانہ نے مجھ کو اب تک مہلت نہ دی۔

میں نے ایام تعلم و استفادہ میں دیوبند کا نصاب تعلیم (جس کا بڑا حصہ درس نظامی کا خوشہ چین ہے) اپنے لیے معراج ترقی اور مسلم زندگی قرار دیا۔ اور حسب استعداد وقابلیت بڑے درجہ تک اس سے فیض یاب ہوا مگر مدینہ منورہ میں مجھ کو جامعہ ازہر (مصر) اور استنبول بخارا وغیرہ کے نصابوں سے سابقہ پڑا۔ پھر زندگانی کے مختلف شعبوں پر غور وخوض کرنے کی نوبت بھی آئی۔ مختلف ممالک اور متعدد حکومتوں کے احوال نظر سے گزرے۔ اسکولوں اور کالجوں کے نصابوں پر بھی بڑے درجہ تک عبور پہلے سے حاصل تھا۔ زمانۂ حال کی مختلف اسلامی یونیورسٹیوں (جامعہ عثمانیہ دکن، جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی، ندوۃ العلماء وغیرہ) کو بھی زیر نظر لانے کی نوبت آئی حتی الوسع احباب واکابر، اصحاب الرائے اور ارباب تجربہ سے مشوروں کی نوبت بھی بارہا آئی۔ بالآخر یہ موجودہ نصاب انتخاب اور غور وتدبر کے بعد قوم کے سامنے پیش کرنے کا فخر حاصل کرتا ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ تعلیمی حالت پر پوری روشنی ڈالنا اور مکمل اصلاح وترمیم مجھ جیسے ناواقف اور کم مایہ طالب علم کا کام نہیں مگر جبکہ اکابر قوم کو اس طرف کماحقہ توجہ نہیں تو پھر کم مایہ اشخاص ہی کو قدم بڑھانا پڑتا ہے۔ ملک میں مختلف جماعتیں موجود ہیں جنہوں نے بعض امور کو اپنا مطمع نظر بنا کر دوسرے ضروری مقاصد کو بالکل پس پشت ڈال دیا ہے مگر اس نصاب میں اپنی فہم وتجربہ کی بناء پر وہ صحیح راستہ اختیار کیا گیا ہے جو کہ مسلمانوں کو اصلی اور حقیقی کامیابی کے بام ترقی پر پہنچانے والا ہے۔ اگرچہ نصاب سے یہ مقصد نہیں ہوتا کہ طلباء کو حافظ فنون وعلوم بنایا جائے بلکہ ایک ایسی استعداد اور قابلیت

پیدا کرنی مقصود ہوتی ہے جس سے وہ جملہ ضروری فنون میں پوری قوت پیدا کرلیں تا کہ ضرورت یا تکمیل کے وقت ان کو کوئی نقصان سدراہ نہ ہوسکے مگر تاہم ان کو بہت سے فنون اور بہت سی اہم تر کتابوں اور اعمال سے دوچار ہونا ضروری ہے تا کہ یہ ملکہ راسخہ حاصل ہو۔

میں ابھی تک محسوس کر رہا ہوں کہ ہم ہندوستانی مسلمانوں کے لیے دائرۂ تصنیف و تالیف غیر مکمل ہے اور موجودہ کتابیں ہماری ضرورتوں کے لیے ایک درجہ تک ہماری زبان میں ناکافی ہیں مگر تاہم ان شاء اللہ یہ نصاب اگر اکابر قوم نے پسند فرمایا اور رائج کیا تو مجھ کو قوی امید ہے کہ ہمارے قوم و ملک میں اچھے اچھے اشخاص پیدا ہوسکیں۔

میں نے اگرچہ یہ نصاب تمام قطر ہند کے لیے تیار کیا ہے مگر چونکہ صوبہ بنگال کے اکابر و عمائد کی خدمات عالیہ میں اولاً پیش کرنے کا مجھ کو فخر حاصل ہوا ہے اس لیے میں نے بنگلہ زبان اور یہاں کے طرز کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے۔ دوسرے صوبہ میں اس کا تغیر حسب مکان نہایت آسانی سے ہوسکے گا۔

آخر میں اپنی بضاعت مزجاۃ میں اکابر قوم کے سامنے پیش کرتے ہوئے غلطیوں کی معافی اور اصلاح کی درخواست پیش کرتا ہوں اور اگر پسند خاطر ہوتو دعا اور ترویج کا خواستگار ہوں۔

والسلام

میں ہوں آپ کا خادم،

ننگ اکابر،

حسین احمد غفرلہ

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اُسے پھیر!
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر!

سید ابوالاعلیٰ مودودی

انقلابِ امامت کے لیے انقلابِ تعلیم ناگزیر ہے

ناخدا شناس آئمہ کی امامت میں رہ کر خدا شناسی کا مسلک زندہ نہیں رہ سکتا لہٰذا جو کوئی اس مسلک پر اعتقاد رکھتا ہو، اس کے عین ایمان و اعتقاد کا اقتضا یہ ہے کہ اس امامت کو مٹانے اور خداشناس امامت کو دنیا میں قائم کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔

جو نظامِ تعلیم محض پرانے سمعی علوم کی حد تک محدود ہے، اس میں یہ طاقت ہرگز نہیں ہے کہ امامت میں اتنا بڑا انقلاب برپا کرنے کے لیے آپ کو تیار کر سکے۔ لہٰذا اگر آپ اس پر راضی ہوں کہ خدا پرستی کا مسلک بتدریج مٹتے مٹتے دنیا سے فنا ہو جائے تب تو شوق سے اس نظامِ تعلیم پر جمے رہیں ورنہ اسے آپ کو بدلنا ہوگا۔ جو نظامِ تعلیم تمام علوم کو اسی ترتیب اور اسی زاویۂ نظر سے لیتا ہے جو ناخداشناس آئمہ کی ترتیب اور ان کا زاویۂ نظر ہے اور جو اس تمدنی مشین کا پرزہ بننے کے لیے انسانوں کو تیار کرتا ہے جو آئمہ ضلال نے بنائی ہے وہ دراصل ارتداد کا مجرب نسخہ ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی فریب نہیں ہوسکتا کہ اس نوعیت کی کسی تعلیم گاہ پر مسلم یونیورسٹی یا اسلامیہ کالج یا اسلامیہ ہائی سکول کے الفاظ کا اطلاق کیا جائے اور اس تعلیم کے ساتھ دینیات کے کسی کورس کو الگ سے جوڑ دینا ۹۵ فی صدی تو بالکل ہی لاحاصل ہے اور ۵ فی صدی فائدہ اگر اس سے حاصل بھی ہوسکتا ہے تو وہ بیش از یں نیست کہ لوگ کچھ مدت تک کفر کے راستے پر خدا کا نام لیتے ہوئے چلتے رہیں۔ اصلاحِ تعلیم کا یہ لائحہ کہ علومِ اسلامی کے ساتھ نئے علوم کا جوڑ لگایا جائے۔ یہ بھی امامت میں انقلاب پیدا کرنے کے لیے آپ کو تیار نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ فلسفہ، سائنس، تاریخ، سیاسیات، معاشیات اور دوسرے علوم جو اس وقت مدون و مرتب صورت میں آپ کو ملتے ہیں وہ سب کے سب ناخداشناس لوگوں کی فکر و تحقیق کا نتیجہ ہیں اور ان کی ترتیب و تدوین میں اس گروہ کا نقطۂ نظر اس طرح پیوست ہے کہ حقائق واقعیہ کو نظریات اور اوہام و تعصّبات اور اہواء و رجحانات سے الگ چھانٹ لینا اور خدا پرستی کے نقطۂ نظر سے ان کو بطور خود مرتب کر کے دوسرے نظریات قائم کرنا نہ ہر طالب علم کے بس کی بات ہے نہ ہر استاد کے بس کی۔

(بقیہ دیکھیے صفحہ نمبر ۱۵ کے آخر میں)

جدید تعلیم

ڈاکٹر محمد امین

انگریزی کی حکومت

گلی کوچوں میں کھلنے والے انگلش میڈیم سکولوں کا کاروبار اپنے عروج پر تھا کہ حکومت پنجاب نے سوچا کہ وہ اس ''کارخیر'' سے کیوں پیچھے رہے چنانچہ اس نے بھی اپنے زیرنگرانی سکولوں میں نئے تعلیمی سال سے پہلی جماعت سے انگریزی میڈیم کولازمی کر دیا ہے۔ اب غریبوں کے بچے بھی ''بابا بلیک شیپ'' کورس میں گائیں گے اور ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہوجائے گا۔

کارِطفلاں تمام خواہد شد

انگریزی کی اہمیت سے کسی کو انکارنہیں۔ ہمارے سائنس دانوں، انجینئروں، صنعت کاروں، سیاست دانوں، سفارت کاروں اور اعلیٰ تعلیم کے خواہش مند طلبہ کو انگریزی ضرور جاننی چاہیے کیونکہ انہیں اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ انگریزی سیکھنا اس لیے بھی اہم ہے کہ یہ بین الاقوامی رابطے کی زبان ہے اور علوم وفنون کا ایک بڑا ذخیرہ اس میں موجود ہے۔

تاہم یہ ایک خالص فنی نوعیت کا سوال ہے کہ انگریزی سیکھنے کے خواہش مند یا ضرورت مند طلبہ کو انگریزی کب سکھائی جائے؟ انگریزی بولنے والے ملکوں کو چھوڑ کر دنیا کے آزاد ممالک میں انگریزی سکھانے کا یہ طریقہ مروج ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے مرحلے پر کسی غیر ملکی زبان کی تدریس لازمی کر دی جاتی ہے یا وہاں غیرملکی زبانوں کی تدریس کی اکیڈیمیاں قائم کر دی جاتی ہیں۔ ثانوی یا یونیورسٹی تعلیم کے بعد جو طالب علم اپنے شوق سے یا کسی ضرورت سے انگریزی سیکھنا چاہتا ہے وہ ان اکیڈیمیوں سے سال چھ مہینے میں بنیادی انگریزی سیکھ لیتا ہے۔ اگر کوئی اس زبان میں زیادہ مہارت حاصل کرنا چاہے تو اس کے مواقع بھی موجود ہوتے ہیں۔ جب ساری دنیا میں غیرملکی زبانیں سکھانے کا یہی طریقہ مروج ہے تو سوال یہ ہے کہ ہم کیوں ایک غیرملکی زبان اپنے سارے بچوں کو اور وہ بھی پہلی جماعت سے پڑھانا چاہتے ہیں؟ اور یہی نہیں بلکہ اس غیرملکی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے پر مصر ہیں اور پرائیویٹ سیکٹر میں ہر تعلیمی ادارہ 'انگلش میڈیم' ہونے کا تمغۂ افتخار اپنے سینے پر سجائے ہوئے ہے؟

پرائیویٹ تعلیمی اداروں کے مالکان کا کہنا یہ ہے کہ اردو میڈیم میں والدین اپنے بچے نہیں بھجواتے لہٰذا انگریزی میڈیم سکول کھولنا ہماری مجبوری ہے کہ تعلیم دینا ہمارا ذریعہ روزگار اور کاروبار بھی ہے۔

حکومت کا مؤقف یہ ہے کہ جب سارے پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں انگریزی پہلی جماعت سے پڑھائی جاتی ہے تو سرکاری سکول کیوں اس کارِخیر میں پیچھے رہیں تا کہ طبقاتی فرق نہ بڑھے اور ملک کے تمام طبقوں کو یکساں ترقی کے مواقع ملیں۔

سوال یہ ہے کہ آخر ترقی کا انحصار انگریزی پر کیوں ہے اور یہ کون سی ترقی ہے جو انگریزی کے بغیر نہیں ہوسکتی؟ ہمارے سامنے جاپان نے انگریزی کے بغیر ترقی کی ہے۔ جرمنی نے انگریزی کے بغیر ترقی کی ہے۔ روس سائنس کے بعض میدانوں میں امریکہ سے بھی آگے تھا وہاں انگریزی 'حرام' تھی۔ فرانس ایک ترقی یافتہ قوم ہے اور انگلینڈ سے چند کوس کے فاصلے پر واقعہ ہے۔ وہاں جائیں تو جن کو انگریزی آتی ہے وہ بھی انگریزی میں بات کرنا پسند نہیں کرتے! تو آخر یہ کون سی ترقی ہے جو ہم انگریزی کے بغیر نہیں کر سکتے؟

اس سوال کے جواب کے کئی پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ ترقی اصلاً انگریزی پر منحصر نہیں ہے۔ یہ ہم ہیں جنہوں نے اسے انگریزی سے منسلک کر رکھا ہے کیونکہ غلامی ابھی تک ہمارے ذہن وقلب سے نہیں نکلی۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز کی حکومت ختم ہوگئی لیکن انگریزی کی حکومت ابھی تک قائم و دائم ہے بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ استعمار (جغرافیائی طور پر چلا گیا کہ یہ اس کی مجبوری تھی لیکن وہ) آج بھی اپنی زبان کے ذریعے ہم پر حکمرانی کر رہا ہے۔

پھر سوال یہ بھی ہے کہ اگر ترقی کا انحصار انگریزی پر ہے تو پھر پچاس سال سے بلکہ ڈیڑھ سو سال سے انگریزی پڑھ رہے ہیں ہم نے ترقی کیوں نہیں کی؟ جاپان اور جرمنی نے ہمارے دیکھتے دوسری جنگ عظیم میں تباہ ہونے کے بعد انگریزی کے بغیر ترقی کر لی ہے لیکن ہم ہیں کہ ڈیڑھ سو سال سے انگریزی پڑھ رہے ہیں لیکن ترقی ہمارے قابو میں نہیں آ رہی؟

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم نے بھی یہ سوال اٹھایا تھا کہ ہمیں سوچنے کی ضرورت ہے کہ انگریزی اختیار کر کے ہم نے ملی سطح پر کیا کھویا اور کیا پایا اور ہم بھی آج اپنے ماہرین تعلیم اور دانشوروں سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ ہماری ترقی آخر ایک غیر ملکی زبان کے ساتھ لازم وملزوم کیسے ہوگئی ہے؟ ہم جو ایک قوم ہیں، اپنا ایک مخصوص تمدن رکھتے ہیں، ہماری ترقی کا انحصار ایک غیر ملکی زبان پر کیسے ہوسکتا ہے جو ایک مختلف تہذیب، مختلف فکر اور مختلف تمدن کی پیداوار اور علمبردار ہے؟ کیا سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی محض ایک ایسی قوم کی زبان سیکھنے پر منحصر ہے جس نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں

ترقی کی ہے؟ کیا محض یہ زبان سیکھ لینے سے ہم بھی ترقی یافتہ ہوجائیں گے؟

یہ سوال اس وقت بھی زندہ تھا جب سرسید نے قوم کو انگریزی پڑھانے کی ٹھانی تھی لیکن اس وقت قوم ہزیمت خوردہ تھی۔ نااہل سیاسی قیادت، طویل خانہ جنگی، معاشی اور معاشرتی زوال، دینی قوتوں کی شکست اور فاتح انگریز کا جاہ و جلال ان سب عوامل نے اس وقت مسئلے کی حقیقی نوعیت واضح نہیں ہونے دی لیکن اب اسلام کے نام پر ایک ملک حاصل کرنے کے بعد اور اسے ایک جدید اسلامی ریاست بنانے کے عزم اور اعلان کے بعد بھی ہم کیوں نہیں سوچتے کہ ہماری ترقی کا انحصار محض ایک غیر ملکی زبان سیکھنے پر نہیں۔ فن تعلیم و تربیت کا ایک طالب علم ہونے کے ناطے ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ایک غیر ملکی زبان تعلیم و تعلم میں رکاوٹ ہوتی ہے، ممد نہیں اور اس کے ذریعے تخلیقی سوچ ابھرتی نہیں دب جاتی ہے۔ اس رائے کے حق میں مغربی ماہرین تعلیم کے حوالے بھی دیے جاسکتے ہیں اور ملکی اعداد و شمار سے بھی یہ بات ثابت کی جاسکتی ہے لیکن اختصار اس میں مانع ہے۔

اسی طرح دین کا ایک طالب علم ہونے کے ناطے ہم یہ بات علیٰ وجہ البصیرت کہہ سکتے ہیں کہ کسی بھی قوم کے عروج و زوال کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ اس میں ایسے اعلیٰ انسانی اوصاف پیدا ہوں جو اسے بنی نوع انسان کے لیے نافع اور اصلح بنادیں اور یہ اوصاف بہترین انداز میں اسی وقت پیدا ہوتے ہیں جب کوئی قوم ایک صالح نظریہ حیات پر یقین رکھتی ہو اور اس نظریے کو انسانی زندگی میں غالب و نافذ کرنے کے لیے قربانی دینے کا جذبہ رکھتی ہو۔ لیکن ایک ہماری قوم کے بعض عناصر ہیں جو ابھی تک یہی رٹ لگائے جارہے ہیں کہ ساری قوم انگریزی پڑھے کہ اس کے بغیر ترقی نہیں ہوسکتی۔

ہماری قوم آزاد ہوجانے کے باوجود مغرب سے کیوں مرعوب ہے اور اسلام جیسے صالح نظریۂ حیات کی بجائے مغربی تہذیب اور انگریزی زبان کو کیوں ترقی کا ذریعہ سمجھتی ہے؟ دراصل اس کا اہتمام بڑی پُرکاری بلکہ عیاری سے ہمارے حکمران طبقے کررہے ہیں۔ ہمارا حکمران طبقہ جو جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور بیوروکریسی (سول و ملٹری دونوں) کے بزرجمہروں پر مشتمل ہے، سیکولرزم پر یقین رکھتا ہے اور اپنے ذاتی اور طبقاتی مفادات کا تحفظ اسی میں سمجھتا ہے کہ کوئی حقیقی اسلامی تبدیلی پاکستانی معاشرے اور ریاست میں نہ آئے۔ استعمار نے جانے سے پہلے خصوصی طور پر یہ طبقات پیدا کیے، ان کی برین واشنگ کی اور اپنے مفادات کی حفاظت ان کے سپرد کی جسے یہ اپنے

بقاء کی جنگ سمجھ کر لڑ رہے ہیں اور بھی تک اس میں کامیاب ہیں۔ان کا سب سے بڑا ہتھیار انگریزی کی بالادستی ہے کیونکہ یہ اپنی اولاد کو تعلیم کے لیے مغربی ممالک بھجوادیتے ہیں جہاں وہ کچھ اور سیکھیں نہ سیکھیں انگریزی بہرحال سیکھ لیتے ہیں۔بطور متبادل انہوں نے اعلیٰ معیار کے انگریزی میڈیم تعلیمی ادارے ملک میں قائم کر رکھے ہیں،جن سے وہ استفادہ کرتے ہیں۔

لوگوں کو انگریزی سیکھنے پر مجبور کرنے کا انہوں نے یہ انتظام کر رکھا ہے کہ ملک کی اعلیٰ ملازمتیں انہوں نے صرف انگریزی جاننے والوں کے لیے مختص کر رکھی ہیں۔وہ یوں کہ ملک کی اعلیٰ ملازمتوں کے لیے انتخاب کا انتظام پبلک سروس کمیشن کے ذمے ہے جس نے امتحان کی زبان انگریزی مقرر کر رکھی ہے۔اسی کا شاخسانہ یہ بھی ہے کہ ہماری دفتری زبان ابھی تک انگریزی ہے کیونکہ ہمارے صاحب بہادروں کو جتنی اچھی انگریزی آتی ہے اتنی اچھی اردو نہیں آتی۔لہٰذا پبلک بھی انگریزی استعمال کرنے پر مجبور ہے اور یوں سارا دفتری اور حکومتی نظام انگریزی میں چلتا ہے اور غیر انگریزی دان کے لیے اس میں کوئی جگہ نہیں بنتی۔انگریزی کے حق میں یہ حالات جان بوجھ کر ہماری نوکر شاہی اور ہمارے حکمران طبقوں نے پیدا کر رکھے ہیں تاکہ ملک میں انگریزی کی بالادستی کے ذریعے ان کی بالادستی قائم رہے۔

پاکستان کے نظام تعلیم پر انگریزی مسلط کرنے کے دو بڑے نقصان ہوئے ہیں۔ایک تو یہ کہ نئی نسل پر ملی اور اسلامی نظریات کی گرفت کمزور ہوئی ہے۔مغرب پرستی،مغرب سے مرعوبیت،مغرب کو ترقی اور معیار کی علامت سمجھنا،مغرب کی ہر اچھی بُری بات پر سر دھننا،مغربی ثقافت کی پیروی کرنا اور مغربی طور طریقوں کو اپنانا،سب اسی کا شاخسانہ ہے۔یورپین ٹائپ انگلش میڈیم سکولوں میں، جہاں ہماری اپر کلاس کے بچے پڑھتے ہیں، اکثر یوں ہوتا ہے کہ مغربی افکار پر مبنی تہذیبی اثرات بچوں کی شخصیت پر غالب آجاتے ہیں اور وہ اسلام اور پاکستانیت کو دقیانوسیت اور لغو سمجھنے لگتے ہیں۔تاہم درمیانے درجے کے انگلش میڈیم سکولوں اور پہلی جماعت سے لازمی انگریزی والے سکولوں میں بچے کی شخصیت متصادم تہذیبی اور فکری تصورات و افکار کی وجہ سے منتشر ہو کر رہ جاتی ہے۔وہ نظریاتی طور پر یکسو اور ٹھوس کردار کا حامل شہری بننے کی بجائے ژولیدہ فکری کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کی شخصیت کا ڈھانچہ صحیح فکری سمت سے محرومی کی وجہ سے کمزور ہو کر اور متضاد افکار کی آماجگاہ بن کر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔

چھوٹی عمر کے مسلمان بچوں کو غیر ملکی زبان کی تدریس کی مخالفت ہم اس لیے کر رہے ہیں کہ یہ عمر کا انتہائی نازک دور ہوتا ہے یہ وہ وقت ہے جب بچہ دینی اور اخلاقی قدروں کے تصورات اخذ کرنا شروع کرتا ہے۔ اس کی شخصیت کے ڈھانچے کی تعمیر کی ابتداء ہوتی ہے۔ اسلام کا تقاضا تو یہ ہے کہ بچے کے کان میں سب سے پہلی آواز ''اللہ اکبر'' کی پڑے۔ ہماری ماضی کی تعلیمی روایت بھی یہی ہے کہ جب مسلمانوں میں تعلیم کی شرح سو فیصدی تھی اور ان کے ہاں بڑی بڑی یونیورسٹیاں اور سکول کالج موجود تھے۔ اس وقت بھی ابتدائی تعلیم کا گہوارہ مساجد اور ان میں قائم مکاتب ہوتے تھے۔ اس سے یہ ہوتا تھا کہ بچے کے ذہن میں اسلامی تصورات پختہ ہوجاتے تھے جو باقی ماندہ تعلیمی مراحل میں ساتھ چلتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کوئی بھی آزاد قوم پہلی جماعت سے اپنے بچوں کو کوئی غیر ملکی زبان نہیں پڑھاتی بلکہ ہر قوم اپنے دین، اپنی تہذیب اور اپنی فکر کے مطابق اپنے بچوں کو پروان چڑھاتی ہے۔ پھر جب بچے کی ایک شخصیت بن جاتی ہے، اس کے دینی اور اخلاقی تصورات پختہ ہوجاتے ہیں تو بعد کے تعلیمی مراحل میں حسب ضرورت غیر ملکی زبان یا غیر ملکی ادیان یا غیر ملکی ثقافت و تمدن کا مطالعہ کروایا جاتا ہے لیکن ابتدا ہی میں بچوں کو اپنے دین اور اپنی تہذیب سے متصادم ایک غیر اسلامی افکار کی حامل غیر ملکی زبان پڑھانا نظریاتی خودکشی کے برابر ہے۔ ایسا تو وہی قوم کرسکتی ہے جو کوئی نظریاتی شناخت نہ رکھتی ہو یا نظریاتی شناخت رکھنا نہ چاہتی ہو، جو کسی مخصوص غیر ملکی تہذیب و فکر کو عملاً اپنانا چاہتی ہو اور اسے اپنے ہاں رائج اور نافذ کرنا چاہتی ہو۔ جو قوتیں ہمارے ہاں انگریزی میڈیم یا انگریزی کو پہلی جماعت سے لازمی قرار دینے پر اصرار کرتی ہیں وہ درحقیقت یہی چاہتی ہیں۔ ہمیں افسوس ان اسلامی دانشوروں اور ماہرین تعلیم پر ہے جو اس صورت حال کا ادراک کرنے سے قاصر ہیں یا معاملے کو سمجھتے تو ہیں لیکن چونکہ خود انہوں نے بھی انگریزی ذریعۂ تعلیم کے سکول کھول کر اسے کاروبار بنا رکھا ہے اس لیے وہ اس معاملے کی نزاکت کو نمایاں نہیں ہونے دیتے اور اس غیر تعمیری رویے کی مزاحمت نہیں کرنا چاہتے۔

پہلی جماعت سے انگریزی کی لازمی تدریس کا فیصلہ ایک اور لحاظ سے بھی غیر حقیقت پسندانہ ہے اور وہ یہ کہ ہمارے بچے عام طور پر گھروں میں پنجابی، پشتو، سندھی، بلوچی وغیرہ بولتے ہیں۔ سکول جاتے ہی وہ اردو سیکھنا شروع کردیتے ہیں جو ذریعہ تعلیم بھی ہے۔ پھر اس چار پانچ سال کی عمر میں والدین بچوں کو عربی تعلیم یعنی قرآن مجید پڑھانے پر بھی اصرار کرتے ہیں گویا چار پانچ سال کے بچے پر

تین زبانوں کا بوجھ پہلے ہی موجود ہوتا ہے۔ اب انگریزی سے مرعوب دانش کہتی ہے کہ اسے انگریزی بھی اسی عمر میں پڑھاؤ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے اور اصولاً یہی نکلنا بھی چاہیے کہ اسے کوئی زبان بھی نہیں آتی، نہ عربی نہ انگریزی اور نہ اردو۔ فنی طور پر یہ بات بہت اہم ہے کہ بچے کے ذہن میں ایک زبان کے لسانی اسالیب (Patterns) پختہ ہو جائیں اس کے بعد اگر کوئی دوسری زبان سکھائی جائے تو وہ نقصان دہ نہ ہوگی۔ بلکہ پہلی زبان کی سیکھی ہوئی لسانی مہارتیں بچے کے کام آئیں گی لیکن جب آپ بیک وقت چار زبانیں ایک معصوم کے سر پر لاد دیتے ہیں تو یہ اس کے ذہنی کمپیوٹر کو کنفیوز کرنے والی بات ہے، نتیجتاً وہ کسی زبان میں بھی مہارت حاصل نہیں کر پاتا۔ اس وجہ سے ماہرین کہتے ہیں کہ پہلے ایک زبان سکھا دی جائے پھر بعد میں دوسری زبانیں سکھائی جائیں۔ چلیے زیادہ سے زیادہ دو زبانیں بیک وقت سکھا دی جائیں لیکن ہمارے حکمران اور مغرب سے مرعوب دانشور تو چار زبانیں بیک وقت اپنے معصوم بچوں کو سکھانے پر مصر ہیں۔ ہماری رائے میں عربی بھی اردو سکھانے کے ایک دو سال بعد سکھائی جانی چاہیے لیکن ایک تو دینی ہونے کی وجہ سے یہ جذباتی معاملہ ہے اور والدین اس پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ دوسرے عربی کے حروف تہجی، رسم الخط اور دوسرے لسانی سانچے اردو سے بہت مختلف نہیں۔ پھر عربی بھی اس عمر میں صرف قرآن پڑھنے کی حد تک سکھائی جاتی ہے دیگر لسانی مہارتوں پر زور نہیں دیا جاتا اس لیے ہم اسے فنی لحاظ سے کسی حد تک قابل قبول سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن یہ آخری حد ہے اس کے بعد بچے پر مزید کسی زبان کا بوجھ ڈالنا ہمارے نزدیک اس پر ظلم کے مترادف ہے اور خصوصاً ایسی زبان کا جو لسانی ساخت کے لحاظ سے بھی اس کے لیے مکمل اجنبی ہو۔

ہمیں ان لوگوں کی سادہ لوحی پر ہنسی آتی ہے جو بڑی سادگی سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ اسلام کوئی زبان سیکھنے سے منع نہیں کرتا، اس کی نظر میں سب زبانیں ایک جیسی ہیں لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے فلاں زبان نہیں سیکھنی چاہیے۔ یہ باتیں وہی کہہ سکتا ہے جو تعلیم و تعلم میں زبان کی اہمیت و کردار سے ناواقف ہو۔ کون نہیں جانتا کہ ہر زبان کسی خاص علاقے اور اس کے مذہب اور تہذیب و ثقافت کی مظہر اور امین ہوتی ہے اور ان اسباب کی وجہ سے ہر زبان کا ایک فکری اور تہذیبی سانچہ بن جاتا ہے جو خون کی طرح اس کی رگوں میں دوڑتا رہتا ہے۔ برصغیر کی مثال لیجیے سنسکرت یہاں ہندوؤں کی زبان ہے اور اردو مسلمانوں کی اور اس کے پیچھے صدیوں کا تہذیبی اور تمدنی عمل ہے۔ اب اگر کوئی کہے کہ سنسکرت کو اس کے تہذیبی و تمدنی پس منظر سے الگ کر کے مسلمانوں کی زبان بنایا جاسکتا

ہے اور اردو کو اس کے تہذیبی و تمدنی پس منظر سے الگ کر کے ہندوؤں کی زبان بنایا جا سکتا ہے تو اسے سادہ لوحی ہی کہا جا سکتا ہے۔

اسی طرح انگریزی زبان مغرب کی دینی فکر، اس کی مادہ پرستی، سیکولرزم، سرمایہ داری، لادین جمہوریت اور وہاں کی مادر پدر آزاد معاشرت کا مظہر، امین بلکہ علمبردار ہے۔ اسے مجرد ایک ایسی زبان کی حیثیت سے نہیں لیا جا سکتا جو ان تہذیبی اور فکری اثرات سے خالی ہو۔ اگر کوئی یہ کہے کہ ہم انگریزی کو اسلامی سانچے یا اسلامی پس منظر میں ڈھال کر پڑھائیں گے تو ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ ناممکن ہے لیکن یہ کام ناقابل یقین حد تک مشکل ضرور ہے کیونکہ کسی زبان کی تشکیلِ نو بڑا وقت طلب اور دقت طلب کام ہے، کسی لیبارٹری میں بٹن دبانے سے نہیں ہو سکتا۔ پھر اس کام کے لیے جس لگن، محنت اور جذبے کی ضرورت ہے وہ ہمارے ہاں سرے سے مفقود ہے۔ ہمارے اسلامی ماہرین تعلیم کی نالائقی کی حد تو یہ ہے کہ ان سے پچھلے پچاس سال میں سکولوں میں انگریزی پڑھانے کے لیے ایک سیریز بھی نہیں لکھی جا سکی۔ انہوں نے انگریزی زبان کا مزاج کیا تبدیل کرنا ہے؟ یہاں تو جناب چھری کاٹے گی خواہ وہ خربوزے پر گرے یا خربوزہ اس پر گرے۔

ایک اور بڑا نقصان جو ہمارے ہاں پہلے انگریزی لازمی کرنے سے ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اس نے ناخواندگی کو فروغ دیا ہے۔ میٹرک میں فیل ہونے والے طلبہ کی اکثریت انگریزی میں فیل ہوتی ہے اور انگریزی چونکہ ایف اے اور بی اے میں بھی لازمی ہے اس لیے نہ صرف یہ کہ ہمارے طلبہ کی ایک بڑی تعداد محض انگریزی کی وجہ سے میٹرک نہیں پاس کر سکتی بلکہ یہ طلبہ اگر کسی طرح رو پیٹ کر میٹرک کر بھی لیں تو انہیں آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں اعلیٰ تعلیم کی شرح ایک فیصد سے بھی کم ہے۔ اب ہمارے بزرجمہروں نے پہلی جماعت سے انگریزی لازمی کر دینے کا فیصلہ کر تو لیا ہے لیکن ہمیں یہ خدشہ ہے کہ یہ فیصلہ معصوم بچوں کو سکول سے بھگانے میں اہم کردار ادا کرے گا اور ہم خواندگی میں مزید پیچھے رہ جائیں گے بلکہ ناخواندگی کے نئے ریکارڈ قائم کریں گے۔ ایک طرف پنجاب حکومت لازمی تعلیم کا قانون بنا رہی ہے (اس پر گفتگو پھر کبھی کہ سارے بچوں کی تعلیم کے لیے حکومت انتظام بھی کر سکتی ہے یا یہ محض اخباری پروپیگنڈہ ہے) اور دوسری طرف بچوں کے لیے ناخوشگوار تعلیمی ماحول پیدا کر کے انہیں سکول سے بھاگنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ اسی وجہ سے بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانا یا اسے پہلی جماعت سے لازمی کرنا پاکستانی عوام کو

ناخواندہ رکھنے کی سازش ہے۔

پاکستان میں انگریزی سکھانے کے حوالے سے جو بات سب سے اہم ہے اور جسے اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے، وہ یہ کہ یہاں انگریزی پڑھانے کے طریقے نہایت فرسودہ اور ازکار رفتہ ہیں ورنہ انگریزی پڑھانے کے مواقع کی کمی نہیں۔ اس وقت بھی سرکاری سکولوں میں چھٹی جماعت سے لے کر بی اے تک انگریزی لازمی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا ہر گریجوایٹ نو سال تک مسلسل انگریزی پڑھتا ہے لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہمارے اکثر گریجوایٹ نہ تو انگریزی کی چند سطریں صحیح لکھ سکتے ہیں اور نہ انگریزی بول سکتے ہیں۔ تو اصل خرابی یہ نہیں کہ ہم اپنے بچوں کو انگریزی نہیں سکھاتے یا انہیں انگریزی سیکھنے کے مواقع میسر نہیں۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں انگریزی سکھانے کے طریقے دقیانوسی ہیں۔ انگریزی سکھانے کے ماہر اساتذہ موجود نہیں اور اساتذہ کی ٹریننگ کا مناسب انتظام موجود نہیں۔ سمعی و بصری آلات کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان حالات میں ضرورت اس بات کی تھی کہ انگریزی پڑھانے کا جو نظام پہلے سے موجود تھا اسے مؤثر بنایا جاتا اور اس کی اصلاح کی جاتی لیکن فیصلہ الٹی سمت میں کیا گیا ہے اور اسے پہلی جماعت سے لازمی کر دیا گیا ہے لیکن حسب معمول تربیت یافتہ اساتذہ کا انتظام سرے سے موجود ہی نہیں لہٰذا یہ کہنے کے لیے بہت زیادہ عقل کی ضرورت نہیں کہ یہ تجربہ بُری طرح ناکام ہوگا۔

ہم آخر میں اپنے مؤقف کو پھر دہراتے ہیں کہ ہمیں انگریزی سے کوئی کد ہے نہ ہمیں انگریزی کی اہمیت سے انکار ہے اور نہ ہم اس تدریس کے مخالف ہیں پاکستان میں انگریزی ضرور پڑھائی جانی چاہیے اور اعلیٰ معیار کی پڑھائی جانی چاہیے لیکن سب کو نہیں ضرورت مندوں کو اور وہ بھی مناسب وقت پر۔ اپنی نظریاتی اور ملی سرحدوں کے تحفظ پر اصرار ہماری بقاء اور استحکام کا مسئلہ ہے۔ ہمارا یہ فیصلہ ہونا چاہیے کہ ہماری نئی نسل کو پہلے اچھا مسلمان اور اچھا پاکستانی بننا ہے باقی باتیں اس کے بعد آئیں گی۔ لاریب ہمیں اس دنیا میں ترقی بھی کرنی ہے اور سربلند رہنے کے لیے جدوجہد بھی کرنی ہے لیکن ایک مسلمان کی حیثیت سے اور ایک پاکستانی کی حیثیت سے، اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب ہم اپنے نظریۂ حیات سے جڑے رہیں۔ جب نئی نسلوں کی شخصیت کی تعمیر اسلام اور نظریہ پاکستان کی بنیاد پر ہو، جب انہیں اپنے ماضی پر فخر اور مستقبل پر یقین ہو۔ اس کے برعکس اگر ہم نے اپنے بچوں کو مغرب کا گرویدہ اور اس سے مرعوب بنادیا۔ بچپن ہی سے اپنے بچوں میں غیر ملکی زبان کے ذریعے اسلام

مخالف تصورات کی آبیاری کر دی تو وہ کیسے سچے مسلمان اور پاکستانی بنیں گے؟

اندریں حالات ہماری تجویز یہ ہے کہ ملک میں انگریزی میڈیم سکولوں پر بغیر کسی استثنٰی کے فی الفور پابندی لگادی جائے۔ ثانوی سطح سے انگریزی کو ایک اختیاری مضمون کے طور پر پڑھنے کی اجازت ہو۔ اس کے ساتھ ہی انگریزی زبان کی اسلامی اور پاکستان کے تناظر میں تدریس کے لیے ایسے ماہرین تعلیم کی زیرنگرانی انگریزی کا نصاب اور نصابی کتب ازسرنو مدون کی جائیں جو اسلام اور نظریہ پاکستان پر پختہ یقین رکھتے ہوں۔ علاوہ ازیں انگریزی کی مؤثر تدریس کے لیے اساتذہ کی ٹریننگ کے پروگرام وضع کیے جائیں اور سمعی و بصری وسائل کے ساتھ تدریس کے جدید انداز اپنائے جائیں تاکہ جو طالب علم بھی انگریزی پڑھنا چاہے اسے تھوڑے عرصے میں اس زبان پر ماہرانہ گرفت حاصل ہوجائے۔ لیکن اگر یہ سب کچھ نہ کیا گیا تو جس طرح پہلے نو سال کی تدریس کے بعد بھی بچوں کو انگریزی نہیں آتی تھی، اب چودہ سال کی تدریس کے بعد بھی نہیں آئے گی، ناخواندگی میں زبردست اضافہ ہوگا، اسلام اور نظریہ پاکستان سے بُعد پیدا ہوگا اور ایک ایسی نسل پروان چڑھے گی جو آدھی تیتر آدھی بٹیر ہوگی، نظریاتی لحاظ سے عدم یکسوئی کا شکار ہوگی تو کردار کے لحاظ سے بودی اور کمزور۔
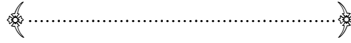
(صفحہ نمبر ۶ کا بقیہ) سید مودودی اور تعلیم

اب اگر آپ ایک طرف پرانے علوم کو پرانی ترتیب کے ساتھ اور نئے علوم کو اس خاص ترتیب کے ساتھ جو اس وقت پائی جاتی ہے، ملاکر پڑھائیں گے تو ان دو متضاد طاقتوں کے میل سے عجیب عجیب قسم کے مرکبات پیدا ہوں گے۔ کوئی پرانے علوم سے مغلوب ہوگا تو مولوی بن جائے گا۔ کوئی نئے علوم سے مفتوح ہوگا تو مسٹریٹ کی طرف چلا جائے گا بلکہ ''کامریڈیٹ'' تک پہنچ جائے گا۔ کوئی دونوں کے درمیان مذبذب ہوکر مضمحل ہوجائے گا۔ بہت ہی کم آدمی اس نظامِ تعلیم سے ایسے نکل سکتے ہیں جو دونوں قسم کے علوم کو جوڑ کر کوئی صحیح مرکب بنا سکیں۔ اور ان کا بھی اس قدر طاقت ور ہونا بہت مشکل ہے کہ اٹھ کر خیالات اور زندگی کے دھارے کو ایک طرف سے دوسری طرف پھیر دیں۔

ڈاکٹر محمد امین

دینی سیاسی جماعتوں کے اتحاد کے لیے

مجوزہ متفقہ پروگرام

۱۔ انتخابی اتحاد

۔ پوری کوشش کی جائے گی کہ ایک نشست پر دینی جماعتوں کے امیدوار مدمقابل نہ ہوں۔

۔ جہاں مجوزہ اتحاد کا کوئی امیدوار ہوگا وہاں ساری جماعتیں مل کر اس کی حمایت کریں گی اور اسے کامیاب بنانے کی کوشش کریں گی۔

۔ کسی دوسری سیاسی جماعت یا گروپ کی حمایت یا اس سے اتحاد کا فیصلہ محض انتخابات یا نشستوں کے لیے نہیں ہوگا بلکہ کچھ اصولی اور اسلامی مطالبات اس سے منوائے جائیں گے جن کا فیصلہ باہمی مشاورت سے ہوگا۔

۔ طریق انتخاب میں ان رکاوٹوں کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے گی جو غیر اسلامی اور غیر جمہوری ہیں اور اسلامی جماعتوں کو ووٹ نہ ملنے کا سبب بنتی ہیں جیسے انتخابی مہم میں دولت، برادری اور لسانی اثرات، آئین کے آرٹیکل ۶۲، ۶۳ پر عمل نہ ہونا۔۔۔۔۔ وغیرہ۔

۲۔ طریق کار

سیاسی جدوجہد

i۔ کامیابی کی صورت میں اگر اتحاد کو مرکز یا کسی صوبے میں اکثریت حاصل ہوگئی تو وہاں نفاذِ شریعت کے لیے وہ تمام اقدامات کیے جائیں گے جو ملی مجلس شرعی کے زیر اہتمام سارے مکاتب فکر کے 55 علماء کرام نے 15 متفقہ نکات کی صورت میں منظور کیے ہیں اور جو 1951ء میں 31 علماء کرام کے منظور کردہ متفقہ 22 نکات پر مبنی ہیں۔

ii۔ کامیاب نہ ہونے کی صورت میں باہم مل کر پارلیمنٹ میں جدوجہد کرنا اور حکومت سے ایک منصوبہ بندی کے تحت مختلف اسلامی مطالبات منوانا

۲۔ عوامی جدوجہد

i۔ عوامی سطح پر خود کو منظّم کر کے مختلف اصلاحی اقدامات کرنا مثلاً جدید تعلیم کو اسلامی تقاضوں کے مطابق ڈھالنا، دینی تعلیم کو مزید مؤثر بنانے کے لیے اس پر نظرِ ثانی کرنا، ذرائع ابلاغ کی نگرانی، اصلاح اور مناسب پروگراموں کی تیاری، تعمیر و اصلاحِ اخلاق کے لیے محلّہ/گاؤں کی سطح پر کمیٹیاں بنا کر انہیں فعال کرنا۔۔۔وغیرہ

ii۔ عوامی سطح پر منظّم ہو کر خدمتِ خلق یعنی مسلمانوں کے دکھ درد دور کرنے کے اقدامات کرنا مثلاً محلّہ/گاؤں کی سطح پر کمیٹی بنا کر بیواؤں، یتیموں اور مسکینوں کی مالی مدد کرنا، مریضوں کے علاج کی کوشش کرنا، شرعی/مصالحتی عدالتوں کا ملک بھر میں قیام اور مظلوموں کی مدد، چوری ڈاکوں سے بچنے کے لیے ہر محلے/گاؤں کی سطح پر امن کمیٹی کا قیام اور اپنی مدد آپ کے تحت پہرے کا انتظام۔۔۔وغیرہ

۳۔ تھنک ٹینک کا قیام

۔ ملک بھر کے چیدہ دانشوروں اور ماہرین پر مشتمل ایک تھنک ٹینک بنا دیا جائے جو ہوم ورک کرے اور مجوزہ اتحاد کے لیے حکمتِ عملی اور تفصیلی لائحہ عمل بنانے کا کام مستقل بنیادوں پر کرتا رہے۔ یہ تھنک ٹینک ابتداء ہی میں بنا دیا جائے تا کہ وہ کام شروع کر دے اور اتحاد کی مرکزی کونسل کے غور و خوض کے لیے تجاویز تیار کرتا رہے۔

....

بتوں سے تجھ کو امیدیں، خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے !

فلک نے ان کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنہیں
خبر نہیں کہ روشِ بندہ پروری کیا ہے !

کسے نہیں ہے تمنائے سروری، لیکن
خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے!

دینی سیاسیات ڈاکٹر محمد امین

کیا جمہوریت کے ذریعے اسلامی انقلاب آسکتا ہے؟

البرہان کے سابقہ شمارے میں مندرجہ بالا موضوع پر کراچی کے دو دانشوروں کے نقطۂ نظر کا ذکر ہوا تھا۔ شاہنواز فاروقی صاحب نے جماعت اسلامی کی اس امکانی قوت کا ذکر کیا تھا جو وہ اسلامی انقلاب لانے کے حوالے سے رکھتی ہے اور ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب کی رائے یہ تھی کہ جماعت موجودہ سیاسی حکمت عملی کے ذریعے نہیں جیت سکتی بلکہ اسے سماجی تبدیلی کی طرف آنا چاہیے۔

ہم اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے ابتداء ہی میں واضح کر دیں کہ بات 'ایشو' پر ہونی چاہیے اور یہ 'ایشو' صرف جماعت اسلامی کا نہیں بلکہ ساری دینی سیاسی جماعتیں اس کی مخاطب ہیں۔

۱۔ پاکستان بننے کے بعد جب دینی عناصر پاکستان میں حکومت الٰہیہ/اسلامی انقلاب/غلبۂ اسلام/اسلامی نظام/نفاذ شریعت/نظام مصطفیٰ۔۔۔ کے لیے عملی سیاسی جدوجہد کا لائحہ عمل بنا رہے تھے تو دو امور کی طرف وہ زیادہ توجہ نہیں دے سکے:

ایک: تو یہ کہ جس 'مغربی جمہوریت' میں چند اسلامی اصول شامل کر کے وہ اسے 'اسلامی جمہوریت' قرار دے رہے تھے اور اس مغربی جمہوریت کے بنائے ہوئے سیاسی اداروں کے تحت سیاسی جدوجہد کرنے جا رہے تھے وہ مغربی جمہوریت **اولاً** ایسے افکار ونظریات کی پیداوار تھی (جیسے ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم، ایمپریسیزم وغیرہ) جو اصلاً اسلام مخالف اور دین دشمن تھے اور اس کے قائم کیے ہوئے اداروں کے تحت جدوجہد کر کے منطقی طور پر مغربی فکر وتہذیب کو فروغ ملتا نہ کہ اسلامی اصول واقدار کو۔ **ثانیاً** اس مغربی جمہوریت کے پشتیبان مغربی ممالک اسلام اور مسلم دشمن تھے۔ انہوں نے اسلامی ملکوں کی 'جغرافیائی آزادی' کو مجبوراً گوارا کیا تھا اور وہ نوزائیدہ مسلم ممالک میں اپنی مرضی کی قیادت کے لانے، مسلمانوں کے دل ودماغ فتح کرنے اور وہاں مغربی فکر وتہذیب رائج کرنے کے لیے ہر جائز وناجائز حربہ اور ترغیب وترہیب کے سارے ذرائع استعمال کرنے والے تھے۔

دوسرے: مسلم معاشرے کی اپنی ایک تاریخ ہے جس کے سیاسی رویوں میں سے دو بہت اہم ہیں۔ **ایک** یہ کہ مسلم ریاستوں میں اسلامی تصور شورائیت کے اس پہلو پر کم ہی عمل درآمد ہوا ہے کہ حکومت

عام مسلمانوں کے مشورے سے بنی اور ہٹنی چاہیے اور دوسرے بعض مخصوص حالات میں علماء وصلحاء نے حکومت بنانے اور چلانے میں دلچسپی لینی چھوڑ دی اور تعلیم وتزکیہ کے شعبوں میں مصروف عمل رہے۔ یہ دونوں باتیں اسلامی آئیڈیلز کے خلاف ہیں لیکن زمینی حقائق ہیں اور ان کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا علماء کرام اور دینی عناصر جب پچھلے تیرہ سو سال کی مسلم روایت سے انحراف کرتے ہوئے عصر حاضر میں خود اقتدار کے طالب بن کر سامنے آئے تا کہ ریاست کی قوت کو اسلامی مقاصد کے لیے استعمال کرسکیں تو اس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنی بھی اصلاح کرتے اور مسلم معاشرے کی بھی کیونکہ نہ مسلم معاشرہ پچھلے تیرہ سو سال سے اس سیاسی منہج کا عادی رہا تھا اور نہ وہ خود۔ لیکن بدقسمتی سے انہوں نے نہ مسلم معاشرے کی اصلاح کی اور نہ اپنی۔ معاشرے کی اصلاح یہ مطلوب تھی کہ لوگوں کو دین پر عمل کا سچا طالب بنادیا جاتا اور اس ضمن میں علماء کی حکومت کی ضرورت ان پر واضح کردی جاتی۔ اور خود علماء کو اپنی اصلاح یہ مطلوب تھی کہ اگر وہ لوگوں کی دنیا بہتر بنانے اور اسے اسلام کے مطابق چلانے نکلے تھے تو ان کے دنیاوی معاملات میں دلچسپی لیتے، ان کے دکھ درد اور مسائل و مشکلات میں ان کا ہاتھ بٹاتے لیکن علماء کرام اور دینی عناصر نے یہ دونوں کام نہ کیے اور صرف سیاسی عمل میں حصہ لینے کو انہوں نے کافی جانا اور وہ بھی اپنے اپنے مسلک کی جماعت بنا کر، بغیر متحد ہوئے۔

ان دونوں امور کو کما حقہ توجہ نہ دینے اور انہیں پیش نظر رکھ کر اپنی حکمت عملی اور لائحہ عمل ترتیب نہ دینے کے دو نتیجے نکلے۔ ایک تو یہ کہ علماء اور دینی عناصر سیاست میں ناکام ہوگئے اور دوسرے یہ کہ معاشرہ دین سے دور ہوگیا ہے اور مغربی فکر وتہذیب کا معاشرے پر غلبہ ہوگیا ہے۔ لہٰذا کوئی خوابوں اور تمناؤں کی دنیا میں جینا چاہے تو اس کی مرضی ورنہ زمینی حقائق یہ ہیں کہ جماعت اسلامی تو رہی ایک طرف پاکستان کی ساری دینی جماعتیں (دل سے بھی مل جائیں جس کے بظاہر امکانات موجود نہیں) تو بھی وہ پاکستان کے سیاسی حالات پر اثر انداز ہوکر کوئی بڑی اور فوری تبدیلی (اسلامی تناظر میں) نہیں لاسکتیں۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ہماری دینی سیاسی جماعتیں:

۱۔ اصلاح معاشرہ کا کام کریں۔ اس کا ایک بڑا ذریعہ نظام تعلیم وتربیت ہے لیکن وہ خود اصلاح طلب ہے۔ جدید تعلیم کو مغرب کے منہاج سے نکال کر اسلام کے عصری تقاضوں کے مطابق اس کی تشکیلِ نو ناگزیر ہے اور دینی مدارس کی تعلیم کو بھی مؤثر بنانے اور عصری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اس پر بھی نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد تعلیم کو عام کیا جائے۔ نیز پرنٹ و الیکٹرانک

میڈیا کی اصلاح کی جائے اور مسجد کو مرکز بنا کر عوام کی اخلاقی تربیت وتزکیہ کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ دینی عناصر عوام کے دکھ درد میں شریک ہونے کو اپنا وطیرہ بنائیں اور خدمت خلق کو اپنائیں۔ غربت وافلاس کو کم کرنے کی کوشش کریں اور بیواؤں، یتیموں اور مسکینوں کا سہارا بنیں۔ مظلوموں اور پسے ہوئے طبقات کا ساتھ دیں۔ شرعی عدالتیں قائم کر کے انصاف مہیا کرنے میں عوام کی مدد کریں اور پہرے داری کا نظام قائم کر کے امن وامان بحال کرنے میں مدد دیں۔

معاشرے کی اصلاح اور خدمت خلق، یہ دونوں شرعی لحاظ سے مطلوب ہیں خواہ دینی عناصر اقتدار میں ہوں یا نہ ہوں۔ ہم یہ تجویز دے رہے ہیں کہ وہ سماجی تبدیلی کے ان کاموں کو اہمیت دیں اور اپنی حکمت عملی کا باقاعدہ جزو بنائیں اور یہ کام باقاعدہ منصوبہ بندی سے کریں۔

۳۔ سیاسی جماعت بنا کر الیکشن لڑنا اور اقتدار کے لیے جدوجہد کرنا ریاستی قوت کو اسلامی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوئی واحد صورت نہیں۔ اس کی دوسری صورتیں بھی ممکن ہیں اور ان پر غور کیا جا سکتا ہے۔ تاہم علماء کرام اور دینی عناصر اگر اسے موجودہ صورت ہی میں جاری رکھنے کو اپنی مجبوری سمجھیں تو کامیابی کے امکانات کو ممکن بنانے کے لیے مندرجہ بالا دو کاموں کے علاوہ، انہیں ایک تو متحد ہونا چاہیے (کہ اگر وہ الگ الگ رہے تو ماضی کی طرح پٹتے رہیں گے) اور دوسرے وہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور ان رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے مل کر تحریک چلائیں جو انتخابات میں حقیقی رائے عامہ کو اوپر آنے میں رکاوٹ ہیں مثلاً آئین کی دفعات 62، 63 پر عمل نہ ہونا، انتخابات میں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی طرف سے دولت کا ناجائز استعمال اور برادری و قبیلے کا کردار یا متناسب نمائندگی کا نظام اپنانا۔۔۔وغیرہ

۴۔ اوپر کے تینوں کام اس انداز سے کیے جائیں کہ اسلامی اصول واقدار کی بالادستی ہو اور مغربی فکر وتہذیب کا رد ہو کیونکہ جب تک ہم شعوری طور پر مغربی فکر وتہذیب اور اس کے مظاہر کو رد نہیں کریں گے اسلام کے لیے مؤثر انداز میں کام نہ کر سکیں گے۔ ویسے بھی کلمۂ طیبہ کا تقاضا یہی ہے کہ ہم پہلے جھوٹے خداؤں کی نفی کریں اور پھر ایک خدا کا اثبات۔

خلاصہ یہ کہ ہماری رائے میں مغربی جمہوریت یا اس سے ملتے جلتے جمہوری نظام میں محض سیاسی جدوجہد کے ذریعے اسلامی انقلاب نہیں آ سکتا اور اسلامی لحاظ سے کوئی مؤثر اور دیرپا تبدیلی لانا پیش نظر ہو تو تعلیم وتربیت کے ذریعے معاشرے کی اصلاح اور خدمت خلق شرط ہے۔

اسلام اور مغرب　　　سید خالد جامعی

ٹیکنالوجی اور ٹیکنو سائنس (۲)

جدید سائنس اور سرمایہ داری کا باہمی تعلق

۱۴۔ الٰہی مابعد الطبیعیات اور مادی مابعد الطبیعیات

اٹھارہویں صدی میں مغرب نے علمیت کو مابعد الطبیعیات پر فوقیت دے کر علمیت کے ذریعے مابعد الطبیعیات اخذ کرنے کی روایت قائم کی جس کے نتیجے میں ایک نئی مابعد الطبیعیات وجود میں آئی جس میں انسان ہی مرکز کائنات قرار پایا۔ وہی علم کا ماخذ، منبع اور سرچشمہ ٹھہرا۔ وہ کسی خارجی ذریعہ علم کا محتاج نہیں رہا۔ علم کا مرکز اس کائنات کے باہر عالم اکبر نہیں اس کائنات کے اندر اور خود عالم اصغر انسان کے اندر منتقل ہوگیا اور حصول علم کے لیے انسان کا رشتہ تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ آسمان سے، خارج سے، باہر سے منقطع ہو کر عالمِ ارذل و اسفل سے جوڑ دیا گیا۔ اس جعلی مابعد الطبیعیات [Pseudo metaphysics] کے نتیجے میں کائنات کا محور حقیقت مطلق، حقیقت الحقائق، حقیقت اولیٰ، اور اللہ کے بجائے اب صرف اور صرف انسان قرار پایا لہٰذا آزادی کے نام پر انسان پرستی کے فلسفے نے جگہ لی جس کی مختلف شکلیں انفرادیت پرستی، مادہ پرستی، نتائجیت پرستی، لذت پرستی، سرمایہ پرستی وغیرہ وجود میں آئیں۔

۱۵۔ ٹیکنو سائنس اسلامی مقصدِ حیات کو ہرگز پورا نہیں کرسکتا

خلافت عثمانیہ کے زوال کے بعد عالمِ اسلام کا اصل مسئلہ نفوس کا تزکیہ، تطہیر قلب، طہارت نفس، معرفت رب اور فکر آخرت کے بجائے صرف اور صرف فکر دنیا ہے یعنی اس زندگی کو کیسے بسر کیا جائے اس میں سہولتیں، لذتیں اور آرام کی کہکشاں کیسے سجائی جائے۔ اکیسویں صدی کی مسلم امت ٹیکنالوجی کی بے دریغ حمایت کے ذریعے اپنے اُس ارادے کا اظہار کرتی ہے کہ وہ دنیا فرعون کی طرح بسر کرے لیکن اس کا آخرت میں انجام حضرت موسیٰؑ کی طرح ہو۔ جو لوگ پیغمبروں کے ساتھ اپنا انجام چاہتے ہیں انھیں پیغمبروں کا طرزِ زندگی اختیار کرنا پڑے گا یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ دنیا فرعون کی اتباع میں بسر کریں اور ان کا انجام پیغمبروں کے ساتھ ہو۔ اس خواہش کا دوسرا نام مغرب ومشرق میں پُل کی تعمیر،

مشرق و مغرب میں مکالمہ، مشرق و مغرب میں مفاہمت، ہم آہنگی، مشترکہ عناصر کی تلاش ہے۔ عالمِ اسلام یہ چاہتا ہے کہ مغرب نے دنیاوی لذتوں اور سہولتوں کے لئے جو ٹیکنو سائنس ایجاد کی ہے اس کی تمام مصنوعات وہ حاصل کر لے لیکن اس کے اندر اسلام کی روحانیت داخل کر دے۔ لیکن انھیں نہیں معلوم کہ ٹرائے کی جنگ کے ٹروجن ہارس [Trogen Horse] کے پیٹ میں اس تہذیب کی مابعد الطبیعیات، تاریخ اور فلسفے کا لشکر چھپا ہوا ہوتا ہے جس تہذیب نے وہ گھوڑا تخلیق کیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ گھوڑا کوئی بھی تخلیق کر لے ہم اس پر بسم اللہ پڑھ کر سوار ہوتے ہوئے اسے اپنی اقدار کے مطابق ڈھال لیں گے۔ ٹیکنو سائنس کی ایجادات غیر اقداری نہیں ہوتیں، یہ خالص اقداری ہوتی ہیں۔ یہ تلوار، چھری یا خنجر یا نشتر نہیں ٹیکنو سائنس ہے اس میں سرمایہ داری کے سوا کوئی اور قدر داخل نہیں کی جاسکتی۔

۱۶۔ ٹیکنالوجی کی وجودی اقدار کو بدلا نہیں جاسکتا

کسی بھی ٹیکنالوجی میں قدر اس کے خیالی تصور،تعمیر، تشکیل، تخلیق [Creation Process] کے وقت تو داخل کی جاسکتی ہے لیکن جب وہ ایجاد تیار ہو کر بازار میں فروخت [Cosumption Purpose] کے لئے آجائے تو اس موقع پر اس بنی بنائی ڈھلی ڈھلائی ٹیکنالوجی کو اسلام کی روحانیت میں ڈھالنے کا عمل یا خواہش، آرزو، جستجو اور گفتگو مشق رائیگاں ہے۔ مثلاً موبائل فون بن گیا۔ یہ کیوں بنا، کیسے بنا، کس لئے بنا، کس نے بنایا، کتنے کھرب روپے خرچ کر کے بنایا، اس کے لئے امریکی محکمہ دفاع (پینٹا گون) نے کتنے کھرب کی سرمایہ کاری کی؟ یہ تمام مباحث فون استعمال کرنے والے فرد، قوم، تہذیب کے لوگوں کے لئے عموماً اجنبی اور غیر مانوس ہی رہتے ہیں لیکن وہ اس میں اذان، نعت، تلاوت کی آوازیں ڈال کر یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اس آلے کی مادیت کو روحانیت سے بدل دیا۔ وہ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ موبائل فون میں ان چیزوں کے داخل اور شامل ہونے سے اس کی مابعد الطبیعیاتی ساخت، رخ، نہج پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ تو محض اضافی کام ہے جو وہ اس ایجاد کے ساتھ کر رہے ہیں اس اضافی کام [Addition] سے فون کی قدر میں کوئی اضافہ [Value Addition] نہیں ہو رہا نہ فون کی اقدار بدل رہی ہیں کیونکہ قدر تو ایجاد کے تخیل کے ساتھ ہی اس میں باطنی طور پر سمو دی گئی اسے خارجی ذریعے سے سمونا محال ہے۔ اس فون کی قدر [Value] آزادی اور سرمایہ کا ارتکاز ہے لہٰذا فون میں اذان، نعت، تلاوت کی آوازیں شامل کرنے والا ان اسلامی لاحقوں سابقوں کے ساتھ آزادی اور ارتکاز سرمایہ کے مابعد الطبیعیاتی عمل میں بھی

شریک ہے۔ وہ اس نظام کا حصہ ہے اس کی شخصیت، اسلامیت، روایت اس نظام میں آج نہیں تو کل تحلیل ہوجائے گی یہ اقداری ایجاد [Value Loaded Invention] اسے اس کے خاندان اور اس کی نسلوں کو اس طرح بدل [Transform] کر رکھ دے گی کہ کسی کو اندازہ ہی نہیں ہو سکے گا مثلاً موبائل فون استعمال کرنے والا جہاں مدعو ہوتا ہے، جس دعوت میں مہمان کے طور پر شریک ہوتا ہے اسلامی آداب کے تحت مہمان و میزبان کی مجلس اور ان کے تخلیے میں کسی کو میزبان کی اجازت کے بغیر داخل ہونے کی اجازت نہیں کیوں کہ یہ اس کے وقت اور خرچ کا زیاں ہے لیکن آپ مہمان کسی اور کے ہوتے ہیں میزبان تخلیے میں آپ سے ہم کلام ہوتا ہے اور آپ اس کی اجازت کے بغیر اس کی موجودگی میں موبائل فون پر اپنے کئی مہمانوں کی میزبانی کا فریضہ اپنے میزبان کے قیمتی اوقات میں انجام دیتے ہیں۔گفتگو اور خیالات کا تسلسل اس مداخلت کے باعث بار بار ٹوٹتا ہے۔ میزبان نے خود کو آپ کے لیے فارغ کیا لیکن آپ خود کو کسی اور کے لیے وقف فرما رہے ہیں۔ پلاسٹک کے ایک کھلونے نے صدیوں کی روایت، اسلامی اخلاقیات اور اصول وآداب لمحوں میں تبدیل کر دیے مگر بدل جانے والے کو احساس تک نہیں ہوا۔مسجد میں لوگ نماز پڑھنے جاتے ہیں حتیٰ کہ حدودِ حرم اور روضۂ نبویؐ کے اندر بھی وہ اس فون کی آواز بند کرنا بھول جاتے ہیں۔ اکثر یہ آوازیں موسیقی کی ہوتی ہیں۔فون ان کو دنیا سے اس طرح جوڑتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہوتے ہوئے دنیا سے دوری گوارا نہیں کرتے۔ خانۂ کعبہ میں حاضری کے باوجود وہ حضوری کی لذت سے نہ صرف محروم رہتے ہیں بلکہ دوسروں کی لذت حضوری میں بھی اپنی حرکات سے خلل پیدا کرتے ہیں۔ اکثر مذہبی لوگوں کو دیکھا گیا کہ وہ نماز ختم ہونے کے فوراً بعد دعا سے پہلے فون نکال کر پیغامات پڑھتے ہیں یا نماز پڑھتے ہی، دعا مانگے بغیر، فوراً باہر نکل کر بات شروع کر دیتے ہیں۔ نماز کے دوران فون کی آواز بند کرتے ہیں مگر پیغامات وصول کرنے کا نظام کھلا رکھتے ہیں۔ جب بھی پیغام وصول ہوتا ہے ایک خفیف سی آواز مسجد کے مقدس ماحول کو مکدر کر دیتی ہے۔ دوسرے معنوں میں ہم جب اذان کی آواز سن کر مسجد کی طرف چلتے ہیں تو ہم اللہ تعالیٰ سے تعلق جوڑنے والے چند لمحات میں بھی دنیا سے تعلق منقطع نہیں کرنا چاہتے لہٰذا عموماً نمازی موبائل فون مسجد میں بھی کھلے رکھتے ہیں خواہ ان کی آواز بند [Silent] ہو۔ دنیا سے تعلق کی یہ نوعیت کہ آدمی اپنے رب سے راز و نیاز کے وقت بھی دنیا سے بے نیاز نہ ہو سکے اس بات کا ثبوت ہے کہ ٹیکنو سائنس آخرت پر دنیا کے غلبے کو ممکن بناتی ہے۔ انسان دنیا کو اس کے ذریعے اپنی عبادت گاہ میں اور خلوت و تنہائی میں بھی لے آتا ہے کیا یہ عمل مادیت پرستی

کی تعریف میں نہیں آتا؟ اکثر لوگ مسجد کے اندر ہی دعا کے بعد اپنے ہاتھ موبائل فون تک پہنچا دیتے ہیں۔ کئی مرتبہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ نماز کے لیے مسجد میں آرہے ہیں جماعت کھڑی ہورہی ہے مگر فون پر آخری ہدایات دی جارہی ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ سنّتوں کے وقفے میں کوئی پیغام موصول ہوا تو فوراً مسجد سے باہر نکل کر گفتگو شروع ہوجاتی ہے۔ بہت سے نیک نفوس باہر جاکر بات چیت کے بجائے وہیں بیٹھے بیٹھے جوابی پیغام روانہ کردیتے ہیں۔ یہ اعمال اب عام مساجد سے لے کر بیت اللہ اور مسجدِ نبویؐ تک وبائے عام کا درجہ اختیار کرچکے ہیں، تو کیا ٹیکنالوجی نے ہماری اقدار، روایات، رویوں، صدیوں کے معمولات پر کوئی اثر نہیں ڈالا؟ اس اثر کو روکنے کی کوئی ٹیکنالوجی ہمارے لوگوں نے ایجاد کی ہوتو وہ پیش کی جائے مغرب نے بینکوں میں ڈکیتیوں کو روکنے کے لئے ایک نظام وضع کیا ہے جس کے تحت بینک میں داخل ہوتے ہوئے اگر آپ موبائل فون بند کرنا بھول جائیں تو اس کا حافظہ [Memory] سلب کرلیا جاتا ہے اور اس کے اعمال[Functions] بینک کی عمارت کے اندر معطل کردیے جاتے ہیں۔ SMS کے ذریعے آپ کی آزادی اور تخلیے میں بلا وجہ ہر شخص، ادارہ اور کمپنی دخل اندازی کرتے رہتے ہیں۔ آپ کو وہ خبریں اور وہ لوازمہ بھی پڑھنے پر مجبور کردیا جاتا ہے جن کا ذکر سننا آپ کو گوارا نہیں ــــ اس جبر کا نام آزادی ہے اور یہ آزادی سب کو پسند ہے۔ موبائل فون استعمال کرنے کے اسلامی آداب پر کتابچے شائع کیے جارہے ہیں۔ قرون وسطٰی میں طبعی علوم (Sciences) ایک قلیل گروہ کی دلچسپیوں کا مرکز تھے۔ تین سال کی عمر کے بچے سے لے کر اسّی سال کے بوڑھے کو ان علوم کی جبری تعلیم نہیں دی جاتی تھی۔ جو ان علوم میں دلچسپی لیتا اسے روکا بھی نہیں جاتا تھا لیکن ریاست ، حکومت، معاشرت اور معاشرے کی تمام قوتیں ، جہتیں اور توانائیاں صرف طبعی علوم[Physical Sciences] کے لیے وقف نہ تھیں لوگ اساسی نقلی علوم [Real Knowledge] کو اہم ترین سمجھتے تھے اور آخرت کو بہتر بنانے والے علوم پر ان کی توجہ مرکوز تھی لہٰذا طبعی علوم میں اگر محیر العقول ترقی کے مظاہر و مناظر ہمیں روایتی تہذیبوں میں نظر نہیں آتے تو اس کا سبب اس عہد کے مابعد الطبیعیاتی تناظر کا جدید مغرب کے جعلی مابعد الطبیعیاتی تناظر [Pseudo Metaphysical Perspective] سے یکسر مختلف ہونا ہے۔

۱۷۔ ٹیکنو سائنس آخرت کی نفی کرتی ہے

قدیم تہذیبوں میں دنیاوی، مادی، عقلی اور حسی علوم کی تقلیل کا رویہ تھا جبکہ جدید مغرب کی ذہنی کیفیت اس کے برعکس مذہب کی تقلیل بلکہ مذہب سے انحراف اور مذہب کے مکمل اخراج سے عبارت

ہے۔ ٹیکنو سائنس کے ذریعے ہر ممکنہ حد تک مذہب کا دائرہ محدود اور تنگ کر کے اسے باقی زندگی سے اس طرح علیحدہ کر دیا گیا ہے کہ اس کا کوئی اثر زندگی پر باقی نہیں رہا۔ٹیکنو سائنس پر مبنی طرزِ زندگی جدید انسان کو حق کی سطح تک بلند کرنے کے بجائے حق کو اپنی سطح تک کھینچ لانے کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔الحق عہد حاضر پر اثر انداز ہونے کے بجائے اس کے سامنے سپر انداز ہو جاتا ہے۔ ہر شخص اور اصول کا ٹیکنو سائنس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا اور خود کو اس کے سپرد کر دینا اور سپردگی، بندگی اور فریب خوردگی عقل کا تقاضا اور ایمان کا معاملہ سمجھا جاتا ہے۔ ہم خود کو جدید سہولیات پر مبنی معاشروں کے باعث نہایت خوش قسمت تصور کرتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم ایک ایسی تنگ و تاریک، بے جہت، بے سمت، یک رخی اور اندھی دنیا میں زندہ ہیں جہاں اندھے ہی اندھوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔اور اگر ان رہنماؤں کو اس موقع پر نہ روکا گیا تو وہ دنیا کو پاتال میں پہنچادیں گے ۔ عالمِ اسلام میں جدیدیت ،مغربیت،ٹیکنو سائنس کے حامی اکثر لوگوں کی حالت فی الحقیقت اس سے مختلف نہیں ہے۔ ٹیکنالوجی کے بارے میں ہماری حد سے بڑھی ہوئی حساسیت کا ایک اہم سبب ویلفیئر ازم اور لبرل ازم ہے جس نے زندگی کا مقصد محض فلاح و بہبود کو قرار دیا لیکن نجات اخروی سے اس کا کوئی سروکار نہیں۔ عہدِ حاضر کا انسان کسی تہذیب میں ہو اس کے لیے دنیا اہم بنادی گئی ہے اور آخرت انتہائی غیر اہم۔ دین کا مقصد فلاح و بہبود نہیں بلکہ نجات اخروی ہے۔صرف ترقی، فلاح، مادی کامیابی اور مستقبل پر ایمان کا ایمان باللہ سے کوئی تعلق نہیں — دینی تہذیب میں حصول نجات سب سے اہم کام ہے — انسان اس کے لیے اپنی دنیا اور معیارات زندگی کو ترک کر دیتا ہے۔ جب آخرت اہم ہوتی ہے تو دنیا غیر اہم ہوجاتی ہے۔ روایتی تہذیبوں میں اسی لئے ٹیکنو سائنس پیدا نہیں ہوسکی کیوں کہ ان تہذیبوں کا نقطۂ ماسکہ اور مقصد زندگی اس دنیا میں آزادی اور لذتوں کا حصول نہیں تھا۔ٹیکنو سائنس جہاں جاتی ہے وہاں آخرت کی فکر کو ناممکن اور محال بنادیتی ہے اور زندگی کے بارے میں غور وفکر اور معیارات زندگی میں شب و روز اضافہ کی فکر کو ہر کہہ ومہہ کے لئے ممکن بنادیتی ہے۔ دنیاوی فلاح ترقی تعیّشات یا نجات — جب یہ سوال مذہب کی بارگاہ میں پیش ہوتا ہے تو نجات کو اولیت دی جاتی ہے لیکن جب عقل کی عدالت، سرمایے کے ذریعے اور ٹیکنو سائنس کے طریقوں سے اس سوال کا جواب دیتی ہے تو نجات کا سلسلہ اس کے دائرۂ علم سے خارج ہوجاتا ہے۔ہمیں صرف ان اشیاء وآلات وایجادات کی فکر ہے جن کی کمی سے شاید ہماری مادی زندگی میں کچھ خلل پیدا ہو لیکن ہمیں ان چیزوں کی کوئی فکر نہیں ہے جو ہماری روح کو مسخ کر کے اسے تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ ایسی اشیاء کی فہرست میں ٹیکنو سائنس کا نام

سب سے پہلے آتا ہے۔

۱۸۔ سائنس اور تجربیت کے فروغ میں ہیوم اور کانٹ کا کردار

جدید سائنس کے فروغ میں ایڈورڈ ہیوم کا بنیادی کردار ہے جو تجربیت [Empiricism] کا بہت بڑا حامی تھا اور جس نے Analytical proposition اور synthetic proposition کا تجزیہ پیش کر کے عقلیت سے حاصل ہونے والے علم کو رد کیا اور بتایا کہ عقلیت پسندی [Rationalism] صرف اور صرف [Analytical Proposition] پر قائم ہے جس سے علم میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا اور عقلیت پسند [Rationalists] عام لوگوں کو محض بے بنیاد دلائل کے ذریعے مسخر کرنے کا فن جانتے ہیں۔ کانٹ پر ہیوم کا بہت اثر ہے کیوں کہ کانٹ نے جب ہیوم کے مباحث پڑھے تو وہ بے اختیار کہہ اٹھا ''ہیوم نے مجھے سوتے سے اٹھا دیا ہے''۔ ہیوم کے فلسفیانہ دلائل نے کانٹ کو مسخر کیا اور اس نے ''تنقید عقل محض'' میں عقلیت پرستی کے فلسفے کی دھجیاں بکھیر دیں اور بتایا کہ انسان نے تین تاریخی غلطیاں کی ہیں کہ اس نے الٰہیات، کونیات اور نفس انسانی کو عقلیت کے دائرے میں جانچنے، پرکھنے اور ثابت کرنے کی کوشش کی جب کہ ان دائروں میں عقل کا رآمد نہیں ہے۔ انسان نے ان دائروں میں عقل کا اطلاق کر کے درحقیقت ایک فاش غلطی (Categorical mistake) کی ہے کیونکہ یہ دائرے عقل انسانی کے ادراک سے ماورا ہیں۔ انسانوں نے تاریخ کے ہر دور میں عقل کا اطلاق ایسے دائرہ ہائے علم پر کیا جو عقل کے ادراک اور تصور سے باہر تھے لہٰذا انسان نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں۔ کانٹ کی کتاب ''تنقید عقل محض'' اسی مدعا کا علمی اظہار ہے۔

ا۔ Analytical proposition کے زمرے کے جملوں کی چار خصوصیات ہیں۔ ۱۔ یہ جملے بغیر تجربے کے [A prarie] ہوں گے۔ ان جملوں کا موضوع (subject) اور اثبات وصف (Predicate) یکساں ہوں گے جیسے پیلا رنگ پیلا ہے، دائرہ گول ہے [Circle is round]، ۲۔ یہ جملے بذاتہ سچ (Self Evident) ہوں گے، ان کی سچائی کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ ۳۔ ان جملوں کا انکار تضاد کو جنم دے گا۔ ۴۔ ان جملوں سے ہمارے علم میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔

ب۔ synthetic proposition کے جملوں کی بھی چار خصوصیات ہیں: ۱۔ یہ جملے تجربے کے نتیجے میں ادا ہوتے ہیں لہٰذا فلسفے کی زبان میں [a posterie] ہوتے ہیں۔ ان کا موضوع (subject) اور اثبات وصف (predicate) یکساں نہیں ہوتے، مثلاً سیب سرخ ہے لیکن ضروری

نہیں کہ ہر سیب سرخ ہو،۲۔ یہ جملے بذاتہٖ سچ نہیں ہوتے ممکنہ سچ (probable truth) ہوسکتے ہیں کیونکہ یہ تجربات پر مشتمل ہوتے ہیں اور ہر نیا تجربہ سابقہ نتیجے کا ممکنہ رد کرسکتا ہے لہٰذا ان جملوں میں تردید کا امکان موجود رہتا ہے۔۳۔ ان سے انکار تضاد کو جنم نہیں دیتا لہٰذا ان کا انکار برخود غلط (self contradictory) نہیں ہوتا۔۴۔ان جملوں سے ہمارے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔

ان دلائل کے نتیجے میں عقلیت پرستی [ریشنل ازم] کی کم تری ثابت ہوئی اور تجربیت کی برتری ــــ تجربے سے حاصل ہونے والا علم بہتر اور برتر ہے کیونکہ اس میں ہمہ وقت اضافہ، تغیر اور ارتقاء کا امکان ہے۔ کانٹ نے کہا تھا Analytical proposition کی خوبی یہ ہے کہ سچ کا حصول بغیر تجربے کے ہوتا ہے۔مگر یہ کمزور علم ہے اس سے علم میں اضافہ نہیں ہوتا، مگر synthetic proposition علم میں مسلسل اضافہ کا سبب بنتے ہیں لہٰذا کانٹ نے ان دونوں علوم کو ملا کر ایک نئی اصلاح وضع کی جس میں ان دونوں اصطلاحوں کے مفہوم سمو دیئے گئے ۔ اس نے اسے analytic synthetic judgement کا نام دیا۔اسے وہ ایک مثال سے بیان کرتا ہے 2+5=7 یہ لازماً سچ ہے اس سے علم میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ کانٹ نے کہا تھا کہ ہر وہ بیان جو انسان کی زبان سے ادا ہوتا ہے وہ proposition نہیں ہوتا، وہ فیصلہ Judgement ہوتا ہے اگر ہم proposition کو شامل رکھیں وہ موضوع subject کو نکال دیتا ہے۔ ایسا علم ماوراء انسان ہو جاتا ہے۔ یہ علم انسان کی نفی کر کے ممکن ہوتا ہے لیکن کانٹ judgement کی بات کرتے ہوئے کہتا ہے کہ فیصلے کے لیے subject کا وجود ضروری ہے۔ انسان کی نفی کر کے جو علم حاصل کیا جائے وہ علم نہیں ہے۔ علم کا کوئی ایسا دائرہ علم نہیں کہلا سکتا جس میں انسان موجود نہ ہو۔ کانٹ کے اس فلسفے سے انسانیت پرستی (Humanism) کی عقلی بنیادیں بھی فراہم ہوئیں ۔عقلیت پرستی کے فلسفے کا انہدام ہیوم کے تجربیت کے فلسفے کے ذریعے ممکن ہوا۔ کانٹ کی اس فکر نے جدید سائنسی علوم کو حقیقی، واقعی اور اصلی علم قرار دینے میں مرکزی کردار ادا کیا۔ کانٹ کے فلسفیانہ استدلال نے یہ موقع فراہم کیا کہ علوم کے دائرے سے وہ تمام علوم خارج کر دئے جائیں جو تجربے، حواس اور تحلیل کے معیار پر پورے نہیں اترتے لہٰذا مابعد الطبیعیات کا علم بے وقعت، لایعنی ٹھہرا اور حقیقی علم صرف سائنسی، تجربی، حسی علم ہی قرار پایا یہ وہ بنیادی تبدیلی ہے جس نے اٹھارھویں صدی کے بعد رفتہ رفتہ دینیات، الٰہیات اور مذہبیات کو علم کے دائرے سے مکمل طور پر خارج کر دیا۔ ہیوم اور کانٹ کی عقلی دلیلوں نے عقلیت کے فلسفے کی صدیوں سے مستحکم عقلی دلیلوں کا رد کیا اور اس کے نتیجے میں سائنسی علم کا فروغ ممکن ہوا۔ (جاری ہے)

تزکیۂ نفس

احمد جاوید

نماز اچھی کیسے ہوسکتی ہے؟

س: کوئی اگر ترک صلاۃ سے توبہ کر کے نماز کی عادت ڈالنا چاہے تو اسے کیا چیزیں تعلیم کی جائیں گی جن کی مدد سے اس معاملے میں استقامت بھی حاصل ہو جائے اور نماز کے ادائی کی بہتر سے بہتر صورت بھی پیدا ہوتی چلی جائے؟

ج: نماز کی دعوت ایمان کی دعوت کی طرح دینی چاہئے۔ یہ ایسا عمل ہے جو مستقلاً قلب و ذہن کو اپنے اثر میں رکھتا ہے یعنی نماز کے عمل میں نہ ہونے کی حالت میں بھی مسلمان نماز کے حضور اور کیفیت میں رہتا ہے۔ یہ نکتہ اگر سمجھ میں آ جائے تو ترک صلاۃ پر توبہ کے قیام اور دوام کی ایک مضبوط بنیاد خود بخود پڑ جاتی ہے۔ نماز کے سلسلے میں اپنے ماضی پر تائب ہونے والے کو نماز کی اہمیت اور مرکزیت کا استحضار رکھنے کی مشق کرنی چاہئے۔ یہ مشق اپنے طور پر اعلیٰ درجے کے ذکر کا فائدہ بھی دے گی۔ اس کے بعد یا اس کے ساتھ ساتھ مندرجہ ذیل امور دوام صلاۃ میں معاون ثابت ہوں گے:

ا۔ ترک معاصی

گناہوں کو چھوڑے بغیر تمام دینی اعمال کی طرح نماز بھی بے معنی اور بے روح ہو جاتی ہے لہٰذا اسلامی احکام کی ترتیب میں سب سے پہلا حکم ترک معصیت کا ہے۔ اس کی بنیاد پر ہی بندگی اور فرمان برداری کی پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ عبادت اور اطاعت کا ابتدائی تصور بھی ترک معصیت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ تاہم زیر نظر مسئلے میں اس کی خاص افادیت یہ ہے کہ ترک صلاۃ پر کی جانے والی توبہ اس کے ذریعے سے مزید پختہ اور مکمل ہو جائے گی اور گناہ سے بچنے کے لئے جو فکر درکار ہوتی ہے وہ نماز کو بھی بھولنے نہیں دے گی۔

۳۔ تلاوت کا معمول

قرآن نماز کا مغز ہے اس کی تلاوت کو معمول بنائے بغیر نماز سے وہ نسبت حاصل نہیں ہوسکتی جو نماز کی مداومت اور تکمیل کا ذریعہ ہے۔ اس معمول کی ابتداء فجر کے بعد تلاوت کی عادت سے کرنی چاہئے۔

۴۔ رسول کریم ﷺ کی نماز کی تفصیلات کا علم

عقائد ہوں یا اخلاق و اعمال، ان سے ہماری وابستگی میں زندگی اور شدت اس وقت تک نہیں پیدا

ہوسکتی جب تک رسول کریم ﷺ کا حوالہ محبت بن کر ہمارے سامنے نہ آ جائے۔ جس آدمی کو رسول اللہ ﷺ کی نماز کے احوال کا پتہ نہ ہو وہ نماز سے تعلق کا کوئی تقاضا بھی پورا نہیں کر سکتا۔

۵۔ نیک لوگوں کی صحبت

س: نماز کو بہتر کرنے کی تدابیر کیا ہیں؟

ج: سب سے پہلے تو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ بہتر نماز کہتے کسے ہیں؟ بہتری کا ایک قطعی پیمانہ بنا کر اس کی کوشش کرنا زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔ رسول کریم ﷺ نے اچھی نماز کی ایک کلمے سے تعریف فرما دی ہے اور وہ ہے احسان۔ آپ ﷺ نے فرمایا احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو ورنہ اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ وہ تو تمہیں دیکھ ہی رہا ہے۔ اللہ کو نظر میں رکھنے اور اللہ کی نظر میں ہونے کا یقینی احساس نماز کی بہتری کا جوہر ہے۔ سب سے پہلے اس احساس کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اصول احسان کی کوشش فرض ہے اس کوشش کے ضروری اجزاء یہ ہیں:

۱۔ قرآن سے تعلق میں مضبوطی، گہرائی اور ترقی پیدا کرنے کی مسلسل تگ و دو۔ بندے کو قرآن سے مناسبت ہوگی تو اس کی نماز اچھی اور معیاری بنے گی۔

۲۔ رسول کریم ﷺ کی عبادات کا ضروری علم اور خصوصاً نماز میں آپ ﷺ کے اشتغال اور انہماک کی تفصیلات کا شعور اور اس کی روشنی میں اپنی نماز کو نئے سرے سے تعمیر کرنے کی کوشش۔ اس کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے آپ ﷺ کی صورت نماز کی اتباع کرے، اس کے بعد نماز کی طرف آپ ﷺ کی رغبت کو اپنے اندر موجود رکھنے کی کوشش کرے اور پھر آپ ﷺ کے معمول میں رہنے والے نوافل میں سے کم از کم کسی ایک کو اہتمام کے ساتھ اپنا معمول بنائے۔

۳۔ کثرت ذکر: دل کے حضور اور ذہن کی یکسوئی کے ساتھ زبان کو اللہ کے ذکر میں مشغول رکھنا کثرت ذکر ہے۔ اصول احسان میں اس کا کردار بہت بنیادی نوعیت کا ہے۔

۴۔ مسجد آتے جاتے کسی نہ کسی ذکر میں خود کو مشغول رکھنا۔

۵۔ نماز کے لئے شعوری طور پر اہتمام کرنا مثلاً وضو اچھی طرح کرنا، اذان و اقامت کا جواب دینا، ظاہری زینت اختیار کرنا، نماز شروع کرنے سے پہلے اور ختم کرنے کے بعد اس کی قبولیت کی دعا کرنا۔

۶۔ نماز کو دعا کے ساتھ خاص مناسبت ہے۔ بہترین دعا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اس سے اللہ کا حضور پیدا ہوتا ہے۔ اس کی تفصیلات فضائل دعا میں آئیں گی وہاں دیکھ لی جائیں۔

س: احسان یعنی قلبی اور ذہنی یکسوئی کے علاوہ نماز کے ضروری محاسن کیا ہیں؟

ج: احسان نماز کیا پوری بندگی کی روح ہے لیکن چونکہ اس کا تعلق باطن سے زیادہ ہے اس لئے ضروری ہے کہ نماز کی بعض ظاہری خوبیوں کو احسان سے ممتاز کر کے بیان کیا جائے لیکن یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ نماز کی تمام خوبیاں احسان کے تابع اور اس سے براہ راست متعلق ہیں۔ ہم صرف سہولت کے لئے باطنی اور ظاہری خوبیوں میں تمیز کر رہے ہیں۔ بہر حال نماز کے ظاہری اوصاف کی ضروری فہرست یہ ہے:

۱۔ ہر نماز کی با جماعت ادائی

۲۔ تعدیل ارکان یعنی نماز کے ہر رکن کو اچھی طرح ادا کرنا

۳۔ نماز میں ساکت رہنا اور ہر طرح کی جسمانی حرکات سے پرہیز کرنا

۴۔ تمام ارکان خصوصاً قیام کو طول دینا

۵۔ نوافل خصوصاً تہجد میں محنت کرنا

۶۔ نماز میں پڑھے جانے والے کلمات کا ترجمہ سیکھنا اور حالت نماز میں ذہن کو ان کلمات اور ان کے مفاہیم پر مرتکز رکھنا۔

س: نماز میں خشوع وخضوع بہت ضروری چیز ہے آپ نے اس کا ذکر نہیں کیا؟

ج: احسان اور نماز کی دیگر خوبیوں کا بیان دراصل اسی خضوع وخشوع کی تفصیل ہے۔ خشوع کا مطلب ہے نماز کی باطنی خوبی اور خضوع کا مطلب ہے نماز کے ظاہری محاسن۔ مختصر یہ کہ احسان اور تعدیل ارکان کی سعادت حاصل ہو جائے تو اسی کو خضوع وخشوع کہتے ہیں۔

س: بعض لوگ پنج وقتہ نمازی تو ہیں مگر مسجد جانے کا اہتمام نہیں کرتے اور اکثر نمازیں گھر ہی میں اکیلے پڑھ لیتے ہیں۔ اس خرابی سے کیسے بچا جا سکتا ہے؟

ج: سچی بات تو یہ ہے کہ کسی عذر کے بغیر مسجد کی جماعت کو ترک کرنا دراصل نماز کو چھوڑ دینا ہے ہم ان ائمہ کرام کی رائے سے اتفاق رکھتے ہیں جن کی تحقیق کے مطابق جماعت کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ جماعت واجب ہے اور اس واجب کو ترک کر کے نماز کی قبولیت کا گمان رکھنا خوش فہمی سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ لوگ دراصل کچھ خرابیوں میں مبتلا ہوتے ہیں مثلاً خود پسندی، کسل، اتباع سنت کے ذوق سے محرومی اور کم علمی۔۔۔ان خرابیوں کا علاج بھی ضروری ہے۔

س: ہم ایسے بہت سے لوگوں کو جانتے ہیں جو اس کوتاہی میں مبتلا تو ہیں مگر نماز کی باجماعت ادائی کا کچھ نہ کچھ اشتیاق ضرور رکھتے ہیں، ایسے لوگوں کی معاونت کے لئے آپ کیا تدابیر تجویز کریں گے؟

ج: اس طرح کے حضرات کی اکثریت عموماً کسل اور کمزور قوت ارادی کی مریض ہوتی ہے۔ ان کے لئے بہترین تدبیر یہ ہے کہ کچھ دوست انہیں مسجد لانے لے جانے کی ذمہ داری اٹھالیں۔ جب نماز کا وقت ہو انہیں ان کی جگہ سے اٹھا کر مسجد لے آیا جائے اور نماز کے بعد واپس پہنچا دیا جائے۔ ان دونوں اوقات میں فضاء کو دوستانہ اور خوشگوار رکھنے کی کوشش کی جائے۔ انہیں یہ تاثر نہ دیا جائے کہ ہم تمہاری کسی دینی خرابی کا علاج کر رہے ہیں۔ کچھ ہی مدت بعد ان شاء اللہ یہ اپنے اندر مسجد سے وہ مناسبت پیدا کر لیں گے جو نماز باجماعت کے لئے شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ بات ہم سب کو یاد رکھنی چاہئے کہ دیندار حضرات جب تک اپنے اندر حسن معاشرت نہیں پیدا کریں گے ایک دوسرے کے کام نہیں آسکیں گے۔

س: بعض لوگ نیک طینت ہوتے ہیں اور نماز کے ساتھ قلبی مناسبت بھی رکھتے ہیں مگر کوشش اور خواہش کے باوجود فجر کے وقت اٹھ نہیں پاتے اور ان کی یہ نماز عموماً قضا ہو جاتی ہے، ان لوگوں کے لئے آپ کیا تجویز کرتے ہیں؟

ج: ہمارا موجودہ طرز زندگی بعض پہلوؤں سے دین کے مخالف رخ پر کھڑا ہوا ہے۔ یہ عذر اس طرز زندگی سے پیدا ہوا ہے۔ فجر کے وقت اٹھنے کی اس کے علاوہ کوئی ترکیب نہیں ہے کہ آدمی عشاء کے بعد فوراً سونے کی تیاری کرے۔

س: جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اکثر گھروں میں ایک شخص جلدی سونا بھی چاہے تو بھی اسے اس کا موقع نہیں ملتا۔ اس صورت میں وہ بیچارا کیا کرے؟

ج: جی ہاں! اکثر گھروں کی صورت حال ایسی ہی ہے۔ اس صورت میں سب سے پہلے اسے دیگر اہل خانہ کو سمجھانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اگر یہ کوشش ناکام ہو جائے تو پھر الارم وغیرہ کے ذریعے سے فجر کے وقت آنکھ کھلنے کی کوئی سبیل نکالنی چاہئے اور اگر خدانخواستہ یہ تدبیر بھی موثر نہ ثابت ہو تو پھر یہ شخص معزور ہے۔ امید ہے کہ اس معاملے میں قیامت کے دن پکڑا نہیں جائے گا۔ اس کی جماعت فوت ہونے کا وبال ان لوگوں پر آئے گا جو اس کا سبب بنے ہیں۔ لیکن ایسے اصحاب پر لازم ہے کہ آنکھ کھلتے ہی سب سے پہلے نماز ادا کرنے کی فکر کریں۔

ہماری سرگرمیاں: تعلیم و تربیت

تحریک اصلاح تعلیم (ٹرسٹ)

ہم جس اصلاحی حکمت عملی کے موید ہیں اس کا عملی اظہار ہماری ان کوششوں سے ہوتا ہے جو ہم تحریک اصلاح تعلیم اور ملی مجلس شرعی کے عنوان سے کر رہے ہیں۔ اس حوالے سے ہم جو کچھ آج تک کر پائے ہیں وہ اگرچہ بہت تھوڑا ہے اور اس کے بہت سے اسباب ہیں تاہم اس کے لئے ہم اللہ تعالیٰ کے حضور سراپا سپاس ہیں اور جو نہیں کر پائے ہیں اور کرنا چاہتے ہیں اس کے لئے ہم سراپا اضطراب اور مصروف جدوجہد ہیں اور اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے توفیق اور اس کی نصرت کے طلب گار ہیں۔ ہمارے ان کاموں کی ایک مختصر سی روداد حاضر خدمت ہے۔ امین

صحیح تعلیم وتربیت کی اہمیت

فرد اور معاشرے کی ہدایت اور بہتری کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں 'اصلاح' کی جو حکمت عملی طے کی ہے (ھود ۱۱:۸۸) اس کی اساس تعلیم و کتاب وحکمت اور تزکیہ کی وہ پالیسی ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں بتایا ہے کہ وہ ہمیشہ سے سارے انبیاء کی پالیسی رہی ہے، اور خصوصاً پیغمبر اعظم و آخر حضرت محمد ﷺ کو بھی اللہ نے یہی اصول و لائحہ عمل دے کر بھیجا تھا کہ وہ تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ کے ذریعے لوگوں کی اصلاح کریں تاکہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اللہ کے احکام کے مطابق گزاریں اور آخرت میں اس کی رضا اور خوشنودی سے ہمکنار ہوں۔ 'تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ' کو آج کی اصطلاح میں ہم تعلیم وتربیت کہہ سکتے ہیں۔ مطلب یہ کہ تعلیم قرآن حکیم (مع سنت رسولؐ جو قرآن حکیم ہی کی تشریح وتبیین ہے اور وہ معاون علوم جن کے بغیر خود قرآن وسنت کو نہیں سمجھا جا سکتا جیسے عربی زبان کی تعلیم وتدریس وغیرہ) ہمارے نظام تعلیم کا بنیادی جزو ہونی چاہئے اور دنیا میں زندگی گزارنے کے لئے جن دیگر علوم وفنون کی ہمیں ضرورت ہو وہ بھی قرآن وسنت پر مبنی اور ان کی تعلیمات کے مطابق ہونے چاہئیں اور ان کے خلاف نہیں ہونے چاہئیں۔ اور اس تعلیم کے ساتھ ساتھ اور اس کا نتیجہ ایسی تربیت وتزکیہ یعنی تعمیر سیرت وکردار ہونی چاہئے جس سے فرد اللہ کا حقیقی 'عبد' بن جائے اور اپنی زندگی اپنے آقا و مولیٰ کے احکام کے مطابق گزار سکے تاکہ وہ دنیا وآخرت کی حسنات سمیٹ سکے۔

مذکورہ دو نکات پر مبنی لائحہ عمل جسے آج کل کی اصطلاح میں تعلیم وتربیت کہا جا سکتا ہے، دنیا اور

آخرت میں کامیابی، ہر قسم کی انفرادی اصلاح، اجتماعی تبدیلی اور مسلم نشأۃ ثانیہ کی بنیاد ہے لیکن ہم نے بحیثیت مجموعی اس اہم حقیقت سے غفلت برتی ہے اور اس کے تقاضوں کو کما حقہ پورا کرنے کی طرف توجہ نہیں دی۔

بگاڑ کی صورتیں

پاکستان میں تعلیم کم ہے، ثنویت پر مبنی ہے، غیر معیاری ہے، محض کاروبار بن چکی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نظریاتی جہت سے عاری ہے اور مسلمان طلبہ کو ان کے بنیادی مقصدِ زندگی کے لئے تیار نہیں کرتی یعنی دنیوی زندگی اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق گزارنا تا کہ آخرت میں اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل ہو جائے۔

تعلیمی ثنویت کا نقصان یہ ہے کہ تعلیم دینی مدارس اور جدید مغربی طرز کے اداروں میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے جس کا نقصان یہ ہے کہ ہمارے ہاں مذہبی تعلیم اس طرح دی جاتی ہے جو اس کے فضلاء کو موجودہ زمانے کی ضرورتوں، تقاضوں اور چیلنجوں کا مقابلہ کرنے اور جدید مسلم معاشرے کی رہنمائی کے قابل نہیں بناتی۔ دوسری طرف جدید اور عمومی تعلیم ہے جو بڑی حد تک مغربی طرزِ فکر و عمل کی نقالی پر مبنی ہے اور دینی تعلیم و تربیت سے تقریباً تہی دست ہے۔ اس کے نتیجے میں ہمارے ہاں متوازن کردار کی حامل شخصیت پیدا ہی نہیں ہو رہی اور یہی وجہ بنیادی طور پر ہماری دین سے دوری، اخلاقی زبوں حالی، سیاسی عدم استحکام، معاشی زوال اور سماجی اقدار اور اداروں کی شکست و ریخت کی ذمہ دار ہے۔

اصلاح کی حکمت عملی

اس صوت حال کی بہتری کے لئے تحریک اصلاح تعلیم کی حکمت عملی یہ ہے کہ ہمارا نظام تعلیم و تربیت مندرجہ ذیل منہاج پر مبنی ہونا چاہئے:

۱۔ جدید تعلیم اسلامی تناظر میں اور مذہبی تعلیم کے ساتھ دی جائے۔

۲۔ مذہبی تعلیم میں عصری علوم اور جدید تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھا جائے۔

۳۔ مذکورہ دونوں تعلیمی دھاروں میں اسلامی تناظر میں تربیت کا اہتمام کیا جائے اور ان میں وحدت کی سعی کی جائے۔

۴۔ مغربی فکر و تہذیب کی اندھی نقالی سے بچا جائے۔

اصلاحی اقدامات

اس صورتِ حال کو بدلنے اور نظام تعلیم کی اصلاح کے لئے ڈاکٹر محمد امین صاحب نے ۱۹۸۸ء میں ارقم فاؤنڈیشن قائم کی اور زیادہ تر انفرادی کوششوں کے ذریعے اس مقصد کے لئے کام کرتے رہے۔ ۲۰۰۱ء میں تحریکِ اصلاحِ تعلیم کو ایک ٹرسٹ کے طور پر رجسٹرڈ کرایا گیا تا کہ اجتماعی کوششوں کو بروئے کار لایا جا سکے۔

ٹرسٹ کے پیش نظر شروع ہی سے تعلیمی اصلاح کے کام کے دو پہلو تھے۔ ایک موجودہ تعلیمی نظام اور اداروں کی اصلاح اور دوسرے موجودہ تعلیمی ثنویت کو ختم کرتے ہوئے وحدت کی بنیاد پر اور اسلامی تناظر میں ایک نئے رول ماڈل تعلیمی ادارے کا قیام جس میں سکول، اسلامک سنٹر، کالج اور ریسرچ سنٹر ہو اور یہ سب مل کر بالآخر ایک جدید یونیورسٹی کی شکل اختیار کر جائیں جس کی زیادہ ترکیز سوشل سائنسز پر ہو اور جس میں جدید عمومی تعلیم اس طرح دی جائے کہ دینی تعلیم و تربیت اور کردار سازی اس کا موثر حصہ ہو۔ اور دین کی خصوصی تعلیم اس طرح دی جائے کہ وہ جدید مسلم معاشرے کی ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق ہو، عصری افکار کے چیلنجوں کا مقابل کر سکے اور معاشرے کو جدید تناظر میں رہنمائی مہیا کر سکے۔ اس ضمن میں آج تک ٹرسٹ نے انتہائی محدود افرادی قوت اور انتہائی قلیل مالی استعداد کے باوجود جو کام کئے ہیں ان کی تفصیلات انتہائی اختصار کے ساتھ درج ذیل ہیں۔ سہولت بیان کی خاطر ہم دینی مدارس اور جدید تعلیمی اداروں کی اصلاح کے لئے کیے گئے کاموں کو الگ الگ بیان کریں گے اور اسکے بعد رول ماڈل تعلیمی ادارے کے قیام کا ذکر ہوگا۔

جدید تعلیمی اداروں کے لئے اصلاحی اقدامات

ا۔ نصاب سازی

۱۹۹۰ تا ۱۹۹۲ء ایک نیم حکومتی تعلیمی فاؤنڈیشن کے ساتھ مل کر پہلی سے بارہویں جماعت تک سارے مضامین کے لئے اسلامی تناظر اور جدید عصری تقاضوں کے مطابق نیا نصاب تشکیل دیا گیا جو ۲۵۰ صفحات کی ایک مطبوعہ رپورٹ کی صورت میں موجود ہے اور کئی تعلیمی ادارے اس رپورٹ سے استفادہ کرتے رہتے ہیں۔

۲۔نصابی کتب

مذکورہ بالا نصابی کام کو بنیاد بناتے ہوئے ٹرسٹ کے نائب صدر جناب پروفیسر ملک محمد حسین نے آفاق اور سحر سیریز کے نام سے بیسوں نصابی کتب مدون کیں جو اس وقت پاکستان بھر کے بہت سے سکولوں میں مروج ہیں صدر ٹرسٹ (ڈاکٹر محمد امین) کی مرتب کردہ بعض نصابی کتب بھی کئی اداروں میں زیر استعمال ہیں۔

۳۔اشاعت لٹریچر

اپنی اصلاحی تحریک کو عام کرنے کے لئے ٹرسٹ نے کافی لٹریچر تیار کیا ہے۔صدر ٹرسٹ کی تالیف کردہ کتب 'ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل'، 'تعلیمی ادارے اور کردار سازی'، 'پاکستان میں تعلیمی کی اسلامائزیشن'، 'اسلام اور تزکیہ نفس'، 'مسلم نشاۃ ثانیہ۔اساس اور لائحہ عمل'۔۔۔۔۔ملک کے علمی اور تعلیمی حلقوں میں معروف ومتداول ہیں۔علاوہ ازیں بعض بروشرز ہزاروں کی تعداد میں طبع کرا کے سکولوں میں مفت تقسیم کئے گئے جن میں سے چند ایک کے عنوانات یہ ہیں: ا۔پرائیوٹ سکولوں کے نام۔ایک اہم پیغام ۲۔اسلامی تربیت۔کیوں اور کیسے؟ ۳۔انگلش میڈیم۔فائدے اور نقصانات ۴۔مسلمانوں کی ترقی کا واحد راستہ۔

علاوہ ازیں تحریک کے صدر اور سیکریٹری علمی جرائد اور اخبارات میں اصلاح تعلیم کے حوالے سے مضامین ومقالات مسلسل لکھتے رہتے ہیں۔ٹرسٹ کے ایک رکن پروفیسر رب نواز صاحب مرحوم کی تعلیم کے فنی پہلوؤں پر اسلامی تناظر میں کئی کتب بھی شائع ہو چکی ہیں۔

۴۔ٹیچرز ٹریننگ

ٹرسٹ کے زیر اہتمام تربیت اساتذہ کے پروگرام مسلسل جاری رہتے ہیں خصوصاً اس کے صدر اور سیکریٹری لاہور اور بیرون لاہور تربیت اساتذہ کے پروگراموں میں شرکت کرتے رہتے ہیں اور اپنا اسلامی اور اصلاحی ایجنڈا اساتذہ کے سامنے رکھتے رہتے ہیں۔تحریک کے سیکرٹری جنرل وزارت تعلیم اسلام آباد اور لاہور کے سٹاف دویلپمنٹ ڈائریکٹوریٹ کے ٹریننگ پروگراموں کے باقاعدہ ریسورس پرسنز میں سے ہیں۔

۵۔مشاورت ورہنمائی

ٹرسٹ کے منتظمین بہت سے تعلیمی اداروں کو بلا معاوضہ مشاورت و رہنمائی مہیا کرتے ہیں ۔مقصود اس سے یہ ہے کہ ادارے نہ صرف تعلیمی سہولتوں کے لحاظ سے ترقی کریں بلکہ اسلامی تناظر میں نصاب کی بہتری ،اساتذہ کی تربیت ،ہم نصابی سرگرمیوں اور طلبہ کی تربیت کے حوالے سے بھی ان کو مفید مشورے اور رہنمائی مہیا کی جاتی رہے ۔ٹرسٹ کے صدر وسیکرٹری جنرل کے علاوہ اس کام میں ٹرسٹ کی انتظامیہ کے ارکان جناب عزیز احمد مرزا صاحب اور پروفیسر سید وقار علی کاری صاحب کی خدمات بھی قابل ذکر ہیں ۔ٹرسٹ کے سیکریٹری جنرل کی نگرانی میں لاہور کے ۳۰ سرکاری سکولوں میں طلبہ کی کردار سازی کا ایک مضبوط اور متنوع پروگرام زیرعمل ہے نیز ان سکولوں میں معیار تعلیم کی بہتری کے لئے اقدامات کیے جارہے ہیں ۔

۶۔میٹریل ڈویلپمنٹ

یونیورسٹی سطح کے نصابات کو اسلامی تناظر میں مدون کرنا اور اس کے مطابق تعلیمی مواد اور نصابی کتب تیار کرنا ایک بہت بڑا اور انتہائی اہم منصوبہ ہے ۔ٹرسٹ اس کام کو کرنا چاہتا ہے لیکن مالی وسائل کی کمی اس میں حارج ہے ۔اس کے باوجود ٹرسٹ نے ۸۔۲۰۰۷ء میں لاہور کی مختلف یونیورسٹیوں کے پروفیسرز کو جمع کیا اور انہیں اس کام پر آمادہ و تیار کرنے کی کوشش کی ۔اس ضمن میں جامعہ پنجاب میں کئی سیشن ہوئے جس میں شرکاء کی خردافروزی اور تربیت کے لئے کئی لیکچرز ہوئے اور اسلامی علوم کے ماخذ تک رسائی اور عربی زبان کی تفہیم کے لئے ایک کورس کا انعقاد کیا گیا ۔ٹرسٹ مستقبل میں اس کام کو زیادہ بہتر اور منظّم انداز میں کرنے کا خواہاں ہے بشرطیکہ تحقیقی کام اور اس کی اشاعت کیلئے ضروری مالی معاونت میسر ہو۔

۷۔ورکشاپس اور سیمینارز

ٹرسٹ اپنی اصلاحی فکر کو تعلیمی اور علمی حلقوں تک پہنچانے کے لئے مندرجہ بالا اقدامات کے علاوہ وقتاً فوقتاً ورکشاپس اور سیمینارز منعقد کرتا رہتا ہے ۔اس سلسلے میں جامعہ پنجاب ، ہمدرد سنٹر لاہور، اسلام آباد ، فیصل آباد ، سکھر اور کراچی میں کئی پروگرام منعقد کئے جا چکے ہیں۔ٹرسٹ کے منتظمین دیگر تعلیمی ادروں کے زیر اہتمام ہونے والی تعلیمی کانفرنسوں اور سیمینارز میں بھی شرکت کرکے اپنا

اصلاحی ایجنڈا آگے بڑھانے کی تگ و دو کرتے رہتے ہیں۔

دینی مدارس کی تعلیم کے لئے اصلاحی اقدامات

ا۔اصلاحِ نصاب

ٹرسٹ نے ۲۰۰۰ء میں دینی مدارس کے نظام تعلیم خصوصاً نصاب کی اصلاح کے لئے ایک مہم شروع کی ۔اس نے نصابی اصلاح کے لئے ایک ورکنگ پیپر تیار کیا اور اس پر حکومت سے منظور شدہ ملک کے چار وفاقوں یعنی امتحانی بورڈز (ا۔ وفاق المدارس العربیہ [دیو بندی مسلک] ۲۔تنظیم المدارس [بریلوی مسلک] ۳۔وفاق المدارس السّلفیہ [اہلحدیث مسلک] اور رابطۃ المدارس [جماعت اسلامی]) کے سرکردہ علماء اور پنجاب کے بڑے دینی مدارس کے مہتمم حضرات سے ڈیڑھ سال کی مشاروت اور ڈائیلاگ کے بعد بالآخران سے تعلیمی ونصابی اصلاح کا ایک پیکیج منظور کروانے میں کامیاب ہوگیا۔اس اصلاحی پیکیج پر سارے مسالک کے علماء کرام کے تائیدی دستخط موجود ہیں اور یہ طبع شدہ ہے۔

اس اصلاحی پیکیج کی منظوری کے بعد اور اس کو بنیاد بناتے ہوئے ٹرسٹ نے دینی مدارس کے لئے آٹھ سالہ متبادل نصاب تیار کیا اور مدارس اور وفاقوں کو مہیا کیا۔بعض وفاقوں اور دینی مدارس نے ٹرسٹ کی بعض تجاویز پر جزواً عمل درآمد بھی کیا۔

۲۔تدریب المعلمین

ٹرسٹ نے یہ دیکھتے ہوئے کہ مدارس اگر چاہیں بھی تو وفاق کی وجہ سے نصاب تبدیل نہیں کر سکتے اور وفاقوں کے اندر نصاب کی تبدیلی بوجوہ انتہائی مشکل ہے، کام کرنے کا یہ راستہ نکالا کہ دینی مدارس کے اساتذہ کی تربیت کا آغاز کر دیا۔چنانچہ ۲۰۰۳ء میں تدریب المعلمین کا چھ ماہ کا ایک کورس بیت الحکمت لائبریری لاہوراور جامع آسٹریلیا میں منعقد کیا گیا۔اگلے سال نو ماہ کا ایک اقامتی کورس وفاقی کالونی کی ایک مسجد اور مدرسے میں رکھا گیا۔۲۰۰۶ء میں تدریب المعلمین کا ایک سہ ماہی اقامتی کورس محکمہ اوقاف پنجاب کے تعاون سے علماء اکیڈمی میں منعقد کیا گیا اور چار ماہ کا ایک کورس ۲۰۰۸ء کے اوائل میں ٹرسٹ نے اپنے قائم کردہ ادارے صفاانسٹی ٹیوٹ میں منعقد کیا۔

ان کورسز کی ایک منفرد خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سارے مسالک کے طلبہ شریک ہوتے ہیں

اور یوں مسلک پرستی سے بُعد پیدا ہوتا اور باہمی محبت واخوت کو فروغ ملتا ہے۔ ان کورسز میں طریقہ ہائے تدریس کے علاوہ انگریزی زبان، عربی تقریر وتحریر، مغربی فکر وتہذیب اور عمرانی وسائنسی علوم کا تعارفی مطالعہ، تقابل ادیان، اسلام وعصری مسائل اور کمپیوٹر کی تدریس شامل ہوتی ہے۔ ۲۰۰۷ء میں ایک تربیتی کورس دینی مدارس کے مہتمم حضرات کے لئے بھی رکھا گیا جس میں مدارس کے ادارتی اور نصابی مسائل زیر بحث آئے۔ علاوہ ازیں بعض مدارس میں آن دی جاب ٹریننگ کا تجربہ بھی کیا گیا جن میں جامعہ نعیمیہ گڑھی شاہو لاہور اور جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ کامران بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور شامل ہیں۔ یہ بات بھی قابل ملاحظہ ہے کہ ان ٹریننگ کورسوں میں اساتذہ بھی مختلف مسالک سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں جب کہ یونیورسٹی پروفیسرز بھی ان تربیتی سرگرمیوں میں شریک ہوتے ہیں۔

۳۔ مشاورت ورہنمائی

ٹرسٹ بعض مدارس کو بلا معاوضہ مشاورت بھی مہیا کرتا ہے خصوصاً اعلیٰ تعلیم، دینی تربیت اور جدید علوم کی تدریس کے حوالے سے۔ اس ضمن میں معہد ام القریٰ جامعہ اشرفیہ لاہور اور جامعہ تعلیماتِ اسلامیہ فیصل آباد کے لئے خصوصی رپورٹیں بھی تیار کی گئیں۔

۴۔ اشاعت لٹریچر

ٹرسٹ کے صدر چونکہ خود علوم اسلامیہ اور عربی کے پروفیسر ہیں اور معتدل دینی نظریات رکھتے ہیں لہذا انہیں دینی مدارس کے ساتھ ورکنگ ریلیشن شپ قائم کرنے میں زیادہ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ وہ دینی مدارس کی تعلیم، نصابات اور دوسرے مسائل پر دینی جرائد اور اخبارات میں مضامین لکھتے رہتے ہیں "ہمارا دینی نظام تعلیم" کے نام سے ان کی کتاب بھی طبع شدہ ہے نیز "دینی مدارس کے نام ایک اہم پیغام" نامی پمفلٹ لکھ کر ہزاروں کی تعداد میں شائع کیا گیا اور مدارس کو بھیجا گیا۔

۵۔ نصابی کتب

دینی مدارس کے لئے بعض نصابی کتب کی تیاری کا کام تدوینی مرحلے میں ہے۔ فوری طور پر مغربی فکر وتہذیب اور مغرب کے عمرانی وسائنسی علوم کے تعارفی مطالعہ پر تین کتابیں طبع کرنا پیش نظر ہے کیونکہ اس موضوع پر اردو میں بہت کم مواد میسر ہے جس سے مدارس کی ضرورت پوری نہیں ہوسکتی۔

۶۔حکومتی ڈگریوں کا حصول

۲۰۰۸ء سے دینی مدارس کے فضلاء اور طلبہ کو ایف اے، بی اے، ایم اے اور ایم فل و پی ایچ ڈی کی تیاری کے پروگرام کا آغاز کر دیا گیا ہے تاکہ دینی مدارس کے طلبہ نہ صرف اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں اور انہیں اچھی ملازمت مل جائے بلکہ اس سے ان کا ذہنی افق بھی وسیع ہوتا ہے، ان کی مالی حالت بہتر ہوتی ہے اور وہ معاشرے میں اشاعت دین کا کام مزید مؤثر طریقے سے کر سکتے ہیں۔

یہ ایک مختصر سا جائزہ تھا ان اصلاحی تعلیمی سرگرمیوں کا جو تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ پچھلے کئی برسوں سے ایک فرض سمجھ کر ادا کرتا آ رہا ہے۔اگرچہ محدود وسائل کی وجہ سے یہ کام بڑے پیمانے پر نہیں ہو سکا اور معاشرے پر اس کے مفید اثرات نمایاں نظر نہیں آتے تاہم ہر صاحبِ نظر صاف دیکھ سکتا ہے کہ یہ درست سمت میں ایک مثبت کام ہے اور اگر یہ جاری رہا اور خصوصاً اللہ کی نصرت اور احباب کے تعاون سے زیادہ وسائل میسر آ گئے اور اسے بڑے پیمانے پر کیا جا سکا تو اس کے تعمیری اثرات پاکستانی معاشرے پر ان شاء اللہ جلد واضح نظر آنے لگیں گے۔

رول ماڈل نئے تعلیمی ادارے کا قیام

سطور بالا میں مختصر تذکرہ تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ کی ان سرگرمیوں کا کیا گیا جن کے پیش نظر نظام تعلیم کی اصلاح تھا۔اب ہم رول ماڈل تعلیمی ادارے کے قیام کے لئے ٹرسٹ کی کوششوں کا ذکر کرتے ہیں۔جیسا کہ ابتداء میں ذکر کیا گیا کہ ٹرسٹ کے پیش نظر تعلیمی ثنویت کا خاتمہ ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ دینی تعلیم اور درس نظامی کے دیوبند ماڈل اور جدید مغرب پرستی پر مبنی علی گڑھ ماڈل کے بالمقابل ایک ایسا نیا رول ماڈل تعلیمی ادارہ سکول تا یونیوسٹی قائم کرے جو ثنویت کی بجائے وحدت کے اصول پر کام کرے، جو مذکورہ بالا دونوں رول ماڈلز کی خامیوں سے پاک ہو اور دونوں کی خوبیوں کا حامل ہو۔تاہم یہ کام چونکہ بہت زیادہ سرمائے کا متقاضی ہے اس لئے اس کام کا آغاز نہ کیا جا سکا۔اگرچہ اس کے لئے ٹرسٹ کے پاس راولپنڈی ،اسلام آباد سے ایک گھنٹے کی مسافت پر سوہاوہ۔ چکوال روڈ پر ایک ہزار کنال زمین کی آفر موجود ہے اور اس غرض سے ٹرسٹ کے منتظمین کئی اصحاب خیر اور لاہور اور کراچی کے چیمبرز آف کامرس سے گفتگو کرتے رہے ہیں لیکن اس بھاری پتھر کو ابھی تک ہلایا نہیں جا سکا۔

صفا انسٹی ٹیوٹ اور صفاء اسلامک سنٹر کا قیام

اس اثناء میں ٹرسٹ نے اس کام کی ایک عاجزانہ ابتداء کے لئے علامہ اقبال ٹاؤن لاہور میں ۲۰۰۸ء کے اوائل سے کرائے کی ایک بلڈنگ میں صفا انسٹی ٹیوٹ قائم کر لیا ہے۔اس انسٹی ٹیوٹ میں تعلیمی ثنویت کے برے نقصانات سے بچنے کے لئے دینی تعلیم کے فضلاء وطلبہ کو انگریزی زبان اور جدید علوم کے تعارفی مطالعے پر مبنی کورسز کرائے جا رہے ہیں اور انہیں جدید تعلیم کی ڈگریوں کے لئے تیاری کروائی جاتی ہے۔اسی طرح سکولوں ،کالجوں اور یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہونے والے اصحاب کو دینی علوم کا مطالعہ کروایا جا رہا ہے تا کہ ان کی یہ کمی بھی پوری ہو جائے۔

علاوہ ازیں صفا انسٹی ٹیوٹ میں دینی مدارس اور جدید سکولوں ہر دو کے اساتذہ کی تربیت کے پروگرام بھی منعقد کئے جا رہے ہیں تا کہ تعلیمی اصلاح کا جو کام ٹرسٹ کے پیش نظر ہے وہ آگے بڑھ سکے اور اس کے نتیجے میں اسلام کے ایک متوازن تصور کے مطابق مسلم شخصیت کی نشوونما کو فروغ مل سکے۔

اس کے علاوہ صفا انسٹی ٹیوٹ میں عمرانی علوم میں ایک ریسرچ سنٹر قائم کیا جا رہا ہے تا کہ قریبی یونیورسٹیوں کے سوشل سائنسز (خصوصاً اسلامی علوم) کے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے طلبہ کو تحقیق کے لئے نہ صرف موزوں موضوعات کے انتخاب میں مدد دی جا سکے بلکہ بعد میں دوران تحقیق بھی ان کو مشاورت اور رہنمائی مہیا کی جا سکے۔اس کے علاوہ صفا انسٹی ٹیوٹ میں یونیورسٹی سطح کے نصابات کی اسلامائزیشن اور اس کیلئے میٹریل ڈویلپمنٹ کے کام کو منظم کرنے پر غور وفکر بھی جاری ہے اور اصلاح تعلیم کے لئے دیگر سرگرمیوں کو منظم کرنے کے کئی منصوبے بھی پائپ لائن میں ہیں۔

حال ہی میں تقسیم کار کی خاطر ٹرسٹ کی تعلیمی سرگرمیوں کو دو اداروں میں بانٹ دیا گیا ہے دینی سرگرمیاں صفاء اسلامک سنٹر کے نام سے اور تعلیمی اصلاح کے دوسرے کام صفاء انسٹی ٹیوٹ کے نام سے کئے جا رہے ہیں۔

اہمیت

یہ ایک مختصر روداد تھی اب تک تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ کے دینی اور تعلیمی کاموں کی۔ٹرسٹ کی شروع سے یہ خواہش وکوشش رہی ہے کہ جب تک ہمارے جدید تعلیمی نظام میں اسلامی اجزاء اور تربیت و کردار سازی کو مؤثر طور پر شامل نہیں کیا جاتا اور دینی مدارس کے موجودہ مذہبی تعلیم کے نظام کی اصلاح کر

کے اسے جدید تقاضوں کے مطابق نہیں ڈھالا جاتا پاکستان کے عوام وخواص میں دین سے دوری بڑھتی جا ئے گی ،ان کے اخلاق میں زوال آتا رہے گا اور ہم مسلمان نہ صرف دنیا میں ذلیل وخوار ہوتے رہیں گے بلکہ آخرت میں بھی ناکامی ہمارا مقدر بنے گی، **العیاذ باللہ**۔ اس لئے ٹرسٹ اس امر پر یقین رکھتا ہے اور اسی وجہ سے اسے ایک دینی فریضہ سمجھ کر ادا کر رہا ہے کہ پاکستان کا نظام تعلیم اسلام کے متوازن تصور تعلیم کے مطابق اور وحدت کے اصول پر از سر نو قائم ہو جائے تا کہ ایسے افراد تیار ہو سکیں جو باعمل مسلمان ہوں اور ایسا معاشرہ تشکیل دیا جا سکے جو مستحکم ومضبوط ہو تا کہ امت مسلمہ اپنی گم گشتہ عظمت کو دوبارہ پا سکے۔اس تناظر میں ٹرسٹ کے کام کی اہمیت کا اندازہ ہر صاحب فکر ونظر کر سکتا ہے۔

مالیات

ٹرسٹ کے اصلاح تعلیم کے منصوبے کو بروئے کار لانے کے لئے دو بڑے چیلنج درپیش ہیں ،ایک مالی اور دوسرا افرادی۔ اگر چہ افرادی چیلنج بھی کم اہم نہیں تاہم ٹرسٹ کو پاکستانی یونیورسٹیوں کے بہترین اور متدین اساتذہ کی ایک ٹیم میسر ہے جسے بوقت ضرورت منظّم کیا اور بڑھایا جا سکتا ہے لہذا کہا جا سکتا ہے کہ تعلیمی اور علمی چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے ٹرسٹ کے پاس افرادی قوت موجود ہے لیکن سب سے بڑا مسئلہ مالیات کی فراہمی کا ہے۔ اکثر اصحاب خیر ''دینی تعلیم'' کا یہ تصور رکھتے ہیں کہ یہ مسجد و مدرسہ قرآن و ناظرہ وحفظ کا نام ہے اور اسلامی خطوط پر جدید تعلیم کے ادارے قائم کرنا ایک کاروباری کام ہے لہذا ٹرسٹ کا نقطہ ءنظر انہیں سمجھ نہیں آتا اور وہ اس سے اتنے مطمئن نہیں ہو پاتے کہ وہ اس کا عملاً ساتھ دیں۔

ٹرسٹ کو حکومتی سر پرستی اور مدد حاصل نہیں ہے۔کسی بیرونی این جی او سے بھی اسے فنڈ ز نہیں ملتے یہی وجہ ہے کہ ٹرسٹ مالی مشکلات کا شکار ہے۔لہٰذا ہم ان سطور کے قارئین سے درخواست کر تے ہیں کہ اگر وہ ٹرسٹ کے کام کو تعمیری ،اسلامی اور ثواب کا کام سمجھتے ہیں تو وہ دامے ،درمے ، سخنے اس کی مدد کریں تا کہ جس عظیم کام کا ٹرسٹ نے بیڑہ اٹھایا ہے وہ اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے۔

ٹرسٹ کا کرنٹ اکاؤنٹ نمبر 02011478219 سونیری بنک ، مین برانچ لاہور میں ہے ۔اس کے حسابات ہر سال آڈٹ ہوتے ہیں اور ہر کسی کو ان تک رسائی حاصل ہے۔

مجلس منتظمہ

ٹرسٹ کو جسٹس (ر) خلیل الرحمٰن صاحب (سابق جج سپریم کورٹ و ریکٹر اسلامی یونیورسٹی)، جسٹس (ر) ڈاکٹر منیر احمد مغل صاحب (لاہور ہائی کورٹ)، مجیب الرحمٰن شامی صاحب (چیف ایڈیٹر روزنامہ پاکستان)، اوریا مقبول جان صاحب (سیکریٹری اطلاعات و ثقافت حکومتِ پنجاب)، ماہرین تعلیم میں سے جناب ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب (سابق مرکزی وزیر مذہبی امور و صدر اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد)، اور علماء کرام میں سے مولانا حافظ فضل الرحیم صاحب، مولانا مفتی محمد خان قادری صاحب، مولانا حافظ عبدالرحمٰن مدنی صاحب اور مولانا عبدالمالک صاحب کی سرپرستی اور مشاورت کی سعادت حاصل ہے جبکہ ٹرسٹ کے تعلیمی پروگرام کو لے کر چلنے میں پروفیسر ڈاکٹر محمد امین (سابق سینئر ایڈیٹر اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام جامعہ پنجاب اور حال چیئر مین شعبہ اسلامی فکر و تہذیب، یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور) اپنے ساتھیوں کے ساتھ دن رات کوشاں ہیں۔

حضرت سری سقطیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے عید کے دن حضرت معروف کرخیؒ کو کھجوریں چنتے ہوئے پایا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کیا کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ میں نے اس لڑکے کو روتے ہوئے دیکھا، پوچھا کہ کیوں روتا ہے؟ اس نے کہا کہ میں یتیم ہوں۔ آج سب لڑکوں نے نئے کپڑے پہنے ہیں اور میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ میں اس لیے کھجوریں چن رہا ہوں کہ ان کو فروخت کر کے اسے اخروٹ لے دوں تا کہ یہ ان سے کھیلے اور نہ روئے۔ حضرت سری سقطیؒ نے آپ سے عرض کیا کہ میں اس کام کو سرانجام دے لوں گا، آپ بے فکر رہیں۔ پھر میں اس لڑکے کو اپنے ہمراہ لے گیا۔ اسے نئے کپڑے خرید کر پہنا دیے اور کچھ اخروٹ بھی کھیلنے کے لیے خرید دیے اور اس لڑکے کے پژمردہ دل کو خوش کر دیا۔ اس فعل سے میرے دل میں ایک نور پیدا ہو گیا اور میری حالت ہی کچھ اور ہو گئی۔

(مخزنِ اخلاق از علامہ رحمت اللہ سبحانی)

مدیر کے نام

محترم ڈاکٹر صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

البرہان کے گزشتہ چند شماروں سے مغربی تہذیب کی تفہیم کے حوالے سے ایک زوردار بحث پڑھنے کو مل رہی ہے۔ اِن سطور کا مقصد اس بحث کے آغاز کے پس منظر سے البرہان کے قارئین کو آگاہ کرنا ہے۔ مغربی تہذیب کی تفہیم کے حوالے سے کراچی کے بنیاد پرست سکالر علامہ ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب کا ایک مخصوص اور جاندار مؤقف ہے لیکن لاہور کے علمی حلقوں میں اسی حوالے سے خاصی ناواقفیت پائی جاتی تھی۔ پنجاب کے دور دراز مقام اور نہایت غیر معروف قصبے جھوک نواز میں قائم ادارہ بلال اسلامک سنٹر نے اس مکتبہ فکر کی رائے کو پنجاب کے اہل علم تک پہنچانے کا عزم کیا۔ اس سلسلے میں آٹھ نو ماہ کے مسلسل رابطے کے بعد انصاری صاحب کے شاگردِ خاص سید خالد جامعی نے مذکورہ ادارے کے زیر اہتمام جھوک نواز میں مارچ ۲۰۱۱ء میں ایک سہ روزہ علمی مجلس میں مغربی تہذیب کے حوالے سے اپنی فکر بھرپور انداز میں پیش کی۔ اس مجلس میں لاہور، اسلام آباد، بہاولپور، ساہیوال، اٹک، پاک پتن، وہاڑی، بہاولنگر اور ملتان سے تشریف لانے والے وکلاء پروفیسرز، ڈاکٹرز، مختلف تنظیموں کے ذمہ داران، کاروباری شخصیات، یونیورسٹی کے طلبہ اور سجادہ نشین حضرات نے استفادہ کیا۔ بعد ازاں خالد جامعی صاحب کی قیادت میں دو رکنی وفد نے مئی میں بہاولپور، وہاڑی، ساہیوال، چیچہ وطنی اور اوکاڑہ میں علمی مجالس سے خطاب کیا جن میں یونیورسٹی اساتذہ، رسائل و جرائد کے مدیران، معروف مصنفین، ملکی سطح پر شہرت یافتہ فکری شخصیات، ماہرین قانون اور مذہبی و سیاسی تنظیموں کے ذمہ داران نے شرکت کی۔ تیسرے مرحلے میں ملتان اور ساہیوال میں جون میں خالد جامعی صاحب کے چار لیکچر ہوئے اور انہوں نے دیوبندی اور بریلوی مکتبۂ فکر کے دو بڑے دینی مدارس کے اساتذہ، منتظمین اور طلبہ سے الگ الگ خطاب فرمایا۔ یہ شکر کا مقام ہے کہ بلال اسلامک سنٹر جیسے چھوٹے سے ادارے اور اس کے کم علم اور بے وسیلہ منتظمین کے ذریعے پنجاب میں ایک مفید بحث کا آغاز ہوا۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ چھوٹے لوگوں سے بڑے کام لے لیتا ہے۔ یہ ؂

بڑے کرم کے ہیں فیصلے — یہ بڑے نصیب کی بات ہے

محمد ممتاز قطب
جامعہ پنجاب، لاہور

۱۵ دسمبر ۲۰۱۱ء

برادرم حافظ عاکف سعید صاحب ☆

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

میں نے حال ہی میں ایک خط انجینئر مختار فاروقی صاحب کو لکھا ہے جس کی ایک کاپی آپ کی اطلاع کے لیے ارسالِ خدمت ہے۔

کئی دنوں سے مجھے یہ خیال آ رہا تھا کہ آپ سے عرض کروں کہ آپ کی تنظیم کو تعلیم کی طرف توجہ دینی چاہیے کہ افراد سازی اور ذہن سازی میں اس کا کردار انتہائی اہم ہے۔ اگر آپ اس موضوع پر سوچنے پر آمادہ ہوں تو تعلیم وتحقیق سے متعلق آپ کے احباب کے ساتھ ایک نشست مفید ہوسکتی ہے خصوصاً قرآن کالج جیسے پراجیکٹ کو محض ایک روایتی دینی مدرسہ بنا دینا میرے نزدیک محتاج نظر ثانی ہے۔

میں اس سے پہلے جماعت اسلامی کے محترم امیر صاحب کا دروازہ بھی کھٹکھٹا چکا ہوں۔ اب آپ سے بھی عرض ہے کہ ہمارے ہاں کی اقامت دین کی تحریکوں کو ترکی، مصر، انڈونیشیا وغیرہ کی اسلامی تحریکوں کے تجربات سے استفادہ کرنا چاہیے جنھوں نے تعلیم اور خدمت خلق پر تزکیر کر کے میدان مار لیا ہے۔

اللہ کرے آپ بصحت وبعافیت ہوں۔

مخلص،

(محمد امین)

☆ امیر تنظیم اسلامی پاکستان، لاہور

۱۵ دسمبر ۲۰۱۱ء

برادرم انجینئر مختار فاروقی صاحب (۱)

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ،

کل آپ کے دفتر سے فون آیا کہ ہم 'البرہان' میں جس 'نئی طرز کی یونیورسٹی' کی بات کرتے ہیں اس پر اگر ہم ہم نے کچھ ہوم ورک کر رکھا ہوتو وہ آپ کو بھجوا دیا جائے کہ آپ بھی 'قرآن یونیورسٹی' قائم کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔

اس سلسلے میں عرض ہے کہ میں نے مجوزہ جدید اسلامی یونیورسٹی کے بارے میں جو قدرے تفصیلی تحریر لکھی ہے وہ میری کتاب 'ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل' میں موجود ہے اور یہ کتاب غالبًا آپ کی لائبریری میں ہوگی وہاں دیکھ لیں (۲) اس ضمن میں جو دیگر مختصر تحریریں اور پمفلٹ وغیرہ ہم نے تیار کیے تھے وہ بھی ارسال خدمت کر دوں گا۔

اس حوالے سے یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ میں نے شروع میں اس مجوزہ یونیورسٹی کا نام 'قرآن یونیورسٹی' ہی تجویز کیا تھا۔ اسی طرح اسے قائم کرنے والے ادارے کا نام 'تحریک رجوع الی القرآن' رکھا تھا (اور ان ناموں سے چھپا ہوا لٹریچر ہماری پرانی فائلوں میں مل جائے گا) لیکن بعد میں خیال آیا کہ اس سے یہ پیغام جاتا ہے کہ شائد ہم کوئی مذہبی تعلیم کا ادارہ قائم کرنا چاہتے ہیں جب کہ ہم بنیادی طور پر ثنویت کے خاتمے اور وحدت تعلیم کے داعی ہیں اس لیے ہم نے 'تحریک رجوع الی القرآن' کو 'تحریک اصلاح تعلیم' سے بدل دیا اور مجوزہ یونیورسٹی کے نام کے ساتھ قرآن کا سابقہ ترک کر دیا کہ تعلیم تو ہر شخص کی ضرورت ہے اور اس کے لیے صرف دینی حلقوں کو مخاطب کرنا شائد موزوں اور کافی نہ ہو (۳) ویسے بھی یہ لادین حلقوں کو چونکانے (اور مخالفت پر

۱۔ مدیر ماہنامہ 'حکمت بالغہ' وقرآن اکیڈمی جھنگ و ناظم اعلیٰ تحریک خلافت، پاکستان۔

۲۔ دینی تعلیم کے حوالے سے میری کتاب 'ہمارا دینی نظام تعلیم' بھی شائد آپ کی نظر سے گزری ہو۔

۳۔ قرآن یونیورسٹی کے نام سے چارٹر بھی شائد نہ ملے اور اس صورت میں مجوزہ یونیورسٹی ایک دینی مدرسہ بن کر رہ جائے گی جیسے گوجرانوالہ کے بریلوی حضرات کی اسلامک مدینہ یونیورسٹی، دیوبندی حضرات کی شاہ ولی اللہ یونیورسٹی اور سیالکوٹ کے اہل حدیث حضرات کی بخاری یونیورسٹی بن چکی ہیں۔

اکسانے) والی بات ہے۔[1]

بہرحال نام سے قطع نظر اصل اہمیت وژن اور کام کی ہے جس کے بارے میں چند بنیادی باتیں عرض خدمت ہیں:

وژن: مجوزہ جدید اسلامی یونیورسٹی تین بنیادی اصولوں کے مطابق کام کرے گی:

۱۔ اسلام کو اس طرح پیش کرنا کہ وہ عصری ضرورتوں کو پورا کرے

۲۔ مغربی فکر وتہذیب کا رد کرنا

۳۔ وحدت تعلیم کا تصور

طریق کار: کرنے کے بنیادی کام چار ہیں:

۱۔ عمرانی علوم کو اسلامی تناظر میں از سر نو مدون کر کے پیش کرنا

۲۔ سائنسی علوم کی اسلامی اسلوب میں تدریس

۳۔ اسلامی علوم کی اس طرح تدریس وتحقیق کہ وہ جدید مسائل ومشکلات کو حل کرتا اور عصری چیلنجز سے نمٹتا نظر آئے

۴۔ طلبہ کی تربیت یعنی تعمیر سیرت وکردار اسلامی اصولوں کے مطابق

عملی چیلنج: دو ہیں:

۱۔ افرادی قوت: جستجو اور محنت سے اساتذہ کی بنیادی ٹیم میسر آسکتی ہے گو سو فیصد ہم خیالی نہ ہو[2] باقی لوگ ساتھ ساتھ تیار کیے جاسکتے ہیں۔

۱۔ جب کہ ہم ابھی محض سوچ رہے ہیں اور تعلیم میں کوئی ٹھوس اور بڑا کام کرنا ابھی دور کی بات ہے اور معاملہ محض تمناؤں اور ارادوں تک محدود ہے (شائد اسی وجہ سے ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ کا 'قرآن کالج' بھی مرحوم ہوگیا اور مقبول نہ ہوسکا کہ اس طرح کے ناموں سے تعلیمی ادارے کی اپیل اور جاذبیت محدود ہوجاتی ہے اور عام آدمی اپنے بچے وہاں نہیں بھجواتا بلکہ صرف آپ کی تنظیم کے اور آپ کے مخصوص ذاتی نظریات اور تصور دین سے متفق لوگ ہی اپنے بچے بھجواتے ہیں اور اس سے تعلیمی ادارہ فروغ نہیں پاتا۔ جب کہ یونیورسٹی تو ایک بہت بڑا (کروڑوں اور اربوں کا) پراجیکٹ ہوتی ہے اور اسے کسی خاص شخص یا تنظیم کے نظریات اور دین کی کسی خاص تعبیر تک محدود کر کے اس کی ناکامی کا خطرہ مول نہیں لیا جاسکتا۔ ویسے بھی مناسب یہی ہے کہ مجوزہ یونیورسٹی میں وہ ہزاروں طلبہ آئیں جو فی الوقت اسلامی ذہن نہیں رکھتے تاکہ جب وہ وہاں سے جائیں تو اسلامی ذہن رکھتے ہوں، بجائے اس کے کہ آپ پہلے سے (صرف ایک خاص) دینی نقطۂ نظر رکھنے والے طلبہ کو جمع کریں۔

۲۔ بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں اختلاف رائے برداشت کرنے کا کلچر نہیں ہے اور ہر فرد/ جماعت دوسروں سے سو فیصد اتفاق رائے کی توقع رکھتی بلکہ اس پر اصرار کرتی ہے؛ اور اس کے بغیر مل کر کام کرنے کو ناممکن خیال کرتی ہے۔

۲۔ مالیات: اس کے لیے کثیر سرمائے کی ضرورت ہے اور اس کی فراہمی کار دارد ہے۔
میری رائے یہ بھی ہے کہ مجوزہ یونیورسٹی لاہور یا کسی بڑے شہر میں قائم ہونی چاہیے تاکہ اہل علم بھی میسر ہوں اور بڑی لائبریریاں بھی۔ ہمارے پاس 125 ایکڑ زمین اس غرض سے سوہاوہ چکوال روڈ پر موجود ہے وہ حاضر خدمت ہے لیکن بڑے شہروں سے دور دیہات کی فضا میں ایک 'شہر علم' بسانا ناممکن حد تک مشکل ہے اور اس کے لیے کثیر سرمائے کی ضرورت ہے، اگرچہ اس کے بعض فوائد بھی ہیں۔
اسلامی یونیورسٹی کے حوالے سے یہ چند ضروری باتیں تھیں جو میں آپ کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا تھا۔ کبھی لاہور تشریف لائیں تو بالمشافہ ملاقات میں مزید تفصیلات گوش گزار کرسکوں گا۔

مخلص،

(محمد امین)

ڈاکٹر محمد امین کی بعض اہم تالیفات

اردو

۱۔ ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل
۲۔ ہمارا دینی نظامِ تعلیم
۳۔ تعلیمی ادارے اور کردار سازی
۴۔ مسلم نشأۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل
۵۔ اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش
۶۔ اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی نفسیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ)
۷۔ حقیقتِ تزکیۂ نفس
۸۔ ترکِ رذائل (اصلاح اعمال و اخلاق کا حصہ اول)
۹۔ اسلام اور پاکستان
۱۰۔ اسلامی انقلاب۔ مفہوم، تقاضے اور حکمت عملی
۱۱۔ عصر حاضر اور اسلام کا نظامِ قانون
۱۲۔ مقالاتِ امین (دو جلدیں)
۱۳۔ مطالعۂ قرآن و حدیث (برائے جماعت اول تا پنجم)

بروشرز

۱۴۔ پرائیویٹ سکولوں کے نام ایک اہم پیغام
۱۵۔ طلبہ کی اسلامی تربیت۔ کیوں اور کیسے؟
۱۶۔ انگلش میڈیم۔ فائدے اور نقصانات
۱۷۔ دینی مدارس کے نام۔ ایک اہم پیغام
۱۸۔ مسلمانوں کی ترقی کا واحد راستہ
۱۹۔ حقیقتِ تصوف

انگریزی

۲۰۔ Riyadh-us Saliheen (2 Vols)
۲۱۔ Noble Quran, Part 1
۲۲۔ Islamization of Laws in Pakistan

عربی

۲۳۔ السلطة التشريعية ۔ دراسة مقارنة